شوالہ کے پجاری
1
ایم اے راحت

ہمدان جمشیدی کا تعلق ساگرسی۔پی کی ریاست سیتا گڑھی سے تھا۔ لیکن ان کی آبائی زمینیں ہماچل پردیش سے لے کر راس پورنی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ راجہ کرناشکی نے جب دیوالیہ ہو کر اپنے سارے اثاثے فروخت کرنے کا اعلان کیا تو ہمدان جمشیدی کے والد جمشید درانی نے خاموشی سے راجہ صاحب سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ اپنی رسوائی کیوں کر رہے ہیں۔

''اس لئے کہ میں اب ہندوستان میں نہیں رہنا چاہتا۔ میں افریقہ جا رہا ہوں۔''

''آپ چاہیں تو اپنی ساکھ بحال کر سکتے ہیں۔ میں آپ کی مالی مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

''دھن واد مہاراج! یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ جو کچھ فروخت کر رہے ہیں اس کا تخمینہ لگا لیں اور خاموشی سے سب کچھ ہمارے نام منتقل کر کے مجھ سے رقم لے لیں۔ ہم پرانے پڑوسی ہیں، میں آپ کے بارے میں افواہیں گشت کرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

راجہ صاحب کی طلب کی ہوئی رقم ہاتھوں ہاتھ ادا کر دی گئی اور راجہ صاحب سب کچھ جمشیدی خاندان کو سونپ کر افریقہ چلے گئے۔ اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جمشیدی خاندان کی دولت آسمان کو پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن اتنا ہی بلند ان لوگوں کا ظرف تھا۔ بلند ظرفی اپنا مقام الگ رکھتی تھی لیکن راجوں، نوابوں اور رئیسوں کے شوق اپنی جگہ۔ چنانچہ میرے دادا جمشید درانی کی جوانی تو صیغہ راز میں ہی رہی لیکن میرے والد صاحب قبلہ المعروف ہمدان جمشیدی شوقین مزاج تھے۔ حسن ان کی کمزوری تھا۔ اور یہ بگڑی ہوئی شخصیت کی دین نہیں تھی بلکہ ان کی فطرت تھی۔ البتہ حسین خواتین سے متاثر ہونا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ عیاش طبع کہہ کر خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کو زینت حرم بناتے رہے۔ پانچ بیویاں اکٹھی ہو گئیں۔ چھٹی شادی دادی حضور کی پسند تھی۔ دادی

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

حضور کے ماموں زاد بھائی لبنان میں مقیم تھے جہاں ان کی دوستی ابراہیم سلقی سے ہوگئی۔ دادی حضور ماموں حضور سے ملنے گئیں تو براہیم سلقی کی بیٹی ضوبیہ انہیں بھا گئیں۔ لے دے کر ہمدان جمشیدی ہی تھے جن سے اس شوق کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مرد میدان کو میدان میں لایا گیا اور خاتون ضوبیہ کا نکاح ہمدان جمشیدی سے کر دیا گیا۔ چھٹی بیگم نے ہمدان جمشیدی کو چت کر دیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خاتون ضوبیہ یعنی میری والدہ محترمہ ایک زبردست اور نامور شکاری یعنی ابراہیم سلقی کی بیٹی تھیں اور خود بھی شکار کی دیوانی تھیں۔ باپ نے بیٹی کو بہترین شکاری بنا دیا تھا۔ خود ہمدان جمشیدی کی زندگی کا ایک ہی شوق تھا یعنی شکار۔ آبادی میں ہوتے تو حسین بیویاں شکار کرتے، جنگل میں ہوتے تو خطرناک جانور۔ نئی بیگم کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ ایک نامور شکاری کی صاحبزادی ہیں لیکن ایک بار مدھیہ پردیش کے جنگل کرتالیہ میں تیندوے کے شکار میں بیگم کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خاتون ضوبیہ نے اس مہارت سے تیندوے کو شکار کیا کہ تندوے کو بھی یقین نہ آئے کہ میں مر گیا ہوں۔

بس اس دن سے خاتون ضوبیہ، بیوی کی بجائے دوست بن گئیں اور یوں لگا جیسے ہمدان جمشیدی صاحب دوستی کے خول میں بند ہو گئے ہوں اور باہر نکلنے کا کوئی دروازہ نہ رہا ہو۔ ہندوستان بہت بڑی شکار گاہ ہے، طرح طرح کے جنگلوں میں شکار کھیلے جاتے تھے۔ ہمدان جمشیدی ان تمام علاقوں میں والدہ صاحبہ کو شکار کھلا چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی کو اولاد سے کوئی رغبت نہیں تھی لیکن خدا کی دین کو کون ٹال سکتا ہے۔ والدہ صاحبہ امید سے ہو گئیں۔ دادی حضور کو علم ہوا تو خوشی سے دیوانی ہو گئیں۔ اصولوں اور نصیحتوں کا رجسٹر بنا دیا گیا۔ والد صاحب نے تنہائی میں والدہ صاحبہ کی خبر لی۔

"یہ کیا سن رہا ہوں میں ضوبیہ؟"

"تو میں کیا کروں؟" والدہ صاحبہ شرما کر بولیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"پتہ نہیں......" والدہ صاحبہ ہنس کر بولیں۔

والد صاحب خوب بگڑے۔ کئی شکار تنہا کھیلے۔ مگر اب بیوی کے بغیر شکار کھیلنے کا مزا نہیں آتا تھا۔ انہیں جنگلوں سے عشق تھا۔ والدہ صاحبہ خود شدید بور ہو رہی تھیں۔ ابتدائی کچھ ماہ تو دادی حضور کے زیر ہدایت گزارنے ہی پڑے۔ پھر انہوں نے دبی زبان میں

کہا۔

"اماں، اب ضوبیہ کو شکار پر لے جا سکتا ہوں؟"

"تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہمدان؟"

"ہونے والا ہوں۔ آپ جانتی ہیں ضوبیہ کے بغیر اب شکار بیکار ہو گیا ہے۔"

"بچے ہوش کے ناخن لے۔ اس کا ساتواں مہینہ چل رہا ہے۔"

"چلنے دو اماں...... میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"نقصان اٹھائے گا بیٹا۔"

"نفع نقصان زندگی کے ساتھ ہے۔"

"دیکھ، میری بات مان لے، دو ڈھائی مہینے کی ہی تو بات ہے۔"

"جس طرح وہ یہاں رہے گی، اسی طرح میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے کسی مشقت میں نہیں ڈالوں گا۔"

"تیری مرضی ہے بیٹا، واپس کب تک آ جائے گا؟" ان کی والدہ اور میری دادی حضور نے مجبور ہو کر کہا۔

"آپ کے حساب سے ایک ماہ پہلے۔"

"جا، اللہ کے سپرد......!"

اور شکاری جوڑا چل پڑا۔ لبنانی نژاد اور شکاری باپ کی بیٹی خاتون ضوبیہ جنگلوں میں داخل ہوئیں تو بے لگام ہو گئیں۔ پہلے ہی ہلے میں ایک آدم خور شیر مار گرایا۔ اس شیر کی کہانی بھی عجیب تھی۔ مدھیہ پردیش کے بہت سے دیہاتوں کا راستہ گھنے جنگلوں سے گزرتا ہے۔ یہاں ڈاک کی ترسیل کا کوئی خصوصی نظام آج تک نہیں ہے۔ سرکاری ڈاکیے بے چارے کئی کئی ہفتوں کی ڈاک اکٹھی کر کے سائیکل پر انہی جنگلوں سے گزر کر دیہاتوں میں جاتے اور ڈاک تقسیم کرتے ہیں۔ انکے پاس صرف ایک لاٹھی ہوتی ہے جس کے سرے پر گھنٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ جنگل سے گزرتے وقت اسے بجاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی شکاری کسی جانور کو مارنے کی فکر میں جنگل کے اندر ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے اس جگہ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جب ایک چوپایہ وہاں پانی پینے آیا تو اس نے اپنی بندوق سے گولی چلا دی۔ لیکن جب زخمی ہو کر جانور دہاڑا تو شکاری کی جان نکل گئی۔ یہ ایک ہیبت

ناک شیر تھا۔

شکاری تو بچ گیا کیونکہ وہ تالاب کے دوسرے کنارے پر تھا۔ لیکن زخمی شیر بھاگ کر پگڈنڈی پر پہنچ گیا جہاں سے ایک بدقسمت ڈاکیا گھنٹی بجاتا گزر رہا تھا۔ شیر نے اسے چیتھڑے چیتھڑے کر دیا۔ اس کے بعد شیر کو اس گھنٹی کی آواز سے ایسی چڑ ہوئی کہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ باہر نکل آتا اور ڈاکیے کو ہلاک کر دیتا۔ یہ داستان ہمدان جمشیدی نے بھی سنی اور دونوں میاں بیوی مچل گئے۔ یہ تجویز ضوبیہ ہمدان کی ہی تھی کہ ہمدان جمشیدی ڈاکیہ بن جائے اور گھنٹی بجاتا ہوا سائیکل پر گزرے اور جیسے ہی شیر حملہ آور ہو، ضوبیہ اسے نشانہ بنا لے۔ ان کے قدیم ملازم اور شکار کے خصوصی ساتھی جناب خان نے ان کی تجویز سنی تو بولا۔

"صاحب! زندگی کھیلنے کے لئے نہیں، گزارنے کے لئے ہوتی ہیں۔ درندوں سے کھیلنا عقلمندی نہیں ہوتی۔ میں آپ کو یہ کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔"

"یار جناب خان! تمہیں لکھنا پڑھنا آتا ہے؟" ہمدان نے پوچھا۔

"آتا ہے صاحب!"

"تو مجھے لکھ کر دے دو کہ میں کب تک زندہ رہوں گا۔ اس میں کمی بیشی ہوئی تو تمہیں مار دوں گا۔"

"ہم نہیں سمجھے صاحب؟"

"زندگی ایک بار ملتی ہے، دوسری بار جاتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔"

"بیگم صاحب! آپ سمجھدار ہو، آپ سوچو، شیر کو اپنا زخم ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ دوسری جانب یہ کہ انسان کا گوشت کھانے کے بعد وہ انسان ہی کی طرح چالاک اور خونخوار ہو جاتا ہے۔ آپ ایسے خطرناک جانور سے مت کھیلو بیگم صاحب!"

'ضوبیہ، یہ جناب خان تمہیں خونخوار کہہ رہا ہے۔" ہمدان جمشیدی نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ جناب خان کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا تھا کیونکہ وہ ایک بہادر اور جانثار انسان تھا اور ہر شکار میں ان کا ساتھی ہوتا تھا۔ اکثر وہ ان کی شاندار جیپ ڈرائیو کرتا تھا۔

"تم فکر نہ کرو جناب خان! ہم ہوشیار رہیں گے۔" ضوبیہ بیگم کسی بھی طرح والد صاحب سے کم سرپھری نہیں تھیں۔

"آپ ایسا کرو بیگم صاحب! ہم سائیکل پر گھنٹی بجاتے نکلیں گے، آپ دونوں لوگ

بندوق چلاؤ گے۔" جناب خان کی یہ بات بھی نہیں مانی گئی تھی اور دونوں نے وہی کیا جو نہیں کرنا تھا۔ ہمدان جمشیدی سائیکل پر گھنٹی بجاتے ہوئے نکلے اور شیر نے فوراً ان پر حملہ کیا۔ ضوبیہ خاتون نے کامیابی سے اس پر گولی چلائی لیکن شیر حد سے زیادہ طاقتور تھا۔ دو گولیاں کھا کر وہ بھاگا تو اس کا رخ خاتون ضوبیہ کی طرف ہو گیا جو زمین پر ہی تھیں اور جھاڑیوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔ جان بچانے کے لئے ضوبیہ کو بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تب کہیں ہمدان نے شیر پر اور گولیاں چلا کر اسے مار گرایا۔

لیکن اس شدید بھاگ دوڑ نے خاتون ضوبیہ کو نقصان پہنچایا اور وہ تکلیف میں مبتلا ہو گئیں۔ کیفیت خراب سے خراب تر ہو گئی اور ہمدان جمشیدی بمشکل تمام انہیں ان کھنڈرات تک لے جانے میں کامیاب ہو سکے جو سات سو سال پرانے تھے اور جن کی تاریخ یشودھا ونسی سے ملتی تھی۔ اس حساب سے یہ کھنڈرات بھی یشودھا ونسی کہلاتے تھے۔ بہترین طرزِ تعمیر کا نمونہ تھے۔ باہر سے بہت بوسیدہ اور خستہ لیکن اندر سے بہت سے کمرے ایسے تھے جو بالکل مضبوط اور پختہ تھے۔ یشودھا ونسی کے ان کھنڈرات میں میری ولادت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ شدید زلزلے کی ایک لہر نے یشودھا ونسی کی کچھ اور دیواریں گرائیں اور دھماکے اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی میری آواز میرے ماں باپ نے سنی۔

ہمدان جمشیدی ہر مشکل دور سے گزرے تھے لیکن یہ افتاد اجنبی تھی۔ ضوبیہ خاتون غیر معمولی خاتون تھیں اس لئے یہ مشکل سہہ گئیں۔ لیکن حالات قدرے بہتر ہوتے ہی ہمدان صاحب نے جناب خان سے کہا۔

"جناب خان! یار تم گاڑی لے کر شہر چلے جاؤ اور ڈاکٹر للت رائے کو میرا یہ خط پہنچا دو۔ وہ سارے انتظامات کر دیں گے۔"

"بڑی بیگم جان کے پاس نہ جاؤں صاحب؟"

"ابھی نہیں یار، شامت آ جائے گی۔ بعد میں دیکھیں گے۔" والد صاحب نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب!" جناب خان جانے کے لئے تیار ہوا تو والد صاحب نے کہا۔

"اور سنو۔"

"جی صاحب......" جناب خان بولا۔

"جو کچھ کہا ہے، وہی کرنا ہے۔ اپنی وفاداریوں کا اظہار کرنے کے لئے یا ان حالات

میں برا بھلا سننے سے بچنے کے لئے اگر تم بیگم صاحب تک جا پہنچے تو میری تمہاری دوستی خ[تم] ہو جائے گی۔"

جناب خان نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"اس سے بڑی دھمکی اور کوئی نہیں ہوتی جناب! وعدہ کرتے ہیں، آپ نے جو کچھ ک[ہا] ہے وہی کریں گے۔"

جناب خان گاڑی لے کر چلا گیا۔ والد صاحب اپنی معلومات کے مطابق جو کچھ ک[ر] سکتے تھے انہوں نے کیا۔ جناب خان بھی بڑی برق رفتاری سے گیا تھا۔ حالانکہ فاصلے بہت زیادہ تھے لیکن جس قدر جلد ممکن ہو سکا وہ ایک لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو لے کر آ گیا۔ والد صاحب کے دوست نے ان دونوں خواتین کا بندوبست کیا تھا۔ بہرحال لیڈی ڈاکٹر کے آنے کے بعد والد صاحب مطمئن ہو گئے۔

کھنڈر کے ایک صاف ستھرے گوشے میں جو غالباً کوئی بارہ دری تھا، صاف ستھری زمین پر آرام سے لیٹے اور سو گئے۔ اب انہیں کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے یہ اطلاع بڑی حویلی پہنچائی اور ہمدان صاحب کی والدہ یہ سن کر آگ بگولا ہو گئیں۔ پھر انہوں نے فوراً سفر شروع کر دیا اور آخر کار یشودھاونسی پہنچ گئیں۔ کئی ملازموں کو ساتھ لائی تھیں اور دوسرا سامان بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہاں انہوں نے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو اتنی سنائیں کہ دونوں کی طبیعت صاف ہو گئی۔ والد صاحب نے عاجزی سے کہا۔

"لیکن اماں جی! مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سسرا وقت سے اتنا پہلے اس دنیا میں نازل ہو جائے گا۔ آپ یقین کریں، زلزلہ ہے پورا زلزلہ۔ میں تو اسے زلزلے کی اولاد ہی کہتا ہوں۔"

"تو اسے جو بھی کہے یہ تیری مرضی ہے۔ لیکن تو نے مجھ سے میری خوشیاں چھین لیں۔ منع کیا تھا میں نے کہ بہو کو اس عالم میں شکار پر مت لے جانا۔"

"چھوڑیں اماں جی! بلاوجہ دو ڈھائی مہینے انتظار اور کرنا پڑتا۔ اچھا بچہ ہے، ہمیں انتظار کی زحمت سے بچا لیا۔"

"مگر کتنا کمزور ہے، یہ تو دیکھ۔"

"اماں! ابھی لیڈی ڈاکٹر نے ضوبیہ کو سفر کی اجازت نہیں دی۔ یہ جگہ بے شک ویران

ہے لیکن ڈاکٹر للت نے جو انتظام کر دیا ہے وہ کافی ہے اگر آپ اجازت دیں تو۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تیرا جب دل چاہے حویلی آ جانا۔ میں جا رہی ہوں۔" بیگم صاحبہ بہت ناراض تھیں۔ ہمدان جمشیدی کے کہنے پر بھی وہ نہ رکیں اور واپس چلی گئیں۔ بہرحال اس وقت والد صاحب کو ذرا بھی صورتحال کی پرواہ نہیں تھی۔ یشودھاونسی کے اطراف اس قدر حسین تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ موسم بھی اپنے جوبن پر تھا۔ ان کھنڈرات میں میٹرنٹی ہوم کا سماں کئی دن تک رہا۔ اس دوران لیڈی ڈاکٹر پورے اطمینان کا اظہار کرتی رہی۔ پکنک کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ کام خود لیڈی ڈاکٹر اور خوبصورت نرس کو بڑا پسند آیا تھا، دونوں یہاں خوش تھیں۔ کام کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت بھی ہو رہی تھی۔

میری پیدائش کے غالباً ساتویں دن کی بات ہے، ڈاکٹر نے اماں کو چلنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ ضوبیہ بیگم ٹہلتی ہوئی اس علاقے میں پہنچیں جہاں والد صاحب نے اپنی قیام گاہ بنائی ہوئی تھی تو انہوں نے دیکھا کہ والد صاحب نرس کے ساتھ اس ماحول کی تنہائی دور کرنے میں مصروف ہیں۔ نرس اور والد صاحب نے ضوبیہ بیگم کو دیکھ لیا تھا۔ والد صاحب پر تو خیر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا اور والدہ صاحبہ بھی اس صورتحال سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن نرس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ والدہ صاحبہ کچھ لمحے وہاں کھڑی رہیں اور پھر اس کے بعد وہاں سے چلی گئیں۔ نرس کی حالت بے پناہ خراب ہو گئی تھی۔ لیکن والد صاحب خاصے مطمئن تھے۔ والدہ صاحبہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ اس حادثے کو اسکینڈل نہیں بننے دیں گی۔ لیکن انہوں نے اسی دن وہاں سے واپسی کا فیصلہ کر لیا اور حویلی واپس آ گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ والدہ صاحبہ نے یشودھاونسی والے معاملے میں کبھی زبان تک نہیں ہلائی لیکن ہمدان جمشیدی کی وضع داری دیکھئے کہ اس واقعے کے کچھ ماہ بعد انہوں نے نرس سے باقاعدہ نکاح کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ میری ساتویں ماں تھیں۔ لیکن ان ساری ماؤں میں سے کوئی بھی ماں حویلی تک پہنچنے کا درجہ نہیں حاصل کر سکی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ والد صاحب نیک دل اور نیک فطرت انسان تھے اور انہوں نے میری ساری ماؤں کو مکانات بنا کر دیئے تھے اور اتنا کچھ دے دیا تھا کہ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں رہی تھی۔ ضوبیہ بیگم کی شکایت پر وہ ان سے یہی کہا کرتے تھے کہ دیکھو خاتون

ضوبیہ، بیوی تو تم بس میری بن گئی ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم میری دوست ہو اور دو
کا درجہ ان چھوٹی موٹی باتوں سے بہت زیادہ بلند ہوتا ہے۔ یہ مسخرے پن کی محبت
والدہ صاحبہ کو پسند تھی۔

میری جتنی دوسری مائیں تھیں، میری والدہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں۔ لبنا
خواتین حسن و جمال میں دنیا بھر میں بے مثال کہی جاتی ہیں۔ خاتون ضوبیہ کا بلند و با
قد، نیلی آنکھیں، بھورے بال اور سرخ و سفید رنگت انہیں لاکھوں میں ممتاز کرتی تھی
ویسے میرے ننھیال والوں سے تقریباً آدھا شہر آباد تھا۔ مگر ہماری یہ حویلی شہر سے چار پا
میل دور ایک عالی شان حویلی کہلاتی تھی۔ اور اس کا نام ثمرستانِ جمشید تھا۔ ہم اسی حوی
میں رہتے تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری آبائی زمینیں دور دور تک کی ریاستو
اور تحصیلوں میں پھیلی ہوئی تھیں، ہمارے ہاں ان زمینوں پر اجناس میں گیہوں کے علاو
گنے اور کپاس کی کاشت بھی ہوتی تھی۔

کوئی گیارہ برس کی عمر تک مجھے دو چار مہینے سے زیادہ کہیں ایک جگہ رہنے کا موقع ہ
نہیں ملا۔ والد صاحب مجھے بھی ایک ماہر شکاری اور سیاح بنانا چاہتے تھے۔ گرمیوں
زمانہ ہم شملہ، نینی تال یا میسوری میں گزارتے تھے۔ اس کے بعد سال کا باقی حص
ریاست کے مختلف حصوں میں گھومتے ہوئے گزرتا تھا۔ میں ذرا بڑا ہوا تو میری تعلیم ک
ذمہ داری اماں نے سنبھال لی۔ اماں اس زمانے کے لحاظ سے بہت پڑھی لکھی خاتو
تھیں۔ انہیں کئی زبانیں آتی تھیں اور انگریزی میں تو وہ ماہر تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ
ہی مجھے مذہبی تعلیم بھی اماں نے دی تھی۔ اُردو، انگریزی، حساب وغیرہ سب کچھ پڑھ ر
تھا۔ لیکن ہمدان جمشیدی کو ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اگر مجھے کوئی تعلیم
دینا چاہتے تھے تو بس اتنی کہ مجھے ایک اعلیٰ شکاری بنا دیں۔ یوں بھی میں ہر شخص کے حصے
میں آجاتا تھا لیکن زیادہ تر والد صاحب کے حصے میں رہتا تھا۔ وہ مجھے شکار پر لے جاتے
اور سرچ لائٹ میں چمکتی ہوئی جنگلی جانوروں کی آنکھوں سے ایک ایک جانور کی پہچان
کراتے۔ اگر میں صحیح بتا دیتا تو ایئرگن کے پانچ چھرے انعام دیتے۔ غلط بتاتا تو ضمانت
کے طور پر دو چھرے ضبط کر لیتے۔ ہلتی ہوئی جھاڑی کا اشارہ سمجھ لینا، کیچڑ، ریت اور مٹی
وغیرہ پر جانوروں کے پیروں کے نشان، ان کی قسم، تعداد اور عمر کا تعین کرنا، ہوا اور بادلوں
سے موسم کا اندازہ لگانا۔ غرض میرا یہی نصابِ تعلیم تھا جو والد صاحب کی طرف سے مجھے

منتقل ہو رہا تھا۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں تھی کہ میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا۔

دادی اماں اور تقریباً وہ تمام بزرگ جو مجھ سے دلچسپی رکھتے تھے، ان کے متفقہ فیصلے
سے میرا نام خاقان جمشیدی رکھا گیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اس نام میں ایک وقار
چھپا ہوا تھا۔ بہرحال گیارہ سال کی عمر تک میں کھیتوں کھلیانوں میں، ہریلوں میں،
فاختاؤں اور کبوتروں پر ایئرگن چلاتا رہا یا پھر والد صاحب کے شکار کئے ہوئے جانوروں
کی پیائش کرتا رہا۔ گھوڑے کی سواری میں، میں نے اس عمر میں ہی اتنی مہارت حاصل کر
لی تھی کہ خود والد صاحب بھی حیران رہ گئے تھے۔ اسی طرح دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت
تیرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ پھر اس وقت میری عمر تقریباً ساڑھے گیارہ برس تھی کہ ایک دن
والد صاحب نے کسی آدم خور گلدار کے چکر میں ایک خاص علاقے دھرم شوالہ کے نیچے
وادی میں کیمپ لگوایا۔ دھرم شوالہ کا علاقہ شِو جی کے ایک غیر آباد مندر کی وجہ سے بہت
مشہور تھا۔ اب تو ان اطراف میں کوئی موجود نہیں تھا، لیکن سنا جاتا ہے کہ دھرم شوالہ کے
علاقے میں ایک بدھ خانقاہ بھی تھی اور اس کے اطراف میں آبادی بھی تھی۔ لیکن اب
وہاں پر جنگلی جانوروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ویسے دھرم شوالہ کا علاقہ اس قدر پُر ہیبت
اور پُرشکوہ تھا کہ میں اس کے بارے میں صحیح الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہاں اس پُرشکوہ
مندر اور خانقاہ کے کھنڈرات اب بھی موجود تھے اور ان کی عظمت اور ہیبت اس قدر بے
مثال تھی کہ اس کا تذکرہ صحیح الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کے درمیانی حصے کے گھنے جنگلوں میں بندھیاچل پہاڑ کی ایک سرسبز و
شاداب پہاڑی ہے جس کی دُشوار گزار چوٹی پر تقریباً آدھا میل چوڑا بالکل مسطح میدان
ہے۔ اس میدان کے درمیان میں دھرم شوالہ کی پہاڑی کے دامن میں ایک انتہائی تیز
رفتار ندی بہتی ہے جو ایک قدرتی کھائی کا کام بھی دیتی ہے۔ گویا دھرم شوالہ تک پہنچنے
کے لئے آدمی کا بہت سے معاملات میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کوہ پیما بھی
ہو، تیراک بھی ہو اور عقیدہ پرست بھی۔ یہاں کی تاریخ تھی کہ یہ مندر دھرم شوالہ کے
راجہ شِو نے بنوایا تھا۔ مقامی روایت یہ بھی ہے کہ اس مندر کو پراسرار قوتوں نے تعمیر کیا
تھا۔ یہ قوتیں ان دیکھی تھیں۔ آس پاس کے باسیوں سے روایت تھی کہ مندر راتوں رات
بن گیا تھا۔ مندر کے ایک نامکمل حصے کے بارے میں خوش عقیدہ لوگ اس وقت یہ کہتے
تھے کہ مندر کی تعمیر ابھی جاری تھی کہ رات ختم ہوگئی اور صبح کا تارہ نکل آیا اور جیسے ہی مرغ

کی آواز فضا میں ابھری وہ پراسرار قوتیں مندر کو ادھورا چھوڑ کر اِندر دوار واپس چلی گئیں اور مندر کا تھوڑا سا حصہ ادھورا رہ گیا۔ اس کے بعد سے آج تک کسی کی اتنی ہمت نہیں ہو سکی کہ ان دُشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزر کر وہ پتھر اوپر لے کر جائے جو وہاں کے ایک ایک چپے میں نصب کئے گئے تھے اور مندر کا یہ حصہ مکمل کر دے۔

یہ روایتیں دھرم شوالہ کے قرب و جوار کی نچلی آبادیوں میں یا پھر پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والے ان محنت کش اور عقیدت مند لوگوں میں پھیلی ہوئی تھیں جو نجانے کس کس طرح ہمت کر کے بلندیوں تک جاتے اور ان مندروں میں پوجا پاٹ کر کے واپس آتے تھے۔ یہ مندر جو کہ شِو جی کا مندر کہلاتا تھا، اس قدر عجیب وغریب طرزِ تعمیر کا مجموعہ تھا کہ انسان اس میں کھو کر رہ جائے۔ پتھروں کو اس انداز میں نصب کیا گیا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ پتھر آپس میں کسی چیز سے جڑے ہوئے ہیں بلکہ یہ سارے کے سارے فضا میں معلق ہوتے تھے۔ اور بھلا ہندوستان میں رہ کر ایک ایسی جگہ جہاں کبھی کبھی باقاعدہ سرکاری طور پر غیر ملکی وفد آتے تھے اور وہاں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر کے واپس چلے جاتے تھے، ہمدان جمشیدی نہ پہنچیں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

اپنے دلیر بیٹے خاقان جمشیدی کو ساتھ لے کر وہ جب بلندیوں پر اوپر پہنچے اور دھرم شوالہ کی بدھ خانقاہ اور شِو مندر کی زیارتیں کرائیں تو اس کی ویرانی اور وحشت ناکی نے مجھے اس درجے متاثر کیا کہ کچھ دیر کے لئے میری قوتِ گویائی ہی صلب ہو گئی۔ میری آواز حلق میں رُک گئی اور میری آنکھیں مکمل طور پر ہر چیز کو نہ سمجھنے کے باوجود کچھ ایسے عالم میں کھو گئیں کہ خود مجھے بھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔

یہ شام کا وقت تھا اور پرندوں کی مسلسل بولنے کی آوازیں اور ہوا کی نغمہ بار سرسراہٹ سن کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کسی جلتی ہوئی چتا کے گرد مرنے والے کے عزیز مدھم آوازوں میں رو رہے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ والد صاحب نے چھوٹی سی عمر میں مجھے اتنا کچھ دکھا دیا تھا کہ میرا دل اپنے سائز سے بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں دلیری کے بہت سے مظاہرے کر چکا تھا اور سب یہ بات مانتے تھے کہ میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ دلیر ہوں۔ مگر اس وقت یہی دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ یہ بات بھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے والد مجھے دنیا کا بہادر ترین آدمی دیکھنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اس بات کا اظہار بھی کتنی ہی بار مجھ سے کر بھی دیا تھا۔ اس لئے بس شرما

حضوری میں ان سے یہ جملے نہ کہہ سکا کہ بابا جان واپس چلئے۔ بلکہ میں اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میری تربیت جنگلوں میں ہوئی تھی اس کے علاوہ میری رگوں میں جنگجو نسلوں کا خون دوڑ رہا تھا اور پھر میرے پاس میری اپنی بائیس بور کی رائفل بھی تھی جو مجھے اسی سال تحفے کے طور پر دی گئی تھی۔ میں نے ان تمام چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ بہرحال ہم دونوں چڑھائی کی وجہ سے دھرم شالہ تک پہنچتے پہنچتے پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ میں تو خیر جو کچھ بھی تھا لیکن والد صاحب جو بڑے سے بڑے پُرخطر راستے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ہانپنے لگے تھے۔ وہ مجھ سے آگے اپنی بندوق کے کندھے سے جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سرخ رنگ کی پہاڑی چوٹیوں پر سورج کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ مندر کے بلند و بالا کلس پر جہاں بھی ذرا سی سائے دار جگہ ملی تھی وہاں شہد کی مکھیوں نے چھتے بنا رکھے تھے جن سے نجانے کب سے شہد اور موم گرتا رہا تھا اور گہرے سرخ رنگ کے پتھروں پر ڈراؤنی شکلیں بن گئی تھیں۔

مندر کے صدر دروازے تک پہنچنے کے لئے سرخ پتھر ہی کی تقریباً پچاس سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں جن پر صدیوں کی بارش اور دھوپ نے ہلکی ہلکی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ یہ تھا اس مندر کا حدود اربعہ جسے دیکھ کر دل پر شدید وحشت طاری ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر پتھر میں کوئی چہرہ پوشیدہ ہو اور نہ معلوم اور نظر نہ آنے والی نظریں آنے والوں کا جائزہ لے رہی ہوں۔ میں مہم جوئی کے جوش میں بھاگ کر چار چھ سیڑھیاں چڑھ گیا تو بابا جان نے چیخ کر مجھے آواز دی۔

''خاقان! رُکو...... رُک جاؤ۔ رُکو......'' اُن کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرے قدم رُک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، انہوں نے رائفل کا سیفٹی کیچ اتار لیا تھا اور فائر کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ باپ کی اس آواز کو میں نے غیر معمولی سمجھا اور آہستہ سے الٹے پیروں چلتا ہوا ان کے برابر جا پہنچا۔ میں ابھی ان سے کوئی سوال ہی کرنے والا تھا کہ انہوں نے ایک انگلی اٹھائی اور پھر آہستہ سے بولے۔

''پیچھے...... پیچھے......'' میں نے پلٹ کر دیکھا، ہماری پشت پر پیپل کا ایک پرانا تناور درخت تھا۔

''ہری اپ۔'' بابا جان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ مطلب یہ تھا کہ میں درخت پر چڑھ جاؤں۔ میں نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور پھرتی سے درخت پر چڑھنے لگا۔ ان تمام چیزوں پر مجھے عبور حاصل تھا اور میں کہیں بھی مار نہیں کھاتا تھا۔ بابا جان کی محنت نے اور میرے شوق نے مجھے آتش بنا دیا تھا۔ بہرحال میں درخت پر چڑھ گیا اور پھر درخت کی ایک شاخ پر چڑھ کر میں نے دیکھا کہ بابا جان سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے صدر دروازے میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں شدید حیرت کا شکار تھا۔ میں نے مندر کے پتھریلے فرش پر ان کے قدموں کی آواز دور ہوتے ہوئے سنی اور اس کے بعد چڑیوں کی گونج اور ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ مجھے کوئی دوسری بات نہ سنائی دی۔ میرے لئے یہ انتہائی حیرت کی بات تھی کہ بابا جان نے مجھے خود تو درخت پر چڑھا دیا تھا اور اپنے آپ کو نجانے کہاں لے گئے تھے۔

مجھے درخت پر بیٹھے بیٹھے تقریباً بیس منٹ گزر گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بابا جان کی خبر گیری ضروری تھی۔ اچانک ہی مندر کے اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور اس آواز کے ساتھ ہی بے شمار ابابیلیں اور چمگادڑیں شور مچاتی ہوئی اڑیں اور غولِ بیابان کی شکل میں صدر دروازے سے باہر نکلنے لگیں۔ ایک خوفناک شور برپا ہو گیا تھا۔ پرندوں کے چیخنے کی آوازیں اور پھر مندر کی ویرانی۔ ایک لمحے کے لئے ایک بار پھر میرا دل لرزنے لگا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے والد صاحب نظر نہیں آئے۔ اب میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو بڑا غلط ہوا۔ بہت ہی غلط ہوا۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ والد صاحب کی اس قدر طویل گمشدگی نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ یہ کیا ہوا، آخر کیا ہوا؟ میں شدید پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا اور فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بہرحال اس کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے درخت سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہوشیاری کے ساتھ اپنی رائفل سنبھال لی تھی تاکہ اگر کوئی خطرناک صورتحال پیش آئے تو میں اسے سنبھال لوں۔

اسی وقت مجھے ایک تیز روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی مجھ پر پڑی تھی۔ میں نے فوراً رائفل سیدھی کی لیکن پھر مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ والد صاحب ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ

میں موجود برقی ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی تھی۔ انہوں نے میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ لی تھیں اور پھر ہنستے ہوئے میرے پاس آ گئے تھے۔ اندر آ کر انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی واہ خاقان جمشیدی، کیا ڈر گئے؟''

''نہیں، میں ڈرا نہیں تھا۔ لیکن آپ کا اتنی دیر غائب رہنا میرے لئے ذرا سنگین تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے آپ کو کیا صورتحال پیش آئی اور اندر سے فائر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔''

''فائر میں نے ہی کیا تھا۔''

''لیکن کیوں بابا جان؟''

''بس مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔''

''کیسا شبہ ہوا تھا؟''

''مجھے یہ احساس ہوا تھا جیسے اندر کوئی درندہ ہے۔ بس ہلکی ہلکی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں اور اس طرح کی کھرکھراہٹ جو درندے کے نتھنوں سے خارج ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں درخت پر چڑھا دیا تھا اور خود درندے کی تلاش میں اندر گیا تھا۔''

''تو پھر؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس آہٹ اور غرغر کی آواز کیسی تھی۔''

''اب کیا کریں گے؟''

''آؤ یار، ہم کیا بزدل ہیں جو ڈریں گے۔'' ہمدان جمشیدی نے کہا اور میں ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مندر کے سنگیں برآمدوں سے گزرتے ہوئے ہم دیو استھان کی جانب چل پڑے۔ ویران مندر کے فرش پر جابجا لنگوروں کا فضلہ اور چمگادڑوں کی بیٹ پڑی ہوئی تھی۔ ایک تصور یہ بھی ذہن میں تھا کہ ہو سکتا ہے اندر کوئی لنگور ہو جو بابا جان کو دیکھ کر کسی رخنے سے بھاگ نکلا ہو۔ لیکن بہرحال ہم بڑے غور سے دیکھتے چلے جا رہے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہاں کسی خوفناک جانور کے پیروں کے نشان تو نہیں ہیں۔ ایک برآمدے میں پیتل کے بہت بڑے بڑے نقارے نظر آئے۔ ایک نقارے پر کھال منڈھی ہوئی تھی

ہوا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لئے میں رُکا اور میں نے چلتے چلتے ا بندوق کے کنارے سے نقارے پر چوٹ لگائی جس سے ایک ایسی عجیب اور ہولناک آو پیدا ہوئی کہ نا قابل بیان ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے آواز نقارے سے ہی نہیں بلکہ من کے در و دیوار سے ابھر رہی ہو۔ ایک بار پھر سردی کی ایک لہر میرے پورے بدن میں د گئی اور میں نے محسوس کیا کہ میری اس حرکت کو والد صاحب نے پسندیدگی کی نگاہوا سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے مجھے سرزنش بھی کر دی۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ جگہ ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے یہاں کون ہے، کیا ہے، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم سمجھ رہے ہو۔ کہیں سے بھی کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ آؤ۔''

میں نے معذرت آمیز نگاہوں سے بابا جان کو دیکھا تھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا ہم برآمدے سے صحن میں آ گئے اور پھر ٹارچ کی روشنی میں اپنے آپ سے بیس قدم کے فاصلے پر دیو استھان دیکھا۔ تقریباً گیارہ فٹ اونچے اور تیس فٹ چوڑے سنگ مرمر کے چبوترے پر شِو کی مورتی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ دیو استھان پر جگہ جگہ کائی جمی ہوئی تھی اور وقت نے پتھروں میں دراڑیں ڈال رکھی تھیں۔ میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں آپ سے کہ اس وقت اس ماحول اور اس مندر کے اندر کی ہیبت ناکی کو دیکھتے ہوئے عام دلوں کی حرکتیں بند ہو جانا معمولی سی بات تھی۔ وہ بلند و بالا سنگیں مجسمہ جس کی لمبائی چوڑائی کی تفصیل میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں، نا قابل یقین ہیبت کا مالک تھا۔ میں نے بعد میں بہت سے مندر دیکھے لیکن اس مندر کو آج تک نہیں بھول سکتا۔ شِو کی مورتی کو اس آسن میں کسی نے کہیں بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ سیاہ پتھر کی اس مورتی کی اونچائی دیو استھان سے شِو کے مکٹھ تک تقریباً پچاس فٹ تھی۔ ہم دونوں اس دیو ہیکل مجسمے کو دیکھتے رہے۔ عام طور پر دیویوں اور دیوتاؤں پر بت تراش ایک طرح کا ازلی اور ابدی سکون پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ شانت نظر آئیں۔ لیکن شِو کی اس مورتی کے چہرے پر ایک عجیب سی خوفناک کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ میں ان نقوش کے اس عالم کو صحیح الفاظ بھی نہیں دے سکتا۔ بہرحال ہم لوگ پُر ہیبت نگاہوں سے اس مورتی کو دیکھتے رہے۔ اسی وقت والد صاحب کی آواز ابھری۔

''چلو جاؤ...... یہ سیڑھیاں چڑھو اور مورتی کے بائیں جانب جا بیٹھو۔ ہمیں یہ رات

یہیں گزارنی ہے۔ کیونکہ باہر کے ماحول میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا کیفیت ہو گی۔ اور پھر ہم نے کوئی مناسب جگہ اپنے رات کے قیام کے لئے منتخب بھی نہیں کی۔''

میں نے والد صاحب کی ہدایت کے مطابق سیڑھیاں چڑھیں اور مورتی کے زانو کے قریب پہنچ گیا۔ بہرحال رفتہ رفتہ ہر چیز کی حیثیت ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کئی نگاہیں اس مورتی پر ڈالنے کے بعد میرے دل میں خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا چنانچہ میں مورتی کے زانو سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دوسری سمت بابا جان بیٹھ گئے۔ گویا ہم اِدھر اور اُدھر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے درمیان میں مورتی تھی۔ ہمارے سامنے صحن تھا اور اس میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف دالانوں سے چمگادڑیں چیختی ہوئی صحن میں آتیں اور چکر لگا کر پھر سے دالانوں میں چلی جاتیں۔ اب کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چنانچہ بابا جان نے کہا۔

''کیا خیال ہے، کچھ کھاؤ گے؟''

''ہاں، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

بابا جان نے اپنا شکاری تھیلا کھول کر کچھ کھانا اپنے لئے نکالا اور کچھ میری طرف بڑھایا۔ کھانے کے بعد بابا جان نے کہا کہ جب ہم نیچے کیمپ لگا رہے تھے تو ایک شکاری کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ جس آدم خور گلدار کی ہمیں تلاش ہے وہ اسی مندر کے آس پاس گھومتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ اصل میں بات وہی تھی۔ مجھے یہ شبہ ہوا تھا کہ کہیں یہ گلدار مندر میں تو نہیں گھسا ہوا۔ اس وقت میں نے تمہیں درخت پر چڑھا کر اسی گلدار کو تلاش کیا تھا۔ دیکھو ایک بات کہوں کہ ایک ماہر شکاری کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم نہ ہو جائے بلکہ مکمل طور سے شکار کی طرف سے ہوشیار رہے تا کہ خود شکار نہ بن جائے۔ کیا سمجھے؟ اس بات کو ذہن میں رکھنا۔''

''ٹھیک ہے بابا جان!''

''نیند آ رہی ہے؟''

''ہاں۔ کھانے کے بعد آنکھوں میں غنودگی سی ہوتی جا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر چاہو تو سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔'' میں نے شِو جی کے زانو سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ بابا جان صبح تک جاگتے رہے تھے۔ بہرحال باپ تھے، اولاد کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس گلدار کا خیال بھی ذہن میں

تھا۔

بہرحال جس گلدار کے بارے میں ہمارا یہ خیال تھا اس سے تو ہمارا سامنا نہیں ہو بلکہ وہ تیسرے دن ندی کے گھاٹ پر مارا گیا تھا۔ البتہ اس ہیبت ناک مندر میں ایک رات گزارنے کے بعد میرا ڈر بالکل نکل گیا تھا اور دن کی روشنی میں جب میں نے مندر کو دیکھا تو مجھے یہاں کی فضا بڑی مانوس مانوس سی محسوس ہوئی۔ ہمدان جمشیدی نے نجانے کس مقصد کے تحت یہاں زیادہ وقت قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے بھی اس بات سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مندر کی ویرانی، گمبھیر سناٹے اور شِو کی اس پراسرار مورتی نے نجانے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔

پہلے تو میں اس ہیبت ناک فضا سے بڑا خوفزدہ سا تھا لیکن اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے ذہن کے تار اس مندر کی ویرانی سے منسلک ہو گئے ہوں۔ چنانچہ میں اکثر اس طرف نکل جاتا اور گھنٹوں مندر میں گھومتا رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میں نے اس بدھ خانقاہ کو بھی اندر سے دیکھا تھا۔ مندر سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یہ دونوں جگہیں مجھے ایک ہی محسوس ہوتی تھیں۔ میں اکثر وہاں بھی جا بیٹھتا تھا۔ وقت نے نجانے کیا کیا فیصلے کئے تھے میرے بارے میں۔ خود ہمدان جمشیدی نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ ہونا تھا اور جب کچھ ہونا ہوتا ہے تو اس کے لئے ایک فضا ضرور بنتی ہے۔ مجھے اسی جگہ خراب ہونا تھا اور وقت نے میری تقدیر میں یہی کچھ لکھ دیا تھا۔

وہ دن جب میری زندگی میں ایک نئے رُخ کا آغاز ہوا بظاہر ایک عام سا دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، میں مندر میں پہنچا اور حسب معمول دیو استھان کی سیڑھیاں چڑھ کر شِو کی مورتی کی گود میں جا بیٹھا۔ حالانکہ میرا اس سے نہ کوئی رابطہ تھا نہ میرے عقیدے کے مطابق وہ کوئی حیثیت رکھتا تھا۔ ماں اور دادی اماں نے مذہب کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا اور سکھایا تھا وہی میرے لئے مذہب کی بنیاد تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ باپ کی طرف سے مذہب کی طرف زیادہ رغبت نہ ہونے کی وجہ سے میں کبھی اس بارے میں نہیں سوچتا تھا بلکہ ایک خالص دنیا دار انسان تھا بلکہ انسان تھا بھی کہاں۔ ابھی تو میری ذہنی نشوونما ہو رہی تھی۔ شِو کی اس مورتی کی گود میں بیٹھ کر نجانے کیوں مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔ غالباً یہ وہاں کے ماحول کی ٹھنڈک اور دل سے اس پُرہیبت

جگہ کا خوف نکل جانے کی وجہ سے تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں سو گیا۔ چونکہ دوپہر کا وقت تھا اور باہر گرمی تھی لیکن یہاں اندر کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ اسی نیم غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قدموں کی کوئی چاپ کہیں دور سے دیو استھان کی جانب بڑھ رہی ہے۔ لکڑی کے کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ۔ یقینی طور پر کوئی شخص دیو استھان کی طرف آ رہا تھا۔ جب یہ آہٹ بالکل قریب پہنچ گئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے گیروے رنگ کا لبادہ پہنے ایک بلند و بالا قد و قامت کا آدمی حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور چہرے پر ایسی وحشت، ایسا خوف یا پھر شاید میں اس کی اس کیفیت کو صحیح الفاظ نہیں دے پا رہا، بس ایک شدید حیرت اس کے چہرے پر تھی۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ کوئی یاتری ہے اور شِو جی کے درشن کو آیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ایک نامعلوم سے خوف کا احساس ہوا۔ میں گھبرا کر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا تھا کہ آنے والے نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے میرے پیر چھوئے اور پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے منڈھے ہوئے سر پر رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور عجیب والہانہ انداز سے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر گر گیا۔ وہ جذبے کی شدت سے کانپتی آواز میں ایک ہی فقرہ بار بار بڑبڑا رہا تھا۔

''بودھی ستو...... بودھی ستو...... بودھی ستو......''

میں جو بہت نڈر تھا نجانے کیوں اس وقت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میرے بدن میں لرزشیں تھیں۔ ویسے بھی اتنی عمر نہیں تھی کہ ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہو جاتا۔ بے شک ایک شکاری باپ کا نڈر بیٹا تھا لیکن ماحول کا اثر تو ہر انسان پر ہوتا ہے۔ میں مندر میں بالکل تنہا تھا اور چالیس بیالیس سال کا یہ شخص گیارہ بارہ برس کے ایک لڑکے کو سجدے کر رہا تھا۔ دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں، یا تو یہ شخص بالکل پاگل ہے یا پتہ نہیں اسے کیا ہوا ہے۔ ویسے پاگلوں سے مجھے ہمیشہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ میرا رنگ زرد پڑ گیا اور پھر میں پوری تیزی سے اٹھا تاکہ دیو استھان کے اونچے چبوترے سے کود کر باہر بھاگ جاؤں۔ لیکن وہ شخص مجھ سے کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ سجدے سے اٹھا اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور پھر اپنا سر ان پر رکھ دیا۔ سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی میں خوف کی اس شدت سے پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا اور نہ اس کے

بعد۔ میں نے خدا سے ہمیشہ یہ دعا مانگی ہے کہ پھر سے اس خوف کا شکار نہ کرے۔

چند لمحوں کے بعد اس شخص نے میرے پیروں سے اپنا سر اٹھایا اور چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔

"لوکھ ناتھ...... دھم راج، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ کہہ دیجئے کہ آپ ہی بودھی ستو وسکو پالی ہیں۔ آپ ہی ہمیں نجات دلانے والے ہیں۔ ہمارے پانچویں اور آخری بدھ مہتر بدھ ہیں۔ کہہ دیجئے بودھی ستو...... مان لیجئے ہماری بات...... مان جائیے بودھی ستو۔" وہ عجیب طرح کی والہانہ خوشیوں اور غمناک کیفیتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔

"دیکھو...... تم نجانے کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں تو خاقان جمشیدی ہوں۔ اپنے بابا جان کے ساتھ شکار کھیلنے آیا ہوں۔" میں نے بمشکل کانپتی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ گیروے کپڑے پہننے والا اس طرح مسکرایا جیسے اسے مجھ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس نے ہولے سے کہا۔

"بودھی ستو...... آپ شکاری ہیں اور اگلے پچھلے تمام جنموں کی آتمائیں آپ کا شکار ہیں۔ میں گاشر برم کے مہان بھکشوؤں کا سیوک سندھورتی ہوں۔ سادھوانی ہوں۔ آپ کے شرن میں آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور ہاتھ آگے باندھ کر جھکا اور آنکھیں بند کر کے نجانے کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ ایک عجیب سی لے میں اس نے کہا۔ جو الفاظ میری سمجھ میں آئے وہ یہ تھے۔

"تواں...... شرنا...... گچھامی......" مجھے بعد میں یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ بدھ مت کے مقدس کلمات میں سے ہیں اور اس کے معنی ہیں کہ میں بدھ کی پناہ میں آتا ہوں۔

گیروے کپڑے والے اس شخص کی حرکتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ یقیناً پاگل ہے۔ لیکن یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ یہ شخص عام پاگلوں سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر عام پاگل مارنے دوڑتے ہیں جبکہ وہ مجھے سجدے کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا خوف کم ہونے لگا۔ اس کی حرکتوں پر مجھے ہنسی سی آنے لگی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بدھاں...... شرنا...... گچھامی کا ورد کرتا رہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" میری آواز سن کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر خوب تیز

دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اتنی دیر میں ہی وہ شخص پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔

"آؤ باہر چلتے ہیں۔ پیپل کے نیچے سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں۔" میں نے اس سے کہا تو وہ اپنا جھولا اٹھا کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے جھٹ سے اپنی گیروے رنگ کی چادر بچھا دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر جھک گیا۔ وہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اب مجھے اس سارے کھیل میں مزہ آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بادشاہ ہوں اور میرے سامنے میرا غلام ہو۔ میں بڑے رُعب کے ساتھ سیڑھیوں پر ٹیک لگا کر چادر پر بیٹھ گیا اور اپنے پیر پھیلا دیئے۔ سندھورتی میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے جوتے کے بند کھولے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی گٹھڑی سے لکڑی کی ایک پلیٹ اور پانی کا عجیب سا برتن نکالا اور پھر اس نے بڑے اہتمام سے میرے پاؤں دھونا شروع کر دیئے۔ پیر دھو کر اس نے لکڑی کی پلیٹ اٹھائی اور میری طرف پشت کئے بغیر سیڑھیوں سے اتر کر وہ پانی پیپل کی جڑ میں ڈال دیا جو میرے دھلے ہوئے پیروں سے پلیٹ میں بھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جا رہا ہے۔ شاید وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ پہلے کی طرح میرے قدموں میں آ بیٹھا۔ ایک بار پھر اس نے گٹھڑی میں ہاتھ ڈالا اور پیپل کے پتوں کا ایک دونا نکالا جس میں دو بھنے ہوئے شکر قند تھے۔ اس نے انہیں احتیاط کے ساتھ چھیل کر بڑی تعظیم سے میری طرف بڑھایا۔ شکر قند مجھے ہمیشہ سے بہت پسند تھے۔ میں نے اس وقت تکلف نہ کیا۔ ہلکی ہلکی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر شکر قند پلیٹ میں سے اٹھایا اور اس سے کہا۔

"تم بھی کھاؤ سندھورتی۔" اس نے دوسرا شکر قند اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگایا اور محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس بات کا منتظر تھا کہ میں کھانا شروع کروں تو وہ بھی کھائے۔ میں نے شکر قند کھایا۔ بڑا میٹھا اور بڑا لذیذ تھا۔ بہر حال یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس کھیل میں اب بادشاہ اور وزیر سے بھی کہیں زیادہ لطف آنے لگا تھا۔ پھر اس نے مجھے لکڑی کے ایک پیالے میں نہایت ادب سے پانی پیش کیا۔ پانی پینے کے بعد میں نے سوچا کہ کھیل بہت ہو چکا۔ اب مجھے اپنے کیمپ میں واپس چلنا چاہئے کیونکہ بہر حال والد صاحب بھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہر چند کہ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے مجھے ہر طرح کی آزادی بھی دی تھی۔ لیکن حد سے

زیادہ آزادی بھی خطرناک چیز ہوتی ہے اور انہوں نے پہلے بھی مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ اس جنگل میں اور ان خانقاہوں میں جنگلی جانور آزادی سے چلے آتے ہیں۔ کیونکہ یہاں انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کسی بھی وقت کوئی جنگلی درندہ اس ہولناک مندر میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ احتیاط رکھی جائے۔ اس وقت بھی میں خالی ہاتھ ہی چلا آیا تھا ورنہ عام طور سے میری رائفل میرے ساتھ ہوتی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بولا۔

''کیا آپ جانا چاہتے ہیں مہاراج؟''

''ہاں، مجھے بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''تو اسے...... ساؤتھافی! اے پرمپر ماتما، اے بودھی ستو، جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونا ہے وہ سب آپ جانتے ہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ نیدھان کتھا مہاودھان ستھ میں لکھا ہوا ملا ہے اور گاشر گرن کے مہان بھکشوؤں نے بھی اسی طرح بتایا ہے۔ میں تو بس ایک دوہرانے والا ہوں اور میں دوہراتا ہوں کہ مہامایا دیوی کے ہاں جب ولادت ہونے والی تھی تب انہوں نے اپنے میکے جانے کی خواہش ظاہر کی اور آپ کے مہان پتا نے ان کا کہا مان لیا اور اپنی راجدھانی سے سونے کی پالکی میں ان کے میکے تک بٹھا کر لے گئے۔ راستے میں لمبی کے جنگل میں شال کے ایک پیڑ کے نیچے مہا مایا نے آپ کو جنم دیا۔ جے مہا وستو...... جے مہاپردھانی...... اے مقدس راجکمار، مقدس کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ پھر گاشر گرن کے مہان بھکشوؤں نے بتیس جسمانی نشانیاں بتائیں۔ جو یا تو چکروتی راجاؤں میں ہوتی ہیں یا گیانیوں میں۔ اور وہ نشانیاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے آپ کے جنم کے بارے میں جو کچھ کہا، آپ بتا دیجئے کہ وہ ایسا ہی ہے۔ ایسا ہی ہے مہاراج۔''

اتنا کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سر جھکا کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے میرے جواب کا منتظر ہو۔ چند لمحات خاموشی رہی۔ مجھے اپنی پیدائش کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سارا چکر کیا ہے۔ یہ شخص یا تو کوئی جوتشی ہے یا بابا جان کے جاننے والوں میں سے کوئی۔ اور یہ میری پیدائش کے بارے میں ساری باتیں معلوم کر کے آیا ہے۔ مگر یہ چاہتا کیا ہے؟ یا تو یہ کہ مجھ سے کچھ پیسے اینٹھنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میری پیدائش کے واقعات کچھ اس طرح عجیب تھے کہ آج گیارہ بارہ برس ہونے کے بعد بھی ہماری جاگیر کے ہر چھوٹے بڑے کو یہ

واقعات معلوم تھے۔ ویسے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان واقعات کو سب سے زیادہ ہوا ہمارے اس ملازم نے دی تھی جو میری پیدائش کے وقت میرے والد صاحب کے ساتھ تھا اور آج بھی وہ ہمارے قریب ہی ہوتا تھا۔ اس نے ان واقعات کی زبردست پبلسٹی کی تھی اور لوگوں کو بتایا تھا کہ زلزلے کے پہلے جھٹکے کے ساتھ میری ولادت ہوئی تھی۔ اصل میں ان واقعات کو اتنا دوہرایا گیا تھا کہ میں اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی ان واقعات کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ یہ سب سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی لیکن میرے ہنسنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح سر جھکا کر کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

''بودھی ستو...... مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے۔ کہہ دیجئے کہ میں نے آپ کے جنم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہی درست ہے۔ میں گوتم بدھ کا ایک بے نام بھکشو اگرچہ کائنات کے وجود کی طرح فانی اور غیر حقیقی ہوں اور اسی سے ساؤدھانی ہوں۔ مگر مجھے زمانوں کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ سو میں سچائی کے بوجھ سے کانپتے ہوئے کہتا ہوں کہ تم بودھی ستو ہو۔ کسوپانی کا زمینی روپ ہو۔ تم ہمارے آخری نجات دہندہ مہتر بدھ ہو۔''

میرا ذہن بھٹکنے لگا۔ اصل میں کچھ الفاظ بار بار کہے جائیں تو ذہن پر نقش سے ہونے لگتے ہیں۔ میں اب بھی آپ کو ایک بات بتاؤں کہ بابا جان نے کسی آدم خور گلدار کے چکر میں یہاں کیمپ لگوایا تھا اور شِو کا ایک غیر آباد مندر اور ایک بدھ خانقاہ یہاں جس پُرشکوہ حیثیت کی حامل تھی وہ شاید انسانی سوچ سے کہیں زیادہ آگے کی چیز ہوں گی۔ لیکن میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت وہاں جنگلی جانوروں کے سوا کچھ نہیں تھا اور یہ بات بھی میں آپ سے کہوں کہ اگر آپ نے گاشر برم نہیں دیکھا تو میں کتنا ہی اس پُرہیبت اور پُرشکوہ خانقاہ کا حال لکھوں آپ کے ذہن تک اس کی عظمت اور ہیبت منتقل نہیں کر سکوں گا۔ بڑی عجیب و غریب جگہ تھی اور یہاں کسی بھی ایسی بات پر ذہن خراب ہو سکتا تھا۔ بہرحال میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور پھر میں نے کہا۔

''دیکھو، میری پیدائش کے بارے میں تم نے جو بات کہی ہے وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن واقعات ذرا بدلے ہوئے ہیں۔ میری پیدائش کے وقت میری ماں جنگل میں شکار کھیل رہی تھی اور میں ایک ایسے کھنڈر میں پیدا ہوا جہاں بس ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا اور میری پیدائش کے وقت زمین بہت زور سے ہلی تھی، تبھی میں اس دنیا میں آیا۔'' میرے ان

الفاظ نے اس شخص پر ایک ہیجان طاری کر دیا۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ اس کے چہرے پر سکون کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور تعظیماً جھک کر بولا۔

''بودھی ستو...... آپ نے کہہ دیا کہ میں سچا ہوں۔ سو میرا کام پورا ہو گیا۔ پر کسی اور کو یہ باتیں معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔ مہا دستو! اب میری یہ آنکھیں کلکتے میں اپنے راجکمار کے درشن کریں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا جھولا اٹھایا اور الٹے قدموں چلتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اترا اور پھر مندر کے آنگن میں اُگی ہوئی خود رو جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

بہر حال اس کے بعد میں کیمپ واپس پہنچ گیا۔ مجھ پر گزرے ہوئے واقعات کا کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔ نجانے کیوں میں نے بھی اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن پر خاصے وقت تک وہ عجیب و غریب شخص سوار رہا تھا۔

آخر کار دھرم شوالہ سے واپسی ہوئی اور ہم ثمرستان جمشید پہنچے تو وہ شخص بالکل میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا جس نے اپنا نام سیوک سندھورتی بتایا تھا۔ سیوک سندھورتی بڑا پراسرار شخص تھا۔ یہ بات تقریباً ایک ہفتے بعد کی ہے جب مجھے یہ بتایا گیا کہ اب میری ماں میری باقاعدہ تعلیم کے لئے مجھے ماموں جان کے پاس کلکتے بھیج رہی ہیں۔ کلکتے کا نام جب آیا تو سندھورتی کا جملہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جو اس نے چلتے ہوئے کہا تھا۔

''اب یہ آنکھیں کلکتے میں مہا دستو کے درشن کریں گی۔''

نجانے کیوں پہلی بار مجھے یہ خیال ہوا کہ گیروے کپڑوں والا وہ بھکشو کوئی عام آدمی نہیں تھا جس نے میری پیدائش کی داستان ذرا مختلف انداز میں بیان کی تھی لیکن جو حقیقت سے قریب تھی۔ وہ میری زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ اب اکثر وہ میرے ذہن میں آنے لگا اور میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ نجانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا کہ وہ کلکتے میں مجھ سے ملنے ضرور آئے گا۔

⁂

حالانکہ میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا تھا اور ہمدان جمشیدی، میرے والد صاحب مجھے اپنے ساتھ شکار میں مصروف رکھتے تھے۔ البتہ والدہ صاحبہ نجانے کیوں تھوڑی سی مضمحل ہو گئی تھیں۔ اب ان کے ذہن میں گھر کا تصور بیدار ہو گیا تھا اور وہ زیادہ تر گھر پر ہی وقت گزارتی تھیں حالانکہ والد صاحب نے بیشتر بار انہیں دعوت دی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ ان کے ساتھ شکار پر چلیں لیکن انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے آپ کو اپنا بدل دے دیا ہے۔ اب مجھے گھر سنبھالنے دیجئے تاکہ میں یہ محسوس کروں کہ میں عورت ہوں۔ اور پھر اماں بھی یہی کہتی ہیں۔''

والد صاحب نے بہت زیادہ زور نہیں دیا تھا حالانکہ میری پیدائش سے پہلے وہ والدہ صاحبہ کے بغیر کہیں جانے کے لئے قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ لیکن اب صورتحال کافی تبدیل ہو گئی تھی۔ میری تعلیم کے سلسلے میں بھی میری دادی جان کی اور میرے والد صاحب کی ایک جھڑپ ہوئی تھی۔ والد صاحب نے کہا تھا۔ ''جی اماں! اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ دولت، زمین، جائیدادیں۔ کئی نسلیں بیٹھ کر آرام سے کھا سکیں گی۔ اور پھر آپ کا پوتا بالکل جاہل تو نہیں ہے، اچھی خاصی تعلیمی حیثیت ہے اس کی۔ آپ امتحان لے لیجئے۔ کیوں اسے بلاوجہ کلکتہ بھیج رہی ہیں؟''

اماں نے آنکھیں نکال کر کہا تھا۔ ''ہمدان، زندگی بھر تو مجھ سے انحراف کرتا رہا ہے، میری ہر بات کو کاٹا ہے تو نے۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ ماں ہونے کا حق ہی چھین لیا۔ یہ غرور کی باتیں ہیں جو تو کر رہا ہے اور میں نے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہوا دیکھا ہے۔ تیرے جیسے مغرور ہی دنیا میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسا نہ کر ہمدان۔ ان زمینوں، جائیدادوں کو سنبھالنے کے لئے بھی ایک تعلیمی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر قانونی داؤ پیچ کو بھی سمجھ سکے۔ تیری مرضی ہے بھائی! کاش تو ہمیں بھی کسی قابل سمجھتا۔''

والد صاحب نے جلدی سے کان پکڑ لئے اور بولے۔ ''بس، بس، بس۔ اور کچھ نہ کہیں۔ میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ چلئے آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

بہر حال کلکتہ جانا تقدیر میں لکھا گیا تھا۔ والد صاحب خود مجھے اس عظیم الشان شہر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ یہاں مجھے ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے اسکول میں پڑھایا گیا۔ ظاہر ہے ارب پتی باپ کا بیٹا تھا اور جس دور کی کہانی میں سنا رہا ہوں اس دور میں ارب پتی بس تقریباً راجے مہاراجے ہی ہوا کرتے تھے۔ ایک اہمیت تھی ارب کی۔ ہوسٹل کے ایک شاندار کمرے میں میرے لئے بندوبست کیا گیا تھا۔ والد صاحب نے جاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''یار! تیری ماں تو اچانک ہی عورت بن گئی۔ حالانکہ میری اس سے دوستی صرف ایک شکاری عورت کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ بہو یار تو اللہ نے مجھے بہت دی ہے لیکن مجھے

پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تو میرا یار بن گیا۔ یار! بات بھی سچ ہی ہے، بے شک اللہ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے لیکن پھر بھی تعلیم بڑی ضروری چیز ہے۔ اس بات کو میں بھی جانتا ہوں اور مانتا ہوں۔ اماں سچ کہتی ہیں۔ میں ان سے منحرف نہیں تھا بلکہ یہ سمجھ لے کہ تجھ سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بہرحال بیٹا! میں آتا رہوں گا۔ تمہیں بھی چھٹیوں میں گھر آنا ہو گا۔ میں نے تمہارے لئے اور بھی بہت سے بندوبست کر دیئے ہیں۔''

یہ بندوبست میرے لئے ایک خوبصورت دو گھوڑوں والی بگھی اور اس کا کوچوان تھا جو میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اسکول کے پرنسپل سے بھی میرے بارے میں بات کر لی گئی تھی۔ بہرحال ایک محبت کرنے والے باپ نے جو کچھ آسانی مجھے فراہم کر سکتے تھے، انہوں نے کی تھی۔

میں اسکول کے ہوسٹل میں رہنے لگا۔ اس کے بعد میرا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ حالانکہ میری باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود میں اپنی ذہانت کے سبب اپنی کلاس میں سب سے تیز طالب علم تھا۔ وقت کس طرح پَر لگا کر اڑتا ہے آپ لوگ بھی جانتے ہیں۔ میرے مشاغل یہاں بہت سے ہو گئے تھے اور میں تیزی سے تعلیمی مراحل طے کر رہا تھا۔ شروع ہی سے جنگلوں میں گھومنے پھرنے اور بابا جان کے ساتھ شکاری مہمات سر کرنے کی وجہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور میں ایک توانا اور چست و چالاک لڑکا تھا۔ چنانچہ کھیل کے میدان میں بھی میرا سکہ بیٹھ گیا۔ فٹ بال میرا پسندیدہ کھیل تھا۔ جب میں میٹرک میں پہنچا تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے اسکول کی ٹیم کا کپتان بن گیا بلکہ کلکتے کے مشہور فٹ بال کلب محمڈن سکیورٹی کلب کے کھلاڑیوں میں حصہ لینے لگا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کیا تھا اور پھر مجھے یہاں کے سب سے اعلیٰ درجے کے کالج میں داخلہ دلوا دیا گیا۔

کالج ایک الگ زندگی کا حامل تھا۔ کلکتہ ویسے ہی انسانوں کا سمندر تھا، یہاں کی زندگی میں بڑی تیزی تھی۔ جبکہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں اس قدر تیز رفتاری نہیں تھی۔ کالج میں، میں نے اپنے جوہر اور دکھائے۔ میں نہ صرف تعلیمی میدان میں تیز ہو گیا تھا بلکہ دوسرے مشاغل بھی بہت عمدہ ہو گئے تھے۔ اور یہیں میری ملاقات کلاڈیا سے ہوئی۔ کلاڈیا بھی اسی کالج میں پڑتی تھی۔ یہ ایک انگریز لڑکی تھی لیکن شلوار قمیض میں ملبوس کالج آیا کرتی تھی۔ اس کے حسن بے مثال کے بڑے چرچے تھے۔ ادھر لوگوں کا

خیال تھا کہ میں کالج کا سب سے حسین نوجوان ہوں۔ چنانچہ کلاڈیا سے میرا موازنہ کیا جانے لگا۔ لیکن کلاڈیا ذرا مغرور قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے حسین ماہ و سال پوری سنجیدگی سے گزارے تھے لیکن حسن و عشق کے چکروں میں نہیں پڑا تھا۔ کلاڈیا کے بارے میں لڑکے مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے لیکن میں ان پر توجہ نہیں دیا کرتا تھا۔ پھر ایک اور دلچسپ سلسلہ شروع ہوا۔ یہ چوپان کا کھیل تھا۔ میرے ایک دوست علی سفیان نے مجھے اس طرف راغب کیا تھا اور میں نے گھوڑے کی سواری شروع کر دی تھی۔ وہ بھی ایک بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور چوپان کلب کا بہترین ممبر۔ چنانچہ مجھے بھی وہاں کی ممبر شپ ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب کلاڈیا کو بھی میں نے چوپان کلب میں دیکھا اور کلاڈیا نے مجھے حیران نگاہوں سے۔ وہ بہت اچھا پولو کھیلتی تھی۔ میں نے خود بھی اس سلسلے میں خاصی مہارت حاصل کر لی اور تھوڑے ہی دن کے بعد میں چوپان کا بہترین کھلاڑی بن گیا۔ ہماری ٹیم الگ تھی۔ کلاڈیا دوسری ٹیم میں کھیلتی تھی۔ اور بھی کچھ لڑکیاں اس کے ساتھ کھیلتی تھیں جن کا تعلق اس کالج سے نہیں تھا۔ پھر ایک بار کلاڈیا سے پولو میچ پڑ گیا۔ میں بھی اس کا مدمقابل تھا اور سفیان بھی۔ ہم نے وہ کھیل پیش کیا کہ دوسری ٹیم کو ہم نے بالکل بھنگی بنا دیا۔ بہرحال کلاڈیا نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا اور خود ہی آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتی ہوں مسٹر خاقان!''

''ارے آپ تو میرا نام بھی جانتی ہیں۔''

''کیوں...... ہم کالج کے ساتھی نہیں ہیں؟ اور کیا آپ میرا نام نہیں جانتے؟''

''ارے کیوں نہیں، جانتا ہوں۔''

''آیئے آپ کو اپنے پپا سے ملاؤں۔'' کلاڈیا کے پپا اور ممی سے مل کر میں حیران رہ گیا۔ کلاڈیا کے والد کرنل صغیر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ برٹش آرمی میں کرنل کا عہدہ رکھتے تھے اور آن ڈیوٹی تھے۔ والدہ کا تعلق انگلینڈ سے تھا اور اس نے اپنا مذہب نہیں تبدیل کیا تھا۔ بڑی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی ان سے اور بڑا تفصیلی تعارف ہوا تھا اور یہ تعارف کلاڈیا کے گھر میں ہوا تھا جو ڈھلکا گلی کے علاقے میں رہتے تھے۔ ڈھلکا گلی کلکتے کے متمول لوگوں کا علاقہ تھا۔ کرنل صاحب بہت خوش اخلاق تھے۔ اسی طرح کلاڈیا کی والدہ ڈینین بھی خوش اخلاق تھیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ بہترین اردو بولتی

تھیں جبکہ کلاڈیا کی اردو بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولتی تھی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ کلاڈیا نے انگلینڈ میں اپنے نانا کے پاس پرورش پائی تھی۔ بچپن ہی سے اس کے نانا نے اسے اپنے پاس رکھا تھا۔ بعد میں نانا کا انتقال ہوا تو وہ ہندوستان واپس آ گئی۔ اس خاندان سے بڑی اچھی دوستی ہوئی اور اب کالج میں بھی کلاڈیا میرے ساتھ نظر آنے لگی۔ لڑکے دبی دبی آوازوں میں ہم پر تبصرے کرنے لگے۔ لیکن یہ سچ بات ہے کہ ایک سفید نسل کی باشندہ ہونے کے باوجود نہ کبھی کلاڈیا نے کسی ہلکے پن کا مظاہرہ کیا۔ اور میں بھی بہرحال اس طرح کا انسان نہیں تھا۔ ابھی میری عمر بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ مجھ سے عمر کے بڑے اور سینئر لڑکے کھیل کے میدان کے علاوہ بھی ہر شعبہ میں مجھے اپنا لیڈر تسلیم کرنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ جب میں شام کو اپنی سفید رنگ کی بگھی میں جس کا کوچوان وہی بنگالی تھا جو شروع سے میرے ساتھ تھا اور جس کے بارے میں ہم سب کہتے تھے کہ وقت اس پر ٹھہر گیا ہے۔ اتنا طویل عرصہ ہو گیا تھا لیکن کلام علی بالکل ویسے کا ویسا تھا جیسا میں نے اسے پہلے دن دیکھا تھا۔ شام کو جب میں اپنی بگھی میں بھرے بازار میں نکل جاتا تو بہت سے حسین چہرے اور نیم وا آنکھیں میری طرف اٹھ جاتیں۔ بنگال کا حسن بہت ہی کم پلٹ کر مردوں کا نظارہ کرتا ہے۔ لیکن میرے معاملے میں یہ روایت الٹ گئی تھی۔ میں بیس بائیس برس کی عمر میں ایسا گبھرو جوان بن گیا تھا کہ اچھے اچھے وجیہہ لڑکے میرے ساتھ چلتے ہوئے گھبراتے تھے۔ میرا قد چھ فٹ دو انچ، شیر جیسی چھاتی، پتلی کمر، لمبے ہاتھ، سرخ و سفید رنگ اور نیلی آنکھیں جن پر لمبی گھنیری پلکیں سایہ کرتی تھیں، نیلگوں مائل، سیاہ گھنگھریالے بال، اونچی اور روشن پیشانی، چیتے جیسی چست چال اور گفتگو کی شیرینی۔ یہ سب چیزیں مردوں تک کو میرا دیوانہ بنا دیتی تھیں۔ پھر عورتیں اور لڑکیاں اگر میرے لئے سرگرداں نہ ہو جاتیں تو اس میں ان کا کیا قصور۔ ویسے آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں، انسان بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ اگر اسے کچھ مل جاتا ہے تو اس پر بہت زیادہ اترانے لگ جاتا ہے۔ میں اترانا تو نہیں تھا لیکن جب میں نگاہوں میں اپنے لئے عجیب و غریب جذبات پاتا تھا تو مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ لیکن ان ساری چیزوں کے برعکس میں حسن و عشق کے جھگڑوں میں اور جنس کے ہنگاموں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میری ان چیزوں پر کوئی ریسرچ ہی نہیں تھی سادہ سادہ زندگی کا مالک تھا۔ حالانکہ میرے دوست مجھے ہر طرح کی

باتیں سمجھاتے تھے۔ کالج کی صرف ایک ہی لڑکی نہیں بلکہ بیشتر لڑکیاں میری طرف قدم بڑھاتی تھیں، میں ان سے بڑی خوش اخلاقی سے ملتا تھا لیکن قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ میرا ذہن ان کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میری تعلیم بی اے فائنل تک پہنچ گئی۔ یہ بی اے کا آخری سال تھا اور امتحان کا آخری دن۔ میں کتابیں بند کر کے سونے کی نیت سے بتی بجھانے اٹھا ہی تھا کہ میں نے برآمدے میں ایک نامانوس سی آواز سنی۔ یہ آواز قریب آئی تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی لکڑی کے جوتے پہنے ہوئے میرے کمرے کی طرف چلا آ رہا ہو۔ اس شاندار کالج میں لکڑی کے کھڑاؤں پہننا ایسا ہی تھا جیسے ملکہ وکٹوریہ کے محل میں تہمد باندھ کر گھومنا۔ کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ میرے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی اور پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں بڑا حیران ہوا تھا۔ ویسے خوف و دہشت سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میری یادداشت بے مثال تھی۔ بچپن تک کی وہ باتیں جو کہ بالکل ہی نوخیز عمر میں ہوئی تھیں، مجھے مستقل طور سے یاد تھیں۔ اور پھر خاص طور سے وہ باتیں جن کا تعلق ہوش کی زندگی سے تھا میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ بے شک ایک طویل عرصہ ہو گیا لیکن اس کے باوجود میں نے سیوک سندھورتی کو صاف پہچان لیا۔ وہ اپنے مخصوص گیروے رنگ کا لباس پہنے میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ارے سیوک تم......''

اُس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ ''جے ہو مہاراج، آپ نے ہمیں پہچان لیا۔''

میری آنکھوں میں دس سال پہلے کا وہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ آ گیا جو گاشر برم میں پیش آیا تھا۔ کسی سحر زدہ انسان کی طرح میں نے سندھورتی کو دیکھا اور پھر ایک دم ہوش میں آ گیا۔

''آؤ...... اندر آ جاؤ۔'' سندھورتی نے بڑے ادب سے گردن خم کی اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ نجانے کس خیال کے تحت میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت میرا سر گھوم کر رہ گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد جب میرے اوسان بجا ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔ ''بیٹھو سندھورتی! تم یہاں اس طرح آ جاؤ گے میں نے کبھی خواب میں

بھی نہیں سوچا تھا۔"

سندھورتی نے معمول کے مطابق دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور گردن خم کر کے مسکرایا۔ پھر بولا۔ "دھرم راج! میں نے کہا تھا نا کہ یہ آنکھیں اپنے راجکمار کو کلکتے میں دیکھیں گی۔"

"ہاں، تم نے کہا تھا۔ بیٹھو بھئی، تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو؟"

"میری یہ مجال نہیں مہاراج کہ آپ کے سامنے بیٹھوں۔ آپ جب تک نہیں بیٹھیں گے، میں نہیں بیٹھوں گا۔" اس نے کہا اور میں آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگا۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

"چلو آؤ بیٹھو۔" یہ کہہ کر میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بہرحال اب بہت ساری باتیں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اب میں گیارہ بارہ برس کا لڑکا نہیں تھا، بائیس برس کا ہوش مند اور ذہین نوجوان تھا اور اب سندھورتی اور اس کی باتیں میرے لئے مذاق نہیں رہی تھیں۔ اس رات مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ان پراسرار اور اُلجھی ہوئی باتوں میں یقیناً کوئی مفہوم پوشیدہ ہے۔ ورنہ یہ شخص اس طرح کی بات کو پتھر کی لکیر نہ بنا لیتا۔ لیکن یہ مفہوم کیا ہے، میں ایک مسلمان لڑکا، ایک اچھے گھرانے کا فرد اور یہ شخص ایک بدھ ودھیارتی۔ یہ مجھے اتنا مقام کیوں دے رہا ہے؟ کیا ہے اس کہانی میں؟ اس وقت تو میں نے اس کی کہانی پر زیادہ غور نہیں کیا تھا حالانکہ اس وقت مجھے گاشر برم اور اس علاقے کی یعنی دھرم شوالہ کی باتیں یاد آتی رہی تھیں۔ شو جی کے مندر میں جو لمحات پیش آئے تھے، اور دیو استھان کے پہلو میں جس طرح اس شخص نے مجھے دیکھ کر نجانے مجھے کیا کیا نام دیئے اور ان ناموں سے وہ مجھے پکار رہا تھا، ان سب کا مفہوم کیا ہے؟ میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے زیادہ موثر اور جامع لہجے میں کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے سیوک سندھورتی! کہ اس وقت جب میری اور تمہاری ملاقات ہوئی تھی، تمہیں یاد ہے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"دس سال آٹھ مہینے اور سات دن مہاراج۔" اس نے جواب دیا۔

"ارے، تم نے اتنی تفصیل سے یہ وقت یاد رکھا؟"

"میں نے تو کم بتایا ہے مہاراج! آپ مجھ سے یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ ایک ایک لمحہ، ایک ایک سیکنڈ میں نے آپ کو کیسے یاد رکھا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ ہے کیا؟ دیکھو، اُس وقت میں بچہ تھا، جو واقعہ پیش آیا تھا میں نے اس پر اتنا غور نہیں کیا تھا۔ بے شک مجھے یہ الفاظ یاد ہیں کہ تم نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اب تم مجھے کلکتے میں ملو گے۔ حالانکہ اس وقت میرا کلکتے آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، میری والدہ نے بعد ہی میں اس کا فیصلہ کیا۔ میں دہلی بھی جا سکتا تھا بلکہ یہ بات گھر میں ہوئی بھی تھی کہ مجھے دہلی بھیجا جائے یا کلکتہ۔ لیکن پھر بزرگوں نے یہی طے کیا کہ مجھے کلکتہ بھیجا جائے کیونکہ ہمارا علاقہ اس سے زیادہ قریب ہے۔ تم نے اس فیصلے سے پہلے ہی مجھ سے کلکتے میں ملنے کی بات کر لی تھی۔ اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

سیوک سندھورتی نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور ہاتھ باندھے ہوئے بولا۔

"بودھی ستو...... میں کیا جان سکتا ہوں۔ آپ جو کچھ ہیں اور کیا بننے والے ہیں وہ سب آپ کو معلوم ہے۔ میں تو کہی ہوئی باتیں دوہرانے والا ایک معمولی سا بھکشو ہوں۔"

"پھر بھی، کم از کم تم مجھے اتنا تو بتاؤ گے کہ کیا بننے والا ہوں میں؟ اور تمہیں یقیناً یہ بات بھی معلوم ہے کہ میرا مذہب ایک مسلمان کا مذہب ہے اور ہم مسلمان لوگ اپنا مذہب کبھی اور کسی شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے سیوک سندھورتی کے چہرے کو دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تغیر رونما نہیں ہوا تھا بلکہ وہی ابدی سکون اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا جو مجھے بڑا عجیب لگتا تھا۔ بالکل یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سنگی مجسمہ ہو جس کا جو تاثر تراش دیا گیا، بس اسی تاثر میں اس کی زندگی گزر سکتی ہے۔ بہرحال میں نے اس سے یہ بات کہی تو وہ اسی پُرسکون لہجے میں بولا۔

"سمے سب فیصلے کرتا ہے مہاراج! سمے سب فیصلے کرتا ہے۔ میں آپ کو کچھ باتیں بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک انوکھی کہانی سنانا شروع کر دی جس کی تفصیل میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا وہ میرے لئے ایک انکشاف سے کم نہیں تھا۔ اگر میں ان سب باتوں کی تفصیل بتاؤں تو ایک طویل تحریر درکار ہو گی۔ بہرحال ان باتوں کا خلاصہ بتائے دیتا ہوں وہ یہ کہ میں یعنی خاقان جمشیدی، مہاتما گوتم بدھ کے بعد آنے والا وہ پانچواں اور آخری بدھ ہوں جس کا بدھ قوم

کوصدیوں سے انتظار تھا اور ان مذہبی کتابوں میں میرا نام مہتر بدھ بتایا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ مہاراج! سمے آنے دیں، وہ کتابیں آپ کے سامنے پیش کر دی جائیں گی اور یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ یہ تصور آپ سے وابستہ کیوں کیا گیا ہے۔ میں حیران پریشان اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اگرچہ میری تربیت مذہبی ماحول میں نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود میں اپنے مذہب کی بنیادی باتیں ضرور جانتا تھا۔ میرے لئے یہ بات انتہائی پریشان کن تھی کہ میں اپنے مذہب کا عام سا انسان نہیں بلکہ درحقیقت کسی دوسرے مذہب کا اوتار ہوں۔ گو عقل میں آنے والی بات نہیں تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ گئی ہو اور وہ اسے اپنا معیار بنا چکا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ بھکشو خود بھی فریب کھا رہا ہے اور مجھے بھی فریب دے رہا ہے تو پھر میرے مستقبل کے بارے مین صحیح پیش گوئیاں کس طرح کر سکتا ہے؟ شِو مندر کی سیڑھیوں پر اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے کلکتے میں ملے گا۔ اور اب کئی برس بعد اس کی پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی تھی اور وہ میرے سامنے موجود تھا۔ جبکہ میرے ذہن میں ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ خدانخواستہ میں اپنے مذہب سے دور ہو جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ میرا خاندان ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔ اور میں بھی اپنے دل میں اس طرح کی کوئی بات نہیں رکھتا تھا۔ یہ بے چینی میرے چہرے پر تھی اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یقیناً یہ شخص کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اس لئے غلط فہمی ہوئی ہو کہ اس وقت میں دیو استھان میں شِو جی کے مجسمے کی آغوش میں لیٹا ہوا تھا۔ کہیں اس بیوقوف آدمی نے یہ تو نہیں سمجھا کہ مجھے پتھر کی اس مورتی نے جنم دیا ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سندھورتی نے کہا۔

''لوکھ ناتھ، آج سے دیبانت کے راستے پر آپ کی یاترا شروع ہوتی ہے۔ آپ کچھ دن بعد پھولا کھانچن کی پہاڑی چوٹیوں پر جائیں گے جہاں رانگا پوری کی پہاڑیوں میں مہان بھکشوؤں میں پرانے دھار کے بھکشو، ویدوان، سارھانی آپ کا راستہ دیکھ رہے ہیں۔ دھم راج، اب یہ آنکھیں اپنے بودھی ستو کو مہان بھکشوؤں کے دھار میں دیکھیں گی۔ اسے میری پیشگوئی نہ سمجھیں، یہ سمے کا دھارن ہے۔''

''پھولا کھانچن! یہ تو ہمالیہ کی چوٹی ہے۔''

''ہاں مہاراج! لیکن سری لنکا سے مشرقی حصے میں سفر کرتے ہوئے آپ کو اس علاقے میں جانا ہو گا اور وہاں سے آپ پھولا کھانچن کا سفر اختیار کریں گے۔''

''بھائی! یہ تو تم نے مجھے ایک ایسی بات بتا دی جو میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا، حیرت کی بات ہے۔''

''مہاراج! سارا سنسار ہی حیرت ہے۔ کون سی چیز ایسی ہے جو منش کے لئے حیرت نہ ہو۔''

بہرحال میں سناٹے میں آ گیا تھا اور اس طرح خیالات میں کھویا تھا کہ مجھے یہ بھی اندازہ نہ ہوا کہ وہ کب اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ یا پھر حقیقت یہ ہے کہ اس کا پراسرار وجود اس طرح میری نگاہوں سے گم ہو گیا جیسے کوئی تصویر سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ البتہ جب میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اسے موجود نہ پا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر دروازے کی طرف دیکھا تو دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی نظر آیا تھا۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ باہر آ کر میں نے راہداری میں دیکھا، کہیں کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ ہر طرف گہری اور مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ میرے پاس آیا تھا تو لکڑی کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ کھٹ بہت دور سے سنائی دی تھی۔ لیکن اس کی واپسی میں یہ کھٹ کھٹ بھی مجھے نہ سنائی دی۔ اور ایک بات اور بھی تھی، برابر برابر دوسرے کمروں کے دروازے بھی تھے۔ یہ ناخوشگوار کھٹ کھٹ سن کر کوئی بھی باہر آ سکتا تھا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میرے علاوہ کسی نے یہ آواز سنی ہی نہ ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آواز کسی کے کانوں تک ہی نہ پہنچی ہو اور وہ سب گہری نیند سو رہے ہوں۔

بہرحال نجانے کیوں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر ایک دوہری شخصیت پل رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے اپنی ہوش کی زندگی سے پہلے دن کی کہانی مجھے اچھی طرح یاد تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گاشر برم کی پہاڑیوں میں شِو مندر میں مجھے یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا جو بہرحال اب میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ لیکن میری یادداشت میں اس کے نقوش موجود تھے اور سیوک سندھورتی کے بھی۔ چنانچہ یہ بڑا عجیب مسئلہ تھا۔ میں سری لنکا جانے والی پیشگوئی پر غور کر رہا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ تمام باتیں اس قدر ہیجان انگیز تھیں کہ میں رات بھر جاگتا رہا۔ حالانکہ دوسری صبح میرا آخری پرچہ تھا جسے بڑی توجہ کے ساتھ مجھے دینا تھا اور اپنا تعلیمی ریکارڈ برقرار رکھنا تھا۔ صبح کو میں بہت دیر تک ٹھنڈے پانی کے نیچے بیٹھ کر اپنے دماغ کو سکون دیتا رہا۔ رات بھر کی جگار آنکھوں میں سرخی کی شکل میں اتر آئی تھی۔ میرے دوستوں نے مجھ سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آج کے پرچے پر تم نے بہت زیادہ توجہ دی ہے۔ ورنہ تمہاری آنکھوں میں یہ سرخ رنگ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اب ان لوگوں کو میں کیا بتاتا کہ اس سرخ رنگ کی کہانی کیا ہے۔ بہرحال دوسرے دن میں امتحان سے فارغ ہو گیا۔ بمشکل تمام میں نے پرچہ دینے کے دوران اپنی انتہائی قوتِ ارادی سے کام لے کر ان باتوں کو ذہن سے دور کیا تھا جنہوں نے میرے سکون کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ بدھ بھکشو ایسی عجیب و غریب باتیں کر کے گیا تھا کہ میرے دن کا سکون اور رات کی نیندیں غائب ہو گئی تھیں اور اس طرح حقیقت یہ ہے کہ میری زندہ دلی اور کھلنڈرے پن میں بھی فرق آیا تھا۔ حالانکہ میں نے سوچا تو یہ تھا کہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ خوب سیر و سیاحت کروں گا تاکہ میرے دل میں ان کے لئے کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ اس کے بعد گھر جا کر ماں باپ کی محبت کا لطف اٹھاؤں گا۔ غرض یہ کہ اب اچانک ہی دل و دماغ پر ایک عجیب سی کھولت سوار ہو گئی تھی جسے دوسرے لوگوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس دن بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اپنے گھر روانہ ہو جانا چاہئے، یہاں طبیعت لگ نہیں رہی تھی۔ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے کہ کرنل صغیر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے ہوسٹل پہنچ گئے تھے۔ یہ اچھے آدمی تھے اور میں ان سے دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ کلاڈیا کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں پیدا ہو پائی تھی جبکہ میں بہت سی بار دیکھ چکا تھا کہ کلاڈیا میری طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ابھی میں حسن و عشق کے ہنگاموں میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔ کرنل صاحب نے کہا۔

"بھئی! اس وقت تو ایک غرض سے آیا ہوں میں تمہارے پاس۔ ویسے یقین کرو مجھے تمہارے پاس آنے میں کوئی عار نہیں تھا۔ اصل میں پولو کا ایک میچ پڑ گیا ہے اور ہمارے درمیان خوب ٹھن گئی ہے۔ یہاں ایک صاحب جو فوجی ہیں، رانا کرتار سنگھ۔ انہوں نے اپنی ٹیم بنائی ہوئی ہے اور بڑے دعوے کرتے پھر رہے ہیں۔ ان دنوں ہمارے اور ان کے درمیان میچ پڑ گیا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہماری ٹیم میں شامل ہو جاؤ۔ دیکھو انکار مت کرنا۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ تمہارے پاس آیا ہوں۔"

کرنل صغیر صاحب کی شخصیت کچھ اس طرح کی تھی کہ میں نے حامی بھر لی۔ ویسے بھی

ذہن سے یہ گرد جھٹکنا چاہتا تھا جو اس طرح مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہرحال کرنل صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اسی شام مجھے اپنے گھر دعوت دے ڈالی۔ وہاں کلاڈیا سے ملاقات ہونا فطری بات تھی۔ کلاڈیا نے خوش دلی سے کہا۔

"میں جانتی تھی مسٹر خاقان! کہ آپ اپنے نام کی طرح بڑے آدمی ہیں اور یقیناً ہماری دوستی کو نہیں ٹھکرائیں گے۔"

"آپ کی کوٹھی بڑی خوبصورت ہے کلاڈیا۔"

"آیئے، میں آپ کو دکھاؤں۔" کلاڈیا نے کہا اور پھر اس نے مجھے اپنی کوٹھی دکھائی۔ لیکن میں اس وقت اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا جب اس نے مجھے اپنی لائبریری دکھائی۔ چھوٹی سی لائبریری تھی لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس لائبریری میں خاص طور سے بدھا کا مجسمہ اور بدھ مذہب سے متعلق بے شمار کتابیں نظر آئیں۔ میں حیرت زدہ نگاہوں سے ان کتابوں کو دیکھتا رہا تو کلاڈیا میرے قریب آ کر بولی۔

"آپ کو بدھ تعلیمات سے دلچسپی ہے؟" میں نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے کلاڈیا کو دیکھا اور کہا۔

"یہ کس کا شوق ہے؟"

"میرا۔"

"کیا مطلب؟"

"بتاؤں گی تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"نہیں کلاڈیا! میں واقعی بدھ مت سے کافی دلچسپی رکھتا ہوں۔ تم مجھے اس بارے میں بتاؤ۔"

"سچ کہوں، کوئی دس سال پہلے کی بات ہے، تم سمجھ لو میری عمر کیا ہو گی۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ نیم خوابی کے عالم میں جاگ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو اور پھر مجھے عجیب و غریب الفاظ سنائی دیئے۔

"کیسے......؟" میں نے سحر زدہ لہجے میں پوچھا۔

"وتھاں...... استو...... کرم کردھانی...... اپنی جگہ سے اٹھو، ہمارے ساتھ آؤ۔ نجانے ان الفاظ میں کیا قوت تھی، میں اپنی جگہ سے اٹھی۔ یہ بہت بڑا سچ ہے خاقان! نہ تو مجھے

پاگل سمجھنا نہ جھوٹا۔ میں عالم ہوش میں تھی لیکن اس طرح کہ مجھ پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے میرے دونوں بازو پکڑ رکھے ہوں اور مجھے کشاں کشاں کہیں لئے جا رہے ہوں۔ میں اپنے بیڈ روم میں ہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ میری ہمیشہ کی عادت ہے۔ لیکن وہ بند دروازہ میرے لئے خود بخود کھل گیا۔ میں باہر آئی اور راہداری طے کر کے پائیں باغ میں آ گئی۔ اور اس کے بعد کوئی مجھے، میرا مطلب ہے وہ نادیدہ ہاتھ جو میرے بازو پکڑے ہوئے تھے، مجھے ساتھ لئے ہوئے ایک طویل سفر طے کرانے لگے۔ پھر مجھے ایک گھر کے سامنے لے جایا گیا۔ یہ بھی خالی گھر تھا۔ مجھے اس کے دروازے کھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ایک دیوار کے پاس جا کر مجھے ایک تہہ خانے میں اتارا گیا اور تہہ خانے میں ایک عظیم الشان کتاب رکھی ہوئی تھی۔ اس کتاب کی بلندی کوئی پندرہ فٹ کے قریب تھی اور اس کے کنارے کنارے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح سے اس کتاب کی لمبائی بھی کوئی پچیس فٹ کے قریب ہو گی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے اوپری سرے پر بدھا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مجھے ان سیڑھیوں سے گزار کر اوپر لے جایا گیا تھا۔ پھر کچھ نادیدہ ہاتھوں نے اس کتاب کی جلد کھولی اور مجھے سیڑھیوں سے اتار کر اس کے ورق پر اتار دیا۔ کتاب کے ورق میں ایک دروازہ تھا، اس دروازے سے مجھے اندر لے جایا گیا اور اس کے بعد میں نے ایک عجیب وغریب دنیا آباد دیکھی۔ ایک انوکھا مندر جہاں بدھ مت کے پیروکار پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔ بدھ کی سونے کی مورتیاں چاروں طرف ایستادہ تھیں۔ ان مورتیوں سے پیلی روشنی پھوٹ رہی تھی اور عجیب وغریب سازوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان سازوں کی آوازوں میں ایسا سحر تھا کہ آج بھی میں اسے اپنے وجود میں محسوس کرتی ہوں۔ مجھے اس عظیم الشان مندر کی مکمل سیر کرائی گئی اور اس کے بعد مجھے وہاں سے واپس لے آیا گیا اور میں اپنے بستر پر سو گئی۔ لیکن دوسری صبح میرا سارا وجود تھکا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ رات کو میرے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ بہرحال میں اسی کرید میں لگ گئی۔ میں نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی کہ میرا دوسرا انتہائی شوق بدھ تعلیمات کے بارے میں تعلیم حاصل کرنا ہے۔ بدھ کا یہ مجسمہ میں نے جان بوجھ کر اچھی طرح ہوش وحواس کے عالم میں خریدا ہے اور اکثر کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر میں اس مجسمے کا جائزہ لیتی ہوں اور یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میرا تو اس مذہب اور دین سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر میری

طرف یہ کوشش اور کارروائی کیوں ہوئی ہے؟ اس سلسلے میں یہ ساری کتابیں بھی خریدی ہیں۔ یہ ہے ان کتابوں کی یہاں موجودگی اور بدھ کے اس مجسمے کی موجودگی کی کہانی۔"

میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نجانے کیوں پہلی بار مجھے کلاڈیا سے ہلکا سا تعلق محسوس ہوا۔ بس اتنا سا تعلق کہ میری اور اس کی مشکل ایک ہی تھی۔ پتہ نہیں کلاڈیا کا ان معاملات سے کیا تعلق تھا مگر میں نے عقل سے کام لے کر اپنی کیفیت کا اس پر اظہار نہیں کیا۔ البتہ میں نے اس سے کہا۔

"کلاڈیا! میں خود بھی بدھ مت سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں تمہاری ان کتابوں کا کبھی کبھی مطالعہ کر لیا کروں؟"

"ہاں ضرور، کیوں نہیں؟ مجھے تو خوشی ہو گی۔"

"میں ان میں سے کچھ کتابیں لے جاؤں گا۔"

"کیوں نہیں۔ میں تمہیں بہترین کتابیں دیتی ہوں جن میں ان کے عقائد لکھے ہوئے ہیں۔"

بہرحال یہ ایک عجیب وغریب بات تھی کہ مجھے میری من پسند چیزیں مل گئی تھیں۔ کلاڈیا سے میں نے دو کتابیں لیں اور ساری رات اور سارا دن ان کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے ان کتابوں کو پڑھ ڈالا لیکن ان کتابوں نے مجھے مزید اُلجھن کا شکار بنا دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ سیوک سندھورتی نے مجھے جو تفصیلات بتائی تھیں ان کا بدھ مت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے جن عقائد کا اظہار کیا تھا وہ بدھ مت کے بنیادی فرقوں کے عقائد سے نہ صرف یہ کہ مختلف تھے بلکہ بدھ مذہب کے کافی خلاف تھے اور بہت سی جگہ ایسی تفصیلات بتائی گئی تھیں جن میں ان عقائد کی شدید مخالفت کی جاتی تھی اور اسے بدھ مت کے خلاف ایک بدترین سازش قرار دیا جاتا تھا۔ یہ ایک اور نئی کہانی تھی جو میرے چھوٹے سے ذہن تک پہنچی۔ حالانکہ میں ان تمام چیزوں سے بالکل الگ انسان تھا۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیوں میری زندگی سے منسلک ہوتا جا رہا تھا۔

بہرحال یہ پراسرار عمل جاری رہا۔ کلاڈیا کے ساتھ چوپان کی مشق ہوئی تھی۔ اور پھر ہمارا میچ ہوا۔ رانا کرتار سنگھ کی ٹیم ہمارے مقابلے میں بہت کمزور ثابت ہوئی۔ اس کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے اور ہم نے انہیں نچا مارا۔ کلاڈیا کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ رانا صغیر بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ بڑی شاندار قسم کی ضیافتیں

ہوئیں۔ بڑی پذیرائی ہوئی۔ میرے کھیل کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ سارے کام اپنی
تھے لیکن جو کچھ میرے ذہن میں پل رہا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔

بہر حال میں نے ابھی تک ان باتوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اصل میں ا
مجھے ان پراسرار واقعات سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ سیوک سندھورتی نے بہت عر
پہلے کہا تھا، اس وقت جب میں شِو مندر میں موجود تھا، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ا
ہماری کلکتے میں ملاقات ہوگی۔ اور کلکتے میں ہماری ملاقات ہوگئی تھی۔ اب دوسری با
اس نے یہ کہی تھی کہ میری اس سے ملاقات پھولا کھانچن میں ہوگی تو میں دیکھنا چاہتا
کہ اس کی یہ پیشگوئی کیسے پوری ہوتی ہے۔

پھولا کھانچن کے بارے میں مجھے مکمل تفصیلات تو نہیں معلوم تھیں لیکن ان دنو
معلومات حاصل کرتے ہوئے مجھے اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ سری لنکا سے کچھ ا
راستے اختیار کرنا ہوں گے جن سے پھولا کھانچن تک کا سفر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن
کس طرح، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ مجھے سری لنکا کے راستے پھو
کھانچن آنا ہے۔ بظاہر تو اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی دل نجانے کیو
ایک عجیب سے احساس کا شکار ہونے لگتا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں کچھ پراسر
قوتوں کا کھلونا بن گیا ہوں اور وہ مجھے اپنی مرضی اور اپنے اشارے پر چلا رہی ہیں۔

گھر سے دو تین بار خبر آچکی تھی کہ مجھے گھر واپس آنا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بات معلو
تھی کہ میں اپنا آخری پیپر دے چکا ہوں اور اب مجھے آ جانا چاہئے۔ لیکن بہر حال میر
نے کچھ عرصے کے لئے معذرت کر لی تھی۔ اس دوران ان تحقیقات میں اور میچ کے مسا
میں کافی دن گزر گئے۔

آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اب گھر جانے کی تیاری کرنی چاہئے۔ چنانچہ میر
نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ میرے دماغ پر اب پہلے جیسا بوجھ نہیں رہا تھا او
میں سوچ رہا تھا کہ بابا جان کے ساتھ مہینے ڈیڑھ مہینے تک جنگلوں میں گھوموں گا تو ب
پریشان خیالی بھی دور ہو جائے گی۔ پھر میری روانگی میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا کہ اچانک
ہی مجھے محمڈن اسپورٹنگ کلب کا ایک عہدے دار نظر آیا جو میری ہی جانب آ رہا تھا اس
نے مجھے سلام کیا اور بولا۔

''سر! آپ کو منیجر صاحب نے یہ خط بھیجا ہے۔''

میں نے حیرانی سے لفافہ کھولا تو اس کے اندر سے ایک پرچہ نکلا۔ منیجر صاحب نے
بڑی عاجزی سے لکھا تھا۔

''مسٹر خاقان!

آپ ہمارے کلب کے بہت ہی شاندار رکن رہے ہیں اور کلب آپ پر
اپنی مصروفیات کا حق سمجھتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ بہت ہی محبت بھرے انداز
میں آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ ہمارے ساتھ آپ سری لنکا کا سفر کیجئے۔
آپ کی ٹیم چار دن کے بعد سری لنکا جا رہی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس
وقت ہمیں آپ کی شدید ضرورت ہے۔ آپ کو اس ٹیم میں شامل کر لیا گیا
ہے اس یقین کے ساتھ کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ فٹ بال کے ایک
عظیم کھلاڑی کی حیثیت سے ہم آپ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ آپ ہماری
دعوت قبول کر لیں گے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمڈن کلب بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا اور فٹ بال کی
اتنی بڑی ٹیم میں میری شمولیت میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھی۔ لیکن اس خط کو پڑھنے کے
بعد نہ تو مجھے اعزاز کا خیال آیا اور نہ ہی سری لنکا جانے کی خوشی تھی۔ بلکہ میرے کانوں
میں سیوک سندھورتی کی آواز گونج رہی تھی۔

''دھم راج! اب یہ آنکھیں اپنے بودھی ستو کو مہان بھکشو کے دھار میں دیکھیں گی۔''

میں پوری جان سے لرزنے لگا۔ سری لنکا...... سری لنکا...... پھولا کھانچن...... رانگا
پوری۔ یہ الفاظ میری آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ دوسری طرف اسپورٹس کلب کا رکن
میرے جواب کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔

''سر! منیجر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کا جواب لے کر آؤں۔''

نجانے کیوں میرے ارادے کے بغیر میرے منہ سے نکل گیا۔

''ٹھیک ہے...... میں چلوں گا۔''

☆☆☆

جو کچھ ہوا تھا، میں پورے اعتماد کے ساتھ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں میر سوچ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنے بڑے کلب کی طرف سے ف بال کے ایک عظیم کھلاڑی کی حیثیت سے دعوت ملنا بہت بڑی بات تھی۔ یہ کلب نہ صرف ہندوستان بھر میں بلکہ دنیا کے کئی ملکوں میں اپنے کھلاڑیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا اکثر اس کے کھلاڑیوں کو دنیا کے الگ الگ ملکوں سے کھیل کی یا پھر کسی اسپورٹس سیمینا میں شرکت کی دعوتیں بھی ملتی رہتی تھیں اور اس کے کھلاڑی دنیا کے مختلف ممالک میں جاتے تھے۔ لیکن مجھ پر اس کا اس وقت کوئی اثر نہیں تھا۔ میں تو ہوسٹل میں اپنے کمر میں لیٹا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ میرے خدا، میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔

اس وقت مجھ پر لرزا سا طاری تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے؟ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری زندگی اب میرے اختیار میں نہیں رہی ہے۔ میں خود اپ بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر رہا بلکہ میرے اطراف میں احاطہ کرنے والی پراسرار قوتیں میرے آگے کے ہر قدم کا فیصلہ کر رہی ہیں۔ لیکن یہ قوتیں مجھ سے کیا چاہتی ہیں، ی مجھے نہیں معلوم تھا۔

ادھر گھر والے باقاعدہ میری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھ کیا کرنا چاہئے۔ بہرحال میں نے سب سے پہلے والد صاحب کو تار دیا کہ میں اپ کلب کی جانب سے میچ کھیلنے سری لنکا جا رہا ہوں۔ یہ اطلاع دینے کے بعد آخر کار میں ٹیم کے ساتھ جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ سارے کام کر رہا تھا لیکن مجھے سیوک سندھورتی کی باتیں سخت پریشان کر رہی تھیں۔ ہر لمحہ اب یہی سوچیں میرے ذہن پر سوار رہتی تھیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔

کلاڈیا اب ذرا مجھ سے کچھ زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس کی کتابیں واپس کر اس کے گھر پہنچا تو اس نے میری بہترین پذیرائی کی۔ اس وقت کرنل صغیر موجود نہیں

تھے۔ وہ کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ کتابیں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''مجھے معاف کرنا خاقان! کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتی ہوں جنہیں کہتے ہوئے مجھے خود بھی اپنے ہلکے پن کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کالج میں لڑکیاں تمہارے بارے میں ایسی ایسی باتیں کیا کرتی تھیں کہ میں انہیں سن کر ہنستی تھی۔ تم سے کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے۔ ان میں سے کئی لڑکیاں ایسی تھیں جو اپنے خوابوں میں تمہیں دیکھتی تھیں۔ اور ان خوابوں میں انہوں نے تمہیں حاصل کر لیا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جو نجانے کیوں مجھ سے پرخاش رکھتی تھیں حالانکہ اس وقت میری تمہاری کوئی دوستی نہیں تھی۔ لیکن ان میں سے کچھ کا کہنا تھا کہ میں نے تمہیں ان سے چھین لیا ہے۔ سچ کہتی ہوں میرے اپنے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ ان لڑکیوں کی دیوانگی پر غور کرتے ہوئے میں نے تمہارے بارے میں کئی بار سوچا ضرور تھا اور تمہیں اس لئے غور سے دیکھا تھا کہ آخر تم میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کی بناء پر وہ لڑکیاں ایسی حماقتیں کرتی ہیں۔ اب مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ کچھ خاص باتیں تھیں تو ضرور۔ مثلاً تمہاری ان کی جانب سے بے اعتنائی۔ میں نے کبھی تمہیں گھٹیا طریقے سے ان کی طرف متوجہ نہیں دیکھا نہ کبھی ان کے التفات پر تمہیں اتراتے ہوئے دیکھا۔ بس اس بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے ضرور دیکھا تھا میں نے۔ لیکن اس میں پسندیدگی کا کوئی ایسا جذبہ شامل نہیں تھا جسے عامیانہ کہا جا سکے۔ بہرحال اسپورٹس کے سلسلے میں اور خاص طور سے پولو کے کھیل میں تمہاری مہارت نے مجھے متاثر کیا۔ تم نے دیکھا صرف میں ہی نہیں میرے پاپا بھی تم سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ بات کہی کہ یہ شخص بہت معیاری ہے، خاص طور سے چوپان کے کھیل میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ ایک دن یہ چوپان کے بہت بڑے کھلاڑی کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر جائے گا۔ تو میں یہ کہنا چاہتی تھی خاقان! کہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم بھی بدھ مت سے دلچسپی رکھتے ہو تو مجھے عجیب سی ایک خوشی ہوئی اور اب میں تمہارے لئے اپنے دل میں ایک خاص مقام پاتی ہوں۔ تم یقین کرو اس میں ایک لڑکی اور لڑکے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ میرے دل میں خواہش ہے کہ میرے تم سے روابط گہرے ہوں۔ میں تم سے بھی اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں ایک خیال ہے، کیوں نہ ہم بدھ مت کے بارے میں مزید تحقیقات کریں اور اس سلسلے میں، میں اور تم مل کر ایسا

کر سکتے ہیں۔"

میں نے سپاٹ نگاہوں سے کلاڈیا کو دیکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلے بھی کلاڈیا میر
لئے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ لوگ کالج میں باتیں کیا کرتے تھے، اس کے حس
کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ بعد میں مجھے اس کے بارے میں مزید تفصیلات معلو
ہوئیں جو ذرا دلچسپ تھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میرے ذہن میں کبھی ایسا کو
تصور نہیں ابھرا۔ اور اس وقت بھی کلاڈیا نے جو الفاظ کہے تھے انہوں نے مجھے بہت زیا
متاثر نہیں کیا۔ لیکن بدھ مت کے بارے میں تحقیقات کی بات جو اس نے کی تھی وہ مج
خاصی دلچسپ محسوس ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"کلاڈیا! میں کلب کی جانب سے کھیلنے سری لنکا جا رہا ہوں اور اس کے بعد میر
وہاں سے واپسی ہو گی۔ لیکن شاید یہاں نہیں بلکہ اپنے گھر۔ کیونکہ میرے اہل خاندان ا
اے کے بعد میرے لئے آگے کے راستے منتخب کریں گے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چ
ہوں کہ میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں اور میرا خیال ہے اس سے زیادہ تعلیم مجھے نہیں دلا
جائے گی۔ کیونکہ وہ لوگ زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ تو کلاڈیا، اگر واپس
کلکتے آیا تو وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے رابطہ رکھوں گا اور ہو سکتا ہے اس وقت ہم دونوں مل کر
بدھ مت کے بارے میں تحقیقات کا کام شروع کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے میں تم سے
کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اس کا فیصلہ تو میرے گھر پہنچنے کے بعد ہی ہو گا کہ مجھے واپس
کلکتے بھیجا جاتا ہے یا پھر اور کوئی کام میرے سپرد کیا جائے گا۔"

ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن کلاڈیا کو میں اتنی تفصیل سے اپنے اوپر بیتنے وا
داستان نہیں سنانا چاہتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ داستان میرے پاس ایک امانت
کی حیثیت رکھتی ہو اور امانت میں خیانت میرے لئے ممکن نہ تھی۔ بہر حال کلاڈیا نے
چونک کر پوچھا۔

"تم کون سے کلب کی جانب سے کھیلنے جا رہے ہو؟"

"میں محمڈن اسپورٹس کلب کا ریگولر ممبر ہوں۔"

"اوہ...... ویری گڈ۔ میں نے کہا تھا نا کہ تم ترقی کی منازل طے کرتے چلے جا
گے۔ ٹھیک ہے، میں ان تمام حقیقتوں کو سمجھتی ہوں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" کلاڈیا
نے کہا۔ ایک عجیب سا تاثر اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

بہر حال ساری تیاریاں کرنے کے بعد ہم سری لنکا چل پڑے۔ یہاں پہنچ کر میں میچ
کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ذہن پر ایک خاص دباؤ
ہمیشہ رہتا تھا۔ بس وہی سیوک سندھورتی کی پیش گوئیاں اور گزرے ہوئے واقعات کا
عکس۔ لیکن سری لنکا آنے کے بعد ہم نے کولمبو، رتن پورے میں کئی میچ کھیلے اور یہ
حقیقت ہے کہ یہاں بھی میری اپنی کارروائیوں کے بجائے کچھ پراسرار قوتوں کا عمل زیادہ
کارفرما رہا۔ آپ یقین کیجئے، میں حیران رہ جاتا تھا جب میرا بدن وزن سے بے نیاز ہو
جاتا تھا اور میں فٹ بال لے کر چلتا تو لوگوں کے منہ سے آوازیں نکل جاتیں۔ میں فضا
میں تیر کی مانند اُڑتا ہوا بال تک پہنچتا اور گول کر آتا۔ مخالف ٹیموں پر میرے کھیل کی
دھاک بیٹھ گئی تھی اور کلب کے کارکنان میرے دیوانے ہو گئے تھے۔ میں نے بہت
کامیاب اور صاف ستھرے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

پھر کینڈی میں میری ملاقات ایک بدھ لڑکے سے ہوئی۔ اس کا نام اجے ورتنا تھا۔
اجے ورتنا میرا دوست بن گیا اور ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ ورتنا
کا باپ رتن پورے میں یاقوت کی ایک کان میں انجینئر تھا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ
ہم کینڈی سے رتن پورے میچ کھیلنے جائیں گے تو اس نے بھی میرے ساتھ چلنے کا پروگرام
بنا لیا۔ وہ کینڈی میں تعلیم حاصل کرتا تھا اور چھٹیوں میں رتن پورے جاتا رہتا تھا۔ رتن
پورے ہی میں وہ لڑکی بھی رہتی تھی جس کا اجے سے معاشقہ چل رہا تھا۔ پھر ہم رتن
پورے پہنچ گئے۔ یہاں اجے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ٹیم کے ساتھ ہوٹل میں قیام
کرنے کی بجائے اس کے گھر میں ٹھہروں۔ اس کا باپ صاحب حیثیت آدمی تھا۔ ٹیم کے
منتظمین سے اس نے خاص طور سے یہ اجازت لے لی تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر مہمان
بنائے۔ ہماری ٹیم کا یہاں خاصے دنوں قیام تھا۔ اور پھر کوئی خاص پابندی نہیں تھی چنانچہ
رتن پورے میں میچ کھیلنے کے بعد میں نے ورتنا کے ساتھ وہاں کے قابل دید مناظر
دیکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ رتن پورے کے بارے میں اگر کوئی ایسا شخص تفصیلات جاننا ہے
جس نے سری لنکا کا دورہ کیا ہو تو وہی بتا سکتا ہے کہ رتن پورے کا یہ علاقہ کتنا حسین تھا۔
ورتنا مجھے جگہ جگہ کی سیر کراتا رہا اور یہاں ہم نے پہاڑی سلسلے میں آخری چوٹی بھی دیکھی
جس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کو اس چوٹی پر پھینکا گیا تھا۔ وہاں
باقاعدہ ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ سری لنکا کے مسلمان عقیدت مند بہزار دقت اس چوٹی پر

آتے تھے اور یہاں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ مختلف چیزوں کو دیکھنے کے بعد بدھوں کی مشہور عبادت گاہ مہاسان دیول پہنچے تو مجھے یہ لگا جیسے مجھے خاص طور سے یہ لایا گیا ہو۔ سیوک سندھورتی اور کچھ پراسرار قوتیں میرے قریب ہی کہیں موجود ہوں ایک بہت بڑی حقیقت میں آپ کو بتاؤں، یہاں آنے کے بعد میں ہر وقت کچھ محسوس کرتا تھا جیسے میں عالم خواب میں ہوں اور ذہن پر ایک دھند سے چھائی رہتی تھی

جب مہاسان دیول سے واپس آ رہے تھے تو ہم نے ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں کی ایک چٹان شیر کے منہ کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ پورا شیر کا دہانہ تھا، لمبے لمبے دا نکلے ہوئے تھے۔ ورتنا نے مجھے بتایا کہ لوگ یہاں آتے ہیں تو اس میں بیٹھ کر تصویر کھنچواتے ہیں، بالکل یوں لگتا ہے جیسے وہ شیر کے حلق میں بیٹھے ہوں۔ آؤ یہاں بیٹھ ہیں۔ اس وقت آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اجے ورتنا کے ساتھ وہاں جا بیٹھا یہاں پہنچ کر میرے ذہن پر ایک پراسرار سی دھند چھا گئی۔ اجے ورتنا مجھے صرف ا ہیولے کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''ورتنا! میں اپنے دل کی داستان تمہیں سنانا چاہتا ہوں۔ میں ایک عجیب سی کیفیت شکار ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکو گے؟''

اجے ورتنا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے میرے دوست بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''یہ کہانی میرے بچپن سے شروع ہوتی ہے اجے ورتنا! اور بچپن سے اس کہانی گزرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ لیکن اس داستان کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ میں سخ پریشان ہوں اجے، میری مدد کرو۔''

''کیا بات ہے؟ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

اور پھر وہی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود نہ بول رہا ہوں میرے اندر سے ایک آواز بلند ہو رہی ہو۔ نیم غشی، دھند، خواب، اس عالم میں، میں ۔ ورتنا کو اپنے بارے میں کیا بتایا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے میر داستان سن رہا تھا۔ اور جب میں اپنی بات کہہ چکا تو اس نے زور سے مجھے جھنجھوڑ۔ ہوئے کہا۔

''تم جاگ رہے ہو نا خاقان؟''

''ہاں...... کیوں؟'' میں نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔

''تمہاری آواز بالکل ایسے لگ رہی تھی جیسے تم خواب میں بول رہے ہو۔'' ورتنا نے مجھے یہ کہہ کر مزید چونکا دیا۔ میں خاموش نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ ورتنا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا اور اس کے بعد اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیکھو خاقان! ہمارا تعلق سری لنکا کے ایک ایسے قبیلے سے ہے جس کا اپنا ایک وقار ایک مقام ہے۔ ہم جسے دوست کہہ دیتے ہیں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میں مذہباً بدھ ہوں اور میں نے اپنے قبیلے کی روایات کے مطابق بہت سی مذہبی تعلیمات کا جائزہ لیا ہے۔ مذہب اسلام کی طرح ہمارے ہاں بھی توہمات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں تمہیں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات بتاتا ہوں کہ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ تمہاری پیدائش تقریباً ویسے ہی حالات میں ہوئی ہے جیسے بھگوان بدھ کا جنم ہوا تھا۔ تم اس اتفاق سے کسی الجھن میں نہ پڑو۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ ویدوان سادھانی یا وہ دوسرا شخص جس کا نام تم نے سیوک سندھورتی بتایا ہے ان دونوں سے دور رہو تو کیا تم میرا کہنا مان لو گے؟ یہ دونوں تمہارے لئے بہتر ثابت نہیں ہوں گے۔ یہ میری پیشگوئی ہے۔''

میں حیرانی سے اجے ورتنا کی صورت دیکھتا رہا، پھر میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اجے ورتنا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، میں کیا مانوں اور کیا نہ مانوں۔ سیوک سندھورتی کی باتوں اور اس کی پیشگوئیوں نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا ہے اور یہاں آنے کے بعد تو مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میرا پورا سفر وردان سادھانی ہی کی طرف ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وردان سادھانی کسی ایک انسان کا نام نہیں بلکہ یہ زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ایک چمکدار دھند ہے جو آہستہ آہستہ میرے بدن کے گرد لپٹتی جا رہی ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہئے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

اجے ورتنا ہمدردی کی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''ایسا ہی ہوتا ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کبھی کبھی حالات انسان کو اسی طرح جکڑ لیتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں تجربے کی کوئی بات نہیں کہہ رہا لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اسی کی بنیاد پر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ بدھ میں بھی ایسے کسی

وہم کا وجود نہیں ہے۔ ویسے تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو یہ بات۔ ہم واقعی اس وقت وردا
سادھانی کے بالکل قریب ہیں اور رانگاپوری یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہمار
یہاں سے تھوڑے قریب ہی ایک بستی ہے جہاں سے دشوار گزار پہاڑوں کا ایک را
جاتا ہے۔ بستی کا نام مودنبے ہے۔ کسی زمانے میں اس راستے پر آمدورفت رہتی تھی ا
محکمہ جنگلات کے لوگ یا جنگلی ہاتھی پکڑنے والے ادھر جانکلتے تھے۔ مگر اس کے بعد وہا
پے درپے حادثات ہونے لگے۔ بہت سے حادثات ہوئے ہیں وہاں اور لوگوں نے اد
جانا چھوڑ دیا ہے۔ اسی راستے پر کافی دور جاکر پہاڑوں میں وردان سادھانی اور اس ک
بدعقیدہ بھکشوؤں کا دھار ہے۔ بہت کم لوگوں نے وہ جگہ دیکھی ہے اور اس کی ایک وجہ
بھی ہے کہ سال کے آٹھ مہینے ان پہاڑوں پر برف جمی رہتی ہے۔ میرے پتا نے بھی دو
سے اس دھار کی عمارت دیکھی ہے پر قریب جانے کی ہمت کبھی نہیں کی اور اس کی وج
وہاں کی روایات ہیں۔"

اجے ورتنا کے ان انکشافات نے میری دلچسپی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ میں ن
اس سے کہا۔ "ٹھہرو اجے ورتنا! اپنی باتوں کی تشریح کرتے چلو۔ ابھی تم نے کہا تھا ک
وردان سادھانی بدعقیدہ، بدمست ہے۔"

"ہاں...... ان لوگوں کے عقیدے ہمارے عقائد سے میل نہیں کھاتے بلکہ ہم اپ
الفاظ میں انہیں کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ بدھ مذہب سے بہت دور کی باتیں کرتے ہیں او
وہ بھی بدھ مذہب کے عقائد میں لپیٹ کر۔"

"ٹھیک۔ تو تم کہہ رہے تھے کہ بہت کم لوگوں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔"

"ہاں۔ وہاں برف جمی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں لوگوں کے نہ جانے کی ایک
وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں جو ایک دفعہ چلا گیا، وہ یا تو دنیا کو ترک کر کے انہی گمراہ بھکشوؤں
میں شامل ہو گیا یا پھر پاگلوں کی طرح واپس آیا، وہ صحیح دماغ نہیں رہتا۔" اجے ورتنا نے
کسی قدر متاثر کن لہجے میں کہا۔

"آہ...... ان باتوں سے تو مسئلہ سلجھنے کی بجائے کسی قدر الجھ گیا ہے۔"

"بس۔ میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے وہ ایک دوست کا مشورہ ہے۔ بہت ہی بہتر
ہوگا تمہارے حق میں کہ تم ان الجھنوں میں نہ پڑو۔"

یہ سچ ہے کہ اجے ورتنا کی باتوں نے مجھے اور الجھا دیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں

گھر واپس آ گیا۔ اجے کا گھر بہت ہی اچھا تھا، ایک مخصوص طرزِ تعمیر کا نمونہ۔ اور مجھے
ایک ایسی جگہ دی گئی تھی جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور اس کا راستہ باہر
سے ہی تھا۔ بہرحال میں کافی گم صم تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں سیوک کا منتظر تھا یا اس
سے بھاگ کر کہیں دور چھپ جانا چاہتا تھا۔ واقعی اس وقت میرا ذہن میرے قابو میں نہیں
تھا۔ اجے ورتنا کے مشورے نے مجھے اور پریشان کر دیا تھا۔ اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ
وہ انتہائی مخلص انسان ہے اور اپنی دانست میں اس نے مجھے غلط مشورہ نہیں دیا ہے۔ لیکن
سیوک سندھورتی بھی اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔ اجے نے مجھے جس جگہ ٹھہرایا تھا اس کی ایک
کھڑکی ٹینس کورٹ کی طرف کھلتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اجے میرے پاس آ گیا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں
خاقان! میں تمہارے چہرے پر پریشانی کی جھلک نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں اپنے ذہن کو آزاد
چھوڑ دینا چاہئے۔ ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔
بہرحال حالات کوئی نہ کوئی مناسب فیصلہ کر لیں گے۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں
کرتے رہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہاری آنکھوں میں بھی نیند اتر رہی ہے اور
میں بھی سونا چاہتا ہوں۔ جاؤں؟"

"ہاں اجے، میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ یہاں تم نے مجھے جیسے کمپنی دی ہے اور
جس قدر محبت کا سلوک کیا ہے، میں اس کا بدلہ تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔"

"چھوڑو یار! میں اپنی محبت سے تمہیں لایا ہوں، ایسی باتیں نہ کرو۔ اچھا چلتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں بھی بتی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور پھر بہت دیر
تک کروٹیں بدلتا رہا۔ میری سوچ کا محور ورتنا سے کی ہوئی باتیں ہی تھیں۔ نجانے کب
مجھے نیند آ گئی اور نجانے کتنی دیر سویا تھا کہ نیند ہی کی حالت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے
کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ لیکن پکارنے والا مجھے اس نام سے نہیں پکار رہا تھا جس سے مجھے
دنیا جانتی ہے یعنی خاقان جمشیدی۔ بلکہ میرے کانوں میں جو آواز اُبھر رہی تھی اور جو مجھے
ہی مخاطب کئے ہوئے تھی، وہ لوک ناتھ، لوک ناتھ کی آواز تھی۔ کوئی مجھے لوک ناتھ کہہ کر
پکار رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے کمرے میں نائٹ بلب جل رہا
تھا۔ میری نگاہیں گھڑی پر پڑیں تو وہ ایک بجا رہی تھی۔

"دھم راج...... مہا دستو...... روانہ ہونے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ ہمیں چلنا ہے مہاراج!" یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تو میں تڑپ کر بستر سے اٹھ گیا۔ میری نگاہیں اب کھڑکی کی جانب دیکھ رہی تھیں جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میری کھڑکی سے لگا ہوا ایک سایہ سا کھڑا ہے۔ ایک لمحے کے لئے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آ پڑا۔ مگر دوسرے لمحے میں جھپٹ کر کھڑکی کی طرف بڑھا تو اس سائے نے دونوں ہاتھ باندھ کر چوکھٹ پر اپنا ماتھا ٹکا دیا۔ میری نگاہوں نے ایک لمحے میں اسے پہچان لیا۔ یہ سیوک سندھورتی ہی تھا۔ لمحے بھر کے لئے میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر تمام لوگوں کو اکٹھا کر لوں۔ اجے ورتنا کو پکاروں جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں آنے والوں کو بتاؤں کہ مجھے وردان سادھانی اور اس کے پیروکاروں سے بچاؤ۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں ان لوگوں سے بغاوت کا جذبہ ابھرا تھا، لیکن پھر نجانے مجھے کیا ہوا کہ میرا یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔ میں ایک لمحے کے لئے سوچتا رہا اور پھر دوسرے لمحے میں دروازہ کھول کر اور ایک لمبا چکر کاٹ کر گھومتا ہوا آخر کار سیوک سندھورتی تک پہنچ گیا۔ سیوک سندھورتی نے بڑے عقیدت مندانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہی ایک بار پھر سجدہ کیا، اس کے بعد اٹھا اور بغیر کچھ کہے سنے میرا بازو پکڑ کر مجھے ایک طرف لے کر چل پڑا۔ مجھے حیرت تھی کہ میں سوچے سمجھے بغیر اور کسی تعارف کے بغیر اس کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ تصور کئے بغیر کہ میں کہاں جا رہا ہوں، کتنا فاصلہ طے کرنا ہے مجھے۔

اونچی نیچی ٹھیکریوں، وادیوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے میں سیوک سندھورتی کے ساتھ نجانے کب تک چلتا رہا۔ ہم دونوں کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم چل نہیں رہے بلکہ تیر رہے ہیں بلکہ اُڑ رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تو نہیں تھا کہ ہم کتنی دور نکل آئے ہیں مگر اجے ورتنا نے جو نشانیاں بتائی تھیں انہیں یاد کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم مودنبے سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ آہ...... یہ انوکھا سفر میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ گویا فضا کی پرواز ہمیں کسی جہاز سے زیادہ تیز رفتاری سے لئے جا رہی تھی۔ مودنبے نامی بستی پیچھے رہ گئی تھی اور اب ہم پہاڑی راستوں پر جا رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر، گھنے جنگلوں کا گزر اور پھر بلندیاں اور پستیاں جن پر چڑھتے اترتے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ فضا، یہ سناٹا ہمارے قدموں تلے ہو اور ہم اس پر پوری طرح قادر ہوں۔ ادھر سیوک سندھورتی منہ ہی منہ میں کچھ اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ اب ہم جس

علاقے سے گزر رہے تھے اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں پر بہت سردی ہے مگر وہ سردی مجھے نہیں محسوس ہو رہی تھی اور اتنا چلنے کے باوجود تھکن کی بجائے میرے اندر ایک طرح کی توانائی اور سرشاری کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں ہر بات سوچ رہا تھا، ہر تصور، ہر احساس میرے ذہن میں تھا۔ اپنی کیفیت کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ اجے ورتنا کی بتائی ہوئی باتیں بھی میرے ذہن میں تھیں۔ ان راستوں کا بھی تعین کر رہا تھا جو انتہائی دشوار گزار تھے۔ لیکن کسی تکلیف اور پریشانی کے بغیر یہ سفر طے کر رہا تھا اور اس سے غیر مطمئن نہیں تھا بلکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ایک عجیب طرح کی فرحت میرے دل و دماغ پر تھی۔

مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ ہم کتنی بلندی پر ہیں یا رات کتنی گزر گئی ہے۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد میں نے دیو قامت درختوں پر اِکا دُکا پرندوں کی چہچہاہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مدھم مدھم روشنی بھی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ گویا صبح ہونے والی تھی۔ پھر ذرا اجالا ہوا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا، اس وقت ہم پہاڑ کی جس دُشوار گزار چڑھائی پر چڑھ رہے تھے اس کے خاتمے پر دُھند میں مجھے ایک عمارت دھبے کی طرح نظر آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس عمارت کے عقب میں پہاڑ ایک دیوار کی طرح سیدھا اٹھتا چلا گیا ہے اور اتنا بلند ہے کہ اس کی چوٹی بادلوں میں چھپ گئی ہے۔ ادھر سیوک سندھورتی کی بڑبڑاہٹ بھی اب کچھ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی آواز اب بلند ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار منتر پڑھ رہا تھا اور اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

سنگھا شرنا گچھالی یعنی میں سونڈ یا جماعت کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہی پُرجلال، ہیبت ناک اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی پُرشکوہ عمارت مہمان بھکشو وردان سادھانی کی دھار تھی۔ میں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور خاص طور سے اب سری لنکا میں بھی بہت سے بدھ دھار دیکھے تھے لیکن وردان سادھانی کا دھار ایک عجیب عمارت تھی بلکہ اسے عمارت کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔ پہاڑ کی ایک ٹھوس چٹان کو تراش کر قدرتی غار کے دہانے کو بہت بڑی محراب کی شکل دے دی گئی تھی۔ محراب سے گزر کر ایک طویل غلام گردش تھی جس کی چھت پر ایک آدھا گنبد نظر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس باقی آدھے گنبد کا حصہ پہاڑ نے نگل لیا ہو۔ دھار کا اندرونی حصہ سرنگوں اور گپھاؤں پر مشتمل تھا۔ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر چھوٹے بڑے حجرے بنائے گئے تھے۔ یقیناً ان

حجروں میں وردان سادھانی کے بھکشو یا پجاری رہتے ہوں گے۔ ہم جب کشادہ اور اونچی نیچی ناہموار سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس عمارت کے چبوترے تک پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا جس کی کمر بہت زیادہ جھکی ہوئی ہے، اس عظیم الشان محراب سے گزر کر لکڑی ٹیکتا ہوا ہماری طرف آرہا ہے۔ وہ گیروا لباس اور کھڑاویں پہنے ہوئے تھا۔ جب وہ کچھ اور قریب آیا تو میں نے دیکھا اس کی سفید اور گھنی بھنویں اس کی آنکھوں پر جھکی پڑ رہی ہیں لیکن آنکھوں میں سفید روشنی تھی اور ان سے سفید چمک نکلتی معلوم ہوتی تھی۔ جھریوں نے اس کے چہرے اور بدن پر جال سا بن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا اور سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف۔ وہ بے شک لاٹھی ٹیک کر چل رہا تھا لیکن سنگیں فرش پر اس کے قدم ایسی دھمک کے ساتھ پڑ رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی وزنی شے چلی آرہی ہو۔ ساتھ ہی اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس کی عمر دو سو سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہو گی تو دیکھنے والا اس بات پر فوراً یقین کر لیتا۔ اس کی کیفیت سے ایسا ہی احساس ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر راہبوں کا سا سکون اور مجسمے جیسی سنگینی کا ایک عجیب ملا جلا تاثر تھا۔ آخر کار وہ ہم سے کچھ فاصلے پر رُکا۔ اور جب اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف نگاہ کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی گزری ہوئی صدی کے غبار میں سے مجھے دیکھ رہا ہو۔ کچھ لمحے وہ اسی طرح خاموش کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس کی انتہائی مکروہ اور کانوں کو چبھنے والی آواز سنائی دی۔

''دھم راج، دھم راج، بودھی ستو......''

اور اس کے بعد اس نے اپنی لکڑی زمین پر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں کو پیشانی سے لگا کر سجدے میں گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیوک سندھورتی بھی میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ میں درحقیقت اس وقت نیم خوابیدہ کیفیت میں تھا۔ سب کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک طویل خواب ہو اور میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے ذہن میں اب بھی لاتعداد سوچیں گردش کر رہی تھیں اور یہ خیال میرے ذہن سے گزر رہا تھا کہ کیا واقعی میں ان انوکھے بھکشوؤں کا اوتار ہوں۔ آخر کیا ہے یہ سب۔ کوئی کھیل یا پھر سچ مچ کی حقیقت؟ آہ...... اس وقت میرا ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اور سچی بات یہ تھی کہ کوئی بھی میری پشت پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنے والا نہیں تھا کہ خاقان! تیرا مذہب کچھ اور ہے، تیرا منصب کچھ اور ہے۔ وقت کے یہ دھارے مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ یہ تو شیطانی ٹولہ ہے۔ یہ تو

شیطانوں کا نشیمن ہے۔ ایک شیطانی طلسم کدہ جہاں مذہب سے بھٹکانے والوں کا ایک پورا گروہ موجود ہے۔ یہ تجھے آسمان کی مخلوق قرار دے رہے ہیں۔ تو ایک مسلمان ہے۔ شیطان اگر ایک صاحب ایمان کو بہکا لے تو اپنے طور پر وہ بے حد خوشی محسوس کرتا ہے۔

بہر حال چند لمحوں کے بعد وہ دونوں اٹھے اور میرے دائیں بائیں آ گئے۔ پھر دونوں نے اپنی چادروں کے گوشے اپنے بازوؤں پر ڈالے اور میرے ہاتھ تھام کر مجھے دھار میں لے چلے۔ راہداری میں داخل ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ غار کا ایک اندرونی حصہ جو دور سے تاریک دکھائی دیتا ہے، درحقیقت اتنا تاریک نہیں ہے۔ کسی ایسی نامعلوم جگہ سے ہلکی ہلکی دودھیا روشنی سرنگوں کی ان بھول بھلیوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ راہداری سے گزر کر ہم جب سب سے بڑی اور مرکزی سرنگ میں پہنچے تو مجھے شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کی آواز سنائی دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتے چلے گئے، یہ آوازیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ اور کچھ لمحوں کے بعد ان آوازوں کا راز مجھ پر کھلا۔ بہت سے مرد اور عورتیں بڑے سوز و گداز سے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ایک بار پھر مجھے اپنے بدن میں شدید سردی کا سا احساس ہوا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑنے لگیں اور میں اپنے بدن کی لرزشوں پر قابو نہیں پا سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ آوازیں میرے ذہن کے ہر گوشے پر چھاتی جا رہی ہوں۔ آوازیں اب اور واضح ہو گئی تھیں۔ بے شمار بھکشو اور پجارنیں شرن مگن کا جاپ کر رہی تھیں۔ الفاظ نمایاں تھے۔

بدھاں شرنا گچھامی...... دھماں شرنا گچھامی...... سنگھاں شرنا گچھامی۔ مطلب بھی خود بخود میرے ذہن میں واضح ہو رہا تھا۔ یعنی میں بدھ دھرم اور جماعت کی پناہ میں آتا ہوں۔ بہر حال یہ آوازیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ ہم سرنگ کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے اندازہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ یہ حجرے بھکشوؤں سے آباد ہیں۔ ہم ان آوازوں کے درمیان سے گزرتے رہے یہاں تک کہ یہ آوازیں پیچھے رہ گئیں۔ ہر دس بیس قدم کے بعد ہمیں ناہموار سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرنگ اونچائی کی طرف جا رہی ہے۔ اچانک ہی مجھے اپنے بدن پر نمی کا سا احساس ہوا اور میں نے کہیں دور سے پانی گرنے کا شور سنا۔ یہ آواز ایک یکساں حیثیت سے آرہی تھی۔ مزید کچھ فاصلہ طے ہوا اور ہم کسی ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے دو راستے پھوٹتے تھے۔ یہاں ان دونوں بھکشوؤں نے دائیں بائیں راستے کی طرف

مڑ کر مجھے تعظیمی اشارے کئے اور آخر کار بائیں طرف کی سمت اختیار کی۔ مجھے تو خیر ان کے ساتھ چلنا ہی پڑ رہا تھا۔ ویسے یہ اندازہ مجھے بخوبی ہو گیا تھا کہ پانی گرنے کی آواز بائیں سمت سے آ رہی ہے۔ اس عمارت کا یہ حصہ سب سے زیادہ روشن تھا اور یہاں سرنگ بھی بہت بلند ہو گئی تھی۔

ہم مزید کچھ آگے بڑھے تو سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھوتا ہوا گزر گیا۔ اس سے اندازہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں سے پانی کی دھار بہہ رہی ہے یعنی جو آبشار یہاں پہاڑوں میں بہہ رہا ہے ہم اس کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

اچانک ہی یہ سرنگ کچھ دور جانے کے بعد دائیں طرف مڑ گئی اور میں نے دیکھا کہ ہم ایک بہت بڑے قدرتی ہال کی دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں۔ میری نگاہوں کے سامنے تقریباً پچاس فٹ کی بلندی سے چشمہ کا پانی ہال کے وسط میں ایک ناہموار چٹان پر گر رہا تھا اور ایسی گونج پیدا ہو رہی تھی کہ مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ ان دونوں بھکشوؤں نے اب بلند آواز سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آبشار کی آواز اتنی تیز تھی کہ اس کے شور میں ان کے الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بعد بوڑھے نے سیوک سندھورتی کو اسی طرح کا اشارہ کیا اور سیوک سندھورتی نے بڑے ادب سے گردن جھکا کر کہا۔

”جو حکم وردان سادھانی!“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ تو یہ بوڑھا ہے وردان سادھانی۔ بے شک اس کی عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جھریوں میں لپٹا ہوا لیکن اتنا حیرت انگیز کہ یقین نہ آئے۔ بہرحال وردان سادھانی نے سیوک سندھورتی کو کوئی اشارہ کیا اور سیوک سندھورتی نے اپنی چادر کا ایک کونا پھاڑ کر دو رومال سے بنائے۔ ایک سے اس نے وردان سادھانی کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور دوسرا رومال اپنی آنکھوں پر باندھ لیا۔ پھر اس نے میرے بہت قریب آ کر بلند آواز میں کہا۔

”دھم راج...... اس بدھ کے مقدس چشمے میں راستے کی دھول دھو ڈالئے۔ مہان بھکشو وردان سادھانی اور میں نے اپنی ظاہری آنکھیں بند کر لی ہیں اور اپنے اندر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔“

کچھ عجیب سے الفاظ تھے جن کے بارے میں، میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ کیا

کہہ رہا ہے۔ اس کے بعد میری نگاہیں سامنے کی جانب اُٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ جہاں ہم کھڑے ہیں، وہاں چٹان میں چار پانچ سیڑھیاں تراش کر جانے کا راستہ بنا ہوا ہے۔ دونوں بھکشو آنکھوں پر پٹی باندھے اور ہاتھ باندھے ساکت و جامد کھڑے ہوئے تھے۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ چشمے کے پانی سے نہا کر میں سفر کی تھکن اور گرد صاف کر لوں۔ ایک سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ اب تک انہوں نے جو کچھ چاہا تھا اور جو کچھ مجھ سے کہا تھا میں آنکھیں بند کر کے ان کے کہے پر عمل کرتا رہا تھا اور کہیں بھی میرے اندر مدافعتی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ گویا میرے دل و دماغ تو بے شک میرے قبضے میں تھے اور میرے احساسات میرے اپنے تھے۔ لیکن میرا پورا وجدان ان کے سامنے ایک معمول بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اس پر بھی میں نے اعتراض نہیں کیا اور کسی معمول کی طرح ہی اپنے کپڑے اتارے اور سیڑھیاں اتر کر اس چٹان کے پاس جا کھڑا ہوا جس پر آبشار کا پانی زور و شور سے گر رہا تھا۔ میں عام حالات میں پچاس فٹ اونچائی سے گرنے والی پانی کی چادر کے نیچے جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نجانے کون سی طاقت مجھے آگے بڑھنے کے لئے اکسا رہی تھی اور میں یخ بستہ پانی کی چھینٹیں بدن پر سہتا ہوا اس چٹان کے پاس جا پہنچا جہاں صدیوں کی کائی جمی ہوئی تھی۔ کسی سحر زدہ انسان کی سی حرکتیں کرنے کے باوجود مجھے غیر شعوری طور پر اس بات کا ضرور احساس تھا کہ میں موت کی جانب بڑھ رہا ہوں اور اس کے چنگل سے بچنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اور اگر میں حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہونے والا ہوں تو میرا یہ عمل میری مرضی کے مطابق نہیں ہے۔

میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ میں وہ سب کچھ کر گزرنے پر تیار ہوں جو یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ آہ...... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میرا ذہن مجھے خوف کا احساس دلا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ میں کسی چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ لیکن میرا سارا وجود ان کی آواز کے تابع تھا۔ میں کچھ نادیدہ اور پراسرار قوتوں کے ہاتھوں میں ایک بے جان پتلا بن کر رہ گیا تھا۔ میرے قدم میرے خوف کے باوجود اس چٹان کی جانب بڑھے تھے اور میں چٹان پر جا پہنچا تھا۔ لیکن حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس کائی سے جس پر انسان تو کیا اگر کوئی مکھی بھی جا کر بیٹھ جائے تو اپنے قدم نہ جما سکے، لیکن کائی سے بھری سخت چٹان پر میرے قدم ایک لمحے کے لئے بھی نہیں پھسلے اور اب آبشار کا بے پناہ شور جیسے میرے پورے وجود میں گرج رہا تھا۔ میری نگاہیں نیچے کی طرف اٹھ گئیں تو میں نے

دیکھا کہ آبشار کا پانی نیچے ایک جگہ جمع ہو رہا ہے اور اس جگہ قیامت کے بھنور پڑ رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پتہ نہیں چل رہا تھا کہ پانی کہاں جا رہا تھا۔

میرے دل و دماغ پر عجیب سی کیفیت چھائی ہوئی تھی اور سوچ کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا کہ پانی کی ان ہولناک ضربوں نے میرے جسم کے چیتھڑے کیوں نہیں اڑا دیئے؟ اور پگھلی ہوئی اس برف کے آبشار میں میری موت کیوں نہ واقع ہو گئی۔ یہ پانی تو اتنا سرد تھا کہ اگر اس میں پتھر کو بھی ڈال دیا جائے تو وہ جم جائے۔ لیکن میرے جسم کو اس پانی سے ایک عجیب طرح کی لطافت کا احساس ہو رہا تھا اور ایک عجیب سی کیفیت میرے سارے وجود میں اترتی جا رہی تھی۔

زمین دوز ہال کی دہلیز پر وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی دست بستہ مجسموں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس حیات بخش آبشار کے نیچے ساری زندگی اسی طرح کھڑا رہوں۔

گیارہ بارہ برس کی عمر میں سیوک سندھورتی نے میرے بارے میں جو حیرت ناک انکشاف کیا تھا اور جسے میرے شعور نے آج تک تسلیم نہیں کیا تھا، اس وقت مجھے ایک آسمانی حقیقت معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں واقعی مہتر بدھ کا آسمانی روپ ہوں، میں ان کا بودھی ستو ہوں، میں اس غار میں رہنے والے بے شمار بوڑھوں کا نجات دہندہ ہوں اور ان کو نجات دلانے والا بدھ ہوں۔ خاقان جمشیدی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یا پھر ہے تو وہ صرف ایک قالب ہے جسے مقدس روح نے اپنا مسکن بنایا ہے۔ خاقان جمشیدی درحقیقت مہتر بدھ ہے، بودھی ستو ہے اور اس کا دوسرا روپ خاقان جمشیدی ہے یا پھر اس کا اصل روپ موجود ہی نہیں ہے۔ وہ تو صرف ایک خیال، ایک تصور ہے۔

میرے ذہن میں مسلسل خیالات کی چرخی چل رہی تھی۔ وہ گھر جہاں میرے دوست اجے ورتنا نے مجھے ٹھہرایا تھا، بس ایک آرام گاہ تھی میرے لئے، ایک راستہ تھا جس سے یاں تک آنا تھا۔ اور اس وقت میری روح وردان سادھانی کے حلقہ ارواح میں شامل ہونے یہاں تک پہنچی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ایک روح نہیں بلکہ ایک زندہ انسان ہوں۔

مجھے اپنے صحت مند ورزشی جسم پر تیز پانی کی دھاریں پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس پانی میں کلیلیں کروں۔ میں نے کسی کھلنڈرے بچے کی طرح چلو میں پانی بھر کر پیا۔ اتنا مزیدار پانی کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ میں شراب

سے ناواقف تھا۔ لیکن اس آبشار کا پانی مجھے لطیف اور سرور انگیز شراب کی طرح خوش ذائقہ اور نشہ آور محسوس ہوا۔

پھر اچانک میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی اور کچھ نامانوس الفاظ میں کچھ کہا گیا۔ یہ آواز نہ تو وردان سادھانی کی تھی اور نہ ہی سیوک سندھورتی کی بلکہ ایک اجنبی آواز تھی۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ آواز پھر میرے کانوں میں آئی اور نجانے کیا ہوا کہ میں نے یونانی دیوتاؤں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور اپنے سینے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا۔

"انیک دکھ سادھانی! نمو آزت نمو بدھا" یہ دنیا فانی دُکھوں سے بھری ہوئی ہے اور غیر حقیقی ہے اور سچا نام بدھ کا ہے۔

میری آواز آبشار کے بے پناہ شور کو تلوار کی طرح کاٹتی ہوئی جیسے پہاڑوں کے جگر میں اُترتی چلی گئی اور یقینی طور پر یہ آواز وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نے بھی سنی اور دونوں کے حلق سے آواز نکلی۔

"نموستو......نمو بدھا"

تب میں نے ایک عجیب بات دیکھی، وہ یہ کہ آبشار کا پانی اور ہلکا ہوتا گیا۔ اور پھر صدیوں سے پہاڑ کے جگر میں بہنے والا یہ مقدس چشمہ آخر کار رک گیا اور سرنگوں کی بھول بھلیوں سے گزرتی ہوئی خاصی ہلکی لیکن واضح آواز سنائی دی۔ یہ ساگر کے بھکشوؤں اور بھکشونیوں کی آواز تھی جو ایک ساتھ دوہرا رہے تھے۔

"نموست......نمو بدھا"

اور مجھے یوں لگا جیسے میری حیثیت بالکل بدل گئی ہو۔ میں کسی روحانی فتح مندی کے سے غرور میں جھومتا ہوا چٹان پر سے اتر آیا اور ان دونوں کی جانب بڑھا جو بدستور مؤدب مجسموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے میرے قدموں کی چاپ سنی اور دونوں رکوع کے انداز میں جھکے اور دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا ہال سے باہر آ گیا۔ اس وقت میں ایک دیوتاؤں جیسی برہنگی میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا اور وہ اس اندھے سفر میں میرے قدموں کی آہٹ پر میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

سرنگ کے اس حصے میں پہنچ کر جہاں سے دو راستے کھلتے تھے، میں رُک گیا۔ دونوں

بوڑھوں نے پہلے کی طرح اس دوسرے راستے کی طرف منہ کر کے تعظیمی اشارے
اور میں اس دوسری سرنگ میں داخل ہو گیا۔ تین چار قدم چل کر رُکا، سرنگ کی سنگیں
میں ایک تاک بنا ہوا تھا جس پر گیروے رنگ کی ایک بڑی سی گٹھڑی رکھی ہوئی تھی۔
نے ایک گٹھڑی اٹھائی، کھول کر دیکھا تو یہ تین کپڑے تھے۔ ایک لنگوٹ، ایک تہد اور ا
لمبی سی چادر۔ میں نے لنگوٹ پہن کر تہد باندھا، اس لمبی چادر کو پاؤں سے لپیٹا اور با
کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ میرا داہنا کندھا کھلا رہا۔ یہ کپڑے پہن کر میں
دونوں بھکشوؤں کو دیکھا، وہ اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹیاں کھول رہے تھے۔ پتہ
انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کپڑے پہن چکا ہوں۔ یہ واقعات اس قدر عجیب وغریب
اور پے در پے ہو رہے تھے کہ میرا اپنا ذہن تو کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ میں
اس بات کو اہمیت نہیں دی لیکن مجھے اس لباس میں دیکھ کر وردان سادھانی اور سیوک
سندھورتی کے چہروں پر بڑی گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے محبت بھرے انداز میں
آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں ابھی ننگے پیر تھا اور وہ دونوں کھڑاویں پہنے
ہوئے تھے۔ جب ہم دو قدم آگے چلے تو ان دونوں نے بھی اپنی کھڑاویں اتار دیں
آگے سرنگ بتدریج بلند ہو رہی تھی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں اور آگے چل کر تو مسلسل
سیڑھیاں شروع ہو گئیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ کے اندر ہی کوئی مینارا ہے جس پر ہم
چڑھتے جا رہے ہیں۔ پھر یہ سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور بائیں جانب مڑ کر ایک بڑے حجرے
میں ہمارے اس سفر کا اختتام ہوا۔ یہ حجرہ آبشار والے غار سے زیادہ طویل وعریض او
بہت روشن اور ہوا دار تھا۔ ہم جس دروازے سے داخل ہوئے تھے اس کے علاوہ حجرے
میں دائیں اور بائیں دوسرے دروازے بھی تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، چاروں طرف
روشن دان تراشے گئے تھے جن میں کہیں کہیں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا
کہ ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے ہیں۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے اس
دروازے کے عین سامنے چبوترے پر ایک عظیم الشان مجسمہ نصب تھا۔ اسے بھی چٹان
سے تراشا گیا تھا۔ حجرے کا یہ حصہ کچھ تاریک تھا اور مجسمے کے نقوش واضح نظر نہیں آ رہے
تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وردان سادھانی اور سیوک، مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔
پھر سادھانی اپنی جگہ سے اٹھا اور لکڑی ٹیکتا ہوا دیوار کے پاس گیا۔ کسی زنجیر کے

کھڑکھڑانے کی آواز سنی گئی اور ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ حجرے کی آدھی چھت
اپنی جگہ سے کھسک گئی۔

اب سورج کی روشنی براہِ راست مجسمے پر پڑنے لگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے
جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر پہلی بار میرے حواس واپس آئے۔ میں حیرت کے سمندر میں
ڈوب گیا اور میرے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ یہ مجسمہ بدھ کے مجسمے کی طرح
آسن جمائے بیٹھا تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے ہوئے تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں
رکھے استغراق کے عالم میں تھے۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔
مورتی کا بدن اور آسن بدھ کا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ...... اُس کا چہرہ میرا چہرہ تھا...... سو
فیصدی میرا چہرہ۔ اور اس چہرے کو دیکھ کر میں اس قدر حیران ہوا کہ ایک لمحے کے لئے
میرا ذہن اس طلسم سے آزاد ہو گیا اور میں پھر اپنے وجود میں واپس آ گیا یعنی خاقان
جمشیدی......!

※☆※

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھتے چڑھتے پھسل پڑا ہوں اور برق
رفتاری سے لڑھکتا ہوا، پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا نیچے جا رہا ہوں۔ نیچے...... اور نیچے
...... اور نیچے۔ لیکن پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں سنبھال لیا
ہو اور ایک عجیب وغریب خوشبو میرے سارے وجود میں تیر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی کے
گھنیرے بال میرے چہرے کو چھو رہے ہوں۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں بند
ہوئیں، لیکن پھر میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔ ایک نرم وگداز وجود مجھے اپنے آپ
میں سموئے ہوئے تھا۔ میں نے گھبرا کر اس چہرے کو دیکھا۔ یہ چہرہ بھی اجنبی نہیں تھا،
کلاڈیا...... کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا۔ ایک غیر ملکی ماں کی اولاد۔ لیکن عجیب وغریب خیالات
کی حامل یہ تمام کیفیت لمحوں میں گزر گئی۔ اور دوسرے لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی
نے میری گردن پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ دیا ہو۔ میں ان خیالات سے چونکا۔ آہ...... کچھ سمجھ میں
نہیں آتا تھا، کون سی حقیقت ہے اور کون سا فریب۔ آپ مجھ جیسے کسی انسان کا تصور کریں
جو اچھی خاصی شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود بچپن ہی سے زندہ طلسمات میں گھرا ہوا
ہو۔ درحقیقت میں زندہ طلسمات کا شکار تھا۔ میرے سامنے میری پتھر کی مورتی ایستادہ
تھی۔ اپنا بدھ دیکھ کر اور وہ بھی اس انداز میں جس قدر حیرت ہو سکتی ہے، اتنی حیرت ہوئی

تھی۔ تب میں نے آنکھیں گھما کر سادھانی اور سندھورتی کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ باند
گردن جھکائے کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ بے جان سے انداز میں اٹھے۔ میں ا
مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نہ کہہ سکا۔ بے بسی کی نگاہوں سے میں
چاروں طرف دیکھا اور پھر میری نگاہ سامنے والی مورتی کے چبوترے پر پڑی۔ چبوتر
کے نیچے ایک چوکی سی نظر آئی جس پر گیروے رنگ کا ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ وردان
نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر بڑے ادب سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”بودھی ستو...... دھن راج، اس سنگھاسن کا سُونا پن آپ کے آنے کے بعد ختم ہو گ
آیئے، اس سنگھاسن پر پدھاریئے۔“ اس نے چوکی کی طرف اشارہ کیا۔ میرے بدن
تار، میرے جسم کا ہر عضو جیسے آواز کے تاروں سے بندھا ہوا تھا۔ دماغ کسی بھی طر
جائے، ذہن کچھ بھی سوچے، کرنا مجھے وہ پڑ رہا تھا جو ان میں سے کوئی کہتا تھا۔ میں آ
آہستہ چلتا ہوا چوکی کی طرف بڑھا اور بیٹھ گیا۔ دونوں بھکشو آگے بڑھ کر میرے قدم
میں دو زانوں بیٹھ گئے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی حجرے کے دائیں اور بائیں دروازے
تاریکی میں شرن گومل کی پُرسوز آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گیروے رنگ کے لباس پہنے،
جھکائے اور ہاتھ باندھے ایک جانب سے بھکشو اور دوسری طرف سے بھکشونیاں قطار
قطار حجرے میں داخل ہونے لگے۔ وہ بڑے سُوز کے ساتھ آواز ملا کر وہی تین بول
رہے تھے۔

”بدھاں شرنا گچھامی۔ دھماں شرنا گچھامی۔ سنگھاں شرنا گچھامی۔“

ان کی تعداد بے شمار تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا حجرہ ان سے بھر گیا۔ یہ سارے
سارے سنگھاسن کے سامنے پہنچ کر سجدے میں گر گئے۔ کچھ دیر اسی طرح پڑے رہے ا
پھر اسی ترتیب سے بیٹھتے چلے گئے۔ جب پورا حجرہ بھر گیا تو وردان سادھانی میری طر
بڑھنے لگا اور میری جانب پشت کئے بغیر چبوترے کے ایک جانب لاٹھی ٹیک کر کھڑا
گیا۔ وہ پہلے بھنبھناتی آواز میں کچھ بڑبڑاتا رہا، پھر اس نے ایک نامانوس زبان میں ک
کہنا شروع کر دیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ ہاتھ باندھ کر تعظیماً میری طرف جھک
اپنی گمبھیر آواز میں کچھ کہتا۔ اور آخر اپنی تقریر ختم کر کے وہ میری جانب بڑھ آیا۔ جھک
میرے پیروں کو بوسہ دیا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھتے ہی تمام لوگ کھڑ
ہو گئے اور عجیب و غریب کیفیت میں ایک گیت گانا شروع کر دیا۔ یہ گیت کوئی بھجن معلو

ہوتا تھا۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن مردوں اور عورتوں کی آواز
میں ایسا خلوص اور مٹھاس تھی کہ میری آنکھیں خودبخود بند ہو گئیں اور میں نے خود کو اس
موسیقی کی لہروں پر بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ غیر محسوس طریقے سے آوازیں
ہلکی ہوتی چلی گئیں اور گیت ختم ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پورا ہال یا حجرہ
خالی تھا۔ میرے سامنے ہی سادھانی کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے گلا
صاف کیا اور بولا۔

”لوک ناتھ! جہان بھکشوؤں کے سنگ نے اور یشوسنگ کی بھکشونیوں اور ان سب
کے داس یعنی وردان سادھانی نے دیکھا اپنی آنکھوں سے اور ہم سب جان گئے کہ آپ
ہی دھم دیول ہیں، بودھی ستو ہیں، مہتر بدھ کا دیہانی روپ ہیں۔“

اس نے اس دیوہیکل مورتی کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے جس کا چہرہ میرا تھا اور بدن
پتہ نہیں کس کا اور پھر بولا۔

”آپ ہی وہاں ہیں اور آپ ہی یہاں ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے سینے پر دونوں
ہاتھ رکھے۔ پھر اس نے ایک ہاتھ بلند کیا اور اسے فضا میں گردش دے کر کہا۔ ”اور آپ
ہی چاروں کھونٹ ہیں۔“

میں چوکی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اس کا یہ قصیدہ سنتا رہا۔ وہ دیر تک اسی طرح بولتا
رہا۔ اس نے دلیلیں، شہادتیں اور مثالیں دیں، اپنے ایک ایک بیان کی تائید میں مذہبی
کتابوں اور روایتوں کے حوالے دیئے۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ میں یعنی خاقان
جمشیدی اس فرقے کے عقیدے کے مطابق وہ آخری بدھ ہوں جس کا تذکرہ تاریخ میں
صدیوں سے ہے۔ میں ابھی بودھی ستو کی منزل میں ہوں اور آج کے بعد سے میرا ہر قدم
تکمیل کی طرف اٹھے گا۔ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب میں گیان حاصل کرنے
کے بعد اپنے مہتر بدھ یعنی بدھ ہونے کا اعلان کروں گا اور سادھانی کے بھکشوؤں اور
بھکشونیوں کی اس جماعت کو لے کر خانقاہ سے اٹھوں گا اور ساری دنیا پر اس مذہب کا
پیغام پھیلا دوں گا۔ وردان سادھانی نے کہا۔

”اور بودھی ستو! تکمیل کی منزل تک پہنچنے کے لئے تمہیں بہت سی ریاضتیں بھی کرنا
پڑیں گی۔ جن میں تم برائیوں اور نیکیوں کے ساتھ ساتھ سفر کرو گے۔ ان میں نیک کام
بھی ہوں گے اور کچھ ایسے کام بھی جنہیں انسان برا سمجھتا ہے۔ نیک ریاضتوں میں محبت،

ہمدردی، خوشی اور اطمینان کے دھیان کرنا ہوں گے اور بدی کی ریاضتوں میں اشبھ بھاوناؤں یا منحوس دھیان کی مشق کرنا پڑے گی۔ اس ریاضت کا طریقہ یہ ہوگا کہ کسی ایسی لاش پر دھیان دیا جائے جو نیلی پڑ گئی ہو اور جس میں سوراخ ہوں یا جس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو یا جس میں سے خون بہتا ہو یا پھر جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو۔ اس پر اشلوک پڑھے جائیں گے۔ جب یہ اشلوک مکمل ہوں گے تو ایسی کسی لاش میں کوئی جسم حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہی بدن اپنے شریر میں منتقل کیا جائے گا اور جب وہ زندہ ہو کر تمہارے وجود میں پیوست ہو جائے گا تو تمہارا یہ بدی کا عمل مکمل ہو جائے گا۔ اشبھ بھاونا چارن نیک بھاوناؤں کی تکمیل کے بعد کرنا ہوگی ورنہ اس اشبھ بھاونا کے بھیانک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔'' آخر میں اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا اور اس کی آواز اُبھری۔

''دھم راج! آپ نے تو اپنے دل میں جان لیا تھا کہ آپ وہی ہیں جو آپ ہیں۔ مگر کسی نے آپ کو سچ سے دور رکھنا اور بہکانا چاہا۔ سو وہ بہکانے والا اب کہیں کا نہیں رہے گا۔ کہیں کا نہیں رہے گا وہ۔ سنا...... اشبھ بھاوناؤ، ہنسا ارتیشاء کے پیروکارو! جس نے مہتر بدھ کو بہکایا وہ اب کہیں نہ ہو۔''

یہ الفاظ کہتے وقت سادھانی کا چہرہ اتنا بھیانک ہو گیا کہ اس پر نگاہ نہ جمائی جا سکے۔ اس کے یہ الفاظ اور یہ کیفیت میری سمجھ میں نہ آ سکی تھی۔ میں کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس کی آواز سن رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی بولنا بند کر دیا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا میری مورتی کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ وہ نامعلوم زبان میں کچھ کہتا جا رہا تھا۔ جب وہ مورتی کے پاس سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گیروے رنگ کے بوسیدہ کپڑے میں کوئی چیز تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے اس پلندے کو سر پر رکھا، بوسہ دیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس کپڑے کی تہیں کھولنا شروع کر دیں۔ اس پلندے سے عجیب وغریب مہک اٹھ رہی تھی۔ کپڑے کی ساری تہیں کھلیں تو اس میں سے تمباکو کے پتے کی طرح ایک خوشبودار پتا نکلا۔ اس کی سطح کیلے کے تنے کی طرح چکنی اور ہموار تھی اور اس کی رنگت تانبے کی طرح تھی۔ سادھانی نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا پھر آنکھوں سے لگا کر میری طرف بڑھا دیا اور کہنے لگا۔

''دھم راج! یہ جنموں کے بھید کھولنے والا بھوج پتر ہے۔ شاکیہ منی گوتم کے نروان پانے کے بعد سیانوں نے اسے گوشی نگر سے دھرم شوالہ پہنچا دیا تھا۔ پرانی پوتھیوں میں لکھا

ہے اور مہان سیوکوں کے بھکشوؤں نے ایک دوسرے کو یہ بات پہنچائی ہے کہ ایک دن مہتر بدھ یہاں آئے گا اور جنموں کے بھید کھولنے والا یہ پتر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ مہتر بدھ کے نروان پانے تک یہ پتر ان کے پاس رہے گا۔ لوک ناتھ! دوہرا دیجئے کہ جنموں کے بھید کھولنے والا یہ پتر میں نے اپنے مہان بودھی ستو کو پہنچا دیا۔ آپ کہئے کہ پر بھوج پتر آپ کو حاصل ہو چکا ہے۔''

میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ دوہرائے اور اس بھوج پتر کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی اس پتر کی مہک اور بڑھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خوشبو برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ چمپا کے پھول کی طرح میٹھی، تیز اور کسی حد تک ناگوار بو جس سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے چاہا کہ اسے اپنے پاس سے دور ہٹا دوں لیکن اس سے پہلے کہ میں ہاتھ بڑھا کر بھوج پتر اٹھاتا، میرا اٹھا ہوا ہاتھ بے حس وحرکت میرے پہلو میں ڈھلک گیا اور میری پیٹھ سنگیں چبوترے سے جا لگی۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے مجھے شدت کی نیند آ رہی ہو۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سادھانی کا جھریوں بھرا چہرہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں میرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ پوری طرح نیند آنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر انکسار اور عبودیت کے تاثرات اور گہرے ہو گئے تھے۔ پھر نیند میرے اعصاب میں گھلتی چلی گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد میرے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سے لوگ مل کر رو پیٹ رہے ہوں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں دُھوپ بھری ہوئی تھی اور کہیں دور سے مردوں اور عورتوں کے چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں شدید حیران ہو گیا اور میں نے کروٹ بدلی، پھر پلنگ کی پٹی پکڑ کر جھٹکے کے ساتھ اٹھ گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، جو مناظر میرے اردگرد پھیلے ہوئے تھے اور جو کچھ میں نے عالم ہوش میں دیکھا تھا، اب وہ نہیں تھا۔ میں اجے ورتنا کے مہمان خانے میں تھا...... میرے اندر ایک ایسی خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی کہ میرا سارا وجود تھرتھر کانپنے لگا۔ تو کیا میں یہ خوب دیکھ رہا تھا؟ آہ...... یقینی طور پر یہ خواب ہی تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سادھانی اور سیوک کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔

دیوار پر لگی گھڑی پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ رات کے انوکھے خواب کی وجہ سے شاید یا پھر دیر تک جاگنے کی وجہ سے، میرا سر بھاری ہو گیا تھا اور

جوڑ جوڑ دُکھنے لگا تھا۔ لیکن ایک بار پھر میرا ذہن ان آوازوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو میرا وہم نہیں تھیں۔ یہ رونے پیٹنے کی آوازیں کیسی ہیں؟ میں بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن چادر میرے پیروں میں الجھ گئی اور میں گرتے گرتے بچا۔ ٹھیک اسی وقت کسی نے میرے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

''آ رہا ہوں...... آ رہا ہوں...... کون ہے؟'' میں نے کہا اور چادر سے اپنا پیر نکالنے کے لئے جھکا۔ لیکن اسی وقت میرے حلق سے ایک دہشت زدہ آواز نکل گئی۔

''ارے...... یہ...... یہ......''

آہ، واقعی ایک انتہائی حیرتناک عمل ہوا تھا۔ جس نے ایک لمحے کے لئے میرے ہوش وحواس چھین لئے تھے۔ جو چادر میرے پیروں میں لپٹی تھی وہ سفید چادر نہیں تھی۔ یعنی وہ چادر نہیں تھی جو میرے بستر پر تھی اور نہ ہی میرے بدن پر وہ سوٹ تھا جسے پہن کر میں سویا تھا بلکہ ایک گیروے رنگ کی چادر تھی جو میرے بدن سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہی لباس، وہی چیز جو اس مندر میں میرے حوالے کی گئی تھی۔ دستک دینے والا کچھ کہہ رہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں تو اس وقت دہشت سے کانپتے ہوئے اس گیروے رنگ کے لباس میں کھو گیا تھا۔ اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو میرے بدن پر یہ کپڑے کہاں سے آئے اور یہ تیز خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟ یہ...... یہ چمپا کی بو ہے اور میرے ہی بستر سے آ رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے بستر کو دیکھا، میرے سرہانے تمباکو کے پتے کے برابر ایک خشک پتا پڑا ہوا تھا اور یہ خوشبو اسی میں سے آ رہی تھی۔

''بھوج پتر......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور پھر میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو پتر کی سطح پر ایک نقش بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے روشنی کے سامنے کیا تو دیکھا وہ ایک تصویر تھی، ایک انسانی تصویر...... اور ایک بار پھر میرے سینے کو ایک زور کا گھونسا سا لگا تھا، میں نے اس تصویر کے نقوش پہچان لئے۔ یہ اجے ورتنا کی تصویر تھی۔ اور اس میں اجے ورتنا کے گلے میں رسّی کا پھندہ پڑا ہوا تھا۔

''یہ کیا تماشہ ہے؟'' میرے منہ سے بے اختیار آواز نکلی اور پھر مجھے دروازے پر دستک کا احساس ہوا جو مسلسل ہو رہی تھی۔ اس وقت میرے سامنے فوری مسئلہ یہ تھا کہ اس گیروے لباس اور بھوج پتر کو کہاں چھپاؤں؟ بہرحال میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گیروے رنگ کی یہ چادر اتار کر الماری میں ٹھونسی، جلدی سے پتلون قمیض پہنی، بھوج

پتر بھی الماری میں چھپایا اور اس کے بعد میں نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اجے کا ملازم کمرے میں گھس آیا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے صحیح طور پر آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں اسے ایک طرف ہٹاتا ہوا باہر نکلا۔ برآمدے میں بہت سے لوگ بھرے ہوئے تھے اور رونے پیٹنے کی آواز اجے کے کمرے سے آ رہی تھی۔ میرا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں لوگوں کو ہٹاتا ہوا اندر داخل ہوا اور وہاں میں نے جو منظر دیکھا وہ مجھے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا...... بستر پر اجے کی لاش پڑی ہوئی تھی اور لاش کے گلے میں رسّی کا پھندا تھا......!

مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ میرے پاؤں لرز کر رہ گئے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ اجے ورتنا میرا نوجوان دوست میری وجہ سے موت کا شکار ہوا تھا۔ صرف میری وجہ سے۔ میرے ذہن میں ایک ایک چیز گردش کر رہی تھی۔ اجے کی لاش مجھے بتا رہی تھی کہ وردان سادھانی کے ساتھ جو لمحے میں نے گزارے تھے وہ کوئی خواب نہیں بلکہ ایک بہت ہی ہولناک حقیقت تھے۔ میرے کانوں میں اس قہر زدہ بھکشو کے الفاظ گونج رہے تھے جس نے کہا تھا کہ بہکانے والا اب کہیں نہ ہو۔ وہ اب کہیں نہ ہو۔ اور ان الفاظ کا مطلب اس وقت اجے ورتنا کی لاش کی شکل میں میری نگاہوں کے سامنے تھا اور یہ کوئی خواب، دھوکا یا فریب نہیں تھا، ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ کیونکہ اجے ورتنا نے مجھے ان بد عقیدہ بدھ بھکشوؤں کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں۔ حیرت ناک بات تھی۔ بہت ہی حیرت ناک۔ گویا کوئی ایسی پراسرار تحریک ان کے درمیان بھی چل رہی تھی جسے ایک مذہبی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ تو صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ حسن بن صباح، فری میسن اور پتہ نہیں کون کون سی جماعتیں اپنے الگ گروہ بنا کر مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی میں بری طرح ملوث نظر آتی ہیں۔ اصل میں یہ تو ایک بہت ہی لمبا کھیل ہے، بہت ہی لمبا جس کے بارے میں اگر تفصیل میں جایا جائے تو کہانی میں بے مقصد طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں تو اس ہولناک حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا اور مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ صرف ان الفاظ کی نحوست ہے کہ ہنستے کھیلتے، زندگی سے بھرپور اجے ورتنا کی موت واقع ہو گئی تھی۔ میرا دوست میرے خواب پریشاں کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ کاش میں نے اسے اپنی روداد نہ سنائی ہوتی۔ کاش اس نے مجھے وردان سادھانی کے دھار جانے سے نہ روکا ہوتا۔

بہر حال اجے ورتنا کی موت کا ماتم کیا جا رہا تھا۔ جوان بیٹا زندگی سے گزر گیا ت
عجیب و غریب دن گزرا تھا میرا۔ میں تو سارا دن اجے ورتنا کی لاش کے پاس بیٹھا رہا
سوچتا رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ یہ حقیقت ہے
میں نے موت کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا اور خاص طور سے ایک نوجوان کی موت ک

پھر اجے ورتنا کی ارتھی شمشان لے جائی گئی۔ میں نے اپنے دوست کا کڑیل بد
شعلوں کی لپیٹ میں آتے دیکھا۔ میرا کلیجہ دہل رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ خداوند عا
موت کیسی بھیانک چیز ہے۔ میرا دل اس لئے کٹ رہا تھا کہ اجے ورتنا میری وجہ
موت کا شکار ہوا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔ اس کے باپ کی حالت بہت خراب تھی۔ می
ان کے سینے سے لگ کر چیخ چیخ کر رو دیا۔ دوسرے لوگ اسے میری بے پناہ محبت سمج
رہے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میں اجے کا قاتل تھا اور احساسِ پشیمانی مجھے پاگل
کئے دے رہا تھا۔

میری ٹیم یہاں سے کولمبو روانہ ہو گئی تا کہ واپس کلکتے کا رخ کرے۔ لیکن میں
ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ابھی ا
کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ میں اپنے دوست کی موت کے دوسرے دن
اطمینان سے اپنے وطن نہیں جانا چاہتا تھا۔ بمشکل تمام ٹیم کے مینیجر نے مجھے اجازت دی ک
میں یہاں رک جاؤں۔ لیکن اس نے یہ صاف بات کہہ دی تھی کہ ایسا میں صرف اپنی ذمہ
داری پر کروں گا۔ میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ میں اپنے کھلنڈرے ساتھیوں کی
رفاقت اختیار کر سکتا۔

بہر حال پانچ دن کے بعد میں اجے کے پتا سے اجازت لے کر بذریعہ ٹرین کولمبو
روانہ ہو گیا۔ اس عرصے میں، میں مستقل اپنے گیروے لباس اور بھوج پتر کے بارے میں
سوچتا رہا۔ آخر کار میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

ٹرین جب یہاں سے روانہ ہوئی تو سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ایک مقامی آدمی میرا ہم
سفر ہو گیا۔ وہ باتونی آدمی تھا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا رہا میں
نے اس سے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ اس نے انگریزی بولی تب بھی میں نے خاموشی ہی
اختیار کی اور پھر خدا کا شکر ہے کہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر وہ رخصت ہو گیا تو میں نے
فوراً اپنا سوٹ کیس کھول کر گیروے کپڑے اور وہ منحوس بھوج پتر نکالا۔ پہلے تو میں نے

گیروے کپڑوں کا بنڈل کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور اس کے بعد وردان سادھانی کے
دیئے ہوئے بھوج پتر کو مسل کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میرا دل بڑا مطمئن تھا کہ وہ
منحوس تصور جو وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی کی نحوست سے نجات نہیں لینے دیتا
تھا، مجھ سے دور ہو گیا۔ اس ناقابلِ فہم واقعہ کو میں اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
خارج کر دینا چاہتا تھا۔

بہر حال میں کولمبو پہنچا اور وہاں سے بذریعہ اسٹیمر کلکتے روانگی ہوئی۔ کلکتے پہنچ کر میں
نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ واپس ہوسٹل جاؤں۔ یہاں میرے بہت سے دوست موجود
تھے۔ کوئی اور پخ نکل آتی۔ چنانچہ میں نے وہیں پر یہ فیصلہ کیا کہ اب میں اپنے گھر کا
رخ کرتا ہوں۔ اور آخر کار میں اپنے گھر جا پہنچا۔

میری اچانک آمد پر یہاں خوب ہنگامہ ہوا تھا۔ میرے گھر میں میری والدہ بھی تھیں
لیکن ابا جان موجود نہیں تھے۔ وہ شکار کی تلاش میں بندھیاچل پہاڑ کی ترائیوں میں گھوم
رہے تھے۔ میں ایک عجیب اضطراب دل میں لے کر یہاں آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ
یہاں آ کر میرا دل بہل جائے گا۔ یہاں میرے ماں باپ اور دوسرے اہل خاندان تھے
جو مجھے بے پناہ چاہتے تھے اور صحیح معنوں میں میری آمد سے بڑی خوشیاں منا رہے تھے۔
لیکن میں ان کی خوشیوں میں اس انداز سے شریک نہ ہو سکا جس طرح مجھے ہونا چاہئے
تھا۔ میری شخصیت جیسے بکھر سی گئی تھی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں مجھ پر جو انکشاف ہوئے
تھے اور خاص طور سے دھرم شوالہ میں جو عذاب مجھ پر سوار ہو گیا تھا، اس وقت تو میرے
ناپختہ ذہن نے کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن سری لنکا جانے کے بعد پھولا کھانچن کی
پہاڑیوں میں مجھ پر جو گزری تھی میں نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ شعور کی جس
کیفیت سے میں ان باتوں کو سمجھ رہا تھا اب وہ میرے لئے عذاب بنتی جا رہی تھیں۔
الٰہی! کسے اپنی مشکل کا حال بتاؤں؟ اب تو دہشت ہو رہی تھی۔ اجے ورتنا اسی رازداری کا
شکار تو ہو گیا۔ ماں کو بتاؤں، باپ کو بتاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ منحوس جادوگر، وہ خونخوار
جنونی انہیں بھی کوئی نقصان پہنچا دیں۔

بہر حال وقت گزرتا رہا اور میں اپنے عذاب میں گرفتار رہا۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر
کونا، ہر گوشہ میرے لئے عذابِ جان بنا ہوا تھا۔ والد صاحب شکار سے واپس آ گئے اور
انہوں نے معمول کے مطابق دوستوں کی طرح مجھ سے کلکتے اور اس کے بعد لنکا کی

مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا اور پھر خوشگوار لہجے میں بولے۔

''یار! تیرے دادا، دادی کی خواہش پوری ہو گئی۔ تیری والدہ بھی یہی چاہتی تھ
لیکن میری سوچ اور میرا مقصد دوسرا تھا۔ ان لوگوں نے ایک طویل عرصے کے لئ
سے میرا یار چھین لیا تھا۔ کیا خیال ہے، اب اس کے بعد پھر وہی کام شروع ہو جا
ویسے میں تجھے ایک بات بتاؤں یار، تیری ماں بہت جلدی بوڑھی ہو گئی۔ حالانک
عورت سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ ایک نامور شکاری کی بیٹی تھی اور
میں شکار کے سامنے اس طرح سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی تھی کہ تو یقین کر کہ بعض او
تو شیر بھی اسے دیکھ کر بھاگ جاتا تھا۔ لیکن اب پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔ بہر
اب تو آ گیا ہے۔ کیا خیال ہے بنائیں کوئی عمدہ سا پروگرام؟''

''ابھی نہیں پپا! میں ایک طویل عرصے تک آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے
سے کہا۔

''میں جانتا تھا...... میں جانتا تھا۔ یہ اسکول اور کالج کی زندگی انسان کو کچھ سے ک
دیتی ہے۔ اسی لئے تو میں اپنے شیر کو جنگل میں ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ دھت تیرے
سارے کے سارے بزدل ہو گئے۔ ٹھیک ہے بھائی، تیری مرضی۔''

میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ شکار جس کا میں خود بھی عاشق
اب میرے لئے بے معنی سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ بات وہی تھی، میرے دل و دماغ پر ا
بوجھ سا طاری تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی میری شخصیت کے دو ٹکڑے کرنا چاہتا
کبھی کبھی ان لوگوں کی باتوں پر بھی غور کرتا تو یہ احساس ہوتا کہ بہرحال وہ سب کچ
دلچسپ اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کا وہ دیوتا بن کر یا مہتر بدھ بن کر دیکھوں تو سہی
بات کہاں تک جاتی ہے۔ لیکن پھر خوف دامن گیر ہو جاتا۔ نجانے کتنے لوگ میری
سے ہلاکت کا شکار ہو جائیں اور نجانے مجھے کیا کرنا پڑے۔

آخر مجھے اپنا نتیجہ معلوم ہوا۔ میں نے فرسٹ کلاس میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی ا
پاس کر لیا تھا۔ یہاں پھر ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی اور میرے بزرگ اس بات پر تیا
گئے کہ مجھے آئی۔سی۔ایس کی تیاری شروع کر دینی چاہئے۔ والد صاحب نے بھی ہتھ
ڈال دیئے تھے کیونکہ انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اب ایک دلیر شکاری ن
ہوں۔ بہرحال میں نے سوچا کہ شاید تعلیمی سلسلے میں میرا ذہن بٹ جائے۔ چنانچہ

نے آئی۔سی۔ایس کی تیاری شروع کر دی۔ اس سلسلے میں کئی بار کلکتے بھی جانا ہوا لیکن
بس دوستوں سے مل کر واپس آ گیا۔ وہ پرانی خوشی تو اب مجھ سے دور ہی ہو گئی تھی۔

مقابلے کے امتحان کی تیاری کے دوران بہت حد تک مجھے اس دماغی اُلجھن سے
نجات مل گئی تھی۔ میں صرف اپنے آپ کو اس اُلجھن سے نجات دلانے کے لئے بارہ بارہ
گھنٹے تک مسلسل پڑھتا رہتا تھا۔ ویسے چند دوست بھی بنا لئے تھے جن سے صرف علمی
موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ میں آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں بیٹھا اور
سول سروس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ منتخب ہونے والوں کی فہرست میں میرا چوتھا نمبر تھا۔
پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر بالترتیب چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مقرر کردہ دو صاحبان
اور سروس کمیشن کے افسر اعلیٰ کے بھانجے آئے تھے۔ گویا لیاقت کی بناء پر منتخب کئے جانے
والوں میں میرا پہلا نمبر تھا۔

بہرحال آئی۔سی۔ایس میں کامیابی میرے لئے رحمت ثابت ہوئی کیونکہ اس دوران
زیادہ تر پڑھنے میں توجہ دی تھی اس لئے میرے دل سے اُداسی کم ہو گئی اور اب میں نے
اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اصل میں، میں اپنے آپ سے خوفزدہ
تھا۔ حالانکہ اس کے بعد سے اب تک نہ تو مجھے سیوک سندھورتی ملا تھا اور نہ ہی وردان
سادھانی کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ ان دنوں چونکہ شکار وغیرہ پر بھی نہیں گیا تھا
اس لئے ذرا سکون رہا تھا۔

آخر کار ٹریننگ کے بعد سروس کمیشن سے مجھے ہدایات ملی کہ میں کلکتے پہنچ کر
وائسرائے کے اسٹاف آفیسر سے ملوں۔ وائسرائے بہادر ان دنوں کلکتے میں مقیم تھے۔
میرے والد نے زندگی میں پہلی بار مجھے سنجیدگی سے کچھ نصیحتیں کیں۔ یعنی یہ کہ میں ہمیشہ
اپنے منصب سے وفادار رہوں اور ایسا کوئی کام نہ کروں جس سے اس عظیم الشان خاندان
پر حرف آئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس کے لئے آئی
سی ایس ہونا زندگی کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ اماں کو تو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی
ہوئی کہ میں اب جنگلوں میں مارا مارا پھرنے والا نیم وحشی آدمی نہیں رہوں گا بلکہ ایک اہم
سرکاری افسر بن کر عملی زندگی میں قدم رکھوں گا۔ والد صاحب بدستور من موجی تھے۔
حالانکہ عمر بہت بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی، ٹھیک ہے۔ ایک تجربہ تو مجھے بھی ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان

چاہے کتنا بڑا آدمی ہو، سارے فیصلے وہ خود نہیں کرتا۔ بادشاہ بھی ہے تو اسے راج نیتی کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور وہ دوسروں کے مشوروں پر چلتا ہے۔ اب دیکھو ہمارے شکاری شیر کو کس طرح سرکاری نوکر بنا دیا گیا جبکہ وہ اس جیسے پچاس نوکر رکھ سکتا ہے۔"

"تو، تو ہمیشہ کا بے وقوف ہے۔ کبھی عقل کی بات کی ہو تو جانیں۔ ہمیشہ کا ایسا ہے۔ تیرے باوا نے تجھے جنگلی جانور بنا کر چھوڑ دیا اور تو جنگلوں میں ٹکریں مارتا رہا۔ کبھی کبھی تو تیری صورت دیکھنے کو ترس جاتے تھے ہم۔ خاک پڑے ایسی شکاری زندگی پر۔" یہ دادی اماں کے الفاظ تھے۔ سارے ہی میرے آئی سی ایس کرنے سے خوش تھے۔

بہرحال میں کلکتے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ سری لنکا سے واپسی پر میری زندگی میں وہ ترتیب نہیں رہی تھی جو ایک اعتبار سے میرا مزاج تھی۔ مجھے اب یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ترتیب اور میرا پرانا مزاج واپس آ گیا ہے۔ سفر کے لئے میں اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں اپنے سوٹ کیسوں میں رکھتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی اس وقت میرا موڈ بہت اچھا تھا اور میں مزے سے گنگناتا بھی جا رہا تھا کہ اچانک چمپا کی خوشبو سے میرا دماغ اُڑ گیا...... یہ خوشبو اس سوٹ کیس سے آ رہی تھی جس میں ابھی ابھی میں نے کپڑے رکھے تھے۔

میرے سارے وجود میں وحشت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ میٹھی میٹھی خوشبو میرے ذہن کے نجانے کون سے حصے سے بری طرح ٹکرائی تھی اور میرا سارا وجود اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر قالین پر سوٹ کیس کا سارا سامان الٹ دیا۔ کپڑوں کی تہہ میں مجھے بادامی رنگت کی کوئی چیز نظر آئی تو میں نے ہاتھ بڑھا کر کپڑوں کی تہہ سے وہ چیز کھینچ لی۔ اور ایک بار پھر مجھ پر وحشت کا شدید حملہ ہوا۔ آہ...... یہ وردان سادھانی کا دیا ہوا وہی بھوج پتر تھا جسے میں نے مسل کر ٹرین سے باہر اُڑا دیا تھا۔ کمرہ اس کی تیز خوشبو سے بھر گیا تھا اور میں بری طرح کانپ رہا تھا۔

الٰہی، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ یہ بھوج پتر یہاں پھر میری زندگی پر کیوں مسلط ہو رہا ہے؟ کیا دیکھ رہا ہوں میں یہ؟ سب کچھ کیا ہے یہ......؟ ایک بار پھر میری نگاہیں اس بھوج پتر پر پڑیں اور میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اب اس پر اجے کی تصویر کی بجائے ایک اور اجنبی تصویر بنی تھی۔ یہ تصویر مغربی لباس میں ملبوس کسی شخص کی تھی جو ایک بہت

بڑی الماری سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ مجھے سوتا ہوا ہی نظر آیا تھا۔ لیکن نہیں، وہ سو نہیں رہا تھا۔ اس کی گردن بڑی غیر قدرتی زاویئے سے مڑی ہوئی تھی۔ مزید غور سے دیکھا تو مجھے اس کی کنپٹی میں سوراخ نظر آیا جس سے کوئی سیال بہہ رہا تھا اور وہ سیال اس کے کوٹ پر گر رہا تھا۔ یہ شاید خون تھا۔ میں نے اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ سو فیصدی غیر ملکی معلوم ہو رہا تھا۔ شاید انگریز۔ لیکن یہ صورت میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ خداوند عالم! کیا پھر میں کسی مشکل میں پھنسنے والا ہوں؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟...... کیا ہو رہا ہے یہ؟

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے اس بھوج پتر کو سوٹ کیس میں رکھ کر چابی گھما دی۔ اماں سامان رکھنے میں میری مدد کرنے آئی تھی۔ انہوں نے کمرے میں آتے ہی اِدھر اُدھر دیکھا اور ناک سکیڑ کر کہنے لگیں۔

"خاقان! یہ تیز خوشبو کیسی ہے؟"

"اماں! وہ خانساماں ابھی چمپا کے پھول لے کر آیا تھا۔ بڑی تیز خوشبو تھی ان کی۔ میرے تو سر میں درد ہونے لگا۔ اسی وقت پھنکوا دیئے میں نے۔"

"چمپا کے پھول لے کر آیا تھا؟"

"ہاں اماں۔"

"مگر یہ چمپا کا موسم تو نہیں ہے۔"

"پتہ نہیں کہاں سے اٹھا لایا تھا کمبخت۔"

"بس یہ لوگ بھی سر پھرے ہوتے ہیں۔ پھنکوا دیئے تم نے، اچھا کیا۔ دیکھو کیسی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔"

بہرحال اس سے پہلے کہ میں مزید اس سلسلے میں کوئی بات کرتا میرے ذہن میں ایک تیز درد کی لہر اٹھی۔ یہ لہر اس احساس کا نتیجہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کمرے میں اماں کا ٹھہرنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ضرور اس پر مزید تبصرے کریں گی۔ وردان سادھانی کی نحوست بھوج پتر کی صورت میں سوٹ کیس میں موجود تھی۔ میں نے کہا۔

"آؤ اماں...... باہر چلتے ہیں۔ یہاں تو میرے سر میں درد ہو گیا۔"

"ہاں..... آ جاؤ، چلیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بدبو باہر نکل جائے گی۔" اماں میر
ساتھ کمرے سے باہر آ گئیں۔ پھر کافی دیر تک میں ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔
جب وہ کسی اور کام سے اٹھ کر گئیں تو میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا، سوٹ ک
کھول کر دیکھا تو پھر سر چکراتا محسوس ہوا۔ بھوج پتر اب سوٹ کیس میں نہیں تھا
کمرے میں چمپا کی خوشبو کے مدھم مدھم آثار تھے۔ لیکن بھوج پتر میرے سوٹ کیس
غائب نظر آ رہا تھا۔ بہرحال اب اس کا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں پورے طور پر ماف
الفطرت قوتوں کے بس میں آ چکا ہوں۔ لنکا سے آنے کے بعد بڑی مشکل سے میں
اپنے ذہنی انتشار پر قابو پایا تھا لیکن بھوج پتر کے ظاہر ہونے سے میری تمام اُلجھنیں
احساسِ دہشت پھر اُبھر آیا۔ میرے اندر ایک عجیب سی کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔ میں ا
کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں کیا نہ کروں؟ میرا دل چاہا کہ میں کلکتے نہ جاؤ
لیکن یہ بھی مجبوری تھی۔ سب کچھ تو ہو چکا تھا۔ وہاں نہ جانے سے بھی کوئی خاص فر
نہیں پڑتا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ اپنی اس آگ میں، میں
ہی جلنا چاہتا تھا۔ دوسروں کو جلانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آج تک اجے ورتا میر
ذہن سے نہیں نکل سکا تھا۔

آخر کار دوسرے دن میں کلکتے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دن بھر آرام کیا
میرے دوستوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ میں آ گیا ہوں تو وہ میرے پاس آ گئے ا
میں نے صرف اپنے احساس کو منتشر کرنے کے لئے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح
پروگرام بنا لیا۔ وہ سب بے حد خوش تھے کہ میں اب کلکتے میں ہی رہوں گا۔ اس طر
ایک بار پھر گھومنے پھرنے کے مواقع حاصل ہوں گے اور وہ بھی ایک بہت اچھی اور بڑ
حیثیت سے۔ میں خود بھی اب ان لوگوں کے ساتھ شامل رہنا چاہتا تھا۔ پہلی بات تو یہ ک
پرانے ساتھیوں کی رفاقت ہمیشہ دنیا کے دوسرے لوگوں سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔
دوسری بات یہ کہ میں سوچ رہا تھا کہ اب اپنے آپ کو کسی ایسے طریقے سے منظم کروں ک
میرے اندر قوت ارادی پیدا ہو جائے اور میں ان منحوس طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے
تیار ہو جاؤں۔ واقعی بڑی عجیب بات تھی۔ انسان کسی کو اپنا دشمن بنا لیتا ہے، دشمنی چلتی
ہے۔ اسے خود بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر احتیاط برتی جائے تو
دشمن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ نادیدہ دشمن، وہ پراسرار لوگ جو ایک مسلمان لڑکے کو

ایک مذہبی فرقے کا اوتار بنانا چاہتے تھے وہ میرے لئے نامعلوم تھے۔ ان کے لئے کیا
کرتا، کیا نہ کرتا۔

لیکن بہرحال میں ہر صورتحال سے نمٹنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ بلویدا
ہاؤس کے اسٹاف افسر سے ملنا تھا۔ رات میں نے اپنے ہوٹل میں نسبتاً آرام سے
گزاری۔ صبح اپنا شاندار سوٹ پہن کر میں نے اپنے کاغذات سنبھالے اور بلویدا ہاؤس
روانہ ہو گیا۔ اس وقت آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت مسلط تھی۔
انگریزی حکومت کے انتظامی چونچلے ویسے قابل ذکر ہوتے ہیں۔ میں صبح پونے نو بجے
بلویدا ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ یہاں چار مرتبہ میرے کاغذات کی پڑتال ہوئی، شناختی دستاویزات
دیکھی گئیں۔ پھر کہیں جا کر وائسرائے ہاؤس میں داخل ہونے دیا گیا اور دوپہر کے دو
بجے کے قریب اس آفیسر صاحب بہادر کے ہاں باریابی نصیب ہوئی۔ ایک عجیب سا ڈھیلا
ڈھالا ہیڈ کلرک مجھے ملا اور اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ خاقان جمشیدی صاحب کو اسٹاف
افسر نے یاد فرمایا ہے۔

بہرحال میں اسٹاف آفیسر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسٹاف آفیسر سر جھکائے کچھ
لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے انگریزی میں سلام کیا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے
دیکھا اور ایک بار پھر مجھ پر بجلی گر گئی۔ وہ بریف کیس جس میں میرے کاغذات تھے،
میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کیونکہ اسٹاف افسر کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں
بھوج پتر پر اس چہرے کو موت کی نیند سویا ہوا دیکھ چکا تھا۔ اسٹاف افسر نے تعجب بھری
نگاہوں سے مجھے اور پھر زمین پر گرے بریف کیس کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے
چہرے پر ناگواری کا تاثر پیدا ہوا لیکن دوسرے لمحے اس نے انگریزی چارسوبیسی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے روایتی مسکراہٹ سے کام لیا اور کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر مصافحہ کے لئے
ہاتھ بڑھا دیا اور بولا۔

"ہیلو مسٹر خاقان جمشیدی! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے نجانے کتنی ہمت اور حنت کے ساتھ اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔ بہرحال میں
نے تیزی سے بریف کیس اٹھایا اور بڑھ کر مصافحہ کیا۔ پھر میں نے کہا۔

"سوری سر! اصل میں آپ کی شخصیت کچھ ایسی متاثر کن ہے کہ میں اپنے اعصاب پر
قابو نہیں پا سکا۔ معذرت چاہتا ہوں آپ سے۔"

حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک چالاک انگریز تھا، ایک انتہائی چالاک قوم کا نمائندہ جس نے اپنی چالاکی سے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ اپنی تعریف سن کر ہر شخص پر تھوڑا بہت اثر ہوتا ہے۔ وہ مجسم اخلاق بن گیا اور اس نے اس طرح گردن ہلائی جیسے واقعی اس کی شخصیت اتنی ہی اہم ہو۔ البتہ مجھے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے معلوم ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ ادھر میں اس کے چہرے کے نقوش کو مزید غور سے دیکھ رہا تھا اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ مجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ بھوج پتر پر میں نے اسی چہرے کو دیکھا تھا؟ اور میری یادداشت کا ہر نقش یہی تصدیق کر رہا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی تصویر بھوج پتر پر مُردہ حالت میں بنی ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ”آپ کے بارے میں تو میں جان چکا ہوں مسٹر خاقان! میرا تعارف آپ سے نہیں ہے۔ میرا نام این مورالس ہے۔“

”آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی جناب!“ میں نے پُراخلاق لہجے میں کہا۔ لیکن میں ابھی تک ذہنی طور پر اس کیفیت سے متاثر تھا جو میں نے بھوج پتر پر دیکھی تھی۔ سو فیصدی وہی تھا۔ اور جو کچھ اجے ورتنا کے ساتھ پیش آیا تھا، اسے ذہن میں رکھتے ہوئے میں پورے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ اجے ورتنا کے بعد اب مورالس کی باری ہے۔ حالانکہ ان تمام چیزوں کا کوئی جواز نہیں تھا میرے پاس۔

ایک بار پھر میں نے مورالس کو غور سے دیکھا، یہ تیس پینتیس سال کا صحت مند آدمی تھا صحیح معنوں میں۔ افسوس کی بات تھی کہ بہت جلد یہ سر میں گولی لگنے سے ہلاک ہو جائے گا۔ مگر کیوں اور کب؟ کیا اس شخص کا میری آئندہ زندگی میں کوئی دخل ہے؟ اور کیا اس کا خون بھی میری گردن پر ہی ہو گا؟ حالانکہ سچی بات تو یہ تھی کہ اجے ورتنا تو ان افریقی قوتوں کے انتقام کا شکار ہوا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے ان کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اس شخص کا کیا رول ہو گا؟ میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ لیکن افسرِ اعلیٰ کے سامنے تھا۔ سنبھل کر اس سے گفتگو کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن اس کی پراسرار مسکراہٹ نے میری الجھن اور بڑھا دی تھی۔ یہ انوکھی مسکراہٹ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار میں نے یہ غور بھی کیا کہ ممکن ہے یہ اس کے چہرے کا ایک حصہ ہو۔ لیکن اندازہ ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن

کیا پوچھتا؟ کس طرح پوچھتا؟ وہ بہرحال ایک بڑا افسر تھا اور اس کے ماتحت کی حیثیت سے مجھے وائس ریگل لاج میں اپنے فرائض انجام دینا تھے۔ انگریز کی حکومت میں سرکاری ادب و آداب کا خیال رکھنا بڑا ضروری تھا۔ بہرحال دفتری نوعیت کی گفتگو کے علاوہ اور کوئی ذاتی گفتگو نہیں کرنی۔ ابھی میں اسی الجھن میں تھا کہ یکایک اس نے پوچھا۔

”ایک سوال کروں آپ سے مسٹر خاقان جمشیدی؟“

”جی سر، ضرور۔“ میں نے نیاز مندی سے کہا۔

”کیا ہماری ملاقات پہلے کہیں ہو چکی ہے؟“

”جی؟“ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر میں نے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں سر۔“

”آپ جب کمرے میں داخل ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر چونکے تھے۔ بلکہ اس قدر پریشان ہوئے تھے کہ آپ کے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹ گیا۔“

”جی سر، جی......“

”مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ آپ سے میری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ یا آپ نے مجھے اس سے پہلے کہاں دیکھا تھا؟“

”سر! وہ...... میں...... میں......“ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو وہ ہنس پڑا اور پھر بولا۔

”میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے کہاں دیکھا ہو گا۔“

”سس...... سر!...... مم...... میں...... میں...... حقیقت میں، میں نروس ہو گیا تھا۔“ وہ بولا۔

”آپ نے مجھے پشاور میں دیکھا ہو گا کرنل کی وردی میں۔“

”پشاور...... کرنل......؟“ میں نے حیرت سے دوہرایا۔ جواب میں مورالس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ پھر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

”بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ تماشہ ہو چکا ہے۔ ایک شخص نے مجھے آگرا کینٹ کے فوجی ہسپتال میں پلاسٹر میں جکڑا ہوا دیکھا تھا اور تیسرے دن اس نے مجھے کلکتے میں ایک کلب میں یا ڈینس سکوپ میں یا بلویڈا ہاؤس میں۔ ہاہا...... ہاہاہا...... تو آپ نے مجھے کس حال میں دیکھا تھا، بتایئے؟“ وہ باقاعدہ مجھ سے کھیل رہا تھا اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ابھی تک ناکام تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ بیوقوف میں نے تجھے جس حال

میں دیکھا ہے اگر میں تجھے بتا دوں تو تیری خود ہوا خراب ہو جائے گی۔ اس کی یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے کہا۔

''آپ نہیں سمجھے مسٹر جمشیدی! اصل میں ہم دو بھائی ہیں، جڑواں بھائی۔ میرا بھائی این پیٹر جسے آپ نے پشاور چھاؤنی میں دیکھا ہو گا، مجھ سے بڑا ہے لیکن صرف چالیس منٹ بڑا۔ ہم دونوں کی حد درجے مشابہت بہت سے لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بن چکی ہے۔ کیا سمجھے آپ؟''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کی پراسرار مسکراہٹ کے پیچھے کوئی گہرا راز نہیں تھا بلکہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں اسے دیکھ کر اس لئے چونکا ہوں کہ میں نے اس کی شکل کے جڑواں بھائی کو کہیں اور دیکھا ہے اور وہ بڑے دوستانہ انداز میں اپنے بھائی کے واقعات مزے لے لے کر سنانے لگا اور میں دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ یہ الجھن آخر کار دور ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ میں اس کو بتا دوں کہ اس کا بھائی یا تو اب تک گولی کا نشانہ بن چکا ہے یا جلد ہی ہلاک ہونے والا ہے۔ لیکن بھوج پتر کا راز میں کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ ایک اطمینان سا ہوا تھا کہ یہ شخص جس سے آئندہ زندگی میں میرا واسطہ پڑے گا، میری وجہ سے ہلاک نہیں ہو گا۔ ر اس کا بھائی تو وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔

بہرحال اسٹاف آفیسر سے میری پہلی ملاقات نے اس درجہ غیر رسمی رخ اختیار کر لیا کہ گھنٹے بھر کے بعد جب میں اس سے رخصت ہوا تو وہ مجھے اپنے بنگلے پر رات کے کھانے کی دعوت دے چکا تھا۔ اصل میں اسے بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ میں یہ ملازمت صرف تنخواہ کے لئے نہیں کر رہا ہوں بلکہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے ایک طرح سے میری حکومت قائم ہے اور میں ایک بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا ہوں۔

بہرحال اپنے بنگلے پر اس نے میرا استقبال اپنے ایک ماتحت افسر کے تحت نہیں بلکہ ایک معزز مہمان کی حیثیت سے کیا۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ مورالس اس کوٹھی میں اپنے ملازموں کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔ رات کے کھانے پر اس نے چار پانچ انگر دوستوں کو بھی بلا لیا تھا اور وہیں اس نئی خاتون سے میرا تعارف ہوا جو وائسرائے کی پر سیکرٹری تھی۔ اس کا نام ایلس فیوری تھا۔ میں نے خاتون اسے اس لئے کہا کہ وہ اکتیس بتیس برس کی عورت تھی لیکن دیکھنے میں لڑکی لگتی تھی۔ البتہ اس کے اندر ایک خوبی یہ تھی

وہ نہایت ذہین، بدمزاج اور انسانوں سے دور رہنے والی نظر آ رہی تھی۔ ہم اسے لڑکی اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ابھی تک مِس تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور آئندہ بھی ایسا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دو چار رسمی جملوں کے علاوہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن اس کا چہرہ مجھے بہت عجیب و غریب محسوس ہوا۔ پتلے پتلے ہونٹ، دبلا پتلا بدن، موٹے شیشوں والی عینک، بھورے بال اور ہری آنکھیں۔ اسے دوسری نگاہ دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بلی جیسی شخصیت کی مالک عورت ہے۔ بلاشبہ وہ ایک بلی معلوم ہو رہی تھی جس کی مرضی کے خلاف اگر ذرا سی بھی بات ہو جائے تو وہ غرا غرا کر آسمان سر پر اٹھا لے اور جو بھی سامنے آئے اسے نوچ ڈالے۔

بہرحال کلکتے میں وائس ریگل لاج کے افسروں اور ماتحتوں سے میرا تعارف ہوا۔ چوتھے پانچویں دن وائسرائے بہادر کے سامنے پیشی ہوئی۔ وائسرائے لارڈ کارل بروکس خاموش طبع شخص تھا۔ اس نے مجھ سے دو چار رسمی باتیں کیں اور پھر سرکاری امور کے بارے میں ہدایت دے کر رخصت کر دیا اور میں وائسرائے کے انتظامات معاملات کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ بل ویدا ہاؤس کلکتے میں وائسرائے کی قیام گاہ تھی۔ جب وائسرائے دہلی جاتا تو اس کا اسٹاف بھی اس کے ہمراہ دہلی چلا جاتا۔ ایک طرح سے ہماری زندگی خانہ بدوشوں جیسی زندگی تھی۔ وائسرائے جہاں بھی ہوتا ہمیں اس کے ساتھ وہاں قیام کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح کلکتے میں وائسرائے کا قیام طویل ہوا۔

کلکتہ میرے لئے ایک گھر کی طرح تھا۔ یہاں میرے بہت سے دوست بھی تھے جنہیں میری شخصیت کا مکمل طور پر علم ہو چکا تھا لیکن میں نے اپنے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی اور ایک سرکاری افسر ہونے کے ناطے ذرا بھی کسی قسم کی علیحدگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ میرا فرصت کا وقت بہت اچھی طرح گزرتا تھا اور دوسرے لوگوں کے علاوہ اب مورالس بھی میرا دوست بن گیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ زیادہ تر گھوڑ سواری کرتے یا دوسری تفریحات کرتے۔ میری زندگی کے دن بڑے ہموار اور پُرآسائش گزر رہے تھے۔ مورالس اگرچہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا مگر آدمی خوش مزاج تھا۔ ویسے اس شخص کے بارے میں انگریزوں اور دیسی افسروں میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ کسی نامعلوم لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ شادی

کے قابل نہیں ہے۔ ویسے ایک اندازہ اور بھی مجھے ہوا، وہ یہ کہ مورالس کی ایلس فی
کے علاوہ کسی اور سے نہیں بنتی تھی۔ وہ عورت ہی اس ڈھب کی تھی۔ مورالس ایک
نشے کے عالم میں بولا۔

''مسٹر خاقان! آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں ایلس فیوری پر جان دیتا ہوں
اتنا عشق کرتا ہوں اس سے کہ شاید رومیو نے جولیٹ سے بھی نہ کیا ہو۔''

''مجھے اندازہ ہے مسٹر مورالس۔''

''لیکن وہ عورت پتہ نہیں کمبخت اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ میں نے اسے شادی
پرپوزل دے دیا ہے لیکن اگر اس نے مجھ سے شادی نہ کی یا پھر میری قربت قبول نہ ک
تم دیکھ لینا ایک دن کیا ہو جائے گا۔''

میں نے حیرت سے مورالس کو دیکھا۔ اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہو چکا تھا اس دنیا
رہتے ہوئے کہ نشے کے عالم میں انسان کبھی کبھی سچ بھی بول دیتا ہے۔ مورالس نے
الفاظ بے شک نشے کے عالم میں کہے تھے لیکن بڑا ہیجان تھا ان الفاظ میں۔ تعجب کی با
تھی، ایک با اصول انگریز اس انداز میں سوچتا ہے۔ لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی
انڈین سول سروس کے سنگین چہرہ بت کا یہ روپ میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔ مجھے
اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستانی معاشرے نے جس طبقے کو دیوتاؤں جیسا درجہ دے رکھا
اس کی نجی زندگی اس قدر افسوس ناک ہے۔ بہرحال ظاہر ہے یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں
نے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ اپنے محکمے میں، میں نیا تھا۔ لیکن اپنی فطرت اور خو
اخلاقی کے بل پر سرکاری ملازموں کے اس طبقے میں قبول ہو گیا اور بہت جلد ان کے
اندرونی حلقوں تک میری رسائی ہو گئی۔ ساتھ ہی اپنے کالج کے استادوں اور ہم جماعت
دوستوں سے میری ملاقاتیں بدستور رہتی تھیں۔ انہی پرانے ساتھیوں میں میرا ایک
دوست بھی تھا جس کا نام اختیار تھا۔ میں اور اختیار بہت دن ہوسٹل کے ایک کمرے میں
رہے تھے اور اب وہ دریائے ہگلی میں چلنے والے کسی اسٹیمر پر انجینئر لگا ہوا تھا۔ میں
چونکہ پرانے دوستوں میں سے کسی سے رابطہ نہیں توڑا تھا اس لئے وہ مجھ سے اکثر ملنے
جایا کرتے تھے۔

ایک دن اختیار نے ایک غیر ملکی شخص کو مجھ سے ملایا۔ اس کے اس نئے دوست کا نا
ہیگ جونس تھا۔ ہیگ جونس بیالیس، ترتالیس سال کا لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ لیکن اس کے

سر کے بال وقت سے پہلے سفید ہو چکے تھے۔ اپنی آنکھوں ہی سے وہ ایک اوباش مزاج
اور عیار فطرت کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ اور بھاری جبڑے اس
کے ظالمانہ مزاج کی عکاسی کرتے تھے۔ ہیگ جونس اسپین کا رہنے والا تھا اور کئی زبانیں
روانی سے بول سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ شاندار سوٹ میں ملبوس نظر آتا تھا اور اس کی انگلیوں میں
انتہائی قیمتی ہیروں کی انگوٹھیاں ہوتیں۔ وہ بیش قیمت سگار پینے کا عادی تھا۔ اسے دیکھتے
ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ شخص بے پناہ دولت مند ہے۔ البتہ مجھے پہلی ملاقات میں یہ
اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ہنگامہ پسند آدمی ہے اور اس کا اندازِ گفتگو ایسا ہے کہ جہاں بیٹھ
جائے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تاجر ہے اور کاروبار کے
سلسلے میں کچھ دن کلکتہ ٹھہرے گا۔ خوش باش غیر ملکیوں کی طرح اس کو محفل آرائی کا فن
بھی آتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

''زندگی میں ہر طرح کے دلچسپ تجربات کئے ہیں میں نے۔ اور کسی بھی جگہ بیٹھ کر
میں دوستوں کو بیوقوف بنا سکتا ہوں۔ مجھے معاف کرنا میرے الفاظ میں بے ساختگی ہے۔
اب جیسے مجھے بہت شعبدے آتے ہیں۔'' اس نے اپنی جیب سے تاش کی گڈی نکالی اور
اس کے بہت سے کرتب دکھائے۔ شعبدہ بازی سے بات نظر بندی یا مسمریزم تک پہنچی تو
اس نے پُروقار اور ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں مسمریزم کا ماہر ہوں۔ لیکن اس کے مظاہرے عام نہیں ہوتے۔ میں تمہیں
کسی وقت اپنے اس فن کا مظاہرہ بھی دکھاؤں گا مسٹر خاقان! کیونکہ میں بہت کم دوست
بناتا ہوں اور جنہیں دوست بنا لیتا ہوں پھر ان سے بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ تمہارے
اندر ایک اچھے دوست کی تمام صفات موجود ہے۔''

دو ایک مرتبہ تو وہ میرے دوست کے ساتھ آیا لیکن اس کے بعد وہ اختیار احمد کے بغیر
بھی میرے پاس پہنچا۔

''اکیلا آ گیا ہوں، مائنڈ تو نہیں کرو گے میری جان؟'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''نہیں نہیں، مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے۔ بیٹھئے پلیز۔''

''اچھا یہ بتاؤ، پینے پلانے کی کیا کیفیت ہے؟''

''افسوس، میں نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے، وہاں شراب کی گنجائش نہیں تھی۔
اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔''

"کوئی مسئلہ نہیں...... کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنا شراب خانہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"
اس نے کہا اور اپنی جیب سے شراب نکال کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ویسے شراب کے بارے میں میرے خیالات بے حد خراب تھے۔ نشے کے عالم میں انسان وہ بولتا ہے جو اس کے اندر بسا ہوا ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ اپنے اندر کی باتیں مجھے بتا رہا ہے لیکن وہ ڈینگیں ایسی مارتا کہ سن کر ہنسی آتی۔ کبھی کبھی اس طرح سنجیدہ ہو جاتا کہ بالکل دوسرا آدمی معلوم ہوتا۔ ایک دن شراب کی ایسی ہی کیفیت میں اس نے مجھے بتایا۔

"میں تمہیں ایک بہت ہی گہری بات بتاؤں۔ وعدہ کرو کہ ہنسو گے تو نہیں۔"

"چلو وعدہ، میں نہیں ہنسوں گا ڈیئر ہیگ۔"

"تو سنو، میرا تعلق اسپین سے نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میرا باپ مراکش کا ایک عیسائی تھا اور میری ماں مصر کی قبطی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ کیا سمجھے؟"

"تو پھر تم اپنے آپ کو اسپینی کیوں ظاہر کرتے ہو؟"

وہ آنکھیں بند کر کے ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "بہت سی باتیں صیغہ راز میں ہوتی ہیں۔ اچھا ایک بات بتاؤں۔ میری ایک محبوبہ ہے جو پہلے یہاں رہتی تھی لیکن اب یہاں نہیں رہتی۔"

"اب کہاں رہتی ہے وہ؟" میں نے اس کی بے تکی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"یہی تو پتہ نہیں۔ نجانے کہاں کہاں اسے تلاش کر چکا ہوں۔ دیکھو میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔" اس نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے کی۔ میں تو اب یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری تقدیر میں قدرت نے صرف ذہنی جھٹکے ہی لکھے ہیں۔ ایک بھولی داستان مجھے پھر سے یاد آ گئی تھی۔ تصویر کلاڈیا کی تھی۔ سو فیصدی کلاڈیا کی تصویر تھی یہ۔ اور کلاڈیا کوئی ایسا کردار نہیں تھا جسے میں آسانی سے نظر انداز کر دیتا۔ وہ میری زندگی کی فہرست سے خارج نہیں ہوئی تھی۔ بس یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اپنی الجھنوں میں پھنس کر میں نے اسے فراموش کر دیا تھا۔ بلکہ کچھ عرصے پہلے کی بات ہے کہ ایک بار میرا دل چاہا تھا کہ میں کرنل صغیر سے ملاقات کروں۔ لیکن پھر خوف دل پر چھا گیا تھا اور وہ خوف اجے ورتنا کی صورت سے متعلق تھا۔ کلاڈیا نے جس پراسرار کتاب کا تذکرہ کیا تھا وہ میرے لئے بڑی انوکھی نوعیت کا حامل تھا اور میں یہ سوچتا تھا کہ کہیں کلاڈیا بھی کوئی

ہی بات مجھ سے نہ کہہ بیٹھے جو خود اس کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔ پھر بھی میرا تجسس جاگ اٹھا۔ میں تصویر دیکھ ہی رہا تھا کہ ہیگ نے وہ تصویر میرے ہاتھ سے لے لی اور مسکراتا ہوا بولا۔

"یہ اتنی ہی خوبصورت ہے کہ کوئی بھی اس کی تصویر کو ایک دفعہ دیکھ کر دیر تک دیکھتے رہنے کی خواہش کو اپنے اندر سے نہیں نکال سکتا۔"

"واقعی، آپ خوش قسمت ہیں مسٹر ہیگ کہ اتنی حسین لڑکی آپ کی محبت میں گرفتار ہے۔"

وہ ایک دم افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ میری محبت میں گرفتار نہیں ہے۔ یہ تو ون وے ٹریفک چل رہا ہے۔ ویسے بڑی پراسرار لڑکی ہے۔ جانتے ہو اس سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی۔ میں ایک سمندری سفر کر رہا تھا کوئین وکٹوریہ نامی جہاز پر۔ میرا یہ سفر بہت ہی خوبصورت گزر رہا تھا کہ ایک دن میں نے تاروں کی چھاؤں میں اسے جہاز کے عرشے پر دیکھا۔ سفید رنگ کے لباس میں وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا انداز بھی ایسا ہی تھا۔ تم کبھی اسے چلتے ہوئے دیکھو تو لگے جیسے فضا میں تیر رہی ہو۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک بدبخت شخص نے مجھے آواز دی تو میری نگاہیں اس کی طرف سے ہٹ گئیں۔ اور پھر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ تم یقین کرو، میں نے اسے پورے جہاز کے چپے چپے پر تلاش کر لیا۔ کوئی ایک ہفتے تک میں اس کی کھوج میں رہا۔ یہاں تک کہ اپنے اختیارات سے کام لے کر میں نے جہاز کے کپتان سے ایسی کسی لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کی لیکن کپتان تک مجھے اس کے بارے میں نہ بتا سکا جبکہ خفیہ طور پر اس نے مجھے ایک ایک کیبن کی سیر کرائی۔ وہاں موجود ہر ایک نوجوان لڑکی کو مجھے دکھایا لیکن وہ ان میں موجود نہیں تھی۔ میں اس وقت اپنے دل و دماغ کو یہ سوچ کر سکون دینے کی کوشش کرنے لگا کہ ممکن ہے میں نے نشے کے عالم میں اسے دیکھا ہو، میرا مطلب ہے وہ صرف میرا تصور ہو۔ جہاز کے سفر کے دوران میں خود کو یہی سمجھانے لگا کیونکہ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔

اس واقعے کے کوئی تین ماہ کے بعد میں رنگون میں تھا اور ایک لفٹ سے رنگ
ایک عمارت کی آٹھویں منزل پر جا رہا تھا کہ میں نے اسے دوسری لفٹ سے نیچے
ہوئے دیکھا۔ اصل میں لفٹ کا دروازہ شیشے کا بنا ہوا تھا اور اس سے باہر دیکھا
تھا۔ لفٹ اوپر چل پڑی تھی۔ میری نگاہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ لفٹ کو سب
پہلے چوتھی منزل پر رُکنا تھا۔ میں چوتھی منزل پر اتر کر نیچے بھاگا اور اس کے بعد بس
لو کہ میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف دوڑتا رہا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی اس حالت پر
گئی۔ وہاں موجود لوگ مجھے حیرت سے اس طرح بھاگتے دوڑتے دیکھ رہے تھے۔
میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہی تھی۔ سو فیصدی وہی تھی۔ پھر تم یوں سمجھ
رنگون مجھے صرف چھ دن کے لئے رُکنا تھا لیکن چوبیس دن میں نے رنگون میں گزار
بس میں ہوتا تھا اور میری کار اور اس کے بعد وہاں کی گلیاں، کوچے، بازار، مارکیٹیں
ہال ہر جگہ میں اسے تلاش کرتا پھرتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ ایک عجیب سا سحر میرے
و دماغ پر طاری تھا۔ اب تو مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ کوئی آوارہ روح ہو جو بار بار
نظر آ جاتی ہو۔ اور تیسری بار پھر وہ مجھے ملی۔ جانتے ہو کہاں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ معاملہ اگر کلاڈیا کا نہ ہوتا تو شاید میں اتنی دلچسپ
نہ لیتا۔ میں نے اس سے دلچسپی سے پوچھا۔ ''تیسری بار وہ تمہیں کہاں ملی؟''

''روم میں...... میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ روم گیا ہوا تھا۔ یہ دوست ا
معزز تھے۔ انہوں نے مجھ سے روم کی سیر کے بارے میں مشورے کئے اور پھر ہم
پڑے۔ روم سے کیپیٹن جمنازیم میں جس کی تاریخ بہت بڑی ہے، میں نے ایک بار
اسے دیکھا۔ اس وقت ہم لوگ کیپیٹن جمنازیم کی فوٹو گرافی کر رہے تھے۔ کیمرہ میر
پاس تھا۔ وہ ایک ریلنگ سے ٹکی ہوئی ڈولفن شو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن
فوراً ہی یہ خیال آیا کہ میں اس کی تصویر بنا لوں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمیشہ کی طرح اب
غائب ہو جائے۔ چنانچہ میں نے کیمرے کا رُخ اُس کی جانب کر کے اس کی
تصویریں بنائیں۔ وہ ان تصویروں سے بے خبر تھی۔ ذرا دیکھو، غور کرو۔ جہاں وہ
کھڑی ہے اور جو ریلنگ تمہیں نظر آ رہی ہے یہ کیپیٹن جمنازیم کی ہے جو روم میں
ہے۔ اس وقت وہاں اتنا رش تھا کہ تصویر بنانے کے بعد میں نے اپنے دوستوں
معذرت کی اور کہا کہ میں ابھی آیا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ بس انسانوں کی بھیڑ میں

لمحوں کے لئے میری نگاہوں سے اوجھل ہوئی تھی اور پھر میں اسے دوبارہ تلاش نہیں کر
کا۔ یہاں تک کہ میرے دوست پریشان ہو کر واپس چلے گئے کہ میں کہاں چلا گیا۔ لیکن
پر اسے دیکھ کر ہمیشہ ایسی ہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔
میں، میں نے ان لوگوں سے معذرت کی۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ فوراً وہ فلم
ولپ کروائی۔ یہاں ایک کسوٹی تھی اس بات کی کہ اگر وہ کوئی روح ہے تو اس تصویر میں
یں آئی ہو گی۔ لیکن یہ دیکھ لو، اس کی وہ تمام تصویریں میرے پاس محفوظ ہیں جو میں
نے کیپیٹن جمنازیم میں بنائی تھیں۔ یہ ہے میری محبوبہ اور میں اسے ہر لمحے تلاش کرتا رہتا
وں۔ حالانکہ میں ایک خواب دیکھنے والا آدمی نہیں ہوں، میری زندگی پریکٹیکل رہی ہے۔
لیکن اس لڑکی نے میرے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔ پتہ نہیں کون ہے، کہاں ہے۔''

میرے اندر ایک عجیب سی لہر اٹھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں اسے
کلاڈیا کے بارے میں بتا دوں۔ لیکن پھر نجانے کون سے تصور نے میری زبان بند کر
دی۔ یہ وہ پابندی نہیں تھی جو بھوج پتر کے حوالے سے مجھ پر لگائی گئی تھی بلکہ یہ شاید
میرے اندر کی کوئی بات تھی جس نے مجھے روک دیا۔ البتہ ہیگ کی سنائی ہوئی کہانی
میرے لئے بڑی حیران کن تھی۔ ویسے بھی کلاڈیا نے اپنے بارے میں جو تفصیلات مجھے
بتائی تھیں وہ اس قدر حیران کن تھیں کہ مجھے اس کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے تھا۔
لیکن مجھ پر جو کیفیات طاری تھیں میں ان سے نہیں نکل سکا تھا۔ اور اس کے بعد کچھ ایسی
مصروفیات ہوئیں کہ بے شک میں دوسرے دوستوں سے ملا لیکن کلاڈیا سے نہ مل سکا اور
نہ ہی اس دوران وہ میرے ذہن میں آئی۔ حالانکہ وہ خود ایک پُراسرار کردار تھی۔ لیکن اب
جبکہ میں نے ہیگ کی زبانی یہ تمام تفصیلات سنیں تو ایک دم سے کلاڈیا میرے ذہن میں
جاگ گئی۔ واقعی وہ بھی ایک پراسرار وجود اور پراسرار کردار ہے۔

میں نے ہیگ سے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن خود خفیہ طور پر کرنل صغیر کی کوٹھی
پر جا پہنچا۔ کلاڈیا کی خیریت اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کرنل کے ہاں میں اجنبی آدمی
نہیں تھا لیکن جب میں کوٹھی پر پہنچا تو دروازے کے ہی چوکیدار نے بتایا کہ کرنل صاحب
اپنی پوری فیملی کے ساتھ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اور ان کو گئے ہوئے بھی کئی ماہ گزر
گئے ہیں۔ کوئی لمبا پروگرام ہے ان کا۔''

''ان کی بیٹی کلاڈیا بھی گھر پر نہیں ہیں؟''

"نہیں سر! پوری فیملی گئی ہوئی ہے۔ ان کی مسز، بیٹی اور وہ خود۔ اور بھی چند افراد کے ساتھ ہیں۔"

"واپسی کا کچھ پتہ ہے؟"

"نہیں سر! کچھ پتہ نہیں ہے۔"

پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ "اچھا ایک بات بتاؤ، وہ یہ سے کس طرح گئے ہیں؟"

"سر! یہاں سے تو وہ سمندری جہاز سے گئے تھے۔ اب اس کے بعد معلوم نہیں کہاں پہنچے اور کہاں سے کہاں گئے۔ ویسے ان کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی ہیں وہ خیریت سے ہیں اور ابھی ان کی واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

سمندری جہاز کے سفر کے بارے میں سن کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ بہرحال ا پراسرار زندگی تو میرے ہمرکاب تھی ہی۔ کیا کہتا اور کیا نہ کہتا۔ کوئی بات ہی نہیں کہی سکتی تھی۔

ادھر اختیار کے ذریعے ملنے والے شخص کا تعلق بھی چونکہ حکمران گروہ سے تھا اس اس کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی تھی کہ آخر وہ ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟ مہینے دو مہینے اس کا قیام یہاں رہا تھا اور اس نے ہم لوگوں پر پیسہ صرف کر دیا کہ مجھے وحشت ہونے لگی وہ ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی پروگرام بناتا رہتا اور اس پروگرام کے سارے اخراجات وہ خود برداشت کرتا تھا۔

سچی بات ہے کہ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ آخر یہ شخص ہے کس چکر میں؟ وہ مجھے ا اختیار کو ضد کر کے ریس کورس لے جاتا۔ ہماری طرف سے گھوڑوں پر بڑے بڑے لگاتا، گھوڑے جیت جاتے تو ساری رقم ہماری جیبوں میں ٹھونس دیتا۔ ہار جاتے تو ا کے جوتے کو بھی پرواہ نہ ہوتی۔ ہم کوشش کرتے کہ وہ ہم پر اتنا نہ خرچ کرے لیکن ہماری ایک نہ چلنے دیتا۔

ایک دن اختیار کے اسٹیمر پر ہگلی کی سیر کرتے ہوئے اس نے ایک اور انکشاف کیا میرے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ ہیگ نے مجھے بتایا کہ وہ ڈرگز کا بہت بڑا سوداگر ہے ا ایک بین الاقوامی گروہ کا سرغنہ ہے۔ اس گروہ کا کام ہانگ کانگ سے بحیرہ روم تک ا سطح پر پرفیوم، کوکین، ہیروئین، وغیرہ کی فروخت اور دنیا بھر سے پکڑی ہوئی لڑکیوں

تجارت کرنا ہے۔ میں اس وقت بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ حسب عادت شراب کے نشے میں بڑ ہانک رہا ہے کیونکہ نشے میں وہ ہمیشہ ہی رہتا تھا اور عام طور سے الٹی سیدھی ہی ہانکتا رہتا تھا۔ اگر تھوڑی سی بھی عقل ہوتی اس میں تو وہ ایک سرکاری افسر کو یہ باتیں بتانا کسی طور بہتر نہ سمجھتا۔ اب تک یا تو وہ ڈینگیں مارتا رہا تھا یا پھر شعبدے دکھاتا رہا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے ہپناٹزم کا کھیل بھی دکھا دیا اور میں اس کی مہارت کا قائل ہو گیا۔

"تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں صرف ایک سڑک چھاپ شعبدہ گر ہوں یا جو کچھ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا رہا ہوں یا تمہیں تاش کا جو کھیل دکھاتا رہا ہوں وہ صرف ایک تفریح ہے۔ نہیں میرے دوستو، میں بین الاقوامی شخصیت کا مالک ہوں۔ تم لوگ میری حقیقت کو نہیں پہنچ سکتے۔ اچھا دیکھو، مسمریزم کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ میں نے تم سے دعویٰ کیا تھا نا، میں تمہیں تماشہ دکھاتا ہوں۔"

اس وقت کئی افراد وہاں موجود تھے۔ سامنے کی میز پر ایک بڑا سا گلدان رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلدان کو گھورنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد گلدان میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھنا شروع ہو گیا اور میز سے کوئی دو فٹ بلند ہو کر خلا میں معلق ہو گیا۔ سب حیران نگاہوں سے ہیگ کو دیکھ رہے تھے اور وہ گلدان پر نظریں جمائے بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ کوئی دو منٹ تک معلق رہنے کے بعد گلدان آہستہ آہستہ اپنی جگہ واپس آ گیا۔ مسمریزم کا یہ کمال دکھانے کے بعد ہیگ نے اپنے گرد کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اور اس طرح ہنسنے لگا جیسے اس نے کوئی دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت وہاں جتنے افراد موجود تھے سب اس سے مرعوب ہو گئے جن میں، میں بھی شامل تھا۔

یہ اس کی شخصیت کا جادو تھا یا پھر مسمریزم کی کارستانی تھی کہ ایک دن میں نے جب اس کا تعارف این مورالس سے کرایا تو این مورالس بھی اس کی شخصیت سے بری طرح متاثر ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"کمال کی شخصیت ہے مسٹر ہیگ کی۔ تم نے اب تک انہیں کہاں چھپا کر رکھا تھا؟"

"بس سر! آپ بڑے آدمی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اتنی نفیس شخصیت کے مالک ہیں کہ اپنے ماتحتوں سے بھی دوستوں کی طرح پیش آتے ہیں۔"

"بھئی ہیگ جونس جیسی شخصیتیں بہت کم ملتی ہیں۔"

میں نے تنہائی میں ہیگ جونس سے پوچھا۔ ''ہیگ! مجھے ایک بات بتاؤ؟''

''ہاں، کہو؟''

''جب تم مسمریزم میں اتنی مہارت رکھتے ہو تو پھر تم نے کلاڈیا کو سحر زدہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اسے کیوں نہیں مجبور کیا کہ وہ تمہاری محبت کا دم بھرے؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے میری بات کا جواب دیا۔

''کیا؟''

''پہلی بات تو یہ کہ کم از کم محبوبہ کو زبردستی قابو میں نہیں کرنا چاہئے۔ ساری شخصیت ختم ہو جاتی ہے اس کی۔ اور دوسری بات یہ کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ تو بس اپنی ایک جھلک دکھا کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جایا کرتی تھی۔ مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ میں اس سے قریب ہو سکوں۔'' بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔

اب زیادہ تر ملاقاتیں میرے بنگلے پر ہی ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن این مورالس نے کہا۔ ''ڈیئر خاقان! اپنے دوست ہیگ کو اور اختیار احمد کو یہاں لے آیا کرو۔ میں بھی تنہا ہی ہوتا ہوں۔ چنانچہ تم لوگ یہاں جس طرح کی پارٹی چاہو کر لیا کرو۔''

پھر یہ ملاقاتیں مورالس کے بنگلے پر ہونے لگیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک بات میں نے عجیب سی محسوس کی کہ جب میں نے ہیگ کی ملاقات مورالس سے کرائی، وہ میری طرف سے بے نیاز سا ہو گیا تھا جس طرح مجھ سے ملاقات ہونے کے بعد اس نے اختیار سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا اور مجھ سے براہِ راست تعلقات بڑھا لئے تھے، اسی طرح اب یہ ہونے لگا کہ جب میں مورالس کی کوٹھی پر جاتا تو وہاں ہیگ کو پہلے سے موجود پاتا۔ دور ہی سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اور میں سمجھ جاتا کہ محفل جمی ہوئی ہے۔ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر میں غور کرتا۔ بہرحال ابھی تک میں اس شخص کی گتھی کو نہیں سلجھا سکا تھا۔ پتہ نہیں کیا چیز تھا۔

پھر ایک دن مورالس کی موجودگی میں ہیگ نے مجھے بتایا کہ جس بین الاقوامی گروہ کا وہ سرغنہ ہے جلد ہی اس کے دو اہم رکن کلکتے پہنچنے والے ہیں۔ اس نے یہ بات آتے ہی سرسری انداز میں جیسے کوئی عام خبر سناتا ہے سنائی تھی۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ مجھ سے بھی بڑے افسر اعلیٰ کے سامنے اس نے اپنے منشیات کے اسمگلر ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت زیادہ حیرت ہوئی جب مورالس یہ سن کر ہنسنے لگا۔

ہیگ اپنے بین الاقوامی جرائم کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے گپ اُڑا رہا ہو۔ ظاہر ہے ہمارا فطری ردِعمل یہی ہونا چاہئے تھا کہ ہم بھی اس کی باتوں کو لطیفہ سمجھ کر اپنے ذہن سے نکال دیتے۔ لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہ اس کی بڑی گہری چال تھی اور ہمیں یہ اندازہ اس وقت ہوا جب ہم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے تھے!

⁂☆⁂

ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ یہ شخص بڑبولا ہے۔ چونکہ ہر وقت نشے میں رہتا ہے اس
نشہ آور کہانیاں ہی سناتا رہا ہے۔ البتہ تھوڑا بہت شک و شبہ تھا تو اس کے بے
اخراجات پر۔ لیکن ہماری ساری خوش فہمی دور ہوگئی۔ ایک دن وہ دو افراد کو لے کر
کے وقت مورالس کی کوٹھی پر پہنچ گیا اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں ان دونو
تعارف کرایا۔

''یہ سائرس میکائل ہے جس کا تعلق قبرص سے ہے۔ یہ بہت بڑا کاروباری آدمی
اور یہ دوسری شخصیت مسٹر یوآن لی کی ہے۔ جاپان کے شہر کوبے میں ان کی بہت
تجارتی فرم ہے۔ کیا سمجھے آپ لوگ۔'' اس نے کہا اور عادت کے مطابق قہقہہ مار کر
اور بولا۔ ''اصل میں ہم قبرص، یونان اور اٹلی وغیرہ سے خام افیون حاصل کرتے ہیں
سائرس میکائل بحری جہازوں کے کپتانوں کے ہاتھ جاپان پہنچا دیتا ہے اور وہاں
یوآن لی کے آدمی یہ افیون اتار کر اپنی ذاتی تجربہ گاہ میں لے جاتے ہیں جہاں اس
کوکین جیسی منشیات تیار کی جاتی ہیں۔''

اس وقت ہم ایک عجیب و غریب انتشار کا شکار ہوگئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ
خالص سرکاری افسران ہونے کے باوجود اس مسئلے پر غور نہیں کر پائے تھے اور
خطرناک بین الاقوامی مجرموں سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ لیکن اب میں پورے اع
کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس پراسرار شخص نے جس کا نام ہیگ جونس تھا ہم پر اپنی مقناطیس
قوت استعمال کی تھی اور یقینی طور پر ہم اس کے مسمریزم کے زیر اثر تھے۔ ہماری قوت
ارادی اس کی تابع ہو چکی تھی اور یہ خیال بعد میں بالکل سچ ثابت ہوا۔ کیونکہ آگے چل
ہمیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ کلکتے کا بل ویدا ہاؤس اور اس سے ملی ہو
سرکاری اہل کاروں کی کوٹھیاں ایک الگ ہی نوعیت رکھتے تھے۔ ہماری یہ محفلیں وائسرا
کی قیام گاہ سے بہت قریب جمتی تھیں۔

ہیگ کے ساتھیوں کو آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن ایک ہولناک
واقعہ پیش آ گیا۔ مورالس اور ہیگ بہت دیر تک شراب پیتے رہے تھے۔ وائسرائے کارل
بروکس اس دن اپنی فیملی کے ساتھ تفریح کی غرض سے کلکتے سے باہر گئے ہوئے تھے
چنانچہ ادھر سے بھی آزادی تھی۔ یہ محفل خوب جمی۔ حالانکہ میں شراب نوشی نہیں کرتا تھا مگر
ان لوگوں کی محفلوں میں برابر شریک رہتا تھا۔ چند ہفتوں کے تعلقات کے بعد مورالس کی
حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ہیگ جونس جو چاہتا تھا مورالس وہی کرتا تھا۔ مگر اس رات......
اس رات غضب ہوگیا۔ اچانک ہی ہیگ نے بیٹھے بیٹھے کہا۔

''مورالس! آؤ بل ویدا ہاؤس چلتے ہیں۔''

میں بری طرح چونک پڑا تھا۔ بڑی عجیب سی صورتحال تھی۔ میرا چونکہ خود بھی تعلق اسی
ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ بے شک این مورالس میرا چیف تھا لیکن ذمہ داریاں سب کی برابر
ہوتی ہیں۔ ہیگ نے جو کچھ کہا تھا وہ تو قابل عمل تھا ہی نہیں۔ اس بدبخت نے شاید میری
بے چینی محسوس کر لی اور میری طرح رخ کر کے بولا۔

''اور خاقان! تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں
آنکھیں ڈال دیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے واقعی اس وقت ہم لوگوں کا وائسرائے کی
قیام گاہ پر جانا ضروری ہے۔

مورالس تو اس طرح کھڑا ہوگیا تھا جیسے وہاں پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہوگئی تو قیامت آ
جائے گی۔ میں بھی خود بخود اٹھ گیا تھا۔ مورالس کی کوٹھی سے نکل کر ہم لوگ سڑک پر آ
گئے۔ سڑک سنسان تھی۔ سامنے بل ویدا ہاؤس کی مضبوط عمارت برطانوی حکومت کی سنگین
علامت بنی کھڑی تھی۔ دور جنوبی رخ پر اسٹاف بنگلے میں وائسرائے کی پرسنل سیکرٹری ایلس
فیوری کی رہائش گاہ میں روشنی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فیوری جاگ رہی ہے۔ بل
ویدا ہاؤس کی چار دیواری پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ ہر سو قدم
کے فاصلے پر چوکیاں بنی تھیں جن میں مسلح سنتری سنگین مجسموں کی طرح کھڑے پہرہ
دے رہے تھے۔ صدر دروازے پر گارڈ روم میں دن رات حفاظتی دستے کے لوگ مستعدی
کے ساتھ ڈیوٹی دیتے رہتے تھے۔ ہم نے دور سے دیکھا، اس وقت بھی دو انگریز
سارجنٹ اور دو دیسی سنتری رائفلوں پر سنگینیں چڑھائے مستعد تھے۔ ہیگ اور اس کے
دونوں ساتھی احاطے کی دیوار تک ہمارے ساتھ پہنچے اور ہم سب ایک درخت کے نیچے جا

کھڑے ہوئے۔ میرا ذہن اس وقت ایک ہی نقطے پر سوچ رہا تھا کہ مجھے وہی کچھ کرنا چاہئے جو ہیگ چاہتا ہے۔ دوسری طرف مورالس بھی ٹکٹکی باندھے ہیگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی پلک جھپکائے بغیر اسی کو دیکھے جا رہا تھا اور ہیگ جونس کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ اس نے اب بل ویدا ہاؤس کے اس رخ پر نظریں جما دیں جہاں وائسرائے اجلاس کرتا تھا۔ وائسرائے چیمبر کی پیشانی پر حسب معمول سرخ روشنی روشن تھی۔ ہیگ نے رُک رُک کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مجھ سے اور مورالس سے کہا۔

"تم دونوں وائسرائے کے چیمبر میں اس کی پوری عمارت کا چکر لگاؤ اس طرح کہ گارڈ روم والے تمہیں اندر داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھیں۔ تمہیں واپس بھی اسی طرح آنا ہے۔ مورالس! تم گارڈ روم سے چابی لے کر خاقان کے ساتھ چیمبر میں داخل ہو جاؤ گے۔ وائسرائے کی نشست کے بائیں جانب دیوار میں لوہے کی جو الماری ہے تم اسے کھول کر اس میں سے سرخ جلد کی ایک فائل نکالو گے اور تم لوگ واپس آ کر یہ فائل مجھے دے دو گے اور پھر ہم لوگ واپس مورالس کی کوٹھی پر پہنچ جائیں گے۔ صبح سے پہلے تمہی دونوں کو یہ فائل واپس ادھر رکھنا ہو گی۔ اور صبح جب تم سو کر اٹھو گے تو رات کی کوئی بات تمہیں یاد نہیں ہو گی۔ سمجھے؟ تم سب کچھ بھول چکے ہو گے۔ چلو، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس کی تکمیل کرو۔"

میں اور مورالس جیسے نیند میں یہ تمام باتیں سنتے اور اس کی تکمیل کرتے رہے۔ مگر مورالس کا منتقی ذہن ہیگ کے زیر اثر ہونے کے باوجود بھی کام کر رہا تھا۔ اس نے سوئے ہوئے آدمی کی سی آواز میں کہا۔

"وائسرائے چیمبر کی چابی گارڈ روم میں نہیں رہتی۔"

"پھر کہاں رہتی ہے؟"

"وہ چابی اس کی سیکرٹری ایلس فیوری کے پاس ہوتی ہے۔" مورالس کی آواز اس طرح ابھری جیسے کسی مشین سے ابھر رہی ہو۔ لیکن اس کے الفاظ سے ہیگ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ لمحے بھر خاموش رہا، پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تالے کھولنے والا ایک آلہ دیتا ہوں۔ ذرا سی کوشش کرو گے تو چیمبر کا تالا کھل جائے گا۔" یہ کہہ کر ہیگ نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور

دھات کا ایک ٹکڑا سا نکالا۔ عجیب و غریب شکل کا یہ آلہ اس نے مورالس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا اور بدستور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"بس، اب جاؤ۔"

یہ ایک عجیب و غریب عمل تھا جو ہم کرنے پر مجبور تھے۔ مورالس کی کیفیت بھی یقینی طور پر مجھ سے مختلف نہیں ہو گی۔ میں جو محسوس کر رہا تھا وہ یہ بات تھی کہ اس کا ایک ایک لفظ ہمارے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا اور ہم اس کی تکمیل کرنے پر مجبور تھے حالانکہ شاید مجھ سے زیادہ مورالس اس عمل کے خلاف مدافعت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ یقیناً وہ اپنے سوئے ہوئے ذہن کو جگا کر کوئی اہم بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بات اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔ لمحے بھر یہ کیفیت رہی، پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ گھوم گیا۔ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ اگرچہ میں یہ بات سن اور سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ ایک انتہائی خطرناک عمل ہے لیکن جو کچھ کہا جا رہا تھا اس کے خلاف عمل کرنے کی طاقت نہ مجھ میں تھی اور نہ مورالس میں۔ ہیگ اور اس کے ساتھیوں کو سڑک پر چھوڑ کر ہم دونوں بل ویدا کے کمپاؤنڈ کے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ کمپاؤنڈ کا آہنی پھاٹک بند تھا۔ مورالس نے سلاخوں پر اپنی انگوٹھی بجائی۔ سنتریوں میں سے ایک ہماری طرف بڑھا۔ اس نے ہمیں پہچان لیا اور پھر گارڈ روم کی طرف رخ کر کے آواز لگائی۔

"مسٹر این مورالس اور مسٹر خاقان جمشیدی۔"

"دروازہ کھول دو۔" گارڈ روم کے کمانڈر نے بھاری آواز میں کہا اور دروازہ کھل گیا۔ سنتری نے پھاٹک کھول کر ہمیں سیلوٹ مارا اور اس کے بعد گارڈ کے چاروں آدمیوں نے ہمیں تعظیم دی۔ گارڈ کے کمانڈر نے جب یہ دیکھا کہ ہم عمارت کے جنوبی حصے کی طرف جا رہے تھے تو وہ یہ سمجھا کہ ہمیں یا تو مورالس کے دفتر میں کوئی کام ہے یا پھر ہم دونوں فیوری سے ملنے جا رہے ہیں۔

ہیگ کی ہدایت کے مطابق ہم نے پوری عمارت کا چکر لگایا اور دوسری جانب سے وائسرائے چیمبر پہنچ گئے۔ برآمدے کے چوڑے ستونوں کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ گارڈ روم میں کھڑا کوئی بھی شخص ہمیں چیمبر تک جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ برآمدے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وائسرائے کے کمرے کے سامنے پہنچ کر مورالس نے کوٹ کی

جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہیگ کا دیا ہوا آلہ نکال لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت بھی مورالس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے آلے کو دروازے کے تالے میں ڈال کر گھمایا۔ کچھ نہیں ہوا۔ ایک بار پھر اس نے کوشش کی اور آخر کار ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر زور دے کر میں نے وہاں بنے کواڑوں کو اندر دھکیلا اور کواڑ کھل گئے۔ ہم احتیاط کے ساتھ وائسرائے کے چیمبر میں داخل ہو گئے۔ وائسرائے چیمبر کی جانی پہچانی فضا، چمڑے کے صوفوں کی خصوصی بو اور دیواروں پر لگی ہوئی مانوس تصویروں کو دیکھ کر مورالس کے ذہن کو جیسے جھٹکا سا لگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگا۔ اس نے تین چار بار آنکھیں جھپکائیں اور پھر جیسے اس کے دماغ میں روشنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ چند قدم وائسرائے کی نشست کی جانب بڑھا، پھر پلٹا۔ اس نے دہشت کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کسی اندرونی سپرنگ کی مدد سے دونوں کواڑ آہستہ آہستہ بند ہو رہے تھے۔ دفعتہً ہی مورالس کی آواز ابھری۔

”خاقان! دروازہ بند نہ ہونے پائے۔ وہ خود چیختا ہوا دروازے کی طرف جھپٹا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔ اور پھر میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ ہم دونوں بری طرح ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ دہشت سے مورالس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ ہم دونوں نیچے گر گئے۔ لیکن مورالس برق رفتاری سے اٹھا اور پھر دروازے کی طرف جھپٹا۔ دونوں کواڑ تقریباً بند ہو چکے تھے۔ مورالس نے بے بسی کے عالم میں دونوں کواڑوں کے درمیان اپنا پیر پھنسانے کی آخری کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ اس کا پیر کواڑوں کی درز میں پھنس کر دروازے کو بند ہونے سے روک دیتا، وائسرائے چیمبر کا بھاری دروازہ ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ مورالس اس بھاری بھرکم دروازے کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ میرا سر بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ ٹکرا کر گرنے کا اثر تھا یا پھر میرے ذہن سے ہیگ کے ڈالے ہوئے اثرات زائل ہو رہے تھے۔ مورالس بھی دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کے بعد قریب کے صوفے پر گر گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ فرش پر ہیگ کا دیا ہوا قفل کھولنے والا آلہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور دروازے کے تالے میں ہزار طریقے سے

ھمایا لیا بے سود۔ مجھے دروازے سے الجھتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو مورالس نے سر اٹھا ر دیکھا اور مری ہوئی آواز میں بولا۔

”بیکار ہے خاقان! اب یہ اندر سے نہیں کھل سکتا۔“

ظاہر ہے مورالس سے زیادہ اس بارے میں اور کون جان سکتا تھا۔ کیونکہ وہی تمام فاظتی انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ کچھ لمحے تک وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”یہ خاص م کا تالہ ہے۔ اس تالے کو چابی کے بغیر اگر کوئی کھول کر اندر آ جائے تو دروازہ خود بخود ہ ہو جاتا ہے اور پھر یہ کسی صورت میں اندر سے نہیں کھلتا...... آہ، یہ بات میں جانتا تھا یکن...... لیکن......“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نگاہیں اس وسیع و عریض ہال میں گردش کر رہی ھیں۔ تین بڑی بڑی کھڑکیاں اور دو روشن دانوں کے علاوہ اس کمرے میں دو دروازے ر تھے۔ ایک دروازہ غسل خانے میں اور دوسرا وائسرائے کی ذاتی لائبریری میں کھلتا تھا۔ یرے بدن میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے بڑی تیزی سے کھڑکیوں، روشن دانوں ور دروازوں کا جائزہ لیا۔ کھڑکیوں پر گاتھک طرز کے ڈیزائن میں بنی ہوئی چوڑی سلاخیں ور جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ روشن دان بہت بلندی پر تھے اور ان میں بھی حفاظتی سلاخوں کے علاوہ لوہے کی جالی بھی لگی ہوئی تھی تاکہ مکھیاں اور مچھر اندر نہ آ سکیں۔ غسل خانے کے اندر بھی کھڑکیوں اور روشن دانوں کا یہی حال تھا۔ میں نے لائبریری میں کھلنے والے روازے پر بھی زور آزمائی کی لیکن دروازہ دوسری طرف سے مقفل تھا اور اس کے بعد یہ کہنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوتی کہ ہم وائسرائے چیمبر کے چوہے دان میں پھنس چکے تھے۔ میں نے مورالس کی طرف دیکھا، وہ اپنا سر تھامے بیٹھا تھا اور نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں لرزش ہو رہی تھی۔

میں نے چیمبر میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ میری نظر وائسرائے کی میز پر پڑی اور سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی...... وائسرائے کی نشست کی بائیں جانب لوہے کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا...... خدا کی قسم یہ وہی الماری تھی، اتنی ہی اونچی اور وہی نقش و نگار اور وہی ہینڈل۔ اور پھر یہ حقیقت اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ مجھ پر کھل گئی کہ میں نے بھوج پتر پر الماری سے ٹکی جو لاش دیکھی تھی وہ اسٹاف افسر کے بھائی کی لاش کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ خود این

مورالس کی لاش تھی۔ آہ...... یہ بالکل سچ تھا۔ وردان سادھانی کے بھوج پتر نے
رات کا منتظر دکھایا تھا۔ یقیناً یہ وہی رات تھی۔ صبح ہونے سے پہلے اس الماری پر جا
مورالس کا مقدر بن چکا تھا۔ یقیناً ایسی ہی بات تھی۔ آہ...... یہی تھا...... یہی تھا......
تھا۔ میں جو اس دوران گزرے ہوئے واقعات سے بہت دور ہو چکا تھا اور اپنی ذمے
میں پھنس کر میں نے سیوک سندھورتی، وردان سادھانی، دھرم شوالہ، شِو مندر، دیوا
پھولا کھانچن اور رانگا پوری سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اپنی تمام تر قوت ارادی سے کام لے
میں اپنے آپ کو اس طلسم سے نکالنے کی کوشش میں مصروف رہا تھا اور کافی حد تک
میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ ایک خوفناک سچائی تھی
میں وائسرائے کی میز پر جھکا ہوا سوچتا رہا، یہ سب کچھ جو ہوا ہے یا ہو رہا ہے ا
تو نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مورالس میرے ہاتھوں سے مارا جا
گا؟ مگر میں تو غیر مسلح تھا۔ مورالس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ حفاظتی عملے کا ر
ہونے کی بناء پر بھرا ہوا سروس ریوالور ہر وقت اس کے پاس رہتا ہے۔ یہ ریوالور ا
بغلی ہولسٹر میں لگا رہتا ہے۔ اب اگر میں اس سے ان تمام باتوں کا تذکرہ کرتا تو ا
نتیجہ نجانے کیا ہوتا اور سچی بات یہ ہے کہ تذکرہ کرنے کی ہمت بھی میرے اندر نہیں
مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ مجھ پر حملے کرے گا اور میں خود کو بچا
کے لئے اس کا ریوالور چھین کر اس کو ہلاک کر دوں گا یا وہ خودکشی کر لے گا؟ اور یہ
بات مجھے زیادہ درست معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ باصلاحیت افسر میری
سے اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ اگر میں اسے اس یقینی موت سے بچانے
کامیاب ہو گیا تو میں سوچوں گا کہ میں نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ یہ
بڑی سچائی تھی کہ میں نے ہی مورالس سے ہیگ کا تعارف کرایا تھا اور ہیگ کے با
میں یہ کوئی شک وشبے کی بات نہیں تھی کہ وہ ایک انتہائی ہولناک مجرم تھا۔ اگر میں
اس خطرناک مجرم سے دور رہتا یا مورالس کو اس سے متعارف نہ کراتا تو یہ بے چارہ
اس خطرے میں پڑتا۔ مگر اس چکر میں وہ اکیلا تو نہیں گرفتار ہوا تھا۔ رات ختم ہونے
پہلے اگر ہم چیمبر سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو صبح دونوں ہی حراست میں لے
جائیں گے اور دونوں کا ایک سا انجام ہو گا۔ مگر بھوج پتر نے تو صرف مورالس کے با
میں ہی پیش گوئی کی تھی۔ فرض کیا اگر اس کی پیش گوئی ٹھیک نکلتی ہے، جس طرح

رتنا موت کا شکار ہو گیا تھا تو میرا کیا ہو گا؟
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارا ذہن ہیگ کی گرفت
سے نکل آیا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہمارا اپنا عمل بے مقصد ہو گیا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے
کہ ہم دونوں پر کیا گزرنے والی ہے۔
مورالس نے اب وحشت کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے سارے وجود
میں تشنج اور بے چینی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے اس کے
ستے ہوئے چہرے پر موت کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا
اور بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔
''خاقان! تم اس مصیبت کے اکیلے ذمہ دار نہیں ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم
بھی نہیں جانتے تھے کہ ہیگ کون ہے اور کس چکر میں ہے؟ ویسے اس میں کوئی شک نہیں
ہے کہ وہ دنیا کا پراسرار ترین آدمی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ حرف
بہ حرف درست نکلا۔ بلاشبہ وہ مجرموں کے بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور کسی
ملک کے لئے جاسوسی کر رہا ہے۔ ہم دونوں تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔
ہماری زندگی تو ایک سادہ سی کتاب کی مانند ہے۔ میں تمہارے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا
مگر اپنے بارے میں، میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس وقت میں ہیگ کے سامنے تھا اور
ہیگ اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے اثرات مجھ پر ڈال رہا تھا اس وقت بھی مجھے معلوم تھا
کہ ہم کس درجے ہولناک کام کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن میں تمہیں پورے
وثوق کے ساتھ بتاتا ہوں کہ یہ جانتے ہوئے بھی مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں انکار کر
سکتا یا اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی اٹھا سکتا۔ چیمبر میں داخل ہونے کے بعد نجانے
کس طرح مجھ میں یہ قوت آ گئی کہ میں نے ہیگ کی شیطانی قوتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے
حواس میں آ گیا۔ لیکن میرے دوست، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔
یہ دروازہ تو باہر ہی سے کھلے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا، تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔
میرے پیارے دوست، اب میرے اور تمہارے لئے صرف ایک ہی صورت ہے۔ صرف
ایک ہی صورت۔'' اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر پیلاہٹیں
دوڑ گئیں اور وہ گھونسہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے لگا۔ پھر وہ بے چینی کے عالم میں مجھ
سے دور ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے مجھ سے کہا۔

’’سنو، تم ایک کام کرو۔ غسل خانے میں جاؤ اور فلش کی ٹینکی پر چڑھ کر روشن دان
جالی کاٹنے کی کوشش کرو۔‘‘

’’لیکن کیسے مورالس؟‘‘ میں نے بے چین سے لہجے میں سوال کیا۔

’’میں تمہیں بتاتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور وائسرائے کی میز سے ہاتھی دانت کے
کا فولادی کاغذ تراش اٹھا لیا اور میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ’’دیکھو...... تم یہ کوشش
دیکھو۔ اگر کامیابی نہ ہوئی تو میں تمہیں یہاں سے نکلنے کا آخری طریقہ بتاؤں گا۔ بہرحا
یہ کوشش تو کرنی چاہئے، باقی بات بعد میں کریں گے۔‘‘

نجانے کیوں مجھے اس کا لہجہ بے حد کمزور محسوس ہوا تھا۔ وہ جس کیفیت کا شکار تھا
تھا ہی لیکن میں دوہری کیفیت کا شکار تھا۔ البتہ مورالس کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں
تھی۔ اگر یہاں سے نکلنے کی کوئی اور صورت اسے معلوم ہے تو وہ بتاتا کیوں نہیں
یہی سوچا جا سکتا ہے کہ اب اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن بہرحال میں
سوچا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اسی پر عمل کیا جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ چنانچہ اپنا اطمینا
کرنے کے بعد میں غسل خانے میں جا کر فلش کی ٹینکی پر چڑھنے کی ترکیب سوچنے
غسل خانے میں داخل ہو کر ابھی میں اس کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ چیمبر سے اچا
مجھے ایسی آواز آئی جیسے غبارہ پھٹا ہو۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا جیسے مورالس نے
کوئی خفیہ دروازہ کھولا ہے۔ کون سا خفیہ دروازہ ہو سکتا ہے؟ یہ سوچ کر میں چیمبر
گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ الماری پر جھکا ہوا ہے۔ پھر وہ آہستہ سے مڑا اور پھسل
قالین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے دیکھا اور بے اختیار میرے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر
گئے۔ میرے خدا...... میرے خدا...... میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی کنپٹی میں
سوراخ بن گیا تھا اور خون اس سوراخ سے نکل کر اس کے کپڑوں اور قالین پر گر رہا
اس کے ہاتھ میں سروس ریوالور تھا اور ریوالور کی نالی پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ اس
بجھتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور الماری سے ٹک گیا اور اس کی گردن
قدرتی زاویئے پر مڑ گئی۔

آہ...... بھوج پتر پر بنی ہوئی تصویر نمایاں ہوگئی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اس شخص
دیکھا تھا تبھی چونکا تھا اور وہ بے چارہ غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ موت اس کے بھاگ
نہیں، اس کی ہونی تھی۔ یہی تصویر تھی وہ۔ بالکل یہی تصویر تھی۔ میں سکتے کے عالم

کھڑا رہا لیکن پھر اچانک ہی مجھے اپنی فکر ہوئی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ سرکاری رازوں
کا محافظ موت کے بعد بھی اہم ترین کاغذات کی تجوری پر پہرہ دے رہا تھا۔ میرے پاؤں
میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ آہ...... کیا کروں۔ اب کیا
کروں؟ میں نے سوچا۔ جس سنگین صورتحال سے میں دوچار تھا اس کا پورا پورا ادراک
مجھے تھا۔ وائسرائے کے چیمبر میں پایا جانا کیا ہو سکتا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ جتنی
بڑی مصیبت میں، میں گرفتار ہونے جا رہا تھا اس کا مجھے بھرپور احساس تھا۔ اب مجھے صبح
تک یہاں رہنا ہو گا اور صبح کو جب فیوری یہاں آئے گی تو میں یہاں ایک لاش کے
ساتھ پایا جاؤں گا۔ گویا دوہرے سنگین جرم کا مجرم ہوں گا میں۔ جاسوسی اور ایک انگریز
سرکاری افسر کا قاتل۔

میں سر پکڑے سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہو گا؟ بچپن سے اب تک کی زندگی میری
آنکھوں میں گھوم گئی۔ بے شک میں بہت سی بار کیسی کیسی بلاؤں میں گرفتار ہوا تھا اور اب
جبکہ زندگی کا لطف اٹھانے کا وقت آیا تھا تو بھری جوانی میں کس قدر ذلیل موت مارا
جاؤں گا۔ واقعی یہ ذلیل موت اب میرا مقدر بن چکی تھی اور کوئی مجھے بچانے والا نہیں تھا۔
وہ سب مجھ سے شاید منحرف ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں کس کس نام سے مجھے مخاطب کیا جاتا
تھا۔ بڑی عزت، بڑا مقام دیا جاتا تھا۔ اگر میں کوئی مافوق الفطرت ہستی تھا بھی اور اگر
مجھے روحانی قوتیں حاصل تھیں تو اس وقت یہ سب کیا ہوا؟ کیا میں واقعی ان حالات میں
بدنامی کی موت مارا جاؤں گا؟ یا وہ پراسرار قوتیں میرا دفاع کرائیں گی؟ نجانے کیسے کیسے
احساسات میرے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ وہی تصور اس وقت مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔
میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ برے حالات میں انسان کو اپنا ایمان سنبھالنا بڑا
مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اب تک ان تمام چیزوں سے نفرت کرتا رہا تھا۔ یہ سوچتا رہا تھا
کہ وہ سب غیر ایمانی چیزیں ہیں۔ لیکن اس وقت میرے دل میں یہی خیال آ رہے تھے
کہ اگر میں بودھی ستو ہوں، میں روحانی پیشوا بننے والا ہوں تو کیا اس وقت وہ پراسرار
قوتیں میری مدد کریں گی؟ میرے پاس وہ بھوج پتر تھا جو نجانے اب کہاں ہے۔ پھر مجھے
وہ ریاضتیں یاد آئیں جو مجھے سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی نے سکھائی تھیں۔ کیا
یہاں سے بچ نکلنے میں کوئی ریاضت میرے کام آ سکتی ہے؟ دھت تیرے کی۔ جن
چیزوں سے میں بچ رہا تھا اور جنہیں میں نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا اس وقت وہی

میرے سر پر مسلط ہوگئی تھیں اور میں ان کے بارے میں مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔
میں نے سامنے پڑی ہوئی مورالس کی لاش پر نگاہ ڈالی اور مختلف انداز میں سوچنے لگا۔ یہاں ایک لاش موجود ہے۔ میں اس پر اشبھ بھاونا کرسکتا ہوں۔ اس منحوس ریاضت سے مجھے شاید بچ نکلنے کا راستہ ملے، شاید مجھے کوئی روحانی طاقت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ میں نے کوٹ اتار دیا اور مورالس کی لاش کے روبرو آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ مجھے وردان سادھانی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے ریاضت کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ کسی ایسی لاش پر دھیان لگایا جائے جو نیلی پڑ گئی ہو یا جس میں سوراخ ہو یا جس کے اعضاء بکھر گئے ہوں یا جس میں سے خون بہتا ہو۔ مورالس کی لاش اس کی آخری شرط پر پوری اترتی تھی۔ ہیگ کی غیر معمولی قوتِ ارادی سے مات کھایا اور جھنجھلایا ہوا میں مورالس کی لاش کے سامنے بیٹھا تھا۔ لڑکپن ہی سے میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ حالات سے مجبور ہو کر ہار مان لینا مردوں کا شیوہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے والد صاحب کے ساتھ جنگلوں اور ویرانوں میں ہنسی خوشی بھوک، تھکن اور سختیاں جھیلی تھیں۔ میں نے یہ سیکھا تھا کہ شکست کا سامنا ہو تو اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے اور اس سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں، میں نے یہ سوچا کہ اس قید اور یقینی موت سے بچنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔ مگر میں خاقان جمشیدی یا پھر ان شیطانوں کے خیال میں بودھی ستو یعنی مستقبل کا مہتر بدھ کوئی معمولی ہستی نہیں ہوں۔ مجھے چوہے کی موت نہیں مرنا چاہئے۔ وہ لوگ آئیں گے، مجھے گرفتار کر لیں گے اور اس کے بعد میری جو تحقیر ہو گی، میں جانتا ہوں۔ اور بات مجھ تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ میرے بارے میں تحقیقات کرنے سے پتہ چلے گا کہ میں تو سیتا گڑھی کے ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں۔ سیتا گڑھی کی عزت پر داغ لگ جائیں گے۔ میرے خاندان کا نام بدنام ہو جائے گا۔ نہ صرف بدنام ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ انگریز حکومت میرے والد پر بھی ہاتھ ڈال دے۔ کیونکہ اتنے بڑے اور پھر انگریز افسر کی موت کو وہ لوگ آسانی سے ہضم نہیں کریں گے۔ یہ تمام واقعات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور میں تیار ہو گیا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے اس منحوس عمارت سے باہر نکل جاؤں۔
میں نے ذہن کی تمام قوتیں مورالس کی لاش پر منتقل کر دیں۔ کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ میرا یہ عمل آخر کار مجھے تباہ کر دے گا اور میں عمر بھر کے لئے مصیبت میں گرفتار ہو

جاؤں گا۔ کاش میں نے اشبھ بھاونا کرنے سے پہلے سادھانی کے کہے ہوئے الفاظ اچھی طرح یاد کر لئے ہوتے۔ اس لئے کہ جب وہ الفاظ مجھے یاد آئے تو قیامت گزر چکی تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میرا کردار، میری شخصیت، خاقان جمشیدی، اس کا ایمان، اس کا حسب نسب سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ وہ ایمانی قوتیں جو مجھے سہارا دے سکتی تھیں، میرا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ کیونکہ میں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اس کی بجائے شیطان کی برتری قبول کر لی تھی۔ مجھے اس وقت وردان سادھانی کی وہ بات یاد آئی کہ اشبھ بھاونا آخری ریاضت ہے، اسے چاروں عملی ریاضتوں کی تعمیل کے بعد کرنا چاہئے ورنہ اس سفلی ریاضت کے بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں۔ جبکہ میں نے ایک بھی عملی ریاضت نہیں کی تھی۔ میری ابتدا ہی غلط تھی۔ میں نے سب سے پہلے شیطان کی قربت سے آغاز کیا تھا اور شیطان بہر حال اس تاک میں رہتا ہے کہ انسانوں کو کس طرح نقصان پہنچائے۔
نجانے کتنی دیر تک میں لاش پر دھیان لگائے رہا۔ مجھے اس کا تو اندازہ نہیں ہے۔ بس اتنا احساس ہے کہ میرا بدن پسینے سے تر ہو گیا اور آنکھوں کے آگے مکمل اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں ننھے ننھے جگنو چمکنے لگے تھے۔ میں بت کی طرح دھیان سمادھی کے انداز میں آلتی پالتی مارے بیٹھا، دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے پلک جھپکائے بغیر اس لاش کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میری پیشانی پر دونوں بھنوؤں کے درمیان میں کوئی تیز نشتر اتر گیا ہے۔ اس شدید تکلیف سے ایک لمحے کے لئے دھیان بکھرنے لگا۔ مگر میں نے پوری قوت سے خود کو سنبھالا اور لاش پر توجہ جمائے رکھی۔
پھر میری یہ کوشش رنگ لائی اور میں نے دیکھا کہ اس لاش میں سے ایک دوسرا وجود رنگ لا رہا ہے۔ دوسرا وجود جو مورالس ہی کا تھا۔ وہ نہ تو زندہ تھا اور نہ مُردہ۔ یہ اجنبی وجود اس کی نیم دراز لاش سے نکل کر سیدھا کھڑا ہوا اور قدم قدم چلتا ہوا میری جانب بڑھنے لگا۔ پھر وہ میرے قریب پہنچا۔ یہ مورالس کا ہمزاد تھا یا سایہ جو کچھ بھی تھا، ایک لمحے تک وہ میرے قریب رُکا اور پھر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ اسے پکڑنے کے لئے بڑھے لیکن خلا میں ناچ کر رہ گئے۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوا کہ میں نے وردان سادھانی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل نہیں کیا ہے۔ چنانچہ میں نے لاش پر دوبارہ دھیان لگا دیا۔ مورالس کو اشبھ بھاوناؤں کے تحت میرے وجود میں منتقل ہونا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ ضروری تھا کہ میں اس شے کو جو لاش سے اتر کر میری طرف آ

رہی ہے، اپنے وجود میں منتقل کر لیتا۔ اپنے سراپا میں اتار لیتا۔ اس صورت میں اٹھ بھاونا مکمل ہوتی تھی۔ میں پھر یہ کام کرتا رہا اور میں نے اس بار سوچا کہ میں وہی کروں گا جو مجھے بتایا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ دوسری بار مورالس یا اس کا سایہ اپنی لاش سے نکل کر میری طرف بڑھا۔ میں نے اپنی توجہ برقرار رکھی۔ وہ پراسرار وجود میری طرف آیا اور میں نے اسے اچانک ہی اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اور جیسے ہی میں نے اسے اپنے سینے سے لگایا، میرا پورا بدن آگ کی طرح تپنے لگا۔ آہ...... اس قدر اذیت، اس قدر وحشت خیزی۔ اس آگ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سرد ہے یا گرم۔ بس میرے سارے وجود میں یوں لگتا تھا جیسے موٹی موٹی سوئیاں چبھ گئی ہوں۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ میں بلندی سے نیچے گرنے لگا۔ اس قدر گہرائیوں میں جن کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ میرا بدن الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کبھی سر کے بل جاتا ہوں اور کبھی پیروں کے بل اور کبھی لیٹنے کے انداز میں گرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا۔ کیا عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک سر چکراتا رہا اور آخر کار میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مورالس کی لاش تو جوں کی توں پڑی ہوئی تھی اور میں اس سے کچھ فاصلے پر پسینے میں شرابور چت پڑا ہوا تھا۔ آہ...... اس قدر کمزوری ہو گئی تھی میرے جسم میں کہ محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی قوت سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا۔

تھوڑی دیر تک میں اسی طرح بے سدھ پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر میں کون ہوں؟ کیا صرف خاقان جمشیدی یا پھر این مورالس؟ ان دونوں میں سے کیا ہوں؟ لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے دونوں وجود میرے اندر یکجا ہو گئے ہوں۔ پھر میں خود کو کیا کہوں...... کیا کہوں؟ میں بمشکل تمام اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے گرد تیز ہوائیں چل رہی ہوں۔ میرے کان شدید سنسناہٹ محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اب میرے ہاتھوں پیروں کی قوت بحال ہوتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن اس طرح صاف ہوتا جا رہا تھا جیسے کوئی ذہن پر لگے ہوئے برسوں کے جالے اتار رہا ہو۔ مجھے اندر سے جھاڑ پونچھ کر صاف کر رہا ہو۔ میرا دماغ روشن ہوتا جا رہا تھا۔

میں سکیورٹی آفیسر خاقان جمشیدی ہوں...... نہیں، میں سکیورٹی افسر نہیں بلکہ آئی سی ایس کا ایک جونیئر ممبر ہوں...... یہ وائسرائے کا چیمبر ہے اور میں اس میں بند ہوں......

چھ بجے ایلس فیوری تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئے گی اور چیمبر کا دروازہ کھولے گی۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر این مورالس کی لاش پر پڑے گی تو وہ چاروں طرف دیکھے گی اور اسے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ چیمبر میں اور کوئی بھی ہے۔ وہ دروازے کے فریم میں لگا ہوا خفیہ بٹن دبا دے گی جس سے گارڈ روم میں گھنٹی بجے گی اور پلک جھپکتے ہی مسلح گارڈز چیمبر کے دروازے پر گھیرا ڈال دیں گے۔

ان خیالات پر میں خود چونک پڑا۔ حیرانی کی بات تھی کہ ان حفاظتی اقدامات کا علم صرف وائسرائے کارل بروکس یا اس کی اسسٹنٹ ایلس فیوری کو تھا۔ مجھے یہ تمام باتیں کہاں سے معلوم ہو گئیں؟ کیا میں مورالس کے مُردہ ذہن میں جھانک سکتا ہوں؟ معلوم نہیں کیا اسرار تھا۔ لیکن اب مجھے معلوم تھا کہ ہنگامی صورتحال میں وائسرائے کی پرسنل سیکرٹری کو کیا کچھ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ چنانچہ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے فوری طور پر اپنے تحفظ کے اقدامات کرنے تھے۔

میں برق رفتاری سے دروازے کی جانب بڑھ گیا اور پھر میں نے بھاری مخمل کے پردے ہٹا کر انگوٹھے کے برابر سوراخ کو تلاش کیا جو عام حالات میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس سوراخ میں اسی رنگ کا بٹن لگا نظر آ رہا تھا۔ خطرے کا الارم یہاں سے بجایا جاتا ہے۔ مجھے اس وقت اپنے تحفظ کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور وہ کام یہ تھا کہ اسی وقت میں خطرے کا الارم بجا دوں۔ مورالس کے ریوالور میں ابھی چھ گولیاں ہیں۔ وہ لوگ دروازہ کھولیں گے تو میں اپنے سامنے اور دائیں بائیں گولیاں چلاتا ہوا نکل بھاگوں گا۔ کیا مجھے ایسا کرنا چاہئے؟ نہیں، یہ بہت ہی بچکانہ خیال ہے جبکہ محافظوں کے پاس تو زبردست آٹومیٹک ہتھیار ہوا کرتے ہیں۔ وہ مجھے بھون کر رکھ دیں گے۔ میرا یہ اقدام بالکل غیر مناسب ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے کام میں نے یہ کیا کہ ہال میں ایک طرف جو خوبصورت اسکرین پڑا ہوا تھا میں نے اسے کھینچ کر میز کے ساتھ لگا دیا۔ اب الماری اور لاش اس کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ دروازے سے اندر داخل ہونے والے کو فوری نظر نہیں آ سکتے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی، صبح ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ گویا ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایلس فیوری چیمبر میں آئے گی۔ اصولاً اسے اپنے ساتھ دو ملازم لانے چاہئیں جو فرش وغیرہ کی صفائی کرتے ہیں۔ لیکن ان سے کمرے کی صفائی کرانے سے پہلے وہ خود کمرے میں آتی

ہے اور کمرے کے ماحول پر ایک نگاہ ڈالتی ہے۔ تمام کاغذات ٹھیک کر کے وہ صف
کرنے والے کو چیمبر میں بلاتی ہے۔ یہی اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ لیکن نہیں، آ
چونکہ وائسرائے موجود نہیں ہے، اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ کاغذات کی دیکھ بھا
نہیں کرے گی اور براہِ راست صفائی کرنے والوں کو لے کر صفائی کرانے آ جائے گ
ہاں، یقیناً ایسی صورت میں مورالس کے سائلنسر لگے ریوالور سے ایلس فیوری اور ا
دونوں ملازموں کو ٹھکانے لگانا آسان کام ہو گا۔ اس کے بعد میں آرام سے ٹہلتا ہوا با
جاؤں گا۔ لیکن تین آدمیوں کو اتنی آسانی سے گولی کا نشانہ بنانا کہ ان میں سے کوئی گا
روم والوں کو ہوشیار نہ کر پائے، بڑا مشکل کام تھا۔ بہرحال جیسا بھی ہو گا، دیکھا جا
گا۔ اور یہی فیصلہ مناسب تھا۔

آنے والے وقت کا ایک ایک لمحہ میری نگاہوں کے سامنے تھا اور ابھی تک میرا ذ
اس طرف راغب نہیں ہوا تھا کہ میں یہ سمجھوں کہ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا علم ؟
پہلے سے کیسے ہو گیا ہے۔

بہرحال میں نے آگے بڑھ کر لاش کے ہاتھ میں سے ریوالور لیا اور اپنی پتلون
جیب میں ڈال لیا۔ صبح ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ہر رخنے سے روشنی
آمد آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ فیوری اگر تنہا آئے تو میرا کام بڑا آسان
جائے گا۔ کیونکہ اس کے بعد میں اسے اتنا موقع نہیں دوں گا کہ وہ خطرے کا الارم
سکے یا شور مچا سکے۔ آرام سے اسے ٹھکانے لگا کر میں چیمبر کا دروازہ بند کر دوں گا ا
دوسری طرف سے ٹہلتا ہوا گارڈ روم میں پہنچوں گا اور باہر نکل جاؤں گا۔

پتہ نہیں کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اچانک میں نے ایک آہٹ سنی اور جھپٹ
دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ برآمدے کے فرش پر کسی کے تیز قدموں کی آواز آ ر
تھی۔ باہر درختوں پر چڑیوں نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ صبح ہو گئی
میرے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ اور ایک دم میرے ذہن میں روشنی
ہوئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ ایلس فیوری ہی ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال
ریوالور نکال لیا اور دانت بھینچ کر ایلس فیوری کو ایک گندی سی گالی دی۔ عجیب بات تھی
اس وقت مجھے گھٹیا اور بازاری باتیں سوجھ رہی تھیں۔ ایسی باتیں جو میرے مزاج
مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہوں۔ جی

ہی وہ چیمبر میں داخل ہو گی، میں ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کروں گا اور اس کے سینے پر
ریوالور رکھ کر اسے داغ دوں گا۔

قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آ کر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد چابیاں بجنے کی
آواز ابھری اور پھر بھاری دروازہ بے آواز کھلنا شروع ہو گیا۔ سینٹ کی خوشبو کا ایک جھونکا
سا آیا اور پھر کسی کے حلق سے حیرت اور خوف کی دبی ہوئی سسکاری سی نکلی۔ ایلس فیوری
کو شاید اسکرین کو غلط جگہ دیکھ کر کسی گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ واقعی ایک خطرناک
عورت تھی، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن میں پردے کے پیچھے خطرے کے بٹن کو
چھپائے کھڑا ہوا تھا۔ ایلس کا ہاتھ خود بخود خطرے کے بٹن کی جانب بڑھا اور میرے بدن
سے ٹکرایا۔ وہ دہشت بھری آواز میں چیخ مارنے ہی والی تھی کہ میں نے پھرتی سے آگے
بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ مارے خوف کے اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی
تھیں۔ اس نے ایک زوردار جھٹکا مجھے دیا اور میری گرفت سے نکل جانا چاہا۔ ایک لمحے
کے لئے مجھے احساس ہوا کہ اس کے دُبلے پتلے بدن میں بلا کی قوت ہے۔ لیکن بہرحال
وہ عورت تھی اور اس وقت میں ایک معمولی انسان نہیں تھا۔ میرے اندر دوہرے وجود کی
طاقت تھی۔ ایک شیطانی طاقت۔ میں نے اسے جھٹکا دے کر قالین پر گرا لیا اور اس کے
ہاتھ سے چابیوں کا گچھا ایک چھناکے سے دور جا گرا۔ ایک لمحے کے اندر آگے کا منصوبہ
میرے ذہن نے سوچا کہ میں اسے قتل کر کے چیمبر کو مقفل کر دوں گا اور چابیاں لے کر
یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔ وائسرائے تو موجود نہیں ہے۔ اگر ایلس فیوری اور چیمبر کی
چابیاں شام تک بھی نہ ملیں تو کسی کو اتنی تشویش نہیں ہو گی۔ میں اس عرصے میں کہیں کا
کہیں نکل چکا ہوں گا۔

میں نے بدن کا پورا بوجھ ڈال کر اسے فرش پر گرا رکھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ
پر تھا اور دوسرا جس میں ریوالور تھا اس کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور والا ہاتھ
کھینچ کر سائلنسر لگا ریوالور اس کے سینے پر رکھا۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچل رہی
تھی۔ اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا چشمہ اتر گیا تھا اور بڑی بڑی
خوبصورت آنکھیں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح بے چین تھیں۔

نجانے کیوں میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہوئی۔ میرا ریوالور والا ہاتھ ڈھیلا
پڑ گیا۔ فیوری بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ آہ، لیکن یہ سوچ

میری نہیں تھی۔ یہ سوچ تو این مورالس کی تھی۔ میں تو آج تک حسین سے حسین لڑکیوں کو
خاطر میں نہیں لایا تھا۔ ایلس فیوری کے بارے میں، میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا
تھا۔ لیکن اس وقت میرا وجود ایک نہیں بلکہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ مورالس کے وجود میں
میں نے سوچا کہ یہ کمبخت عورت مجھ سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہی ہے۔ میری لاکھ کوششوں
کے باوجود وہ مجھ سے دور رہی ہے۔ آج یہ میرے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت
اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے۔ میں اپنے اندر شدید کشمکش محسوس کرنے لگا۔ یہ
سوچ میری نہیں، مورالس کی تھی جو بھرپور طریقے سے میرے اندر تھا۔ بہت شدید اُلجھن
میں پڑ گیا تھا میں۔ میں نے تو اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے لئے کسی قسم کی
پسندیدگی کا پیدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن مورالس مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ
میں نے ریوالور دور پھینک دیا اور اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ تبھی
میرے حلق سے ایک آواز نکلی۔

"فیوری! تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔" آہ، یہ آواز میری نہیں تھی۔ میں نے
پھر کہا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں فیوری! تمہارے بدن سے آنے والی یہ خوشبو ہمیشہ مجھے
پاگل کر دیتی ہے مگر تم نے کبھی میری پذیرائی نہیں کی۔"

میں نہیں بول رہا تھا، میرے کان میرے منہ سے نکلنے والی آوازیں سن رہے تھے۔ یہ
میری نہیں، مورالس کی آواز تھی۔ مجھے اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا اور اسی کشمکش
میں اس کے منہ پر رکھا ہوا میرا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا پڑا تو فیوری نے ہسٹریائی انداز میں چیخ
ماری۔ اس کے حلق سے وحشت زدہ آواز نکلی۔

"گارڈز...... گارڈز......" اور دوسرے لمحے میں سنبھل گیا۔ میں نے اپنی گرفت سخت
کر دی اور لیٹے ہی لیٹے فرش پر ایک گھٹنا ٹیک کر دوسرا گھٹنا اس کے سینے پر رکھا اور اس
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"فیوری! تم نہیں جانتی کہ میں کب سے تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ میں نے جب
بھی اپنے جذبے کا اظہار کیا تم نے حقارت سے مجھے ٹھکرا دیا۔ اتنے دن گزر گئے پھر بھی
میرے اور تمہارے درمیان بے کیف رسمی تعلقات سے آگے بات بڑھ ہی نہ سکی۔ آہ......
لیکن میں...... میں اب تمہیں اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔" میرے اندر وحشت ابھر آئی
مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی آدم خور ہوں اور اسے کھا جانا چاہتا ہوں۔ فیوری اپنے آپ

چھڑانے کے لئے بے پناہ مچل رہی تھی۔ میں نے اس کے ریشمی بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر
دو تین جھٹکے دیئے۔ وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی تو میں نے کہا۔

"بہت حسین ہو تم فیوری! بہت حسین ہو۔"

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں خوف، دہشت کی بجائے حیرت تھی۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمجھیں...... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

میں وحشیوں کی طرح اسے بھنبھوڑنے لگا۔ اس کا لباس تار تار ہو گیا۔ اس نے زخمی
شیرنی کی طرح پنجہ مار کر میرا منہ نوچنے کی کوشش کی لیکن اس وقت میرا زناٹے دار تھپڑ اس
کے منہ پر پڑا۔ میں کیا کر رہا تھا، ایک بار پھر میرے اندر ایک جنون سا ابھرا۔ میری
نوجوانی بے داغ تھی۔ ایلس فیوری عمر میں مجھ سے بے حد بڑی تھی۔ میں ایک مہذب
گھرانے کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ ذمہ دار سرکاری افسر تھا۔ میں نے آج سے پہلے فیوری
کو اس نظر سے دیکھا تک نہ تھا تو پھر یہ سب کیا ہے؟ بڑا خوفناک ماحول ہو گیا تھا۔
اسکرین کے پیچھے سینئر آفیسر کی لاش خون میں تر بتر پڑی تھی اور میں اس کی محبوبہ کو وحشیوں
کی طرح بھنبھوڑ رہا تھا۔

بہرحال آہستہ آہستہ فیوری کی مزاحمت ختم ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اب وہ
خوف و دہشت کے لمحات سے نکل آئی ہے۔ اس کے اندر ایک سکون سا پیدا ہو گیا ہے۔
ایک عجیب سا سکون۔ لیکن یہ ساری چیزیں اس وقت مجھے متاثر نہیں کر رہی تھیں۔ میں
نے فیوری کے انداز میں خود سپردگی دیکھی اور پھر وہ لمحات گزر گئے جنہوں نے مجھ سے
میری شخصیت چھین لی۔ سب سے پہلے میرا کردار قتل ہو گیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی
کہ فیوری میرا مکمل طور پر ساتھ دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر
عجیب سا سکون تھا۔ جیسے سوتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر اس کی آواز میرے
کان میں ابھری۔

"خاقان! میری جان، میری روح!"

میں پھر چونکا۔ میں خاقان ہوں کیا؟ یہ جو کچھ ہوا ہے، خاقان کے ذریعے ہوا ہے؟
خاقان جمشیدی، ہمدان جمشیدی کا بیٹا۔ ایک بلند کردار اور صاحب عزت آدمی۔ میں درندہ
کیسے بن گیا؟ نہیں، میں خاقان نہیں ہوں اور میں مورالس بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ مورالس
کا بدن تو الماری سے ٹیک لگائے کبھی کا اکڑ گیا ہو گا۔ یہ میرا بدن تھا ہی نہیں۔ یہ تو کوئی

اور تیسری ہی شخصیت تھی۔ اور جہاں تک ایلس فیوری کا تعلق تھا بے شک اس کے کردار
کوئی حرف نہیں لایا جا سکتا تھا کیونکہ میں نے اسے اس برائی کی جانب آمادہ کیا تھا۔
پھر صورتحال ایک دم تبدیل ہوئی۔ ایلس فیوری کی نگاہ اس سٹینڈ کے دوسری جانب
اور اس نے بڑی آسانی سے مورالس کی لاش کو دیکھ لیا اور اس کے بعد میں اگر فیوری
منہ نہ بند کر دیتا تو وہ یقیناً ایسی بھیانک چیخ مارتی جو چیمبر کی سنگین دیواروں کے پار
روم تک سنی جاتی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے محبت
میری قربت کا جو احساس اسے نرم کرنے کا باعث بنا تھا، وہ مدھم پڑتا جا رہا تھا۔
پاگلوں کی طرح کبھی لاش کو دیکھتی کبھی میرا منہ تکتی۔

''آہ...... تم نے اسے کیوں قتل کر دیا؟ تم نے...... تم نے اوہو...... میرے خدا
میرے خدا تم نے این مورالس کو زندگی سے محروم کر دیا۔ آخر کیوں...... آخر کیوں؟''

میں نے اسے محبت سے صوفے پر بٹھا دیا اور دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''تم یقین
فیوری! میں نے اسے نہیں مارا۔ میں تو کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔ اس نے خودکشی کی ہے

''بکواس کرتے ہو کتے...... ذلیل، کمینے، تم نے اسے قتل کیا ہے۔ تم نے اسے قتل کیا
ہے۔ تم اس کے قاتل ہو۔'' وہ مجھے دھکا دے کر اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی جانب
بھاگی۔ میں صوفے سے الجھ کر گرتے گرتے بچا تھا۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی
فیوری اگر دروازے تک پہنچ گئی تو پھر میرے بچنے کی آخری امید بھی ختم ہو جائے
چیمبر کا دروازہ جو مقفل نہیں تھا، یہ نازک اندام عورت آسانی سے نہیں کھول سکتی تھی
خطرے کا بٹن تو دبا سکتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر آخری کوشش کی اور پھر چیخ کر کہا

''فیوری! خدا کے لئے رُک جاؤ...... پوری بات تو سن لو۔'' نجانے میرے لہجے
کیا اثر تھا کہ وہ رُکی، اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں خوف اور نفرت
ملا جلا تاثر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''وحشی، کمینے، تم قاتل ہو۔ تم کالی نسل کے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ تم
نے...... تم نے مورالس کو مار ڈالا۔'' وہ لڑکھڑائی اور شیشم کے قد آدم لیمپ کا سہارا
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں دیکھتا رہا۔ اور اس وقت اس کے پیروں کے پاس
این مورالس کا ریوالور پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ آنسو بہا رہی تھی اور نفرت بھری نگاہوں
مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ اور پھر شاید اس نے میری نگاہوں کے تعاقب میں ہی اس ری

کو دیکھا۔ بجلی کی طرح تڑپ کر اس نے ریوالور اٹھا لیا اور اس کا رخ میری جانب کر دیا۔
میں جو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا، ایک بار پھر اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ لیکن اس وقت
اگر مکاری سے کام نہ لیتا تو زندگی کے بچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صورتحال ایسی ہی
ہو گئی تھی۔ ہر لمحہ میرے خلاف ایک مستحکم حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے
مصلحت سے کام لے کر انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

''فیوری! تم یقین کر لو میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ پوری بات میں تمہیں اس وقت
نہیں بتا سکتا فیوری۔ کسی بھی طرح مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں
گا۔ ہم دونوں سازش کا شکار ہوئے ہیں فیوری! تم یقین کرو ایک ایسی سازش کا شکار
ہوئے ہیں ہم کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ لیکن جب تمہیں اس کے بارے میں
معلومات حاصل ہوں گی تو تم مجھے بالکل بے گناہ سمجھ لو گی۔''

''کتے...... کتے، وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ وہ تیری طرح جانور نہیں تھا۔ سمجھا؟ تیری
طرح جانور نہیں تھا وہ۔'' فیوری نے بدستور نفرت بھری آواز میں کہا۔

''اوہ...... فیوری، فیوری، تم میری بات تو سمجھو۔''

لیکن فیوری پر ایک دم دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اس نے ریوالور سیدھا کیا اور میں نے
ایک دم پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اس نے گولی چلا دی تھی لیکن پیچھے چھلانگ لگاتے ہوئے
میں مورالس کے بدن سے ٹکرایا۔ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مورالس کی
لاش ایک طرف لڑھک گئی۔ وہ اب بھی فرش پر اوندھی پڑی تھی اور اب اس کے پہلو میں
بھی ایک سوراخ بن گیا تھا۔ میں تیزی سے میز کے اندر سے ہو کر ایک جانب رینگ
گیا۔ لیکن جس جگہ میں نے پناہ لی تھی وہاں سے فیوری نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ایک لمحے
کے اندر اندر میرا ذہن یہ کہہ رہا تھا کہ میرے بچنے کی صرف ایک ہی اُمید ہے اور وہ یہ
کہ کسی طرح فیوری سے ریوالور چھین لوں اور اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں۔
نرم قالین پر کسی طرح کی آواز پیدا ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم
تھا کہ وہ اپنی جگہ کھڑی ہے یا میری جانب بڑھ رہی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے
اندھیرے کمرے میں مجھے قابو کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن میں بچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا
تھا کہ اب کچھ ہی لمحے جا رہے ہیں جب فیوری مجھ پر مسلسل فائرنگ کرے گی اور کوئی نہ
کوئی گولی مجھے لگ جائے گی۔

بہرحال میں دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا میز کے گرد چکر لگا کر دوسری طرف
فیوری میری طرف سے غافل نہیں تھی۔ جونہی میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش ک
فولاد کی نال میری ٹھوڑی سے آ لگی اور فیوری کی غراہٹ ابھری۔
"اٹھو..... کتے، میں تجھے اپنے ہاتھ سے ہلاک نہیں کروں گی۔"
مجھے ایک بات پر شدید حیرت ہوئی۔ کچھ لمحے پہلے جو عورت میری بانہوں مے
حال ہو رہی تھی اور ایک دم مجھ سے متاثر ہو گئی تھی، اب اس کے لفظ اور لہجہ انتقام
پکار رہا تھا۔ میں بزدل اور عیار نہیں تھا لیکن اشبھ بھاونا کے بعد مجھ پر کیا کیا قیامتیں
رہی تھیں۔ میں نے اپنی فطرت کے خلاف اپنی پاکیزگی داغدار کر لی تھی اور ا
چیونٹیوں کی طرح رینگتا ہوا موت سے چھپتا پھر رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ا
بھی ان حالات میں اس بات پر غور کر سکتا تھا کہ میری شخصیت داغدار ہوئی ہے ا
نادیدہ قوتوں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ ورنہ میں اس طرح کا انسان نہیں تھا۔ میں نے
میں کہیں کسی عورت کو اپنے قرب کا ایک لمحہ نہیں بخشا تھا۔ میں نے اپنے بدن کو ک
بدن سے مس کرنے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ لیکن اس وقت..... اس وقت وہ کچھ
طاقتیں تھیں جو مجھے اس پر آمادہ کر رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے اند
عیار مجرم جنم لیتا جا رہا تھا۔
میں نے پلک جھپکتے میں طے کیا کہ عیاری اور مکاری سے کام لوں گا۔ یہ عور
ہے اور انتقام پر تلی ہوئی ہے۔ مجھے گارڈ روم لے جائے بغیر نہیں رہے گی۔ می
آنکھوں میں بے پناہ خواہشیں اور پیار بھر کر اسے دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھیں چی
کے ٹکڑوں کی طرح تھیں۔ میز کا سہارا لئے ہوئے جھکی ہوئی تھی اور ریوالور اس ک
میں تھا۔ اس حالت میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ آہستہ بڑے پیٹ
میں، میں نے کہنا شروع کیا۔
"سنو فیوری! یہ حقیقت ہے۔ میں تم سے اب بھی یہ کہوں گا کہ میں مورالس ک
نہیں ہوں بلکہ تم نے میری زندگی میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پیدا کر دی ہے۔
یقین نہ کرو میری بات پر کہ تم میری زندگی میں پہلی لڑکی ہو فیوری۔ آج سے پ
نے کبھی بھی کسی لڑکی کو وجود کا شریک نہیں بنایا تھا۔"
"بکواس مت کر جاہل آدمی، بکواس مت کر۔" اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی کرخ

بدنما تھا۔
"تم بے شک یقین مت کرو فیوری! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔
میں بڑے سخت اصولوں کا آدمی تھا۔ لیکن تمہارے قرب نے نجانے مجھ پر کیا جادو کر دیا
کہ میں اپنا کردار، اپنی ریاضت سب کچھ بھول گیا۔ فیوری، تم جانتی ہو کہ میرا مذہب کیا
ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ گناہ سب سے زیادہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن میں تمہیں دیکھ کر
نجانے کس کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اب اگر تم مجھے مار بھی ڈالو تو مجھے پرواہ نہیں۔ میں اب
تمہارا ہوں۔"
"ٹھیک ہے فیوری، مجھے تمہارے ہاتھوں مر کر بھی خوشی ہو گی۔ چلو، گولی چلاؤ۔ مار دو
مجھے۔ لیکن مارنے سے پہلے اگر تم میری ایک بات سن لو، جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سن لو تو
تمہاری مہربانی ہو گی۔"
مجھے یوں لگا جیسے میری اس وقت کی کوشش رنگ لائی ہے اور اس کے ہاتھ میں
لرزشیں ہونے لگیں۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا مگر اس نے دانتوں میں ہونٹ دبا کر ریوالور پر
گرفت مضبوط کر لی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری اداکاری کامیاب ہے۔ میں رُکے بغیر
بولتا چلا گیا۔
"فیوری! میں پہلے ہی دن سے تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری
شخصیت اتنی جادوگر ہے کہ مجھ جیسے سخت اصول پسند کو دیوانہ بنا دے گی۔ فیوری! ہم
دونوں کے ساتھ وقت نے غداری کی ہے۔ اس میں تمہارا یا میرا قصور نہیں۔ خود کو ملامت
نہ کرو۔ تم تو وہی فیوری ہو جو اپنی چھوٹی سی دنیا میں....." یہ کہہ کر میں نے ایک لمحے کے
لئے سانس لی۔ میں غم آلود نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فیوری کے
لب کانپنے لگے۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ آہستہ آہستہ جھکنے لگا اور میرے اندر کے کمینے
انسان نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ وہ مارا۔ میں نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے شانے
کو انگلیوں سے چھونے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے میں نے اسے
اپنی طرف کھینچا۔ وہ کچی دیوار کی طرح ڈھے گئی اور میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر
بڑی آہستگی سے ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ میرے ہی وجود میں سمٹ گئی تھی
اور اب اس کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔
میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سات بجنے والے تھے۔ باہر اب پوری طرح روشنی ہو گئی

تھی۔ آٹھ بجے برآمدے اور لان پر عملے کی آمدورفت شروع ہو جائے گی۔ اگر یہ اس
طرح ٹسوے بہاتی رہی تو میں مارا جاؤں گا۔ اب لمبی تقریریں کرنے کا وقت نہیں رہا تھا
مجھے اب اس کتیا سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں اب اسے اپنی مدد پر کیسے آمادہ کروں
میرا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ یہ اگر چاہے تو مجھے اس منحوس چیمبر سے نکال کر اپنے بنگلے
میں پناہ دے سکتی ہے۔ میں نے دل سوزی سے کہا۔

"فیوری! میں نے تو تمہیں دعوت دی ہے کہ مجھے ہلاک کر دو۔ میری زندگی تمہارے
رحم و کرم پر ہے۔ دیکھو، یہ ریوالور میرے ہاتھ میں ہے مگر یہ تمہاری ملکیت ہے۔ میں
تمہارے ساتھ کوئی مکر و فریب نہیں کر رہا۔ تمہیں رونا نہیں چاہئے فیوری، تمہیں رونا نہیں
چاہئے۔ اگر چاہو تو میری زندگی بچالو جواب صرف اور صرف تمہارے لئے ہے۔"

میری مکالمہ بازی جاری ہی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گھڑی کی ٹک ٹک میرے اعصاب
پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ مجھے سوا سات بجے تک ادھر سے نکل کر فیوری کے بنگلے میں
پناہ لینی چاہئے۔ مجھے اس آتش فشاں کو جگانے اور سرد کرنے میں پندرہ بیس منٹ سے
زیادہ وقت نہیں لگانا چاہئے ورنہ مارا جاؤں گا۔ میں وقت کے خلاف دوڑیں لگا رہا تھا
آہستہ آہستہ اس کی ہچکیاں بند ہونے لگی۔ وہ میری گود میں کسی آسائش پسند بلی کی طرح
کسمسائی۔ بازی اب میرے ہاتھ آنے لگی تھی۔ میں ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ تھوڑے
فاصلے پر مورالس کی خون میں لتھڑی لاش پڑی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے اسے دوبارہ
اس طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیا اور ایک بار پھر اسے جذباتی کیفیت کا شکار کر دیا۔
عورت اور گیلی مٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی رہائی کا معاملہ پکا کر لیا۔ پھر
مجھے اس بات پر امید ہوگئی کہ اب صورتحال میرے حق میں ہوگئی ہے۔

آخر کار میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے فرش سے اٹھایا اور مختصر لفظوں میں اس سے
درخواست کی کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ وہ سر جھکائے کھڑی سنتی رہی۔ پھر
نے سب سے پہلے اسکرین کو اس کی جگہ لگایا۔ فیوری نے ریوالور کو اپنے رومال سے اچھی
طرح صاف کرنے کے بعد مورالس کی لاش کے قریب ڈال دیا۔ قالین پر تمام نشانات
مٹانے کے بعد میں نے اپنا کوٹ فیوری کے شانوں پر ڈالا۔ اس لئے کہ اسے اس کی
ضرورت تھی اور آخر کار چیمبر کی چابی لے کر ہم چلنے کو تیار ہوگئے۔ میں نے چیمبر کا بھاری
دروازہ کھولا۔ فیوری نے باہر جھانک کر پہلے اپنا اطمینان کر لیا کہ برآمدے میں کوئی ہے

نہیں۔ اس کے بعد ہم باہر آگئے۔ اس چیمبر کا دروازہ مقفل کیا اور برآمدے کے ستون کی
آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ہم عمارت کے باہر ہی باہر اس راستے
پر چلتے ہوئے جدھر سے میں مورالس کے ساتھ یہاں تک آیا تھا فیوری کے بنگلے کی طرف
نکل جائیں۔ لیکن اب پوری طرح دن نکل آیا تھا۔ فیوری نے بتایا کہ کمپاؤنڈ کے وسیع
سبزہ زاروں پر مالی کام کر رہے ہوں گے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"آؤ...... اس طرف آؤ۔"

ہم دونوں ایک راہداری کی جانب مڑ گئے اور مختلف برآمدوں اور کمروں سے گزرتے
ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں قیام کے دوران میں ہاؤس کیپر کے فرائض بھی انجام دیتا
تھا اور فیوری تو تھی ہی ہاؤس کیپر۔ اسے معلوم تھا کہ عملے کے لوگ عمارت کے کس حصے
میں کیا کام کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیں کئی
آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ فیوری نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے
خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم پنجوں کے بل چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے سے
گزرے تو مارے خوف کے میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے ہمارے
پاس آ رہے تھے۔ فیوری مجھے لے کر چوبی سیڑھیوں کے نیچے دبک گئی۔ آنے والے
ہمارے سروں پر پہنچ گئے تھے۔ ہم جن سیڑھیوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے، یہ دھم دھم
کرتے ہوئے انہی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ فیوری نے مجھے اشارہ کیا اور کہا۔

"آؤ چلو...... میدان صاف ہے۔"

ہم پھر اس عمارت کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئے۔ خدا خدا کر کے یہ سلسلہ ختم ہوا تھا۔
اس کے بعد ایک خالی کمرے کی کھلی کھڑکی سے فیوری کے اسٹاف کے بنگلے کا عقبی حصہ نظر
آنے لگا۔ فیوری نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، دور ایک مالی کام کر رہا تھا لیکن ہماری
طرف اس کی پیٹھ تھی۔ یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ عمارت میں اب ایک منٹ بھی ٹھہرنا
خطرناک تھا۔ ہم آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے کمرے سے باہر آگئے۔

"سنو، سیڑھیوں سے اتر کر آرام سے ٹہلتے ہوئے میرے کمرے کی طرف جاؤ اور عقبی
برآمدے کے ستون کی آڑ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی آتی ہوں۔"

"اوکے ڈارلنگ۔" میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا
سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ پھر میں پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دائیں بائیں دیکھتا ہوا

اس کے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ یہ چہل قدمی میرے لئے قیامت سے کم نہیں تھی۔ لیکن جوں جوں بنگلے سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، میرا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار میں بنگلے کے برآمدے میں پہنچ گیا اور ستون کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد فیوری بھی وہاں آ گئی۔ اس نے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور مجھے جلدی سے اندر دھکیل دیا۔ یہ اس کی خادمہ کا رہائشی کمرہ تھا۔ اس کمرے کو پار کر کے ہم ایک اندرونی ہال میں پہنچے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فیوری کی خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ یہ کمرہ بہت آرام دہ تھا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے ہیں۔

یہاں کا ماحول مجھے بے حد اچھا لگا۔ میں سیدھا جا کر اس کے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے کئی گھنٹے عذاب میں گزارے تھے۔ زندگی اور موت ایک ایک لمحہ قریب آ رہی تھی۔ لیکن اب یہاں تک آنے کے بعد تھوڑا سا اطمینان ہو گیا تھا کیونکہ فی الحال میں بالکل محفوظ تھا۔ فیوری نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی کیفیت کا صحیح الفاظ میں تذکرہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مطمئن بھی تھی، مضطرب بھی تھی، غمزدہ بھی تھی، مسرور بھی تھی اور خوفزدہ بھی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھکی تھکی مسکراہٹ۔

''فیوری! تم نے مجھے بچا لیا ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔''

فیوری کے چہرے پر کرب کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''میں نہیں جانتی کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔ مگر سنو..... تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم پوری بات مجھے بتاؤ گے۔ بولو، مجھے پوری بات بتاؤ۔ مگر نہیں، ابھی نہیں۔ میں کپڑے تبدیل کر کے چلی جاؤں گی۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لو اور اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرو کہ میرے سامنے صرف سچ بولو۔ تمہارا سچ تمہیں زندگی دے گا ورنہ میں تم سے متاثر ضرور ہو گئی ہوں لیکن مورالس کو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں نے اس خوابگاہ کا دروازہ بند کر لیا۔ فیوری کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ وہ روز کی طرح آج بھی وائسرائے چیمبر کی جانب نہ جائے بلکہ بل ویدا ہاؤس کے انتظامی شعبے میں پہنچ کر پہلے فراشوں کو ساتھ لے کر چیمبر کا دروازہ کھولے اور یہ ظاہر کرے کہ وائسرائے کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ دیر تک سوتی رہی ہے۔ اور اب فراشوں کو لے کر جلد صفائی کا کام بھی ختم کرا دینا چاہتی ہے۔ اس طرح

فراشوں کی موجودگی میں چیمبر کھول کر وہ مورالس کی لاش دریافت کرے گی اور سارے فراش اس کے گواہ ہوں گے۔ اصل میں، میں اس الجھن میں تھا کہ رات کو میں یہاں داخل ہوا تھا تو ابھی تک گارڈ روم میں میری واپسی درج نہیں ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی موجودگی کہاں ثابت کروں گا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مورالس کی لاش ملے گی اور میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس وقت تو میں محفوظ ہوں لیکن یہاں سے نکلنے کی کیا صورتحال ہو گی۔ کمپاؤنڈ کے کئی دروازے ہیں لیکن صرف دو دروازے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس سے ہم آئے تھے اور دوسرا پچھلا گیٹ جو صرف ملازموں کی آمدورفت اور سامان لانے لے جانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس طرف چھوٹا گارڈ روم تھا۔ میں نے جو مہماتی کہانیاں پڑھی تھیں ان میں تو یہ تھا کہ سامان گاڑی میں یا کسی کار کی ڈگی میں بند ہو کر یا بھیس بدل کر لوگ ایسی جگہوں سے باہر نکل جایا کرتے ہیں۔ مگر کہانیاں صرف کہانیاں ہوتی ہیں۔ اصل مسئلہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ حفاظتی انتظامات اس قدر سخت تھے یہاں کہ گارڈز کی لاعلمی میں نکل جانا یا داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ دوسری بات یہ کہ اگر میں کسی طرح یہاں سے نکل بھی گیا تو پھر تفتیش کے وقت میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہو گا کہ میں مورالس کے ساتھ یہاں آیا تھا تو گارڈز کے علم میں آئے بغیر میں باہر کس طرح چلا گیا اور کیوں گیا؟ اس طرح تو مورالس کی موت کا الزام لازمی طور پر میرے ہی سر آئے گا۔

میں فیوری کے بستر پر بیٹھا انہی خیالات میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ آہ..... یہ کیا قصہ ہے؟ میرا خون خشک ہو گیا۔ فیوری کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ پھر اس کی خوابگاہ پر ٹیلی فون کیوں کیا گیا ہے؟

گھنٹی برابر بجے جا رہی تھی۔ میں اگر فون اٹھاتا ہوں تو میری یہاں موجودگی کا راز کھل جائے گا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے فیوری مجھے کہیں سے فون کر رہی ہو اور مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتی ہو۔ بہرحال آگے بڑھ کر میں نے ریسیور اٹھایا۔ لیکن یہ سوچ لیا تھا کہ میں صرف سنوں گا، بولوں گا نہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ٹیلی فون پر فیوری ہی تھی۔ اس نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہیلو..... کیا یہ تم بول رہے ہو؟ خاقان! ایک المناک حادثہ ہو گیا ہے۔ فوراً وائسرائے چیمبر میں پہنچو۔'' پھر کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''اور تم نے مجھے یہ نہیں

بتایا تھا کہ رات مورالس بھی تمہارے ساتھ ہی اندر آیا تھا۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”فیوری! یہ سب کیا ہے؟ چیمبر سے فون کر رہی ہو؟“

”ہاں، ہم لوگ چیمبر میں ہیں۔ تم فوراً آ جاؤ۔ اور سنو میری ملازمہ سے کہنا کہ میرے لئے لنچ تیار نہ کرے۔“

”فیوری! کیا تم نے سب کو بتا دیا ہے کہ میں بنگلے میں تمہارے ساتھ ہوں؟ اور یہ ملازمہ کا کیا قصہ ہے؟“ اس نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ تم جلدی سے یہاں آ جاؤ“ اور فون بند کر دیا۔ اس کا رویہ بے حد پراسرار تھا۔ کیا وہ مجھے پھنسوانا چاہتی ہے؟ لیکن نہیں۔ اگر وہ پھنسوانا چاہتی ہے تو ٹیلی فون پر اس طرح مکالمے بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے سب کے سامنے یہ کیوں تسلیم کر لیا کہ میں اس کے بنگلے پر موجود ہوں اور رات بھر وہیں رہا ہوں۔ یا تو یہ عورت مجھے بچانے کے لئے بہت بڑی قربانی دے رہی ہے یا پھر مجھ سے اپنی تباہی اور مورالس کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں پھر وائسرائے چیمبر میں جاؤں اور جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا سامنا کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور خواب گاہ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ بنگلے کے وسیع ہال میں ایلس فیوری کی عیسائی ملازمہ گلدان میں پھول سجا رہی تھی۔ اس کے بارے میں غالباً ایلس فیوری نے مجھ سے کہا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور گلدان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”سس...... سر...... سس...... سر، آپ؟“

شاید اس نے مجھے ایلس فیوری کی خوابگاہ سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے اس طرح گردن ہلائی جیسے میں اس کی بات کا جواب دے رہا ہوں اور اس کے بعد میں پُراعتماد قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ کئی برس کی ملازمت کے دوران نک چڑھی، کم آمیز اور کنواری ایلس فیوری کی جو شخصیت بنی تھی وہ اب اس گلدان کی طرح پارہ پارہ ہو چکی تھی جو ملازمہ کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹا تھا۔ اب یہ سارا عملہ قریب کی گنجان بستیوں سے لے کر کشادہ بنگلوں، کوٹھیوں اور بازاروں تک میں وائسرائے کی پرسنل سیکرٹری کے گھناؤنے کرتوت مزے لے لے کر دوہرائے گا اور بے چاری ایلس فیوری کی رنگین راتوں کے

قصے ہر زبان پر ہوں گے۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایلس فیوری شدید نقصانات سے دوچار ہوئی ہے۔ وائسرائے چیمبر کی طرف جاتے ہوئے پوری صورتحال اب میرے سامنے تھی۔ فیوری نے مجھے بچانے کی غرض سے میری موجودگی کا جواز پیدا کرنے کے لئے اپنا بے داغ کردار اور اپنی پوری شخصیت بھینٹ چڑھا دی تھی۔ عورت جب قربانی دینے پر آتی ہے تو اسی طرح قربان ہو جاتی ہے چاہے اس کا تعلق دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو، اس کی فطرت کہیں بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ قربانیاں دیتی ہے۔ حالانکہ ایلس فیوری سے یہ قربانی میں نے زبردستی لی تھی۔

بہرحال چیمبر کے دروازے پر سکیورٹی گارڈ والوں کو دیکھا جو گھیرا ڈالے ہوئے کھڑے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر فیوری میری طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ کوئی سکیورٹی والا مجھے آ کر گھیرتا اس نے میرے سینے پر سر ٹکا کر رونا شروع کر دیا اور لرزتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”آہ، ڈیئر خاقان! کسی نے این مورالس کو قتل کر دیا۔ وہ مر گیا۔ پتہ نہیں اس نے خودکشی کی ہے یا...... یا......“ پھر سر اٹھائے بغیر اس نے چپکے سے کہا۔

”اور تم یہ بیان دو گے کہ میں رات کو ایلس فیوری کے پاس آیا اور راستے میں این مورالس مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ معائنے کے لئے آیا ہے۔ اور...... اور کوئی اگر تم سے پوچھے تو کہہ دینا کہ وہ میرے اور تمہارے تعلقات کے بارے میں جانتا تھا۔“

یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ اتنے میں سکیورٹی کا ایک انگریز سارجنٹ ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے شانے تھپتھپا کر فیوری کو تسلی دی اور مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”سر! سکیورٹی کے ڈپٹی چیف آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

فیوری نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ اب اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ لٹے ہوئے شہر کی طرح اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ مگر پھر بھی ان آنکھوں نے مجھے حوصلہ دیا اور سارجنٹ کے ساتھ چیمبر سے ملے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سارجنٹ سابق انگریز فوجی تھا۔ اس نے مجھ سے سوالات کئے اور میں وہی جواب اسے دینے لگا جو فیوری نے مجھے بتائے تھے۔ یہ انگریز فوجی این مورالس کا ماتحت تھا۔ میرے اس بیان پر کہ فیوری میری محبوبہ ہے اور یہ رات میں نے

اس کے بنگلے پر گزاری ہے، اس کا سرخ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اگر میں آئی سی ایس آفیسر ہوتا تو وہ اسی وقت مجھے ہتھکڑی ڈال دیتا۔ بھلا حاکم قوم کا ایک فرد ایک دیسی باشندے سے اپنی قوم کی رُسوائی کی داستان کیسے سن سکتا تھا؟ مگر وہ مجبور تھا۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں سارجنٹ کو کمرے سے نکل جانے کا کہا پھر مجھ سے بولا۔

"سنو، وائسرائے کے آنے تک تم اپنے بنگلے میں ہی رہو گے۔ نہ کسی سے ملاقات کرو گے نہ کسی سے کسی اور طرح کا رابطہ فون وغیرہ کے ذریعے کرو گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تمہارے بنگلے کا ٹیلی فون عارضی طور پر کاٹ دیا جائے گا۔ باہر سکیورٹی کی گاڑی گئی ہے۔ وہ تمہیں تمہارے بنگلے پر چھوڑنے جائے گی۔ سمجھے؟" اس نے یہ تمام باتیں اس طرح سے کہی تھیں کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ چمڑے کے کوڑے مار مار کر یہ باتیں مجھ سے کہتا۔ لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر کہا۔

"آپ آرام کریں سر! اور میں نے جو گزارش کی ہے اس کا خیال رکھیں۔ تھینک یو۔"

گاڑی میں میرے ساتھ ایک شخص سادہ لباس میں آ بیٹھا جو مجھے بنگلے کے برآمدے تک پہنچانے کے بعد قریب ہی ایک کرسی ڈلوا کر بیٹھ گیا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے نظر بند کر دیا گیا ہے اور وائسرائے کے آنے پر میری قسمت کا فیصلہ ہو گا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر نڈھال سا اپنے بستر پر پہنچ گیا اور اس کے بعد مجھ سدھ بدھ نہ رہی۔ کچھ اس طرح تھک گیا تھا میں کہ اب کچھ سوچنے کے لئے دماغ میں ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ این مورالس کی موت، ایلس فیوری کے ساتھ اچانک ہی میرا عشق۔ میں اپنے آپ کو اتنے سستے داموں فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مرد کی بھی آبرو ہوتی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ وہ ہر عورت کے سامنے زمین بوس ہو جائے۔

بہر حال دوپہر تک سوتا رہا اور دن میں بھی خواب دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ میں شو مند کی دھار میں اپنے مورتی والے کمرے میں دھم سنگھاسن پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک بھکشو عورت میری طرف ریوالور تانے آگے بڑھتی ہے۔ تب میں وہ بھوج پتر کھینچ مارتا ہوں اور وہ ریوالور پھینک کر میرے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ میں اس کے دلکش اور دلآویز وجود کو دیکھتا ہوں اور میری آنکھوں میں ایلس فیوری کا جسم آ جاتا ہے جو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھتا ہوں تو ایک طرف سے این مورالس گیروا لباس پہنے لاٹھی ٹیکتا ہوا آتا ہے۔ اس کی کنپٹی کے سوراخ سے خون بہہ رہا ہے۔ میں

ریوالور سے اس پر کئی فائر کرتا ہوں مگر وہ اسی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ پھر دوسری جانب سے اجے ورتنا گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے قہقہے مارتا ہوا آ رہا ہے اور پھنسی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

"کہا تھا نا میں نے تم سے...... کہا تھا نا میں نے تم سے کہ گاشر بھرم کی چوٹی پر مت جاؤ۔ جو نہیں مانتا وہ نقصان اٹھاتا ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اسی وقت این مورالس اور وہ عورت غائب ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن میرے گرد جیل کی دیواریں ہیں اور سامنے جنگل نظر آ رہا ہے۔ تھوڑے فاصلے پر بابا جان کا ملازم خاص سلاخوں میں سے کھانے کی ٹرے میری جانب بڑھا رہا ہے۔ عجیب وغریب خواب تھا۔ سارے ہی کردار بدلی ہوئی شکل میں میرے سامنے نظر آتے ہیں۔ پھر میں نے ہیگ کو دیکھا جو جیلر کی وردی پہنے ہوئے ادھر آ رہا ہے اور وہ بابا جان کے ملازم کے سر پر اپنی چھڑی سے ضرب لگاتا ہے اور بابا جان کا ملازم خاص اور میرا بچپن کا اطالیق مجھے پکارتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ میں غصے میں کوٹھڑی کی سلاخیں پکڑ کر موڑنے لگتا ہوں کہ میرے پیچھے سے ماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں۔

"لعنت ہو تجھ پر خاقان! لعنت ہو تجھ پر۔ تو نے اپنے باپ کو مار دیا۔"

میں گھبرا کر مڑتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ماں کی بجائے ایلس فیوری براؤن غرارہ پہنے اور سر پر پلو ڈالے میرے پیچھے کھڑی ہے۔ وہ افسردگی سے مسکراتی ہے اور پھر وائسرائے کا کاغذ تراش چاقو لے کر مجھ پر حملہ کرتی ہے۔ میرا شانہ زخمی ہوتا ہے اور میں چیخ مار کر اٹھ کر بیٹھتا ہوں۔ میرا اردلی میری چیخ کی آواز سن کر میرے پاس آیا اور میرا شانہ ہلا ہلا کر مجھے جگانے لگا۔

"سر، جاگئے سر......"

"کیا بات ہے...... کیا بات ہے؟" میں نے ہڑبڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سر! وائسرائے بہادر آ گئے ہیں اور آپ کو ویدا ہاؤس میں طلب کیا گیا ہے۔"

"اوہ......" میرا دل لرزشوں سے لرز رہا تھا۔ بہر حال وائسرائے کی طرف سے طلبی تھی، مجھے جانا تھا۔ میں نے ملازم سے کہا۔

"سنو، مجھے چائے بنا دو اور ہلکی پھلکی کوئی کھانے کی چیز۔ میں نہا کر آتا ہوں۔"

پھر چائے وغیرہ پی کر میں باہر نکلا تو سکیورٹی کی گاڑی میں سادہ لباس والا میرا انتظار

کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور میں اندر بیٹھ گیا۔ پھر وائسرائے ہاؤس کی لائبریری میں میری تنہا پیشی ہوئی۔ میں نے وائسرائے کو اس درجے غضب ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"مسٹر خاقان! میں فوری طور پر تمہیں اور مس ایلس فیوری کو معطل کر رہا ہوں۔ مجھے تم لوگوں کی ذاتی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر سکیورٹی کی بے ضابطگیاں ہوئی ہیں جن کی تحقیقات ضروری ہیں۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بلایا ہے کہ مورالس جن حالات میں ہلاک ہوا ہے ان کے بارے میں اگر تم کوئی ایسی بات بتانا چاہو جس کا سرکاری ریکارڈ میں شامل ہونا حکومت کے مفاد میں ہو تو میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ تحقیقات مکمل ہونے تک تمہاری نقل و حرکت صرف رہائش گاہ تک محدود رہے گی۔ اور اگر تمہیں کچھ نہیں کہنا تو تم جا سکتے ہو۔" میں خاموش کھڑا رہا۔ وائسرائے نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر اٹھ کر بولا۔ "بس، اب تم جاؤ۔"

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ میں ہیگ کی سازش کے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میری مصیبت تو دور ہونے کی نہیں۔ بلکہ میں تو اور بھی پھنس جاؤں گا اور بیچاری فیوری جو میری وجہ سے پہلے ہی برباد ہو چکی ہے، بالکل ہی ماری جائے گی۔ پھر بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"سر! این مورالس نے خودکشی کی ہے اور یہ بات میں پہلے سے جانتا تھا کہ وہ ایک دن خودکشی کرے گا۔"

"کیا مطلب؟" وائسرائے نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ کیا میں وائسرائے کو یہ بات بتاؤں کہ میں نے بھوج پتر پر اس کی لاش دیکھی تھی؟ احمقانہ بات ہے۔ وائسرائے سے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ مگر میں نے فوراً ہی کہا۔

"سر! میں نے اس کے ہاتھ کی لکیروں میں دیکھ لیا تھا۔ ہم ہندوستانی لوگ ستاروں کے کھیل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ایک بار میں نے اس کا ہاتھ دیکھا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ خودکشی کرے گا۔"

"تم لوگ آدھے پاگل ہوتے ہیں۔ ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ گیٹ آؤٹ۔" اس نے کہا اور میری طرف پشت کر لی۔ میں سلام کر کے لائبریری سے باہر آ گیا۔

اس کے بعد تحقیقاتی مشن ترتیب پایا گیا اور اس کے سامنے بیانات اور گواہیوں کا وہ سلسلہ چلا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ تفتیش کرنے والے جن سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھے ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ مورالس چیمبر میں کیا کرنے گیا تھا؟ دوسرے اس کی لاش میں دو گولیاں پیوست تھیں۔ ایک سے تو وہ ہلاک ہوا تھا اور دوسری مرنے کے چند گھنٹے بعد چلائی گئی تھی۔ آخر کیوں؟ اگر اس نے خودکشی کی تھی اور تجزیئے سے یہ ثابت ہوا تھا کہ گولی ریوالور کنپٹی پر رکھ کر چلائی گئی ہے تو پھر دوسری گولی کس نے چلائی تھی؟ چیمبر میں جہاں دوسرے نشانات تھے وہاں میری انگلیوں کے تازہ نشانات کیوں تھے؟ جبکہ وہاں میرے داخلے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ غسل خانے میں بھی نشانات کا پایا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر مورالس کے ریوالور پر سے انگلیوں کے نشانات بھی غائب تھے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی انگلیوں کے نشانات بھی نہیں تھے۔ یہ چکر نجانے کب تک چلتا رہا۔ بہر حال میں نے اور ایلس فیوری نے جو پہلا بیان دیا تھا، ہم اس پر قائم رہے۔ یعنی یہ کہ ہم مختلف جگہ ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے اور جس دن شام کو وائسرائے پولو وغیرہ کھیلنے کے لئے جاتے تھے اس دن ان کے چیمبر میں ہم دونوں کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور اسی لئے میری انگلیوں کے نشانات وہاں ملے تھے۔

بہر حال اعلیٰ تحقیقاتی بورڈ بھی یہ گتھیاں نہیں سلجھا سکا اور کافی عرصے تک نظر بندی کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔ معطلی کے احکامات بھی واپس لے لئے گئے۔ اس لئے کہ تحقیقاتی بورڈ نے مجھے برخاست کرنے کی سفارش کی تھی اور مجھے برخاست کر دیا گیا تھا۔ ایلس فیوری کو بحال کر کے اس کا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اس نے دوسرے ہی دن استعفیٰ دے دیا۔ نوکری سے الگ ہونے کے بعد اس نے مجھ سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر وہ میری نظر بندی کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ آخر غریب تنہائی اور بدنامی کی فصل کاٹ کر ایک روز انگلستان واپس چلی گئی۔ یہ بات بہت عرصے بعد مجھے معلوم ہوئی تھی کہ آخر اس نے کسی آسٹریلوی سے شادی کر لی ہے جس کا سبی میں بہت بڑا کاروبار تھا۔ لیکن بہر حال وہ عجیب عورت تھی۔ البتہ یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ اس نے میری زندگی بچانے کے لئے بڑی عظمت کا ثبوت دیا تھا۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال میں نوکری سے نکال دیا گیا اور اس کے بعد گھر واپس جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے عجیب و غریب حالات میں گھر کا رخ کیا۔

میرا دل لرز رہا تھا۔ نجانے کیا کیا سوچیں دامن گیر تھیں۔ یہاں تک کہ آخر کار میں
گھر پہنچ گیا۔ لیکن یہاں بہت سی نئی خبریں میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے یہ پتہ چلا کہ
گڑھی میں بڑی تبدیلیاں آ چکی ہیں اور میرے والد اور والدہ کو یہ دنیا چھوڑے ہو
کافی وقت گزر چکا ہے۔

سیتا گڑھی آ کر میں نے تو اپنی دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ ثمرستانِ جمشید کے درو
کاٹنے کو دوڑتے تھے۔

آخر کار دوسری زمینوں اور جائیداد کا انتظام اپنے ملازمِ خاص کے سپرد کر کے
نے مختصر سا سامان اپنے ساتھ لیا اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ اب مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے
کوشش کرنی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ہیگ نے میری ہموار زندگی پر ایسی ضرب لگائی تھی
اس نے مجھے تہہ و بالا کر دیا تھا۔ میں اب اپنے آپ کو بڑے شہروں کی ہنگامہ آرائی
کھو دینا چاہتا تھا۔ جب میں سروس میں داخل ہوا تھا تو میری زندگی کچھ اصولوں
رہنمائی میں چل رہی تھی اور اب میں ایک بے کردار آدمی تھا۔ نہ میرا باپ تھا نہ
ماں۔ نہ کوئی ماضی تھا نہ مستقبل۔ میں تو بس ایک زندہ لاش تھا۔

بمبئی کے تاج ہوٹل میں، میں نے ایک کمرہ حاصل کیا اور ہوٹل کے پورٹر نے کمر
میں سامان پہنچا کر میرے کپڑے وارڈ روب میں ٹانگ دیئے اور پھر ٹپ وغیرہ لے
وہاں سے چلا گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں اپنی اس نئی زندگی پر غور کرنے لگا۔ میرا
کچھ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ غسل کر کے نیچے ہال میں کھانا کھا لوں
چنانچہ میں نے تولیہ نکالنے کے لئے سوٹ کیس کھولا تو چمپا کی تیز بو نے مجھے چکرا کر
دیا۔ ایک لمحے کے لئے میں سکتے میں رہ گیا۔ لیکن پھر میں نے اس کے بعد خود کو سنبھا
یہ بو اسی بھوج پتر کی تھی۔ میں نے جھنجلا کر کپڑوں کی تہہ کھولی اور مجھے ایک بھوج پتر
گیا۔ میں نے اسے اس طرح دیکھا جیسے کوئی صبح کا اخبار دیکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے
وہ اخبار ہی تھا۔ اس دفعہ اس پر ایک اجنبی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ شخص وردی
ہوئے تھا اور شکل سے کوئی فوجی نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے شاید رقص کر رہا تھا۔

ایک بار پھر میرے سارے وجود میں گڑگڑاہٹ دوڑ گئی اور میں اس انوکھی تصویر
بارے میں سوچنے لگا۔ کیا کروں۔ آخر کیا کروں؟ اس خشک اور منحوس پتے کو میں
بڑی نفرت کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور سگریٹ سلگا کر باتھ روم میں دا

ہو گیا۔ ابھی غسل خانے کا دروازہ میں نے بند بھی نہیں کیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا
شروع ہو گئی۔ چنانچہ میں باہر نکل آیا۔ پتہ نہیں کون مردود تھا۔ یہاں بھی مجھے پریشان کیا
جا رہا ہے۔ بہرحال میں نے ٹیلی فون اٹھایا تو ہوٹل کے استقبالیہ سے کوئی کہہ رہا تھا۔

''خاقان جمشیدی صاحب! آپ سے ایک فوجی افسر ملنے آئے ہیں۔''

میرے ہاتھ پاؤں ایک لمحے کے لئے لرز کر رہ گئے۔ فوجی افسر کے نام سے ہی مجھے
بھوج پتر کی تصویر نظر آ گئی۔ میں نے بیزاری سے کہا۔

''سنو، اس سے کہہ دو کہ وہ بھی جا کر خودکشی کر لے۔ مجھے اطلاع مل گئی ہے۔'' یہ
کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور پٹخا اور ایک بار پھر باتھ روم کی جانب چل پڑا۔ ذہن
شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ میں بہت دیر تک پانی میں پڑا رہا اور شاور کی تیز دھاریں
میرے بدن سے کھیلتی رہیں۔ بدنامی اور ذلت و خواری بدن کا میل تو نہیں ہوتے کہ گرم
پانی اور صابن سے دھوئے جا سکیں۔ بہت دیر تک میں پانی کے نیچے اپنے تپتے ہوئے
وجود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد میں غسل خانے سے برآمد
ہوا تو جھلاہٹ میں کسی قدر کمی ہو گئی تھی۔ کچھ قدم آگے بڑھا تو مجھے دروازے کے قریب
ایک کاغذ کا پُرزہ پڑا ہوا نظر آیا۔ سفید کاغذ گہرے رنگ کے قالین پر بہت نمایاں تھا۔ میں
آگے بڑھا اور کاغذ کا پُرزہ اٹھا لیا۔ پھر میں نے اسے کھول کر دیکھا تو لکھا ہوا تھا۔

''خاقان!

یہ مت بھولو کہ بمبئی میرا شہر ہے۔ یہاں تمہیں لنگر سے
باندھ کر عدم آباد بھی پہنچا سکتا ہوں۔ میں نیچے بیٹھا ہوا ہوں۔
فوراً آ جاؤ۔ کیا سمجھے؟ اگر مجھے پہچان سکتے ہو تو پہچانو کہ یہ تحریر
کس کی ہو سکتی ہے۔ ویسے شناسائی کے طور پر میں ڈبلیو، ایچ
لکھے دیتا ہوں۔''

یہ انوکھی تحریر تھی۔ ڈبلیو ایچ، ڈبلیو ایچ، ڈبلیو ایچ...... بمبئی، لنگر...... اوہ مائی گاڈ! اوہ
میرے خدا، استقبالیہ پر جو افسر مجھے پوچھ رہا تھا وہی نامعقول تھا ڈبلیو ایچ یعنی ولیم
ہاروے یعنی شاہی بحریہ کا لیفٹیننٹ۔ میرا طالب علمی کے زمانے کا دوست۔ ویری گڈ......
ویری گڈ۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے نجانے کیوں ولیم ہاروے کے تصور سے مجھے
خوشی ہوئی تھی۔

بہر حال میں نیچے جانے کے لئے لفٹ کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ کمرہ میں نے مق
کر دیا تھا۔ پچھلے دنوں میں نے جو اذیتیں جھیلی تھیں اور جن عذابوں سے گزرا تھا انہو
نے مجھے خود غرض، کمینہ اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ میں بمبئی یہ سوچ کر آیا تھا کہ یہاں کسی
نہیں ملوں گا اور اگر کوئی شناسا ملنے آیا تو اسے پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ لیکن
ہاروے کی بات ہی دوسری تھی۔ اگرچہ میں ہندوستانی اور مسلمان تھا اور وہ انگریز مگر
دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ولیم کی تعلیم و تربیت ہندوستان میں
ہوئی تھی اور اس کا مزاج مشرقی ہی تھا۔ اس کی گفتگو اور اس کا انداز عام انگریزوں
بالکل مختلف تھا۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اس کا باپ کپتا
تھا اور 1914ء میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ ولیم ہاروے کی پرورش اس کے چچا نے کی تھی
وہ کلکتے میں آرمی سپلائی کا بہت بڑا ٹھیکیدار تھا۔ حالانکہ ولیم کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچ
نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا چچا اسے تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ جیسے
ولیم کو موقع ملا وہ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر شاہی بحریہ میں چلا گیا۔ اس کا باپ چونکہ اعزازی
کیپٹن تھا اس لئے ولیم کو کمیشن ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کالج میں ہم دونوں کی دو
کی مثال دی جاتی تھی اور سچ بات یہ تھی کہ پولو کے کھیل میں ولیم میرا سب سے
حریف تھا۔ ہر سال ہم دونوں میں ٹیم کی کپتانی کے لئے رسہ کشی ہوتی تھی۔ مگر ہمار
دوستی بھی اپنی جگہ ایک مثال تھی ہم دونوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔

میں اس تصور ہی سے بہت خوش تھا کہ اس وقت ولیم ہوٹل میں موجود ہے۔ میر
طبیعت کی اُداسی دور ہونے لگی تھی۔ بہر حال ہوٹل کی راہداری ویران پڑی تھی اور
پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لفٹ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ اگرچہ میں چوتھی منز
پر تھا لیکن میں نے سوچا کہ لفٹ پر لعنت بھیجی جائے اور سیڑھیوں کے راستے اترا جائے
ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ لفٹ آ گئی۔ جونہی دروازہ کھلا، میں نے جھپٹ کر اندر داخ
ہونا چاہا۔ لیکن اچانک ہی میں کسی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ گلابی ساڑھی والی حسین لڑکی گر
گرتے بچی۔ وہ برق رفتاری سے لفٹ سے باہر آنا چاہتی تھی۔ ادھر میں برق رفتاری
اندر جانے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ٹکرا گئے۔ میں معذرت کرنے ہی والا
کہ اس لڑکی کے عقب سے خاکی رنگ کی اعلیٰ تراش کی وردی پہنے ایک لمبے قد و قامت
کا سیاہ فام نوجوان اسے نرمی سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور تقریباً میری ناک تک اپنی ناک

بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہً ہی اس کی غرائی ہوئی آواز اُبھری۔
''پیچھے ہٹو'' اُس کا لہجہ اس قدر خراب تھا کہ میرے پورے بدن میں آگ لگ گئی۔
میں اس لہجے سے مخاطب کئے جانے کا عادی نہیں تھا۔ میرے سارے وجود میں گرم گرم
لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ شخص مجھے فوجی عہدہ دار لگا
تھا لیکن اب جو سر سے پاؤں تک اس پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ سیکرٹری یا باڈی گارڈ قسم
کی کوئی چیز ہے۔ میں نے مڑ کر گلابی ساڑھی والی کو دیکھا وہ اس صورتحال سے کچھ
پریشان سی لگتی تھی۔ وردی والا سیاہ فام پھر اسی سخت اور کرخت لہجے میں بولا۔
''سنا نہیں تم نے۔ ہٹو سامنے سے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے دھکا دینا چاہا کہ میں
بھڑک اٹھا اور دوسرے لمحے میرا زوردار گھونسہ اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وردی والا رُکی ہوئی
لفٹ میں چت جا کر گرا تھا۔ ادھر لڑکی کی چیخ ابھری تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرا یہ لیفٹ
ہک کس نوعیت کا حامل ہے۔ اس بھرپور گھونسے کے بعد اٹھنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ چنانچہ
میں نے گردن خم کر کے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا۔
''سوری میڈم! میں اپنی اس بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ میں
جلدی اندر آنا چاہتا تھا اور آپ باہر نکلنا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا
تھا۔''

لڑکی نے غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔ البتہ وہ تشویش بھری نگاہوں
سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگی جو ایک ہاتھ سے اپنے جبڑے کو سنبھالے ہوئے کہنی
کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن لمحہ بھر پہلے اس کے چہرے پر جو غیض و غضب
تھا، اب وہ نہیں تھا بلکہ ایک شرمندگی اور کھسیاہٹ کا احساس اس کے چہرے سے نمایاں
تھا۔ بلکہ اس کے عضلات میں کوئی تبدیلی نمایاں ہوگئی تھی اور اس کا منہ پوری طرح ٹیڑھا
ہو گیا تھا۔ لڑکی نے اس پر نگاہ ڈالی اور اچانک ہی اس کے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ سیاہ فام
کا ٹیڑھا منہ ایک مضحکہ خیز کیفیت کا حامل ہو گیا تھا۔ لیکن لڑکی کو ہنستے دیکھ کر اس کی
غیرت جاگ اٹھی اور وہ اپنے چہرے کی تکلیف بھول کر جھرجھری لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور
دوسرے لمحے میری طرف بڑھنے لگا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس
کے حملے کو روکوں۔ اسے خوفزدہ کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے باکسروں کی طرح پوزیشن
لے لی اور میری آواز ابھری۔

"آؤ بیٹے آؤ...... اب کے میں تمہارے سارے دانت گرا دوں گا تا کہ زندگی بھر مجھے یاد رکھو۔" اس سے پہلے کہ وہ میری طرف جھپٹتا اور پھر مار کھاتا، لڑکی کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

"ڈیمٹ! ختم کرو یہ بے ہودگی۔ اور پٹنا چاہتے ہو کیا؟" لڑکی کی ڈانٹ سن کر وہ ایک دم رُک گیا۔ پھر مجھے گھورتے ہوئے اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور اسے جھاڑتا ہوا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کے پیروں میں لرزشیں تھیں اور وہ اس طرح جھول رہا تھا جیسے زنجیروں میں بندھا ہوا ہو۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا اور کسی قدر ترش لہجے میں بولی۔

"اور آپ مسٹر! آپ صورت سے تو ایک اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ملازم کو مارتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہئے تھی۔"

"اور مار کھاتے ہوئے؟" میں نے لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نان سینس۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑی اور لفٹ سے باہر نکل گئی۔ وردی والا وردی پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ وہ بیک وقت دو کیفیتوں سے گزر رہا تھا۔ غصے میں بھی تھا اور میرے پٹائی کرنے سے لڑکی کے ہنسنے پر کھسیا بھی رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اپنا جبڑا بھی سیدھا کرتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ مجھے اب اپنے رویے پر واقعی شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس نے بدتمیزی کی تھی لیکن ایک باوقار آدمی کا یہ ردِعمل نہیں ہونا چاہئے تھا جس کا مظاہرہ میں نے کیا تھا۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید وہ مجھے دھکا دے دیتا۔ بہرحال اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں رُکی ہوئی لفٹ میں بیٹھ کر نیچے جاؤں لیکن لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے میں برابر اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہو گی۔ ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کے لباس کا رکھ رکھاؤ اور اس کے انگریزی بولنے کا لہجہ یہ بتا رہا تھا کہ غیر ملکوں میں بھی رہ چکی ہے۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ لفٹ لابی میں رُکی۔

لابی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ پورٹروں کی فوج بہت سا سامان اٹھائے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود ہے اور بہت ہی عمدہ لباس میں ملبوس ایک مخصوص انداز میں اوڑھے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص کاؤنٹر پر کھڑا ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ گھیرے کھڑے ہیں اور اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ وہ کوئی بہت ہی بڑی شخصیت ہے کیونکہ

اور اتنے بڑے ہوٹل کا مینیجر بھی اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے ہوٹل کا کوئی پرانا سرپرست ہو۔ بہرحال میں کھڑا ہو گیا۔ نامعلوم کیوں مجھے ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہوا کہ اس بوڑھے آدمی کا تعلق اس گلابی ساڑھی والی سے ضرور ہے۔ اور پھر ایک لمحے کے اندر پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس آدمی کے دائیں بائیں دو لمبے تڑنگے جوان جو ایسی ہی خاکی وردی پہنے کھڑے تھے جیسی گلابی ساڑھی والی کا ساتھی پہنے ہوئے تھا۔ میں نے ایک لمحے تک ان کا جائزہ لیا اور پھر ایک ویٹر کو اشارہ کیا جو ادب سے میرے قریب پہنچ گیا۔

"ویٹر! یہ کون ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"سر! یہ بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ سیٹھ آدم زمان۔"

میرے ذہن کی چرخی نے حرکت کی اور مجھے سیٹھ آدم زمان کا خیال آ گیا۔ اس شخص کی دولت مندی کی داستان پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شراب کا سب سے بڑا امپورٹر تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے کاروبار تھے۔ اور شاید انگریز حکومت کو سب سے زیادہ انکم ٹیکس یہی دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گلابی ساڑھی والی اس کی بیٹی ہی ہو سکتی ہے۔ بہرحال میں اب ولیم ہاروے کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا اور ولیم ہاروے کی بحریہ کی وردی مجھے نظر آ گئی۔ اس کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے ہوا میں ایک گھونسا چلایا۔

"اگر تم ایک منٹ اور نہ آتے تو میں اوپر آ کر تمہاری ناک چپٹی کر دیتا ڈیئر!"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور میرے گلے لگ گیا۔ ولیم ہاروے کے بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بار میں بیکار نہیں بیٹھا رہا ہے۔ اس کے منہ سے شراب کی ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی شیشیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تیری پرہیز گاری کا کیا حال ہے؟ سول سروس نے ابھی تجھے خراب کیا یا نہیں؟"

ایک لمحے کے لئے میرے دل کو دھچکا لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کالج کے زمانے میں، میں ایک مسلمان لڑکا ہوا کرتا تھا اور میری پارسائی بہت سے لوگوں کی زبان پر تھی۔ ویسے مجھ پر جو گزری ہے، ظاہر ہے ولیم بیچارے کو اس کے بارے میں کیا معلوم۔ بہرحال ابھی میں اسے اس کے بارے میں بتاؤں گا بھی نہیں۔ ہم بہت عرصے کے بعد

ملے تھے اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ناخوشگوار باتوں سے اس ملاقات کو آلودہ کروں۔ نے اس سے بہت ساری باتیں کیں اور وہ اپنے بارے میں سنانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پیتا بھی جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کام سے ہوٹل آیا تھا سے گزرتے ہوئے یکایک اس نے مجھے لفٹ میں داخل ہوتے دیکھا اور میرے پیچھے بھی تھا مگر لفٹ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر آ کر میرے کمرے کا نمبر کیا اور پھر اس نے وہیں سے مجھے ٹیلی فون کیا۔ مگر جب ٹیلی فون ملایا اور اسے میں جو کچھ سننا پڑا اس سے ٹیلی فون آپریٹر حیران رہ گیا تھا۔

"یہ کیا قصہ تھا؟ تم نے مجھے خودکشی کرنے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟"

"بس یار...... میں تھوڑا سا کھسک گیا ہوں۔" میں نے اس سے کہا۔ "تم سنا حال ہے؟"

"آہ...... میری جان، تم نہیں سمجھتے۔ زندگی میں عیش ہی عیش ہیں۔ بحریہ کی ملا دنیا کی سب سے اچھی ملازمت ہے۔ تقریباً دنیا گھوم لی ہے میں نے۔ پچھلے ہی سال نے اپنے عزیزوں کے ساتھ لندن میں بہت سا وقت گزارا ہے۔ ویسے اس وقت جہاز بحریہ کی گودی میں مرمت کے لئے کھڑا ہے۔"

"اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ تم کافی وقت یہاں رہو گے۔"

"ہاں، ظاہر ہے میں اس مرمت کی نگرانی کر رہا ہوں۔ لیکن چوبیس چوبیس، بائیس گھنٹے جہاز کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ بس شام کو تھوڑی دیر کے لئے گھومنے پھ کے لئے نکل آتا ہوں۔ اوہو......" یہ کہہ کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں دیکھا اور بولا۔

"سوری ڈیئر خاقان! جہاز پر اس وقت میں اکیلا ہی افسر ہوں۔ میرے تمام سینئ جونیئر یا تو بحریہ کے ہیڈ کوارٹر میں مصروف ہیں یا چھٹی گزار رہے ہیں۔ مجھے بہت د گئی ہے جہاز چھوڑے ہوئے۔ چنانچہ اس وقت مجھے چلنا ہے۔ تم جہاز سیزنو کا نام کر سکتے ہو۔ سیزنو میرے جہاز کا نام ہے۔"

"یار! ابھی تو ہم لوگ تفصیل سے بیٹھ کر باتیں بھی نہیں کر سکے۔"

"پھر میری جان! ویسے جب تک میں بمبئی میں ہوں مجھے تم سے روزانہ ملنا جہاں بھی مناسب سمجھو۔ یہاں بھی آ سکتا ہوں اور تمہیں بھی بلا سکتا ہوں۔"

ولیم کے جانے کے بعد پہلے تو میں نے سوچا کہ واپس اپنے کمرے میں جا کر روم سروس کو فون کروں کہ مجھے کھانے کو کچھ دو اور اس کے بعد کتاب لے کر بستر میں گھس جاؤں۔ پھر اچانک ہی وہ گلابی رنگ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ لڑکی بہت دلکش تھی۔ کیوں نہ میں اسے تلاش کروں۔ بہرحال جو کچھ ہوا تھا وہ ایک الگ بات تھی لیکن اس لڑکی کے غیر معمولی حسن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مناسب الفاظ میں معذرت کے لئے لفظوں کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ وقت اور گزرا۔ یہ ہوٹل کے مہمانوں کے ہال میں جمع ہونے کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بہت ہی خوبصورت سوٹ پہنا اور اس کے بعد اپنے آپ کو درست کر کے ٹہلتا ہوا ہال میں پہنچ گیا۔ ایک بات میں آپ کو بتاؤں جب سے ایلس فیوری سے میرے قربت کے تعلقات ہوئے تھے، میرے ذہن میں کچھ کچھ عورت جاگ اٹھی تھی۔

بہرحال میں نیچے ہال میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں بمبئی کے اس ہوٹل کا نام پوری بمبئی میں مشہور تھا۔ یہاں راجہ، مہاراجہ، نواب اور کروڑ پتی سیٹھ، دولت مند غیر ملکی ہی آتے تھے۔ چھوٹے موٹے دیسی اور انگریز افسر ہوٹل کے ریستوران یا بار سے آگے جانے کی ہمت ذرا کم ہی کیا کرتے تھے۔ میں نے ہال میں نگاہیں دوڑائیں۔ حکمران قوم کے سول یا فوجی ملازمین جو اپنی اکڑی ہوئی گردن سے پہچان لئے جاتے تھے بہت کم نظر آ رہے تھے۔ غیر ملکی سیاحوں، تاجروں یا جوڑوں نے بیشتر میزوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ طرح طرح کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ کانوں میں منڈلیاں اور کنٹھے پہنے، گلے میں انتہائی قیمتی اور سچے موتیوں کی مالائیں ڈالے رنگ برنگے ہیڈوں پر شتر مرغ کے پر لگائے کچھ راجے، نواب ٹائپ کے لوگ، ڈھیلے ڈھالے ریشمی سوٹوں اور رنگ برنگی ٹائیوں میں ملبوس امریکی سیاح اور روایتی سیاہ رنگ کے سوٹوں میں ملبوس سیاح، رونی صورتیں بنائے کچھ انگریز بہادر۔ غرض عجب ملا جلا ہجوم تھا۔

مجھے جو میز ملی تھی وہاں سے ہال میں داخل ہونے والوں پر آسانی سے نظر رکھی جا سکتی تھی۔ بہرحال یہ اتفاق ہی تھا کہ میرے لئے اس کمرے کی مطابقت سے یہ میز مخصوص تھی۔ ہال اجنبی چہروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس ایک مانوس چہرے کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں لیکن وہ گلابی ساڑھی والی نظر نہیں آئی۔ ویٹر نے میرے سامنے میری مطلوبہ چیزیں رکھ دی تھیں۔ میری بے کیفی بڑھتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا

تھا کہ سمندر کی طرف نکل جاؤں اور تھوڑی چہل قدمی کرنے کے بعد کمرے میں جا کر بند
ہو جاؤں۔ گلابی ساڑھی والی تو نظر نہیں آئی تھی۔

بہر حال بمبئی میں میرا پہلا دن تباہ ہو گیا۔ میں کسی ویٹر کو اشارہ کر کے بلانے ہی والا
تھا کہ میں نے دیکھا کہ دو وردی پوشوں کے ساتھ وہی معزز بزرگ یعنی آدم زمان
صاحب لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہو رہے ہیں۔ میرے ذہن کو ایک خوشگوار سی کیفیت کا
احساس ہوا اور میں نے فوراً ہی ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ ہال کے کیپٹن
نے ایک ریزرو میز پر ان دونوں باپ بیٹی کو بھی بٹھا دیا۔ دونوں باڈی گارڈ ہال میں لگی
کرسیوں پر جا بیٹھے لیکن ان میں وہ تیسرا باڈی گارڈ نہیں تھا جس کی میں نے مرمت کی
تھی۔ لڑکی اس وقت جھلملاتے قیمتی کپڑے کا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ موتیوں کی ایک سادہ
سی لڑی اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی اور اس نے بہت ہلکا پھلکا سا خوبصورت میک
اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں شاید کوئی خوبصورت زیور تھا۔ وہ بڑے انہماک سے
اپنے باپ سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ وہ اس کا باپ ہی ہو سکتا ہے۔

بیرے کو بلا کر میں نے اپنے بل پر دستخط کئے۔ پرس نکال کر اس کو ٹپ دیا اور میزوں
کے درمیان ٹہلتا ہوا میں ہال کے دروازے کی طرف اس طرح چلا جیسے باہر جانا چاہتا
ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ میں آدم زمان کی میز کے سامنے
سے گزروں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ لڑکی نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس نے
ایک دو بار سر اٹھا کر مجھے اپنی میز کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی قدر بے چین سی ہو
گئی۔ شاید اپنی اس بے چینی کو چھپانے کے لئے وہ بڑے میاں سے باتوں میں مصروف
ہو گئی۔ اسی وقت سامنے سے ایک دیو قامت بڑھیا، اسٹیم انجن کی طرح ہانپتی ہوئی آنے
لگی تو میں نے اسے راستہ دینے کے بہانے آدم زمان کی میز کے گرد ایک چکر سا لگایا اور
پھر یکایک جیسے میں نے آدم زمان کو پہچانا اور رُک گیا۔ پھر میں دونوں ہاتھ پھیلا کر حیرت
اور مسرت کے ساتھ اس کی جانب بڑھا اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

''آہا...... سیٹھ آدم زمان۔''

آدم زمان نے گردن اٹھا کر چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کپکپاتی ہوئی
آواز میں اسی تپاک سے بولا۔ ''ہیلو...... ہیلو مسٹر...... مسٹر......'' وہ مجھے پہچاننے کی کوشش
کرنے لگا اور میں بڑی بے تکلفی سے اسے دیکھ کر مسکرانے لگا جیسے مجھے معلوم تھا کہ آخر

کار وہ مجھے پہچان ہی لے گا۔ بڑے میاں میری بے مقصد مسکراہٹ دیکھ کر کچھ نہ کچھ کہنے
پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔

''مائی ڈیئر! تم یہاں؟''

''بس، آج ہی پہنچا ہوں۔'' میں نے بے تکلفی سے کہا اور پھر جلدی سے بولا۔ ''آپ
کو پتہ ہے مسٹر آدم زمان، کہ ہم کسٹم والے تو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔''

''اوہو، اچھا...... ہاں، ہاں، ہاں۔'' آدم زمان نے زبردستی اپنی مصنوعی بتیسی نمایاں
کرتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''مگر یہاں کیا آپ کا تبادلہ ہوا ہے؟''

''یہی بات ہے...... بالکل یہی بات ہے۔'' میں نے گردن ہلا کر کہا اور اگلا فقرہ تیار
کرنے لگا۔ میں نے خاص طور سے اس بات کو ذہن میں رکھا تھا کہ سیٹھ آدم زمان
شراب کا امپورٹر تھا۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں امپورٹ کرتا تھا لیکن کسٹم
والے سے دوستی تو اس کی خوش قسمتی تھی۔ اب چہرے اور نام کون یاد رکھتا ہے۔ پھر اس
نے جلدی سے کہا۔

''اچھا اب آپ یہ بتائیے کہ کوئی پروموشن وغیرہ ہوا یا ویسے ہی تبادلہ ہو گیا ہے؟''

میں نے دل میں سوچا کہ اب اپنا پروموشن بھی کر لینا چاہئے ورنہ آدم زمان کو متاثر
کرنا آسان نہ ہو گا۔ میں نے خوشخبری سنانے والے انداز میں کہا۔

''آپ کو نہیں پتہ، میں یہاں ایکسٹرا اسسٹنٹ کلکٹر ہو کر آیا ہوں۔'' یہ ایکسٹرا مجھے
بروقت سوجھ گیا تھا۔ کیونکہ ممکن ہے کل ہی سے بھائی آدم زمان بمبئی کے کسٹم میں مجھے
تلاش کرنا شروع کر دیں۔

ایک لمحے کے لئے آدم زمان کے چہرے پر عجیب سی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے
جھرجھری لی اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ارے، آپ کھڑے کیوں ہیں؟ اتنے دن کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اب میں
آپ کو جانے تھوڑی دوں گا۔ بیٹھئے بیٹھئے۔ ہاں، ان سے ملئے۔ یہ میری مسز ہیں عالیہ
زمان۔''

''مسز...... مسز...... مسز......''

☆☆☆

میرا ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ حالانکہ آدم زمان کا ڈھیلا ڈھالا لجلجی ہاتھ مصافحے کی غ میں میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا لیکن میرا ہاتھ جیسے مُردہ ہو گیا تھا۔ یہ تروتازہ گلاب پھول جیسی گلابی لڑکی اس پرانی لاش کی بیوی ہے۔ میں نے آدم زمان کے ہاتھ سے ا چھڑایا اور عالیہ زمان کی طرف گھوم کر تعظیماً جھک جانا چاہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑ دیا۔ اس کا نرم و نازک ہاتھ جوان خون کی صحت مند گرمی سے جل رہا تھا۔ مصافحہ کر ہوئے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ لفٹ کے واقعہ کو یاد کر کے شرمندہ سی ہے۔ اب اپنا نام بتانا بھی ضروری تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میرا نام شہریار ہے۔'' نجانے کیوں میر زبان سے میرا نام غلط نکلا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نام بتانے میں میری قوتِ ارادی کا د نہیں تھا۔ لیکن نجانے کیوں میں نے اسے اپنا نام غلط بتایا تھا۔

''ہیلو...... اچھا، آپ یہ بتایئے آپ کیا پئیں گے؟'' عالیہ زمان براہِ راست میر جانب متوجہ ہو گئی۔ مگر میں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی تھی، اس کے انداز م ایک معنی خیز سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جسے میں فوری طور پر کوئی معنی نہیں دے سکا تھا نجانے اس کے انداز میں ایسی کیا خاص بات تھی۔ کیا وہ میرا اصل نام جانتی ہے؟ اور ا وقت اپنا غلط نام بتانے سے اس کی یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے؟ بہرحال بڑی عجیب سی با تھی یہ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے ٹٹول کر کہا۔

''مسز آدم زمان! تھوڑی دیر پہلے آپ مجھے ڈانٹ پلا چکی ہیں۔ اس سے میرے منہ مزا خراب ہو گیا ہے۔ اس وقت آپ کچھ بھی پلا دیں۔''

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ آدم زمان احمقوں کی طرح ہم دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا پھر وہ بولی۔ ''تو پھر اس کے لئے کولڈ کافی بہتر رہے گی۔ مجھے بھی پسند ہے اور مجھے یقی ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔ ویسے ہم دونوں کی پسند ایک جیسی ہے یعنی میری ا

میرے شوہر کی۔ وہ زمان! اصل میں شہریار صاحب جس ڈانٹ کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کی تفصیل یوں ہے کہ لفٹ میں ان سے ملاقات ہو گئی تھی اور واقعی اب مجھے اس بات پر شرمندگی ہو رہی ہے کہ ان جیسے نفیس انسان سے میں بڑی بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔''

''اوہو...... اوہو...... اوہو'' آدم زمان احمقوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ''آپ نے میری مسز کی بات کا برا تو نہیں مانا مسٹر شہریار؟ ویسے عالیہ! تمہیں کس بات پر غصہ آیا تھا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''مسٹر شہریار صاحب سگریٹ پیتے ہوئے لفٹ میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر مناسب ہو تو سگریٹ بجھا دیں۔ بس یہ بات ہوئی تھی۔''

ایک بار پھر میں حیران رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ عالیہ کیا کھیل، کھیل رہی ہے اور کیوں کھیل رہی ہے۔ بظاہر تو ایسی کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ میرے لئے یا میرے سلسلے میں جھوٹ بولے۔ بہرحال مجھے اس کی لاج تو رکھنی ہی تھی اور یہ سب کچھ بھی میں بالکل غیر اختیاری طور پر کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''مگر محترمہ! آپ کے حکم پر میں نے سگریٹ تو بجھا لی تھی۔ وہ تو بس آپ کے باڈی گارڈ نے......'' مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اپنے جھوٹ میں شریک ہونے سے خوش ہوئی ہو۔ اب اس نے اور زیادہ بے تکلفی سے قہقہہ لگایا اور میری بات کاٹ کر بولی۔

''وہ باڈی گارڈ...... وہ بے ضرر آدمی ہے۔'' میں نے ایک دم محسوس کیا کہ باڈی گارڈ کے ذکر پر آدم زمان نے کان کھڑے کر لئے تھے اور پھر انہوں نے جلدی سے کہا۔

''تو کیا اس نے شہریار صاحب کے ساتھ بدتمیزی کی تھی؟''

عالیہ نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر بڑی میٹھی آواز میں اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''نہیں۔ وہ جیت سنگھ نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو رامیشر تھا۔ رامیشر نے شہریار صاحب کو لفٹ میں لگا ہوا نوٹس دکھایا تھا۔ بدتمیزی تو کوئی نہیں کی تھی۔''

آدم زمان جو پوری طرح اس وقت اپنی بیوی کی جانب متوجہ ہوا تھا اور ساری تفصیل جان لینا چاہتا تھا، بدستور جھکا ہوا بولا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

مجھے یوں لگا جیسے عالیہ اس سوال جواب سے کافی الجھ رہی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ ڈرامہ میری بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی غیر فطری طور پر میں نے سوچا کہ اس خوبصورت لڑکی کی مدد کرنی چاہئے چنانچہ میں ہنس کر بولا۔

"نہیں جناب! چھوٹی سی بات تھی۔ وہ تو بس اتفاقیہ طور پر تذکرہ ہو گیا تھا۔ ہوا یہ
کہ آپ کے ملازم نے مجھے لفٹ میں لگا ہوا نوٹس دکھایا۔ یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی
اگرچہ اصول کی بات تھی لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس پر عالیہ صاحبہ نے مجھے ہلکی
ڈانٹ پلائی اور کہنے لگیں کہ ملازموں سے الجھنے کی بجائے مجھے ایک معقول آدمی کی حیثیت
سے سگریٹ بجھا دینی چاہئے تھی۔ بس یہ تھی ساری بات۔"

"ارے اوہ...... بس اتنی سی بات؟" آدم زمان پھر بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگا
بہرحال میں نے اس کی مدد کی تھی لیکن بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی کہ آخر ا
اجنبی کے سامنے عالیہ زمان اپنے بوڑھے شوہر سے کیوں جھوٹ بول رہی ہے؟ کیا
رامیشر کو بچانا چاہتی تھی؟ یقیناً ایسی ہی بات تھی۔ اس بات کے امکانات تھے کہ آدم زما
رامیشر کو پسند نہیں کرتا ہو گا۔ اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو گیا تھا۔

اس عرصے میں ویٹر آیا اور عالیہ نے اسے کولڈ کافی کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے تھوڑ
دیر کے بعد بہت ہی خوبصورت برتنوں میں یہ کافی سرو کر دی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرے
آدم زمان نے دور بیٹھے ہوئے گارڈ کو اشارہ کیا اور ایک گارڈ پھرتی سے اپنی جگہ سے ا
اور آدم زمان کے پاس آ گیا۔ آدم زمان نے ہم دونوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

"بس ایک منٹ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی اور
دونوں سمجھ گئے کہ وہ واش روم جانا چاہتا ہے۔ لیکن پھر حیرت کا دوسرا لمحہ نمودار ہوا۔
سے پہلے عالیہ زمان ہنستی اور مسکراتی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن آدم زمان کے
قدم جاتے ہی اس نے کسی قدر خشک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کس چکر میں ہو۔ اور سنو ایک بات میں اچھی طرح جانتی ہو
کہ کسٹمز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی میں دعویٰ سے کہتی ہوں کہ تم
نام شہریار نہیں ہے۔"

میرے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہو
کہا۔ "میرا خیال ہے ہم دونوں ایک ہی کھیل، کھیل رہے ہیں میڈم! اور ہر لمحہ کم از
میرے لئے تو حیرانی کا لمحہ ہے۔ اب دیکھئے نا، کتنی خوبصورتی سے مسلسل جھوٹ بو
رہی ہیں آپ۔ یہ الگ بات ہے کہ میں آپ کے تمام جھوٹوں کی تصدیق کر رہا ہوں۔ ا
باڈی گارڈ کا نام رامیشر نہیں، جیت سنگھ ہے۔ اگر اس کا نام رامیشر ہوتا تو آپ

بتائیے کہ کیا اسے نوکری سے نکال دیا جاتا؟"

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ دبے اور بھنچے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بکواس
بند کرو۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ اور تم کیا سمجھتے ہو، بہت زیادہ چالاک ہو تم؟ جیت سنگھ نے
تمہارا نام ریسپشن سے معلوم کر لیا تھا اور میں تمہیں تمہارا نام بتا سکتی ہوں مسٹر خاقان
جمشیدی۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ تم میرے شوہر کے ساتھ کوئی فراڈ کرنا چاہتے ہو۔"

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ یہ عورت اب حد سے بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے
سرد لہجے میں کہا۔ "محترمہ! میں بھلا اس کے ساتھ کیا فراڈ کروں گا۔ اس کے ساتھ تو
مسلسل فراڈ ہو رہا ہے۔ اس فراڈ کے بارے میں معلوم کرنے میں مجھے بہت دلچسپی ہے۔
اور یہ دلچسپی کیوں ہے اس کی تفصیل میں کم از کم آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" عالیہ ناگن کی طرح پھنکاری۔

"صرف اتنا کہ آدم زمان کے لئے ویسے ہی الجھنیں کچھ کم نہیں ہیں۔ اس عمر میں
انہیں ذرا سا سکون مل جاتا تو کیا برا تھا۔ بہرحال بے چارے کی تقدیر میں یہی سب کچھ
لکھا تھا۔ اب دیکھئے نا......" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہم نے آدم زمان کو واپس آتے
ہوئے دیکھا۔ وہ باڈی گارڈ کے ساتھ ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ عالیہ نے دانت بھینچتے
ہوئے کہا۔

"آخر اب تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے آدم زمان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جانتا۔ ویسے یہ
بات میں جیت سنگھ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

نجانے کیوں عالیہ تلملا کر رہ گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ کیونکہ آدم زمان اپنی کرسی گھسیٹ
کر بیٹھ گیا تھا۔ چند لمحات پہلے عالیہ کے چہرے پر خشک روی کے جو تاثرات پھیل گئے
تھے وہ پھر شگفتگی میں تبدیل ہو گئے۔ آدم زمان گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ عالیہ
کہنے لگی۔

"آدم جی! آپ کے دوست شہریار تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ ابھی مجھ سے کہہ رہے
تھے کہ آدم زمان جی مجھے بالکل نہیں پہچانے لیکن بہت ہی نفیس انسان ہیں۔ انہوں نے
اپنے رویے سے محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتے ہیں۔"

"ارے نہیں نہیں۔ اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" آدم زمان نے جلدی سے کہا اور

عالیہ زمان ہنس پڑی اور بولی۔

"آپ نے دیکھا مسٹر خاقان! آدم جی ابھی تک آپ کو نہیں پہچانے اور آپ کو شہر یار ہی سمجھ رہے ہیں۔"

آدم زمان حیرت سے بولا۔ "خاقان...... خاقان...... کون خاقان؟" اس کے سوال میں بڑا تعجب تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"جی محترمہ صحیح فرما رہی ہیں۔ آپ مجھے خاقان بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میرا پورا نام شہر یار خاقان ہے۔"

"اوہو ہو...... اچھا اچھا، واہ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شہر یار کہہ لیا جائے یا شہر یار خاقان۔"

ایک بار پھر عالیہ زمان نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ میں ان نگاہوں کا مفہوم نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اس بار اس کے چہرے پر ناخوشگوار کیفیت نہیں تھی۔ غالباً اسے میری تیزی طراری پسند آ رہی تھی حالانکہ وہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح مجھے غلط ثابت کر دے لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ ادھر سیٹھ آدم زمان اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسٹمز کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کلکٹر سے اس کے تعلقات گہرے ہو جائیں۔ میں خود بھی حیران تھا۔ عام حالات میں کسی اجنبی جوڑے کو میں اس طرح اپنے قریب لانے کی کوشش نہ کرتا۔ لیکن نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سی کلبلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں ہر قیمت پر اس مثلث کو سمجھنا چاہتا تھا کہ بوڑھا آدم زمان، اس کی نوخیز بیوی اور دیو قامت جیت سنگھ میں آخر کس قسم کی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات کہ عالیہ کی تیزی طراری نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں اپنے اندر ایک عجیب و غریب خواہش محسوس کر رہا تھا۔ میں گلاب کی اس کانٹوں بھر شاخ سے اپنا دامن تار تار کر لینا چاہتا تھا۔ اشبھ بھاونا کے بعد کا شکاری پھر بیدار ہو رہا تھا اور میری آنکھوں میں اس کے حصول کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسے دیکھا تو وہ سرسری انداز میں بولی۔

"تو آپ کہیں اور سے تبدیل ہو کر یہاں آئے ہیں؟"

"جی جی......" میں نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔

"کہاں سے؟"

"بس جہاں جہاں سمندر ہوتا ہے ہم لوگوں کی ڈیوٹیاں وہاں لگتی رہتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"گویا آپ یہ بتانا نہیں چاہتے کہ آپ کہاں سے تبدیل ہو کر آئے ہیں۔"

"بات اس قدر غیر دلچسپ ہے اور میں آپ کو بتاؤں مسز عالیہ زمان! کہ انسان اپنے مصروف لمحوں سے فرصت پا کر ایسی جگہوں پر سیر و تفریح کے لئے آتا ہے اور میں ایسی جگہوں پر کم از کم کاروباری گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ آدم زمان کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ میں نے اطمینان سے اپنا گلاس اٹھایا اور کہا۔ "ویسے اگر آپ اس بات پر بضد ہیں کہ میری ماضی کی پوسٹنگ کے بارے میں معلومات حاصل کریں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میں کلکتے سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہوں۔"

آدم زمان نے اس طرح گہری اور پُرسکون سانس لی کہ مجھے پھر ہنسی آنے لگی۔ اب وہ کرسی پر اس طرح پھیل کر بیٹھ گیا تھا جیسے کوئی بہت بڑی الجھن اس کے ذہن سے دور ہو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے اسے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا ہو۔

"ہاں واقعی، یہی وجہ ہے کہ میری آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ورنہ اور دوسری جگہوں پر یقیناً آپ سے کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ہو جاتا۔ ویسے کلکتہ بڑی اعلیٰ جگہ ہے۔"

عالیہ کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی ناکامی پر افسوس ہوا ہو۔ اس کے چہرے کی حسین جلد کے نیچے ایک ہلکی سی نیلاہٹ کی تہہ نمودار ہونے لگی تھی جو اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کسی قدر خاموش ہوئی اور ہم دونوں کی باتیں سننے لگی۔ کم از کم اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی بھی طرح اس سے مات کھانے والوں میں سے نہیں ہوں لیکن پھر بھی اس نے ایک سوال کیا۔

"واقعی! کلکتے کے بہت سے افراد کے بارے میں، میں جانتی ہوں۔ آپ اپنے ان شناساؤں کا تذکرہ کریں گے؟"

یہ کام میرے لئے کون سا مشکل تھا۔ میں نے کلکتے کے جم خانے کے تقریباً تمام ہی ممبروں کے نام گنوا دیئے اور جو جو نام میں لے رہا تھا ان کو سن کر آدم زمان بار بار اچھل رہا تھا کیونکہ ان میں سے وہ بہت سوں کو جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ پچھلے چند برسوں میں وہ کلب کے ماحول سے الگ سا ہو گیا ہے اور کلکتے میں بھی وہ ایک دو ہفتے سے زیادہ نہیں

ٹھہرتا۔ ہم دونوں کلکتے کی باتیں کرتے رہے اور عالیہ اپنا گلاس سامنے رکھے بیزاری سے
ہال میں نگاہیں دوڑاتی رہی۔

آدم زمان کو بہت زیادہ باتیں کرنے کی عادت تھی۔ اس نے مجھے اپنی جوانی کے
بہت سے واقعات سنائے اور میں نے ان میں پوری پوری دلچسپی لی۔ اصل میں عالیہ کو جل
تپانے میں لطف آ رہا تھا۔ پھر جب آدم زمان کی رفتار سست ہونے لگتی تو میں کوئی ایسی
بات کہہ دیتا جس سے اس بے چارے کی سنہری یادوں کے زمانے میں ایک دریچہ
کھل جاتا۔ اب صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ عالیہ زمان اپنی کرسی پر بیٹھی بار بار پہلو بدل
رہی تھی۔ مجھ سے نگاہ ملتی تو اس طرح گھور کر دیکھتی جیسے اس کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے گولی
سے اڑا دے۔

گھنٹے بھر کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اب آدم زمان کو بھوک ستانے لگی ہے اور
ہال کیپٹن کو بلا کر کھانا منگوانے ہی لگا ہے تو میں نے کرسی پیچھے کھسکائی اور اجازت لے کر
کھڑا ہو گیا۔

''ارے ارے...... کیا مطلب؟''

''میں جانتا ہوں کہ آپ کھانا طلب کرنے والے ہیں۔''

''تو کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ کھانا ہمارے ساتھ کھا لیجیے۔''

''نہیں، پہلی ملاقات میں کسی کو اتنی تکلیف دینا ایک ناخوشگوار عمل ہے۔''

''آپ کون سے کمرے میں مقیم ہیں؟''

میں نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا تو اس نے بھی مجھے اپنے کمرے کا نمبر بتا دیا اور
بولا۔ ''آپ ضرور میرے پاس آئیے۔''

میں نے ایک بار پھر عالیہ زمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔ ''ہاں، یقیناً
بھلا آپ کے پاس آئے بغیر میں کیسے رہ سکوں گا۔ آپ سے مل کر تو کلکتے کی یادیں تازہ
ہو گئی ہیں۔''

عالیہ شاید میری زبان سے کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خون کے
گھونٹ پی رہی ہو۔ بہرحال میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ پتہ نہیں کیوں اس ملاقات
سے ایک خوشگوار تاثر دل و دماغ پر پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس بات کو میں پورے وثوق اور
دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ یہ جوڑا بے حد پراسرار ہے۔ خاص طور سے عالیہ زمان۔ پہلی

بات تو یہ کہ اس طرح اس سے میری ملاقات ہوئی اور دوبارہ بھی اس سے ملنے کی خواہش
میں نے اپنے دل میں محسوس کی۔ جبکہ میں کوئی اوباش طبع انسان نہیں تھا۔ ہزاروں خواتین
اور لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں۔ بس ایک فیوری ایسی تھی جو میری مجبوری بن گئی
تھی۔ لیکن اب یہ بار بار مجبوری بن رہی تھی۔

کمرے میں آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور بستر میں آ کر گھس گیا لیکن ان دونوں
کے تصور نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ خاص طور سے عالیہ میرے ذہن پر سوار تھی۔ کیا لڑکی
ہے اور کس عیاری سے اس بوڑھے کو انگلیوں پر نچا رہی ہے۔ پہلے تو مجھے افسوس ہوا تھا
کہ اتنی خوبصورت اور دلکش لڑکی اس بوڑھے گدھ کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن
اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر باڈی گارڈ جیت سنگھ کا مسئلہ بھی تھا۔
باڈی گارڈ اگر اس کا محبوب نہیں ہے تو کم از کم عالیہ کا رازدار ضرور ہے اور ہو سکتا ہے وہ
اس کو اپنے کسی آشنا سے ملنے میں مدد دیتا ہو۔

بہرحال اس سلسلے میں، میں کوئی اور دلچسپی نہیں رکھتا تھا کیونکہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ آدم
زمان قابل ہمدردی انسان نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی تھی کہ جیت
سنگھ عالیہ کا ساتھی بنا ہوا ہے یا عالیہ کتنے لوگوں سے اپنی دلچسپیاں وابستہ کئے ہوئے ہے۔
میں تو بس یہ جانتا تھا کہ یہ شکل مجھے بھا گئی تھی اور مجھے ہر قیمت پر اس کا قرب اختیار کرنا
ہے۔ آرام دہ مسہری پر کروٹیں بدلتے ہوئے میرے ذہن میں خیالات کا چرخہ چلتا رہا اور
مجھے بدھ بھکشو کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے گیارہ برس کے خاقان جمشیدی سے کہے
تھے۔ اس نے کہا تھا۔

''آپ آتماؤں کے شکاری ہیں اور جنم جنم کی آتمائیں آپ کا شکار ہیں۔''

بڑا ناقابل فہم جملہ تھا۔ آتماؤں کے شکاری یعنی روحوں کا شکار کرنے والے۔ لیکن
اب اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اب شکاری بن چکا تھا اور اس وقت ایک خوبصورت
آتما میری زد پر تھی۔ بالکل صحیح کہہ رہا تھا وہ شخص وردان سادھانی۔ اس نے مجھے بتایا تھا
کہ دھن راج، آج سے دھیان کے راستے پر آپ کی یاترا شروع ہوتی ہے۔ بات اس
کے عقیدے کی تھی لیکن سچ ہی تو تھا۔ یہ دھیان ہی کا تو راستہ تھا جس پر میں اس وقت
رواں دواں تھا۔

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ لفٹ والے واقعے سے پہلے میں نے باڈی گارڈ جیت

سنگھ کو کہیں دیکھا ہے۔ یہ اچانک ہی تبدیلی میرے اندر پیدا ہوئی تھی مگر یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں۔ بس خیالات تھے جو ذہن کے پردے پر ضربیں لگا رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت جب لفٹ میں، میں نے اس کے جبڑے پر گھونسہ مارا تھا اور ایک باکسر کی حیثیت سے اسے چیلنج کر دیا تھا اور نیچے گرا دیا تھا تو اس وقت سے لے کر اب تک میرے دل و دماغ پر اس کی کوئی قدیم تصویر نہیں تھی۔ لیکن بس یوں لگتا تھا جیسے میرے دماغ کے پردوں کی آزادی بھی کسی کے قبضے میں ہو۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ میرے ذہن میں خیال آیا اور میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آج ہی مجھے بھوج پتر ملا تھا اور اس پر میں نے ایک شخص کو وردی پہنے ہاتھ اٹھائے رقص کرتے دیکھا تھا۔ اور پھر اس کے نقوش میرے ذہن میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ رقص کرنے والا یہ شخص میرا پرانا دوست نہیں تھا بلکہ یہ جیت سنگھ تھا۔ سو فیصدی جیت سنگھ...... واقعی...... بھوج پتر پر نظر آنے والی تصویر مجھے اپنی تمام تفصیل کے ساتھ یاد آ گئی اور اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ جیت سنگھ ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور احساس ہوا وہ یہ کہ اس تصویر میں جیت سنگھ رقص ضرور کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پر انتہا درجے کا خوف و ہراس تھا۔ میں بے چینی سے اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ واقعی...... کیا ہو رہا ہے یہ؟ آخر یہ سب کیا تھا...... کیا؟

میں نے کچھ دیر تک سوچا اور اس کے بعد اچانک ہی مجھے ردی کی وہ ٹوکری یاد آ گئی جس میں، میں نے بھوج پتر ڈال دیا تھا۔ میں پھرتی سے اٹھ کر ٹوکری کی جانب دوڑا لیکن ٹوکری خالی تھی۔ بھوج پتر پتہ نہیں کب اور کیسے غائب ہو گیا تھا۔ بے خیالی کے سے انداز میں، میں نے اپنے کمرے کے ایک ایک گوشے پر نگاہ ڈالی لیکن کمرہ صاف شفاف تھا۔ بھوج پتر یہاں کہاں سے آ سکتا تھا؟ وہ غائب ہو چکا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ میرے خدا...... میرے خدا...... اس کا مطلب ہے کہ اب کسی نہ کسی شکل میں اس بے چارے جیت سنگھ کی باری ہے۔ آدم زمان، اس کی بیوی عالیہ، جیت سنگھ، آدم زمان کا باڈی گارڈ۔ خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ...... نجانے وقت مجھے کون کون سے راستوں پر لے جا رہا ہے۔

***

اس خوبصورت اور بمبئی کے سب سے بڑے ہوٹل میں میرے اگلے چار پانچ دن اس

طرح گزرے کہ جونہی صبح ہوتی، آدم زمان کا فون آ جاتا۔ اسے مجھ سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ کہتا۔

''جاگ گئے ہو۔ میں نے جلدی تو نہیں جگا دیا؟''

''نہیں سیٹھ صاحب۔''

''تو پھر آ جاؤ۔ ناشتہ ساتھ ہی کریں گے۔''

اور جب میں وہاں پہنچتا تو باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور یہ سلسلہ لنچ کے وقت تک جاری رہتا۔ مجھے بھی اس شخص سے اچھی خاصی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ یہ خاصا دلچسپ آدمی تھا۔ وہ مجھ سے کہتا۔

''بہت جلد میں دنیا کے دورے پر جانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ بمبئی میں، میں نے جو کاروبار پھیلا رکھا ہے بمبئی سے جانے سے پہلے اس کے حالات ٹھیک ٹھاک کر دوں تاکہ میری غیر حاضری میں بھی یہ کام معمول کے مطابق ہوتا رہے۔''

''کیوں نہیں مسٹر آدم زمان!'' میں اسے جواب دیتا۔

تقریباً ہر شام کو وہ اپنے منیجروں کے ساتھ اپنے مختلف گوداموں اور دفاتر کے دورے پر نکل جاتا۔ شام کو البتہ میری جان اس سے چھوٹ جاتی تھی اور میں جس طرح چاہتا وقت گزارتا۔ ویسے تھوڑے ہی وقفے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی بیوی کی حرکتوں سے کسی حد تک واقف ہے کیونکہ ہر وقت اس کی یہی کوشش رہتی کہ عالیہ زمان اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ میں نے جب یہ بات محسوس کی تو خود بھی بہت محتاط ہو گیا اور اس کی موجودگی میں بڑی پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ حالانکہ عالیہ فطرتاً دل پھینک محسوس ہوتی تھی اور یہ اندازہ ہوتا تھا اس کے بارے میں کہ خاصی شوقین فطرت کی مالک ہے۔ لیکن آدم زمان کی لاکھ کوششوں کے باوجود میں نے ایک بار بھی ایسے شبے کا موقع نہیں دیا اور عالیہ کی طرف سے مسلسل لاپرواہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ باہر جاتا تو عالیہ کو باڈی گارڈوں کے سپرد کرنے کی بجائے مجھ سے الجھا کر چلا جاتا اور اس کے بعد اس کے آنے تک میں اور عالیہ اس کا انتظار کرتے رہتے۔

ایسے موقعوں پر عالیہ کا ایک دلچسپ مشغلہ ہمارے کام آتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لگا لیتی اور اس کے بے شمار ٹکٹوں کو البموں میں لگانے کا بیزار کن فرض مجھے بھی ادا کرنا پڑتا۔ کبھی آدم زمان اپنے کھاتے نکال کر ٹیبل پر پھیلا جاتا اور ہم سے کہہ جاتا کہ ہم کھاتوں پر ایک

نظر ڈالیں کہ کہیں اکاؤنٹنٹ نے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔
مجھے اکاؤنٹس کا تو کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن عالیہ اس سلسلے میں زبردست ماہر تھ
ممکن ہے وہ طویل عرصے سے آدم زمان کا یہ کام کرتی رہی ہو چنانچہ وہ میرے ساتھ
شامل ہو کر یہ حساب چیک کرتی رہتی۔ ویسے جو پارسائی کا مظاہرہ میں نے آدم زمان کے
سامنے کیا تھا اس نے عالیہ کو میری طرف سے کسی حد تک بددل کر دیا تھا اور وہ حقیقتاً
میں یہ سمجھنے لگی تھی کہ میں عورت پسند انسان نہیں ہوں۔ اس بات سے وہ اپنی توہین بھ
محسوس کرنے لگی تھی اور مجھ سے بہت کم بات کرتی تھی۔

پھر کچھ دن کے بعد ایک نئی بات ہونے لگی۔ وہ یہ کہ آدم زمان عالیہ کو ہوٹل پر چھو
کر جاتا تو جیت سنگھ کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا۔ ویسے بھی وہ اسے شہر کے دور دراز کامو
میں الجھائے رکھتا۔ ہفتے بھر سے زیادہ ہو گیا تھا مگر مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی ج
سے جیت سنگھ اور عالیہ کے درمیان کسی گڑبڑ کے ثبوت ملتے۔ جیت سنگھ کا اور میرا کئی ب
سامنا بھی ہوا تھا۔ آدم زمان کے سامنے تو وہ مجھ سے ادب سے پیش آتا لیکن جب
وہ مجھے تنہا دیکھتا اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی۔ ظاہر ہے پہلے دن کا گھونسہ وہ نہیں بھول
سکتا تھا جس سے اس کا جبڑا کئی دن ٹیڑھا رہا تھا۔ ادھر اپنے دوست ولیم ہاروے سے ا
پہلی ملاقات کے بعد بھی کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنے جہاز پر لے گیا اور اس۔
مجھے وہاں کا ماحول دکھاتے ہوئے کہا۔

''اب ذرا دیکھو، جہاز مرمت ہو رہا ہے۔ یہ لوگ کتنا شور مچاتے ہیں۔ میں تو سمجھ
ہوں کہ اگر کوئی اجنبی انسان ان کے درمیان ایک مہینہ رہ جائے تو بہرہ ہو جائے۔''

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن میں اسے ہوٹ
میں لا کر عالیہ سے متعارف کرانا پسند نہیں کرتا تھا۔ البتہ اس نے کئی بار حیرانی سے پو
کہ آخر میں دن بھر ہوٹل میں پڑا کیا کرتا رہتا ہوں۔

''بس یہ ہوٹل مجھے ضرورت سے زیادہ ہی پسند ہے۔ یہاں کچھ شناسائیاں بھی حاص
کر لی ہیں میں نے۔'' میں نے جواب دیا۔ عالیہ اور آدم زمان سے اس قدر قریب ہو
کا کوئی پس منظر نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں عالیہ کے حسن سے متاثر تھا
جب پہلی بار گلابی ساڑھی میں میری اس کی ملاقات ہوئی تھی تو بہت دیر تک وہ میر
ذہن پر سوار رہی تھی۔ اور اب جبکہ مجھے اس کی اس قدر قربت حاصل ہو گئی تھی اور

جانتا تھا کہ اگر میں عالیہ کی تھوڑی سی پذیرائی کروں تو وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری
آغوش میں آ کر گر سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں بہت کچھ کھو چکا تھا، بہت کچھ۔ گھر
بار، ماں باپ اس طرح میری زندگی سے دور ہو گئے تھے کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ انسان
چند ہی ایسے کرداروں سے تو منسلک ہوتا ہے جو اس کی پوری زندگی پر محیط ہوتے ہیں۔ مگر
میں نادانستہ طور پر باپ کو بھی کھو چکا تھا۔ اس باپ کو جس نے انگلی پکڑ کر مجھے دنیا سے
شناسا کیا تھا۔ جو باپ سے زیادہ میرا دوست تھا۔ ایک ماہر اور جنگجو شکاری جسے دیکھ کر کئی
بار میں نے شیر کو دُم دبا کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو مجھے بھی اتنا ہی بڑا شکاری بنانا
چاہتا تھا۔ کتنی امنگیں اور آرزوئیں تھیں اس کے دل میں میرے لئے۔ لیکن اس کے بعد
انسان کس طرح ایک دوسرے کو بھول جاتا ہے۔ اس نے بھی یہی کیا تھا، سب کچھ چھوڑ
کر مجھے دنیا کے حوالے کر کے اپنی منزل کی طرف راہی ہو گیا تھا۔ ادھر والدہ تھیں کہ
انہوں نے مجھ سے جیتے جی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ممتا اور محبت کے سارے قصے ہوا
ہو گئے تھے اور میرے اور ان کے درمیان اتنا فاصلہ ہو گیا تھا کہ میں سوچتا تھا کہ شاید کبھی
زندگی میں میری ان سے ملاقات نہ ہو سکے۔

بہرحال اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ عالیہ کا مسئلہ مسلسل جاری تھا۔ میں نے بے
شک آدم زمان کے سامنے اس سے انحراف کیا تھا لیکن جب آدم زمان کو پورا اطمینان ہو
گیا تھا اور وہ جب مکمل طور پر عالیہ کو میرے سپرد کر کے چلا جاتا تھا تو میرے پاس
بہترین ذرائع تھے کہ میں عالیہ پر ڈورے ڈال سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اشبھ بھاوناؤں
نے مجھے مکمل طور سے اپنے جال میں جکڑا ہوا تھا اور میں ایک خالص برا آدمی تھا۔ پکا برا
جس کی برائی میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ اب سارے اقدار، سارے معیار ایلس فیوری
کے ساتھ ہونے والے واقعہ کے بعد ختم ہو گئے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ایسا انسان اس
دوران اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ان الہام کا سہارا لے لیتا ہے جو کسی نہ کسی
طرح اس کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو معصوم اور پوتر ثابت کرنے کی
کوشش کرتا ہے اور یہی سب کچھ میں بھی کر رہا تھا۔ البتہ ذرا سی جھنجھلاہٹ ہونے لگتی
تھی۔ چونکہ عالیہ کو یہ بات سمجھنی چاہئے تھی کہ میں اس کے گھاگ اور زمانہ شناس شوہر کے
سامنے اگر اس سے رغبت کا اظہار کروں گا تو مصیبت نازل ہو جائے گی۔ لیکن وہ مجھ
سے مسلسل بددل نظر آتی تھی۔ غالباً اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کی توہین کئے جا

رہا ہوں۔

کافی وقت تک میں اس کے سلسلے میں رفتہ رفتہ کوشش کرتا رہا۔ اصل میں مکمل طور تو میں اس پر پانسہ نہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ اگر بھڑک جاتی تو آدم زمان کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیتی۔ کیا کرنا چاہئے؟ اور میرے ذہن میں خود ہی ایک تجویز آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اب میں اس کی جانب سے لاپرواہی برتوں۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اسے یہ تاثر دیا کہ وہ ایک وقتی ہے، میری دلچسپیوں کا مرکز کچھ اور ہے۔

انہی دنوں دکن کا ایک نواب ٹائپ کا خاندان کچھ دن سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے ان کی جانب قدم بڑھائے اور ان سے سلام دعا پیدا کر لی۔ اصل میں اس کی وجہ ان کی تیز وطرار لڑکیوں کا حسن و جمال تھا۔ یہ لڑکیاں بہت ہی ماڈرن تھیں اور بمبئی کے بہت ہی شاندار سوئمنگ پول پر اکثر وقت گزارتی تھیں۔ چنانچہ میں نے بھی انہی کی جانب رخ کیا اور سوئمنگ پول پر زیادہ وقت گزارنے لگا۔

ادھر آدم زمان سے اسی طرح ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ فرصت میں اپنی سیاحتوں کے قصے سناتا رہتا اور عالیہ کو بھی بحالت مجبوری اس کے ساتھ ہونا پڑتا تھا۔ لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ رفتہ رفتہ عالیہ کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی جا رہی تھیں۔ غالباً یہ ان لڑکیوں کی مہربانی تھی جو اب مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی تھیں۔ پھر آدم زمان نے ایک دن صبح ہی صبح دورے پر جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”بھئی تم لوگ اپنے لئے کوئی مشغلہ تلاش کر لو۔ میں تو آج دن بھر ہی مصروف رہوں گا۔ حالانکہ گرمی بہت زیادہ ہے اور مجھے گرمی سے بچنا چاہئے۔ لیکن کچھ کام بھی ہوا کرتے ہیں۔ عالیہ، تم نے وہ نیا البم تیار کر لیا؟ میں نے تمہیں کچھ غیر ملکی ٹکٹ لا کر دیئے تھے۔“

”نہیں۔“

”واہ...... تو پھر تم باہر کی گرمی سے بچنے کے لئے یہ مشغلہ اختیار کر لو۔“ عالیہ نے گردن جھکا دی۔ بہرحال آدم زمان کے ان احکامات کی پابندی وہ بڑی دلچسپی سے کیا کرتی تھی۔ ہم لوگ البم تیار کرنے لگے۔ پھر اس سے جی اکتایا تو عالیہ نے کہا۔

”میں بیئر پیوں گی۔“

”ویٹر کو بلاؤں؟“

”ہاں۔ روم سروس کو فون کر دو۔“

برف میں لگی ہوئی یخ بیئر آ گئی تو عالیہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کب تک انسان بن جاؤ گے؟“

میں نے سنجیدہ نگاہوں سے عالیہ کو دیکھا اور بولا۔ ”جب تک مجھے یہ احساس نہ ہو جائے کہ میں انسان نہیں ہوں۔“

”بیئر پیو میرے ساتھ۔“

”میں نے کہا نا کہ ابھی مجھے اپنی غیر انسانی صفت کا احساس نہیں ہے۔ تم پیو، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”اوکے...... اوکے، کچھ تو منگوا لو اپنے لئے۔“

”ہاں، ویٹر میری پسند کا مشروب لینے گیا ہوا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ عالیہ کا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اپنے پیرس، لندن اور روم کے واقعات مزے لے لے کر سنانے لگی۔ اس نے کہا۔

”بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ روم میں ایک غریب سا آدمی جس کا نام بیرن تھا مجھ پر عاشق ہو گیا تھا اور عموماً مجھ سے عشق بگھارتا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے اس کی پٹائی کر دی۔“ وہ تفصیل سے مجھے یہ قصہ سناتی رہی۔ پتہ نہیں ان واقعات کو مزے لے لے کر بیان کرنے سے وہ کیا چاہتی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے میری طرف جھک کر پوچھا۔

”ایک بات بتاؤ گے...... بتاؤ گے، بولو؟“

”ہاں، کیوں نہیں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”کیا تم ڈبل گیم نہیں کھیل رہے؟“

”ڈبل گیم؟“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں، مجھ سے لاپرواہی کا اظہار بھی کرتے ہو ایک طرف اور دوسری طرف مجھے پھانسنے کے چکر میں بھی ہو۔“

میں ایک دم چونک پڑا۔ بہرحال عالیہ چالاک تو تھی لیکن وہ یہ بات اتنی آسانی سے محسوس کرے گی اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا، بیئر کی جھاگ سے اس کے بالائی ہونٹوں پر مونچھیں سی بن گئی تھیں۔ میں نے ایک دم اپنا موڈ تبدیل کیا اور ہاتھ بڑھا کر وہ مونچھیں صاف کر دیں پھر کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا۔

"ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ مگر تم میری پٹائی نہیں کرسکو گی۔ کیونکہ تم مجھے صحیح طور پر نہیں جانتیں۔ میں مار کھانے والوں میں سے نہیں بلکہ مارنے والوں میں سے ہوں۔ سمجھ رہی ہو نا تم؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر بولی۔ "کسی کی پٹائی کی ہے آج تک؟"

"ہاں، کئی ایسی لڑکیوں کی جو میری محبوبائیں تھیں اور انہوں نے ناز و ادا کے مظاہرے کئے تھے۔"

"ایک فرمائش کروں تم سے؟"

"بولو۔"

"اب اگر کسی محبوبہ کی پٹائی کرو تو مجھے ضرور بلا لینا۔ میں یہ منظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی......؟" میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا اور وہ ایک دم چونک پڑی۔

"کیا مطلب؟"

"نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر فوری طور پر یہ منظر دیکھنا چاہتی ہو تو آؤ میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔"

وہ جھنجھلا گئی۔ اس نے اپنا بازو میرے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کیا اور بولی۔ "میں تمہارا مطلب سمجھنا چاہتی ہوں۔"

لیکن اچانک ہی اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو نارمل کیا، اور ریسیور اٹھا کر کچھ دیر سنتی رہی۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اس نے چہک کر کہا۔

"اوہو...... تم، کوشل تم...... میں تو تمہاری آواز بھی نہیں پہچان سکی تھی۔ کیا کر رہی ہو بھئی؟ کہاں ہو؟ فرصت میں ہو نا؟ ویری گڈ...... بالکل، بالکل...... ہاں ہاں، کیوں نہیں...... بالکل ٹھیک ہے، اوکے...... ہاں ہاں بالکل ٹھیک...... اوکے۔"

اس نے یہ کہہ کر فون کا ریسیور رکھ دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ فون کسی کوشل وشل کا نہیں ہے اس لئے کہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے وہ غیر ضروری طور پر یہ ظاہر کر رہی تھی کہ دوسری جانب کوئی عورت ہے۔ ٹیلی فون آنے کے بعد اس کا رویہ اچانک بدل گیا اور وہ مجھے گھورتی ہوئی بولی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم یہ کہنا چاہتے تھے کہ تم میری بھی پٹائی کر سکتے ہو۔ اس

غلط فہمی کو دل سے نکال دو۔ سمجھ رہے ہو نا؟ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دو۔ تم اگر اب چاہو تو جا سکتے ہو۔ میں کچھ مصروف ہو گئی ہوں۔"

"اوکے۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ لیکن میں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی اس تبدیلی کا راز معلوم کروں گا اور چھپ کر اس کا تعاقب کروں گا۔ آدم زمان کے بارے میں مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ تین چار گھنٹے سے پہلے تو واپس نہیں آئے گا۔ اگر کوئی عالیہ سے ملنے آیا تو میں دیکھ لوں گا۔ اندازہ یہ تھا کہ وہ باہر نہیں جائے گی کیونکہ اس کے لئے پھر اسے آدم زمانے کے لئے جواب دہی کرنا پڑے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہو گا۔

بہر حال وقت گزرنے لگا۔ اگر کوئی عالیہ سے ملنے آنے والا ہے تو وہ کون ہو سکتا ہے؟ کم از کم جیت سنگھ تو نہیں کیونکہ وہ آدم زمان کے ساتھ باہر گیا ہے۔ خیر یہ تو پتہ کسی نہ کسی شکل میں چل ہی جائے گا کہ عالیہ کو اس وقت ٹیلی فون کرنے والا کون تھا۔ میں نے اپنے اندر کا جائزہ لیا تو ایک لمحے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں عالیہ کی طرف ضرورت سے زیادہ ہی مائل ہوں اور دوسروں سے رقابت محسوس کرنے لگا ہوں۔ بہر حال اپنی خواہش یا اسے پاگل پن کہہ لیا جائے کہ میں نے آج طے کر لیا تھا کہ اس شاطر عورت کے نامعلوم محبوب کے بارے میں معلوم کر کے رہوں گا۔

میں باہر نکل آیا اور خیالوں میں ڈوبا ہوا آگے نکل آیا۔ پھر اچانک ہی میں نے دیکھا کہ کوریڈور میں جیت سنگھ صوفے پر بڑا مزے سے سگریٹ پی رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے سگریٹ ڈسٹ بن میں ڈالی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سر، آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

جیت سنگھ کو دیکھ کر میں چونکا تو تھا لیکن پھر بھی میں نے اسے اتنی اہمیت نہیں دی اور کہا۔ "ہاں...... میں کسی کام سے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا اور میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں سے لفٹ کا دروازہ نظر آتا تھا۔ ویٹر جو میرے لئے مشروب لینے گیا تھا میرے پاس پہنچ گیا اور بولا۔

"سر! آپ کا مشروب آپ کے کمرے میں پہنچا دوں یا میڈم کے کمرے میں؟"

"نہیں، مجھے یہیں دے دو۔" میں نے اس سے کہا اور ویٹر نے ادب سے ایک میز میرے سامنے لگائی اور مشروب اس پر رکھ دیا۔ میں مشروب کے چھوٹے چھوٹے سپ

لینے لگا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے جیت سنگھ کو دیکھا، وہ لا
سے باہر آرہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کینوس کا وہ تھیلا اٹھایا ہوا تھا جو ایک دو بار
نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ عام طور سے وہ اس تھیلے میں میلے کپڑے بھر کر ڈرائی کلین
ہاں لے جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عالیہ ہوٹل کی لانڈری سروس سے اپنے کپڑے
دھلواتی بلکہ مارکیٹ کے سامنے کوئی اور ڈرائی کلین فیکٹری تھی جہاں اس کے کپڑے ڈ
کلین ہونے جاتے تھے۔ گویا اس وقت جیت سنگھ لانڈری جا رہا ہے۔ یہ تو بڑی عج
بات تھی۔ اس نے جیت سنگھ کو بھی چلتا کر دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے جیت سنگھ نہیں،
اور شخصیت ہے جو اس سے ملنے آنے والی ہے۔ میں نے بل سائن کئے اور باہر نکل آ
اچانک میں نے دیکھا کہ ایک اور باڈی گارڈ جس کا نام کریم خان تھا، باہر نکل رہا
وہ لفٹ کی جانب ہی جا رہا تھا۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ لیکن میرا منہ حیر
سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اس شاطر عورت نے کیا
جال پھیلا رکھے ہیں۔ کریم خان تو بالکل ہی دبا ڈھکا سا آدمی تھا لیکن در پردہ اس
عالیہ سے تعلقات تھے۔ یہ بات اس وقت مجھے پتہ چلی تھی۔

میں نے تیزی سے لابی عبور کی اور بڑھ کر دیکھا کہ لفٹ اوپر نہیں، نیچے کی طرف
رہی ہے جہاں سوئمنگ پول کا زمین دوز استقبالیہ تھا۔ میرا سر چکرا کر رہ گیا۔ خداوند، یہ
پراسرار کہانی ہے۔ ویسے مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ ہوٹل کی لابی سے بھی سوئمنگ پو
پر جا سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ریستوران سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ہوٹل والوں
خاص طور سے غیر ملکیوں کے لئے زمین دوز راستے کی آسانی رکھی تھی تاکہ یہ لوگ نہا
کے لباس میں بھی اپنے کمروں سے نکل کر لفٹ کے ذریعے براہِ راست سوئمنگ پول پر
سکیں اور انہیں لابی اور ریستوران سے نہ گزرنا پڑے۔

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے ریستوران کا رخ کیا اور ریستوران سے گزرتا
میں سوئمنگ پول کے احاطے میں جا پہنچا۔ پول اس وقت بالکل ویران پڑا ہوا تھا کیونکہ
گرمی اور سخت دھوپ تھی۔ اس لئے نہانے والے بھی ابھی اپنے کمروں کے عافیت بخش
سائے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں باہر آیا تو دھوپ کی چمک سے آنکھیں چکا چوند
ہونے لگیں۔ پول کے آس پاس رنگ برنگی چھتریاں مختلف زاویوں سے نصب تھیں۔ میں
نے سوچا کسی چھتری کے سائے میں بیٹھ کر چھپ جاؤں اور دیکھوں کہ یہ کریم خان آ

یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ اس وقت میں قمیض ٹائی اور پتلون میں تھا اور ظاہر ہے پول کے
پاس چھتری کے کنارے اس لباس میں بیٹھنا بہت عجیب لگتا تھا۔ میں نے ابھی تک کریم
خان کو زمین دوز راستے سے نکل کر آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پول
کے استقبالیہ سے نہانے کا لباس لے رہا ہو گا۔ میں ریستوران کے دروازے پر جا کھڑا
ہوا۔ یہ بڑے موقع کی جگہ تھی اور یہاں سے پورا سوئمنگ پول بھی نظر آتا تھا اور زمین دوز
راستے کی نگرانی بھی ہو سکتی تھی۔

اچانک ہی مجھے اس تمام بھاگ دوڑ میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔ کم از کم پتہ تو چلے کہ
اس عورت نے کیا کیا کھیل، کھیل رکھے ہیں۔ کتنی حیرانی کی بات تھی۔ ایک نگاہ میں
انسانوں کو متاثر کر کے انہیں اپنا دیوانہ بنا لینے والی اس عورت کے اندر جسے دیکھ کر یہ
محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی معصوم فطرت اور شریف سی بچی ہے، اتنے چھل فریب
بھرے ہوئے تھے کہ تجربے کار سے تجربے کار انسان بھی اس کا جائزہ نہ لے سکے۔ اب
تک میرا خیال یہی تھا کہ جیت سنگھ جو ایک لمبا تڑنگا آدمی ہے اور اگر اس کے چہرے اور
اس کی حیثیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہر دل پسند عورتوں کے لئے وہ ایک پُرکشش شخصیت
کا مالک ثابت ہو سکتا ہے خاص طور سے ایسی کسی عورت کے لئے جس کا شوہر اس کی عمر
سے تین گنا زیادہ ہو۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ لیکن ایک نوعمر لڑکی پہلی بار میں نے غور کیا
کہ عالیہ زمان کی عمر کیا ہو سکتی ہے اور اس بات میں کوئی شبہ نہ پایا کہ بہرحال وہ مکمل طور
سے نوخیزیت کی منزل میں ہے۔

پول کے احاطے میں میرے دائیں ہاتھ پر لباس تبدیل کرنے کے دس چھوٹے
چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ بالکل اتفاق تھا کہ ابھی میری نظر اس وقت انہی کیبنوں
کی جانب تھی کہ میں نے زمین دوز راستے کی سیڑھیوں سے عالیہ زمان کو دیکھا جو
سیڑھیاں طے کر کے پول پر آئی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر لباس تبدیل کرنے کے کیبنوں کی
جانب بڑھ گئی۔ اس کے بازو پر سوئمنگ کا لباس پڑا ہوا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے
کے بعد وہ رکی اور اس نے کیبنوں کی قطار پر نظر ڈالی، جیسے وہ کسی مخصوص کیبن میں جانا
چاہتی ہو۔ پھر پانچویں کیبن کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلی گئی۔ میں دروازے کی آڑ میں
کھڑا ہوا یہ انتظار کرنے لگا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عالیہ
کو کیبن میں گئے ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ زمین دوز راستے سے ویسا ہی

تیرنے والا لباس پہنے ہوئے کریم خان برآمد ہوا۔ دوپہر کی چمکیلی دھوپ میں اس کا
جیسا بدن چمک رہا تھا اور پہلی بار اسے وردی سے بے نیاز دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو
کتنا شاندار اور فولادی جوان ہے۔ چلتے ہوئے اس کے بازوؤں اور رانوں کی مچھ
تڑپ رہی تھیں۔ کاندھے پر تولیہ ڈالے وہ بڑی بے نیازی سے پول کے کنارے کنا
چلتا ہوا کیبنوں کی طرف بڑھا اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اس پانچویں کیبن میں داخل
جس میں تھوڑی دیر پہلے عالیہ زمان گئی تھی۔ میرے پورے بدن میں شدید اینٹھن ہو
لگی۔ گویا میرا اندازہ بالکل درست ہے۔ بظاہر بھولی بھالی شکل کی نظر آنے والی یہ بد
عورت، اب میں اسے لڑکی نہیں کہہ سکتا تھا، یہ کھیل، کھیل رہی ہے اور بوڑھا بیو
صرف اپنے کاروبار کر رہا ہے۔

میں ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ فیصلہ کر رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اگر موق
ان دونوں کو جا پکڑوں اور ہنگامہ کھڑا کر دوں تو اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ بہرطور
میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں رقابت کی آگ میں جل رہا تھا اور اس سے پہلے اس آ
کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں ان تمام خرافات سے بچا ہوا تھا۔ لیکن لا
ہوسیوک سندھورتی اور وردان سادھانی پر جنہوں نے مجھے برائیوں کے راستے پر لگا دیا
اور اب برائی یوں لگتا تھا جیسے میرے وجود میں بس گئی ہوں۔

میں تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا اور پھر چونک پڑا۔ کیونکہ کریم خان باہر نکلا تھا
اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ تولیے سے اپنا بدن صاف ک
ہوا زمین دوز راستے میں غائب ہو گیا جبکہ عالیہ ابھی تک کیبن سے باہر نہیں آئی تھی۔ ا
میرے لئے ضبط کرنا دُشوار ہو گیا۔ میں پانچ نمبر کیبن کے دروازے پر پہنچا اور پلائی
کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر میں نے دھکا دیا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ میں پلک جھپکتے کیب
کے اندر داخل ہو گیا۔ جس تیزی سے میں داخل ہوا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا۔
میں عالیہ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اسے جس عالم میں دیکھا اسے دیکھ کر خود میری پلکیں
جھپک گئیں۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ دوسرے
اس نے دبی ہوئی چیخ ماری اور سر گھما کر میری طرف دیکھا پھر اس کے حلق سے آواز نکلی

''گیٹ آؤٹ...... گیٹ آؤٹ یو باسٹرڈ۔'' اس کی آواز شدید غصے سے کانپ ر
تھی۔ میں تو اس وقت دوسری کیفیت کا شکار تھا۔ میں اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا

دوسرے لمحے اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کا رنگ دہشت سے فق ہو گیا۔

''نکلو...... نکلو یہاں سے...... کمینے، غنڈے، حرام زادے۔ میں شور مچا دوں گی۔''

''تم جانتی ہو تم شور نہیں مچاؤ گی عالیہ زمان! اس لئے کہ ابھی تو تمہارے عاشق نے لباس بھی نہیں تبدیل کیا ہوگا۔''

''میں کہہ رہی ہوں کیا بکواس کر رہے ہو؟ نکلو یہاں سے۔'' اس کی آواز پھسپھسی تھی۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے سنہرے بدن کو لرزتے ہوئے دیکھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت خود میری ذہنی حالت بے انتہا خراب ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کے حسین جسم کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ بے داغ گندم کے پکے ہوئے خوشے کی طرح موسموں کی خوشبو میں بسا ہوا یہ سنگ مرمر کا جسم، یقین نہیں آتا تھا کہ کسی انسان کا جسم ہو سکتا ہے۔ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ شرم اور غصے سے سرخ ہو گئی اور خود کو چھپانے کی ناکام کوشش میں چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔ اب اس کے انداز میں نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''خاقان! خدا کے لئے چلے جاؤ۔ کوئی آ جائے گا۔''

''یہ لو......'' میں نے کیبن کی کھونٹی پر ٹنگا بڑا تولیہ اتار کر اسے دیتے ہوئے کہا اور اس نے جلدی سے تولیہ اپنے بدن پر لپیٹ لیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''مسز آدم زمان! میں تو اس وقت صرف ایک بات پوچھنے آیا تھا آپ سے۔''

''چلے جاؤ اس وقت۔ خدا کے واسطے چلے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟''

''کمال کرتی ہو۔ تھوڑی دیر پہلے بھی تو کوئی دیکھ سکتا تھا جیسے میں نے تم کو دیکھ لیا۔''

''جاؤ، پلیز جاؤ'' اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں لجاجت تھی۔ وہ سخت دُکھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''میں بعد میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گی۔ ابھی چلے جاؤ۔ خدا کے لئے......'' وہ بدستور گڑگڑا رہی تھی۔ لیکن میں اس کی اداکاری سے متاثر نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

''ہاں تو عالیہ! میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ آدم زمان نے اگر پوچھ لیا کہ اس کیبن میں کریم خان آیا تھا یا جیت سنگھ تو مجھے کیا کہنا چاہئے؟''

''کمینے، کتے! تم بلیک میلر اور بے غیرت ہو'' اس نے الٹے ہاتھ سے بھرپور طمانچہ

مارا جسے میں نے اپنے بازو پر روکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ وہ تکلیف سے دُہری ہو گئی تو میں نے بڑے پیار سے کہا۔

"نہیں ڈارلنگ! نہ میں کمینہ ہوں نہ بے غیرت۔ ہاں بلیک میلر ضرور ہوں۔ تم اگر مجھے کتا کہنا بھی چاہتی ہو تو کہو، لیکن اعلیٰ نسل کا۔ اور ایک بات اور سنو، جھوٹے برتنوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ میں تم سے صرف اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں، یہ بھی پھر سہی۔"

عالیہ نے مجھے نگاہیں بھر کر یوں دیکھا جیسے وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے پہلی بار میری شخصیت پر غور کیا ہو۔ اب تک میں ایک ایسے ضدی آدمی کا رول کر رہا تھا جو اس پر بری طرح ریجھ گیا ہو اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہو۔ وہ اس کی بدتمیزی برداشت کر رہا ہو اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کئے جا رہا ہو۔ مگر اس واقعے کے بعد اس کا نظریہ تبدیل ہوا اور اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں اس کا کوئی نیاز مند عاشق نہیں ہوں اور نہ ہی اس سے پہلے تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہی ہو گی کہ میں اس کے تلخ جملے بھی ہنس کر ٹال جاتا تھا حالانکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت وہ بری طرح میرے شکنجے میں ہے۔ لیکن ابھی جو چند لمحے گزرے تھے اس میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان آئندہ کیا تعلقات ہوں گے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس کی اداکاری سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ وہ غصہ بھی کر کے دیکھ چکی تھی اور اس کی منت وسماجت بھی کام نہیں آئی تھی۔ سارے ہتھیار آزما چکی تھی وہ۔ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ میرے سامنے نرم ہو جائے اور سیدھی سیدھی باتیں کرے۔ اب تک وہ ایک آزاد خیال لیکن وفادار بیوی کے روپ میں آئی تھی۔ ایسی بیوی جو اپنے شوہر کے ساتھ وفادار ہو اور اس کی امانتوں کی حفاظت کرتی ہو اور اسے ہر نقصان سے بچانا چاہتی ہو۔ مگر یہ بھرم ٹوٹ چکا تھا۔ وہ جہاں تھی اور اس وقت جس حال میں، میں نے اسے پکڑا تھا اس سے اس کی شخصیت کا بھرم کھل جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مس عالیہ! ہمیں سیدھا سیدھا کھیل کھیلنا چاہئے۔ کم از کم اب تمہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں تمہارے بارے میں سمجھ چکا ہوں۔ کیا سمجھیں؟ بات وہی آ جاتی ہے۔ میں تم سے اپنے کچھ سوالات کے جواب چاہتا ہوں۔"

"دیکھو میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے دوں گی۔ مگر اس وقت تم یہاں سے جاؤ۔"

میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا اور اس کے بعد ایک جھٹکے سے پلٹ کر کیبن سے باہر نکل گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پول اسی طرح ویران تھا۔ ریستوران سے گزرتا ہوا میں لابی میں پہنچا اور اپنے کمرے کی پُرسکون تنہائی تک پہنچنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لیکن ایک عجیب سی بے کلی اور بے چینی میرے سارے وجود میں تھی۔ یہ آخر کیا ہو رہا ہے؟ ایلس فیوری کے واقعے کے بعد پہلی بار مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ اگر وردان سادھانی نے میرے لئے یہ پیش گوئی نہ کی ہوتی کہ مجھے کس قسم کی روحانی بادشاہت ملنے والی ہے، اگر لنکا کے ان منحوس پہاڑوں میں مجھے یہ وہم نہ ہوا ہوتا کہ میں بعض غیر معمولی قوتوں کا مالک ہوں، اگر سینکڑوں بھکشوؤں نے مجھے عقیدت اور محبت سے سجدے نہ کئے ہوتے تو میں یہ سمجھتا کہ میں بیسویں صدی کا ایک عام سا نوجوان ہوں۔ مالدار گھرانے کا بگڑا ہوا نوجوان جس نے اپنے باپ کی عیاشیاں دیکھی تھیں۔ میرے باپ مرحوم جن کے بارے میں بہت سی باتیں سوچتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی، جو بہت سی بیویوں کے شوہر تھے۔ اگر انہی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ واقعی ایک عام آدمی کی حیثیت سے مجھے اپنے باپ ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ بے شک میں تھوڑا تھوڑا تھا لیکن تھا پتا پر۔ البتہ ایک بات میں اپنی ذات سے منسلک پاتا تھا وہ یہ کہ ایلس فیوری کے واقعے تک میں نے اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھا تھا حالانکہ بہت سی حسین مورتیاں میرے اردگرد چکراتی تھیں لیکن اس وقت میرا نظریہ زندگی بالکل مختلف تھا۔ ہو سکتا ہے اس وقت میرے ذہن میں بدھی ستو کی وہ مقدس تصویر بھی موجود ہو جو شو جی کے مندر میں دیو استھان پر مجھے نظر آئی تھی۔ یہ تصویر جو سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی نے کہیں برسوں میں جا کر بنائی تھی۔ میں نے کتنی ہی بار رات کی تنہائیوں میں خود سے یہ عہد کیا تھا کہ میں گناہوں سے دور رہوں گا۔ اس لئے کہ مقدس ہوں۔ لیکن اب میں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایلس فیوری نے تو زاویہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ وہیں سے مجھے اس لذت سے آشنائی ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ یہ تھا انہی منحوس اشبھ بھاوناؤں کا ورثہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عالیہ زمان بہت خوبصورت لڑکی تھی اور آوارہ مزاج
لیکن کیا میرے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ دنیا کی تمام خوبصورت اور آوارہ لڑکیوں کے
مارا مارا پھرتا رہوں جس طرح سے چند دنوں سے اس عورت کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں
میں نے اپنے اعمال کا جائزہ لیا تو مجھے احساس ہوا کہ کس طرح ایک نیک نفس ا
برائیوں کے ہاتھوں بھٹک جاتا ہے۔ میں ابھی تک اس درجے پر نہیں پہنچا تھا۔
حقیقت یہ تھی کہ اس وقت عالیہ زمان میرے لئے ناقابل حصول نہیں تھی جب میں
خان کے فوراً بعد کیبن میں اس کے پاس پہنچا تھا۔ ویسے ایک بات کا مجھے اندازہ تھا
میرے پاس ضرور آئے گی۔ کیونکہ مکھی جالے میں پھنس چکی ہے۔ وہ یقینی طور پر اپنے
کو راز رکھنے کے لئے سب کچھ لٹا دے گی اور اس کے بعد...... اس کے بعد اچانک
میرے ذہن میں ایک اور تصور آیا۔ کیا مجھے اتنا زیادہ گر جانا چاہئے؟ مناسب تو نہیں
یہ۔ پھر کیا کروں، کیسے اپنے ذہن کو اپنے قابو میں کروں؟ اتنا کمزور ہوں میں، اتنا ب
اور کم ہمت ہوں کہ ایک عورت سے بچنے کے لئے بھاگا بھاگا پھروں۔ نہیں، اپنے کردا
خود سنبھالنا ہوگا۔

آخر کار میں نے طے کر لیا کہ یہ رات میں ہوٹل میں ہی گزاروں گا۔ کہیں جا
کہیں بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ تو میرے اپنے ہاتھ کی با
ہے۔ ٹھکرا دوں گا اگر وہ آئے گی میرے پاس۔ یہ تمام باتیں سوچ کر بالکل ٹھکرا دو
اسے۔ اگر مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اب
غلاظت میں ہی دوڑ لگاتا رہوں۔ ان لوگوں سے تعلق رکھنے کی وجہ بھی صرف عالیہ ز
ہی تھی۔ میں اب ان سے ملنا جلنا بھی کم کر دوں گا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نے مجھے ک
کا نہیں چھوڑا تھا۔ بھوج پتر کی تمام تصویریں اور جو جو ہو چکا تھا سب کچھ ایک برا
خواب کی مانند میرے وجود میں بسا ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ان کے حساب سے میں
کا بدھ اور قابل احترام ہستی ہوں۔ لیکن میں اب تک اپنے آپ کو کسی احمقانہ حیثیت
تسلیم نہیں کر سکا تھا۔ کچھ بھی ہے، بہرصورت میں ایک نیک ماں کا بیٹا ضرور ہوں۔ پ
لکھا آدمی ہوں۔ اپنے برے بھلے کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ زندگی بڑی طویل ہے۔
سے اپنے آپ کو توہمات کے حوالے کر دینا تو بڑی حماقت ہے۔ جو ہو چکا ہے اس

انحراف کرنا چاہئے۔ ابھی تو میرے سفر کی ابتدا ہے۔ میں نے اگر ابھی سے اپنے آپ کو
غلط راستوں پر ڈال دیا تو آگے چل کر میں پورا شیطان بن جاؤں گا۔

نجانے کتنی دیر یہی تمام باتیں سوچتا رہا اور پھر بستر پر نیند آ گئی۔ نجانے کب تک میں
گہری نیند سوتا رہا کہ اچانک میرے کانوں میں ٹرن ٹرن ٹرن کی منحوس آواز ابھرنے لگی۔
میں نے بے چینی سے گردن اِدھر اُدھر پٹخی اور آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی
بج رہی ہے۔ میں نے کاہلی سے آنکھیں کھول کر دیکھا، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ کلائی
کی گھڑی پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ آٹھ بج رہے ہیں۔ میں نے کاہلی کے انداز میں اپنی جگہ
سے اٹھ کر پہلے لیمپ جلایا اور پھر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے معمول کے مطابق آدم
زمان کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو...... کیا ہو گیا، خیریت سے تو ہو؟''

''کون؟''

''ارے میری جان، میری زندگی، تمہارے بغیر تو اب زندگی ادھوری محسوس ہوتی ہے۔
آ جاؤ، انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ انکار کر دوں لیکن پھر خود ہی اپنے اس خیال کی
تردید کر دی اگر میں اس وقت وہاں نہیں جاتا تو ممکن ہے عالیہ اس کا غلط مطلب نکالے۔
وہ یہ سمجھے گی کہ شاید میں اپنے مطالبے پر زور دینے کے لئے اتنا کچھ کر رہا ہوں۔ اور اگر
میں اس وقت چلا جاؤں اور اپنے رویے سے یا ایک آدھ فقرے سے یہ ظاہر کر دوں کہ
مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ میرے کمرے پر ہی نہ آئے اور میں
بہت سی الجھنوں سے بچ جاؤں۔''

''کیا ہوا بھئی...... کیا کر رہے ہو؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں تھکے تھکے انداز میں اٹھا اور غسل خانے میں گیا۔ شیو وغیرہ کیا اور نجانے کیوں
میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنا بہترین لباس زیب تن کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔
عمدہ سا سوٹ پہن کر میں آدم زمان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کوریڈور میں کریم خان تازہ
استری کیا ہوا سوٹ پہنے ٹہل رہا تھا اور اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور آنکھوں میں

چمک تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بہت ادب سے سلام کیا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ عام طور پر تو وہ اِدھر اُدھر ہو جایا کرتا تھا۔

اندر داخل ہوا تو آدم زمان کو بہت خوش پایا۔ وہ اور عالیہ ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اور آدم زمان نے بڑی محبت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ مجھے بڑا لطف آیا اور یہی احساس میں نے عالیہ کے چہرے پر دیکھا۔ وہ محبت کو دست شفقت محسوس کر رہی تھی۔ ویسے اس وقت وہ بہت حسین نظر آ رہی تھی۔ کمبخت نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا گاؤن اور اس کے بعد خوبصورت ترین میک اپ۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔ آدم زمان نے پہلے سے زیادہ گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالیہ بھی شریک تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ترو تازگی میں بے مثال تھی۔ دوپہر کے واقعہ سے وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھی بلکہ اس کے انداز میں بڑی بے باکی تھی۔ میں بیٹھ گیا تو آدم زمان نے اپنی دن بھر کی مصروفیات کی داستان سنانا شروع کر دی کہ کس طرح وہ ایک گودام سے دوسرے گودام اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر گیا۔ یہاں کا کام پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہاں سے ٹیلی فون آ گیا۔ اس نے جیت سنگھ کو وہاں دیکھ بھال کے لئے بھیج دیا اور خود تیسری جگہ چلا گیا۔ یہ ساری باتیں وہ سنائے جا رہا تھا۔ کریم خان کا ذکر بھی کئی بار آیا اور اس ذکر پر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی عالیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ پُرسکون بیٹھی ہوئی تھی۔

دفعتہً ہی میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر آدم زمان مزے سے صوفے پر پڑا اپنی نام نہاد بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالے بولے جا رہا تھا۔ میں جب ایک دم کھڑا ہوا تو اس کی باتوں کو بریک سا لگا۔ وہ بولا۔

’’کیوں خیریت، کیا بات ہے؟ کیوں اٹھ گئے؟ اصل میں، میں اور عالیہ پروگرام بنا رہے تھے کہ سمندر پر چلیں گے۔ آج پورن ماشی ہے، آسمان پر پورا چاند نکلا ہو گا۔ سمندر کے کنارے ذرا مزا رہے گا۔‘‘

’’وہ بس کچھ نہیں۔ اصل میں، میں نے کھانا نہیں کھایا۔‘‘ اس وقت نجانے کیوں اتنی احمقانہ بات میرے منہ سے نکلی تھی۔ اصل میں، میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ عالیہ زمان کا اس وقت کا حسن دیکھ کر، اس کے بدن کی دلکشی اور لطافت دیکھ کر میرے ہوش و حواس

گم ہوئے جا رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتا تھا۔

’’تو پھر کھڑے ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھانا منگوائے لیتے ہیں۔ یہیں ساتھ مل کر کھائیں گے۔‘‘

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بہانہ بھی ایسا بے تکا کیا تھا کہ اس کے نتیجے میں یہی کچھ ہونا چاہئے تھا۔ بہت ہی پُرتکلف کھانا آ گیا اور کھانے کے دوران عالیہ زمان غیر معمولی طور پر میری مدارات کرتی رہی۔ آدم زمان اس وقت اپنی بیوی کی محبت میں گم تھا۔ اس وقت کی خاص ڈش مچھلی کے تلے ہوئے کباب تھے جو آلو کے ٹکڑوں کے ساتھ مزا دے رہے تھے۔ ان میں آدم زمان کو یہ سہولت تھی کہ وہ آسانی سے انہیں چبا کر کھا سکتا تھا۔ محبت میں سرشار ہو کر اس نے اپنی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے کانٹے میں لیا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس پر ٹماٹر کی چٹنی لگا کر عالیہ کو اپنے ہاتھ سے کھلا دیا۔ عالیہ اس کھیل میں برابر کی شریک تھی۔ تب ایک آدھ لقمہ وہ بھی اپنے بڈھے کو کھلا دیتی۔ اور کبھی وہ دونوں بچوں کی طرح ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کرنے لگتے۔ یہ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ کھانے کے دوران میاں بیوی نئے شادی شدہ جوڑے کی مانند چہلیں کرتے رہے۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ کاش یہ دونوں ہی جوان ہوتے یا پھر دونوں بوڑھے ہوتے تو اس منظر میں کتنی پاکیزگی اور معصومیت آ جاتی۔

کھانے کے بعد ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ اب میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ باہر آدم زمان کی چوڑی چکلی ڈارٹ کھڑی تھی۔ جس میں بیٹھ کر ہم جوہو چل پڑے۔ اس وقت ڈارٹ جیت سنگھ چلا رہا تھا اور ہم تینوں پچھلی سیٹ پر اس طرح بیٹھے تھے کہ عالیہ درمیان میں تھی۔ بظاہر وہ اپنے شوہر کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی مگر بار بار اس کی پنڈلی میری پنڈلیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور لاپرواہی سے باہر کی روشنیاں دیکھتا رہا۔ آدم زمان کی قیمتی کار گیلی ریت پر دور تک دوڑتی رہی۔ جوہو پر بہت ہی خوبصورت سماں تھا۔ پورے چاند کی یہ رات بڑی پُرکیف تھی۔ اور آدم زمان تو جیسے بھرپور نشے میں تھا۔ ویسے کھانے کے دوران اس نے ہلکی پھلکی شراب بھی پی تھی۔

عالیہ زمان نے بڑے میاں کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ لئے ساحل سمندر پر دور تک چلے گئے۔ میں وہیں رک گیا تھا۔ لیکن جب وہ واپس آئے تو آدم زمان کی

سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چاندنی میں گاڑی کی طرف آتے ہوئے وہ دونوں مجھے یوں لگے جیسے کوئی خدا ترس لڑکی کسی اندھے کو سڑک پار کرا رہی ہو۔ ادھر جیت سنگھ نے ریت پر چادر بچھا دی تھی۔ آدم زمان چادر پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ عالیہ بچوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ آدم زمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ دونوں یہاں بیٹھ کر رنگ رلیاں منانے لگے تو میں ساحل پر ٹہلنے کے ارادے سے وہاں سے دور چلا گیا اور کافی دور نکل گیا۔ جب خاصی دیر کے بعد میں لوٹا تو میں نے دیکھا کہ زمان، عالیہ کے کاندھے ہاتھ رکھے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے چاند کو تکے جا رہا تھا۔ یہ رومانی منظر ابھی تک جاری تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ آدم زمان کی گدی پر اُگی ہوئی سفید جھالر میں عالیہ انگلیاں دوڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آدم زمان نے اس کا ہاتھ کھینچ کر چوم لیا اور عالیہ کھنکتی ہنسی فضا میں گونجنے لگی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آدم زمان جیسا سنجیدہ آدمی اس وقت یہ تماشا مجھے کیوں دکھا رہا ہے؟ ممکن ہے کسی تیسرے فرد کی موجودگی میں وہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف رجوع ہو کر اپنے اندر کے انسان کو سکون دے رہا ہو۔ اس کی عمر اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیل رہی تھی۔

تقریباً کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ آدم زمان کو بتائے بغیر ہوٹل چلا جاؤں۔ کوئی ٹیکسی تو مل ہی جائے گی۔ میں اس انوکھے رومانی جوڑے سے دور ٹہلتا ہوا آ... کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف نکل گیا۔ یہاں کا منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ میں ایک درخت سے ٹک کر چاند اور سمندر کو دیکھنے لگا۔ مگر یہاں بھی مجھے تنہائی نصیب نہ ہو سکی۔ کچھ ہی لمحوں بعد میری نگاہیں اپنے بائیں طرف اٹھی تھیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک جوڑا چاندنی میں چمکتی ریت پر پڑا اینٹھ رہا تھا۔ یہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ میں ان کے اوپر پیر رکھ کر بھی گزر جاتا تو انہیں خبر نہ ہوتی۔ جھنجلاہٹ میں، میں نے ریت پر ٹھوکر ماری۔ بہت سی ریت اُڑ کر مرد کی برہنہ پیٹھ پر گری۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، پھر اسی طرح عورت کے بالوں میں منہ چھپا کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ میری کنپٹیوں پر خون ٹھوکریں مار رہا تھا۔ بہرحال میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ میرے لئے کتنے عذاب بچھائے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے اندر چھپے ہوئے اس حیوان کو جس نے اشبھ بھاؤناؤں کے بعد میری جڑیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں، آ...

...ات قابو میں کرلوں گا۔ مگر آدم زمان اور عالیہ زمان اور وہ نامعلوم جوڑا جو ریت پر گڈمڈ ہو رہا تھا اور اس بھرے پرے شہر کے ہزاروں نیم روشن کمروں میں ہزاروں جوڑے جو اس وقت خواہش کی بھٹیوں میں سلگ رہے ہوں گے اور جن کے دھواں دیتے ہوئے بدن آسودگی کی آخری حدوں میں پہنچنے کے لئے پسینہ پسینہ ہوں گے، یہ سارے کے سارے میرے ہی خلاف سازش تو کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں تنہا ہوں اور اس وقت خود سے لڑ رہا ہوں۔ انہیں معلوم ہے کہ آج رات عالیہ زمان میرے کمرے میں آئے گی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں اسے دروازے سے ہی لوٹا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ میرے اچھے ارادوں کو، میرے مضبوط حصاروں کو ریزہ ریزہ کر دینا چاہتے ہیں اور عالیہ ان میں سب سے آگے ہے۔

شاید میں جذباتی ہو رہا ہوں اور جذباتی ہونے کے ساتھ میرے الفاظ عجیب وغریب شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت کوئی اور میرے جسم کو کھول کر دیکھتا تو میرے مسامات سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا ہوا نظر آ جاتا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بے دھیانی میں ایک بار پھر واپس پلٹا اور آدم زمان تک پہنچ گیا۔ آدم زمان نے شاید مجھے دیکھا تھا یا نہیں دیکھا، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے عالیہ زمان کا سمٹا ہوا گاؤن ٹھیک کر رہا تھا اور وہ ہنس ہنس کر اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ آواز بھی کمبخت کی بڑی دلکش تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اس کی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ میں اس کمبخت کے ساتھ جہنم کی یہ رات گزاروں گا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد جب یہ میرے دروازے پر دستک دے گی تو میں اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا اپنے بستر پر لے جاؤں گا اور اپنی ہزار ہیجان انگیز راتوں کی آگ میں اسے جھلسا کر راکھ کر دوں گا، اسے پارہ پارہ کر دوں گا۔ پھر جب یہ مویشیوں سے روندی ہوئی فصل کی طرح پڑی ہو گی اور چھت کے پنکھے کو خالی خالی آنکھوں سے تک رہی ہو گی تو میں پوچھوں گا کہ بتا، کبھی کریم خان تجھے یا تیرے دوسرے عاشقوں میں جن میں جیت سنگھ یا اور جو کوئی بھی ہو وہ تجھے اس حد تک لے جا سکتا ہے؟ بول کبھی جیت سنگھ...... جیت سنگھ...... یہ الفاظ میرے منہ سے شاید زور سے نکل گئے تھے۔ کیونکہ دوسرے لمحے جیت سنگھ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

''یس سر!'' اس نے باادب لہجے میں گردن جھکاتے ہوئے کہا اور میں ایک دم چونک

پڑا۔ مجھے احساس ہوا کہ کیا حماقتیں کر رہا ہوں میں۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے
قابو پایا اور مدھم لہجے میں بولا۔

''جیت سنگھ! کیا یہاں ٹیکسی مل جائے گی؟''

''ٹیکسی سر؟'' جیت سنگھ کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کلائی کو اپنی آنکھوں سے لگا کر اس پر دوسرے ہاتھ سے دور بین سی بنائی اور دور بین سے جھ ہوئے گھڑی کے ڈائل پر وقت دیکھا پھر بولا۔ ''سر! پونے گیارہ بجے ہیں۔ اس وقت ٹیکسی ملنا مشکل ہے۔'' پھر کچھ تحمل کے بعد وہ دھیرے سے بولا۔

''سر، سیٹھ کو گیارہ بجے ہوٹل واپس پہنچنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ چلنے ہی والا ہوں گے۔ لیجیے، وہ آ رہے ہیں۔'' اس نے اشارہ کیا اور میری گردن گھوم گئی۔ میں نے دیکھا کہ عالیہ زمان گاڑی کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہ چادر تھی جو سنگھ نے ریت پر بچھائی تھی۔ چاند کی روشنی میں عالیہ مسکراتی ہوئی میرے قریب آئی آہستہ سے بولی۔

''میں آؤں گی۔ مگر دیر سے۔'' پھر وہ مڑی اور بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی اپنے بڈھے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور ٹھنک کر بولی۔

''آؤ نا آدم! نیند آ رہی ہے۔''

اس کے انداز میں بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ پتہ نہیں وہ مجھے رجھا رہی تھی یا بوڑھے شوہر کو۔ واپسی بھی بڑی عجیب تھی۔ دونوں ہی بدمستیاں کرتے رہے تھے۔ جان بوجھ کر جیت سنگھ کے برابر بیٹھا تھا اور اس پر انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ عالیہ تو صرف اداکاری کر رہی ہے، اس گدھے کو بالکل ہی پٹھا بنا رہی ہے۔ مگر وہ اُلو کا پٹھا اپنے آپ میں کیوں نہیں ہے؟ آخر بہرحال یہ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ دیکھو اس کے علاوہ میرے او گزرتی ہے۔

***

عارضی طور پر یہ مشکل لمحات ٹل گئے تھے۔ اس وقت عالیہ اور آدم زمان کی کیفیت تو جو کچھ بھی ہو گی لیکن مجھ پر جو بیت رہی تھی میں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے پاؤں زمین سے کئی فٹ اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ میرا سارا وجود بے وزن ہو گیا ہے۔ اسی بے وزنی کے عالم میں، میں نے کمرے میں پہنچ کر کپڑے اچھالے اور ایک طرف پھینک دیئے۔ پھر لائٹ آن کئے بغیر بستر میں لیٹ گیا۔ درد کے مارے سر پھٹ رہا تھا۔ کنپٹیوں پر جیسے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ کافی دیر تک میں اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ جب سر کے درد میں کوئی کمی نہ ہوئی تو لیمپ جلا کر میز کی دراز سے درد کی گولیاں نکالیں اور دو گلاس پانی سے یہ گولیاں نگل کر شب خوابی کا لباس پہنے بغیر صرف انڈرویئر اور بنیان میں بستر پر جا لیٹا اور لیمپ بجھا دیا۔ سونے سے پہلے مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا۔ پھر وہ شاید تھرماس ٹوٹنے کا دھماکہ تھا جس سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے جھپٹ کر سرہانے کا ٹیبل لیمپ جلایا تو مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''لائٹ بجھا دو بے وقوف!''

میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو وہ میز کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سلیپنگ گاؤن کے کالر بند کر رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھوں پر سایہ کر لیا تھا۔ میں نے دروازے پر نگاہ ڈالی تو نظر آیا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں نے لیمپ بجھانے سے پہلے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے بال بے ترتیب تھے اور آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اندھیرے میں، میں نے کپڑوں کی سرسراہٹ کی۔ وہ شاید گاؤن اتار رہی تھی۔

پھر وہ بستر پر آ بیٹھی اور میرا پورا بدن تپنے لگا۔ لیکن جب میرے ہاتھ تاریکی میں رینگے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سنگ مرمر کی چٹانوں پر پھسل رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ

کر میرے بستر میں گھس گئی تھی۔ پھر اس نے مدھم سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"بڑے عجیب آدمی ہو تم۔ بہت ہی عجیب آدمی ہو۔ دوپہر میں تو تمہاری زبان خوب چل رہی تھی۔ اب سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ میں کہتی ہوں کچھ منہ سے پھوٹو۔ اب کہو بڑی بڑی باتیں اس وقت کر رہے تھے۔ بولو گے نہیں؟"

میرے ہوش و حواس پر تو بجلیاں گر رہی تھیں۔ میں کہاں ہوں، کیا کر رہا ہوں، سوچ رہا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے منہ سے ایک احمقانہ آواز نکلی۔

"کیا وقت ہوا ہے؟"

وہ ایک لمحے تک خاموش رہی جیسے اپنے حواس سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر غصیلے لہجے میں بولی۔ "اب تمہارے چہرے پر کیا بجا ہے اس کا تو مجھے پتہ نہیں اور گھڑی میں کیا بجا ہے وہ ابھی میں تمہیں دیکھ کر بتاتی ہوں۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ "بارہ بج کر دس منٹ۔"

"اوہو..... اس کا مطلب ہے کہ میں زیادہ دیر نہیں سویا۔"

"کیا تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو؟" وہ غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا مطلب..... اس میں ذلیل کرنے کی کیا بات ہے؟"

"میں تو سمجھتی ہوں کہ مجھے جو ایک نگاہ دیکھ لیتا ہے اس کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور اگر کبھی اس کے دل میں یہ خیال آ جائے کہ میرا حصول اس کے لئے ممکن ہے تو پھر وہ سو ہی نہیں سکتا۔"

اس کے ان الفاظ پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کن لوگوں کی بات کر رہی ہو ڈیئر؟ رامیشر، کریم خان، جیت سنگھ۔ ان کے لئے تو تم لاٹری ہو، میرے لئے نہیں۔"

"ٹھیک۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس وقت تمہاری پتنگ چڑھی ہوئی ہے۔ اس لہجے میں بات نہیں کرو گے تو اور کس لہجے میں کرو گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں پتنگوں کی ڈور درمیان سے توڑ دیتی ہوں۔"

"گڈ..... بڑی بات ہے۔" میں نے اب اپنے حواس سنبھال لئے تھے۔

وہ بولی۔ "اب فضول باتوں میں وقت گزارو گے یا مجھے بتاؤ گے کہ تم نے مجھے کیوں

بلایا تھا؟"

یہ ایک کھلی دعوت تھی۔ بہرحال مجھے زیادہ تجربہ تو نہیں تھا لیکن اتنا میں جان چکا تھا کہ اس قسم کی عورتیں جب بگڑتی ہیں تو اتنی بگڑ جاتی ہیں کہ پھر انہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ کچھ ایسی ہی تھی۔ بظاہر اس نے اداکاری کی تھی لیکن پھر اس کی یہی کیفیت ابھر آئی تھی جو اسے وحشی بنا دیتی تھی۔ میں اس وقت اپنے اندر کے انسان سے لڑ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں اسے کمرے سے باہر نکال دوں یا پھر اشبھ بھاوناؤں کے تحت اسے بھی الیس فیوری سمجھ کر اس کے ساتھ وہی سلوک کروں۔ بہرحال ابھی میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ تھوڑی سی سنبھل گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولی۔

"اندھیرا بھی اپنی جگہ ایک الگ نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ میں سگریٹ پینا چاہتی ہوں۔"

"مگر میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"پیو۔" وہ بولی اور شاید اس نے اپنے پرس سے سگریٹ نکال لئے۔ پھر اس نے دو سگریٹ جلائے۔ سگریٹ اندھیرے میں چمک رہے تھے اور اس نے ایک سگریٹ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

"میں نے کہا نا میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"جلو۔ جلنے میں بڑا مزا آتا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"اور جلانے میں؟"

"اگر سگریٹ نہیں لو گے تو میں اس کا جلتا ہوا سرا تمہارے بازو سے لگا دوں گی۔ سمجھے؟"

"تم مجھے بیوقوف سمجھتی ہو کیا؟"

"بالکل نہیں۔ تم تو صورت سے ہی ایک عیار آدمی لگتے ہو۔ شیطان کی طرح۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔ پھر بولی۔ "میں پیاسی ہوں۔ سمجھے؟ میں پیاسی ہوں۔"

میں پھر ہنس پڑا اور بولا۔ "مجھے معاف کرنا، میں تمہیں پانی نہیں پلا سکتا۔ جگ تو تم نے شاید گرا کر توڑ دیا ہے۔ اندھیرے میں سارا پانی بکھر گیا ہوگا۔"

"تمہارا وجود جو پانی پانی ہے۔"

"غلط۔"

''کیا مطلب؟''

''فولاد کو پانی کہتی ہو۔ یہ تمہاری بے وقوفی ہے۔''

''ہائے، فولاد.....'' اس نے ایک سسکاری سی لی اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرنے لگی، پھر بولی۔ ''واقعی فولاد ہو..... اور بلاشبہ خوبصورت بھی ہو۔''

''سیٹھ آدم زمان کے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''وہ ایک ایسی لاش ہے جو ابھی اکڑی نہیں ہے مگر بے جان اور سرد ہے۔''

''وہ بہت شریف آدمی ہے۔''

''تم کچھ نہیں جانتے بیوقوف آدمی، کچھ نہیں جانتے۔ کبھی جہنم کا تصور کیا ہے؟''

''جہنم؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں جہنم۔ اور اس جہنم کا نام آدم زمان ہے۔''

''ارے نہیں، کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ وہ تو بے چارہ بالکل ہی.....''

''بس دیکھو، مجھے غصہ مت دلاؤ۔ یہ بتاؤ آخر تم پول کے کنارے کیبن تک کیسے گئے تھے؟''

''بس اتفاق تھا، تم نظر آ گئیں۔''

''جھوٹ۔''

''کیوں؟''

''تم نے میرا پیچھا کیا تھا۔''

''میں کہتا ہوں آخر یہ تصور بار بار تمہارے ذہن میں کیوں ابھرتا ہے؟''

''جانتے ہو یہ تصور کب سے میرے ذہن میں ہے؟''

''نہیں جانتا۔ بتا دو۔''

''اس وقت سے جب تم لفٹ میں مجھ سے ٹکرائے تھے۔''

''ارے واہ، کمال کرتی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے میں جان بوجھ کر تم سے لفٹ میں ٹکرایا تھا؟ کیا مجھے یہ بات معلوم تھی کہ لفٹ میں تم موجود ہو؟ میں تو جلد بازی میں جانا چاہتا تھا۔''

''چلو یہ بات مان لیتی ہوں۔ لیکن اس کے بعد تمہاری جو کیفیت تھی کیا تم سمجھتے ہو مجھے اس کا اندازہ نہیں؟''

''اب تم زبردستی کر رہی ہو تو میں تم سے کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''نہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم سچ بولو۔''

''سچ؟''

''ہاں۔''

''کیا واقعی ہم دونوں ایک دوسرے سے سچ بول سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ مگر پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے۔''

''میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ایک بات تو بالکل طے ہے۔''

''کیا؟''

''تمہارا تعلق کسٹم سے نہیں ہے۔''

''اچھا..... آگے بولو۔''

''اور یقینی طور پر تم کوئی بگڑے ہوئے رئیس زادے ہو۔''

''رئیس زادے کی بات تم نے کیوں کہی؟''

''وجہ ہے اس کی۔''

''کیا؟''

''تمہارے ہاتھ۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ میرا تجربہ ہے۔ زندگی بھر کا تجربہ۔ تم نے ان ہاتھوں سے مشقت کبھی نہیں کی۔ میرا مطلب ہے وہ مشقت جو عام لوگ کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ تمہارا بدن انتہائی سڈول اور بہت خوبصورت ہے، اس بات کو میں دل سے تسلیم کرتی ہوں۔'' اس کے ہاتھ مسلسل اپنی بات کی تصدیق کر رہے تھے۔

''کیبن میں تو تم بہت پارسا بن رہی تھیں۔''

''گالیاں دینا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''میں پارسا ہوں لیکن انسان بھی تو ہوں۔''

''یہ کس طرح کی پارسائی ہے جو انسانیت سے ہم آغوش ہو گئی ہے۔''

""بوڑھی لاش کو دیکھا ہے تم نے؟""

""آدم زمان؟""

""کیوں بار بار اس کا نام لیتے ہو اس وقت۔""

""اس وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟""

""یہ لمحات سمندر کے چڑھاؤ کے لمحات ہیں۔ مدوجزر ہو رہا ہے۔ چاند چڑھ چکا ہے، لہریں آسمان کی جانب لپک رہی ہیں اور تم ایسی سرد گفتگو کر رہے ہو۔ آخر تمہاری گفتگو میں گرمی کیوں نہیں آتی؟""

""بات آدم زمان کی ہو رہی تھی۔""

""بکتے رہو...... بہت ہی مردود انسان ہو۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ ضدی، خودسر۔ بڑی خوبصورتی سے تم اپنی بات چھپا گئے۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا واقعی تم ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے نہیں ہو؟""

""فرض کرو ہوں۔""

""مگر ایک تجربے کی بات اور کہوں؟""

""کہو۔""

""ناتجربے کار ہو۔""

""کس سلسلے میں؟""

""عورت کے سلسلے میں۔ کیا تمہاری زندگی میں بہت سی عورتیں آئی ہیں؟""

اس کے اس سوال پر میرا ذہن ایک لمحے کے لئے بھٹک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس سوال نے مجھ پر ایک عجیب سی نشہ آور بارش کر دی ہو۔ اور پھر میں ریورس ہونے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا پورا بدن ہوا میں بلند ہو رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے اور میں کچھ سن رہا ہوں لیکن اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میں تو فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ایک کمرہ نظر آیا جس میں ایلس فیوری میرے سامنے تھی اور میں زندگی کے وہ راستے طے کر رہا تھا جن سے میں نے ہمیشہ گریز کیا تھا...... ان ویرانوں میں سیاہ رنگ کا ایک مندر چمک رہا تھا اور کچھ آوازیں بھی ابھر رہی تھیں میرے اردگرد۔ میں نے سامنے نگاہ ڈالی تو مجھے بہت سے لوگ اپنے سامنے سجدہ ریز نظر آئے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ وہ سب کے سب سجدے میں گرے ہوئے تھے اور میں ایک اونچے پتھر پر کھڑا

ہوا تھا۔ میں نے ان پر نگاہ ڈالی، پھر میری نظر ایک جانب اٹھ گئی۔ صرف ایک شخصیت ایسی تھی جو ان سجدہ ریز لوگوں سے الگ ہٹ کر نظر آ رہی تھی۔ اس کی پشت اس طرف تھی اور منہ دوسری طرف۔ تھوڑی سی حیرت ہوئی، یہ کون ہے؟ کیا ہے یہ؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

آہستہ آہستہ اس شخصیت کا رخ بدلا۔ چاندنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے چاند سے ایک شعاع نکل کر اس کے چہرے کو منور کر رہی ہو۔ اور یہ چہرہ...... غیض و غضب میں ڈوبا ہوا یہ چہرہ، میں نے اسے ایک لمحے کے اندر پہچان لیا تھا۔ یہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میرے خدا...... میرے خدا، یہ کلاڈیا تھی۔ کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا جس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس نے اپنے جسم کا بھی رخ تبدیل کیا اور اٹھ کر ان سجدہ ریز لوگوں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ بدستور سجدے میں تھے۔ وہ ان کے درمیان سے ہوتی ہوئی چند قدم آگے بڑھی لیکن پیچھے کسی اور وجود نے اسے آواز دی اور پھر ایک سفید جسم نمودار ہوا۔ سفید میں اسے اس لئے کہہ سکتا تھا کہ وہ بہت ہی براق قسم کی چادر اوڑھے ہوئے تھا جس سے ہلکی ہلکی نیلی روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے کلاڈیا کا بازو پکڑ لیا۔ کلاڈیا نے گھوم کر اسے دیکھا تو مجھے دوسرا چہرہ نظر آیا اور یہ دوسرا چہرہ میری ماں کا تھا۔ میری ماں جو میری جانب متوجہ نہیں تھی۔ اس نے کلاڈیا کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے گئی۔

دفعتہً ہی مجھے یوں لگا جیسے میں خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا ہوں۔ اس بدبخت عورت نے ایک ایسا ہی عمل کیا تھا کہ مجھے چونکنا پڑا اور میں ہوش و حواس میں واپس آ گیا۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک عجیب و غریب کیفیت تھی اس کی۔ اور اس کیفیت نے مجھے بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ آہ...... میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ایک عورت کو میں نے اتنا بے باک کس طرح دیکھا۔ کیا بتاؤں میں۔

بہرحال جو کچھ ہوا اس میں اس وقت میری قوتِ ارادی کو دخل نہیں تھا۔ بس وقت مجھے اپنے دھارے پر بہا رہا تھا۔ وہ بدبختی اور بدنصیبی جس نے میرے وجود کے گرد احاطہ کر لیا تھا، مجھے برائیوں کے غار میں گہرے سے گہرا پھینکتی جا رہی تھی۔ اور نجانے کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ میں جب ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آیا تو بدبخت عالیہ

زمان کا چہرہ میرے بالوں بھرے سینے پر ٹکا ہوا تھا اور وہ گہری گہری بدمست سانسیں لے رہی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ عالیہ کی جذبات میں ڈوبی سانسیں آہستہ آہستہ معتدل ہوتی چلی گئیں۔ پھر وہ ایک دم ہنس پڑی۔ میں نے اس سے اس کی ہنسی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ خود ہی بولی۔

"تم واقعی محبوب نہیں محبوبہ ہو۔"

اس کے ان الفاظ میں کتنا طنز چھپا ہوا تھا، میں نے اسے محسوس کیا۔ وہ شاید میرے جواب کا انتظار کرتی رہی، پھر بولی۔ "لیکن میں تمہیں محبوب بنا کر چھوڑوں گی سمجھے۔ سیٹھ آدم زمان کے بارے میں پوچھ رہے تھے، میں تمہیں بتاؤں، میں زندگی کو حسین دیکھنا چاہتی ہوں۔ حسین سے حسین تر۔ کیونکہ میں خود حسن و جمال کی دیوی ہوں۔ تم اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکو گے اگر ان لمحات کا ایک ہزارواں حصہ بھی تمہارے ہوش سے گزرتا ہے۔ مگر میرے پاس ایسے وسائل نہیں تھے۔ پہلی محبت میں نے اس سے کی تھی جو ایک سرکس میں ملازمت کرتا تھا۔ شیروں کو کنٹرول کرتا تھا وہ۔ سرکس دیکھنے گئی تھی میں۔ اتنی کمسن تھی کہ سرکس میں شیروں کو سدھانے والے کی گرویدہ ہو گئی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ وہ معمولی سا آدمی ہے۔ مگر میں نے اسے حاصل کرنا چاہا اور دیوانوں کے انداز میں اسے حاصل کر لیا۔ اس کے بعد جب مجھے اس کا احساس ہوا کہ زندگی اس قدر گھٹیا چیز نہیں ہے کہ اسے صرف اپنی خواہشوں پر قربان کر دیا جائے۔ زندگی کے لئے کچھ ایسا چاہئے جو خوبصورت ہو اور تجربے نے یہ بات بتائی کہ زیادہ عمر کے لوگ بہت اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔ کم از کم مالی حد تک۔ اور اس کے لئے میں نے آدم زمان کی جانب قدم بڑھائے اور آخر کار میں اس کی بیوی بن گئی۔ سیدھا سادھا کاروباری جوا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ آدم زمان ایک عمر رسیدہ آدمی ہے اور ابتدا بھی میں نے اسی لئے کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دو چار سال میں وہ چل بسے گا اور میں کروڑوں کی مالک بن جاؤں گی۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے آدم زمان زندگی سے بری طرح چپکا ہوا ہے۔ وہ بہت بڑا کاروباری ہے اور ہمیشہ کاروبار کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا تم اس بات پر یقین کرتے ہو کہ وہ بس ایک بھرپور زندگی گزارنا چاہتا ہے اور اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ میرے اپنے معمولات کیا ہیں۔ تم میری بات سمجھ گئے؟ وہ صرف دولت چاہتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ۔ اور اس پر اگر میں اس کے کام آ جاؤں تو وہ اسے اچ

سمجھتا ہے۔ برا نہیں سمجھتا۔ اب چلتی ہوں۔ تم بھی سمجھ گئے ہو گے اور میں بھی تمہیں سمجھ گئی ہوں۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو، اب تمہارے بغیر میں بالکل ناکارہ ہو جاؤں گی۔ وجہ جانتے ہو؟ وجہ بس یہ ہے کہ تم سب سے منفرد ہو۔"

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں برائیوں سے بچنا چاہتا تھا لیکن میرے وجود میں کوئی ایسا منحوس وجود حلول کر گیا تھا جو مجھے ان برائیوں سے بچنے نہیں دیتا تھا۔

آخر کار ایک دن اس کہانی کا بھی ڈراپ سین ہو ہی گیا۔ اس دوران عالیہ اکثر میرے کمرے میں آ جاتی تھی۔ ایک دن کے بعد وہ لوگ یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے اور انہوں نے مجھے بہت پہلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میاں بیوی بھرپور طریقے سے تیاریاں کر رہے تھے۔ اس دن بھی وہ کافی دیر سے ہوٹل پہنچے کیونکہ رات کو جس وقت عالیہ میرے کمرے کے کھلے دروازے کو بند کرتی ہوئی میرے قریب آئی تو اس وقت ایک بج رہا تھا۔ اس دن وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اب یہ تو میں پورے اعتماد سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی میرے لئے جذباتی تھی یا پھر مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اس کے بعد ہم دونوں جدا ہو جائیں گے۔ آہ، کاش میں کوئی بڑی جادوگرنی ہوتی تو تمہیں مکھی بنا کر اپنے ساتھ رکھ لیتی اور پھر جادو منتر پڑھ کر تم پر پھونکتی اور تم انسان بن جاتے۔ کچھ بولو گے نہیں؟"

"کیا بولوں؟"

"کچھ تو کہو۔"

"یورپ کتنے عرصے قیام رہے گا؟"

"میں کیا جانوں؟ ویسے میں یورپ، امریکہ، مشرق وسطیٰ نجانے کہاں کہاں گھوم آئی ہوں، سب کچھ دیکھا ہے میں نے۔ کیا تمہیں کمرے میں گھٹن نہیں محسوس ہو رہی؟"

"نہیں، کیوں خیریت؟"

"آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ کوئی ایسی انوکھی یادگار اپنے ساتھ لے جاؤں جو مجھے تمہاری یاد دلاتی رہے۔ آؤ، چھت پر چلتے ہیں۔"

"ارے اس میں کیا انوکھا پن ہو گا؟"

"ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔ ضد مت کرو۔"

''مگر میری بات تو سنو۔''

''کمال ہے، کل میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گی اور تم میری ا بات بھی نہیں مانتے۔ میں تمہاری بے شمار قربتیں حاصل کر چکی ہوں۔ کچھ تبدیلی چاہ ہوں۔ آؤ، چھت پر بالکل سناٹا ہو گا۔ باہر ہوا بھی بہت اچھی چل رہی ہے۔ بہت ا لگے گا۔''

''سنو تو سہی عالیہ! کسی نے ہمیں سیڑھیوں پر یا کوریڈور میں دیکھ لیا تو کیا مصیب نہیں آ جائے گی؟''

''کوئی نہیں دیکھے گا۔ بس جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔''

''دیکھو...... ایسا کوئی عمل مت کرو جو سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دے۔ کسی ہمارے تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تم آخری وقت میں کیوں بھانڈا پھو چاہتی ہو؟''

اس نے غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس بات کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھ کہ وہ ٹھیک ٹھاک نشے میں ہے لیکن کمبخت نشے کے عالم میں ایسی کوئی حرکت کر ڈالے گ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔

''بزدل ہو تم...... بزدل ہو۔ بیوقوف تو تم خیر ہو ہی، لیکن اس قدر بزدلی مجھے ناپسند ہے۔ میں نے اب تک تمہاری ہر طرح سے تعریفیں کی ہیں۔ لیکن میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں بزدل نہیں ہوں اور مجھے بزدلی پسند نہیں ہے۔''

''خدا کے واسطے آہستہ بولو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''بس یہ کہ اوپر چلو۔''

''او کے...... او کے...... چلو۔'' میں نے انتظام کیا اور ہم اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ جب ہم دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر کی منزل پر پہنچے تو دیکھا چھت پر جانے والے دروازے پر لوہے کا جنگلا لگا ہوا ہے اور اس میں تالا لگا ہوا ہے۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس ضدی عورت کے کہنے پر میں یہاں تک آ تو گیا تھا لیکن ظاہر ہے تالہ توڑ کر ہم چھت پر جانے سے رہے۔ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''سنو، ہم چھت پر ضرور جائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''ارے بابا مگر کیسے؟ یہاں تو تالہ پڑا ہوا ہے۔''

''ہم فائر اسکیپ سے جائیں گے۔'' عالیہ نے ضدی لہجے میں کہا۔ بلڈنگ کے پیچھے کی سمت ہنگامی صورت میں استعمال کے لئے لوہے کی جو چکردار سیڑھیاں بنائی گئی تھیں وہ ان کے ذریعے چھت پر جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

''تم میری بات تو سنو۔ کیوں یہ خطرہ مول لے رہی ہو؟''

''خطرات ہی تو زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں کیا سمجھے؟ ارے میں کہتی ہوں تم کیوں میرے جذبات کو زخمی کر رہے ہو۔ آؤ...... چلتے ہیں۔''

میں کافی الجھ گیا تھا۔ بزدلی تو خیر کیا تھی، مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر عمارت کے پیچھے سے کسی نے ہمیں ان چکردار سیڑھیوں سے چھت پر جاتے دیکھ لیا تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ دیکھنے والا پتہ نہیں کیا سمجھے۔ ہو سکتا ہے کہ چور ہی سمجھ لے۔ لیکن وہ کمبخت میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ یہاں تک کہ مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور جو شخص عورت کی کسی نامعقول خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دے اسے بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔

''آؤ بابا، آؤ۔ نیچے چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کمرے میں جا کر ہمیں اپنے کمرے کے پچھلے دروازے سے باہر جانا ہو گا اور یہیں سے ہم فائر اسکیپ کے ذریعے چھت پر پہنچ سکتے ہیں۔''

''آؤ'' اس نے کہا اور ہم واپس کمرے میں آ گئے۔ پھر وہی ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر میں پچھلے حصے سے فائر اسکیپ کے ذریعے اس کے ساتھ چھت پر پہنچ گیا۔ عالیہ زمان کی ضد سے میں اس وقت خاصا بیزار ہو رہا تھا مگر اس کو دل نوازی کا فن آتا تھا اور اس نے خوب دل نوازیاں کیں۔ وہ ایک دہکتا ہوا الاؤ بنی ہوئی تھی۔ عجب نہیں تھا کہ اس رات سمندر کی بھیگی ہواؤں میں ہم ستاروں کے غائب ہونے تک جلتے رہتے کہ وقت نے کروٹ بدلی۔ میں نے چکردار زینے سے ایک سایہ ابھرتے دیکھا اور میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ عالیہ نے جیسے آگ کی لپٹوں میں راستہ ڈھونڈتے ہوئے مجھے آواز دی۔ اس کی نشے میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''خاقان! کہاں چلے گئے؟''

''خاموش رہو۔ کوئی آ رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا مگر اس پر دیوانگی طاری تھی۔ کہنے لگی۔

''آنے دو...... ہمیں کیا؟''

''خاموش رہو پلیز۔'' میں نے پھر کہا۔ چونکہ قدموں کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ چھت
ہم پانی کی ٹینکی کے قریب تھے۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور ٹینکی کی آڑ میں
دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے جھول رہی تھی۔ ایک بار پھر اس نے نیم واسی آواز میں کہا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ پلیز۔'' وہ اپنے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

''میں کہتا ہوں خاموش رہو۔ وہ اوپر آ چکا ہے اور ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔'' میں نے
بات غلط نہیں کی تھی۔ آنے والا ہوٹل کی وسیع و عریض چھت پر واقعی ہمیں ہی تلاش کر رہا
تھا۔ عالیہ اپنی پشت پر چپکے ہوئے کنکر چھڑانے لگی۔ میں نے اس کا گاؤن اس کی طرف
پھینکا۔ اچانک ہی ایک سردی کی لہر میرے سارے وجود میں پھیل گئی تھی۔ ہم دونوں ٹینکی
کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے مگر اس قسم کے بے شمار نشانات موجود تھے جو کسی بھی آنے
والے کو ہماری یہاں موجودگی کا پتہ دے سکتے تھے۔ ابھی تک آنے والے نے ان
نشانات پر نگاہ نہیں کی تھی۔ وہ چھت پر بنی چمنیوں اور ٹینکیوں کی آڑ لیتا ہوا ہم سے قریب
ہوتا جا رہا تھا۔ اور جب اس کے پاؤں نظر آنے لگے تو عالیہ کو بھی شاید خطرے کا احساس
ہوا۔ وہ گٹھڑی سی بنی بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا۔ شاید
اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ نہ نکل جائے۔

پھر آنے والے کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور اس کے منہ سے ایک گندی سی گالی نکل گئی۔
میں نے ہلکی سی روشنی میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں موٹر کا لمبا پانا دبا ہوا تھا۔ پالش کی
ہوئی دھات چاندنی میں چمک رہی تھی اور مجھے ایک لمحے کے اندر یہ اندازہ ہو گیا کہ اب
کام ہونے ہی والا ہے۔ وہ اور دو چار قدم آگے آتا تو ہم اسے نظر آ جاتے۔ چنانچہ اب
اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اس سے جنگ کا آغاز کر دیا جائے۔ چنانچہ میں
نے بجلی کی سی تیزی سے یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلا وار مجھے کرنا چاہئے۔ کیونکہ میں نہتا ہوں۔
میں ٹینکی کی آڑ سے نکلا اور جھپٹ کر اس کے چہرے پر بھرپور گھونسا مارا۔ اس کے حلق
سے چیخ کی آواز نکلی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب جا پڑا۔ ابھی تک اس نے عالیہ کو نہیں
دیکھا تھا۔ مگر ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ یہ کریم خان ہی تھا۔ وہ اس وقت پوری
وردی میں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آدم زمان کے تین باڈی گارڈوں میں سے ایک ہر وقت ان
کی کار پر ڈیوٹی دیتا رہتا ہے اور اس کی کار ہوٹل کے عقبی حصے میں ہر وقت تیار ہوتی

ہے۔ ہو سکتا ہے کریم خان نے مجھے اور عالیہ کو فائر اسکیپ پر چڑھتے دیکھ لیا ہو۔ اتنے
فاصلے سے ہمیں پہچاننا تو ممکن نہیں تھا مگر اس کو چہرے کے رخ کا علم تھا۔ پھر لڑکی کے
کھلے ہوئے بال ہوا میں لہراتے دیکھ کر پوری بات سمجھ لینا کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی۔
بہر حال گھونسا کھا کر وہ گر پڑا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ بھی
فولادی جسم کا مالک اور شاندار جنگجو تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بدن کی پوری قوت استعمال
کی اور پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فولادی پانا تولتے ہوئے میری طرف قدم
بڑھائے اور اس کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

''عالیہ زمان کہاں ہے...... بتا وہ کہاں ہے؟''

میں نے دیکھا کہ اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اگر میں پیچھے ہٹتا ہوں تو شاید وہ
عالیہ کو دیکھ لے۔ اس لئے میں اس کے دائیں ہاتھ کھلی چھت پر آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔
میں نے سوچا کہ کاش عالیہ کی سمجھ میں یہ بات آ جائے اور وہ فائر اسکیپ سے خاموشی
کے ساتھ نیچے اتر جائے تو پھر اس حرام زادے سے میں اچھی طرح نمٹ لوں گا۔ میں
دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے اس کے دائیں طرف نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہا
تھا۔ اچانک ہی وہ گھوما اور اس نے پوری طاقت سے مجھ پر وار کیا۔ اگر میں بروقت بیٹھ
نہ جاتا تو یہ وزنی پانا میرے سر کو بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا۔ فولادی پانا میرے سر
سے تقریباً دو انچ کے فاصلے سے سنسناتا ہوا گزرا۔ میں نے بیٹھنے کے ساتھ ہی زمین پر
ٹک کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ایک لات ماری اور میرا یہ وار بھی بڑا کارگر
ثابت ہوا۔ وہ گر گیا۔ ویسے میں اس بات کا تذکرہ ضرور کروں گا کہ یہ ایک عام ضرب
نہیں تھی بلکہ فٹ بال کھیلنے والے کی کک تھی۔ پانا اس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ میرے
لئے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا۔ میں اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس وقت میری
دلی خواہش تھی کہ عالیہ فائر اسکیپ سے نیچے اتر جائے۔ کون اسے سمجھائے۔ مگر مجھے
سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ واقعی ایک ذہین عورت تھی۔ میں نے کریم خان
کے لہولہان چہرے پر گھونسے برساتے ہوئے ایک لمحے کے لئے گھوم کر دیکھا تو عالیہ برق
رفتاری سے فائر اسکیپ کے آہنی پنجرے میں اتر رہی تھی۔ میرا دل خوش ہو گیا۔ بہر حال
مجھے امید تھی کہ اب وہ با آسانی نیچے پہنچ جائے گی۔ ہوٹل میں داخل ہونے کا ایک ہی
راستہ تھا۔ میرے کمرے کا پچھلا دروازہ۔ اور تمام دروازے اس وقت بند تھے۔ میرے

کمرے میں پہنچ کر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں پہنچ سکتی ہے۔ اور ایک بار
اپنے کمرے میں پہنچ جائے پھر سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر میرا مڑ کر دیکھنا غضب ہو
گیا۔ کریم خان نے بھی اسے فائر اسکیپ سے نیچے اترتے دیکھ لیا۔ ویسے کریم خان مجھ
سے زیادہ نہیں تو برابر کا ضرور ہو گا۔ اس نے پوری قوت لگا کر مجھے گرایا اور چیختا ہوا دوڑا
''مار ڈالوں گا تجھے کتیا کی بچی، میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگا
نجانے اس پر کیا دیوانگی سوار تھی۔ غالباً یہ رقابت کا جذبہ تھا۔ ادھر عالیہ کی جو کیفیت تھی
اس سے مجھے ڈر تھا کہ کہیں فائر اسکیپ کی سیڑھیوں سے اس کا پیر نہ پھسل جائے۔ وہ
بڑے بے ڈھنگے پن سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں نے پھرتی سے کریم خان پر چھلانگ
لگائی۔ وہ فائر اسکیپ سے اترنے کے بعد جھکا ہی تھا کہ میں نے اسے پیچھے سے جا پکڑا
اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا ایک کٹ مارا اور
مجھے یوں لگا جیسے میرے رخسار کی ہڈی گوشت پھاڑ کر باہر آ گئی ہو۔ میں نے ہوا میں
ہاتھ گھمایا، وہ پیچھے ہٹا۔ وہ مجھ سے اب دو دو ہاتھ کرنے پر تل گیا تھا۔ ممکن ہے پہلے سے
اس کے ذہن میں کسی طرح کا شبہ رہا ہو۔ لیکن اب تو عالیہ کو اس نے اپنی آنکھوں سے
فائر اسکیپ سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

ہم دونوں چھت کے سرے پر پہنچ گئے۔ زیادہ سے زیادہ چھ انچ کی منڈیر ہو گی جس
پر کریم خان اب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے یونیفارم کی آستین سے ہونٹوں پر لگا ہوا خون
پونچھا اور گالی دے کر مجھ پر جھپٹا ہی تھا کہ میں نے اس کے پیٹ پر سیدھے پیر کا ایک
کک رسید کیا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا اور پیچھے کی طرف گرا۔ مگر پیچھے کچھ نہیں تھا۔
محض خلا تھا اور موت...... دہشت کی لہر مجھے کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ کریم خان کی بھیانک چیخ
ابھری۔ اس نے ہوا میں دونوں ہاتھ پاؤں چلائے جیسے کسی چیز کو پکڑ کر لٹک جانا چاہتا
ہو۔ اس کے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھے ہوئے تھے اور پیر یوں چل رہے تھے جیسے کوئی
مستی میں ناچ رہا ہو۔ خداوند...... یہی وہ تصویر تھی جو اس ہوٹل میں آتے ہوئے میں نے
بھوج پتر پر دیکھی تھی۔ ایک رقص کرتا ہوا وردی پوش۔ پلک جھپکتے میں یہ تصویر بنی اور مٹ
گئی۔ زمین کی طرف جاتے ہوئے وہ کسی چھجے سے ٹکرایا ہو گا۔ کیونکہ میں نے ایک
دھماکہ سنا اور اس کے بعد اس کی آخر چیخ۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد لوگوں کے پکارنے
اور دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کمروں میں روشنیاں ہونے لگیں۔

''چور...... چور...... چور...... کیا ہوا؟ کون تھا؟ کون اوپر سے گرا ہے؟ دیکھنا......
دوڑنا......'' یہ آوازیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں اور میرے لئے ہر لمحہ قیمتی تھا۔ میں
دیوانوں کی طرح چکر دار زینوں پر پیر مارتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ کریم خان جہاں گرا تھا وہ
جگہ یہاں سے نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ جگہ بالکل نیچے تھی۔ بہت سے سایوں کو ایک خاص
سمت میں جمع ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی اور وہ زمین پر
روشنی ڈالتا ہوا کسی کو زور زور سے پکار رہا تھا۔ میرے خدا، اگر اس نے ایک بار بھی اپنی
ٹارچ کا رخ اوپر کی طرف کر دیا تو میں مارا جاؤں گا۔ ابھی مجھے ایک منزل اور اترنا ہے۔
چند سیڑھیاں اور ہیں، اس کے بعد میں چوتھی منزل تک پہنچ جاؤں گا اور اپنی منزل کی
پچھلی گیلری میں کسی نے مجھے دیکھ بھی لیا تو میں کہہ دوں گا کہ میں خود شور سن کر اپنے
کمرے سے نکل آیا ہوں۔ مگر یہاں کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔

میرا دم نکلا جا رہا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اب وہ چند سیڑھیاں عبور کرنا میرے اختیار
میں نہ تھا۔ چوتھی منزل کی پچھلی گیلری میں چکر دار سیڑھیوں کی ریلنگ پر کوئی شخص کھڑا تھا
اور نیچے جھانک رہا تھا۔ میں اسے پہچان نہیں سکا۔ وہ شاید میرے برابر کے کمرے والا تھا
اور شور سن کر اپنے کمرے کا پچھلا دروازہ کھول کر گیلری میں آ گیا تھا۔ مجھے اپنے کمرے
میں جانے کے لئے اس کے قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا اور وہ سوچتا کہ میں اوپر سے
کیوں اتر رہا ہوں؟

میں دم سادھے کھڑا رہا۔ میں پانچویں اور چوتھی منزل کے درمیان معلق تھا۔ نیچے بھیڑ
بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی نے کہا۔

''پولیس کو بلاؤ...... پولیس کو۔''

دوسری آواز آئی۔ ''ارے کوئی ڈاکٹر ہے یہاں؟''

''ڈاکٹر...... ڈاکٹر کیا کرے گا؟''

''کیوں؟''

''یہ مر چکا ہے۔'' کسی نے کہا اور میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا لہرانے
لگا۔ بہرحال میں خاموشی سے سیڑھیوں پر جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ آواز پھر آئی۔

''یہ گرا کہاں سے ہے؟'' اس آواز میں ایک کرختگی، ایک فوجی پن تھا۔ یہ شاید ہوٹل
کے بے شمار چوکیداروں میں سے کوئی چوکیدار تھا۔ عموماً اچھے ہوٹلوں میں ریٹائرڈ فوجیوں کو

جگہ دی جاتی ہے۔ یہ ذہن بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ کارکردگی کے مالک بھی۔ ایسی صورت میں دیکھا جا سکتا تھا کہ اوپر سے کس جگہ سے وہ گرا ہے۔ کسی نے فوراً کہا۔

''ادھر اوپر سے۔''

میں نے دو سیڑھیوں کی درمیانی درز سے دیکھا، ٹارچ والا اور دوسرا سایہ اس سایہ سے نکل کر باہر آئے تھے جس کی وجہ سے میں کریم خان کی لاش نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ٹارچ والے نے اوپر کی طرف ٹارچ چمکائی اور پھر اس کی آواز اُبھری۔ ''ٹھہرو۔ ادھر دیکھو، وہ کون ہے؟''

''کدھر؟''

''چوتھی منزل پر۔'' چوکیدار کی آواز ہتھوڑے کی مانند پڑی۔ میں نے سوچا کہ اب چھپنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں پکڑا گیا۔ ٹارچ والے نے چوتھی منزل پر روشنی گھمائی۔ یہ ہمسایہ ابھی تک ریلنگ پر جھکا ہوا تھا اس نے نیچے والوں سے پکار کر کہا۔

''ارے نیچے کھڑے ہوئے کیا باتیں کر رہے ہو۔ چھت پر دیکھو، چھت پر اس کے اور بھی ساتھی ہوں گے۔''

میں نے دو تین آدمیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ ٹارچ والے نے ٹارچ بجھا دی تھی چوتھی منزل پر اسے جو سایہ نظر آیا تھا وہ میرا پڑوسی تھا۔ ہوٹل کا معزز مہمان۔ چوکیدار نے بڑے ادب سے کہا۔

''سر! آپ اپنے کمرے میں جائیں، ہم دیکھتے ہیں۔''

میرے پڑوسی نے زیرِ لب کچھ کہا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ کیونکہ میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ نیچے چوکیدار اپنی فوج جمع کر رہا تھا اور ٹارچ والا اب نیچے سے ہٹ گیا تھا مگر ان کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ یہی موقع ہے۔ میں نے سوچا۔ منٹ بھر میں وہ چھت پر جانے کے لئے فائر اسکیپ پر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ میں بے آواز قدم رکھتا ہوا یہ چند سیڑھیاں اتر کر اپنی گیلری میں آ گیا اور پھر یہاں سے اپنے کمرے کی محفوظ چار دیواری میں پہنچنا لمحے بھر کی بات تھی۔ یہ خطرہ میں نے خطرے کے بالکل سر پر پہنچ جانے کے بعد مول لیا تھا۔ لیکن بہرحال اس وقت تقدیر ساتھ دے رہی تھی چنانچہ میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں آنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور سانس روکے فائر اسکیپ پر چڑھنے والے قدموں کی آوازیں سننے لگا۔

میں نے سوچا کہ ابھی روشنی نہ جلاؤں۔ چوکیداروں کی فوج چوتھی منزل پر پہنچے گی تو ان کے قدموں کے شور سے جیسے میری آنکھ کھل جائے گی اور میں روشنی جلا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ فائر اسکیپ پر یہ دھاچوکڑی کیسی مچی ہوئی ہے۔ ایک لمحے کے اندر میں نے پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ خطرہ فوری طور پر ٹل گیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری رخسار کی ہڈی سلگ رہی ہے اور سلیپنگ سوٹ کے کالر پر کچھ چپچپاہٹ سی ہے۔ میں دروازے سے ہٹ کر سیدھا غسل خانے میں پہنچا۔ روشنی جلا کر سیدھا آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو دیکھا کہ بائیں آنکھ کے نیچے رخسار کا گوشت پھٹ گیا ہے۔ تقریباً ایک انچ کا زخم تھا۔ خون زیادہ نہیں بہا تھا مگر گال سوجنے لگا تھا۔ میں نے شیونگ کے سامان میں سے آفٹر شیو نکالا اور پھر زخم پر ہلکا ہلکا اسپرے کرنے لگا۔ میرے زخم پر اتنی شدید جلن ہوئی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن خون رسنا بند ہو گیا تھا۔ پھر میں نے تھوڑا سا پاؤڈر لگا کر شب خوابی کے کپڑے غسل خانے میں اتار پھینکے اور کمرے میں آ کر روشنی جلا لی۔

باہر کوریڈور میں کھلنے والا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے چٹخنی چڑھا دی۔

ہم اوپر جاتے ہوئے ایک کمبل اور دو تکیے لے گئے تھے۔ عالیہ نے کمرے سے جاتے ہوئے میرا کمبل اور تکیہ قالین پر پھینک دیا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔ بہرحال میں اس کی حاضر دماغی کا قائل ہو گیا۔ کمال کی لڑکی تھی۔ اتنی ننھی سی عمر میں اس قدر ماہر ہو چکی تھی۔ لیکن ایک بار پھر میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ میرے خدا...... میرے خدا...... میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمبل اٹھا کر جھٹکا۔ میں ایک بار پھر اپنے گلے میں رسّی کا پھندا محسوس کرنے لگا۔ عالیہ کمبل کے ساتھ ایک تکیہ بھی اٹھا کر لائی تھی اور دوسرا تکیہ چھت پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ میں نے کمبل کو دوسری بار جھاڑا جھپٹا، تکیے کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ریشمی غلاف پر ہوٹل کا مونو گرام اور کمرے کا نمبر کڑھا ہوا تھا۔ یقیناً چھت پر پڑے تکیے پر بھی یہ نشان ہوگا اور وہ اب چھت پر پہنچ چکے ہوں گے اور تھوڑی دیر میں میرے کمرے کو گھیر لیں گے۔ اس کے بعد پولیس اسٹیشن، مقدمہ، پھانسی۔ میں نے پاگلوں کی طرح کمرے میں نظر دوڑائی۔ دوسرے تکیے کا واقعی پتہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے کہا۔

''ہو سکتا ہے عالیہ اسے اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ لیکن پھر خود ہی میں نے اس احمقانہ

خیال کو مسترد کر دیا۔ تکیہ یقیناً ابھی تک چھت پر پڑا ہوا ہے یا پھر سیڑھیوں پر رہ گیا ہے۔
مگر نہیں، سیڑھیوں پر کچھ نہیں تھا۔ میرے کمرے کا ایک تکیہ ابھی تک چھت پر ہی تھا۔
فائر اسکیپ کی سیڑھیوں پر برابر لوگ آ جا رہے تھے لیکن نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ
اگر تکیہ سیڑھیوں پر ہوتا تو اس پر ضرور میری نظر پڑتی۔ وہ یقیناً چھت پر ہی رہ گیا ہے۔
ایک بار پھر میں نے دروازے پر کان لگا کر سنا، کوئی کہہ رہا تھا۔

''پولیس آ گئی ہے...... پولیس آ گئی ہے۔''

''مگر چھت پر تو چوکیدار چڑھے ہوئے ہیں۔''

''ہاں، پولیس ان سے بھی نیچے اترنے کے لئے کہہ رہی ہے۔''

پولیس کی یہ برق رفتاری بھی میرے لئے حیران کن تھی اور واقعی پولیس جس برق
رفتاری سے کام کرتی ہے اس حساب سے دس پندرہ منٹ میں میری تلاش شروع ہو جائے
گی۔ اب ایک ہی راستہ ہے۔ صرف ایک راستہ اور وہ یہ کہ میں یہاں سے فرار ہو
جاؤں۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مایوسی سے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا کہ کیا میری تقدیر
میں یہی سب کچھ لکھا ہے کہ ایک مشکل سے چھٹکارا پاؤں تو دوسری میں گرفتار ہو جاؤں؟
اب اور کچھ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ نکل جاؤں یہاں سے۔ میں نے جلدی جلدی
سوٹ کیس کھولے اور جس قدر بھی نقد رقم اور قیمتی چیزیں میرے پاس تھیں وہ ایک بیگ
میں بھریں اور اس کے بعد وہاں سے نکل گیا۔

بمبئی جیسے زبردست شہر میں جہاں قدم قدم جیب کتروں اور چوروں سے واسطہ پڑتا
ہے، اس مال و زر اور جواہرات کو بچانا بھی ضروری تھا۔ میرے پاس اس وقت بہت بڑی
رقم تھی اور اس کے علاوہ کچھ جواہرات بھی تھے جو میں نے بڑی حفاظت سے اپنے لباس
میں محفوظ کر لئے تھے۔ ویسٹ پہننے کے بعد میں نے کپڑے پہنے اور وہ سب کاغذات
وغیرہ جن سے میری شناخت ہو سکتی تھی یا بمبئی یا اس کے بعد سیتا گڑھی یا کلکتے میں میرا
سراغ لگایا جا سکتا تھا، یہ سارے کے سارے کاغذات میں نے جیبوں میں ٹھونس لئے۔

اب مجھے یہ فکر ہوئی کہ آنکھ کے نیچے جو چوٹ آئی ہے اسے کس طرح چھپایا جائے۔
ایک سوٹ کیس میں بینڈج کا سامان موجود تھا۔ بینڈج نکال کر میں نے اپنے چہرے کی
مرمت شروع کر دی۔ خون بہنا تو بند ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد میں نے کمرے کی روشنی
جلائی اور کوریڈور میں نکل آیا۔

ہوٹل کے ملازمین تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ میں نے ہوٹل میں موجود چند
ہانوں کو دیکھا جو اس شور وغل اور ہنگامے کے بارے میں معلومات کرنے نکل آئے
ے۔ چنانچہ میں بھی انہی میں شامل ہو گیا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

''پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا۔''

''شاید کوئی چور گھس آیا ہے۔ میں نے پورٹر کی آوازیں سنی تھیں۔'' میں نے خود بھی
ہرہ کیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میں نے اپنے گال پر رومال رکھ لیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر
یں نے اس شخص کو دیکھا جو میرا پڑوسی تھا اور عقبی گیلری میں ریلنگ پر جھکا ہوا تھا۔ وہ
یرے برابر ہی آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے زور و شور سے بتانے لگا کہ کس طرح اس نے
پچھلی گیلری سے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر گرنے والے کی چیخ سنی تھی۔ یہ اگر
سچ بول رہا ہے اور اس نے عالیہ کو دیکھا ہے تو اسے بتانا چاہئے کہ وہ شخص میرے کمرے
میں داخل ہوا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

''آپ نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''ہاں۔''

''مگر وہ گیا کہاں؟''

''یہی تو نہیں معلوم ہو سکا۔'' اس نے کہا۔

''ظاہر ہے آپ فوراً ہی تو باہر نہیں نکل آئے ہوں گے۔''

''میں نے پہلے اس کی آواز سنی تھی مگر اسے دیکھا نہیں تھا۔'' اس نے آخر کار سچ اگل
دیا اور میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ ہم چار آدمی لفٹ سے اتر کر لابی میں آ گئے۔
پولیس والوں نے ابتدائی کارروائیاں شروع کر دی تھی۔ مگر ابھی تک ہوٹل سے باہر جانے
والے مہمانوں پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ میں جس قدر ممکن ہوتا یہ ہوٹل چھوڑ دیتا لیکن
میرے برابر کے کمرے والا موقع واردات پر جانا چاہتا تھا۔ وہ اتنی سی دیر میں بے تکلف
ہو گیا تھا۔ میرا بازو پکڑ کر اس نے کہا۔

''آئیے ذرا ہوٹل کے پچھلے حصے میں چلتے ہیں۔ دیکھیں تو سہی اوپر سے کون گرا ہے؟''

دل تو میرا یہ چاہ رہا تھا کہ اس گدھے کی گردن توڑ دوں مگر ظاہر ہے یہ بھی ممکن نہیں
تھا۔ اس وقت تو میری دلی خواہش تھی کہ میں دوڑتا ہوا ہوٹل کے صدر دروازے سے باہر
نکل جاؤں۔ ایک ایک منٹ ایک صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ میں نے بے زاری سے کہا

کہ مجھے لاشیں دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"آیئے تو سہی جناب! ذرا دیکھیں۔"

"بھائی! میں دل کا مریض ہوں اور کسی بھی ایسی چیز کو دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

"اوہ...... یہ بات ہے۔" اس نے کہا اور ریستوران کی طرف مڑ گیا۔ میں خود بھی وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص اب دوسروں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ روشنی ابھی تک نہیں پھیلی تھی لیکن اندازہ یہ تھا کہ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ میں نے ریستوران کے کاؤنٹر پر جا کر ڈسپرین کی گولیاں مانگیں۔ دراصل میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سوئمنگ پول کا راستہ کھلا ہے یا بند۔ اس طرف سے کمپاؤنڈ کی چھوٹی دیوار پھلانگ کر فرار ہو جانے کی آسانی موجود تھی۔ لیکن ہائے بد نصیبی، دروازہ بند تھا اور کاؤنٹر والے کے پاس درد کی گولیاں بھی نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ اب صدر دروازے سے نکلنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ مگر لابی میں وہی کتا کھڑا ہوا تھا یعنی میرا نامعقول پڑوسی۔ میں کاؤنٹر پر کچھ دیر بلاوجہ کھڑا رہا تاکہ یہ لوگ لابی سے ہٹ جائیں تب میں ہوٹل سے باہر نکلوں۔

اچانک ہی میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سامنے سے ایک پولیس افسر آ رہا تھا۔ لیکن اس وقت میرے اس پڑوسی نے میرے ساتھ بہت ہی بہترین سلوک کیا۔ وہ پولیس آفیسر کے راستے میں آ گیا اور اسے غالباً اپنی معلومات کے بارے میں بتانے لگا۔ پھر وہ باتیں کرتے ہوئے اس طرف مڑ گئے جہاں سے ہوٹل کے پچھلے حصے پر راستہ جاتا تھا۔ اب موقع تھا کہ میں ان کے جاتے ہی تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ جاؤں۔ لیکن پھر مجھے خیال ہوا کہ مجھے تیزی نہیں دکھانی چاہئے ورنہ وہ لوگ بلاوجہ متوجہ ہو جائیں گے۔ میں نے اپنی رفتار ہلکی کی اور ٹہلتا ہوا صدر دروازے کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر دو تین پولیس والے اور کئی چوکیدار کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک بھدی سی شکل والے شخص کو روک رکھا تھا۔ مجھے دروازے کی طرف آتا دیکھ کر ایک پولیس والا آگے بڑھا اور میں نے سوچا کہ آئی مصیبت۔ لیکن پچھلے دنوں میں ہوٹل کے چھوٹے ملازموں کو جو بخششیں دیتا رہا تھا وہ کام آ گئیں۔ دو چوکیداروں نے مجھے پہچان کر سیلوٹ مارا اور میں ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا پولیس والے کو نظر انداز کر کے صدر دروازے سے گزر گیا۔ میں نے باہر نکلنے کے بعد ہوا میں گہری گہری سانسیں لیں۔ میرے خدا...... میرے خدا، میری

جان بچ گئی۔ آہ...... واقعی، میری جان بچ گئی۔ لیکن کیا کہا جا سکتا تھا۔ ابھی میں فٹ پاتھ تک نہیں پہنچا تھا کہ کمپاؤنڈ میں پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں اور دوسرے لمحے میں نے اپنے پیچھے تیز قدموں کی آواز سنی......

میرے پورے جسم سے جان نکل گئی۔ ایسا لگا جیسے پیروں میں آگے بڑھنے کی سکت ہی ختم ہو گئی ہو۔

آہ یہ تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ تقدیر کیسے کیسے راستوں سے گزار کر کہاں کہاں لے آتی ہے، کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی اپنے آپ کو کتنا ہی تیس مار خان سمجھ لے، تقدیر اسے انگلیوں پر نچاتی ہے۔ میں کس طرح اس وقت زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری اپنی سوچ کے سارے دروازے بند تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری تقدیر کا اگلا لمحہ کون سا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس والوں کو قاتل کے بھاگنے کا گمان پیدا ہو جائے اور اس کے بعد ظاہر ہے یا تو مجھے رُکنے کی وارننگ دی جائے گی اور اگر میرے قدم نہ رُکے تو اس کے بعد پولیس والے جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہو گا۔

میں اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا جو ایک لمحے کے اندر اندر ہونے والا تھا۔ پیچھے سیٹیاں بج رہی تھیں۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ سیٹیاں بند ہو گئیں البتہ میں کسی کار کی ہیڈ لائٹ میں نمایاں ہو گیا تھا۔ روشنیاں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ سو فیصدی پولیس کی گاڑی ہو گی جو میرے پیچھے بھاگی ہو گی۔ ابھی مجھے وارننگ ملنے والی ہے۔ مجھ سے کہا جانے والا ہے کہ رُکو۔ اگر ایک قدم بڑھایا تو گولی مار دی جائے گی۔ لیکن آگے بڑھنے والے قدم اس وقت تک نہیں روکے جا سکتے جب تک کہ آواز نہ آ جائے۔ چنانچہ میں آگے قدم بڑھاتا رہا۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد روشنیاں میرے قریب سے گزر گئیں۔ وہ پولیس کار نہیں بلکہ ایک پرائیویٹ گاڑی تھی جو اپنا سفر طے کرتی ہوئی اپنی منزل کی جانب چلی گئی تھی۔ لیکن قدموں کی چاپ بدستور میرے قریب آ گئی اور کوئی میرے بالکل نزدیک آ گیا۔ اور جب وہ میرے بالکل قریب پہنچا تو میرے قدم سہمے ہوئے انداز میں رُک گئے۔ تبھی ایک آواز سنائی دی۔

"سر! اگر کہیں جانا ہے تو ٹیکسی لا دوں آپ کے لئے؟" میں نے بند سانسوں کے ساتھ دیکھا، یہ سیلوٹ کرنے والے چوکیداروں میں سے ایک تھا۔ چونکہ میں ان لوگوں کو

ٹپ وغیرہ دیتا رہتا تھا اس لئے خاص طور سے یہ دو چوکیدار میری بڑی عزت کرتے
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے بالکل یوں لگا جیسے کسی نے پھانسی کا پھندا میری گ
سے اتار دیا ہو۔ میں نے اپنی چوٹ کے زخم کو اسی طرح رومال سے چھپا رکھا
بہرحال اس شخص کو جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

”نہیں میرے دوست! میرے دانت میں تکلیف ہے۔ بہت دیر سے دانت میں
ہو رہا ہے۔ ویسے بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہوٹل میں ہنگامہ ہوا تو میری نیند اور اڑ
گئی۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر باہر چہل قدمی کر لوں۔ یہاں کا ماحول بڑا پر
ہے۔ میرے دانت میں شدید درد ہے اور میں چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہو سر! کوئی دوا نہیں لی آپ نے؟“ چوکیدار ہمدردی سے بولا۔

”نہیں۔ پتہ تو نہیں تھا کہ درد دور ہو جائے گا اس طرح سے۔ خیر کوئی بات نہیں
سا ٹہلوں گا تو کچھ سکون مل جائے گا۔“

چوکیدار ہمدردی کے الفاظ کہتا ہوا سلام کر کے چلا گیا۔ میں اسی طرح فٹ پاتھ پر
ہوا صدر دروازے سے کافی دور نکل آیا تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی اور اب مجھے یہ
تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس بات کا تو مجھے پورا پورا یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے
میرا راز کھل جائے گا اور اس کے بعد پولیس سرگرمی سے میری تلاش میں مصروف
جائے گی۔ بمبئی میں اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہاں سے نکل کر کسی ہوٹل میں قیام کروں
ظاہر ہے پولیس اس بات کو بھی ذہن میں رکھے گی۔ اس وقت میرے اور پولیس
درمیان ذہانت کا مقابلہ ہے۔ جو بھی اس مقابلے میں جیت جائے۔ مجھے خود ہی اپنے
احساس پر ہنسی آ گئی۔ لیکن ہنسی کے ساتھ ساتھ ہی مجھے کسی اور کی بھی یاد آئی اور میرا
خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ ہنسی ولیم ہاروے کی تھی جو ایک مخصوص انداز میں ہنستا تھا اور
میں اس کی ہنسی پر تبصرہ کر چکا تھا۔ اس وقت ہنسی پر مجھے اس کی ہنسی یاد آئی تھی۔ اور
ولیم ہاروے یاد آیا تو دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ولیم ہاروے اس وقت بمبئی
تھا۔ اس کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز تھا اور اس کی مرمت ہو رہی تھی۔ آہ...... یہ تو بہت
شاندار بات ہے۔ ولیم ہاروے اس وقت میری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ بس اس کے علا
اور کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ میں نے اندازے سے بندرگاہ کا رخ کیا اور
شروع کر دیا۔ میں یہاں سے ٹیکسی وغیرہ کا بھی بندوبست کر سکتا تھا لیکن میں نہیں

تھا کہ فوری طور پر کسی کو یہ علم ہو کہ ہوٹل کا ایک فرد ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں سے کہاں گیا
ہے۔ حالانکہ بمبئی میرے لئے تقریباً اجنبی شہر تھا لیکن ولیم ہاروے ایک دو بار اپنے جہاز
پر لے جا چکا تھا اور اس کا جہاز جہاں کھڑا تھا اس کا راستہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔
میں اپنی تمام تر ذہانت سے کام لے کر آگے کا سفر کرتا رہا۔ سنسان جگہ دیکھتا تو رفتار
تیز کر دیتا بلکہ ایک حد تک دوڑنے لگتا۔ اِکا دُکا لوگ، آتے جاتے نظر آتے تو چہل قدمی کا
سا انداز اختیار کر لیتا۔

صبح کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ بڑی سڑک چھوڑ کر میں چھوٹی سڑکوں اور
گلیوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن بندرگاہ کے علاقے میں پہنچنے کے بعد ایسی گلیاں وغیرہ
بھی نہ نظر آ رہی تھیں۔ کشادہ سڑکوں اور بڑی عمارتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر
بھی میں نے حسب توفیق چکردار راستے اختیار کئے اور آخر کار میں ڈارک پورٹ کے
قریب پہنچ گیا۔ اب اچھی خاصی روشنی پھیل گئی تھی اور گودیوں میں کام کرنے والے رات
کی شفٹ کے مزدور سڑکوں پر آنا جانا شروع ہو گئے تھے۔ ڈارک پورٹ کے علاقے میں
ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن ولیم ہاروے کے نام پر میں اور خاص طور سے
اس جہاز کے نام پر میں وہاں سے جا سکتا تھا۔ بحریہ کے گارڈ روم سے کچھ دور میں نے
اپنی جیب سے کنگھا نکال کر اپنے بال درست کئے، رومال سے جوتوں کی گرد صاف کی
اور سگریٹ جلا کر بڑے اعتماد سے آخر کار مسلح گارڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے میں نے
بات کی تو گارڈ نے مجھے ایک نگاہ دیکھا اور اس کے بعد بولا۔

”آپ مجھے نہیں پہچانے گے سر! لیکن میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آپ کئی بار یہاں
آ چکے ہیں۔“

”ہاں! اصل میں میرا دوست ولیم ہاروے یہاں ہوتا ہے اور اس وقت مجھے اس سے
اہم کام تھا۔“ میں نے کہا۔

”جی سر! آپ جا سکتے ہیں۔“ اس نے کہا اور میں سکون کی گہری سانس لے کر ولیم
ہاروے کے جہاز کی طرف بڑھ گیا جو مرمت کے لئے خشک گودی پر کھڑا ہوا تھا۔ اس
وقت بھی جہاز پر مرمت کرنے والوں کا ہنگامہ جاری تھا۔ لیکن جہاز کے فورمین کو یہ بات
سمجھانے میں کافی وقت صرف ہو گیا کہ میں جہاز پر جانا چاہتا تھا۔ یہ فورمین ایک نیا
آدمی تھا۔ ظاہر ہے ولیم ہاروے نے ہر شخص سے میری شناسائی نہیں کرائی تھی۔ لیکن اس

سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا مجھے کہ لیفٹیننٹ ہاروے اس جہاز پر موجود ہے۔ بس میں یہی کہتا رہا کہ یہ بحریہ کا جنگی جہاز ہے اور اس پر جانا میری اہم ضرورت ہے۔ لیکن فور مین آسانی سے مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ باہر کے کسی بھی آدمی کو جہاز پر جانے کا حکم نہیں ہے۔

''تو پھر تم یوں کرو کہ لیفٹیننٹ ہاروے کو یہاں بلا دو۔''

''سوری سر! یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا اور میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ میں عام حالات میں اس شخص سے نمٹ سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ میں اس وقت کسی قسم کا جھگڑا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں اس جہاز پر پناہ لینے آیا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ یہاں میری موجودگی کا علم کم سے کم لوگوں کو ہو۔

میں نے بے بسی کی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ بحریہ کی وردی میں بہت سے انگریز افسر جہاز پر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ مگر میری بدقسمتی کہ ولیم کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ جو ادھر گشت کر رہے تھے وہ ڈارک پورٹ کے انجینئر وغیرہ تھے۔ اور سب سے زیادہ خطرہ انہی لوگوں سے تھا۔ بہرحال میں بے بسی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ فور مین عجیب ضدی آدمی تھا۔ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر وہیں منڈلانے لگا اور میں الجھنے لگا۔ یہاں زیادہ دیر تک کھڑے رہ کر بھی اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنی تھی۔ میں جانتا تھا کہ گودی پر سکیورٹی والے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے موٹر سائیکل پر گشت کرتے ہیں۔ اب جو گشتی پارٹی یہاں سے گزرے گی تو فور مین یقیناً انہیں روک کر میرا معاملہ ان کے سامنے پیش کر دے گا۔ چنانچہ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ فور مین گردن اٹھا اٹھا کر دوسری سڑک پر دیکھتا جا رہا ہے۔ لازمی بات ہے وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ حالانکہ سکیورٹی والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ کیونکہ میں لیفٹیننٹ ہاروے سے ملنے آیا تھا۔ وہ جہاز پر جا کر تصدیق کر لیتے۔ لیکن میں اس صورت میں گشتی پارٹی اور جہاز کے بہت سے لوگوں کی نظر میں آ جاتا۔ آخر کار میں نے پریشانی کے عالم میں دور موٹر سائیکلوں کی آواز سنی۔ فور مین میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور بولا۔

''صاحب! یہ لوگ آپ کی ہیلپ کر دے گا۔ میں ان کو بول دیتا ہوں۔''

میں نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا اور غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بھی تمہاری ڈیوٹی نہیں ہے۔ میں خود ان سے بات کر لوں گا۔''

''او کے سر، جیسی آپ کی مرضی۔''

اس نے کندھے اچکا کر کہا لیکن بدبخت کا بچہ وہیں کا وہیں کھڑا رہا یہ ظاہر کرنے کے لئے سکیورٹی والوں سے بات کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے۔ میں خود ہی موٹر سائیکلوں کی طرف بڑھا۔ مجبوری تھی۔ میں کسی بھی طرح اس صورتحال سے نہیں بچ سکتا تھا۔ فور مین بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جنہیں کوئی چھوٹا موٹا عہدہ بھی مل جائے تو اسے مسئلہ بنا لیتے ہیں اور دوسروں کی جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ دونوں موٹر سائیکلیں میرے پاس آ کر رک گئیں۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر جہاز کے عرشے پر نگاہ ڈالی۔ اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ اور پھر میں نے جو کچھ دیکھا اس سے مارے خوشی کے میری باچھیں کھل گئیں۔ میں نے اسی طرح سر اٹھائے اٹھائے پکار کر کہا۔

''ہیلو لیفٹیننٹ...... ہیلو ہاروے۔'' عرشے کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے ولیم ہاروے کھڑا تھا اور نیچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس شور وغوغا میں بھی اس نے میری آواز سن لی۔ اتنی صبح میرے اچانک پہنچ جانے سے اسے عجیب سی خوشی ہوئی اور مسخرے پن سے اٹینشن ہو گیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

''ہیلو لیفٹیننٹ۔'' پھر اس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بیوقوف کے بچے، نیچے کھڑے کیا کر رہے ہو؟ کم آن...... کم آن۔'' پھر اس نے جھک کر اشارہ کیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے سکیورٹی والوں کو نظر انداز کر دیا۔ اب میں اس فور مین کی طرف متوجہ تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ فوجیوں کی طرح اٹینشن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی جانب گھور کر دیکھا تو اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''سس...... سر آپ نے بتایا نہیں تھا۔ آئی ایم سوری...... آئی ایم ویری سوری۔''

ولیم ہاروے ایک مسخرہ قسم کا آدمی تھا اس نے میرے ہی کہے ہوئے الفاظ دوہرائے تھے جس سے فور مین یہ سمجھا کہ میں بھی بحریہ کا لیفٹیننٹ ہوں اور اس وقت سویلین کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''ویسے تم بہت ضدی آدمی ہو اور تم جیسے ضدی آدمی کے بارے میں سوچنا بہت ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر میں جھولتے ہوئے گیٹ وے پر ماہر ملاحوں کی طرح چلتا چلا گیا۔ سکیورٹی والوں کی موٹر سائیکلیں وہاں سے روانہ ہو چکی تھیں۔

ولیم ہاروے میری آمد سے بہت خوش ہوا تھا۔ وہ رات بھر جاگ کر کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ حالانکہ ایسے دوست میرے لئے بہت زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتے تھے لیکن بات تو یہ کہ ولیم ہاروے میرے کالج کا ساتھی تھا اور ہمارے درمیان ایک خصوصی دوستی ہو چکی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت وہ میرے لئے ایک ناخدا ہی ثابت ہوا تھا۔ ڈارک پورٹ کے انجینئروں نے چارج سنبھال لیا تھا اور ولیم اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر میرے چہرے پر چپکی ہوئی پٹی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"یہ کیا ہوا؟ خیریت؟"

"ہاں خیریت ہے۔ بس میرے دانت میں درد ہے۔"

"دانت میں درد ہے؟" ولیم حیرت سے بولا۔

"ہاں۔"

"تو یہ کیا لگایا ہوا ہے؟"

"یار! جو کچھ بھی لگایا ہوا ہے، ساری تفصیل اسی جگہ معلوم کر لو گے؟"

"نہیں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو ڈاکٹر کیسے ہو گیا؟ دانت کے درد کا ایسا علاج تو نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے پیچ در پیچ راہداریوں سے گزرتا ہوا اپنے کیبن میں پہنچ گیا۔ ولیم واقعی ان دوستوں میں سے تھا جو اپنے یار کو اپنے وجود کی طرح رکھ لیتے ہیں اور اپنے وجود میں اتار لیتے ہیں، اس کے چہرے پر ایک شکن یا زیر لب مسکراہٹ سے اس کے قلب کی کیفیت جان لیتے ہیں۔ بہرحال اس وقت ولیم ہاروے کے لئے میں جو بھی کہوں کم ہے۔ وہ بہت اچھا دوست تھا۔ کیبن کا دروازہ بند ہوتے ہی ولیم کا چہکنا بند ہو گیا اور اس کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"ہاں، آؤ بیٹھو اور مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟"

میں ولیم ہاروے کے اچانک ہی بدلے ہوئے انداز پر پریشان ہو گیا تھا۔ ابھی تک میں نے اسے کوئی بھی بات نہیں بتائی تھی۔ ویدا ہاؤس کا قصہ، اپنے کیریئر کی تباہی اس کے بعد یہ آخری کیل جو میرے تابوت میں ٹھک گئی تھی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس حد تک بتا دینا بہت ضروری تھا کیونکہ مجھے اس سے مدد لینی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہاروے! میرے دانت میں درد نہیں ہے۔"

"اس کا اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا ہے۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر تم پہلے میرے اس زخم کی ڈریسنگ کرو اور اس کے بعد مجھے ناشتہ کراؤ۔ پھر میں تمہیں اس کے بارے میں مزید تفصیل بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ولیم ہاروے نے کہا اور اس کے بعد وہ فرسٹ ایڈ بکس نکال کر میرے زخم کی بینڈیج میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اب اس کے اندر وہ کھلنڈرا پن نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک تجسس نے لے لی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ناشتے کا بندوبست بھی کر دیا اور اس دوران مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ذہن میں ایک کہانی ترتیب دے لی۔ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بھوج پتر کا ذکر میں اس سے نہیں کروں گا لیکن باقی ساری کہانی اسے سنانا ضروری تھی۔ چنانچہ ناشتے کے دوران میں نے اسے کلکتے سے بمبئی تک کی پوری داستان سنا دی۔ ولیم ہاروے کی ساری شوخی ختم ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پھیلی ہوئی تھی کیونکہ بہرحال یہ ایک مجرم کی داستان تھی۔ ولیم کے ذہن و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر جلد میری زندگی میں ایسے انقلاب آ جائیں گے۔ پھر ولیم بھی راہبوں کی زندگی نہیں گزارتا تھا۔ اس کے بھی معاملات تھے، لڑکیاں اور شراب جیسی چیزیں اس کی زندگی کا ایک حصہ تھیں خاص طور سے اس لئے بھی کہ وہ ایک یوریپین تھا۔ لیکن ایلس فیوری کا واقعہ اور اس کے بعد کریم خان کا قتل سو فیصدی یہ قتل ہی تھا۔ اگرچہ ولیم اسے حادثہ کہہ رہا تھا لیکن بہرحال یہ باتیں ایسی تھیں کہ ولیم بہت دیر تک سناٹے میں رہا۔ مجھے اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔ اگر اپنی ملازمت کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے اس نے مجھے جہاز پر پناہ دینے سے پرہیز کیا تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اور آخری فیصلہ میں نے یہی کیا کہ اس سلسلے میں، میں اپنے دوست کو بہت زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ ایک ایسے مجرم کو جس کو اس وقت بمبئی کی پولیس پوری تندہی سے تلاش کر رہی ہو گی۔ اگر وہ پناہ نہیں دینا چاہتا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اگر خود بھی اس کی جگہ ہوتا تو شاید اس سلسلے میں خاصی پس و پیش کرنا پڑتی۔ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ دیکھوں گا تقدیر تو اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اور فیصلہ آخر کار تقدیر ہی کرتی ہے۔ لیکن ایک لمحے کے اندر مجھے محسوس ہوا جیسے ولیم نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لئے ہیں۔ وہ میرے خیالات کو سمجھ گیا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آواز ابھری۔

"نہیں مائی ڈیئر خاقان! مجھے غلط مت سمجھنا۔ تم اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین

رکھتے ہو کہ اگر مجھے اس وقت وردی اتار کر تمہارے ساتھ فرار ہونے کی ضرورت پیش آ
تو میں ایک لمحے کی دیر کئے بغیر وردی پھینک کر تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔ بات یہ نہ
ہے جو اس وقت سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہارے چہرے سے تمہاری دلی کیفیت کا اندا
لگا لیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ہر پہلو پر غور کر رہا ہوں۔ میں ذرا فیصلہ کر رہا ہوں
بہر حال تمہیں اس جہاز میں اس وقت تک رہنا ہے جب تک ہم اس سے بہتر کوئی انتظام
نہ کر لیں۔ میں اس وقت اس جہاز کا....'' اس نے کیبن کی دیوار پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''واحد
ذمے دار افسر ہوں۔ کم از کم پندرہ دن تک ہمیں اس پر اس گودی پر رہ کر کام کرنا ہے
یہ پندرہ دن تو تم میرے جہاز میں گزارو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا سمجھے؟''

میں نے ممنونیت سے ولیم ہاروے کا چہرہ دیکھا اور وہ میرے شانوں پر ہاتھ رکھتا ہوا
بولا۔ ''تم مجھے صرف ایک دوست ہی نہ سمجھو۔ یوں سمجھو کہ میں اس وقت تمہاری ہر مشکل کا
ایک حصہ ہوں۔ اصل میں، میں تمہارا چوبیس گھنٹے کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ جہاز کا
انچارج ہونے کی بنا پر کیپٹن کی واپسی تک مجھے برج پر کیپٹن کے کیبن میں رہنے کا حق
حاصل ہے۔ وہاں مرمت کا کام ختم ہو چکا ہے۔ ڈارک پورٹ کا عملہ اپنے کام سے
سروکار رکھتا ہے۔ وہ لوگ برج پر اب نہیں جا سکتے۔ باقی بات دوسروں کی رہ جاتی ہے
جیسے میرا اردلی اور باورچی تو یہ دونوں میرے وفادار ہیں، تم بالکل بے فکر رہو۔ میں صرف
اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کیا.....؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ بات تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اب کم از کم پندرہ دن تک تو تم اس جہاز پر ہو
باقی رہا ان دونوں کا مسئلہ تو میں انہیں سمجھا دوں گا کہ تم کسی خفیہ سرکاری مشن پر یہاں
ٹھہرے ہوئے ہو اور کسی کو تمہاری موجودگی کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جاننے کے بعد یہ
دونوں کسی سے ذکر کرنا تو دور کی بات ہے، تمہارے بارے میں آپس میں باتیں کرنے
سے بھی گریز کریں گے۔ مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے۔''

ولیم کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی جو کبھی شاذ و نادر ہی اس کے چہرے پر نظر آتی
تھی، اس وقت میری ڈھارس بندھا رہی تھی۔

یہ رات میرے لئے بڑی بھیانک رات گزری تھی اور میں بہت سی سوچوں میں
تھا۔ میں جانتا تھا کہ برائی کا انجام تو بہر حال برائی ہی ہوتا ہے۔ لیکن کسی برائی کا نتیجہ ا

قدر جلد نمودار ہو سکتا ہے یہ شاید کسی نے ہی دیکھا ہو گا۔

ولیم ہاروے نے میرے لئے انتظام کر دیا۔ منصوبے کے مطابق موقع دیکھتے ہی اس
نے مجھے برج پر کیپٹن کے کیبن میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے اپنے اردلی اور باورچی کو بلا کر
اپنا سامان بھی اسی کیبن میں منگوا لیا تھا۔ مرمت کرنے والوں کا شور اگرچہ کافی تھا مگر
نیچے کی طرح یہاں اتنی تیز آوازیں نہیں آ رہی تھیں اور کسی قدر سکون تھا۔ ولیم نے اپنے
بہت سے کپڑے میرے حوالے کر دیئے اور بولا کہ اب میں کچھ آرام کر لوں۔ میں واقعی
یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں لباس تبدیل کر کے کیپٹن کے
بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے تھکے ہوئے اعصاب چیخ چیخ کر نیند نیند پکارنے لگے اور میں
گہری نیند سو گیا۔ کیبن کے پردے کھینچ کر تاریکی کر دی گئی تھی۔ پورٹ ہول بھی بند
تھے۔ میں نجانے کب تک سوچتا رہا۔ ذہن اپنے طور پر سفر کر رہا تھا اور اس کے بعد مجھے
اپنی ہی آواز سنائی دی۔

''انیک دکھ، انات نمو...... ست نمو...... بدھا، انیک دکھ، انات نمو...... ست نمو......
بدھا......'' یوں لگا جیسے یہ آواز صدائے بازگشت کی طرح برسوں کا زمانہ اور میلوں کی
مسافت طے کر کے میرے پاس آئی ہو۔ میں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ پتہ نہیں
میں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ یہ آواز میں نے لنکا کی گاشر بھرم کی پہاڑیوں میں سارتھی
کے دھار میں سنی تھی اور اسے پوری طاقت سے اپنی زبان سے بھی دوہرایا تھا۔ مفہوم ان
الفاظ کا کچھ یوں تھا کہ بے شک سب فضول ہے۔ دنیا دکھوں سے بھری ہوئی ہے اور یہ
دکھ کہیں اور سے نہیں آتے ہم خود اپنے لئے دکھ بوتے ہیں اور دکھوں کی فصل کاٹتے ہیں۔
دکھ ہمارا لباس ہیں، ہماری غذا ہیں، ہمارا سایہ اور ہمارا مقدر ہیں۔ اور یہ بات بالکل سچ
تھی۔ ذرا سا غور کیا جاتا تو صورتحال واضح ہو جاتی۔ ایلس فیوری کی زبان بند کرنے کے
لئے وہ سارا کھیل ہوا تھا۔ اس وقت تو خیر زندگی بچانے کا مسئلہ تھا لیکن اب کیا تھا۔ اپنی
ہوس، اپنی خواہشیں، اپنا عمل، اپنے لئے جہنم کے راستے کھولنا۔ واقعی ہم دُکھ کی فصل بوتے
ہیں اور غم کی فصل کاٹتے ہیں۔ کیا سچ بات تھی۔ مکمل سچ۔ بھلا کیا ضروری تھا کہ عالیہ کی
زندگی میں مداخلت کر کے اپنے لئے مصیبت مول لی جائے۔ بے چارہ آدم زمان تو
میرے لئے کسی بھی طرح تکلیف دہ نہیں بنا تھا اور میں نے اس سے غداری کی تھی بلکہ
میرا اس سے تعلق ہی غداری کا نتیجہ تھا۔ صرف ایک بدن کو کچھ لمحوں کے لئے حاصل

کرنے کے لئے میں نے یہ مکروہ زندگی اپنائی تھی۔ سچ ہی تو ہے کہ دکھ ہمارا لباس ہے، ہماری غذا ہے، ہمارا سایہ اور ہمارا مقدر ہے۔ یقینی طور پر وہ میرا بہت اچھا دوست ہے جو نہ میرا ہم وطن ہے، نہ میرا ہم مذہب۔ ایک ایسی قوم سے اس کا تعلق ہے جو برائی اور بدکاری میں اپنا بڑا نام رکھتی ہے۔ لیکن یہ شخص آج تک بے داغ ریکارڈ کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتا رہا ہے۔ پتہ نہیں میری وجہ سے اس پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میری وجہ سے کتنے مسائل کا شکار ہو جائے، کتنی مصیبتیں جھیلے یہ۔ اگر اس کا کیپٹن یا کوئی اور اعلیٰ افسر میرے ہوتے ہوئے جہاز پر آ جائے تو لیفٹیننٹ ولیم ہاروے ایک ایسے مفرور ملزم کو جس پر قتل کا الزام ہے پناہ کے جرم میں بڑے مسائل میں گرفتار ہو جائے۔ کورٹ مارشل اور بدنامی اور سزا اس جیسے باعزت عہدے دار کا مقدر بن جائے گی۔ صرف میری وجہ سے۔ میں غلط کار آدمی ہوں اور میں نے اپنی حیوانی خواہش کی تسکین کے لئے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا جس کی زندگی مسائل میں پڑ کر خود مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ آہ...... واقعی یہاں آ کر میں نے ولیم ہاروے کے لئے پریشانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب بھی وقت ہے، ابھی کچھ نہیں گیا۔ پولیس میری تلاش میں ضرور ہے لیکن اخبارات میں ابھی تک میرے خلاف کوئی خبر نہیں آئی ہے۔ ہوسکتا ہے بعد میں میرا ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے حلیہ چھپ جائے۔

آہ...... ابھی وقت ہے...... ابھی وقت ہے۔ اگر میں خاموشی سے اٹھ کر کپڑے بدل کر یہاں سے باہر نکل جاؤں تو ولیم کی ہموار زندگی سے میری نحوست کی پرچھائیاں دور ہو جائیں گی۔ اگر ناکہ بندی نہیں ہوئی ہے تو میں یہاں سے کہیں نہ کہیں نکل جاؤں گا۔ بمبئی سے وکٹوریہ ٹرمینل جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر پونا چلا جاؤں گا اور پونا میں اس جگہ پناہ لوں گا جہاں ماموں جان رہتے ہیں اور ان کے پاس میری ماں ہے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ میں کتنا ہی غلط کار سہی لیکن مجھے ایک دفعہ پھر معاف کر دے گی۔ آہ... میں اپنی ماں سے معافی مانگ لوں گا۔ حالانکہ امی نے میری پہلی غلطی کب معاف کی ہے جو اس دوسری غلط کاری کو درگزر کرنے کا سوال پیدا ہو۔ پھر میں نے سوچا کہ میں گڑھی چلا جاؤں گا۔ میرے باپ کا وہ خاص ملازم بہت دانش مند آدمی ہے۔ میرے بے شمار فارموں میں سے کسی ایک فارم میں یا رہائش گاہ میں میرے چھپنے کا بندوبست ہو
... لیکن میں کم از کم رتنا گڑھی میں محفوظ رہوں گا۔ وہ تو میری

سلامت ہے۔ لیکن اصل مسئلہ بمبئی سے نکلنے کا ہے۔ اگر ریلوے اسٹیشنوں پر نگرانی ہوئی تو میرا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ بمبئی پولیس کے کتنے ہی سادہ لباس آدمی ریلوے اسٹیشنوں پر موجود ہوں گے۔ میں گھنٹوں میں ہی دھر لیا جاؤں گا۔

یہ خیالات پتہ نہیں خواب کی شکل اختیار کر چکے تھے یا خواب نہیں، میرے ذہن میں ایک چرخی سی گردش کر رہی تھی۔ شاید میں سو بھی نہیں رہا تھا۔ وہ آواز جو مجھے سنائی دی تھی، نیند کے عالم میں نہیں تھی بلکہ حقیقت تھی۔ انیک دکھ، اناتھ نمو، ست نمو، بدھا! آہ...... یہ آواز مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ تو ایک نیک آواز تھی۔ تیکیون کے راستے پر لے جانے والی آواز۔ نہیں، مجھے اس آواز سے چھٹکارا پانا چاہئے۔ میں جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے طے کر لیا کہ میں پکڑا جاؤں یا بچ نکلوں، یہ میرا اور صرف میرا مسئلہ ہوگا۔ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہوتا کہ اپنی وجہ سے ولیم کی زندگی کو الجھنوں میں ڈالوں اور اس کی خوبصورت زندگی کو تباہ کر دوں۔ یہ تو دوستی کا حق نہ ہوا۔

میرے اندر ایک شدید ہیجان برپا تھا۔ دل و دماغ کے درمیان شدید کشمکش ہو رہی تھی اور یہ کشمکش اس قدر حیثیت اختیار کر گئی کہ میں نے بستر سے اٹھ کر خاموشی سے کپڑے بدلے، جوتے ہاتھ میں لئے اور کیبن کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن جیسے ہی میں نے کیبن کا دروازہ کھولا ولیم مجھے اپنے سامنے کھڑا نظر آیا۔ میں اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ولیم کا بھرپور قہقہہ فضا میں گونجا۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے مجھے زور سے اندر دھکا دیا اور خود بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

"تم کو ایک بھرپور نیند کی ضرورت ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں نیند نہیں آ رہی۔ جب بے خوابی ذہن و دل پر حماقتیں پیدا کر دیتی ہے تو انسان ایسے ہی فیصلے کرتا ہے اور میں ایک بیوقوف آدمی نہیں ہوں بلکہ دنیا شناس ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم بھاگنے کی کوشش کرو گے۔ چلو ایک بار پھر کپڑے اتارو اور میرے سامنے اتارو۔ میں اپنا کام ختم کر کے آیا ہوں اور اب میں بھی تمہارے ساتھ سونے کی کوشش کروں گا۔ لیٹو یار! کپڑے تبدیل کرو۔ کیا فضول باتیں ہیں۔ مجھے بھی سونے دو۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔ یقین کرو رات بھر جاگ کر ڈیوٹی انجام دی ہے۔ میں تو بس لوگوں کو کام سمجھانے کے لئے تمہارے پاس سے چلا گیا تھا۔"

ولیم نے ایک بار پھر کہا۔ "احمق آدمی! جو کچھ تم سوچ رہے ہو نا اس پر بعد میں تم سے

تفصیلی گفتگو ہو گی یار! یقین کرو میں تھکا ہوا ہوں اور اب اور کچھ نہیں کہوں گا سوائے اس کے کہ کپڑے بدلو اور لیٹ جاؤ۔ جب تک میں تم سے تفصیلی گفتگو نہ کرلوں اس وقت تک یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا اور بھاگنا چاہو تو بھاگ بھی نہیں سکو گے۔ کیونکہ باہر سکیورٹی ہے اور وہ تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ پلیز!"

میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑا مکار ہے یہ شخص بھی۔ میں نے دل میں سوچا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی آ گئی تھی۔ مگر میں نے ولیم کو آنکھوں کے آنسو نہ دیکھنے دیئے اور دل میں سوچا کہ کیا واقعی مجھے اتنا سچا دوست حاصل ہے۔ بہرحال خاموشی سے کپڑے تبدیل کیئے اور اس احساس کے ساتھ سو گیا کہ ولیم نے مجھے پناہ دے کر جو خطرہ مول لیا ہے وہ اس کے نتائج بھی خوب جانتا ہے اور ہمت کے ساتھ ہر مصیبت بھگتنے کو تیار ہے۔

شام کو چار بجے اردلی نے کیبن کے دروازے پر دستک دی۔ ولیم بیدار ہو چکا تھا۔ وہ غسل خانے میں تھا۔ اس نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر چابی باہر اچھال دی۔ اردلی کھانے کا سامان اور شام کے سارے اخبارات لایا تھا۔ طبیعت اندر سے متلائی متلائی سی ہو رہی تھی۔ چائے کے ساتھ اور بھی بہت سے لوازمات تھے۔ مگر مجھ سے نہ کھائے گئے۔ میں نے صرف چائے پی۔ شام کے تمام اخبارات نے اس واقعے کو نمایاں طور پر لکھا تھا اور میری نگاہیں ان خبروں پر جم گئی تھیں۔ آہ، وہی ہوا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ لکھا تھا۔

"ایک مقامی فرم کا تیس سالہ ڈرائیور کریم خان رات کے وقت ایک ہوٹل کی چھت سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ پولیس کا شبہ ہے کہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ایک نوجوان رئیس زادہ خاقان جمشیدی اس ہلاکت میں ملوث ہے۔ رات ہی سے خاقان جمشیدی بھی لاپتہ ہے۔ پولیس نے ہوٹل کے اس کمرے کو سیل کر دیا ہے جس میں خاقان جمشیدی ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت ہی سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

اس کے بعد بمبئی کی پولیس کے ان افسروں کے نام لکھے تھے جو اس واقعے کی تحقیقات کر رہے تھے۔ ان خبروں کو کئی بار پڑھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ دولت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ وہ دولت مند بھی تھا لیکن میں تو ایک پراسرار مشکل کا شکار تھا اور صحیح معنوں میں میری اپنی شخصیت کبھی کی کھو چکی تھی۔ بارہا یہ خیال میرے دل میں آتا کہ اگر میں اپنی ریاست، اپنی جاگیر، اپنی مملکت کو سلیقے سے سنبھالتا جیسا کہ میرے والد

صاحب نے میرے لئے ابتدا کی تھی اور انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی مجھے کلکتہ بھیج کر میری تعلیم مکمل کرائی تھی، ظاہر ہے اس کے بعد میں سیتا گڑھی پہنچ کر اپنی جاگیریں ہی سنبھالتا اور صحیح معنوں میں کسی بھی طرح میں سیٹھ آدم زمان سے کم نہ ہوتا۔ سیٹھ آدم زمان تو صرف ایک کاروباری آدمی تھا۔ ایک عام قسم کے کاروباری آدمی اور جاگیردار میں فرق ہوتا ہے۔ میری حیثیت اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہوتی۔ لیکن تقدیر نے مجھے ایک ایسے ہولناک جال میں گرفتار کر لیا تھا جس سے نکلنے کی کوئی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی تقدیر ایسے ہی کھیل کھیلتی ہے اور انسان نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

اخبار کی خبر میں ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ کریم خان کو ایک مقامی فرم کا ڈرائیور بتایا گیا تھا اور کہیں بھی آدم زمان کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے آدم زمان کی مکمل حمایت کی گئی تھی اور اسے ان معاملات میں ملوث نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اب تو میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پولیس نے آدم زمان یا عالیہ زمان سے یہ بھی نہ پوچھا ہو گا کہ میں ان کا دوست رہا ہوں یا نہیں۔ وہ بڑے آرام سے ان سارے معاملات سے بچ گئے تھے۔

آگے چل کر لکھا گیا تھا کہ خاقان کی تلاش جاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرا تفصیلی حلیہ بھی درج تھا۔ ولیم نے غالباً پہلی بار میرے چہرے کے تاثرات دیکھے اور محسوس کیا کہ ان اخبارات کی خبریں پڑھ کر میں الجھن میں گرفتار ہوں۔ چنانچہ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے تمام اخبارات میرے سامنے سے دور پھینک دیئے اور ہنستا ہوا بولا۔

"دنیا ختم نہیں ہو گئی ہے میری جان! کیا سمجھے؟ ان اخبارات میں چھپی خبروں پر بالکل توجہ نہ دو۔ تمہارا یار زندہ ہے، مجال ہے کسی کی کہ تمہاری طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ جائے۔ ابھی پندرہ دن تو اس جہاز پر آرام سے رہو۔ اس عرصے میں یہ گرما گرمی ختم ہو جائے گی۔ پولیس ہر وقت تو ناکہ بندی نہیں رکھ سکتی۔ کیپٹن کو جہاز کا چارج دینے سے پہلے میں تمہیں بمبئی سے نکال کر لے جاؤں گا اور کسی بھی ایسے علاقے میں پہنچا دوں گا جہاں تمہیں مکمل تحفظ مل جائے۔ تم بے فکر رہو، میں وہ متعصب انگریز نہیں ہوں جو ہندوستان پر حکومت قائم کر کے اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہو گا۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں تم سے۔ بہت سی جگہ میرے ایسے جاننے والے موجود ہیں جو تمہاری بھرپور مدد کریں گے۔ بس ان سے ایک بار کہہ دینا کافی ہے۔ میرا باورچی

گوا کا رہنے والا ہے۔ وہ گوا میں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دے گا۔ وہاں سے اسمگلروں کی لانچیں تمہیں با آسانی سری لنکا پہنچا دیں گی۔ اس کے بعد پورا یورپ پڑا ہے، افریقہ ہے، جہاں بھی دل چاہے نکل جانا۔ کچھ دن بیرونی ملکوں کی سیر کر لو، تمہارا جی بھی بہل جائے گا اور زندگی کے کچھ اور تجربات حاصل ہو جائیں گے اور...... اور......" اس نے خوش دلی سے ایک آنکھ دبائی اور بولا۔ "اور لڑکیاں بھی ملیں گی۔ دولت کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے پھر پریشانی کس بات کی ہے۔ کیا سمجھے؟" وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور میں سوچنے لگا کہ انسان کہیں بھی مل سکتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی بھی نسل، کسی بھی قوم سے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک انفرادی عمل ہے کہ کون کس حد تک اچھا ہے اور کس حد تک برا۔ ولیم بہرحال ایک اچھا دوست تھا جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ وہ مجھے ایسے دلاسے دے رہا تھا جیسے کوئی ننھے سے بچے کو بہلاتا ہے۔ پھر اس نے کہا۔

"اب اٹھو اور نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ میں باہر جاتا ہوں۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے اپنے بارے میں سوچا۔ ولیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے غلطیوں پر غلطیاں ضرور کی ہیں لیکن زندگی سے کچھ سیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

بہرحال پانچ بجے تک جہاز پر ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ ڈارک پورٹ کے کاریگر اور مزدور دن بھر کی مصروفیت ختم کر کے جا چکے تھے۔ میں نے کیپٹن کے آرام دہ کیبن میں غسل وغیرہ کیا، کپڑے تبدیل کئے۔ کپڑوں کا مسئلہ میرے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس ایک جوڑے کو میں کب تک چلا سکتا تھا؟ بہرحال میں کیبن کے سناٹے میں بیٹھا سوچتا رہا اور آگے کے منصوبے بناتا رہا۔ بازار جا کر اپنے لئے کپڑے اور دوسرا سامان لانا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال میرے پاس کافی رقم موجود تھی اور اس سلسلے میں مجھے ولیم کی مدد درکار تھی۔ اس کے علاوہ باورچی یا اردلی کو اس سے زیادہ اعتماد میں لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ یہ کام صرف اور صرف ولیم کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ ولیم آ جائے تو اس سے بات کروں گا اس بارے میں۔

پھر کیبن کے دروازے پر مخصوص انداز کی دستک ہوئی۔ یہ میرا اور ولیم کا لڑکپن کا کھیل تھا۔ کالج، ہوسٹل میں ہم نے امتحانوں کی تیاری کے دوران یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اگر ہم اپنے کمرے میں پڑھ رہے ہوں اور دوسرے لڑکے ہمارا وقت آ کر

دوسرا کمرے سے باہر گیا ہوتا تو باہر والے کو کمرے میں آنے کے لئے مخصوص اشارہ دینا پڑتا تھا ورنہ دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ اب جب کیبن کے دروازے پر وہی دستک ہوئی تو میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ باہر ولیم نہیں تھا بلکہ اس کا اردلی کھڑا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے اندر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ولیم نے خفیہ سرکاری ...ن والی بات نبھانے کے لئے اردلی کو اس کھیل میں شریک کر لیا تھا۔

"ہاں...... کیا بات ہے؟" میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"سر! مسٹر ولیم کسی کام سے جہاز سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ سات بجے تک آ جائیں گے۔ اگر آپ پسند کریں تو ڈیک پر جا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ سارا انتظام ہو گیا ہے۔"

"کیا انتظام ہو گیا ہے؟"

"سر! جہاز پر اب یا تو میں ہوں یا باورچی۔ اور گیٹ وے پر حسب معمول بحریہ کا گارڈ ڈیوٹی دے رہا ہے۔"

"کیا ولیم نے تمہیں اس بات کی ہدایت کر دی تھی؟"

"جی سر۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ ڈیک پر آنا چاہیں تو میں آپ کو اس بارے میں مطمئن کر دوں۔" اردلی نے جواب دیا۔

میں واقعی کیبن میں بند تنگ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی فاسد خیالات نے دل و دماغ پر ایسے برے اثرات مرتب کئے تھے کہ طبیعت پر بوجھ ہی بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کھلی فضا میں جا کر سانس لینے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ ولیم میرا دوست، میری جان میرے لئے سینہ سپر ہو گیا ہے۔

بہرحال میں ڈیک پر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ اردلی نے دو تین کرسیاں اور میز لگا دی ہے۔ سینٹر ٹیبل پر پانی کا گلاس اور جگ رکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔

"سر! میں آپ کو بہترین کافی پیش کر سکتا ہوں اگر آپ پسند کریں۔"

"پلا دو یار! تم سب لوگ سونے سے بنے ہوئے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

شام بڑی پُر فضا تھی۔ کئی گھنٹے کیبن میں بیٹھنے کے بعد مجھے اس طرح ہوا میں بیٹھنا اچھا لگا۔ دل میں کچھ اعتماد بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ولیم ہاروے نے میرے لئے جو تحفظ فراہم کیا تھا [illegible] تھا۔ ایک غیر ملکی جہاز پر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان لوگوں

کے حساب سے ایک قاتل چھپا بیٹھا ہوگا۔

میری نگاہ دور بندرگاہ پر کھڑے ہوئے تجارتی جہازوں کی روشنیوں پر پڑی اور میں نجانے کیا سے کیا سوچنے لگا۔ شاید اسی شام عالیہ زمان یورپ کے دورے پر روانہ ہوگی ہوگی۔ یہ شام کا وقت تھا جب سمندر کا پانی چڑھتا ہے تو بڑے مسافر بردار جہاز عام طور پر شام ہی کو روانہ ہوتے ہیں۔ یقیناً عالیہ اس وقت اپنے فرسٹ کلاس کیبن میں شام کی مصروفیتوں کے لئے لباس بدل رہی ہوگی۔ آہ کیا عورت ہے، آگ کی طرح گرم اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے زندگی کی بازی لگا دینے والی۔ میرے بارے میں اسے اس بات کا علم تو ہو گیا ہوگا کہ میں کس طرح عذاب میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ کیا تاثرات ہوں گے اس کے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک منظور نظر اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ کیا عجیب دنیا ہے۔ کس طرح اسے بچانے کے لئے کریم خان کو کسی مقامی فرم کی کسی گاڑی کا ڈرائیور بتایا گیا ہے حالانکہ حقیقتیں بہت الگ تھیں۔

آرام دہ کرسی پر پڑا ہوا میں انہی خیالات میں محو تھا کہ ولیم آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کاغذ کے بہت سے تھیلے اور ڈبے اٹھائے ہوئے اس کا اردلی تھا۔ ولیم نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً تمہاری کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم بہت دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔''

''ہاں...... کافی دیر ہوگئی۔''

''تو پھر آؤ اُٹھو، کیبن میں چلتے ہیں۔ آ جاؤ۔''

میں خاموشی سے کھڑا ہوا اور اردلی اور ولیم کے ساتھ برج کی طرف بڑھ گیا۔

کیبن میں پہنچ کر اردلی نے اپنے ساتھ لائے ہوئے پیکٹ اور ڈبے بستر پر ڈھیر کر دیئے۔ ولیم مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اردلی واپس چلا گیا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے ڈبے اور تھیلے کھولنا شروع کر دیئے۔ میں دلچسپی سے اس کا یہ عمل دیکھ رہا تھا۔ اور پھر میں نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ ولیم میرے لئے کپڑے، جوتے، بنیان اور ایسی ہی دوسری چیزیں لے کر آیا تھا۔ درحقیقت میرا دل چاہا اس وقت کہ میں سسکیاں لے کر رو پڑوں۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا...... بہت ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ وقت نے مجھے جن حالات کا شکار کر دیا تھا ان میں میرا اپنا کتنا دخل تھا۔ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو میں ایک معصوم سا آدمی تھا اور اس وقت بھی اپنے آپ کو معصوم سمجھتا تھا۔ برا ہو ان

توتوں کے دائرے میں آ کر میں نجانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ورنہ نہ تو میں کردار کا برا تھا نہ گفتار کا۔ یہ ظالم کس طرح کا دوست ہے کہ میرے سوچنے سے پہلے سارے انتظامات کر دیتا ہے۔ ایسے دوست اس کائنات میں کہاں ہوتے ہیں؟ میں نے یہ بھی دیکھا کہ تمام چیزیں میری پسندیدہ تھیں۔ جوتے پیروں میں اس طرح فٹ تھے کہ بیان سے باہر ہے اور کپڑے بھی میرے بدن پر بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

''تم شاید یہ بات بھول رہے ہو کہ میرے اور تمہارے جسم اور پیروں کا ناپ ایک ہے۔ انیس بیس کا بھی فرق نہیں ہوگا۔ کیا سمجھے؟ تمہیں یاد ہے کہ اکثر ہم ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ اور یار، میں تمہیں ایک بات اور بتاؤں، ٹھیک ہے جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے تمہارے درمیان مذہب کا فرق ہے لیکن نجانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا دل تمہارے سینے میں اور تمہارا دل میرے سینے میں دھڑکتا ہو۔''

''میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ولیم! کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔'' میری آواز رندھی ہوئی تھی۔

اس نے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

''دیکھو...... ہم لوگوں کے درمیان بھی کوئی پردہ داری نہیں رہی۔ ہماری دوستی ایک مثال کہی جاتی تھی۔ اب اس میں کون سا ایسا کوئی بڑا فرق آ گیا کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔ اچھا ہاں، ایک بات سنو۔ یہ میں تمہیں بتا دوں کہ شیونگ کٹ میں جان بوجھ کر نہیں لایا ہوں کیونکہ اب تم شیو نہیں کرو گے۔ تمہیں داڑھی بنانی ہے۔ میرا مطلب ہے داڑھی بڑھاؤ گے۔ اس طرح سے تمہارے حلیے میں خاصی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔''

میں چونک پڑا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس قدر چھوٹی چھوٹی تفصیلات پر بھی اس شخص کی نظر ہے۔ مجھے واقعی یہ بات بڑی پسند آئی تھی۔ دس بارہ دن میں مجھ جیسے ریچھ نما آدمی کی داڑھی اتنی ضرور بڑھ جائے گی کہ میرا حلیہ بدلنے میں مددگار ثابت ہو۔

اب ولیم کے ایک ایک عمل پر مجھے مکمل اعتماد ہو گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ زندگی بچانے کے لئے قدرت نے میرے لئے ولیم کا انتظام کر دیا ہے۔ چنانچہ میں نے خود کو جہاز کی زندگی کے مطابق ڈھال لیا۔ میرا زیادہ وقت کیپٹن کی لائبریری میں گزرتا تھا۔

ولیم کے کیپٹن کو یقینی طور پر اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کی لائبریری میں ایک
ایک کتاب موجود تھی۔ جتنی دیر تک ڈارک پورٹ کا انجینئرنگ کا عملہ جہاز پر کام کرتا، م
کیبن میں رہتا۔ آٹھ آٹھ گھنٹے پڑھتا رہتا۔ سو جاتا۔ ولیم مجھے آ کر جگا دیتا۔ میری د
اب ولیم، اردلی، باورچی اور کیبن تک محدود ہو گئی تھی۔ یہ لوگ اس طرح میرا خیال رکھ
تھے جیسے میں کوئی شہنشاہ ہوں اور یہ سب میرے غلام۔ میری ایک ایک ضرورت پر نگ
رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ دس دن اتنے آرام سے گزر گئے کہ بیان سے باہر ہے۔ ولی
پابندی سے صبح شام کے اخبارات منگواتا تھا اور ان اخبارات میں میری خبریں نظر آ
تھیں۔ کمبخت مجھے ابھی تک نہیں بھولے تھے۔ ویسے پولیس کی کارروائیاں تھیں اور پولیس
رتنا گڑھی تک پہنچ گئی تھی۔ یہ خبر میرے لئے انتہائی روح فرسا تھی کہ میری شہرت میرے
اپنے گھر پہنچ گئی تھی اور ظاہر ہے میرے تمام عزیز و اقارب وہ جو میرے خاندان کی عزت
کرتے تھے اب میرے بارے میں لاکھوں قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہوں گے۔ نجانے
کیا کیا کہانیاں منسوب کی جا رہی ہوں گی میری ذات سے۔ اور پھر میرے والد کی تو
بہت سی بیویاں تھیں، ان کے اپنے خاندان تھے۔ کیا شہرت حاصل ہو رہی ہو گی مجھے۔

ویسے کریم خان کی موت کے دس دن بعد اخبارات نے وہ تصویریں بھی چھاپ دی
تھیں اور یہ بڑی پریشان کن بات تھی۔ ذرا سی ڈھارس بندھانے کے لئے اتنا ضرور تھا
کہ پولیس کو رتنا گڑھی سے جو تصویریں ملی تھیں وہ سب میرے طالب علمی کے زمانے کی
تھیں اور اب جب میں صبح آئینہ دیکھتا تھا تو دن بدن بڑھتی داڑھی میں کوئی دوسرا ہی آدمی
نظر آتا تھا۔

جہاز پر کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ رنگ و روغن والے اب صبح کو آتے اور شام تک
خاموشی سے کام کرتے رہتے۔ ولیم اور میں سر جوڑ کر بیٹھتے تو یہ سوچتے رہتے کہ میرے
بمبئی سے نکلنے کی کیا صورتحال ہو سکتی ہے۔

ایک شام میں اور ولیم جہاز سے اتر کر گودیوں کے علاقے سے باہر نکلے اور ٹہلتے
ہوئے کافی دور نکل گئے۔ ہم دونوں کو خطرے سے اس طرح کھیلنے میں بڑا لطف آیا تھا۔
اس کی تجویز بھی ولیم نے ہی پیش کی تھی اور کہا تھا۔

"یار! ایک بات سنو، کیا تم یہاں اس کیبن میں گھسے گھسے اپنے آپ کو کوئی بہادر مرد
تصور کرتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

"واقعی......؟"

"ہاں۔ جھوٹ بولنے کا بھلا کیا تصور ہے۔"

"تو پھر باہر کیوں نہیں نکلتے۔"

"نکلنا چاہتا ہوں مگر تمہاری وجہ سے نہیں نکلتا۔"

"میری وجہ سے؟"

"تو اور کیا؟"

"سمجھاؤ۔"

"ظاہر ہے اس وقت تم میری معاونت کر رہے ہو۔ میرا ہر غلط قدم تمہیں بدنام کرے
گا۔"

"آؤ ایڈونچر کرتے ہیں۔ ٹہلتے ہوئے چلتے ہیں کہیں اور۔"

اور اس طرح ہم باہر نکل آئے تھے۔ دو گھنٹے تک ہم سنسان سڑکوں پر ٹہلنے کے بعد
لوٹ رہے تھے کہ گارڈ روم کے قریب انجینئرنگ والوں کی موٹر کرین کھڑی ہوئی نظر آئی۔
میں نے دور ہی سے کرین کو پہچان کر ولیم سے کہا۔

"ولیم، وہ دیکھو کرین کھڑی ہوئی ہے۔ کیوں نہ ہم واپس لوٹ جائیں اور سڑکوں کا
چکر لگا کر آئیں۔ اس عرصے میں یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ بلاضرورت میرا ان
لوگوں کے سامنے آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

ولیم نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک تنقید تھی۔ پھر اس نے
لاپرواہی سے گردن ہلا کر کہا۔ "نہیں دوست! تمہارے اندر جو تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں ان
سے کوئی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ آ جاؤ۔"

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر گردن ہلائی۔ اب بہت زیادہ بزدلی کا اظہار بھی
شرمندگی کا باعث بن سکتا تھا۔ چنانچہ ہم گارڈ روم سے گزرے اور میں نے محسوس کیا کہ
گارڈ روم سے گزرتے وقت عملے کے لوگ ولیم کو پہچان کر سلیوٹ کر رہے تھے۔ لیکن وہی
فورمین جس سے میری اس دن جھک جھک ہوئی تھی، ولیم کو سلام کرنے کے بعد خالی خالی
نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا کرین میں جا بیٹھا تھا۔ مگر ہم کرین سے بمشکل دو قدم
آگے بڑھے ہوں گے کہ فورمین دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم رک گئے۔ اس نے زمین

پر پیر مار کر مجھے سیلوٹ کیا اور بولا۔

''سر! معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔''

میں نے سلام کا جواب دیا اور مسکرا کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں فور مین۔ تم اچھے تو ہو؟''

''سر آپ کی دعا ہے۔'' اس نے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ولیم کا یہ خیال کہ بارہ دن کے بڑھے شیو سے میرا حلیہ بالکل ہی بدل گیا ہے غلط ثابت ہوا۔ آخر اس آدمی نے بھی تو مجھے پہچان لیا۔ ہم لوگ اس پر دیر تک تبصرہ کرتے رہے تھے لیکن ولیم اب بھی کسی احساس کا شکار نہیں تھا۔

دوسرے دن ہم باہر نکلے تو میں نے ولیم کا دھوپ کا چشمہ پہن رکھا تھا اور بالوں کو ذرا مختلف انداز میں سنوارا تھا۔ یہ سب ولیم ہی کی کارروائی تھی۔ وہ مجھ پر تجربات کر رہا تھا۔ اس روز ہم بازار کی جانب نکل گئے۔ اور پھر ہم نے ایک درمیانہ درجے کے ریستوران میں چائے پی اور واپس جہاز پر آ گئے۔ دو دن بعد ولیم کو جہاز کا چارج دینا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے باورچی کے ساتھ تمام معاملات طے کر لئے تھے۔ کیپٹن کو چارج دینے سے ایک دن قبل ولیم کا باورچی مجھے لے کر جانے لگا جہاں اس کے ایک ہم وطن کے ہاں میرے عارضی قیام کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بہرحال یہ تمام تفصیل مجھے اس نے بتائی تھی۔ ولیم کا باورچی میرا مختصر سا سامان ایک سوٹ کیس میں بھر کر پہلے ہی وہاں پہنچا چکا تھا۔ میں منصوبے کے مطابق دو تین دن اس دوست کے پاس رہوں گا۔ اس دوران جہاز کا چارج دینے کے بعد ولیم کو پندرہ روز کی چھٹی مل جائے گی۔ وہ مجھ سے اپنے دوست کے مکان پر آ کر ملے گا اور ہم دونوں پرتگالی سیاحوں کے حلیے میں اس کے دوست کے ساتھ ڈمن چلے جائیں گے۔ ڈمن میں ہمیں ایک مشہور اسمگلر کے سپرد کر دیا جائے گا اور وہ اسمگلر جسے یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں موقع محل دیکھ کر ہمیں خلیج فارس کے کسی مقام پر اتار دے گا۔ وہاں سے آگے میرے اصل سفر کا آغاز ہو گا۔ یہ تھی مکمل منصوبہ بندی جس پر اب مجھے عمل کرنا تھا۔

جس شام کو مجھے ولیم ہاروے کے دوست مسٹر جان بک کے ہاں جانا تھا اس دن صبح ہی صبح ولیم کو بحریہ کے ہیڈ کوارٹر سے بلاوا آ گیا۔ اب جہاز پر میں تھا، اردلی تھا یا باورچی۔ ناشتے کے بعد مجھ پر وحشت سوار ہوئی۔ دل چاہا کہ گودیوں کے علاقے سے نکل کر کچھ دور کا چکر لگا کر آؤں۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے اور سو سو کر وقت گزارتے گزارتے

مجھ پر اس قدر بیزاری طاری ہو گئی تھی کہ بعض اوقات تو طبیعت عجیب و غریب کیفیت محسوس کرنے لگتی تھی۔

بہرحال میں نے لباس تبدیل کیا۔ دھوپ کا چشمہ اور فلیٹ ہیٹ پہن کر گینگ وے سے اترا اور ٹہلتا ہوا گارڈ روم سے باہر سڑک پر آ گیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک ٹیکسی نظر آئی اور میں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے قریب بلا لیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں شہر چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بھرے پرے بازار کی ایک جھلک دیکھ کر لوٹ آؤں۔ خود آئینے میں اپنا حلیہ دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں بہت زیادہ تبدیل ہو گیا ہوں اور اب مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ کوئی مجھے اخبار کی تصویروں سے پہچان لے گا یا پھر ہوٹل میں جن لوگوں نے مجھے دیکھا ہو گا وہ مجھے پہچان لیں گے۔ میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ولیم کے اردلی نے جو پیشے کے لحاظ سے خاندانی نائی تھا، نیوی کے ریگولیشن کے مطابق میری جارج پنجم جیسی داڑھی تراش دی تھی اور میں ایک نظر میں ہی بحریہ کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔

ٹیکسی بہت دیر تک بازاروں اور سڑکوں سے گزرتی رہی۔ ڈرائیور کو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں سیر و سیاحت کرنا چاہتا ہوں اور میری کوئی خاص منزل نہیں ہے۔ چنانچہ وہ پُرسکون انداز میں ٹیکسی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بمبئی میں ان دنوں ٹریفک کی وہ حالت نہیں تھی جو اب ہو گی۔ تاہم ایک بندرگاہی شہر اور ایک مصروف تجارتی مرکز میں جو رش ہوتا ہے وہی کیفیت اس وقت تھی۔ ڈرائیور بھی پُرسکون انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک بارونق سڑک سے آہستہ آہستہ گزرتا ہوا میں کھڑکی سے لگا فٹ پاتھ پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور اس وقت کو یاد کر رہا تھا جب میں انہی لوگوں کی طرح سینہ تان کر اور بے خوف ہو کر سڑکوں پر چل سکتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میں نے ایک انتہائی خوبصورت، ریشمی سوٹ میں ملبوس ایک غیر ملکی شخص کو تیزی سے فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیاہ چشمہ پہنے ہوئے تھا۔ مگر میں نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ میرے خدا..... یہ ہیگ جانسن تھا۔ سو فیصدی ہیگ جانسن جو میرے مصائب، میری تمام تر ذلتوں اور تمام تر پریشانیوں کا سبب تھا۔ نجانے میرے ذہن پر کیا جنون سوار ہوا، میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

''روکو ٹیکسی، ڈرائیور روکو۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک سائیڈ پر کر کے روکی اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ لیکن میں نے اسے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ، بس مجھے یہیں اترنا تھا۔"

میں پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ وہی دیوانگی، وہی جنون میرے سارے وجود پر سوار تھا جو کسی انتہائی مشتعل شخص کا ہو سکتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں اس وقت مسلح ہوتا۔ کاش میرے پاس کچھ بھی ہوتا، چاہے وہ ایک قلم تراش چاقو ہی کیوں نہ سہی تو میں اس خبیث کو اسی فٹ پاتھ پر گرا کر ذبح کر دیتا جس کی وجہ سے میں دربدر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں نے جو بھی جرائم کئے ہیں، جو روحانی اذیتیں جھیلی ہیں، ان کا بدل تو یہ بھی نہیں ہے کہ میں اسے ذبح کر دوں۔ درحقیقت اس نے خاقان جمشیدی کو قتل کر دیا تھا، اس خاقان جمشیدی کو جو سیدھے اور سچے راستے پر چلنے والا سچ بولنے والا نوجوان تھا۔ اپنی ہر مشکل کے باوجود یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ ہر قیمت پر سچائیوں کے راستے اختیار کرے گا اور میں ہی نہیں، اس نے بہت سے قتل کئے تھے۔ صحیح معنوں میں یہی شخص این مورالس کا قاتل بھی تھا۔ کریم خان کو بھی میں نے نہیں، اسی نے ہلاک کیا ہے۔ بے چاری ایلس فیوری بھی اسی کے ہاتھوں خراب ہوئی ہے۔ کاش ان تمام قتلوں کے عوض میں اسے ہزاروں بار قتل کر سکتا۔ اتنا ہی جنون سوار تھا مجھ پر۔ میں فٹ پاتھ پر ایک راہ گیر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ آگے جا رہا تھا۔ اور کچھ لمحوں کے بعد وہ ایک بلند و بالا شاندار عمارت میں داخل ہو گیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، یہ ایک فرم کا صدر دفتر تھا۔ میں نے دفتر کے سامنے رک کر ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے اس جنون پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں خود کو سمجھا رہا تھا کہ مجھے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس سے بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ یہ حرام زادہ بچ کر کہاں جائے گا۔ میں جہنم تک اس کا پیچھا کروں گا۔ اس نے بڑی عیاری سے مجھے اور مورالس کو شکار کیا تھا۔ میں اسی کے ہتھیار سے اسے ماروں گا۔

کچھ لمحے تک میں اپنے آپ کو سنبھالے رہا اور اس کے بعد شیشے کا دروازہ کھول کر میں فرم کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ پچیس تیس آدمی اور عورتیں کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔ کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک انتہائی قیمتی اور اعلیٰ درجے کا دفتر تھا، دیواروں پر رنگ برنگے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ غالباً یہ کسی ٹریول ایجنسی کا عظیم الشان آفس تھا۔ کیونکہ

جگہ جگہ پوسٹروں پر تفصیلات لکھی ہوئی تھیں۔

"یورپ دیکھئے۔"

"پراسرار افریقہ آپ کا منتظر ہے۔"

"امریکہ جانا ہو تو فلاں جہاز کمپنی کی خدمات حاصل کیجئے۔"

میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں اور میں نے ہیگ کو کاؤنٹر پر جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ بکنگ کلرک سے کچھ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ میں آہستہ اور پُرسکون قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر والے کاؤنٹر پر اس طرح جا کھڑا ہوا جیسے اپنی باری کا منتظر ہوں۔ لیکن میرے کان پوری توجہ کے ساتھ ہیگ کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انتہائی غور سے سنا، بکنگ کلرک کاغذات الٹ پلٹ کر ہیگ سے کہہ رہا تھا۔

"مسٹر، آپ کو سترہ نمبر کیبن ملی ہے۔ آپ کا جہاز نو نمبر برتھ پر لگے گا۔ جہاز کی روانگی کا وقت نوٹ کر لیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے مڑ کر ایک چارٹ دیکھا، پھر بولا۔ "جی ہاں۔ ساڑھے پانچ بجے شام۔ آپ ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جائیے تاکہ کسٹم کی چیکنگ وغیرہ میں آسانی رہے۔ آج ساڑھے پانچ بجے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک فارم سا ہیگ کی طرف بڑھا دیا اور ہیگ یہ فارم پُر کرنے لگا۔ پھر اس نے شکریہ ادا کر کے کاؤنٹر سے کچھ چیزیں وصول کیں اور وہاں سے ہٹ گیا۔

میرے لئے اب وہاں ٹھہرنا بالکل بے کار تھا۔ تقدیر نے ہیگ کی پیشانی پر بدنصیبی اور میری پیشانی پر خوش نصیبی کی مہر لگائی تھی۔ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو گیا تھا جسے جاننے کے لئے میں یہاں آیا تھا۔ میرے سامنے کاؤنٹر کے شیشے کے پار ایک بکنگ کلرک مجھ سے یس پلیز، یس پلیز کہے جا رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، ہیگ دروازہ کھول کر باہر جا رہا تھا۔ بکنگ کلرک سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے پوچھا۔

"یہ کون سی کمپنی کا دفتر ہے؟"

"آپ یہ معلوم کئے بغیر یہاں آ گئے ہیں؟"

"نہیں وہ، اصل میں مجھے مسٹر جان بک سے ملنا تھا۔"

"مسٹر جان بک تیسرے فلور پر ہوتے ہیں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں۔" کلرک نے کہا اور اپنے کاغذات پر جھک گیا۔ میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا تھا۔ میں نے تو ایسے ہی یہ نام لے دیا تھا۔ لیکن اتفاق سے اس نام کا کوئی شخص یہاں موجود تھا اکاؤنٹس

ڈیپارٹمنٹ میں۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور پُرلطف اتفاق تھا۔ ویسے جان بک کے بارے میں ولیم ہاروے سے کبھی کوئی تفصیلی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال میں تیزی سے دروازے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ٹیکسی نظر آئی۔ اب اس وقت ہیگ کا تعاقب کرنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں چل پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میں نے ڈارک پورٹ کی خشک گودی پر چلنے کے لئے کہا۔

میں نے دل میں سوچا کہ میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے تو اب اس جہاز پر سوار ہونا ہے جو نونمبر کی برتھ پر لگنے والا ہے۔ حالانکہ اس کے کوئی انتظامات میرے پاس موجود نہیں تھے۔ اپنا پاسپورٹ تو میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح مجھے ٹکٹ بھی نہیں مل سکتا تھا کیونکہ بغیر پاسپورٹ کے ٹکٹ ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن کچھ بھی ہو جائے میں اس شیطان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ میں دنیا کے آخری حصے تک اس کا پیچھا کروں گا، یہ میرا عزم ہے۔ چاہے اس کے لئے مجھے ہزاروں زندگیاں قربان کرنی پڑیں۔ بس ایک جنون تھا جس نے مجھے بہا کر رکھ دیا تھا۔ ہیگ سے انتقام لینا اب میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے بظاہر کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر زندگی کی بازی بھی ہارنا پڑے تو ہیگ کا تعاقب کروں گا۔ کچھ بھی ہو جائے...... چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

※☆※

بظاہر تو یوں لگتا تھا جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ حالانکہ مستقل مصلحتوں سے کام لیتا رہا تھا۔ لیکن ہیگ کو دیکھ کر نجانے کیوں یہ شدید جنون سوار ہو گیا تھا کہ ہیگ کا کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔

بہرحال جہاز پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بحریہ کے ہیڈ کوارٹر سے ولیم کا پیغام لے کر کوئی شخص آیا تھا۔ ولیم نے کہلوایا تھا کہ میں آج شام کو ہیڈ کوارٹر میں مصروف رہوں گا۔ باورچی سے کہو کہ جو چیزیں شام کو تیار کرنے کے لئے بتائی تھیں وہ ابھی دوپہر میں تیار کرے اور بازار جا کر کچھ اور سامان لے آئے۔ شام کے کھانے پر کیپٹن کے علاوہ دو اور افراد کھانے پر آ رہے ہیں۔ میں اس پیغام کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے باورچی کے ساتھ فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہئے کیونکہ جہاز کا کیپٹن کل کی بجائے آج ہی آ رہا ہے۔

اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اردلی اور باورچی نے کپتان کے کیبن سے میرا اور ولیم کا سامان ہٹا کر میرا مختصر سا سامان سوٹ کیس میں جما دیا تھا۔ وہ دونوں نہایت بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ باورچی نے اپنا کام کا لباس یعنی بنیان اور ایپرن اتار کر استری کی ہوئی جینز کی پتلون، سفید قمیض پر ٹائی باندھ رکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے جوتے چمچما رہے ہیں اور بالوں میں بہت سا تیل ڈال کر اس نے بڑی نفاست سے کنگھا بھی کیا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھے بتایا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں جہاز چھوڑ دینا چاہئے۔

اردلی مجھے سلام کرنے کے بعد رخصت ہو گیا تھا۔ باورچی ایک لمحے تک کیبن کے دروازے پر اٹینشن کھڑا رہا، پھر بولا۔ ”سر! آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بیل دے دیجئے، میں ویٹ کرتا ہوں۔“ پھر اس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور چلا گیا۔

میری زندگی کا اہم موڑ آ پہنچا تھا۔ اس وقت مجھے فوراً ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ باورچی

کے ساتھ جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہیگ ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ دوسری طرف ولیم کے جہاز پر ٹھہرنا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ باورچی کو دھوکا دے کر اگر میں جہاز سے کھسک جاتا ہوں تو بمبئی میں کہاں سر چھپاؤں گا؟ اگر کسی ہوٹل میں پہنچتا ہوں تو میرے پاس سامان تو کچھ ہے نہیں۔ لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہوٹل میں ٹھہر کر مجھے کرنا بھی کیا ہے۔ مجھے ہر قیمت پر ہیگ کے جہاز پر سوار ہونا ہے اور وہ بھی ٹکٹ اور پاسپورٹ کے بغیر۔

میں بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ دس بارہ دن مجھے اس جنگی جہاز پر بھرپور آرام ملا تھا۔ پناہ ملی تھی۔ اور اس دوران میں یہ بھول گیا تھا کہ بمبئی کی پولیس شکاری کتوں کی طرح مجھے سونگھتی پھر رہی ہے۔ میرا حلیہ اگرچہ بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اس شہر میں یا پھر بمبئی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں آسانی سے چھپا رہ سکوں گا۔ میں نے جھلاہٹ میں لکڑی کی الماری پر گھونسا مارا۔ میں آخر چھپے رہنے کے امکان پر کیوں غور کر رہا ہوں؟ مجھے اب صرف ایک مسئلے پر سوچنا چاہئے۔ وہ یہ کہ اب میں سائے کی طرح ہیگ کے پیچھے لگ جاؤں اور موقع پا کر اپنی تباہی کا بدلہ لے لوں۔ وہ ہندوستان سے باہر جا رہا ہے، مجھے بھی یہ ملک چھوڑنا ہے۔ وہ میرا سب سے خطرناک دشمن ہے اور مجھے ہر صورت میں اسے ختم کر دینا ہے۔

میں نے دیکھا کہ میرے گھونسا مارنے سے الماری کا ایک پٹ نکل گیا۔ الماری میں ہینگروں میں قطار در قطار ولیم کی وردیاں سلیقے سے استری سے ٹنگی ہوئی تھیں۔ اور میرے شیطانی ذہن میں ایک اور جھماکہ ہوا۔ حالانکہ میرا ذہن شیطانی ذہن نہیں تھا بلکہ میں تو بہت ہی اچھے انداز میں سوچنے کا عادی تھا۔ لیکن اب شیطنت مکمل طور پر میرے سارے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ میرے عیار ذہن نے پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے کپڑے اتار ڈالے۔ الماری کی دراز میں تہہ در تہہ وردی کی قمیصیں استری کی ہوئی رکھی تھیں۔ سرکاری موزے، سرکاری جوتے، سرکاری ٹائی۔ تین منٹ کے بعد جب میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا تو میں نے اپنے آپ کو شاہی بحریہ کا ایک لیفٹیننٹ پایا۔ نیوی والوں جیسی داڑھی اور نیوی کا ہیئر کٹ۔ سر سے پیر تک نیوی کا افسر معلوم ہو رہا تھا۔

سے آگے بڑھتا ہوا ڈیک پر پہنچ گیا۔ ابھی میں نے ڈیک پر قدم ہی رکھا تھا کہ سامنے سے کوئی آتا نظر آیا۔ میں فوری طور پر کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا چنانچہ ڈیک پر بنے ہوئے ایک ہوا دان کے پاس پہنچ گیا۔ آنے والا ہوا دان سے کچھ فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔ پھر شاید وہ واپس ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ قدموں کی چاپ اب دور ہو رہی تھی۔ دروازہ پھر کھلا اور بند ہو گیا۔ آنے والا نجانے کیوں واپس چلا گیا۔ میں ہوا دان کے پیچھے سے نکل کر جلدی سے گیٹ وے کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے میں نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے بستر کے گدے کے نیچے چھپا دیئے تھے۔ کتابوں کی الماری کھول کر دونوں جوتے بھی کتابوں کی قطار کے پیچھے ڈال دیئے تھے۔

بہرحال میں آگے بڑھا اور میرا خیال یہی تھا کہ اردلی اور باورچی مجھے نہ دیکھ سکیں کیونکہ ولیم کی وردی پہننے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی شک ہو جاتا کہ میں ان کے ساتھ کوئی چال چل رہا ہوں یا ولیم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں تو دونوں اپنے افسر کے اس قدر وفادار تھے کہ اس کے آنے تک مجھے پکڑ رکھنے سے دریغ نہ کرتے۔ باورچی تو پینٹری میں ہو گا۔ جب تک اسے بیل بجا کر بلایا نہ جائے، وہ وہیں رہے گا۔ اردلی کی کوٹھڑی بھی اسی طرف تھی۔ مجھے خدا حافظ کہہ کر وہ سیدھا وہیں گیا ہو گا۔ بظاہر میدان صاف تھا۔ میں دبے قدموں سے اترتا ہوا ڈیک پر آ گیا اور وہاں سے گیٹ وے تک پہنچنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ ہلکی سی آہٹ سن کر باورچی یا اردلی ڈیک پر آ سکتے تھے۔ میرے سر پر جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کنپٹی کی ایک رگ یوں پھڑک رہی تھی جیسے ابھی تڑخ جائے گی۔ پانچ قدم...... پانچ قدم اور گیٹ وے دس قدم دور تھا۔

پینٹری کی طرف کوئی دروازہ کھلا اور بند ہو گیا اور کہیں قدموں کی چاپ بیدار ہو گئی۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر چھپنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ اور اس کے بعد جب مجھے اندازہ ہوا کہ آنے والا گزر گیا ہے تو میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

شام کے ساڑھے پانچ بجے تک کا پورا منصوبہ تیار تھا۔ یہاں سے میں سیدھا مسافروں کی گودیوں کی طرف جاؤں گا اور وہاں نو نمبر برتھ پر ہیگ کا جہاز لگ گیا ہو گا۔ بحریہ کی وردی میں کسی بھی جہاز پر بلا روک ٹوک چڑھ جانا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔

جہاز بیچ سمندر میں نہیں اتر جاتا۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ سب بعد کی باتیں ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ خطرہ تو مول لینا ہی ہے۔

بہرحال گیٹ وے سے اتر کر میں گودی کے پختہ فرش پر آ گیا اور میری دانست میں بہت بڑا معرکہ سر ہو گیا۔ میں نے گارڈ روم کا راستہ دیکھ لیا تھا اور پھر میں فوجیوں کی طرح باوقار انداز میں تیز تیز چلنے لگا۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہو چکی تھی اور دور دور تک کرینیں اور فوجی گاڑیاں قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اِکا دُکا مزدور یا بحریہ کا کوئی وردی پوش کارکن سامنے سے تیزی سے گزر جاتا تھا۔ بائیں طرف سے دو سائیکل سوار فوجی گارڈ روم کی طرف جانے کے لئے میرے قریب سے گزرے تو انہوں نے گردنیں تان کر دائیں طرف اپنے سر کو جھٹکا۔

''اٹ از رائٹ۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کا سلام لیا اور اس وقت کالج میں اسکاؤٹ کے لئے جو تربیت لی تھی اس نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ میرا جوابی سیلوٹ سو فیصدی لیفٹیننٹ کا سیلوٹ تھا۔ ابھی میرا اٹھا ہوا ہاتھ شانے سے نیچے بھی نہیں گرا تھا کہ گارڈ روم سے چھوٹی سی بحریہ کی ایک کار نکلی اور میری طرف بڑھی۔ اسٹیئرنگ پر میرا دوست ولیم ہاروے تھا۔ اس کی نظریں اپنے جہاز پر لگی ہوئی تھیں ورنہ قدرتی طور پر وہ سامنے سے آتے ہوئے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتا۔ تیز دھوپ میں میری وردی کی آستینوں پر عہدے کی سنہری پٹیاں دور سے چمک رہی تھیں۔ میرا دل شدید رفتار سے دھڑکنے لگا۔ لیکن بہرحال میں جلدی سے گھوم گیا۔ سائیکل سوار فوجی چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ میں نے رعب دار آواز میں انہیں پکارا۔

''جوانز، کم ہیئر۔''

فوجیوں نے سائیکلیں روک دیں اور پاؤں ٹیک کر مجھے دیکھا۔ میں نے جاتی ہوئی کار کی طرف پشت کئے ہوئے ہی انگریز افسروں کی سی شان سے کہا۔

''ادھر آؤ۔''

دونوں جوان سائیکلوں سے اتر کر میری طرف آ گئے۔ میں نے یہ سب کچھ فوری ہیجان کے تحت کیا تھا۔ اب اگر ولیم گاڑی سے اتر کر اس طرف دیکھتا بھی ہے تو یہ ایک عام سا منظر ہوگا کہ ایک لیفٹیننٹ دو فوجیوں سے کھڑا باتیں کر رہا ہے۔ البتہ میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ انہیں روک تو لیا ہے میں نے لیکن انہیں کیا کہوں گا۔ میرے کان کار کی

طرف لگے ہوئے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ کار کا انجن بالکل بند ہو گیا ہے۔ اب ولیم گاڑی سے اترے گا اور ممکن ہے جہاز پر چڑھنے سے پہلے وہ اس طرف دیکھ لے۔ دونوں فوجی میرے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے زمین پر بوٹ مار کر کہا۔

''یس سر!''

وہ دونوں ایک ایک ہاتھ سے سائیکل پکڑے اٹینشن کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک لمحے میں میرے ذہن میں گڑبڑ سی ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اب میں ان سے کیا کہوں، کیا بات کروں۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ آخر آگے ایک دم بڑھ کر ایک جوان کی جیب کے فلیپ پر انگلی ماری، ایک فلیپ کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ یہ بے ضابطگی تھی اور انسپکشن کے وقت ایسی کسی بے ضابطگی کی سزا دی جا سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''تم نے پاکٹ کی فلیپ کا بٹن نہیں لگایا۔ کیوں؟''

جس شخص سے میں نے یہ الفاظ کہے تھے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے اور زیادہ اٹینشن ہو گیا۔

''آئی...... آئی ایم سوری سر۔''

اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب کیا کروں۔ اگر میں ان کے ساتھ گارڈ روم تک پہنچ جاؤں تو خطرے سے باہر ہو جاؤں گا۔ میں نے پھر کہا۔

''یہ بہت غلط ہے...... بہت غلط ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔'' یہ کہہ کر میں نے رعب کے ساتھ گارڈ روم کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ دس، بیس، تیس اور پچاس قدم۔ اور ہم لوگ گھوم کر گارڈ روم میں پہنچ گئے۔ مسلح سنتری نے اٹینشن ہو کر مجھے سلام کیا۔ ہم گارڈ روم سے گزرتے ہوئے باہر سڑک پر آ گئے۔ ابھی میں پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے دونوں گارڈز کی حالت خراب تھی۔ میں نے کہا۔

''ٹیکسی...... ٹیکسی نہیں ملے گا اس وقت؟''

میرے اس غیر متوقع سوال پر وہ دونوں حیران سے ہوئے اور پھر جس شخص پر میں نے اعتراض کیا تھا اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس عرصے میں اپنی جیب کا فلیپ بند کر چکا ہے۔

''سر! مل جائے گی۔ ابھی لے کر آتے ہیں۔ آپ گارڈ روم میں تشریف رکھئے۔''

"اوکے...... اوکے۔ جاؤ۔ مگر ٹھہرو، میں کسی سے لفٹ لے لوں گا۔ اوکے...... تم جاؤ۔ تھینک یو۔" وہ دونوں اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر سیلوٹ مار کر سائیکلوں پر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ میں سڑک پر کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس منحوس جگہ سے دور پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن میں اگر کچھ دیر یہیں کھڑا رہا تو مجھے ولیم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں لفٹ مانگوں مگر کس سے؟ سڑک تو دور دور تک ویران پڑی ہوئی تھی۔

دفعتہً ہی مجھے ایک ٹرک آتا ہوا نظر آیا اور میں تیار ہو گیا۔ اب چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے، مجھے اس ٹرک کو روک کر یہاں سے بھاگنا ہے۔ ٹرک میرے قریب آ کر رکا تو اچانک ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر وہی فورمین بیٹھا ہوا تھا جس کی مجھ سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اس نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا اور نیچے اتر آیا۔ پھر سلام کر کے بولا۔

"یس سر! کیا حکم ہے؟"

میں ٹرک کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ ولیم کی گاڑی گارڈ روم پر آئی، لمحے بھر کے لئے رُکی اور پھر چل پڑی۔ وہ ادھر ہی آ رہی تھی۔ میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور اندر سیٹ پر بیٹھ کر فورمین کو اشارہ کیا۔

"تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔ مجھے بھی اس طرف جانا ہے۔ مجھے کوئی ٹیکسی چاہئے۔ چلو، میرا کام بہت جلدی کا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ٹرک ڈرائیور کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو جو سمت بتائی تھی وہ اس سمت سے مختلف تھی جہاں ولیم کی گاڑی مڑی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ولیم نے اپنی گاڑی کی رفتار ہلکی کر لی اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے ٹرک کے دروازے پر اس طرح ہاتھ رکھ لیا کہ عہدوں کے نشانات بھی چھپ گئے اور میرا چہرہ بھی بازو کی آڑ میں ہو گیا۔

ولیم ٹرک کا جائزہ لیتا ہوا وکٹوریہ ٹرفیس جانے والی سڑک پر رک گیا۔ ہمارے ٹرک نے دوسری سڑک پکڑ لی تھی۔ کچھ اور آگے نکلے تو میں نے خود کو سنبھال کر گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ یہ سڑک مسافر گودی کی طرف جا رہی تھی۔ آگے چل کر اسی راستے پر تھوڑا سا گھومتے ہوئے وکٹوریہ ٹرفیس آ جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میں ٹرک سے اتر کر براہ راست ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں گا تو کوئی خطرے کی بات نہیں رہے گی۔ البتہ اگر میں اتر کر

سڑک پر کھڑا ہوا اور کسی ٹیکسی کا انتظار کیا تو ضرور پکڑا جاؤں گا۔ ولیم اس علاقے میں گشت لگاتا رہے گا۔ نجانے کیوں مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے ہی ڈھونڈنے کے لئے نکلا ہے۔

بہرحال کچھ دور ایک خالی ٹیکسی نظر آئی تو میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ٹرک کی رفتار بڑھا کر ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کرے۔ ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی رک گئی اور میں ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہتا ہوا ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ میرا ذہن اب برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ جب کوئی مجرمانہ عمل کیا جاتا ہے تو انسانی ذہن اس پر پورا پورا تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ دفتر کے سامنے میں نے ایک صاف ستھرا چائے خانہ دیکھا تھا۔ یہ دفتر ٹامس کک کا دفتر تھا۔ اس علاقے میں غیر ملکیوں کی آمد و رفت رہتی تھی اس لئے چائے خانہ بہت شاندار قسم کا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یہ پتہ بتا کر میں نے لیفٹیننٹ کی ٹوپی اتاری اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

آخر کار ٹیکسی اس چائے خانے پر پہنچ گئی۔ لنچ کا وقت تھا اور چائے خانہ بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر تجارتی فرموں کے لوگ کھا پی رہے تھے۔ صرف چائے پینے والے کم ہی نظر آتے تھے۔ صبح سے پے در پے ایسے ہیجان خیز واقعات ہوئے تھے کہ میری بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ بہرحال میں چائے خانے میں جا بیٹھا اور ویٹر کو چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس کا بھی آرڈر دے دیا۔ پھر میں چائے پیتا رہا۔ لنچ کرنے والے رفتہ رفتہ چھٹتے جا رہے تھے۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ اب ذہن کسی طرح مطمئن ہو گیا تھا۔ میں ہیگ کے جہاز پر سوار ہونے کے منصوبے پر ہر پہلو سے غور کرتا رہا تھا۔ صورتحال کے بہت سے پہلو ایسے تھے جن کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ہیگ کہاں جا رہا ہے۔ بہرحال وہ دفتر میرے سامنے تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے کاؤنٹر پر جا کر پوچھوں کہ نو نمبر برتھ پر کون سا جہاز لگ رہا ہے اور یہ جہاز کہاں جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات فضول سی معلوم ہوئی۔ بہرحال اب ہیگ کہیں بھی جا رہا ہے، مجھے یہ بات نظر انداز کرنی ہے۔ میں کون سا قانونی طور سے کسی جہاز سے سفر کروں گا۔ ایک مجرمانہ سفر کرنا ہے مجھے۔ لیکن ہیگ کو چھوڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ کہیں بھی جائے، مجھے اس کے پیچھے جانا ہے۔

جہاز پر سوار ہونے کا مسئلہ تو میں نے حل کر ہی لیا تھا۔ لیفٹیننٹ کی وردی کے نیچے کمر

سے وہ بیلٹ بندھی ہوئی تھی جس میں بہت کچھ میرے پاس موجود تھے۔ میں نے بہت
سے روپے تبدیل کرائے تھے اور اب بے شمار امریکی ڈالر اور پاؤنڈ میرے پاس موجود
تھے۔ اس کے علاوہ برٹش انڈیا کے جو نوٹ باقی بچ رہے تھے وہ بھی میرے پاس موجود
تھے۔ میں اس کا کوئی مصرف دریافت نہیں کر سکا تھا۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ میں ٹریولر
چیک لے لیتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ جہاز کی روانگی میں چار گھنٹے سے زیادہ تھے۔ میں یہ
رقم ڈالر میں تبدیل کر لیتا یا پھر اس کے جواہرات خرید لیتا۔ مجھے پتھروں کی پہچان تھی۔
اس شہر میں ایک سے ایک بڑا جوہری پڑا ہوا ہے۔ دھوکا کھانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔
کسی ایسی بڑی دکان کو دیکھتا ہوں جہاں اس رقم سے جواہرات خریدے جا سکیں۔
جواہرات کی زبان اس دنیا میں عام ہے اور صحیح معنوں میں وہ ٹریولر چیک سے زیادہ محفوظ
چیز ہوتے ہیں۔

دفعتہً ہی ایک نام میرے ذہن میں آیا۔ یہ سیٹھ سلطان میاں جواہر والے تھے۔ ایک
بہت بڑے جاگیر دار۔ ریاست کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے طبقے سے
اس درجے مختلف تھے کہ انہوں نے بہت سے کاروباروں میں روپیہ لگایا ہوا تھا اور اس
زمانے میں کروڑ پتی تھے جب ہزار پتی کی حیثیت بھی ہزار پتی کہلاتی تھی۔ میں بیسیوں
مرتبہ ان کے ساتھ شکار پر جا چکا تھا۔ والد صاحب کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے
اور سچی بات یہ ہے کہ جواہرات کا کاروبار ان لوگوں نے صرف اس لئے شروع کیا تھا کہ
مہم جوئیوں میں والد صاحب کے ساتھ رہے تھے اور بہت سی جگہوں سے لاتعداد نوادرات
ان کے ہاتھ لگے تھے۔ بس ان نوادرات کے حصول کے بعد اسی شوق میں جوہری بن
گئے تھے اور اس وقت بمبئی میں سب سے بڑی دکان انہی کی تھی۔ پرانے ٹائپ کے جھکی
سے انسان تھے۔ اکثر ریس کھیلنے کے لئے بمبئی آتے رہتے تھے۔ ایک بار بمبئی میں قیام
کے دوران جوہری بازار سے گزر رہے تھے کہ خیال آیا کیوں نہ بیگم کے لئے موتیوں کا
اچھا سا ہار خرید لیں۔ ان کا حلیہ ہمیشہ ہی خراب رہتا تھا۔ میلا کرتہ پائجامہ اور روئی کی
سدری اور سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ اور بٹوا۔ البتہ دو تین ریاستی پھنٹے باز کم
وبیش انہی کی طرح خراب حلیے میں پان چباتے ہوئے ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔
اس دن جب وہ جوہری بازار سے گزر رہے تھے تو وہ لوگ ان کے ساتھ ہی تھے۔
جس جوہری کے ہاں وہ پہنچے اس نے نئی دکان خریدی تھی۔ سلطان میاں سے واقف نہیں

تھا۔ حلیہ بھی ان کا ایسا تھا کہ کوئی بھی انہیں دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے آدمی
ہوں گے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ اس دوران سلطان میاں نے کہا۔
"ہاں بھئی، ذرا موتیوں کا کوئی ستر واں ہار دکھاؤ۔" جوہری نے ملازموں کو اشارہ کیا۔
ملازموں نے دو تین ہار سامنے رکھے تو انہوں نے بھولے پن سے کہا۔
"ارے ہاں، یہ تو بتاؤ کہ چاندی کی انگوٹھیاں بھی مل جائیں گی کیا عقیق والی؟"
جوہری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جب انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر
عقیق جڑی ہوئی چھ سات چاندی کی انگوٹھیاں دکھائیں تو وہ جا کر سمجھا کہ میاں کیا طلب
کر رہے ہیں۔ ایک ملازم نے کسی قدر رعونت سے کہا۔
"نہیں جناب! آپ نے شاید اس دُکان کی حیثیت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ اگر آپ
کو ایسی گھٹیا انگوٹھیاں چاہئیں تو وہ سامنے والی گلی میں آگے چلے جایئے، فٹ پاتھ پر ایک
شخص چادر بچھائے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ انگوٹھیاں اس کے پاس مل جائیں گی۔ اچھی انگوٹھیاں
ہیں، چار چار، پانچ پانچ روپے کی مل جائیں گی۔ بات کریں گے تو شاید دو چار آنے کم کر
دے۔"
سلطان میاں اور ان کے ساتھی اب بھی نہیں سمجھے کہ ملازم کیا کہنا چاہتا ہے۔ اپنے
ایک ساتھی سے بولے۔ "پتہ سمجھ لو عقیل میاں۔ یہاں سے اٹھ کر وہیں چلیں گے۔"
ادھر دکان کا مالک جوہری ان تمام لوگوں کو عجیب سے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اسے
غصہ آ رہا تھا کہ یہ گھٹیا درجے کے لوگ کس طرح اس عظیم الشان دکان میں گھسے چلے
آئے ہیں۔ سلطان میاں کہنے لگے۔
"بھئی یہ جو ہار تم نے ہمیں دکھائے ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ ہیں تمہارے پاس؟
کوئی ڈھنگ کی چیز دکھاؤ یار! یہ کیا گھٹیا چیزیں میرے سامنے لا کر رکھ دی ہیں۔"
اب دُکان کے مالک سے نہ رہا گیا۔ اس نے ملازموں کو اشارہ کر کے کہا۔ "ہٹا لو یہ
ہار...... ہٹا لو۔ ہٹا لو یہ سامان اس کے سامنے سے۔ جی، کیا چاہئے آپ کو جناب؟ یہ
چاندی کی چار چار روپے والی انگوٹھیاں آپ یہاں اس دُکان سے طلب کر رہے ہیں۔
آپ کو پتہ ہے کہ یہ اصلی موتیوں کی دُکان ہے۔ ہم اصلی موتیوں کے ہار بیچتے ہیں
بھائی۔ جاؤ، سامنے وہ گلی ہے اس میں تمہارے مطلب کی چیزیں مل جائیں گی۔"
سلطان میاں کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ شخص ان کا مذاق اڑا رہا ہے اور انہیں گھٹیا

سمجھ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ''ریاض میاں! اس سے پوچھو کہ بیچ رہا ہے اپنی یہ سچے موتیوں کی دُکان، کیا لے گا اس کے؟''

جوہری اور اس کے ملازم ہنسنے لگے۔ دُکان کے مالک کو بھی مسخرہ پن سوجھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر مسخرے پن سے کہا۔ ''بس جناب! معاف کر دیجئے گا، غریب آدمی ہوں۔ روزی کمانے دیں۔ جائیے، جائیے اس غریب آدمی کی روزی چھیننے کی کوشش مت کیجئے۔''

''ہوں...... مطلب کیا ہے، یہ بتاؤ۔ آؤ بھئی...... ذرا باہر آ جاؤ۔ کہیں یہ بیوقوف آدمی یہ نہ سمجھے کہ ہم اس کی دکان میں ڈاکا ڈالنے آئے ہیں۔ اور تم عقیل میاں ہمارے بینکر کو بلا لاؤ۔ جاؤ، جو ہم کہہ رہے ہیں وہ کرو۔''

وہ نیچے اتر آئے اور پھر بپھرے ہوئے شیر کی طرح دیوار کے سامنے ٹہلتے رہے۔ ان کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ان کا بینکر بھی آ گیا تھا۔ یہ ایک پارسی تھا اور سلطان میاں کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ سلطان میاں نے کہا۔

''جاؤ ذرا اس دکان کا سودا کرو۔ یہ ہمارا حکم ہے۔''

بینکر نے اس دُکان میں جا کر صورتحال معلوم کی اور جب اسے اس صورتحال کا پتہ چلا تو اس نے کہا۔ ''سیٹھ جی! کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا۔ جانتے ہو وہ کون ہیں؟''

''انہیں تو نہیں لیکن آپ کو جانتا ہوں جناب! آپ......''

''اب دُکان بیچ دیں آپ۔ یہ دُکان یہاں قائم نہیں رہے گی۔ وہ بہت بڑے نواب ہیں۔'' اور اس کے بعد بینکر، جوہری کو سلطان میاں کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا۔

جوہری کے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ اس دوران سلطان میاں فٹ پاتھ پر کھڑے غصے سے لال پیلے ہوتے رہے تھے۔ جوہری نیچے آیا اور ہاتھ جوڑ کر اس نے معافی مانگی اور کہنے لگا۔

''آپ مجھے معاف کر دیں جناب! میں آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ آئیے...... میری دکان میں آئیے۔''

''ابے تیری اور تیری دُکان کی ایسی تیسی۔ تو نے کیا سمجھا ہے، پٹھان ہوں پٹھان۔''

وہ کسی طور مان کر نہ دیئے دُکان دار نے بہت کچھ کہا لیکن بس شامت ہی آ گئی تھی۔ اس وقت تک سلطان میاں سکون سے نہ بیٹھے جب تک منہ مانگی قیمت دے کر انہوں نے وہ دُکان نہ خرید لی۔ اور جب دُکان خرید لی گئی تو سلطان میاں اپنے اسی ٹولے کے ساتھ اسی حلیے میں آئے اور بھرے بازار میں سیٹھ اور اس کے ملازموں کو گدی سے پکڑ کر دُکان

سے نیچے اُتار دیا اور دُکان میں تالہ ڈال کر واپس چلے گئے۔

ہفتے بھر کے بعد جب واپس لوٹے تو سناروں اور دوسرے کارندوں کی ایک پوری ٹیم ان کے ساتھ موجود تھی۔ دُکان پر اپنا بورڈ لگوا دیا۔ سلطان میاں جواہر والا۔ اور اس کے بعد باقاعدہ کاروبار پھیلا دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج دس برس کے بعد پورے صرافے میں میاں سلطان کی ٹکر کی کوئی دُکان نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ راجے، نوابوں کے بھائی بند تھے۔ درجنوں ریاستوں سے ان کا نقد اور اُدھار لین دین چلتا تھا۔ ان کی دُکان ریاستی کارندوں کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتی تھی۔ دُکان کے اوپر کی منزل میں انتہائی شاندار دو کمرے ہر وقت تیار رہتے تھے کہ آج کسی ریاست کے دیوان صاحب بمبئی کی سیر کے لئے تشریف لائے ہیں تو کل راجن گھاٹ کے وزیرِ خزانہ راجہ کی بٹیا کے جہیز کا سامان خریدنے آ رہے ہیں۔ ان کا وہی پرانا بینکر گویا افسرِ منصوبہ بندی تھا۔ ایسی ایسی ترکیبیں بتاتا تھا کہ راجواڑوں سے گویا ایک کی جگہ چار چار وصول ہوں اور احسان کا احسان الگ رہے۔

اس وقت مجھے وہی سلطان میاں یاد آ گئے تھے اور ایک دم سے میرے ذہن میں پرانی باتیں گونج گئی تھیں۔ سلطان میاں ان لوگوں میں سے تھے کہ اگر میں اس وقت ان کے پاس جا کر کہوں کہ سلطان چچا میں چالیس آدمیوں کو بم سے اڑا کر آ رہا ہوں تو مزے سے پان چباتے ہوئے فرمائیں گے کہ کوئی بات نہیں ہے شہزادے، تم منہ ہاتھ دھو کر کھانا وانا کھاؤ، ہم کوئی بندوبست کرتے ہیں۔

بہرحال میں نے قریب کی دُکان سے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں سلطان میاں کی دُکان کا نمبر دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہ دُکان پر موجود تھے۔ میں نے ٹیلی فون پر کہا۔

''وہ سلطان صاحب! میں سالمی فارم والا ہمدان جمشیدی کا بیٹا بول رہا ہوں۔''

''جمشیدی میاں...... اچھا...... ارے کیا، کون...... جمشیدی بھائی کے بیٹے؟''

''جی ہاں وہی۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ بڑے گدھے ہو اور ٹیلی فون کر رہے ہو۔ ابے میں تیرا چچا ہوں۔ مجھ سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ اگر بمبئی میں ہے تو کیا تجھے سیدھا میرے پاس نہیں آنا چاہئے تھا؟''

''جی یہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ معلوم کر لوں آپ دکان پر ہیں یا نہیں۔''

"آ جاؤ...... آؤ جلدی آؤ۔ تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔ دیکھو اب ٹیلی فون پر ایک لفظ بھی نہ کہو، میرے پاس آ جاؤ۔"

میں حیران رہ گیا۔ ادھر سے ٹیلی فون بند ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی ٹیلی فون بند کر دیا۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں اور انہیں کیسے معلوم کہ میں......

بہرحال کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دم دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میری تلاش میں پولیس ان کے ہاں بھی پہنچی ہو۔ یعنی شہرت حوالے سے سیتا گڑھی اتنی معمولی جگہ نہیں تھی۔ اور وہاں کے رہنے والے اتنے عام لوگ نہیں تھے کہ پولیس یہ نہ جان سکتی کہ سلطان میاں کا تعلق بھی سیتا گڑھی سے ہے اور میرا بھی۔ بہرحال اگر ایسا بھی ہوا ہے تب بھی پریشانی کی یہ بات نہیں ہے۔ سلطان میاں ہر صورت میں میرے مددگار ہی ثابت ہوں گے۔

میں نے ایک ٹیکسی روکی اور جوہری بازار روانہ ہو گیا۔ سلطان میاں کی عظیم الشان دُکان یا شو روم کے سامنے میں نے ٹیکسی رکوائی، بل ادا کیا اور دُکان میں داخل ہو گیا۔ فوراً ہی دو ملازموں نے مجھے اٹینڈ کیا تھا اور بولے۔

"جناب والا! آیئے، تشریف رکھیے۔ جو کچھ درکار ہو بتا دیجیے گا۔ آیئے۔"

"بھائی مجھے سلطان صاحب سے ملنا ہے۔"

"اچھا اچھا، تشریف لایئے۔" ملازموں کا ادب و آداب دیکھنے کے قابل تھا۔ انہوں نے بڑے احترام سے مجھے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا دیا۔ اندر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اپنی اسی روایتی شان سے سلطان میاں پڑے اونگھ رہے تھے لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہی ٹوپی، وہی سدری گویا زندگی کی ڈگر میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھے اور سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

"سلطان چچا، میں ہمدان جمشیدی کا بیٹا خاقان جمشیدی ہوں۔"

"ایں......" وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ پھر مجھے ساتھ لانے والے نوکروں سے بولے۔ "جاؤ دروازہ باہر سے بند کر دو اور کسی کو اندر مت آنے دینا۔ ہمارا بھتیجا آیا ہے، ہم اس سے باتیں کر رہے ہیں۔"

سلطان میاں پرانے ٹھاٹ باٹ کے آدمی تھے۔ میں پرانی دوستیوں کے رشتے سے

ان کا بھتیجا تھا اور سلطان میاں جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس میں چھوٹوں کے ساتھ اپنی شفقت کا اظہار کرنے کا انداز ذرا مختلف تھا۔ انہوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... تو تم سمندری فوج میں ملازم ہو۔"

"جج...... جی ہاں۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"ہوں...... سنا ہے ہوٹل میں تم نے کوئی آدمی مار ڈالا ہے۔" ان کے یہ الفاظ میرے حواس پر بم کا دھماکہ بن کر گرے تھے۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ ان کا سوال تھا چنانچہ جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ابے بھوتنی کے چھپر! مجھے نہیں پہچانتے ہو؟" اس انوکھی گالی پر مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ خود بھی ہنس پڑے اور بولے۔

"قصہ وِسہ کیا تھا...... کوئی عورت وورت کا چکر تھا کیا؟"

میری گردن جھک گئی تو وہ پھر ہنس پڑے اور بولے۔ "ابے تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ اللہ بخشے وہ جو کہتے ہیں نا کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا۔"

یہ جملے ادا کر کے وہ ایک دم خاموش ہو گئے پھر یوں لگا جیسے انہیں اپنے الفاظ پر شرمندگی ہوئی ہو۔ انہوں نے کسی قدر دُکھ بھری آواز میں کہا۔

"اللہ بخشے ہمدان بھائی کو، اس وقت زندہ ہوتے تو یہ کیس بن ہی نہیں سکتا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہ زندہ نہیں، ہم تو زندہ ہیں۔ بتاؤ...... بتاؤ بیٹھو اور مجھے پورا قصہ بتاؤ۔ لیکن ایک بات سمجھ لو، بولنا سچ ہے۔ میرے پاس ایک جادو کی انگوٹھی ہے، یہ دیکھو۔" انہوں نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی ایک انگوٹھی مجھے دکھائی اور بولے۔ "یہ انگوٹھی کا نگینہ دیکھ رہے ہو نا، جھوٹ بولو گے تو یہ سبز سے سرخ ہو جائے گا۔ اور بس سمجھ لو کہ جھگڑا بڑھ جائے گا۔"

انگوٹھی کے نگینے کا مسئلہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن ان سے واقعی جھوٹ بولنا جائز نہیں تھا۔ بہرحال میں نے محتاط انداز میں انہیں ہوٹل کا واقعہ سنایا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ انہی کی جوانی کا قصہ ہو۔ موقع موقع قہقہے لگا دیتے۔ کبھی حیران ہو کر آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگتے یا ہونٹوں کو گول کر کے سر ہلانے لگتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں اس داستان میں بہت ہی لطف آ رہا ہو۔ اسی دوران دو بار

بٹوے سے گلوری نکال کر منہ میں دبا چکے تھے۔ آنکھوں میں بچوں جیسی شرارت کھیل رہی تھی۔ جب میں پورا قصہ سنا چکا تو جلدی سے بولے۔

"ہائے ہائے...... کہاں ہے اب وہ چھنلیا!"

ایک لمحے تک تو میں چھنلیا نہ سمجھ سکا۔ لیکن پھر بات سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے ان کی چمکدار آنکھوں میں شکاریوں جیسی تجسس کی لہریں موجیں مار رہی ہوں۔ میرے ہونٹوں پر ایک دم مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے مجھے مسکراتے دیکھا تو ایک دم سے جھینپ گئے اور پھر ایک گندی سی گالی دے کر بولے۔

"بھوتنی کے چھپر، مسکراتا کیوں ہے؟ سسرے! بس کیا کہوں تجھ سے، خیر...... خیر وہی کہنے والا تھا۔ ہمدان جمشیدی کو تجھ سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ باپ تو وہ تیرا تھا لیکن دوست میرا تھا۔ ابے ہم نے کیا کیا کھیل نہیں کھیلے بیٹا! تم ایک ہی کھیل میں چت ہو گئے۔ دھت تیرے کی۔ اور اس کے بعد اپنے آپ کو ہمدان جمشیدی کا بیٹا کہتا ہے۔ خیر تو جان اور تیری وہ۔ ہمیں اس سے کیا لینا۔ اچھا ایک بات بتا، آگے کیا منصوبہ ہے؟"

"کچھ نہیں چچا! یہ میرے پاس کچھ برٹش انڈیا کے نوٹ ہیں۔ یہ......"

"بس بس بس...... نوٹ ووٹ کی کوئی مشکل نہیں ہے۔ تجھے جو چاہئے مجھ سے لے لے۔ پھر وھر لے جایا کہے تو پونڈ منگوا دوں۔ اصل جھگڑا تو ٹکٹ کا ہے۔"

"چچا، اس وردی میں جہاز پر چڑھنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"ابے تیری...... کیا کہوں، تیری ماں بھابی ہے ورنہ تجھے ماں کی گالی دیتا۔ ابے جہاز پر تو چڑھ جائے گا مگر رہے گا کہاں؟ کیبن کے بغیر رہے گا جہاز میں؟ کھائے پئے گا کہاں؟ چھپا چھپا پھرے گا۔ یہ کوئی زندگی ہوگی، ایں؟...... میرے پاس آنے کے بعد ایسی باتیں کر رہا ہے۔"

"نہیں چچا، جہاز پر کسی کو کچھ دے کر اپنا بندوبست کر لوں گا۔"

"چل تیری ایسی تیسی۔ یار! تو ہے کیا چیز؟ یا تو، تو وہ ہے وہ جو میں تجھے نہیں کہہ سکتا یا تو مجھے وہ سمجھتا ہے۔ ابے سمندری فوج میں ملازم ہے تو اور جہاز کے طور طریقے نہیں معلوم تجھے۔ اول تو انگریز کی عملداری ہے، کوئی ریاستی ٹنٹا نہیں ہے۔ جہاز کے جس ملازم سے دینے دلانے کی بات کرے گا گدی سے پکڑ کر کپتان کے پاس لے جا کر کھڑا کر دے گا یا پھر کوئی آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا، پیسہ دھیلا لے کر تمہیں چھپائے رکھنے پر

راضی ہو بھی گیا تو چھپائے گا کہاں، جانتے ہو؟ کسی کوئلے کے گودام میں یا آٹے چاول کے اسٹور میں چوہے کی طرح بند رکھے گا۔ تین چار دن میں ہی حلیہ خراب ہو جائے گا، سبھا پاگل کہیں گا۔ ابے بھوتنی کے چھپر، میرے پاس آیا ہے اور اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ کیا تجربہ ہے تیرا زندگی کے بارے میں؟ اسے تجربہ کہتے ہیں۔"

"مگر چچا، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"

"ہوں، کرنا ہے۔ چچا کے پاس آیا اور اب کرنا تجھے ہے۔ چل ٹھیک ہے، اس وقت دو بج رہے ہیں، ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کر لو۔ کھانا وانا کھا کر اوپر جا بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں کون سا جہاز ہے اور کہاں جا رہا ہے۔"

"مگر چچا میری بات سنیں۔ وہ اصل میں......"

"ابے تیری اصل کی ایسی تیسی۔ مجال ہے کسی کمپنی کی کہ سلطان میاں کو ٹکٹ دینے میں آنا کانی کرے۔ ان سسروں کی تو......" سلطان میاں نے ایک بار پھر ایک موٹی سی گالی بکی اور میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ حالانکہ یہ صورتحال ایسی نہیں تھی کہ کسی دوسرے پر بھروسہ کیا جائے مگر سلطان میاں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر تل ہی گئے کچھ کرنے پر تو پھر کر ہی ڈالیں گے۔

بہرحال ان کی، ان باتوں سے میری پریشانی تو دور ہو گئی تھی۔ بھوک واقعی بالکل نہیں تھی لیکن پھر بھی سلطان میاں کی فرمائشی گالیوں سے بچنے کے لئے تھوڑا بہت کھایا پیا اور اس کے بعد ان کے ریاستی گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ ویسے میں نے ملازم کے ہاتھ ساری کرنسی سلطان میاں چچا کو پہنچا دی تھی۔ اور اس کے بعد ملازموں نے پردے کھینچ دیئے اور میں نرم اور آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ویسے تو خیر نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن سلطان میاں نے بڑی شاہانہ مسہریاں بچھوائی تھیں جنہوں نے بالآخر میری پلکیں ایک دوسرے سے چپکا ہی دیں۔

اور پھر جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کمرے کی بتی جل رہی ہے اور روشندان تاریک ہیں۔ ایک لمحے تک تو صورتحال کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن پھر دوسرے لمحے میں بستر سے اچھل کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ کمرے میں لگی ہوئی گھڑی ساڑھے سات بجا رہی تھی۔ میں نے خوفزدہ انداز میں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا، اس میں بھی یہی وقت تھا۔ میں پانچ گھنٹے تک بے خبر سوتا رہا تھا۔

ہنگ کا جہاز دو گھنٹے پہلے بمبئی چھوڑ چکا ہوگا۔ آہ...... یہ کیا ہوا...... یہ کیا ہو گیا؟ میں نے جیسے تیسے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور رقم کی بیلٹ اٹھا کر بھاگم بھاگ سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ کیا ہو گیا...... کیا کر ڈالا یہ میں نے؟ سلطان میاں جیسے اول جلول آدمیوں پر بھروسہ کر کے سب کیا دھرا خاک میں ملا دیا۔

نیچے دکان میں بڑی رونق تھی۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر دکان کا مینجر میری جانب آیا تو میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''سلطان میاں کہاں ہیں؟''

''آپ آیئے جناب، آیئے پلیز۔'' اس نے نرمی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر کا راستہ دکھایا۔ سلطان میاں کی کوٹھڑی میں تاریکی تھی۔ مینجر نے لائٹ جلا کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ تب میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''سلطان میاں کہاں ہیں؟ میں نے کہا نا، میں نے تم سے کچھ کہا تھا اور تم نے کچھ کر ڈالا۔''

''آپ تشریف رکھیے۔ بلکہ غسل کر لیجئے۔ کپڑے تبدیل کر لیں۔ میں چائے تیار کر لیتا ہوں۔ چائے پئیں گے یا کچھ اور؟'' مینجر کے اس سکون پر مجھے شدید غصہ آ گیا۔

''تمہاری شامت آ گئی ہے۔ میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے اور تم کچھ بکواس کر رہے ہو۔ چائے گئی جہنم میں۔ سلطان میاں کہاں ہیں؟ اور یہ سب کیا چکر ہے؟ مجھے آخر جگایا کیوں نہیں گیا؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم جناب کہ سیٹھ صاحب کہاں گئے ہیں اور آپ کو جگایا کیوں نہیں گیا۔ مجھے جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے مطابق طے کیا گیا ہے کہ آپ جب سو کر اٹھیں گے تو تیار ہو کر چائے وغیرہ ضرور پئیں گے۔''

''لعنت ہے تم پر اور تمہاری چائے پر۔ میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف جھپٹا تو مینجر جلدی سے میرے سامنے آ گیا اور میرے اور دروازے کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

''سنیے جناب خاقان صاحب! مجھے یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ آپ کو کہیں نہ جانے دوں اور اس وقت تک آپ کی خدمت کرتا رہوں جب تک کہ خود سیٹھ صاحب نہ آئیں۔''

''یہ خدمت تم کیسے کرو گے...... جواب دو۔''

''معافی چاہتا ہوں جناب! جس طرح بھی بن پڑے گا کروں گا۔ چاہے آپ میری ہڈیاں کیوں نہ توڑ دیں۔''

میں بری طرح جھلا گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند کیوں آ گئی۔ لیکن اب ذہن کچھ اور انکشافات کر رہا تھا اور آہستہ آہستہ سارا کھیل میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ سلطان میاں نے کھانے پینے کی کسی چیز میں نیند کی دوا ملوا دی تھی تاکہ میں سوتا رہ جاؤں اور بمبئی سے فرار نہ ہو سکوں۔ اوہ میرے خدا، یہ خبیث بڈھا جو میرے باپ کے دسترخوان پر منوں کے حساب سے ان کا نمک کھا چکا ہوگا مجھے پولیس کے ہاتھوں فروخت کرنے گیا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحے پولیس کے ٹرک دکان کے سامنے آ کر رکیں گے اور میں جو اتنے دن آزاد رہا ہوں اب خود اپنی حماقت سے اتنی آسانی سے پھنس جاؤں گا یا چوہے کی طرح اس پنجرے میں مارا جاؤں گا۔

میں نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر آخری فیصلہ یہی کیا کہ مجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ مینجر جو، جوڈو کراٹے کا ماہر معلوم ہوتا تھا، بہترین تن و توش کا آدمی تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا کہ اگر اس نے مجھے نہ جانے دیا تو پھر اس سے دو دو ہاتھ کرنا ہی پڑیں گے۔ میرے بچنے کی اور کوئی صورت تو نہیں ہے۔ اس وقت تو صورتحال یوں لگ رہی ہے جیسے پولیس بس آنے ہی والی ہو۔ سلطان میاں اب مجھے ایک شیطان کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ بے شک میں جوڈو کراٹے وغیرہ سے واقف نہیں تھا لیکن دیسی کشتی کے تمام داؤ پیچ مجھے معلوم تھے۔ حالانکہ اس وقت کشتی لڑنے کا کوئی موقع نہیں تھا کیونکہ مینجر کی ایک آواز پر دکان کے سارے ملازم جمع ہو سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ پیتل کا کوئی چار فٹ اونچا ایک خوبصورت سا گلدان سلطان میاں کی مسہری کے پاس رکھا ہے۔ میں نے جھپٹ کر وہ گلدان اٹھا لیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ نتیجے کے ذمہ دار خود ہو گے۔''

''سنیے جناب! میری بات تو سنیے۔'' مینجر نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اگر آپ اس بات سے ناراض ہیں کہ میں بار بار آپ کو چائے کی دعوت دے رہا ہوں تو معافی چاہتا ہوں، آپ نہ پئیں چائے۔ لیکن میرا کوئی قصور تو نہیں ہے۔ یہ گلدان وہیں رکھ دیں اور

اوپر تسلی سے جا کر غسل کر لیں۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا اور میں واقعی بری طرح چکرا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ منیجر دروازہ کھول کر اس طرح پینترے بدلتا ہوا میری طرف بڑھا کہ میں نے گلدان سر سے بلند کر لیا۔ دفعتہً ہی عقب سے مجھے سلطان میاں کی آواز سنائی دی۔

''اے، اے...... یہ کیا تماشہ ہے بھئی؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

سلطان میاں کی آواز سن کر میں نے بجلی کی طرح پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔ مجھے گمان تھا کہ سلطان میاں کے پیچھے پولیس ہو گی اور اب بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ منیجر نے گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ صاحب! میں تو بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر آپ نہ آ جاتے تو پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔'' منیجر کی آواز تھکی تھکی سی تھی جیسے اس کی کسی بڑے فرض سے گلو خلاصی ہوئی ہو۔

''مگر یہ صورتحال میری سمجھ میں آئی نہیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا آخر؟'' سلطان میاں آرام سے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ بچ نکلنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ملے گا۔ چنانچہ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

''ابے پکڑیو اسے۔'' سلطان میاں کے نعرے کے ساتھ ہی منیجر نے جھکائی دے کر مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے کمر سے پکڑ لیا۔ ہم دونوں قالین پر گر گئے۔ وہ واقعی جوڈو کراٹے کا ماہر تھا۔ اس نے کچھ اس انداز سے میرے پیروں میں قینچی ڈالی کہ میں بے بس ہو کر قالین پر پڑے کا پڑا رہ گیا۔ سلطان میاں بڑی خباثت سے ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بھئی یہ کیا حرامی پن ہے۔ ابے چھوڑ بھوتنی کے چھپر! دو چٹکی بھنگ ایسی سالی دماغ کو چڑھ گئی، بلاوجہ کبھی گلدان اٹھاتا ہے اور کبھی اٹھ کر بھاگتا ہے۔ ہاتھ پیر تڑوا بیٹھے گا بیٹا، کیا سمجھا؟''

''میں...... میں...... میں......''

''ابے میں، میں کے بچے! بکرے کی اولاد ہے کیا؟ ابے اگر ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے تو جہاز پر کون چڑھے گا تیرا باپ یا تیرا چچا؟ باپ تو اس دنیا میں نہیں ہے۔'' پھر انہوں نے منیجر کے ایک لات رسید کی اور بولے۔ ''اُٹھ جا بے۔ کیسا ایسے پڑا ہے جیسے

جیسے...... اب کیا کہوں بچے کے سامنے۔ چائے یہیں بھجوا دے اور دروازہ بند کرتا جا۔''

منیجر نے مجھے چھوڑ دیا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور پھر لنگڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بالکل دماغ خراب ہو گیا تھا۔

''اوہ، بھئی کیا سوچ رہا تھا تو آخر؟ کرنا کیا چاہتا تھا مجھے یہ بتا دے...... نہیں نہیں...... بتا دے مجھے۔ یہ کیا مار پیٹ کی سوجھی تھی؟ اور منیجر بے چارہ، ابے دو کوڑی کا آدمی تھا وہ۔ تیرا ملازم تھا، مار پیٹ کر لیتا، اس کی ٹانگیں توڑ دیتا، سر پھاڑ دیتا، کچھ بھی نہیں کہتا وہ تجھ سے۔ تو کیا سمجھتا ہے۔ چل اٹھ، یہ دیکھ۔''

یہ کہہ کر سلطان میاں نے جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا، یہ جہاز کا ٹکٹ تھا۔ اسکندریہ کے لئے ایک فرسٹ کلاس کیبن سلطان میاں کے نام سے ریزرو کر دی گئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ٹکٹ کو دیکھا اور پھر سلطان میاں کی طرف دیکھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے منہ پر غلاظت لگا لوں۔ سلطان میاں کے انداز میں ایک باپ جیسی شفقت تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''بھئی میری صورت کیا دیکھ رہا ہے۔ جہاز کا ٹکٹ ہے۔ تیرے لئے کیبن بک کرا دی ہے میں نے فرسٹ کلاس کی۔ کیا سمجھا؟''

میں واقعی اندر ہی اندر زمین میں گڑھا جا رہا تھا حالانکہ جو کچھ سوچا تھا وہ میرے دل میں تھا۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔ اس شخص کے بارے میں اس انداز میں سوچا تھا میں نے جو محبت و ایثار کا پیکر ہے، جس کے چہرے کی شفقت میں مجھے اپنے باپ کے چہرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''لیکن چچا، جہاز تو جا چکا ہو گا۔''

''ابے ماں کی آنکھ ان سالوں کی۔ ہماری اجازت کے بغیر سالے ساحل چھوڑ سکتے تھے بمبئی کا؟''

''لیکن چچا میاں! اس وقت تو پونے آٹھ بج رہے ہیں۔''

''ہاں بج رہے ہیں۔ جہاز ساڑھے نو بجے جائے گا بیٹا! ساڑھے نو بجے۔ سمجھا؟ ہم کہہ رہے ہیں نا کہ تو خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ جب چچا کے پاس آ گیا تو سمجھ لے ساری

مشکلیں حل ہو گئیں۔ تیرا جہاز ساڑھے نو بجے جائے گا اور اسی نو نمبر کی گودی سے۔ تو جس وقت اپنی حرام کاری کی داستان سنا رہا تھا نا بھوتنی کے چھپر! میں نے اسی وقت ملازم سے پرچہ بھجوا کر منیجر سے جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ادھر تو کھانا کھانے جا رہا تھا اور ادھر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تیرا جہاز ساڑھے پانچ بجے کی بجائے اب ساڑھے نو بجے جا رہا ہے۔ سمجھا؟ میں نے دیکھا کہ تو تھکا ہوا ہے، خوفزدہ ہے، منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ سالے، باپ نے کبھی کسی کی خاطر داری نہ کی، انگریز کیا انگریز کا باپ بھی اسے ڈرا نہیں سکا اور تیرے منہ پر اتنی سی بات سے ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ہم جانتے تھے کہ ایسی حالت میں جہاز پر چڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ بلاوجہ تجھ پر شک کیا جائے۔ اور اس کے بعد تو دھر لیا جاتا آرام سے۔ بزرگوں نے ایسی حالت میں ایک ہی علاج بتایا ہے بیٹا! اور وہ علاج ہے نیند۔ وہ بھی چار پانچ گھنٹے کی بھرپور نیند۔ اور ہماری بوٹی اس کام کے لئے تیر بہدف ہے۔ اس لئے ہم نے خانساماں سے کہہ دیا کہ دو چٹکی بھتیجے کو بھی چکھا دو۔ یہ حرام کا پلّہ سوتا رہے گا اس دوران ہم ٹکٹ کا معاملہ کر لیں گے۔ مگر پتہ چلا بیٹا کہ باپ کی طرح تم بھی ہماری بوٹی کو ہضم نہیں کر سکتے۔ اوچھے ہو حرامیو، اوچھے ہو۔ ہمارے سب سے قیمتی آدمی کا ستیاناس کرنے والے تھے تم۔ کھوپڑی پھاڑ دیتے اس کی، ٹانگیں توڑ دیتے اس کی، مجال تھی کہ وہ تم پر ہاتھ بھی ہلاتا۔ اچھا ہوا موقع پر پہنچ ہی گئے ہم۔ اس سلسلے میں پورے جنگلی ہو بھوتنی کے سانڈ اپنے باپ کی طرح۔"

سلطان چچا کی گالیاں ایسی بے مثال تھیں کہ میرے حلق سے ہنسی نکل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ شرمندگی اب بھی میرے رگ و پے میں موجود تھی جو میں نے ان کے بارے میں اس برے انداز میں سوچا تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی گمان ہو جاتا کہ میں نے ان کے بارے میں کیا کیا سوچا تھا تو میرے لئے واقعی ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ میری اس ہنگامہ آرائی کو بھنگ کا اترتا ہوا نشہ سمجھ رہے تھے۔ بہرحال میں نے فرش سے اپنی رقم کی بیلٹ اٹھائی اور بمشکل تمام پوچھا۔

"چچا میاں! اسکندریہ کا ٹکٹ کتنے کا ملا؟"

سلطان میاں کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کے بعد گالیوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ انہوں نے کئی زبردست گالیاں دے کر وہی گلدان اٹھا لیا اور بولے۔

"حرام کے تخم! چچا کہتا ہے اور چمار سمجھتا ہے۔ ابے مجھے کسی بنیے کی اولاد سمجھ رکھا ہے یا پھر کیا سمجھا ہے تو نے مجھے؟ پٹھان ہوں بیٹے، پٹھان ہوں۔ جو پیسے میں نے تجھ پر خرچ کئے ہیں، اب میں کیا کہوں برا مان جائے گا تو۔"

پھر اسی طیش کے عالم میں انہوں نے سدری کی دوسری جیب سے برطانوی پونڈ کی گڈی نکالی اور میرے منہ پر مار دی۔

"یہ رکھ۔ اور تو نے جو ہندوستانی نوٹ بھجوائے تھے وہ میں نے رکھ لئے ہیں۔ جب بھی بمبئی واپس آئے لے لینا مجھ سے۔ سالا بات کرتا ہے حرامی بنیوں کی طرح۔ ابے کیا کہوں تجھ سے اور۔ دل تو چاہتا ہے کہ وہ گالیاں سناؤں کہ تیرے پورے خاندان کی روحیں بلبلاتی ہوئی قبروں سے نکل آئیں۔ تجھے پتہ ہے تیرے باپ سے میرے کیسے تعلقات تھے۔ بات کرتا ہے۔"

سلطان میاں کی آواز بھرا گئی۔ میرے لئے واقعی زمین سخت ہو گئی تھی کہ زمین میں گڑھ جاتا۔ سلطان میاں نے کرتے کے دامن سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا کہ کمال ہے، وہ کون لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایسے بے مثال لوگوں کی دوستیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ میرے والد بھی یقیناً ایسی ہی چیز ہوں گے۔"

بہرحال اس کے بعد سلطان میاں پر ایک خاموشی سی طاری ہو گئی۔ چائے آ گئی تھی اور سلطان میاں میرے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ لیکن ان کی گردن جھکی ہوئی تھی اور چہرے پر افسردگی کے تاثرات تھے۔ غالباً انہیں ہمدان جمشیدی کے ساتھ گزارے ہوئے دن یاد آ رہے تھے۔ میں واقعی اس وقت عجیب و غریب کیفیت میں تھا۔ ان سے نظر ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

چائے ختم ہوئی تو میں اوپر غسل کرنے چلا گیا۔ تیار کی ہوئی تازہ استری کی وردی میں نیچے اترا تو سلطان میاں کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پھر کچھ گالیاں بکیں اور بولے۔ "بھوتنی کے چھپر! وردی تیرے اوپر بڑی سجتی ہے۔ جمشید بھائی نے شاید اسی لئے تجھے بھرتی نہیں ہونے دیا ہو گا۔"

میں نے چونک کر سلطان میاں کی طرف دیکھا۔ بڑے عجیب الفاظ تھے۔ وہ پھر بولے۔ "کیا سمجھتا ہے مجھے، چونڈا ہوں کیا بالکل؟ مجھ سے اڑ رہا ہے بچونگڑے! تو کیا سمجھتا ہے، ایک نگاہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تو کسی اور کی وردی پہنے ہوئے ہے۔"

"سلطان چچا! کہاں کہاں مجھے اپنی بڑائی کا احساس دلائیں گے۔" ویسے وردی کے ذکر پر مجھے ولیم ہاروے یاد آ گیا۔ میں نے کہا۔ "چچا! مجھے ذرا لکھنے پڑھنے کا سامان منگوا دیجئے۔"

"ہوں، بھیج دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ بہت ہی عمدہ قسم کا ایک کاغذ اور قلم میرے پاس آ گیا تو میں نے ولیم ہاروے کے نام ایک پرچہ لکھا جس میں مختصراً اپنے واقعات، ہیگ سے ملاقات اور اپنے فرار کے بارے میں تفصیل لکھ کر میں نے ولیم سے معافی مانگی کہ میں نے اس کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ لیکن میں اس قدر مجروح ہوں کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ صورتحال درپیش ہے وہ میرے لئے زندگی اور موت کی مانند ہے۔

اس کے بعد میں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور سلطان چچا سے رخصت کی اجازت مانگی۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنی جیب سے ایک پڑیا نکالی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ مجھے مدھم مدھم گالیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے وہ پڑیا میری طرف بڑھائی اور بولے۔

"لے، یہ پہن لے۔ کبھی ضرورت پڑے تو بیچ دینا۔ واپس آئے گا تو میں اور دے دوں گا۔" پڑیا میں سے سفید سونے کی ایک بڑی خوبصورت انگوٹھی نکلی جس میں قابلی چنے کے برابر ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہیرے پہنے تھے۔ اماں اور بابا جان کو خود پتھروں کا بڑا شوق تھا۔ مجھے بھی پتھروں کی پہچان تھی۔ لیکن اتنا شاندار ہیرا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سچی بات ہے کہ اس کی قیمت کا صحیح اندازہ میں نہیں لگا سکتا تھا۔ میرے خدا کیا ہوں میں اور کتنی گھٹیا ہو گئی ہے میری سوچ۔ اس شخص کے بارے میں، میں نے ایسے انداز میں سوچا تھا جس کی شفقتیں بے پناہ تھیں۔ پتہ نہیں بابا جان نے اس کو کیسے گرویدہ بنا لیا کہ ان کے بعد وہ ان کے بیٹے سے بھی اس درجہ کا سلوک کر رہے تھے۔

بہرحال میں نے انگوٹھی ان سے لی اور روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔

"سنو! میرا منصوبہ یہ ہے کہ تم بندرگاہ سے کچھ دور گاڑی سے اتر جاؤ گے اور وہ لوگ حالات کا جائزہ لے لیں گے جو تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اس کے بعد تم کسٹمز کی حد بندی سے گزر کر جہاز پر سوار ہو جاؤ گے۔ اور سنو، بالکل فکر مت کرنا۔ جہاز کی روانگی تک

ہمارا منیجر اور بے شمار افراد جنہیں پہلے سے اطلاع دے دی گئی ہے گودی پر موجود رہیں گے۔ بیٹے! تم فکر مت کرنا۔ اگر سوار ہونے سے پہلے یا سوار ہوتے وقت پولیس نے تمہیں شناخت بھی کر لیا اور گرفتار کرنے کی کوشش کی تو وہ کچھ ہو جائے گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ فوج کی فوج جو تمہارے چاروں طرف بکھری ہو گی، پولیس کے چھکے چھڑا دے گی۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے فکر نہیں کرنی چاہئے۔ اگر صورتحال اس حد تک بگڑ گئی تو تمہیں بمبئی کی زیر زمین دنیا میں پہنچا دیا جائے گا۔ کیا سمجھے؟ رائی کے دانے کے برابر فکر مت کرنا۔ میری یہ فوج بہت زیادہ تربیت یافتہ ہے اور مکمل تیاریاں کر کے تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ جاؤ!"

آہ...... کیا کیا، کیا تھا سلطان چچا نے میرے لئے۔ کوئی انسان زندگی میں کبھی اتنے بڑے انسان کا صلہ دے سکتا ہے۔

بہرحال اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے اور میں نے اس پراسرار منیجر کو، جو بڑے پہلوان ٹائپ کی چیز تھی کچھ عجیب و غریب اشارے کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن سلطان چچا کی وہ فوج مجھے نظر نہیں آئی تھی جو میری حفاظت کے لئے مامور تھی۔ لیکن اس وقت میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ واقعی تقدیر نے میری صحیح رہنمائی کی تھی۔ اور میں نے بہت بڑے آدمی کا سہارا حاصل کر لیا تھا۔

※☆※

نو بجنے میں ابھی کچھ دیر تھی جب ہم بندرگاہ پر پہنچے تھے۔ میں اب اپنے آپ کو بڑا پُراعتماد محسوس کر رہا تھا اور مزے سے سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا تھا۔ اسی طرح ٹہلتا ہوا میں نو نمبر کی گودی پر پہنچ گیا۔ عرب ملکوں اور افریقہ کو جانے والے ملازموں سے پسنجر لاؤنج کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسٹمز اور پولیس کے حکام مسافروں کو کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد انہیں جہاز پر سوار کرا رہے تھے اور ہمیشہ کی طرح مسافروں سے زیادہ رخصت کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں پتہ نہیں کتنے سی آئی ڈی والے عام لوگوں میں گھل مل کر مجھ جیسے لاتعداد مفرور مجرموں کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔

بہرحال میں نے مسافروں کے لاؤنج پر نظر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گودی کی طرف نکلنے والے راستے کی جانب چل پڑا۔ یہاں کسٹمز اور پولیس کے کوئی آٹھ آدمی مسافروں کے کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال پر لگے ہوئے تھے۔ مجھے گودی کی طرف

بڑھتے دیکھ کر مسافروں نے فوراً راستہ دے دیا۔ کسٹمز اور پولیس کے آدمیوں نے میری وردی پر لگے ہوئے نشانات پر ایک نظر ڈالی اور مستعدی سے مجھے سلوٹ دیئے۔ میں بے نیازی سے ان کے سلام لیتا ہوا کسٹمز کی حد سے باہر نکل آیا۔ سامنے وہ جہاز روانگی کے لئے تیار تھا جس سے ہیگ اور میں روانہ ہو رہے تھے۔ گین وے کے ساتھ ہی عقابی نگاہوں والے دو تین سفید پوش اور کسٹمز پولیس کے چند آفیسر کھڑے ہوئے تھے اور ہر آتے جاتے مسافر کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ دور کسٹم کے شیڈ پر دو سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ ادھر جہاز کی سرچ لائٹیں بھی گین وے پر مرکوز تھیں۔ میں اندھا کر دینے والی روشنیوں میں باوقار لیفٹیننٹوں کی طرح ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا گین وے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں یہ تاثر ابھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں اسی جہاز سے سفر کرنے والا ہوں بلکہ میں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ کسی سرکاری کام سے آیا ہوا ہوں اور واپس چلا جاؤں گا۔

گین وے کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا۔ کسٹم اور پولیس کے آدمیوں نے مستعد ہو کر سلام کیا۔ سادہ پوش نظریں جمائے مجھے دیکھتے رہے۔ ابھی میں نے گین وے پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ سادہ پوشوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"سر پلیز، ایک منٹ۔"

میں رُک گیا۔ سردی کی لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میرے دل نے آواز لگائی کہ لو بیٹے خاقان! آخر کھیل ختم ہو گیا۔ پکڑے گئے۔ لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر مڑتے ہوئے تھوڑی سی گردن گھما کر پوچھا۔

"ہاں بولو، کیا بات ہے؟"

"سر، آپ کے نام نیول ہیڈ کوارٹر کے سلطان صاحب کا میسج ہے۔ وہ جہاز پر پہنچ گئے ہیں۔" میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ نیول ہیڈ کوارٹر کے سلطان صاحب کون بلا ہیں؟ یہ کیا چکر ہے؟ کیا یہ کوئی خفیہ سگنل ہے؟ میں مڑ کر اس شخص سے کوئی بے ڈھنگی بات کہنے ہی والا تھا کہ اوپر جہاز کی ریلنگ سے تقریباً آدھا لٹکتا ہوا میں نے سلطان میاں کے منیجر کو دیکھ لیا۔ وہ اسی سادہ پوش آدمی کو اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے مڑے بغیر اپنے پیچھے کھڑے سادہ لباس آدمی کا شکریہ ادا کیا۔

"او کے، تھینک یو۔" اور اس کے بعد میں گین وے پر چڑھتا چلا گیا۔ گین وے کے

بعد جہاز کا عرشہ تھا اور پھر راہداری۔ جب میں نے جہاز پر پہلا قدم رکھا تو یوں لگا جیسے ہندوستان کی سرحد پار کر رہا ہوں۔ جہاز پر پہنچا تو جہاز کے عملے سے پہلے سلطان میاں کے منیجر نے مجھے آلیا۔ اس نے فوج کے سول ملازموں کی طرح نیم فوجی سلام کیا اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

"سر! کیبن کا معائنہ کر لیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے لفافہ لیتے ہوئے بردباری سے گردن ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ مکمل ڈرامہ ہو رہا تھا۔ کچھ اس طرح کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ کوئی میرے بارے میں غور بھی نہ کر سکے۔ یہ سلطان میاں تو پورے جرائم پیشہ آدمی تھے۔ میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ جہاز کے ملاحوں اور افسروں نے مجھے راستہ دے دیا تھا۔ بحریہ کا افسر تو ان کا باپ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے سرسری سی نظر سلطان میاں کے منیجر پر ڈالی اور ہمیں کسی سرکاری مشن پر سمجھ کر دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا۔ مسافر اور قلی اور جہاز کے ملاح اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ تمام راہداریاں آباد تھیں۔ راستے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ منیجر فرسٹ کلاس کیبنوں کی طرف میری رہنمائی کر رہا تھا اور میں کیبنوں کے نمبروں پر نگاہیں ڈالتا جا رہا تھا۔ چودہ، پندرہ، سولہ اور یہ سترہ نمبر کا کیبن جس کا دروازہ اندر سے بند تھا، اگر میں صحیح جہاز پر سوار ہوا ہوں تو اس بند دروازے کے پیچھے میرا دشمن ہیگ موجود ہے شاید اپنی موت کے انتظار میں۔ اس لئے کہ اب میں اسے جیتا نہیں چھوڑوں گا۔

غصے کی گرم لہریں میرے بدن میں دوڑنے لگیں اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میرے کیبن کا نمبر چھبیس تھا۔ منیجر نے کیبن کا دروازہ کھولا اندر ایک وردی پوش اسٹیورڈ بستر وغیرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بستر کے سرہانے ایک نیا سوٹ کیس رکھا ہے۔ منیجر نے سوٹ کیس کی چابی میری طرف بڑھا دی۔

"سر! میں نے آپ کا سامان لگا دیا ہے۔ ٹکٹ عنایت فرما دیں تو اسٹیورڈ کو نوٹ کرا دوں۔"

"او کے...... او کے......" میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر منیجر کی طرف بڑھا دیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہوں۔ میں بہت کچھ کرتا رہا ہوں لیکن سلطان میاں نے ایک انتہائی تجربہ کار شخص کے طور پر جس طرح چاروں طرف

میرے لئے آسانیاں پیدا کر دی تھیں، حقیقت یہ ہے تا قیامت میں ایسی آسانیاں حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس شخص کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا تھا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل اس وقت یہ تھی کہ بغیر سامان کہ میں یہ سفر کس طرح کروں گا۔ اس ایک وردی میں کتنے دن رہ سکتا تھا۔ اس نے یہ مشکل بھی حل کر دی تھی۔ میں نے مینیجر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"شکریہ مینیجر۔"

اسٹیورڈ سامان لگا کے جا چکا تھا۔ ادھر کوریڈور میں گھنٹی بجنے لگی تھی۔ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ تمام غیر متعلق لوگ جہاز سے اتر جائیں۔ مینیجر نے کہا۔ "سر! گین وے پر جو بے وقوف آپ کو ملا تھا آپ اس کی بات کا بالکل خیال نہ کریں۔ میں اس احمق کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔ اس سے کہا گیا تھا کہ اگر آپ کو نیچے روکنے کی کوشش کی جائے تو وہ مزاحمت کرے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ نیول ہیڈ کوارٹر کے سلطان صاحب جہاز پر سوار ہو چکے ہیں اس لئے یاد کرایا تھا کہ اگر پولیس یا کسٹم والے بلا ضرورت آپ سے سوال جواب کریں تو وہ اس طرح کی کوئی بات کہہ دیتا کہ پولیس اس دھوکے میں رہے کہ آپ بحریہ کے کسی کام سے آئے ہیں اور کوئی اعلیٰ عہدیدار پہلے سے اس جہاز میں موجود ہے۔ اس نے بلا وجہ آپ کو ٹوکا۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مینیجر! کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں اب محفوظ ہوں۔ میرا خیال ہے یہ گھنٹی جو بج رہی ہے اس سلسلے میں ہے کہ غیر متعلق لوگ نیچے اتر جائیں۔ اب تم جاؤ۔ سلطان چچا سے میرا سلام کہہ دینا۔ اوکے، بے حد شکریہ۔"

"سر! خدا آپ کو آپ کے ہر مشن میں کامیاب کرے۔" اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ جہاز کے خلاصی شور مچاتے پھر رہے تھے کہ تمام باہر والے لوگ اتر جائیں۔ گین وے ہٹایا جا رہا ہے۔

جہاز کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لئے میں چند قدم آگے بڑھ آیا۔ رخ بدلتے ہوئے جہاز کے ساتھ میں ساحل پر نگاہیں جمائے بے خیالی میں چلتا رہا اور پھر ہمارا جہاز دوسرے جہازوں کے عقب میں پہنچا تو ساحل کا منظر چھپ گیا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا رہا تھا۔ چنانچہ جب ساحل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں اپنے کیبن میں جانے کے

لئے مڑا۔ میرے دائیں ہاتھ پر اوپر جانے کا زینہ بنا ہوا تھا۔

لوہے کے گھومتے ہوئے زینے پر جہاز کے اس حصے پر سناٹا طاری تھا اور اس پر بنائے ہوئے لوہے کے زینے پر لکڑی کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ اتنی واضح تھی کہ بغیر سر اٹھائے ہوئے میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا کہ یہ لکڑی کے کھڑاؤں کی آواز...... آہ میرے مالک......لکڑی کی کھڑاؤں کی یہ آواز میری شناسا ہے۔ یہ سو فیصدی سادھان وردھانی ہے۔ مہا بھکشو وردھانی۔ بمشکل تمام میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ چار سیڑھی اوپر گیروے لباس میں زینے کی ریلنگ پکڑے سادھان وردانی کھڑا ہوا تھا۔ ہماری نظریں ملیں اور مجھے یوں لگا جیسے میرا دم نکل گیا ہو۔ اس کے پتھریلے چہرے پر نفرت کی تحریر لکھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے کسی حملہ آور چیتے کی سی وحشت ناک چنگاریاں بن کر برس رہی تھیں۔ میں نے صرف ایک لمحے سوچا، خوف و دہشت کے یہ لمحات کہاں کہاں گزار دوں اور کیسے کیسے حالات سے نمٹوں؟ اور اس کے بعد میں نے اپنی ذہنی قوتوں کو جمع کیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اس لئے مسکرایا تھا کہ اس پرانی عبودیت کو بیدار کر سکوں۔ میں اس کا بودھی ستو تھا۔ میں مستقبل کا مہتر بدھا تھا۔ مگر میری مسکراہٹ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ اس نے سیدھا ہاتھ بلند کیا جیسے مجھ پر کسی غیر مرئی نیزے سے وار کرنا چاہتا ہو اور وہ ایک سیڑھی نیچے اتر آیا۔ اور پھر اس کے حلق سے ایک عجیب سی مشینی آواز نکلی۔

"خا...... قان......"

میں کچھ نہ سمجھا۔ اچانک ہی میرا پورا جسم مڑا اور میں نے مڑتے ہی راہداری میں دوڑنا شروع کر دیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب غیر ارادی طور پر ہو رہا ہو۔ زیادہ دور نہیں دوڑا تھا کہ اچانک ہی میرے قدموں میں پھر رکاوٹ پیدا ہوئی اور اب جیسے میرے سارے بدن کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے بے شمار بلاؤں نے مجھے گھیر لیا ہو۔ میں گھر گیا تھا۔ واقعی میں گھر گیا تھا۔

راہداری کے دوسرے سرے پر راستہ روکے، کمر پر دونوں ہاتھ رکھے میرا ازلی دشمن ہیگ کھڑا ہوا تھا۔ آہ...... واقعی، اس وقت جو صورتحال میری ہو گئی تھی، خدا کسی دشمن کی بھی نہ کرے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بدن کی ساری قوتیں کھنچتی جا رہی ہوں اور میں کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ایسی مصیبت میں جس میں میری

مدد اب کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ چاہے وہ سلطان چاچا ہوں جنہوں نے ایک چیف کمانڈر کی طرح میری ہر مشکل کو حل کر دیا تھا۔ لیکن یہ مشکل بھلا کیسے حل ہو گی؟

جہاز کے نچلے عرشے کی مدھم روشنی میں ہیگ کے سفید گھنگھریالے بال مجھے مٹیالے اور بے جان نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس کا چہرہ موت کا چہرہ معلوم ہوتا تھا، تاریک اور پتھرایا ہوا۔ وہ راہداری کے درمیان میں کمر پر ہاتھ رکھے اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی موی مجسمے کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ اعلیٰ تراش کا ریشمی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی انگلیوں میں ہیرے جڑی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ پھر وہ میری طرف ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے مجھ سے کہا۔

"ایکسکیوز می آفیسر! میں چیف اسٹیورڈ کی تلاش میں ہوں۔ کیا آپ میری رہنمائی کریں گے؟" ہیگ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح مہذب اور نرم تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ میرے شدت سے دھڑکتے ہوئے دل کو ہلکے سے قرار کا احساس ہوا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے موت کے تاریک اندھیرے میں مجھے جیسے امید کی کوئی کرن نظر آئی ہو۔ اس نے مجھے آفیسر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میری وردی رائل نیوی کی روایتی وردی تھی اور ایسا ہی میرا حلیہ بھی تھا۔ خاص قسم کی داڑھی اور سیاہ چشمہ جسے میں نے رات میں بھی اتارنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ آہ، کیا یہ چیزیں واقعی میرے کام آ رہی ہیں؟ واقعی کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟ ہیگ میرے انتظار میں نہیں کھڑا ہوا بلکہ وہ میری مدد چاہتا ہے۔

میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور اسکاٹ لینڈ کے ٹھیٹ لہجے میں کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں چیف اسٹیورڈ کا اسسٹنٹ ہوں؟ گیٹ لاسٹ۔" میرے بھاری لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ ہیگ ایک دم سنبھل گیا۔

"سوری سر!" اس نے ذرا سا خم ہو کر کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ قیمتی سگار اور اعلیٰ مردانہ سینٹ کی مہک دور تک میرا پیچھا کرتی رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ ایک بار پھر مڑ کر دیکھوں کہ کہیں ہیگ میری طرف دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ لیکن میری ہمت نہ ہوئی۔ وردان سادھانی کے کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ اب مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اور میں اپنے بے جان بدن میں جان پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود کو اطمینان دلا رہا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہیں آ رہا اور مجھے فی الحال اپنے دونوں دشمنوں سے عارضی نجات مل گئی ہے اور اب میرے لئے [illegible] کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ میں اپنے کیبن میں جا کر اپنی

حالات سنبھالوں۔ میرے فرشتے بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس جہاز پر دو خطرناک دشمن میری گھات میں ہیں۔ اس وقت تو میں ہیگ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوں مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس طویل سفر میں دوبارہ جب میری اور اس کی مڈبھیڑ ہو گی تو وہ پھر مجھ سے دھوکا کھا جائے گا؟ آہ، ایک طرف تو ہیگ سے نفرت۔ فرض کر لو اگر میں ہیگ سے انتقام لینے میں کامیاب ہو بھی گیا تو وردان سادھانی اور اس کے ساتھ اس پراسرار بھکشو سے میں کیسے نجات حاصل کروں گا جو پتہ نہیں کس طرح سینکڑوں میل دور سے یہاں تک آ گیا ہے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے جب اور جہاں چاہے مجھ تک پہنچ سکتا ہے؟ یہ بات اور یہ تصور میرے لئے بڑا جان لیوا تھا۔

میرے قدموں میں شرابیوں جیسی لڑکھڑاہٹ تھی اور میں آہستہ آہستہ اپنے کیبن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے اب اس بات کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤں، کتنی ہی حفاظتی تدبیریں کر لوں، پراسرار بدھ بھکشو میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔ سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی میری جان کے لاگو ہیں، کبھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے وہ میرا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں کتنی ہی حفاظتی تدبیریں کر لوں، ان کی زد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ انہیں میری تمام سیاہ کاریوں، میرے تمام جرائم کا علم ہے۔ میں ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ میں تو ایک عام سا مجرم اور اوباش ثابت ہوا۔ ایک ایک بات مجھے یاد آ گئی تھی۔ میں نے ان کے مقدس چشمے میں غسل کیا تھا۔ ان کا مذہبی گیروا لباس پہنا تھا۔ ان کے دھرم سنگھاسن پر بیٹھ کر کائنات کے اسرار سے آگہی حاصل کی تھی اور پھر ان کا مالک و مختار بن کر ان کو دھوکا دیا تھا۔ وردان سادھانی کی تنبیہ کے باوجود میں نے اشبھ بھاؤنا کر کے اپنے اوپر مصیبتوں کے دروازے کھول لئے تھے۔ میں نے بہت کچھ کیا تھا۔ ایلس فیوری اور عالیہ کے ساتھ جسمانی رابطے قائم کئے تھے۔ اور میں نے، جسے وہ بودھی ستو سمجھتے تھے، قتل و غارت گری بھی کی تھی۔ میں نے ان کے دھرم کا مذاق اڑایا تھا۔ دو کوڑی کا ہو گیا تھا میں۔ ایسے حالات میں اگر وہ مجھ سے انتقام لینے پر تل جاتے تو اس میں حیرت کی کون سی بات تھی۔

میرا رُواں رُواں خوف سے کانپ رہا تھا۔ مجھے وردان سادھانی کا وہ لہجہ یاد آ رہا تھا جو اس نے زینے پر کھڑے ہو کر اژدھے کی طرح پھنکار کر میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ خا..... قان..... [illegible] نے محسوس کر لیا تھا کہ اس غیر انسانی چیخ میں انتقام کا جہنم بھڑک رہا

ہے۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کہیں بھی کائنات کے کسی بھی گوشے میں یا اس کیبن کے آہنی حصار میں اتنا ہی غیر محفوظ ہوں جتنا گاشر برم کی پہاڑیوں کی دھار میں اس شیطانی ٹولے کے رحم و کرم پر تھا۔ آہ...... کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہیگ سے نمٹ بھی لیا جائے مگر یہ پراسرار قوتیں کسی بھی طور میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ میرا خیال ہے شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دے کر بیٹھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوئی بھی مضبوط سے مضبوط چار دیواری مجھے ان بدھ بھکشوؤں کے انتقام سے نہیں بچا سکتی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہو کے ہی رہے گا۔ اگر مجھے ہیگ سے نمٹنا ہے تو شکاریوں کی طرح چوکس رہنا اور موقع پاتے ہی وار کرنا ہو گا۔ ہیگ سے میں نمٹ لوں گا لیکن ان بھکشوؤں سے مجھے نجات حاصل نہیں ہو گی۔ میں ان کے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔

کیبن کے اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا یہ سوچتا رہا۔ پھر میں نے اپنے اندر کے خاقان کو آواز دی اور اسے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

”کیا اسی طرح تو زندگی میں قدم آگے بڑھائے گا خاقان؟ کیا اسی طرح خوف کی چار دیواری میں پناہ لے گا؟ ہوش میں آ...... زندگی اس قدر معمولی چیز نہیں ہے کہ تو اس طرح سے اسے کھونے پر تل جائے۔ سمجھ رہا ہے نا۔ اپنے آپ کو سنبھال۔ جب یہی سب کچھ کرنا ہے تو خوف سے مرنے سے کیا فائدہ؟“

یہی سب کچھ سوچ کر میں اٹھا، منہ ہاتھ دھویا اور اس خیال سے کہ بمشکل ابھی ساڑھے دس بجے ہیں کیوں نہ فرسٹ کلاس کے ڈائننگ ہال کا ایک چکر لگاؤں۔ میں نے یہ آخری فیصلہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان چچا کا بھیجا ہوا سوٹ کیس کھولا اور اسے دیکھ کر میری آنکھیں فرطِ مسرت سے جھک گئیں۔ میں جانتا تھا کہ سلطان چچا بہت عظیم انسان ہیں اور میں واقعی ان تک پہنچ کر زندگی کی مشکلوں سے دور ہو گیا ہوں۔ ڈنر سوٹ، دن میں پہننے کے لئے ہلکے رنگ کے سوٹ، گہرے رنگ کے شام کے لباس سلیقے سے استری کیے ہوئے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ مردانہ استعمال کی بے شمار چیزیں بھی موجود تھیں۔ بہرحال میں نے بڑے اہتمام سے ڈنر سوٹ اور اس کے لوازمات نکال کر بستر پر جما دیئے اور ایک بار پھر اپنے آپ کو سہارا دے کر وقت کے دھارے پر بہنے کے لئے تیار ہو گیا۔ تمام تر تیاریاں مکمل کرنے کے بعد میں نے لباس پہننے کی کوشش کی۔

لیکن قمیض پہنتے ہی میری خوشی کافور ہو گئی۔ قمیض کا کالر پورے ایک انچ تنگ تھا اور آستینیں میری کہنی سے بمشکل ایک بالشت آگے پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں۔ پتلون نہ صرف کمر پر تنگ تھی بلکہ ٹخنوں تک پہنچنے میں اسے پورے تین انچ کی ناکامی ہوئی تھی۔ کوٹ بھی قمیض کی طرح کوتاہ آستین تھا۔ ارے باپ رے...... یہ کیا ہوا؟ میں نے سوچا تھا کہ سلطان چچا نے میری ہر مشکل حل کر دی۔ لیکن یہاں مار کھا گئے تھے وہ۔ میں نے جھلاہٹ کے ساتھ تمام کپڑے ایک طرف ڈال دیئے۔ اب تو یہ تمام چیزیں میرے لئے بیکار تھیں۔ اس سوٹ کیس میں سے صرف ایک سلیپنگ گاؤن، ایک شب خوابی کا لباس، موزے، بنیان اور شیونگ کٹ استعمال کر سکتا تھا۔ اس قدر شدید غصے کا شکار ہو گیا تھا میں کہ میں نے سارے سامان کا ایک بنڈل بنایا اور پورٹ ہول کھول کر تینوں استری کیئے ہوئے تازہ تازہ سوٹ سمندر کے حوالے کر دیئے۔ اب اس جہاز پر اور پورے سفر کے دوران میں یا تو لیفٹیننٹ کی وردی پہننے پر مجبور تھا یا شب خوابی کا یہ لباس۔ باقی نام اللہ کا تھا۔

میں نے وردی اتاری اور سارا پروگرام ملتوی کر کے شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ اب جو ہو گا صبح کو دیکھا جائے گا۔

⁂☆⁂

رات گزر گئی۔

دوسری صبح طبیعت پر ایک تکدر تھا۔ زندگی کیا ہے۔ صرف ایک سوچ۔ نہیں، سوچ نہیں بلکہ ایک بھرپور عمل۔

ذہن نے سوال کیا۔ ''تم کون ہو؟''

''خاقان جمشیدی۔''

''تمہارا کردار کیا ہے؟''

''کردار؟''

''ہاں کردار۔''

''کچھ بہتر نہیں۔''

''کیوں؟''

''ماحول۔''

''غلط۔ کون سے ماحول کی بات کرتے ہو؟''

''وہ جو مجھے میسر ہوا۔''

''کچھ نہیں۔ تم نے اپنے راستے خود منتخب کئے ہیں۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''آخر کیوں؟''

''گاشر برم سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی۔ وقت مجھے وہاں لے گیا۔ پتھر کے مجسمے کی آغوش میری طلب نہیں تھی۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''اسی سے سب کچھ ہوا۔''

''ہونہہ......''

''ہونہہ۔''

اپنے آپ سے لڑنا آسان نہیں ہوتا۔ میں جھنجلا کر باہر نکل آیا۔ بالائی عرشہ عدن اور اسکندریہ جانے والے تاجروں اور بحیرہ روم کی مختلف بندرگاہوں تک سفر کرنے والے یاتریوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ایک ڈیک چیئر گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا۔ میرا اسٹیورڈ میرے پاس آیا۔

''کچھ پیش کروں سر؟''

''نہیں شکریہ۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''کتاب۔''

''کیسی کتاب؟''

''یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔ پچھلے سفر میں کوئی مسافر اسے بھول گیا تھا۔''

''دکھاؤ۔'' میں نے کہا۔

''جی سر۔'' اس نے کتاب میری طرف بڑھا دی۔ ایران کا چھپا ہوا مثنوی مولانا روم کا نادر و نایاب نسخہ تھا۔

''بہت شکریہ۔ میں اسے رکھ سکتا ہوں؟''

''مجھے خوشی ہوگی۔''

''ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔''

اسٹیورڈ چلا گیا اور میں اس کتاب میں گم ہو گیا۔ میں نے بچپن میں یہ کتاب پڑھی تھی۔ اور اب نہ جانے کتنے برس کے بعد یہ کتاب میرے ہاتھ لگی تھی۔

میری آنکھیں کتاب پر لگی ہوئی تھیں لیکن ذہن نہ جانے کہاں تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''راہ نجات۔''

''نجات کے کتنے راستے ہیں؟''

''ہزاروں۔''

''آہ، نہیں۔ میں نے انہی راستوں کو تلاش کیا ہے لیکن ماحول مجھے بھٹکا دیتا ہے۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا جو مجھے حاصل ہو گیا ہے۔''

حالانکہ جہاز کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اب میں کیا کہتا اور کس سے کہتا کہ سلطان چچا

جیسے لوگ کیا ہوتے ہیں۔ لیفٹیننٹ کی وردی میں نجانے کیسی کیسی مصیبتوں سے گزرتے جہاز پر چھپے رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اب میں ایک شاندار کیبن کا مالک تھا اور بڑے باعزت طریقے سے سفر کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نادیدہ قوتیں بدستور میرے پیچھے لگی ہوئی تھیں جو وردان سادھانی اور سندھورتی وغیرہ کی تھیں۔ جو تحفہ مجھے مندر سے ملا تھا اور جس نے میری زندگی تباہ کر دی تھی۔ حقیقی معنوں میں یوں لگتا تھا جیسے بے شمار نادیدہ پراسرار قوتیں میرے پیچھے پڑی ہوں۔ دھرم شوالہ، گاشر بھرم اور نجانے کیا کیا۔ یہ عذاب کسی اور کی زندگی میں کہاں ہوں گے۔ بس شِو مندر میں اس بت کے قدموں میں بیٹھنا ہی عذاب بن گیا تھا ورنہ باقی زندگی میں اور کوئی مرحلہ ایسا نہیں تھا جو تکلیف دہ اور پریشان کن ہو۔ بس اس کے بعد وہ کمبخت غلط کار لوگ میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور بلاوجہ مجھے ایسی پراسرار قوتیں دینے پر تل گئے تھے جن کا پہلی بات تو یہ کہ میں اہل نہیں تھا اور دوسری بات یہ کہ میں انہیں پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ نہ میرا دین نہ میرا دھرم۔ وہ نجانے مجھے کیا سے کیا بنانے پر تل گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی اور کسی وقت بھی وہ سب کچھ بن جانا پسند نہیں کیا تھا جو مجھے بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اچانک میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے مسلسل دیکھے جا رہا ہو۔ انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میری نگاہ اس شخص پر پڑ گئی جو اچھی خاصی لمبی تڑنگی جسامت کا مالک تھا۔ سرخ وسفید رنگت، چھوٹی سی داڑھی، گدی پر لمبے بھورے بالوں کی جھالر۔ اس کا لباس انتہائی قیمتی تھا، بہت ہی شاندار تراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا وہ۔ لیکن مجھے یہ حیرت ہوئی کہ اس کی یہ دلچسپی میرے لئے کیوں ہے؟ اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں گزرا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہیگ کا ساتھی ہو۔ وہ مجھے کیوں گھور رہا ہے؟ بس انسانی ذہن میں لاکھوں چور ہوتے ہیں۔ میرے ذہن میں ہیگ کا چور تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہیگ میرے سامنے بھی آ چکا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہیگ کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہو اور اس نے کسی کو میری نگرانی پر مقرر کر دیا ہو۔ کیا واقعی ہیگ کے اس ساتھی نے مجھے پہچان لیا ہے یا پھر صرف ہیگ کو اس بات کا شبہ ہوا ہے اور اس نے اس شخص کو مجھ پر نظر رکھنے کے لئے تعینات کیا ہے۔

ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں ایسے بہت سے سوالات کوند گئے۔

اس نے بھی مجھے اپنی جانب متوجہ محسوس کر لیا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں جناب! اصل میں آپ کے ہاتھ میں مثنوی مولانا روم دیکھ کر میں حیران ہوا تھا۔"

اس کے ان الفاظ نے مجھے تھوڑی سی تسلی بخشی۔ میں نے مسکرا کر اطمینان کا سانس لیا احتیاط سے کتاب بند کر دی۔ وہ شخص پھر بولا۔

"میرا نام احتشام بے ہے۔ اور میں ترکی کے شہر انقرہ کا رہنے والا ہوں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر جناب! آپ کی شخصیت بہت ہی متاثر کن ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ کی محبت ہے جناب! ویسے میں انقرہ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوں۔"

"مزید خوشی ہوئی۔"

"کیا آپ کو بھی تاریخ سے کوئی دلچسپی ہے؟" احتشام بے نے سوال کیا اور میرے ذہن میں حس ظرافت پھڑک اٹھی۔

"جی ہاں...... اپنی پیدائش کی تاریخ سے۔ اس کے بعد اپنے خاندان کی تاریخ سے۔ دلچسپی تو ہوتی ہی ہے۔"

احتشام بے ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "میں ان دنوں مصر کے آثارِ قدیمہ پر تحقیقی کام کر رہا ہوں۔"

"میں نے کہا نا آپ کی شخصیت دلچسپ اور پراسرار ہے۔"

وہ بہت دلچسپی سے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "ایک بات پر مجھے حیرانی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ شاید بحریہ کے ملازم ہیں لیکن فارسی زبان سے اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں۔"

"آپ کا میری قومیت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔" احتشام بے نے جواب دیا۔

"میں مسلمان ہوں اور ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ ویسے آپ کو پتہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان مثنوی مولانا روم کو حکمت و معرفت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔"

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ...... کیا بات ہے۔ میں بہت متاثر ہوا ہوں آپ سے۔''
احتشام بے کی روشن آنکھیں کچھ اور روشن ہو گئیں۔

''ویسے آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟''

''اسکندریہ۔''

''یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔''

''اسکندریہ میں میری بیٹی مصریات کے تحقیقی کام میں میری مددگار ہے۔ ویسے میرے ساتھ ایک اور خاتون ہیں جو اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر میرے ساتھ ہی سفر کر رہے ہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس تحقیقی منصوبے میں وہی سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ اسکندریہ کا یہ سفر کر رہا ہوں۔ دونوں میاں بیوی بہت ہی اعلیٰ فطرت کے مالک ہیں۔ ویسے میں اور میری بیٹی ارسلہ فنی ماہرین کی حیثیت سے اس تحقیقی کام میں ان کے برابر کے شریک ہیں۔''

میں اس شخص کی سادہ دلی سے بہت متاثر تھا اور اسے بڑا پسند کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی مسٹر اسمتھ اور ان کی بیوی کے بارے میں بہت سی تفصیل بتائی۔ بڑا دلچسپ اور کھل مل جانے والا آدمی تھا اور پہلی ملاقات میں اس نے اپنے بارے میں اتنی تفصیل بتا دی جس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ سادہ دل بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صاحب علم لوگوں کی طرح سادہ مزاج اور بھولا آدمی ہے۔ گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہے، ان میں انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی اور عبرانی شامل ہیں۔ قدیم مصری تحریروں کا پڑھنا اور پڑھانا اس کا خاص شعبہ ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں فارسی کے علاوہ عربی زبان بھی جانتا ہوں۔''

''واہ...... یہ تو بہت ہی خوبصورت بات ہے۔'' اس نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔ ''ویسے ایک بات آپ بتا سکیں گے کہ آپ مصر کیوں جا رہے ہیں؟ میں معافی چاہتا ہوں کہ بڑے بے ڈھنگے پن سے آپ کے نجی معاملات میں مداخلت کر رہا ہوں مگر یہ پوچھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بتائیے۔'' احتشام نے یہ بات اتنی سادگی سے کہی تھی کہ میں سادگی سے مسکرا دیا۔

''بھلا آپ کو بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ اصل میں کچھ سرکاری اور کچھ ذاتی کام سے نکلا ہوں میں۔ اسکندریہ میں کچھ مصروفیت تو سرکاری ہے، پھر مجھے ایک پارٹی سے حساب

چکانا ہے اور اس کے بعد میں بالکل فرصت میں ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس کے بعد آپ اسکندریہ میں گھومیں پھریں گے۔''

''کیوں نہیں۔''

اچانک احتشام نے اپنی گردن جھکائی اور رازداری سے بولا۔ ''سنیے، اگر آپ کسی نفع بخش علمی کام سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے۔ ہمیں ایک عربی جاننے والے کی ضرورت بھی ہے۔''

''لیکن......''

''نہیں، بالکل نہیں۔ میری بات سن لیجئے، سرکاری کام نمٹا کر آپ اپنا وہ حساب کتاب بھی چکا لیں جس کے لئے ابھی آپ نے مجھے بتایا ہے۔ مجھے پندرہ دن کے اندر بتا دیں کہ آپ ہماری اس مہم میں شامل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ بس ایک سوال اور ہے میرا آپ سے۔''

''جی فرمائیے۔'' میں نے دلچسپی سے کہا۔

''آپ یہ بتائیے کہ آپ کو بحریہ سے کتنے روز کی رخصت مل سکتی ہے؟''

میں ایک لمحے کے لئے الجھن میں پھنس گیا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ بڑے میاں کس نوعیت کے سرکاری کام میں مصروف ہیں؟ اور نفع بخش سے ان کی مراد کیا ہے۔ بہرحال یہ تفصیل جانے بغیر کچھ کہنا تو ممکن نہیں تھا۔ اور ویسے بھی میں ان سے مکمل طور پر جھوٹ بول رہا تھا میں کسی تفریحی یا تحقیقی کام سے سفر نہیں کر رہا تھا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ابھی فوری طور پر ساری تفصیل نہ وہ مجھے بتا سکتے تھے اور نہ میرے لئے پوچھنا ممکن تھا۔ میں نے گول مول سا جواب دیا۔

''سرکاری کام نمٹانے کے بعد مجھے ایک طویل رخصت کا حق حاصل ہو جائے گا۔ لیکن محترم احتشام بے! اگر آپ مجھے اپنی مہم کے بارے میں بتا دیتے تو میں اس پیشکش پر غور کر سکتا تھا۔''

''ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن بات اتنی بڑی ہے اور تفصیل طلب ہے کہ مختصراً نہیں بتائی جا سکتی۔''

''پھر جیسا آپ پسند کریں۔''

''یوں کرتے ہیں کہ دوپہر کا کھانا مسز اسمتھ اور مسٹر اسمتھ کے ساتھ ان کے کیبن

میں کھاتے ہیں۔ وہاں ذرا تفصیلی گفتگو ہو جائے گی۔ ویسے بھی جیسا میں نے آپ کو بتایا کہ یہ دونوں بڑے اچھے اور بڑی نفیس طبیعت کے مالک ہیں، آپ سے مل کر انہیں بہت خوشی ہو گی۔ معاف کیجئے گا، آپ کی شخصیت میں ایک ایسی کشش ہے جو انسان کو لمحوں میں اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اور وہ دونوں میرا مطلب ہے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ بڑے حسن پرست لوگ ہیں اور اچھی شخصیتوں کو دل سے پسند کرتے ہیں۔"

"آپ نے میری تعریف کا جواب دے دیا۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ آپ یقین کریں بالکل ایسی بات نہیں ہے۔ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ دوپہر کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھا رہے ہیں۔ میں اپنے ان دونوں دوستوں کو بھی یہ اطلاع دے دوں گا۔ اچھا اجازت۔"

احتشام بے بڑے تپاک سے مجھ سے رخصت ہوا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے اپنا کیبن نمبر اور ملاقات کا وقت یاد کرایا۔ بہرحال وہ شخص چلا گیا اور میں اسے دیکھتا رہا۔ میرا اندازہ غلط تھا، یہ ہیگ کا ساتھی نہیں ہے، کچھ بھی ہو یہ ہیگ کا ساتھی نہیں ہے۔

بہرحال اس کے جانے کے بعد میں نے کتاب ایک طرف رکھی اور وقت گزاری کے لئے ریلنگ کے ساتھ ساتھ ڈیک پر ٹہلنے لگا۔ یہ ایک دلچسپ اور نئی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں نئی دوستیاں اور نئے منصوبے شروع کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ چوری کی وردی پہن کر میں پولیس سے بچتا بچاتا نامعلوم مقامات کی خاک چھاننے نکلا تھا اور وہ بھی محض اس لئے کہ مجھے اپنے بدترین دشمن سے اپنی تباہی اور بربادی کا بدلہ لینا تھا۔ انتقام کا یہ تصور میرے دل و دماغ پر اس قدر حاوی تھا کہ دنیا بھر کی تمام سوچیں پس پشت پڑی تھیں۔ میں کچھ اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔

بہرحال یہ ساری صورتحال درپیش تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور بھیانک حقیقت جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی وردان سادھانی کی جہاز پر موجودگی۔ وہ کوئی ہولناک منصوبہ لئے جہاز پر موجود تھا اور میں نے جو کچھ اس کے چہرے پر دیکھا تھا اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جہاز پر ہی مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اور بھی بہت سی مصیبتیں تھیں۔ وردی کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا لباس بھی نہیں تھا۔ ایسی الجھنوں میں کسی علمی یا تحقیقی مہم میں شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر میں اس شعبے کا آدمی بھی نہیں تھا۔ تاریخ مصر میں نے سرسری طور پر پڑھی تھی اور کسی

عام سیاح سے زیادہ مجھے مصر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی حالانکہ قدیم مصر کی کہانیاں ہر نوجوان کے لئے پراسرار ہوتی ہیں لیکن میں کیا کروں اس بات کو کہ میرے بچپن ہی سے زندگی پراسراریت کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ بھلا ایک مسلمان کے لئے یہ کیا ضروری تھا کہ وہ بدھ مذہب کا پیروکار بن جائے اور بدھ بھکشوؤں کے جال میں اس طرح پھنس جائے کہ اپنی ساری زندگی کا محور ہی تبدیل کر دے؟ یہ بات میں اپنے ذہن سے کبھی نہیں مٹا سکتا تھا۔ جب بھی اس کے بارے میں سوچتا، دل چاہتا کہ تنہائی ہو اور میں آنکھیں بند کر کے ان تمام معاملات سے نمٹنے کا بندوبست کر سکوں۔

بہرحال ایک ڈیڑھ گھنٹے ٹہلنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ دوپہر کا کھانا تو مجھے بہرحال ان لوگوں کے ساتھ کھانا چاہئے کیونکہ جہاز پر ابھی سفر خاصا طویل رہے گا اور یہ لوگ مجھے ملتے رہیں گے۔ اگر میں انہیں نظر انداز کر دوں گا تو بہت اچھی گفتگو کرنے والا سادہ لوح پروفیسر احتشام بے میرے بارے میں کوئی اچھا خیال نہیں رکھے گا۔ لیکن اس نفع بخش تحقیقی کام میں چاہے وہ کتنا ہی نفع بخش کیوں نہ ہو، اپنے آپ کو نہیں پھنساؤں گا۔ بہرحال جہاز پر ایک ایسا شخص تو مل گیا ہے جس سے گفتگو کر سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کبھی مجھے بھی اس کی ضرورت پیش آ ہی جائے۔ اس کے علاوہ اس انگریز جوڑے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ سے بھی مل لوں گا۔ شاید وہ میری فوری ضرورت یعنی سویلین لباس کا مسئلہ حل کرنے میں مددگار ہوں۔ اس وقت حقیقت یہ ہے کہ یہ وردی میرے لئے عذاب جان بنی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ میرے سامان میں ایک قیمتی سوٹ کیس موجود تھا مگر میں کیا کرتا سلطان چچا کی اس احمقانہ حرکت پر کہ انہوں نے میرے بدن کا تعین نہیں کیا تھا۔ اب ان کی اس محبت کو تو کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن محبت کے مارے سلطان چچا میری جسامت کا خیال نہیں رکھ سکے تھے۔

دن کا باقی حصہ میں نے اپنے کیبن میں ہی گزارا۔ طے شدہ وقت پر میں پروفیسر احتشام بے کے کیبن کی تلاش میں نکلا اور پھر ایک بار اس چکر دار زینے پر چڑھا اترا جہاں میں نے وردان سادھانی کو کھڑا دیکھا تھا۔ دن کے اجالے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اس سیڑھی پر وردان سادھانی نظر آیا تھا۔ لیکن شاید وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ شاید ذہن نے تصور میں ہلکی روشنی میں کسی اور کو دیکھ کر ہی یہ خیالی تانا بانا تیار کر لیا تھا۔ مگر میں

نے جو آواز سنی تھی وہ آواز تو اسی کی تھی۔ میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ بس دل پر کچھ لرزشیں لئے ہوئے میں احتشام بے کے کیبن پر پہنچ گیا۔ دستک دی تو احتشام بے نے خود دروازہ کھولا۔ مجھ سے کچھ ہی دیر پہلے وہ انگریز جوڑا وہاں پہنچا تھا اور انہوں نے ابھی نشستیں بھی نہیں سنبھالی تھیں۔ مجھے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔

مسز اسمتھ کی آنکھوں میں پسندیدگی کے آثار نظر آئے اور ہم لوگوں میں تعارف ہوا۔ مسز اسمتھ نے میرا ہاتھ، ہاتھ میں لیا تو چھوڑنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ہنری اسمتھ ایک نیاز مند شوہر نکلا اور مجھے وہ پرانا جوڑا یاد آ گیا یعنی مسٹر اور مسز آدم۔

باتوں باتوں میں مسز اسمتھ نے بتا دیا کہ ان کے شوہر نامدار مسز اسمتھ کے دولت مند باپ کے کارندے تھے۔ شادی کے بعد آرام و آسائش میسر ہوا تو انہوں نے چھوٹی سی توند نکال لی اور اب وہ بیوی کی رقموں سے کاروبار کرتے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی عام انگریزوں سے بہت حد تک مختلف تھے۔ اتنے مختلف کہ گھنٹے بھر میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات اور معاشی پس منظر سب کچھ بتا دیا۔ ویسے یہ بہت بڑی بات تھی کہ انہوں نے اپنی حیثیت بھی بتا دی۔ یہ انگریزوں کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن دنیا بھر کے نو دولتیوں کی طرح ڈینگیں مارنے کے مرض میں مبتلا تھے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں خوش مزاج تھے اور ان کی باتوں میں مزاح کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ میرا دل بہت اچھی طرح بہل گیا اور میں جو پچھلے کافی دنوں سے شدید الجھنوں کا شکار تھا ان کی باتوں میں اس طرح بہل گیا۔ ویسے پروفیسر احتشام بے نے جس نفع بخش کام کا ذکر کیا تھا میں نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ مجھے اس کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ پروفیسر نے صبح جس اشتیاق سے مجھے اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی اس وقت اس کا ذکر بھی نہیں ہوا تھا۔ یعنی کھانے سے پہلے، کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد اس مہم کا تذکرہ تک نہیں آیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ شرمندہ شرمندہ سا ہو۔ زیادہ تر باتیں مسز اسمتھ ہی کر رہی تھیں۔ اس نے یہ تک نہ بتایا کہ وہ لوگ جو مصر جا رہے ہیں تو آخر ان کا ارادہ کیا ہے۔ ایک بار پروفیسر کی بیٹی ارسلہ کا تذکرہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ قاہرہ میں کسی ہوٹل میں مقیم ہے اور دن بھر کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔

”کاش میں تمہیں اس کی تصویر دکھا سکتا۔ تمہیں حیرانی ہوتی وہ بڑی شاداب اور ترو

ازہ لڑکی ہے۔ کتابیں بے شک پڑھتی ہے لیکن کتابوں میں گم رہنے والی لڑکیوں سے ت مختلف ہے۔ کشیدہ قامت ہے اور کھلاڑی عورتوں کی طرح کمان جیسے بدن کی مالک ہے۔ اس کی آنکھیں ہنستی ہوئی ہیں اور ہونٹ بولتے ہوئے۔“

پروفیسر نے اس طرح اپنی بیٹی کے رنگ و روپ، قد و قامت اور جسمانی موزونیت کا ذکرہ کیا کہ میں نے اس کی تصویر اپنی آنکھوں میں بنا لی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے وچا کہ اگر اس بے وقوف جوڑے کی جگہ پروفیسر کی بیٹی اس کی ہمسفر ہوتی تو میرا سفر رے سے کٹ جاتا۔ یہ انگریز میاں بیوی تو مجھ سے بھی گئے گزرے نکلے۔ مجھے کم سے لم تاریخ سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی، انہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ مصر میں ت سے فرعون گزرے ہیں۔ مسز اسمتھ نے کہا۔

”فرعونوں کے علاوہ وہاں ملکہ قلوپطرہ کا بھی تو ذکر نکلتا ہے۔“

”ہاں، قلوپطرہ ایک مشہور عورت تھی۔ لیکن ایک اور ملکہ تھی جس کا نام نفرطیطی تھا۔“

”نفرطیطی...... بڑا مشکل نام ہے۔“

”اور ایک اور عورت تھی، حطشی پست۔ ان دونوں میں سے ایک ملکہ کا سر لمبا تھا تو وہ اص طرز کا تاج پہنتی تھی تاکہ اس کا یہ جسمانی عیب نظر نہ آئے۔“ پروفیسر احتشام بے ن لوگوں کو پاگل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی احمقوں کی طرح پروفیسر احتشام بے کی صورت دیکھ رہے تھے اور میں نے بھی پروفیسر احتشام بے کو غور سے دیکھا یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ان دونوں کو بیوقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟ جس نفع بخش کاروبار میں اس نے ن دونوں کو شامل کیا تھا وہ کھیل کوئی دھوکا ہی نہ ہو۔ اس دنیا میں کسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون کتنے پانی میں ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ ویسے یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ ان دو نیم تعلیم یافتہ انگریزوں کے ساتھ مل کر پروفیسر احتشام بے کس قسم کا علمی کام کر رہا ہے۔ لیکن بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ جب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا ہی نہیں ہے تو ان کے بارے میں سوچنے سے کیا فائدہ؟ بہرحال نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سا الجھا ہوا تصور آ بسا تھا۔

میں نے کافی وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارا اور کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے ان سے اجازت لی اور اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ آہ...... یہ وردی میرے لئے کس قدر عذابِ جان بنی ہوئی تھی۔ میں کیا کہوں اس کے بارے میں۔ بہرحال میں وردی

میں ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ پھر نجانے کیوں میری آنکھوں میں ایک بے نقش چہرہ ابھر آیا۔ سڈول بدن، کمان جیسی کھنچی ہوئی جوانی۔ پروفیسر نے نجانے کیوں اتنی تفصیل سے اپنی بیٹی کے حسن و جمال کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش تو بے شک میری نگاہوں میں واضح نہیں تھے کیونکہ پروفیسر نے اس کے چہرے کے نقوش کا کوئی تفصیلی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ نجانے کیوں بار بار میرے ذہن میں یہ تصور آ رہا تھا کہ اگر یہ لڑکی اس وقت اپنے باپ کے ساتھ سفر کر رہی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

پھر اچانک ہی مجھے اپنے اندر کچھ جھٹکے سے محسوس ہوئے۔ ایک لڑکی کا تصور کر کے میں کس طرح دیوانگی کا شکار ہو رہا ہوں حالانکہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔ ایک ایسی اجنبی شخصیت جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن فطرت کی یہ تبدیلی کیسی انوکھی ہے۔ مجھے یہ تمام باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ کیونکہ ظاہر ہے اسکندریہ کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد پروفیسر احتشام بے اپنا راستہ لے گا اور میں ہیگ کا سایہ بن کر پتہ نہیں کن راستوں پر نکل جاؤں گا۔ بہرحال بڑی پریشان کن بات تھی۔

ایک بار پھر میری توجہ وردی کی جانب چلی گئی۔ اگر مجھے پورے سفر کے دوران اسی وردی میں رہنا پڑا تو کیا میں جہاز والوں کے لئے ایک یاد رہنے والی چیز نہیں بن جاؤں گا؟ وہ مجھے ایک عجوبہ ہی سمجھیں گے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے کہیں نہ کہیں سے کسی طرح کپڑے حاصل کرنے ہوں گے۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ پورا دن میں نے سوشل گفتگو اور خواہ مخواہ کے تعلقات بڑھاتے میں گزار دیا تھا۔ مجھے اس عرصے میں کچھ کام کرنا چاہئے۔ بہرحال نجانے کب تک یہ الجھنیں میرے دل و دماغ پر سوار رہیں۔ اور پھر نیند نے مجھے آغوش میں لے کر تھپک تھپک کر سلا دیا۔

جاگا تو پوری طرح شام ہو چکی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر وردی کو جھاڑا اور صاف ستھرا کر کے بار کی جانب نکل گیا۔ میں بڑی اداسی اور تشنگی کے ساتھ جہاز کے بار میں بیٹھا کولڈ ڈرنک پیتا رہا۔ قریب ہی کی ایک میز پر میری ہی جسامت کا ایک امریکی نوجوان شاہ جارج پنجم جیسی داڑھی میں اپنا تمتمایا چہرہ چھپائے ہوئے ایک سبک سی انگریز لڑکی کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھا۔ وہ اپنے بے تکلف لباس اور بے ہنگم گفتگو سے پہچانا جاتا تھا۔ میں نے اس کی گفتگو سنی۔ وہ انگریز لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

”مائی لیڈی! آپ انگریز بڑے قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم امریکی کاک ٹیل

ی طرح کی ساخت اور ہوا کی طرح آزاد ہیں۔ اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے ہم صحیح معنوں میں جمہوری ہے۔ مثلاً میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت میں آپ کے ہونٹ چوم لوں۔ لیکن کاش یہ میڈلین ایونیو ہوتا اور آپ میری ماڈل تو پھر ہم اس شام کو اس طرح ضائع نہ کرتے۔ میرے کیبن میں تو شام کہیں زیادہ نشہ آور اور تند و تیز گزر رہی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ چلئے اور چل کر خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔“

میں نے اس کی گفتگو تو سرسری انداز میں سنی تھی لیکن پھر میں نے اس کی اسمارٹنس پر غور کیا۔ یہ تو واقعی بے پناہ تیز آدمی تھا۔ بڑی استادی سے وہ لڑکی کو راہ پر لا رہا تھا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ میں کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ لڑکی آہستہ آہستہ رام ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے کے نقوش دھندلا گئے اور اس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ غائب ہو گئے۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں ارسلا کا تصور ابھر آیا تھا۔ کیا وہ ایسی ہو گی؟ امریکن بار بار لڑکی کو مائی لیڈی، مائی لیڈی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور مجھے اس لڑکی میں ارسلا کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں اس قدر الجھاوے کا شکار ہوا کہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ یہ بے نقش چہرہ نجانے کیوں میرے حواس پر مسلط ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھ کر جاؤں اور پروفیسر احتشام بے کا گریبان پکڑ کر پوچھوں کہ اس نے صرف اس کے قد و قامت اور جسم کا تذکرہ کیوں کیا ہے؟ مجھے اس کے نقوش کے بارے میں کیوں نہیں بتاتا؟ کیوں نہیں بتاتا۔ یہ سوچ کر میں جھنجلا سا گیا اور میں نے زور سے دانت بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پوچھوں گا۔ پروفیسر سے معلوم کروں گا۔ یہ میری دیوانگی کی سوچ تھی۔ آہ...... نیند آ جانی چاہئے ورنہ دماغ پھٹ جائے گا۔ یہ کیا نیا کھیل شروع ہو رہا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

میں نیم غنودگی کی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ پھر نجانے کیسی آوازیں مجھے سنائی دیں۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھاٹ...... میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ جہاز بری طرح رول کر رہا تھا۔ میں نے تکیے سے سر اٹھا کر سنا تھا۔ آواز کسی مخصوص یکسانیت سے آ رہی تھی۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھاٹ۔ نیند کی گرد جھاڑ کر میں نے جہاز کی اسپرنگ دار مسہری پر لوٹ لگائی۔ یہ یقیناً انجنوں کی آواز نہیں ہو سکتی۔ فرسٹ کلاس کے کیبن اس سے کئی منزل اوپر ہوتے ہیں۔

دستک پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کسی عورت کی سرگوشی میرے کانوں میں

ابھری۔ کوئی میرے دروازے پر ہی دستک دے رہا تھا۔ پکارنے والے کی آواز پر میں نے غور کیا اور پھر پھرتی سے اپنے بستر سے اٹھا اور اس آواز پر کان لگا دیئے۔ پکارنے والی عورت کی آواز تھی اور اس میں جھنجلاہٹ تھی۔

"دیکھو...... دیکھو گدھے...... گدھے، دروازہ کھولو۔ ورنہ میں جا رہی ہوں۔ دروازہ کھولو ایڈیٹ! میں آئی ہوں، پور لیڈی۔ پور لیڈی۔" میں نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ یہ بے تکی بکواس میرے ذہن پر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ میری آواز ابھری۔

"مائی لیڈی۔" اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں عجیب سے خیالات دوڑ گئے۔ بجلی کی سی تیزی سے پچھلی شام کا بار کا منظر میری نگاہوں میں بھر گیا۔ داڑھی والا امریکن لڑکا اور وہ انگریز لڑکی جسے بار بار وہ مائی لیڈی کہہ کر پکار رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر میرے سارے وجود میں گرم گرم لہریں دوڑ گئیں۔ یہ لمحہ تو سوچے سمجھے بغیر کچھ کر گزرنے کا تھا۔ میرے کیبن میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر ظاہر ہے راہداری میں زرد اور مدھم روشنی پھیلی ہوگی اور اس وقت اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے۔ سارے پارسائی کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ بہت سی بار میں نے سوچا تھا کہ اپنے کردار کو سنوارنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ارسلا کے تصور نے، اس کے تذکرے نے میرے دل و دماغ پر دیوانگی سوار کر دی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور کوریڈر کی نیم تاریکی میں دروازے سے بھڑی ہوئی ریشمیں گٹھری کو اندر کھینچ لیا اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔

"سو گئے تھے...... کتنی گہری نیند سو گئے تھے تم۔ میں آدھے گھنٹے سے دروازہ بجا رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ لیکن میں نے اسے تقریر کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اس کا دہانہ باسی لپ اسٹک، تازہ شراب اور سلگتی لو دیتی ہوئی کہانی سنا رہا تھا۔ میں وحشی بن گیا اور وہ بھی جذباتی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میری گردن سے نکل کر میری کمر پر آگئے اور وہ کسی بیل کی طرح جو ستون سے لپٹ جاتی ہے مجھ سے آلپٹی۔ اس کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ میری ہر خواہش کی تکمیل کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ رنگ اور خواہشوں کی تشنگی آگ بن گئی تھی۔ باہر سمندر پر جھاگ اڑاتی ہوئی ہوا تیز و تند لہروں سے الجھ رہی تھی اور میں نجانے کیا محسوس کر رہا تھا۔ ہم آسمانوں کی طرف پرواز کرتے رہے۔ ہماری بے قابو سانسیں اور ناقابل فہم سرگوشیاں جن کی کوئی زبان نہیں تھی، ہزاروں زبانوں سے وقت کی داستان سنا رہی تھیں اور ہم جنگل میں چراغاں کر رہے تھے اور ہر شاخ پر لو دیتے ہوئے

دیے روشن کر رہے تھے۔ اور پھر سیلاب تو ایک وقتی ہوا کے جھونکے جیسا ہوتا ہے۔ جب یہ سیلاب گزر گیا تو وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو نجانے کیوں مجھے اپنے سینے پر تیزاب جیسے چبھ رہے تھے۔ یہ عجیب و غریب تجربہ تھا۔ نجانے کیوں وہ رو رہی تھی۔ پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"ڈِک! تم مجھ سے شادی کر لو، سمجھے۔ ڈِک تم مجھ سے شادی کر لو۔"

اور اس کے بعد میرے لئے خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "مائی لیڈی! میں ڈک نہیں ہوں۔"

اس نے میری آواز سنی اور پھر جیسے بچھو نے اسے ڈنک مارا ہو۔ وہ تڑپ کر مجھ سے علیحدہ ہوگئی اور میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی طرف جھکی۔ کچھ لمحوں میں کیبن میں روشنی ہوگئی۔ اس نے پھرتی سے اپنے بدن پر کمبل کھینچ لیا۔ مجھے یونہی لگا جیسے میں نے پتھر کی تراش کی ہوئی کسی دیوی کو دیکھا ہو جو شو مندر میں کسی گوشے میں آویزاں ہو۔ اس کے بال پسینے سے پیشانی پر چپکے ہوئے تھے اور آنسو سے تر آنکھیں دہشت سے کھلی ہوئی مجھے تکے جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بند کر لیا۔ شاید وہ اپنے منہ سے نکلنے والی چیخ روک رہی تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"کون ہو تم...... کون ہو؟" اس کی آواز میں غصے کی چیخ تھی۔

"ذرا سا اپنے آپ پر غور کرو مائی لیڈی! تم نے مجھے ڈِک کہہ کر مخاطب کیا تھا۔"

وہ آہستہ آہستہ بستر کے دوسری جانب سرک رہی تھی۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر وہ پیچھے بڑھی اور کیبن کے دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔ پھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑھ گئیں اور اس کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔

"تمہیں...... میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ شام کو تم بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا تم کوئی ملاح ہو؟"

"نہیں لیڈی! ملاح نہیں، لیفٹیننٹ ہوں۔ لیفٹیننٹ خاقان جمشیدی۔" میں نے اداکاروں کی طرح جھک کر اپنا تعارف کرایا۔ وہ غصے سے بمشکل اتنا کہہ سکی۔

"میں...... میں کیپٹن سے رپورٹ کروں گی۔"

میں نے بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکائیں اور آہستہ سے بولا۔ "رپورٹ؟"

"ہاں۔"

"کیسی رپورٹ مائی لیڈی...... کیسی رپورٹ؟ ہم دونوں بالغ اور صحت مند ہیں اور یہ سب کچھ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ کیپٹن کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے معزز مسافروں سے ان کے نجی معاملات کی رپورٹ مانگے۔"

"بکواس بند کرو... بکواس بند کرو تم۔" وہ غصے اور احساسِ بے بسی سے کانپ رہی تھی۔

"جو حکم مائی لیڈی!"

"میں کہتی ہوں مجھے مائی لیڈی مت کہو کمینے۔"

"جو حکم مائی لیڈی۔"

اچانک ہی وہ بستر سے کود کر کمبل لپیٹے لپیٹے دروازے کی طرف بڑھی اور الجھ کر کیبن کے فرش پر آ گری۔ اس کا بدن کھل گیا تھا جسے میں نے کمبل سے ڈھک دیا اور فرش پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی برف کی طرح سرد ہو رہی تھی۔ اس نے غرا کر کہا۔

"دیکھو، مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور سرک کر مجھ سے دور ہو گئی۔ اب وہ روہانسی سی ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں روشنی کی ایک لکیر اترتی چلی گئی۔

"مائی لیڈی! آپ سے ایک بات کہوں، میرا ملازم میرے سامان میں سویلین کپڑے رکھنا بھول گیا ہے اور میں بڑی مشکل میں ہوں۔ میرے پاس صرف وردیاں ہیں جو ظاہر ہے میں راستے میں نہیں پہن سکتا۔ مجھے لباس چاہئے۔"

"دیکھو تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"مجھے کپڑوں کی سخت ضرورت ہے مائی لیڈی! شادی سے زیادہ مجھے کپڑے چاہئیں۔ کم از کم دو تین قمیصیں اور پتلونیں، ایک آدھ جیکٹ۔ اور یہ سودا تمہارے حق میں برا نہیں ہو گا۔ دو تین ٹائیاں سادہ سی۔ یہ کپڑے آپ کے امریکی دوست ڈِک فراہم کر دیں گے۔ سمجھیں آپ؟" میرا لہجہ کچھ سخت ہو گیا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے پھر کہا۔

"میں اس کے لئے مجبور ہوں۔ اصل میں میرے ملازم نے میرے سامان میں صرف وردیاں رکھ دی تھیں۔"

"مگر میں تمہیں یہ ساری چیزیں کیوں مہیا کروں گی؟"

"کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" میں نے پرانے اور گھاگ بلیک میلروں کی

طرح پہلے تو صاف صاف باتیں کیں پھر اسے بڑی دردمندی سے سمجھایا کہ مائی لیڈی! میں مجبور ہوں اور مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں ورنہ تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ میرا ایک دشمن اس جہاز پر موجود ہے۔ یہ ضروری ہے کہ میں یہ یونیفارم پہن کر اس کے سامنے نہ آؤں۔ مجھے ہر صورت میں صبح سے پہلے سویلین کپڑے مل جانے چاہئیں ورنہ میں مارا جاؤں گا۔"

"مگر میں پوچھتی ہوں کہ میں تمہارے لئے یہ سب کیوں کروں گی؟"

"وہی آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ اچانک اس طرح آ گئیں اور ہم دونوں ان منزلوں میں داخل ہو گئے جن کے بارے میں اگر یہاں موجود لوگوں کو پتہ چلے گا تو میں تو سیدھی سیدھی بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نشے میں تھا اور یہ خاتون میرے کیبن میں آ گئی تھیں اس کے بعد میں کیا کرتا۔ لیکن اس کے بعد تمہارے دوست ڈِک اور تمہارے ساتھ جو کوئی بھی ہے اس کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔ اور سنو...... اب تم میرے لئے کپڑوں کا بندوبست کرو گی۔ میں ڈِک کو دیکھ چکا ہوں۔ اس کے کپڑے میرے بدن پر ٹھیک آئیں گے۔ مگر یہ مسئلہ تمہیں حل کرنا ہے کیا سمجھیں۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ بکواس کر رہے ہو۔ تم کوئی سازش کر رہے ہو۔ تم ڈِک کو کسی چکر میں پھنسانا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں ہے تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا۔ یہ لو، اپنے کپڑے وغیرہ لے جاؤ۔" میں نے اس کے سلیپنگ سوٹ کی گٹھری سی بنائی اور اس کی طرف اچھال دی۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسے مجھ جیسے کمینے آدمی سے اس معقولیت کی امید نہیں تھی۔ بہرحال اس نے میرے چہرے پر ناراضگی کی جھلک دیکھ لی اور مجھے اس حالت میں روٹھتے دیکھ کر اسے ہنسی آ رہی ہو گی اور میں نے اپنے خیال کی تصدیق کر لی۔ وہ پہلی بار مسکرائی اور بولی۔

"میں اپنا لباس پہننا چاہتی ہوں۔ اپنا رخ تبدیل کر لو۔"

میں نے خاموشی سے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "میں جا رہی ہوں۔"

"اور سنو، اس کیبن کا نمبر بائیس ہے۔ کل رات ڈِک کی تلاش میں نکلو تو بھولے سے پھر اسی کیبن پر دستک نہ دے دینا، او کے؟"

میں نے خاموشی سے کیبن کے دروازے کا بولٹ گرایا اور دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا، کوریڈور ویران اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ اچانک وہ بولی۔ ”تم ایشیائی کتنے جذباتی ہوتے ہو۔ کیا تم عرب ہو؟“

”شب بخیر اور خدا حافظ۔“ میں نے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں دروازے کے پاس دروازہ کھولے کھڑا ہوا تھا۔ تب اس نے کہا۔

”لیفٹیننٹ پلیز، دروازہ بند کر دو اور ادھر آؤ۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے حکم دے رہی ہو۔ میں نے گہری سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ”تمہارا کیا مسئلہ ہے؟“

”کچھ نہیں۔ تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا تھا۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تو بس تمہارے دوست ڈِک کو پھنسوانا چاہتا تھا۔“

”میں بتاؤں قصہ کیا ہے؟“ اس نے کچھ اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”بولو۔“

”تم نیوی سے فرار ہو رہے ہو۔“

”ویری گڈ۔ آپ کے خیال میں میڈم! کیا فرار ہونے والے وردی پہن کر آتے ہیں؟“

”سنو، کیا واقعی تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں؟“ اب اس کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔

”ہاں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم چاہو تو میرے اس کیبن کی تلاشی لے سکتی ہو۔“

”ہوں......“ وہ اپنا داہنا گال کھجانے لگی۔ پھر بولی۔ ”میں تمہیں ڈِک کے کپڑے لا دوں گی لیکن ابھی نہیں۔ صبح کسی بہانے سے میں اسے کیبن سے باہر بھیج دوں گی۔ وہ اس کیبن کے ساتھ ہی تیئس نمبر کیبن ہے۔ سمجھے؟“

”ہوں۔“

”اور اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مجھ سے اندازے کی غلطی کیسے ہو گئی تھی۔“

”شاید۔“

”اب تم سو جاؤ۔ میں صبح آؤں گی کپڑے لے کر، اوکے۔“ پھر اس نے میرے قریب پہنچ کر اچانک ہی میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نیلی آنکھیں کسی نرم جذبے سے دھیمے دھیمے سے روشن ہوتی جا رہی ہیں۔ اس نے مجھے چوما اور پھر بولی۔

”شب بخیر۔ تم اچھے آدمی ہو لیفٹیننٹ۔ لیکن تمہیں بلیک میل کرنا نہیں آتا۔“

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس نے ہوا میں بوسہ اچھال دیا اور ہوا پر بہتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے بہت سا بوجھ اتر گیا ہو۔ جہاز کے دائیں بائیں رولنگ نے اعصاب پر نیند طاری کر دی تھی اور میں نامعلوم کس وقت سو گیا۔ میں نے رات شاید کیبن کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا اس لئے صبح کوئی نو بجے آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ بستر کے قریب رڈی اخبار میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ رکھا ہوا ہے۔ پہلے تو خیال ہوا کہ شاید لانڈری کے لئے پرانے تولیے وغیرہ اکٹھے کئے گئے ہیں۔ لیکن رات کی بات اور مائی لیڈی کا وعدہ یاد آ گیا۔ میں نے بستر سے اتر کر کیبن کا دروازہ بند کیا اور جلدی جلدی اس پیکٹ کو کھولنے لگا۔ ایک عام سا سوٹ تھا جیسا کہ روزمرہ کے کاروبار میں مصروف بے شمار لوگ ہر صبح پہن کر اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ میں مائی لیڈی کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس سوٹ میں کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔ اندر اس دکان کا لیبل لگا ہوا تھا جہاں سے یہ سوٹ سلا تھا اور کپڑے کے لیبل کی دوہری تہہ میں کاغذ کا ایک پُرزہ ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا، پنسل سے ایک پرچہ لکھا ہوا تھا۔

”سنو...... یہ اور ایسے دوسرے لیبل کاٹ دینا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈِک کے لباس میں ایسے بے شمار کپڑے موجود ہیں۔ اسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ٹائیاں سب امریکن ہیں، ایسی کہ اگر انہیں تم پہن لو گے تو ان کے رنگ دور بندرگاہ سے بھی چمکتے دکھائی دیں گے۔ ویسے جہاز کی کینٹین صبح نو بجے کھلے گی تمہارے لائق ٹائیاں نظر آئیں تو پیش کر دوں گی۔“

نیچے اس نے اپنا نام نہیں لکھا تھا، بس ایکس بنا دیا تھا۔ میں نے کلائی پر گھڑی دیکھی، نو بجنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ پھر میں نے پتلون قمیض پہن کر دیکھی، فٹنگ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی کپڑے ہیں یا درزی نے خاص میرے لئے سیئے ہیں۔

نہا دھو کر اس سوٹ کے ساتھ میں نے بحریہ کی نیلی ٹائی باندھی اور جلدی جلدی کیبن کی حالت درست کر کے مائی لیڈی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس عجیب و غریب لڑکی کے لئے دل میں ایک اور لطیف جذبہ محسوس کیا۔ یہ بڑی عجیب اور سرور انگیز بات

تھی۔ نو بج کر بیس منٹ پر کوریڈور سے فرش پر کسی کے قدموں کی آواز ابھری اور میرے کیبن کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ کسی نے دستک دی۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک وردی پوش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''گڈ مارننگ سر! آپ کے لئے ایک پیکٹ لایا ہوں۔'' اس نے رنگین فیتے سے بندھا ہوا ایک پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک سکہ دیا اور وہ سلام کر کے چلا گیا۔ تو وہ نہیں آئی۔ اور اس نے ٹائیاں اس لڑکے کے ہاتھ بھجی ہیں۔ میں نے مایوسی سے سوچا اور اپنے بستر پر آ بیٹھا۔ پیکٹ میں دو بہت ہی خوبصورت ٹائیاں تھیں۔ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے خود سے کہا۔

''مائی لیڈی! تم ایک سطر ہی لکھ کر بھیج دیتیں تو مجھے ایک اور خوشی ہو جاتی۔''

میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ انسان کی قرابت انسان کو کس قدر عزیز ہوتی ہے اور کبھی کبھی بالکل احمقانہ انداز میں کوئی پتھر سے پتھر دل شخص کسی کی قربت سے متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت مجھے عالیہ کے ساتھ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اس انوکھی لڑکی نے جس کا نام بھی مجھے نہیں معلوم تھا، میرے دل کے کسی گوشے کو نرم کر دیا تھا اور میں اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے شکوہ تھا کہ اس نے صبح کیبن میں کپڑوں کا بنڈل رکھتے ہوئے مجھے جگا کیوں نہیں دیا۔ اور اگر وہ اس وقت جلدی میں تھی تو یہ ٹائیاں لے کر خود تو آ سکتی تھی۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی اور وہ یہ کہ یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ مجھے ڈِک سے رقابت محسوس ہو رہی تھی۔

ابھی میں انہی خیالوں میں بیٹھا ہوا تھا کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی اور نجانے کیوں میرا دل اچھل پڑا۔ شاید وہ آئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ لیکن باہر وردی پوش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا اور پھر بولا۔

''سر! آپ کے لئے یہ لفافہ ہے۔'' اس نے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔ میں نے حیرت سے اس لفافے کو دیکھا پھر اسے کھولا۔ موٹی سی نب میں سیاہ روشنائی سے ایک مختصر سا پیغام تھا۔

''لیفٹیننٹ! اگر آپ مصروف نہ ہوں تو کیبن نمبر تیرہ میں آ جائیں۔
آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ شکریہ۔ (احتشام بے)''

میں جھنجلا کر رہ گیا۔ اس گدھے نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے۔ اس روز لنچ پر مجھے یہ کہہ کر بلایا کہ مجھ سے اپنی اس مہم کے بارے میں بات کرے گا اور ڈیڑھ دو گھنٹے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، مہم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ حالانکہ مجھے خود اس تحقیقی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر یہ کیا طریقہ اختیار کیا ہے اس نے۔ اس طرح رقعہ بھیج کر مجھے بلایا ہے۔ میں اس کا ملازم تو نہیں ہوں کہ جب چاہے گھنٹی بجا کر بلا لے۔

میں نے غصے کے عالم میں لفافہ پرزے پرزے کر دیا اور رڈی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ پھر تھوڑی دیر تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد کیبن سے باہر آ گیا۔ میں لاؤنج کے بڑے پیانو پر خود کو تھوڑی دیر بہلانا چاہتا تھا۔ یہ پیانو بار کے ایک گوشے میں مجھے نظر آیا تھا اور جہاز پر سفر کرنے والے اگر بجانے کے شوقین ہوتے تھے تو اس پیانو کو بجا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بار میں آ گیا۔ یہاں اکا دکا مسافر بیئر اور ہلکے پھلکے مشروبات سے شغل کر رہے تھے۔ میں نے لاؤنج کے پردے گرائے اور پیانو پر آ بیٹھا۔ اس کے بعد میں پیانو پر ہلکی پھلکی دھنیں بجاتا رہا۔ دن کے ان روشن لمحوں میں میری اداسی بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں؟ میری زندگی میں کسی لڑکی کی آمد اجنبی تو نہیں ہے۔ یا پھر میری فطرت میں ایسا کوئی نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں کسی بھی شخصیت سے متاثر ہو سکتا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ بے نقش چہرہ تھا جو اچانک ہی میرے وجود پر سوار ہو گیا تھا۔ ایلس فیوری، عالیہ اور اس کے بعد یہ لڑکی مائی لیڈی، جس کا نام پتہ نہیں کیا تھا۔ یہ سب تھیں لیکن وہ بے نقش چہرہ نجانے کیوں مجھے تڑپائے ہوئے تھا اور شاید اسی نے میری یہ کیفیت کر دی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں۔ زندگی کے اس تیز رفتار سفر میں اس لڑکی سے اچانک سرِ راہ ہی ملاقات ہو گئی ہے۔ اس کی پیاس تو شاید تپتی ہوئی زمین کی پیاس تھی جو میں نے بجھا دی۔ مگر میرے اندر یہ کیا ہوا؟ میں تو اپنے اندر چھپے اس پیاسے آدمی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ بھلا یہ کیسا روگ میں نے اپنی جان کو لگا لیا ہے۔ یہ تو گھنٹے دو گھنٹے کا کھیل تھا۔ وہ لڑکی تو اب شاید مجھے مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ کیونکہ وہ ڈِک سے محبت کرتی ہے اور اسی کے دھوکے میں میرے پاس آئی ہے۔ اس کا ڈِک اس کے پاس ہو گا۔ میں تو اس رات ڈِک کا بدن بن کر آیا تھا اور وہ میرے ساتھ میرے احساس کے کسی سفر میں کیوں چلے گی۔ اس کا سفر ڈِک کی سمت تھا۔

رقابت کے شدید احساس نے مجھے جھنجلا دیا اور میں نے پیانو پر ساری انگلیاں جما دیں۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں اپنی یادوں میں کھویا ہوا ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری دھن بجاتا رہا۔ کبھی تو یہ ان معصوم دنوں اور معصوم راتوں کا مرثیہ معلوم ہوتا تھا جنہیں میں نے خود ہلاک کر دیا تھا۔ ان تمام مردہ دنوں اور مردہ راتوں پر دو منحوس سائے اور شیطانی پرچھائیاں تھیں۔ ایک دیو قامت پرچھائیں وردان سادھانی کی تھی اور دوسری پرچھائیں سیوک سندھورتی کی۔ اس کے علاوہ ایک اور منحوس سایہ ہیگ کا تھا۔ میں اس منحوس مثلث میں کس طرح پھنس گیا ہوں۔ کیا کروں...... آہ، کیا کروں۔ ایک بات اور بھی تھی، بظاہر وردان سادھانی اور ہیگ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن جہاز کے اس خاموش لان میں پیانو پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے وردان سادھانی کی طرح ہیگ بھی بھکشو اُوم شری کی بھیجی ہوئی کوئی شیطانی قوت ہے۔ جس نے مجھے ایک ہموار اور پُرسکون جھیل سے سمندر کی سر پٹختی ہوئی پُرشور موجوں پر لا ڈالا ہے۔

میری وحشت عروج کو پہنچتی چلی گئی۔ پیانو پر انگلیاں پھیرتے ہوئے میری نگاہیں سامنے کی جانب اٹھیں تو مجھے یوں لگا جیسے پردہ آپ ہی آپ ہل رہا ہے۔ جیسے کوئی چیز اس پردے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے چونک کر کتنی ہی بار آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہے۔ لیکن پردہ بار بار ہل رہا تھا۔ یقیناً پردے کے پیچھے کوئی پورٹ ہول کھلا رہ گیا ہے جس سے سمندر کی ہوا اندر آ رہی ہے۔ ایک جنون کے عالم میں، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر بھاری پردے کو ایک جھٹکے سے ہٹا دیا۔ پورٹ ہول بے شک کھلا ہوا تھا لیکن پردہ ہوا سے نہیں ہل رہا تھا۔ بلکہ اس پردے کے پیچھے، آہ...... اس پردے کے پیچھے وردان سادھانی کھڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب و غریب انداز میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کوئی تیراک سمندر کی لہروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہو۔

میں نے اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کی۔ نجانے کیوں اس وقت مجھے وردان سادھانی سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ حسب معمول اپنے مخصوص لباس میں ملبوس تھا، وہی گیروا لباس۔ اور اس کے چہرے پر غصے کی وہی کیفیت تھی جو میں نے جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھی تھی۔ اچانک ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں اس طرح گہری سرخ ہو رہی تھیں اور اس طرح متورم تھیں کہ لگتا تھا وہ

جیسے برسوں سے کسی شدید اذیت کا شکار رہا ہو اور ایک لمحے کے لئے بھی نہ سویا ہو۔ پھر اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

"تم نے پرکھوں کی بھیجی ہوئی سوغات گنوا دی خاقان! اور جنم جنم کے کام پلک جھپکتے میں ملیامیٹ کر دیئے۔ ہم تم سے کیا کہیں اور کیوں کہیں۔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ مہان بھکشو اور ان کے داس نے ہیروں کا بیوپار کیا اور پتھر پائے۔ ہم نے تو سینڈھی سے گرمائے ہوئے سانڈ کے آگے ماتھا ٹیکا اور کرنی کا پھل پایا۔ خاقان! اپنے اندر جھانک کر تو دیکھ، کیا تیرے شریر میں بودھی ستو زندہ ہیں؟ کیا وہ سانس لیتے، بولتے یا چلتے پھرتے ہیں جنہوں نے مہا بھکشوؤں کی دھار میں دھم سنگھاسن پر دربار کیا تھا؟ بتا خاقان! بول، جواب دے مجھے۔ کیا کر دیا تو نے ہمارے ساتھ۔ بول......" یہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ میں اس عجیب و غریب تقریر کا کیا جواب دیتا۔ خاموش کھڑا رہا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں کو میرے سر کے قریب لا کر ایک محراب سی بنائی اور محراب کو نیچے کی طرف لاتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ کسی قدر نرم لہجے میں بولا۔

"خاقان! ہم نے سیانوں کی بتائی ہوئی نشانیوں میں کوئی کھوٹ تو نہیں ملایا۔ ہم نے دھوکا تو نہیں دیا اور نہ ہی دھوکا کھایا۔ تمہارے بدن کے آس پاس سوگند اور اجالے کا ہالہ تو اب بھی ہے جسے میں وردان سادھانی یا سیوک سندھورتی دونوں نے دیکھا۔ اور جسے ہمارے گرو تک چھونے کی سکت نہیں رکھتے۔ مگر دیکھو، اس ہالے کے بیچ بدن سڑنے لگا ہے اور سینڈھی سے گرمائے ہوئے سانڈ کی کالی پرچھائیں تمہارے روئیں روئیں میں اترنے لگی ہے۔ خاقان! اب بھی سمے نہیں بیتا، وقت اپنی کہانی پھر سے دوہرا سکتا ہے۔ اپنے اندر کی واسناؤ کو نکال پھینکو اور پھر سے اس اونچائی کی سیڑھیاں طے کر لو جہاں سے تم نیچے اتر آئے تھے۔ آ جاؤ...... آؤ...... چلو مہان بھکشو تمہیں پکارتے ہیں۔ انتم سنھارتی تمہارا کیا دھرا معاف کر دیں گے۔ آ جاؤ۔"

اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا یا کر سکتا، وردان سادھانی نے میرا ہاتھ پکڑا اور پورٹ ہول کی جانب رخ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے عجیب و غریب اشارے کئے اور جیسے پانی کی لہریں کاٹتا ہوا کوئی تیراک آگے بڑھتا جاتا ہے، وہ آگے بڑھنے لگا۔ آگے کوئی رُکاوٹ نہیں تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دُھوئیں اور جھاگ اور آوازوں سے گزر رہا ہوں اور

سمندر سنسناتا ہوا میرے گرد و پیش سے گزرتا جا رہا ہے۔ یہ کیفیت چند ہی سیکنڈ رہی ہو گی۔ پھر اس کے بعد میں نے اپنے پیروں تلے سخت زمین محسوس کی اور میں نے گھبرا کر دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھا۔ اوپر کھلا ہوا نیلا آسمان تھا۔ دائیں بائیں اور اِدھر اُدھر ایک مسطح اور ہموار میدان۔ ہم نرم گھاس پر کھڑے تھے اور گرد و پیش میں ہری بھری جھاڑیوں کا حصار تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی جزیرہ ہو اور اس جزیرے کے مرغزاروں میں ایک بلند ٹیلا نظر آ رہا تھا اور ٹیلے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا بدھا کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ ایک بلند و بالا مجسمہ جس کی جانب وردان سادھانی نے قدم اٹھا دیئے۔ میں اس سے دو قدم پیچھے ملزموں کی طرح چلتا ہوا اس ٹیلے کے قریب پہنچا۔ تب میں نے بدھا کے مجسمے میں جنبش دیکھی۔ اس نے سفید گھنی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک عجیب و غریب چہرہ تھا یہ۔ وہ ناراضگی سے زیادہ افسردہ اور تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پھر مجھے ایک پتھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''خاقان جمشیدی! وردان سادھانی نے کہنے والی ساری باتیں کہہ دیں۔ میں تم سے بس ایک بات پوچھتا ہوں، بس ایک بات پوچھوں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ تم نے کبھی اپنے آپ کو پہچاننے کے لئے جدوجہد کی ہے یا نہیں؟ کیا تم نے ساری زندگی میں کبھی اپنے اندر جھانک کر یہ بھی دیکھا ہے کہ تم کیا ہو اور کیوں ہو؟ مہان بھکشوؤں کے دربار میں تم سے کہا گیا تھا کہ بدھی ستو! دھیان کے راستے پر تمہاری یاترا شروع ہو گئی ہے۔ تو کیا گاشر بھرم سے آنے کے بعد تم گیان کے راستے پر چلتے رہے ہو؟ اور جو کچھ ہوا ہے وہ مہتر بدھ بننے کا جتن تھا۔ سوچو ذرا، سوچو۔ اس لئے کہ اگر وہ نہ ہوا جو سیانوں نے کہا ہے تو تم خاقان! بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ اور پھر مہان بھکشوؤں کے اس سیوک کی سکھائی ہوئی بھاونائیں بھی تمہارے کام نہیں آئیں گی۔ سوچو، جاؤ، غور کرو۔ یہاں تمہیں صرف یہ بتانے کے لئے بلایا گیا ہے کہ تم کوئی معمولی انسان نہیں ہو۔ یہ جنم مرن کے کھیل ہیں۔ سنسار کی بھاونائیں اور واسنائیں گوشت پوست اور ہڈیوں کے بنے ہوئے اس وجود کو متاثر کرتی ہیں اور وہ ہو جاتا ہے جو نہیں ہونا چاہئے سمجھے۔ چھوڑ دو اسے وردان۔ گرفت سے کام نہیں چلتا جب تک کہ منش خود اپنے بارے میں نہ سوچے۔ ہم اسے اس کا وہ مقام بتا رہے ہیں جو ہے۔ اور اگر یہ اس مقام کو پہچانے تو اسے سب کچھ مل سکتا ہے۔ زبردستی اسے کیا کیا سمجھاؤ گے۔ چھوڑ دو اس کا ہاتھ۔''

وردان سادھانی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر اسی دھوئیں اور جھاگ دار آوازوں سے ...ز کر میں ایک مانوس فضا میں آ گیا۔ میرے پیروں تلے نرم قالین تھا جو جہاز کے ...ہانی لاؤنج میں بچھا ہوا تھا اور میں بھاری پردے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے ...ٹ ہول سے بھیگی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا آیا تو میں تھکے تھکے انداز میں پردے سے ہٹ ...ر پیانو کے پاس آ پہنچا اور اسٹول پر بیٹھ گیا۔ میں کہاں گیا تھا؟ میں نے کس کی آواز سنی ...ی؟ لاؤنج میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ سب ایک خواب کہانی معلوم ہوتی تھی۔ دفعتہً ہی میں نے اپنے جوتوں پر نظر ڈالی۔ جوتوں کے تلے نم تھے اور گھاس کی ٹوٹی ...ی ہری ہری پتیاں ان سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ آہ یہ ...اب کہانی نہیں بلکہ ایک سچائی تھی۔ میں نے ایک سفر کیا تھا۔ سمندر میں تیرتے ہوئے ...ہاز سے ان نامعلوم وادیوں کی طرف۔ یقینی طور پر میں اس ماحول سے نکل کر اس جہاز سے کہیں دور گیا تھا۔ لیکن کیا یہ عقل میں آنے والی بات تھی؟ کسی سے کہتا تو کیا کوئی ...ین کر لیتا؟ نہیں، یہ ناممکن تھا۔ میرا سارا وجود یہی ہے۔ اور اگر یہ بھی وہم ہے تو پھر دنیا ...ا ہر چیز غیر حقیقی ہے۔ کیا واقعی مجھے سوچنا چاہئے کہ میں کون ہوں اور کیوں ہوں؟

ایک عجیب سا احساس میرے سارے وجود میں جاگ اٹھا تھا۔ ایک اجنبی احساس۔ ...ٹاید مجھے میری حیثیت بتانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر میرے معبود! سچ کیا ہے؟ میں ...اقان جمشیدی ہوں یا مہتر بدھ؟ دونوں میں سے کون ہوں؟ پھر کچھ اس طرح کی کہولت ...اُن پر سوار ہوئی کہ میں اسٹول سے اٹھا اور لاؤنج سے باہر آ گیا۔ لیکن جیسے ہی میں ...لاؤنج سے باہر نکلا مجھے پروفیسر احتشام بے نظر آیا جو مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا تھا اور ...اس کے چہرے پر عجیب سے نقوش پھیل گئے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچا ...اور کسی قدر شرمسار لہجے میں بولا۔

''لیفٹیننٹ، میں جانتا ہوں کہ آپ ناراض ہوں گے، بلکہ ناراض ہیں۔ دراصل بڑی ...الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر آپ کو اپنی مہم میں شرکت کے لئے ...دعوت دی تھی۔ گو دوسرے ساتھیوں سے صلح و مشورے کے بغیر اپنے ہی طور پر دے دی ...گی۔ بعد میں جب وہ راضی نہ ہوئے تو میں نے اس بات کو روک دیا۔ اب اگر آپ ...مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ اسمتھ کے کیبن میں چلیں۔ وہاں مسٹر اینڈ مسز اسمتھ دونوں ...آپ کے منتظر ہیں۔ آپ یقین کریں میں بہت دیر سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ پلیز،

ہلوں کے لئے اپنی ناراضگی دور کر کے میرے ساتھ چلئے۔''
ہیں نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ پروفیسر احتشام کے چہرے پر کچھ ایسی عاجزی تھی کہ
اسے انکار نہ کرسکا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ اس قدر شریف آدمی تھا کہ اس کی
ٹھکرائی نہیں جاسکتی تھی۔ راستے میں اس نے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے اس مہم میں سرمایہ لگایا ہے۔
لئے وہ شراکت دار بڑھانے میں رضامند نہیں ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جتنے
دہ حصے دار بڑھتے جائیں گے اسی قدر ان کا حصہ کم ہوتا جائے گا۔ مگر مسئلہ یہ نہیں تھا
نہیں اس مہم میں مقامی مزدوروں کی ضرورت پڑے گی جن سے کام لینے کے لئے خود
ے علاوہ بھی ایک اور شخص ہونا چاہئے جو عربی زبان سے واقف ہو۔ کیا سمجھے؟''

میں نے حیرانی سے پروفیسر احتشام بے کو دیکھا۔ یہ تو خیر حقیقت تھی کہ وہ میرے
ے میں کچھ نہیں جانتے تھے مگر نجانے کیوں یہ پروفیسر احتشام مجھ پر اتنا اعتبار کرنا چاہتا
؟ اس کا خیال تھا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو سیدھی راہ چلتے ہیں اور دیانت دار
تے ہیں۔ بڑا احمق تھا یہ شخص۔ میں اس کی بات پر دل ہی دل میں ہنس پڑا تھا۔

''میں نے ان سے کہا کہ جس شخص کو میں اس مہم میں شراکت دار بنانا چاہتا ہوں وہ
بے مثال شخصیت کا مالک ہے۔''

''مگر پروفیسر! کیا آپ نے غلطی نہیں کی؟''

''کیسی غلطی؟''

''یہی کہ مجھے ایک ملاقات میں بے مثال قرار دے دیا۔''

''اصل میں اپنی فطرت کے ایک عجیب پہلو سے میں تمہیں بعد میں روشناس کراؤں
گا۔ بہر حال آؤ۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے میرے خیال میں یہ بڑی مضحکہ خیز صورتحال تھی۔
مجھے اس مہم کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا جس میں وہ مجھے شامل کرنا چاہتا تھا۔ نجانے
اس نے کیوں یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کی ایک سادہ سی پیشکش پر میں ان کی مہم میں شامل ہو
جاؤں گا۔ یہ تو ایک احمقانہ تصور تھا۔ وہ ہوا میں تیر چلا رہے تھے اور بڑے مزے کی
بات تھی کہ وہ مجھے شامل کرنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف میری مخالفت کی جا رہی تھی۔ اور
ایسا بلاوجہ ہی ہو رہا تھا جبکہ میں نے اپنی زبان سے ایک بار بھی اس مہم میں شرکت کا

اقرار نہیں کیا تھا۔ بہر حال میں پروفیسر احتشام بے کے ساتھ اس کے کیبن میں داخل ہو
گیا۔ مسٹر اور مسز اسمتھ بڑے تپاک سے ملے۔ آج ان دونوں کا رویہ کافی بدلا ہوا تھا۔
میری طلب پر انہوں نے مجھے مشروب اور اپنے لئے ہلکی شراب مہیا کر لی اور ہم لوگوں
نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لئے۔ احتشام بے نے مسز اسمتھ کے اشارے پر ایک طویل
داستان کا آغاز کیا اور اس سے پہلے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے مسٹر خاقان! کہ اپنی اس مہم کے بارے میں کچھ تفصیل بتاتے
ہوئے آپ کو ایک الگ سی کہانی سنانی پڑے گی۔ آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے قدیم
مصر کے دو بڑے شہر ممفس اور تھیبز تہذیب و تمدن اور دولت و مسرت میں اس مرتبے پر
پہنچ گئے تھے کہ اس دور میں ان کے مقابل کوئی دوسرا شہر نہیں تھا۔ خاص طور پر تھیبز کی
عبادت گاہوں میں ہزاروں سالوں سے بے حساب زر و جواہر اکٹھے ہو رہے تھے۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو پچیس سال پہلے مصر پر ایرانیوں نے حملہ کیا اور ان
ایرانی حملہ آوروں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ فرعونِ مصر کو تخت سے اتار کر ایرانی
فاتح نے تھیبز میں قیام کیا۔ اس شخص کا نام قنبوسی تھا اور اس نے اس لئے تھیبز میں قیام
کیا تھا کہ اس کی تھکی ہوئی فوج نئے معرکوں کے لئے تازہ دم ہو جائے۔ اسی دوران
قنبوس کو اطلاع ملی کہ صحرائے لیبیا کے پار شمال میں سنوسی عربوں کے شہر بھی مال و دولت
سے اٹے پڑے ہیں۔ صحرائے عظیم کا یہ حصہ سورج کی مانند انتہائی گرم تھا اور یہاں پانی کا
نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے اس خوفناک ریگستان کو پار کر کے سنوسیوں کے دولت مند
شہر پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور تھیبز میں بیٹھ کر منصوبے تیار کرنے لگا۔ اتنی بڑی فوج کو صحرا
کے پانچ سو میل کے اس بے آب و گیاہ ٹکڑے سے نکالنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔
انسانوں اور جانوروں کے لئے پینے کا پانی کہاں سے آتا؟ قنبوسی نے بڑی عقل مندی
سے کام لیتے ہوئے تیس ہزار مٹکے پانی سے بھروا کر اونٹوں کے ایک بہت بڑے کارواں
کے ساتھ ریگستان میں ایک دن کی مسافت پر پہنچا دیئے۔ ان مٹکوں کو زمین کھود کر ریت
میں دبا دیا گیا تاکہ پانی شدید گرمی سے بھاپ بن کر نہ اُڑ جائے۔ کارواں واپس پہنچا،
پھر پانی کے مزید تیس ہزار مٹکے لے کر دو دن کی منزل پر پہنچا اور انہیں بھی ریت میں دبا
دیا گیا۔ اس طرح یہ کارواں ایک دن کی مسافت پر تیس تیس ہزار مٹکے دفن کرتا گیا اور
نشانات بناتا گیا۔ پانچ سو میل کے اس ریگستانی راستے پر بڑے نخلستان تک فاصلے فاصلے

پر پانی کے ذخیرے قائم کئے گئے اور ایرانی مہم کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

مگر جب فوج کے کوچ کا وقت آیا تو قنبوسی شدید بیمار پڑ گیا۔ چنانچہ بحالت مجبوری اس نے مصر میں فوج کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ رکھی اور پچاس ہزار چنے ہوئے سواروں کی ایک مختصر فوج صحرا میں روانہ کر دی۔ اس نے سوچا کہ وہ بعد میں اس مہم میں شریک ہو جائے گا۔ وہ تھیبز کو ایک عارضی پڑاؤ سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے مصر کی عبادت گاہوں سے لوٹی ہوئی بے حساب دولت کا زیادہ تر حصہ اپنی اس مختصر فوج کے ساتھ آگے بھیج دیا جو صحرا میں پیش قدمی کر رہی تھی۔ قنبوسی فاتح عالم بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور ان زر و جواہر کو اس نے نئی فوجوں کو ترتیب دینے اور نئے علاقوں میں اپنی مملکتیں قائم کرنے کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ قنبوسی کے یہ پچاس ہزار جوان اس مشکل مہم پر روانہ ہوئے۔ جب انہوں نے دو تہائی سے زیادہ راستہ طے کر لیا تو راستہ دکھانے والے سنوسی راہبروں نے جان بوجھ کر انہیں غلط راستے پر ڈال دیا۔ وطن پرست راہبروں نے اس حملہ آور فوج کے ساتھ صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانا منظور کر لیا اور یوں انہوں نے اپنی بستیوں کو تباہی سے بچا لیا۔ جھلسے ہوئے ریگزار میں ایرانیوں کی فوج اس طرح گم ہو گئی جیسے گھاس کے ڈھیر میں سوئی گم ہو جاتی ہے۔ اس فوج نے بڑے نخلستان کو اپنی منزلِ مقصود بنایا تھا لیکن ایک بھی ایرانی اس نخلستان تک نہ پہنچ سکا۔ پیاس، تھکن اور زہریلی ہواؤں اور صحرا کی طوالت نے ان کے لئے موت آسان کر دی تھی۔ صحرائے عظیم نے قنبوسی فوج کو قاہرہ کے بے حساب زر و جواہر کے ساتھ نگل لیا۔ ایران کے چنے ہوئے شاہسوار ریت کے ذروں کی طرح آگ برساتے ہوئے سورج کے نیچے بجھتے چلے گئے اور آخر کار ختم ہو گئے۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر احتشام بے نے سب کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں پہلے مجھ پر اور پھر مسز اسمتھ اور مسٹر اسمتھ پر پڑیں۔ دونوں بیزاری سے جمائیاں لے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ واقعات انہوں نے پہلے بھی کئی بار سنے ہوں گے چنانچہ ان تاریخی واقعات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن مجھ سے نہ رہا گیا۔ مجھے واقعی اس داستان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ تو واقعی بڑے حیرت ناک واقعات ہیں۔ کیا آپ جو کچھ بتا رہے ہیں وہ سچ ہے پروفیسر؟"

پروفیسر احتشام بے نے کسی قدر افسردگی سے مجھے دیکھا۔ پھر بولے۔ "نہیں، میں

جھوٹ نہیں بول رہا۔ تاریخ ان واقعات کی سچائیوں کی گواہی دیتی ہے۔ ہیروڈوٹس نے اس زبردست تباہی پر بڑی تفصیلات لکھی ہیں۔ میرے پاس اس مہم سے متعلق ایسی مستند شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ہیروڈوٹس اور دوسرے مؤرخین کا بیان حرف بہ حرف درست ہے۔"

"واقعی...... بڑی کمال کی بات ہے۔ اور میں خاص طور سے ایک بات ضرور کہوں گا پروفیسر احتشام بے کہ آپ نے بڑی محنت سے یہ شواہد اور تاریخ اکٹھی کی ہے۔"

"ہاں۔ اس کا بھی ایک پس منظر ہے۔" پروفیسر احتشام بے نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"بتاتا ہوں۔ میں لکسر سے کوئی ڈھائی سو میل دور دخلا کے نخلستان میں کھدائی کر رہا تھا کہ مجھے ایسے آثار ملے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قنبوسی کی گم ہو جانے والی فوج نے وہاں پڑاؤ کیا ہے۔ کھدائی کے دوران مجھے فولاد کی یادگار تختی ملی۔ یہ دو حصوں میں ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس پر کھدی ہوئی تحریر اس وقت تو نہیں پڑھ سکا۔ مگر سال بھر کے بعد اس فولادی تختی پر لکھے ہوئے قدیم اشاروں کو پڑھنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ یہ لوح ایرانی فاتح قنبوسی کے کسی ایک ہزاری سردار نے تیار کر کے نصب کرائی ہے۔ یہ شخص اپنے گنتی کے بچے کھچے فوجیوں کے ساتھ پیاس اور تھکن کا مارا کئی دن صحرا میں بھٹکتا رہا اور آخر کار دخلا کے اس چھوٹے سے نخلستان میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ لوٹ کر قنبوسی کے پاس نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس زبردست مہم کی ناکامی کا حال سن کر قنبوسی کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہے گی اور وہ اس سردار کو یقیناً مروا دے گا۔ اس لئے سردار اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ نخلستان ہی میں رہ گیا۔ اس نخلستان میں کافی مقدار میں پانی موجود تھا۔ کھجوروں کے درخت بھرے پڑے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے بود و باش اختیار کی۔ وہ یہاں زندگی گزار سکتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہاں جو کی کاشت بھی شروع کر دی اور کسانوں کی طرح یہاں رہنے لگے۔"

"گڈ پروفیسر! آپ ایک بات بتایئے، اس یادگاری تختی پر یہ نہیں لکھا تھا کہ شاہ قنبوسی کی فوج آخر کہاں اپنے انجام کو پہنچی؟"

پروفیسر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ پھر اس نے مسٹر اور مسز اسمتھ کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر بولا۔

"ہاں، جس سردار کی میں نے بات کی ہے اس کا نام ہیروس تھا۔ ہیروس نے ستاروں کی مدد سے اس جگہ کا تعین کیا اور لکھا کہ فوج صحرائے عظیم کے ایک خاص علاقے میں موت کا شکار ہوئی۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟"

نجانے کیوں میرے ذہن میں کچھ سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ پروفیسر خاموش ہو گیا تھا اور میں ان سنسناتی ہواؤں کو عجیب سے انداز میں محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت اس کیبن میں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب میری آواز نکلی تو مجھے یہ آواز خود عجیب محسوس ہوئی۔ میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے پروفیسر! کہ یہ معلومات بے حد قیمتی ہیں اور آپ......"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"ہاں، ان معلومات کے قیمتی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔"

پھر اس وقت مسٹر اسمتھ نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ذرا اندازا لگاؤ میرے دوست خاقان! کہ تھیبز اور ممفس کے ہزاروں معبدوں کی بے حساب دولت آج بھی معمولی پتھروں کی طرح ریگستانوں کے نیچے دبی پڑی ہے۔"

"اسے وہاں پڑے ہوئے ہزاروں سال گزر گئے۔ اور اس جگہ کا علم صرف پروفیسر احتشام بے کو ہے۔ صرف انہیں۔ ہمیں تو انہوں نے اس فولاد کی تختی کا صرف آدھا ٹکڑا ہی دکھایا ہے۔" مسز اسمتھ کی آواز ابھری اور پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس وقت اس گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے فوراً ہی سوال کیا۔

"لیکن پروفیسر! آدھی تختی کہاں ہے؟"

پروفیسر کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا۔ "ارسلا کے پاس۔"

"ارسلا؟"

"میری بیٹی کا نام ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ آدھی تختی ارسلا کے پاس قاہرہ میں ہے۔"

"وہ کیوں پروفیسر؟" میں نے بے اختیار سوال کیا۔

"میرے دوست! میں بھی انسان ہوں۔ ایک کمزور اور بے بس انسان۔ جس کے دماغ میں ایک اتنا بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ مجھے اس کے لئے ایک سرمایہ کار اور ایک مضبوط منیجر کی تلاش تھی۔ سرمایہ کار یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور منیجر تم۔ ہم تمہیں حاصل شدہ

خزانے کا دس فیصد دیں گے۔" پروفیسر احتشام نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس مہم سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور کچھ نہیں تو میں ایک جان لیوا مصروفیت میں پڑ جاؤں گا۔ اس کے علاوہ سچ کہوں کہ مجھے اس عظیم الشان خزانے سے زیادہ اس بے نقش چہرے کو مکمل کرنے کا شوق تھا۔ یعنی ارسلا......!

"اوکے پروفیسر احتشام بے۔" میں نے کہا اور احتشام بے کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے خوشی سے مجھے گلے لگا لیا تھا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

"اب خوش ہیں پروفیسر؟"

"بہت زیادہ۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ہر شریف انسان کو ایک شریف ساتھی کی تلاش رہتی ہے۔ اور یقین کرو میں تمہارے لئے ایک پیش گوئی بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا......؟"

"یہ مہم تمہارے لئے بھی بے حد خوشگوار رہے گی۔"

"کاش......" میں نے کہا۔

"کاش نہیں، حقیقتاً ایسا ہوگا۔ چلو اٹھو۔" پروفیسر نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے سوال کیا۔

"مسٹر اور مسز اسمتھ نے وہ فولادی تختی دیکھی ہے۔ آؤ میں تمہیں بھی دکھا دوں۔ میں نے اس کا مضمون اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہے۔ اس آدھے حصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ یا پھر یوں کرو کہ تم کوئی دس منٹ کے بعد میرے کیبن میں آ جاؤ۔ فولادی تختی کو میں نے بڑی احتیاط سے کپڑے اور ٹاٹ کی پٹیوں میں لپیٹ کر رکھا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے یہ ضروری تھا۔"

"اوکے ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ کے بعد آپ کے کیبن میں پہنچ جاتا ہوں۔"

میں پروفیسر کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اس عرصے میں، میں کینٹین کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ کینٹین کی طرف بڑھتے ہوئے پروفیسر مجھ سے جدا ہو گیا۔ میں نے کینٹین میں داخل ہو کر سگریٹ، ایک رومال اور سیاحت سے متعلق ایک رسالہ خرید!

اور دس منٹ پورے کرنے کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ راستے میں بے خیالی میں رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز کاغذ کی طرح لہراتی ہوئی فرش پر جا گری۔ اس کے ساتھ ہی دور دور تک چمپا کی تیز اور ناخوشگوار بو پھیل گئی۔ میں جہاں تھا، وہیں رک گیا اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے رسالے سے نکل کر گرنے والی چیز کو دیکھا۔ میرے سامنے وہی منحوس بھوج پتر پڑا تھا۔ وہی پراسرار پتہ۔ میرے ہاتھ سے سگریٹوں اور رومالوں کا پیکٹ چھوٹ گیا۔ میں نے جھک کر بھوج پتر اٹھا لیا، اس بھورے پتے پر سنکی ہوئی روئی کی طرح پتیاں سی پڑی ہوئی تھیں اور ان پتیوں سے ایک تصویر بن گئی تھی۔ آہ...... یہ تصویر پروفیسر احتشام بے کی تھی جس میں وہ جھکا ہوا اپنے بستر پر کچھ تلاش کر رہا تھا اور اس کی پشت پر ایک ہاتھ اٹھا ہوا تھا اور اس ہاتھ میں ایک لمبا سا خنجر نظر آ رہا تھا......

میرے پورے بدن میں شدت کی گرمی دوڑ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں ایک لمحے کے لئے ختم ہو گئیں۔ میں نے بھوج پتر کو جیب میں ٹھونسا اور رسالہ چھوڑ کر دیوانوں کی طرح پروفیسر کے کیبن کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پروفیسر کے کیبن کا نمبر تیرہ تھا۔ میں اس وقت جہاز کے رہائشی علاقے سے گزر رہا تھا اور میرے دل و دماغ میں عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ لیکن اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں بھول بھلیوں میں پھنس گیا ہوں۔ نجانے کیبن نمبر تیرہ کہاں گیا؟ میں اس امید میں بے تحاشہ دوڑ رہا تھا کہ شاید میں بروقت پہنچ جاؤں اور اس ہاتھ کو روک دوں جس نے پروفیسر پر وار کرنے کے لئے خنجر تان رکھا ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کاش دشمن اپنا کام نہ کر چکا ہو۔ خدا کرے میں پروفیسر کو بے خبری میں ہلاک ہونے سے بچا سکوں۔ میں زندگی میں کبھی اتنی وحشت اور اتنی تیز رفتار سے نہیں دوڑا تھا۔ میرے اندر سے ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔ خدا کرے...... خدا کرے یہ بھوج پتر میرے کام آ جائے۔ پہلی بار میرے کام آ جائے۔ پتہ نہیں یہ کوریڈور کس طرف مڑے گی۔

سامنے ایک بیرا ٹرے لئے آ رہا تھا۔ میں بچتے بچتے بھی بیرے سے ٹکرا گیا۔ زبردست چھناکا ہوا اور بیرے نے نجانے کیا بک ڈالا۔ میں نے آہنی دیوار کا سہارا لیا اور تیزی سے اس کیبن کا نمبر پڑھا، یہ دس نمبر کیبن تھی۔ اس کے بعد گیارہ، پھر بارہ یعنی اسمتھ فیملی کی کیبن۔ پھر تیرہ یعنی پروفیسر کی کیبن۔ اور آخر کار میں تیرہ نمبر کے نزدیک پہنچ

گیا۔ بے شک میں نے اب تک بہت سی برائیاں کی تھیں۔ لیکن میرے دل سے یہی آواز نکل رہی تھی کہ کاش آج میں ایک اچھے آدمی کو بچانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کاش ...... کاش!

میں نے دیکھا کہ میں تیرہ نمبر کیبن پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے دروازے سے ٹکرانے کے لئے پوری قوت سے دوڑ لگائی۔ میرا کسرتی بدن لوہے کے دروازے سے یوں ٹکرایا جیسے میں انسان نہیں ٹینک ہوں اور ہولناک جھٹکے سے تیرہ نمبر کیبن کا دروازہ کھل گیا۔ پھر میرے کندھے کے پٹھوں میں جیسے سوئیاں سی چبھ گئیں...... کیبن کا دروازہ نکل چکا تھا لیکن میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اندر کیبن میں کیا ہے۔ آنکھوں کے آگے شدید دھندلاہٹیں تھیں۔

جب میں دیکھنے کے قابل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ جس نے بھوج پتر کی تصویر میں پروفیسر احتشام بے پر خنجر تان رکھا تھا، اپنا کام کر چکا ہے۔ پروفیسر احتشام بے بستر پر اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کی پشت میں دستے تک ایک خنجر اترا ہوا تھا۔ بستر پر شدید کشمکش کے آثار تھے اور لاش سے خون ابل ابل کر بستر میں جذب ہو رہا تھا۔ میں نے دہشت زدہ انداز میں اسے چھو کر دیکھا، لاش ابھی گرم تھی۔ آہ...... تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔ بس تھوڑی سی تاخیر۔ کاش، میں کچھ دیر پہلے یہاں پہنچ گیا ہوتا۔

اس وقت میرے بدن میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں جھپٹ کر کیبن کے دروازے پر پہنچا اور میں نے باہر جھانکا، لیکن جس بیرے سے ٹکرا کر میں نے چائے کے برتن توڑ دیئے تھے اس کے سوا راہداری ویران پڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے جھکا ہوا ٹوٹے ہوئے برتن اکٹھے کر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ اسی طرح سر جھکائے اپنا کام کرتا رہا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پکار کر اسے بتاؤں کہ کیبن میں کیا ہو چکا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا اگر میں نے راہداری میں کھڑے ہو کر شور و غل کیا تو جہاز کے عملے کے ساتھ دوسرے لوگ بھی جمع ہو جائیں گے۔ اور شاید کیپٹن کو یہ ہنگامہ آرائی پسند نہ آئے۔ میں اپنے اور کیپٹن کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں تو ویسے ہی گلے گلے تک الجھنوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس جہاز پر میری موجودگی غیر قانونی تھی۔ میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا اور جہاز پر میرا دشمن ہیگ موجود تھا۔ ویسے میرے دل و دماغ میں یہ بات مستقل طور پر جاگزیں تھی کہ اس قتل کا

تعلق ہیگ سے ضرور ہے۔ ممکن ہے وہ بمبئی سے پروفیسر احتشام بے کے تعاقب میں ہی روانہ ہوا ہو۔ یقینی طور پر وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس بات کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں کہ اسے بھی اس فولادی تختی کے بارے میں معلومات ہوں۔ اور ممکن ہے وہ بھی اسے حاصل کرنے کے چکر میں ہو۔ کیونکہ وہ بھی اسی ٹائپ کا انسان تھا۔ تختی میں ممفس اور تھیبز کے مندروں کی بے حساب دولت کی نشاندہی کی گئی تھی اور ہیگ کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

بہرحال کچھ لمحوں تک میں اسی کشمکش کا شکار رہا پھر میں نے سوچا کہ تھوڑی سی خاموشی اختیار کر کے احتشام بے کے کیبن کا جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ آخر چکر کیا تھا؟ قاتل اگر فولادی تختی کے چکر میں تھا تو کیا اس تختی کو اڑا لینے میں اسے کامیابی حاصل ہوگئی؟

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ دو چار منٹ تک اس کیبن کا جائزہ لینے کے بعد میں کسی کو یا اسی بیرے کو بلا لوں گا جو ابھی تک راہداری میں چائے کے برتن سمیٹ رہا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع فوری طور پر جہاز کے عملے کو ہو جانی چاہئے ورنہ مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔

ایک بار میں پھر کیبن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی بستر کے نیچے، غسل خانے میں اور پروفیسر کی کتابوں سے بھرے دونوں سوٹ کیسوں میں اس تختی کا جائزہ لیا۔ خود پروفیسر کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تختی کم سے کم دو فٹ چوڑی اور تین فٹ لمبی ہے۔ ایسے کسی پارسل کو ان چیزوں میں چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مجھے یہاں اس کیبن میں تین منٹ گزر چکے تھے۔ آخر کار جب کوئی کام نہ بن سکا تو میں نے گھنٹی بجا دی اور کیبن کے بیچوں بیچ اگلے واقعات کے انتظار میں کھڑا ہو گیا میری آنکھیں اب بھی کسی پیکٹ کو تلاش کر رہی تھیں۔ نجانے کیوں یہ خیال اب بھی میرے دل میں موجود تھا کہ تختی چوری نہیں ہو سکی ہے اور ابھی تک وہ اسی کمرے میں موجود ہے۔ اور میری طرح شاید قاتل کو بھی اسے ڈھونڈنے میں ناکامی ہوئی ہے۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کیبن کا دروازہ کھلا اور وہی بیرا اندر داخل ہوا جس سے میری ٹکر ہوئی تھی۔ اس نے کسی قدر ناخوشگوار نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''کیا بات ہے صاحب؟''

میری انگلی بستر کی جانب اٹھ گئی اور بستر پر پڑی لاش دیکھ کر بیرے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلا۔

''سر...... سر...... آپ نے...... آپ نے اسے......'' یہ جملہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھسک رہا ہے۔

''ٹھہرو، کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے ڈانٹ کر اسے کہا۔

''بس سر...... بس سر...... آپ......''

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ابھی ابھی اس کیبن میں آیا ہوں۔''

''ج...... جی ہاں، ابھی آپ مجھ سے ٹکرائے تھے۔'' ویٹر دروازے تک پہنچ گیا تھا۔

''کیپٹن کو فوراً اطلاع دو۔ میں یہیں انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ گردن ہلا کر تیزی سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ بیرے کو گئے بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ برآمدے میں تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ جہاز کے کیپٹن، ڈاکٹر اور چیف پرسن نے کیبن کے اندر قدم رکھا اور میں نے انہیں اندر آنے کے لئے جگہ دی۔ کیپٹن نے اس لاش کو دیکھا اور پھر پھرتی سے پلٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ ڈاکٹر نے ہلائے جلائے بغیر لاش کا معائنہ کیا اور کیپٹن کو اطلاع دی کہ موت پچھلے دس سے پندرہ منٹ تک ہوئی۔ اب وہ سب میری طرف متوجہ تھے اور پھر بیرے کو کیبن میں بلایا گیا۔ بیرے نے کہا۔

''صاحب! یہ سر برآمدے سے دوڑتے ہوئے گزرے اور مجھ سے ٹکرا گئے۔ اس کے بعد یہ اس کیبن کا دروازہ بجانے لگے۔ پھر دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ بعد میں انہوں نے گھنٹی بجا کر مجھے بلایا اور یہ لاش دکھائی۔''

میں نے اپنے بیان میں کہا۔ ''پروفیسر کی مجھ سے جہاز پر ہی جان پہچان ہوئی ہے۔ میں اس وقت ان کے کیبن میں ایک علمی مسئلے پر بات چیت کرنے کے لئے مدعو تھا۔ پروفیسر وقت کے حد درجہ پابند تھے۔ مجھے چار پانچ منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے میں تیزی سے کینٹین سے نکلا۔ پروفیسر کے کیبن کو تلاش کرنے میں مجھے کچھ اور دیر ہو گئی۔ اس لئے میں نے راہداری میں دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر میرے

دیر سے آنے پر ناراض ہوں۔ میں یہاں پہنچا تو کیبن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دے کر کچھ دیر انتظار کیا۔ جب اندر سے کسی قسم کی آہٹ نہ سنائی دی تو میں نے زور سے دھکا دے کر دروازے کی چٹخنی توڑ دی۔ اندر پہنچ کر میں نے یہ منظر دیکھا۔ میں نے اس بیرے کو راہداری میں برتن سمیٹتے دیکھ لیا مگر میں چیخ پکار کر کے دوسرے مسافروں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے دوبارہ کیبن میں آ کر میں نے گھنٹی بجائی اور بیرے کو کیپٹن کی طرف بھیج دیا۔"

میں نے یہ بیان بڑی ہوشیاری کے ساتھ دیا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ کیپٹن کے چہرے سے ناگواری کے آثار دور ہو گئے۔ اس کی تنی ہوئی بھنویں کچھ نیچی ہو گئیں۔ میں نے شور و غل نہ مچا کر اس پر ایک طرح سے احسان کیا تھا۔ بیرے نے جو برتنوں کے گرنے سے سخت پریشان ہو گیا تھا مجھے کیبن کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے طور پر تصور کر لیا تھا کہ میں نے پہلے دستک دی ہو گی اور پھر دھکا دے کر دروازہ کھول دیا ہو گا۔ لیکن اس بیرے کے اس بیان سے میری مشکل حل ہو گئی تھی۔ اگر وہ یہ بیان دیتا کہ یہ صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور دھکا دے کر کیبن کا دروازہ کھول دیا تو مجھے اپنے رویے کی وضاحت کرنے میں دقت ہوتی۔

ابتدائی بیانات کے بعد کیپٹن نے چیف آفیسر کو حکم دیا کہ پروفیسر کے کیبن کو مقفل کر دیا جائے۔ مجھے اور بیرے کو کیپٹن کے کیبن میں پہنچا دیا گیا تھا۔ بہرحال یہاں آتے ہی جہاز کے کیپٹن اور ڈاکٹر کا رویہ بالکل بدل گیا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے میرے کاغذات نہ مانگ بیٹھیں۔ چیف افسر اور میرے کیبن کے ملازم کو یہ بات معلوم تھی کہ میں بحریہ میں لیفٹیننٹ ہوں اور کسی سرکاری کام سے مصر جا رہا ہوں۔ اب تک کسی کے بیانات قلمبند نہیں ہوئے تھے۔ ساری تحقیقات زبانی ہوئی تھیں۔ مگر اب کیپٹن جس طرح اپنی ڈیک پر بیٹھا تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ مجھ سے تحریری بیان بھی لے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سامنے شارٹ ہینڈ کی نوٹ بک اور قلم رکھا ہوا تھا۔ اور کچھ ہی لمحوں کے بعد جہاز کا ایک افسر وہ نوٹ بک اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اب وہ لوگ ہمارے بیانات تحریر کرنے والے تھے۔ یہ ایسا مرحلہ تھا کہ اگر میں سمجھداری سے کام نہ لیتا تو شاید بیانات کے بعد حراست میں لے لیا جاتا۔ میں نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کیپٹن سے کہا۔

"دراصل میں پروفیسر احتشام بے سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں۔ فرسٹ کلاس میں ہی ایک انگریز جوڑا مسٹر ہنری اسمتھ اور مسز اسمتھ سفر کر رہے ہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی پروفیسر کو استنبول سے جانتے ہیں۔ پروفیسر کے کیبن سے ملی ہوئی ان کی کیبن ہے۔ بیانات قلمبند کرنے سے پہلے اگر ان دونوں کو بھی بلا لیا جائے تو آپ کو آسانی ہو گی۔"

کیپٹن نے اس افسر کو جو سکیورٹی کے فرائض انجام دے رہا تھا، کہا۔ "جاؤ، ان کے بیان کے مطابق مسٹر اور مسز اسمتھ کو بلا لاؤ۔"

کیپٹن کے کیبن میں بیٹھ کر میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور ان لوگوں کے چہروں سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سب کچھ تو میرے ساتھ مسلسل ہو رہا تھا۔ وہ بھوج پتر جب بھی مجھے نظر آتا تھا میں کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ جبکہ وہ لوگ جو مجھے مہتر بدھ بنانے کے لئے سرگرداں تھے، مجھے کچھ اور ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

بہرحال کچھ لمحوں کے بعد مسٹر اینڈ مسز اسمتھ اندر داخل ہو گئے۔ کیپٹن کی کیبن میں مجھے وہ دونوں یوں پریشان حال دیکھ کر حیران ہوئے اور پھر انہیں احتشام بے کی موت کے بارے میں بتایا گیا تو دونوں سکتے میں رہ گئے تھے۔ اس وقت میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ کسی نہ کسی طرح ان دونوں میاں بیوی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میں نے ابتدائی بیانات میں کیا کہا ہے تاکہ وہ بھی اسی طرح بیان دیں۔ لیکن کیپٹن ظاہر ہے اس کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے بات چیت کرنا چاہی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

"نہیں، آپ پلیز خاموشی اختیار کیجئے۔ میں ان لوگوں کے بیانات لیتا ہوں۔"

اور پھر اس نے اس انگریز جوڑے کے بیانات لینا شروع کر دیئے۔ ہنری اسمتھ نے بتایا کہ پروفیسر سے اس کی پہلی ملاقات استنبول میں ہوئی تھی۔

"یہ ملاقات کس سلسلے میں ہوئی تھی؟" کیپٹن نے سوال کیا۔

"پروفیسر اور اس کی بیٹی مصر کے آثارِ قدیمہ پر کوئی اہم کام کر رہے ہیں۔ ہمیں سیر و سیاحت کا شوق ہے۔ ہم دونوں نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے، پروفسر بہت دن تک مصر میں رہیں گے۔ وہاں لوگوں سے ان کے تعلقات ہوں گے۔ اس طرح ہمیں ٹھہرنے اور گھومنے پھرنے کے لئے بہت سی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ اس لئے ہم استنبول سے

انہی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

''پروفیسر کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں؟''

''پروفیسر کی بیٹی ارسلا قاہرہ میں ہے۔ اس لئے ہم نے طے کیا تھا کہ قاہرہ ہی کو اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔''

''ہوں...... کیا آپ بتا سکتے ہیں مسٹر ہنری کہ پروفیسر کس قسم کا آدمی تھا؟''

''بہت ہی عالم اور قابل شخص تھا یہ۔''

''کیا اس کی کسی سے دشمنی تھی؟''

''نہیں۔ ممکن نہیں ہے۔ اور ہمیں اس کے بارے میں اس طرح کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی تھا اور یقینی طور پر اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔''

''ہوں، اچھا آپ یہ بتائیے کہ لیفٹیننٹ سے آپ لوگوں کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟''

ہنری نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ''اسی جہاز پر۔''

''کس طرح؟''

''پروفیسر نے لیفٹیننٹ سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔''

''کیا لیفٹیننٹ پروفیسر سے ملنے ان کے کیبن میں جاتے تھے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''کیا لیفٹیننٹ کسی علمی مسئلے پر پروفیسر سے مشورہ لیتے رہے ہیں؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔''

کیپٹن نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ کیپٹن نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پھر روک دیا۔

''پلیز لیفٹیننٹ! آپ بالکل خاموش رہیں گے۔ یہ سوالات میں مسٹر ہنری سے کر رہا ہوں۔ آپ سے سوال کیا جائے تو جواب دیں ورنہ خاموش رہیں۔ مسز اسمتھ نے اس اشارے سے بہت کچھ سمجھ لیا۔ اس نے آہستہ سے اپنے شوہر سے کہا۔

''ہنری! پروفیسر نے جو پرانے نوادرات کھود کر نکالے ہیں ان کے بارے میں......''

ابھی مسز اسمتھ نے اتنا ہی کہا تھا کہ کیپٹن کسی قدر سرد لہجے میں بولا۔

''مسز اسمتھ پلیز! میں آپ کا بیان بھی لوں گا۔ اس وقت آپ جو کچھ بتانا چاہیں، بتا

سکتی ہیں۔''

مسز اسمتھ نے برا سا منہ بنایا۔ ہنری اسمتھ کند ذہن آدمی ضرور تھا لیکن بیوی کی باتوں کو بڑے آرام سے سمجھ لیتا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''کیپٹن معاف کیجئے گا، اس نے مجھے یاد دلا دیا۔ میں ایک بڑی اہم بات بھول رہا تھا۔''

''ہاں بتائیے کیا؟'' کیپٹن نے کہا۔

''پروفیسر نے ابھی تھوڑی دیر پہلے لیفٹیننٹ کو اپنے کیبن میں بلایا تھا۔ وہ انہیں کوئی نادر چیز دکھانا چاہتے تھے جس پر کوئی ایسی عبارت تحریر تھی......'' اسی وقت مسز اسمتھ نے فوراً اپنے شوہر کا جملہ درمیان سے اچک لیا۔ وہ تختی کی اس قیمتی عبارت کے بارے میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کیپٹن! کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ جارحانہ انداز میں ہم سے یہ سوالات نہ کریں اور کسی بھی طور ہمیں مجرم نہ گردانیں۔ ہم دوستانہ فضا میں اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم تینوں کو جو کچھ معلوم ہے ہم رضاکارانہ طور پر آپ کو بتا دیں گے۔ اور پھر آپ اپنے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔''

مسز اسمتھ ضرورت سے زیادہ تیز معلوم ہوتی تھی۔ اس کی معنی خیز نگاہیں اپنے شوہر کو دیکھتی رہی تھیں۔ ہنری اسمتھ اپنی رو میں اس تختی کے بارے میں بتا کر جو غلطی کرنے لگا تھا مسز اسمتھ نے بروقت گڑبڑ پھیلا کر اسے روک دیا تھا۔ کیپٹن کی عقابی نگاہیں ایک ایک کر کے ہم تینوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان دونوں کا مسئلہ تو ایک لمحے میں حل ہو گیا تھا لیکن میرے لئے مشکلات پیدا ہو گئیں۔ کیپٹن دیر تک ان دونوں کے بیانات لیتا رہا اس کے بعد اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں کسی اور شخص سے اس موضوع پر بات نہ کروں۔ اس نے کہا۔

''دیکھئے لیفٹیننٹ! آپ کا لاش کے قریب پایا جانا ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس تفتیش میں تعاون کریں۔ اور اگر کوئی بات بتانے سے رہ گئی ہے تو براہ کرم یاد کر کے بتائیں۔''

''جی...... میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' میں اس کے لہجے سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ کو اس قتل میں ملوث سمجھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے میرے خلاف اس کے پاس کوئی معقول ثبوت نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم تینوں کے بیانات میں

ایک قدیم مصری یادگار کا ذکر آیا تھا۔ مسٹر اور مسز اسمتھ نے لاکھ چھپانے کی کوشش کی لیکن کیپٹن نے جرح کر کے معلوم کر ہی لیا کہ پروفیسر احتشام بے جس نادر چیز کے بارے میں مجھے بتانا چاہتا تھا وہ ایک فولادی تختی ہے اور اس تختی پر قدیم مصری تحریر میں کوئی ایسی عبارت لکھی ہے جو کسی اعتبار سے نہایت قیمتی ہو سکتی ہے اور یہ قتل اسی تختی کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

"ٹھیک...... بہرحال یہ بات قابل غور ہے کہ آپ تینوں کے علاوہ اس تختی کے بارے میں اور کسی کو معلومات حاصل نہیں تھیں۔"

"آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کیپٹن، ذرا وضاحت کیجئے اس بات کی۔" میں نے اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر کہا۔

"نہیں...... میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس وقت تک کچھ نہیں کہنا چاہتا جب تک میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں آ جاتا۔" کیپٹن نے یہ کہہ کر اپنے دو افسروں کو طلب کیا اور انہیں مقتول پروفیسر کے کیبن کی تلاشی لینے کے لئے بھیج دیا۔

یہ دونوں افسر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے تھے لیکن انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان کے بقول پروفیسر کے سامان میں ایسی کوئی تختی نہیں پائی گئی تھی۔

"ٹھیک۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ مگر آپ رُکئے ایک منٹ۔" کیپٹن نے مسٹر اور مسز اسمتھ کو جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے اس نے نجانے کس لئے روکا تھا۔ وہ غور کرتا رہا تھا اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو رہی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آپ بھی جائیے۔"

اپنے روکے جانے کی وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن بہرحال ہر چیز سمجھ میں تو نہیں آ جاتی۔ میں باہر نکلا اور سیدھا مسٹر اور مسز اسمتھ کے کیبن کی طرف چل پڑا۔ میں نے اب یہ طے کر لیا تھا کہ ان لوگوں کو ہیگ کے بارے میں جو کچھ بتا سکتا ہوں ضرور بتا دوں گا تاکہ وہ بھی صورتحال سے واقفیت حاصل کر لیں۔

میں ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دونوں کے چہروں پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مسز اسمتھ نے کہا۔ "آہ...... یہ بہت برا ہوا۔ ایک بہت بڑا عالم، عالم ہی نہیں بلکہ ہمارے لئے خوشحالی کے دروازے کھولنے والا ایک شخص جسے ہم ایک عظیم الشان خزانے کی کنجی سمجھتے تھے، دنیا سے چلا گیا۔"

"ہاں...... بہت دُکھ کی بات ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں آپ لوگوں کو ایک اور شخصیت کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی...... بتائیے؟"

"اس سلسلے میں مجھے ایک شخص پر شبہ ہے جو جہاز پر ہی موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں۔ اس کا نام ہیگ جونس ہے۔"

"کون ہے یہ شخص؟"

"ایک بہت ہی بڑا شعبدہ باز جس نے میرے دوست این مورالس کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" مسز اسمتھ نے پوچھا اور میں نے ان لوگوں کو مورالس کی خودکشی کے الم ناک حادثے میں جو کردار ہیگ نے استعمال کیا تھا اس کی تفصیل بتائی۔ پھر میں نے انگریز جوڑے کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ہم باری باری ہیگ کے کیبن کی نگرانی کریں گے۔ یقینی طور پر وہ تختی ہیگ نے اڑا لی ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ہیگ کو اس بارے میں معلومات حاصل تھیں؟"

"وہ جس قدر شاطر اور چالاک آدمی ہے میں آپ کو اس بارے میں بتا چکا ہوں۔ سو فیصدی اس نے آدھی تختی پروفیسر کے کیبن سے اڑا لی ہے اور سکندریہ اب جہاں ہمارا جہاز رکے گا وہ اس فولادی تختی کو لے کر غائب ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے مسٹر اسمتھ! ہم اس کے کیبن کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ اور اگر ہیگ اس تختی کو بندرگاہ پر اترنے یا دورانِ سفر جہاز ہی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش کرے گا تو ہمیں اس کا پتہ چل جائے گا۔"

"لیکن آپ کی اس سے یہاں ملاقات ہو چکی ہے؟"

"براہِ راست نہیں۔ بلکہ یہ سمجھئے جہاز کی راہداریوں میں، ڈیک پر اور لان میں میری اس سے مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔"

"لیکن اس نے آپ کو پہچانا نہیں؟"

"میری داڑھی اور رنگین چشمے کی وجہ سے وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہے۔ اور ویسے بھی

میں اب چونکہ سویلین لباس میں ہوں۔ وہ مجھے سویلین کپڑوں میں بھی نہیں پہچان سکے گا۔ مجھے یقین ہے اس بات کا۔"

"آہ...... واقعی صورتحال کس قدر سنگین ہو گئی ہے۔ لیکن اس طرح تو ہمیں بڑی سخت نگرانی کرنی پڑے گی۔"

"بالکل۔"

بہرحال میں نے اپنی کیبن سے ملے ہوئے اپر ڈیک کے چھوٹے سے قطعے پر کرسی ڈالی اور اس طرح ترچھا ہو کر بیٹھ گیا کہ کیبن نمبر سترہ میں آنے جانے والے ہر آدمی کو دیکھ سکوں۔ موسم سرد ہوتا جا رہا تھا اور دھوپ بری نہیں لگ رہی تھی۔ ویسے اگر یہ موسم اس قدر خوشگوار نہ ہوتا اور ہمارا جہاز گرم استوائی علاقے سے گزر رہا ہوتا تو شاید میری نگرانی اتنی آسان نہ ہوتی۔

بہرحال میں بہت دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ اپر ڈیک کے اس مختصر قطعے پر دو تین مسافر اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم یعنی میں ہیگ کی تمام مصروفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ چار گھنٹوں میں اس نے دو دفعہ بیرے سے بیئر منگوائی تھی۔ پھر ایک مرتبہ ناشتہ منگوایا۔ اس کے بعد اسٹیورڈ اس کے دُھلے اور استری کئے ہوئے کپڑے لے کر آیا۔ جہاز کے عملے کے لوگ تو ضرور ہیگ کے کیبن میں آتے جاتے رہے تھے لیکن وہ خود ایک مرتبہ بھی باہر نہیں آیا اور نہ ہی باہر سے کوئی دوسرا شخص اس سے ملنے پہنچا۔

مجھے اب یہ نگرانی کرتے کرتے اکتاہٹ سی سوار ہو گئی تھی اور اس کے علاوہ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ آخر میں کب تک چیئر پر بیٹھا بیٹھا بسکٹ اور بیئر منگوا کر وقت گزاری کرتا رہتا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے مسز اسمتھ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ مجھ سے بے تعلق قریب کے ایک ڈیک پر ایک چیئر پر آ بیٹھی اور وقت گزاری کے لئے ایک پرانا اخبار اٹھا لیا۔ اس کا مجھ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اس نے اخبار کی اوٹ میں آہستہ سے کہا۔

"لیفٹیننٹ! آپ دو گھنٹے کے لئے چھٹی کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں بیٹھی ہوئی ہوں۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور کاہلی سے اٹھ کر سلیپر پہنے اور کتابیں اور رسالے اٹھا کر اپنے کیبن میں داخل ہو گیا۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ چنانچہ میں نے سیدھے غسل خانے کا رخ کیا اور دیر تک غسل کرتا رہا۔ پھر میں نے لباس بدلا اور اسٹیورڈ سے کھانا لانے کے لئے کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد اسٹیورڈ نے میری طلب کی ہوئی اشیاء لا کر

میرے سامنے رکھ دیں اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن کی چرخیاں برق رفتاری سے چل رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد کیا صورتحال درپیش ہو گی۔ ویسے پروفیسر احتشام بے کی موت کا مجھے دلی رنج تھا۔ میں نے اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ خاص طور سے وہ بے نقش چہرہ جو میرے حواس پر اس طرح جم گیا تھا کہ جب تک بھلائے رکھنا چاہوں بھلاؤں، لیکن ایک لمحے کے لئے اپنی قوتِ ارادی سے کام نہ لوں تو وہ چہرہ میرے تصور پر فوراً حملہ آور ہو جائے۔ آخر ایسی کیا خاص بات تھی ارسلا میں؟ بس اس کے باپ نے اس کے وجود کی نشاندہی کر دی تھی اور میں ہوس کا مارا ایک ایسے حسین وجود کے چکر میں پڑ گیا تھا جو اپنی مثال آپ ہو۔ حالانکہ اس دوران جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ مجھے ہر طرح یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ میں برے راستوں پر پڑ گیا ہوں اور یہ سچ بھی تھا۔ جو کچھ میں کر چکا تھا وہ بالکل الگ بات تھی۔ حالانکہ سلطان چچا نے اس بات کو بڑی آسانی سے لے لیا تھا اور انہوں نے یہی کہا تھا کہ خود ہمدان جمشیدی بھی ایک حسن پرست انسان تھے اس لئے بقول ان کے باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ مگر یہاں مسئلہ بالکل مختلف تھا۔ میری کیفیت تو ایک ایسے بھٹکے ہوئے انسان کی تھی جو بے شک برائیوں کے راستے کا راہی نہ ہو لیکن کچھ پراسرار قوتیں یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ اشبھ بھاونائیں مجھے اس راستے پر لا کر ڈال دیتی تھیں۔ بہرحال میں انہی تمام سوچوں میں گم رہتا تھا۔

مجھے علم ہوا کہ اسکندریہ کی بندرگاہ کا فاصلہ اب یہاں سے چند ہی گھنٹوں کا رہ گیا ہے۔ میں نے اپنا سوٹ کیس وغیرہ تیار کیا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے مسافر اس ساحل کی لکیر کا جائزہ لے رہے تھے جو اب دور سے نظر آنے لگی تھی۔ میں پُرخیال انداز میں اس لکیر کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ اسکندریہ میں یقینی طور پر ہیگ کا پورا گروہ موجود ہو گا۔ ہیگ آسانی سے اس سلسلے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس گروہ کے افراد کے حوالے وہ یہ فولادی تختی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی کوشش ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ کیپٹن ہماری مدد کرے اور اس کی مدد سے کچھ کیا جا سکتا ہے ورنہ یہ بات طے تھی کہ ہیگ کے لئے اس تختی کو نکال لے جانا اب ایسا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ ایک پرانا اسمگلر تھا۔

میں ڈیک پر پہنچا تو ہماری جاسوس پارٹی یعنی مسز اسمتھ اور مسٹر اسمتھ نے بتایا کہ

ہیگ پیسنجر لاؤنج کی طرف گیا ہے۔ ویسے میں بھی اس سفر کے دوران اس کی عادات و اطوار کا بغور مطالعہ کرتا رہا تھا۔ کھانے کے بعد پیسنجر لاؤنج کی طرف جانے کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ کافی پیئے گا اس عادت کی وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ عام طور سے ہیگ اپنے کیبن میں ہی کھانا منگوا لیا کرتا تھا۔ مے نوشی کے لئے بھی اس نے کیبن کے گوشۂ عافیت کو ہی پسند کیا تھا۔ مگر کافی وہ ہمیشہ پیسنجر لاؤنج میں مسافروں کے درمیان بیٹھ کر پینا پسند کرتا تھا۔ میں نے مسز اسمتھ سے سوال کیا۔

"کیا وہ کافی ہاؤس جا چکا ہے؟"

"ہاں، اسے وہاں گئے ہوئے دس منٹ ہو چکے ہیں۔"

وقت بہت کم تھا۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے اب کچھ بھی ہو، میں پروفیسر کے قاتل کو قانون کے حوالے کر کے رہوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ تختی ابھی تک ہیگ کے کیبن میں موجود ہے۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ کیپٹن کو ہیگ کے بارے میں تفصیلات بتا دیتا اور اسے ہیگ کے کیبن کی تلاشی لینے پر آمادہ کر لیتا۔ لیکن یہ ایک خطرناک کھیل ہوتا۔ یہ ایک طرح سے ہیگ کی نگاہوں میں آ جانے والی بات تھی۔ وہ بہت بڑا عیار مجرم تھا۔ اگر وہ اس عرصے میں اس فولادی تختی کو اپنے کیبن میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو میں الٹا مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ جبکہ میں محتاط کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ بہرحال مسز اسمتھ نے مجھ سے کہا۔

"اب مجھے بھی اجازت دو۔ چونکہ اسکندریہ کا راستہ بہت کم رہ گیا ہے اور میں اپنا سامان پیک کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے..... آپ جائیے مسز اسمتھ۔" میں نے کہا۔

میرے ذہن میں جو منصوبہ بن رہا تھا وہ بہت خطرناک تھا۔ لیکن اب چونکہ وقت بہت کم رہ گیا تھا اس لئے خطرے کی پرواہ زیادہ نہیں کرنی چاہئے۔ میں کیبن نمبر سترہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ جہاز پر کتنے افراد ہیں جو ہیگ کے ساتھی ہیں اور اس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ میں نے دائیں بائیں دیکھ کر یہ اطمینان کر لیا کہ جہاز کے عملے کا کوئی شخص یا ہیگ کا ملازم تو مجھے نہیں دیکھ رہا؟ اور پھر میں سترہ نمبر کے کیبن کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر قسمت آزمائی کی تو وہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کیبن میں بڑے

سلیقے اور ترتیب سے سب چیزیں جمی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے ٹرنک ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ گویا ایک طرح سے ہیگ اسکندریہ کی بندرگاہ پر اترنے کے لئے اپنی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ چھوٹے ٹرنکوں اور پیکٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بڑے صندوقوں اور بنڈلوں وغیرہ کا جلدی جلدی جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ان میں سے کوئی صندوق اس طرح کا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے یہ خیال ہوتا کہ اس میں فولاد کی وزنی تختی چھپائی گئی ہے۔ پلنگ کے نیچے، وارڈروب میں، غرض میں نے ہر جگہ تلاش کر لیا لیکن پروفیسر کی اس منحوس فولادی تختی کا کہیں پتہ نہ چلا۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور جہاز بندرگاہ سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اب ہیگ مسافروں کے لاؤنج میں اپنی کافی ختم کر چکا ہو گا اور کسی بھی وقت وہ کیبن میں واپس آ سکتا ہے۔ میں نے کیبن کے ایک گوشے میں بیت کی بنی ہوئی ایک چوڑی اور خاصی اونچی چوکور ٹوکری دیکھی جو استعمال شدہ کپڑے اور چادریں وغیرہ رکھنے کے لئے جہاز کے ہر فرسٹ کلاس کیبن میں موجود ہوتی ہے۔ ہیگ کے سامان سے الگ تھلگ بیت کی ٹوکری یا ٹوکری نما صندوق بالکل غیر متعلق یا غیر اہم نظر آتا تھا۔ سامان کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے کسی کی عقل میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اسے بھی دیکھ لیا جائے۔ میں نے صندوق کا ڈھکنا ہٹایا اور دور تک میلے کپڑوں کا ڈھیر کنگھال ڈالا۔ کپڑوں کے انبار کے نیچے کوئی کھردری سی چوکور سی چیز کپڑے میں لپٹی پڑی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بھاری بھر کم چیز کو ایک ہاتھ سے اٹھانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس بھاری پیکٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

اچانک ہی راہداری میں تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی یہ چاپ کیبن کے دروازے پر آ کر رک گئی تھی۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے اس بڑی اور عظیم الشان ٹوکری میں کپڑوں کے پیچھے غوطہ لگایا اور اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ استعمال شدہ کپڑوں کی گھٹی گھٹی بو ناقابل برداشت تھی۔ میں ہل جل بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ بیت کا صندوق چرچراتا اور آنے والا میری موجودگی سے باخبر ہو جاتا۔ جو کوئی بھی تھا، وہ سیٹی پر کوئی اسپینی دھن بجا رہا تھا۔ پھر اس نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا اور اسپینی زبان میں گالی بکی۔ ایک لمحے کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ہیگ نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں نے

اس کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ بظاہر وہ ایک انتہائی مہذب آدمی نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اسپینی موسیقی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے عربی موسیقی کی ناجائز اولاد کہتا تھا۔ کیبن میں آنے والا کوئی اور ہی تھا، ممکن ہے ہیگ کا کوئی ملازم ہو۔ بہرحال یہ ملازم باتھ روم میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی باہر نکل آیا۔ پھر چابی کا گچھا بجاتا ہوا الماری کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے زور سے الماری کے پٹ کھولے اور پھر بند کر دیئے۔ اب وہ بیت کے اس صندوق کے پاس کھڑا تھا۔

میں تہہ در تہہ میلے کپڑوں کے درمیان پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہیگ کے ملازم نے اس صندوق کو زوردار ٹھوکر ماری۔ میں دم سادھے بیٹھا ہوا تھا۔ خدایا، یہ کچھ اور آگے نہ بڑھ آئے۔ اگر وہ میلے کپڑوں کے ڈھیر نکالنا چاہے گا تو پھر میں اس کے سامنے عریاں ہو جاؤں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ لمحے بھر کے لئے صندوق کے پاس کھڑا رہا، پھر چابیوں کا گچھا ہلاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔

میں ڈر رہا تھا کہ یہ خبیث کہیں واپس کیبن میں نہ آ جائے۔ اس لئے کہ اب اس نامعقول جگہ میرا شدید دم گھٹنے لگا تھا۔ خاص طور سے کپڑوں کی ناخوشگوار بو ماحول کو بری طرح خراب کئے ہوئے تھی۔ تقدیر بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ امید و بیم کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور پھر خود ہی اسے ختم کرتی ہے۔

ہیگ کے ملازم نے کیبن کا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ چلو جان چھوٹی۔ لیکن یہ اطمینان ایک لمحے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس لئے کہ ملازم نے دروازہ بند کرنے کے بعد اسے باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ آہ...... میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔ جس بات سے میں ڈر رہا تھا وہی ہو گئی۔ اسکندریہ پہنچنے سے پہلے ہیگ سے الجھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بھیڑیئے کو خود اس کے بھٹ میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت حالات نے مجھے اس کے رحم و کرم پر لا ڈالا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد ملازم کے ساتھ وہ کیبن میں آئے گا۔ اس تختی کو جہاز سے اتارنے کی تدبیر کرے گا۔ کیا عجیب بات تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ تختی اس قدر وزنی ہو گی اور اسے حاصل کر کے لے جانے کے لئے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لازمی بات ہے کہ ہیگ کو بھی اس سلسلے میں خاصی پریشانی ہو گی۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ کیبن میں میری موجودگی سے میری اصل شخصیت اس پر ظاہر ہو

جائے گی۔ کلکتے میں تو ہیگ نے اپنی دانست میں مجھے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ نکلا۔ لیکن اس دفعہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اس لئے کہ میں اس کے تازہ ترین جرم کی رونمائی کر رہا ہوں۔ اور یہ بات بھی اس کے لئے انتہائی خوفناک تھی کہ مجھ جیسا آدمی اس کے پیچھے لگ جائے جو اس کے پچھلے جرائم کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔

اس وقت میں اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجھے بیت کے صندوق سے اس تختی کو نکالنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ میں وحشت میں کیبن کے دروازے پر زور آزمائی کرنے لگا۔ کیونکہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے ہیگ اور اس کا نوکر آ سکتے تھے۔ ابھی میں دروازے پر زور آزمائی کر ہی رہا تھا کہ دور سے قدموں کی چاپ اور دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسپینش میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا کہ یقینی طور پر وہ ہیگ اور اس کا ملازم ہیں۔ مجھے اور کچھ تو نہ سوجھا، سیدھا باتھ روم میں جا گھسا اور اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اپنی دانست میں، میں وقتی طور پر ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن میرے کان اور آنکھیں باہر ہی لگی ہوئی تھیں۔

آہ...... میرا اندازہ درست تھا۔ ہیگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ملازم بھی تھا۔ میں سانس روکے ہوئے تھا اور میرا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے سانسوں کی آواز تک سن سکے۔ وہ دونوں کیبن میں آئے اور اس کے بعد سامان اٹھاتے اور رکھتے رہے۔ غالباً اپنا سامان سیٹ کر رہے تھے۔ پھر ہیگ باہر چلا گیا، اس کا ملازم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا کیبن میں اِدھر سے اُدھر آ جا رہا تھا۔ پھر یکایک اس نے باتھ روم کے دروازے کو دھکا دیا مگر دروازے اندر سے بند تھا۔ وہ حیران ہو گیا اور اس نے جیسے خود سے کہا۔

''اندر کون ہے...... کون ہو سکتا ہے؟ ارے اندر کون ہے؟'' اس نے زوردار آواز لگائی اور میں بری طرح گھبرا گیا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ کموڈ کے اوپر کوئی ڈیڑھ فٹ چوڑا روشن دان تھا جس سے سمندر کی بھیگی ہوئی ہوائیں آ رہی تھیں۔

''باتھ روم میں کون ہے؟'' اب کے ملازم نے بہت غصے سے پوچھا اور دروازے پر مکے برسانا شروع کر دیئے۔ پھر کسی کی تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ آنے والا کیبن

میں داخل ہوا اور اس کی آواز اُبھری۔

''کیا شور مچا رکھا ہے تم نے...... کیا ہو گیا ہے؟''

آہ...... یہ آواز ہیگ کی ہی تھی۔ میں اس آواز کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

''سر! باتھ روم میں کوئی ہے۔ میں چیف افسر کو بلاتا ہوں۔ کوئی ہمارے کیبن میں چوری کرنے کے لئے گھسا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''نہیں سر! آپ دیکھ لیجئے، باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند ہے۔''

''ہوں، اگر ایسی بات ہے تو اطمینان رکھو۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ چلو آؤ...... باہر آؤ۔ اور کیبن کو تالا لگا دو۔ تم دوڑ کر چیف افسر کو بلا لاؤ میں یہاں دروازے پر کھڑا ہوا ہوں۔''

پھر وہ دونوں باہر نکل گئے اور دروازہ مقفل ہو گیا۔ آہ...... اس وقت پھر میری حالت بری طرح خراب ہو گئی تھی۔ چیف افسر کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ مجھ پر نہ صرف چوری کی نیت سے ایک مسافر کے کیبن میں داخل ہونے کا الزام لگے بلکہ کیپٹن کو پوری طرح یقین ہو جائے کہ احتشام بے کے کیبن میں داخل ہونے والا اور اس پر حملہ کرنے والا مجرم میں ہی ہوں۔ بڑی خوفناک صورتحال پیش آ گئی تھی اور میں بری طرح گھر گیا تھا۔

بہر حال ناچار میں نے کموڈ پر کھڑے ہو روشندان سے باہر نظر ڈالی، یہ روشن دان اُ ڈیک کے جس حصے پر کھلتا تھا وہ نسبتاً کم آباد تھا۔ میں نے وقت کے ساتھ دوڑ لگانے فیصلہ کر لیا۔ چاہے کچھ ہو جائے، مجھے روشندان کے ذریعے باہر کودنا ہوگا۔ میں صرف اُ صورت میں بچ سکتا ہوں۔ روشندان سے باہر نکلنے میں اب دیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ چیف افسر کے پہنچنے پر ڈیک کے اس حصے کو بھی گھیر لیا جائے گا۔ وہ اس صورتحال کو کچھ زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتا ہے۔

میں ابھی روشندان سے سر نکالے باہر کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

آہ...... وہ آ گئے تھے...... وہ آ گئے تھے......!

☆

میرا پورا بدن پسینے سے تر تھا۔ میں جانتا تھا کہ چیف افسر آتے ہی اپر ڈیک کے اس حصے کو گھیرنے کے لئے آدمی بھیج دے گا جس پر روشن دان کھلتا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس وقت بھی دو تین ملاح چکر لگا کر اس طرف آ رہے ہوں۔

میں نے روشن دان کے فولادی فریم پر انگلیاں جمائیں اور زور لگا کر روشن دان سے آدھا باہر کی طرف لٹک گیا۔ اندر کیبن میں اب بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے غسل خانے کے دروازے سے زور آزمائش شروع کر دی۔ میں نے بازوؤں کا سارا زور لگا کر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ڈیک چیئر پر کوئی موٹی امریکن عورت کسی رسالے سے چہرہ ڈھانپے پیر پھیلائے اونگھ رہی تھی۔ میں اس کے پیروں کے قریب جا گرا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر رسالہ دور پھینک دیا اور ہلکی سی چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یہ سمجھی کہ اونگھتے میں اس نے جو پیر پھیلا دیئے تھے تو میں گزرتے ہوئے اس کے پیروں سے الجھ گیا ہوں۔ وہ بری طرح گھگیانے لگی۔

''آئی ایم سوری سر! آئی ایم ویری سوری...... آپ میرے پیروں سے الجھ کر گر پڑے۔ سر! آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟'' وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے کہا۔ ''نہیں میڈم نہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں خود ہی دیکھے بغیر چل رہا تھا۔ اور پھر آپ کے پیروں سے الجھ کر گر پڑا۔ آپ کے اپنے پیروں میں تو چوٹ نہیں لگی؟''

''نہیں، بہت بہت شکریہ تمہارا شریف آدمی۔'' اس نے کہا۔ میں نے ایک بار پھر گردن خم کر کے اسے خدا حافظ کہا اور مڑے بغیر سیدھا اس زینے سے نیچے کے ڈیک کی طرف اتر گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ایک بار پھر مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔ یہاں تک کہ میں اپنے کیبن تک پہنچ گیا اور کیبن میں داخل ہو کر میں نے اس طرح اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا

جیسے موت کے جبڑوں سے نکل کر باہر آیا ہوں۔ کچھ لمحے اسی طرح میں نے گزارے، پھر دفعتہ ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے اپنا حلیہ دیکھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا حلیہ درست کیا اور اس کے بعد میں تقریباً دوڑتا ہوا اپنے کیبن سے باہر نکلا اور مسٹر اینڈ مسز اسمتھ کے پاس پہنچ گیا۔ چند لمحے پہلے جو واقعات رونما ہوئے تھے وہ دونوں اس سے ناواقف تھے۔ البتہ دونوں نے میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا تھا جو اس وقت مجھ پر طاری تھی۔ مسز اسمتھ نے چونک کر کہا۔

"خیریت ڈیئر خاقان! کیا بات ہے؟"

"میں اس آدھی تختی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"کیا؟" دونوں اچھل پڑے۔

"ہاں۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"ہیگ کے کیبن میں۔"

"وہاں کس جگہ؟"

"اس کے کیبن میں میلے کپڑوں کے صندوق میں چھپی ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا اور دونوں کا رنگ زرد ہو گیا۔

"تب ہمیں یہ کرنا چاہئے مائی ڈیئر! کہ ہم اسی وقت کیپٹن کو تمام حالات سے آگاہ کر دیں اور ہیگ کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرا دیں۔"

"کیا بات کر رہے ہو...... تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس طرح کیا ہیگ اور اس کے گروہ کا کھیل سمجھ میں آ جائے گا؟" مسز اسمتھ نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"سنو...... اگر اس مسئلے پر پولیس مداخلت کرتی ہے تو تختی کو بطور ثبوت اس کی تحویل میں دے دیا جائے گا اور تفتیش، مقدمے اور گواہی کے چکر میں اتنا عرصہ لگ جائے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر احتشام بے کی موت سے ہم شدید نقصان سے دوچار ہوئے ہیں مگر یہ بات تم جانتے ہو کہ تختی کا دوسرا آدھا حصہ ارسلا کے پاس قاہرہ میں محفوظ ہے اور ارسلا قدیم مصری علامتوں کو سمجھتی ہے اور تختی کا پورا مضمون اور تمام اشارے بتا کر خزانے تک پہنچ سکتی ہے۔ سارا کھیل بگڑ جائے گا اگر ہم نے اس وقت

تختی کو کسی طرح پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ پھر پولیس یہ بھی جاننے کی کوشش کرے گی کہ تختی کا راز کیا ہے۔ اور سارا کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔"

میں نے حیرت سے مسز اسمتھ کو دیکھا۔ پروفیسر کے قاتل کو گرفتار کروانے سے زیادہ اسے اس بات سے دلچسپی تھی کہ جیسے بھی بن پڑے ہیگ سے تختی کا آدھا ٹکڑا واپس حاصل کیا جائے۔ مگر کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

"لیفٹیننٹ! میں آپ کو اس مہم میں حاصل ہونے والی دولت میں سے ایک چوتھائی حصے کی پیشکش کرتی ہوں۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ تختی کا یہ نصف حصہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہیگ سے واپس لے لیں۔ کہئے، آپ کو یہ سودا منظور ہے؟"

مجھے سودا اس لئے تو بھلا کیا ہی منظور ہوتا کہ اس کے بدلے بھی مجھے اس نامعلوم خزانے کا چوتھائی حصہ ملے گا لیکن ہیگ سے ٹکر میرے لئے بہترین چیز تھی۔ میں اس عورت کی ذہنیت سے کچھ تکدر کا شکار ضرور ہوا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیگ اس وقت ہمارا مشترکہ دشمن تھا اور میں اسے کیفر کردار تک پہنچانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اگر ہیگ سے مقابلہ کرنے کے لئے دولت کی پیشکش نہ ہوتی تو بھی میں یہی کرتا جس ارادے سے ہندوستان سے چلا تھا۔

"میں جائزہ لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ان دونوں کے پاس سے واپس آ کر ہیگ کے کیبن کی طرف چل پڑا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ مجھے چکرا دینے کے لئے کافی تھا۔ ہیگ کا سارا سامان راہداری میں قطار سے رکھا ہوا تھا اور اس کا ملازم قلیوں کی ایک مختصر فوج کے ساتھ اپنے آقا کے سوٹ کیسوں، پیکٹوں اور پلندوں کو اٹھا کر لے جانے کے لئے تیار تھا۔ ادھر ہیگ کمر پر ہاتھ جمائے کھڑا تھا اور ہیگ کے قریب اس کا پرانا دوست اور اسکندریہ کا تاجر جو خود بھی ترکی تھا اور جس کا نام ہشمان ذکری تھا، کھڑا ہوا تھا۔ یہ تاجر قیمتی سگار منہ میں دبائے کھڑا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس شخص کو میں نے پہلی بار کلکتے میں دیکھا تھا۔ وہ اور جاپانی اسمگلر ایکاٹو، وائسرائے ہند کے سکیورٹی افسر این مورالس کی خودکشی سے ایک دن پہلے کلکتے میں وارد ہوئے تھے۔ جس وقت ہیگ مجھے اور این مورالس کو خفیہ کاغذات چرانے وائسرائے کے چیمبر میں بھیج رہا تھا اس وقت یہ اس کے ساتھ تھا۔

یہ لوگ بل ویدا ہاؤس کے کمپاؤنڈ کے باہر ہمارا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر جب ہم چیمبر میں پھنس گئے تھے تو یقیناً یہ چلے گئے ہوں گے۔ اب اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد

اوراس قدر المناک حادثات سے بچ بچا کر میں ایک بار پھر اپنے ان دشمنوں کو اپنے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

بہرحال میں سکون سے چلتا ہوا اس ہجوم کے قریب سے گزرا۔ ہیگ کمبخت ہشمان ذکری سے عربی میں گفتگو کر رہا تھا اور بڑی عمدگی سے عربی بول رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں کے کچھ ادھورے فقرے سنے۔ ذکری، ہیگ سے کہہ رہا تھا۔

"ہماری لانچ دس منٹ کے بعد روانہ ہوگی۔ اگر تمہارے آدمی نے سارا سامان نکال لیا ہو تو" اس نے سارا سامان کہتے ہوئے معنی خیز انداز میں ہیگ کی طرف دیکھا اور ہیگ نے مسکرا کر پُراطمینان انداز سے گردن ہلائی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا ہے۔

یہ لوگ پروفیسر احتشام بے کی تختی کو جہاز سے نکال کر لے جانے کے تمام انتظامات کر چکے ہیں۔ آہ...... ہیگ مجھ سے زیادہ صاحب اختیار ہے۔ میں تو صحیح معنوں میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکا۔ لیکن اس نے اپنے اردگرد کا سارا ماحول مضبوط کر رکھا ہے۔ اس کمبخت ذکری بے کو میں نے پورے سفر کے دوران ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ نجانے کون کون اس خوفناک اسمگلر کے ساتھ ہو۔ میں کہیں جلد بازی کا شکار تو نہیں ہوگیا؟ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اس قدر مضبوط نہیں ہے کہ ہیگ کو آسانی سے شکست دے سکے۔ بہرحال اگر میں نے اس وقت فوراً ہی کچھ نہ کیا تو ہیگ اور ہشمان ذکری یہ بازی بھی جیت جائیں گے۔ حالانکہ وہ عورت جہاز کے حکام کو پروفیسر کی تختی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتی تھی۔ مگر اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اب جہاز اسکندریہ کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے اور چند ہی لمحوں کے بعد وہ بندرگاہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ بندرگاہ میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہا تھا۔ ابھی تک مسافروں کو اترنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن گھنٹے بعد مسافروں کو اترنے کی اجازت مل جائے گی۔ یہ شخص جس کا نام ہشمان ذکری ہے، اسکندریہ کا ہی رہنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہیگ کا کوئی دوست اسی کی طرح با اختیار اور دولت مند آدمی ہوگا۔ جہاز کے گودی پر لگنے اور مسافروں کے اترنے سے پہلے ہی وہ ہیگ کا سارا سامان اپنی لانچ میں منتقل کرنے آیا ہے۔ اسے اگر اس وقت نہ روکا گیا تو مصر کی سرزمین پر اس جیسے بااثر

آدمی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں صرف اپنی عقل کے مطابق کام کروں۔ چنانچہ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چیف افسر کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ شخص ایک شریف صورت آدمی تھا۔ میں نے جلدی جلدی اسے ہیگ اور ہشمان ذکری کی کارروائیوں کے بارے میں آگاہ کیا اور وہ حیران رہ گیا۔

"آپ کے خیال میں جہاز پر ہونے والے قتل میں اس شخص کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا نہیں، سو فیصدی ہے۔ اور میں اس سلسلے میں مکمل ذمے داری قبول کرتا ہوں۔"

"سر! کیپٹن صاحب کا حکم ہے کہ کوئی بھی مسافر سامان کی تلاشی دیئے بغیر جہاز سے نہیں اتر سکتا۔ کم از کم مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو، جہاز کے گودی پر لگنے سے پہلے اور تلاشی دیئے بغیر کوئی سامان جہاز سے نیچے نہیں اتار سکتا۔"

"کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے؟"

"سو فیصدی۔" اس نے جواب دیا اور ٹہلتا ہوا ہیگ کے سامان کی جانب چل پڑا۔ ہیگ کا سارا سامان اس راہداری سے ہٹایا جا چکا تھا۔ یہاں سے چیف افسر ڈیک پر پہنچا۔ میں مسلسل چیف افسر کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ مصری کسٹمز کی ایک لانچ جہاز کے ساحل کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور خلاصیوں نے چھوٹا گین وے ڈال کر دونوں کو ملا دیا ہے۔ گویا ہیگ کا سامان اب لانچ پر لادے جانے کے لئے تیار تھا۔ ادھر میں نے دیکھا کہ ہیگ اور ہشمان ذکری سامان کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔

دفعتہً ہی چیف افسر نے ان کے قریب پہنچ کر کچھ کہا اور ساتھ ہی سامان کی جانب اشارہ کیا۔ اسی وقت ہشمان بے نے مصنوعی حیرت سے چیف افسر کو دیکھا پھر انگلی کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ اس کی ایک آنکھ پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس نے آنکھ سے چشمہ اتار کر اپنی ریشمی ٹائی سے صاف کیا اور دوبارہ چشمہ لگا کر چیف افسر کو اس طرح دیکھا جیسے کسی عجیب وغریب چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی گونج دار آواز ابھری۔

"ہوں...... تو تم چیف افسر ہو۔ غالباً اس جہاز پر نئے آدمی معلوم ہوتے ہو اسی لئے مجھے نہیں جانتے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتا جناب! کیپٹن کا حکم ہے کہ کسی مسافر کو سامان کی تلاشی لئے بغیر نہ اتارا جائے۔ اور پھر ابھی جہاز گودی پر نہیں لگا ہے۔ ویسے بھی کوئی مسافر امیگریشن کی

اجازت کے بغیر جہاز نہیں چھوڑ سکتا۔"

ہشمان بے کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے ہیگ کو دیکھا۔ ہیگ اس کا اشارہ سمجھ کر آگے بڑھا اور اس نے چابیوں کا گچھا نکال کر چیف افسر کی طرف بڑھا دیا۔ پھر بولا۔

"یہ رہی چابیاں اور یہ ہے میرا سامان۔ آپ جلدی چیک کر لیں۔ چلئے، اپنا کام کیجئے۔"

چیف افسر ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی لینے کی کوشش نہیں کی اور الجھی ہوئی نگاہوں سے ہشمان ذکری کو دیکھنے لگا۔ ہشمان ذکری نے ہاتھ آگے بڑھا کر ہیگ کے ہاتھوں سے چابیاں لے لیں اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ میں اسکندریہ کے میئر کی حیثیت سے اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اس سامان میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔ بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟" اس نے کھینچ کر اس کے شانے پر اپنی چھوٹی انگلی مارتے ہوئے کہا اور اس کے بعد چابیاں اپنی جیب میں رکھ لیں۔ پھر وہ عرب قلیوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"سامان لانچ میں پہنچا دو۔" اور اس کے بعد اس کی نگاہیں بندرگاہ کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ چیف افسر اور جہاز کی دوسری سکیورٹی کے عملے سے بالکل بے تعلق ہو گیا تھا۔ چیف افسر نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ خشک کیا۔ اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ سی نکلی۔

"میئر...... اسکندریہ کا میئر۔"

ہشمان ذکری، ہیگ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا اور ٹہلنے والے انداز میں چھوٹے گین وے کی طرف چل پڑا۔ میں نے گہری نگاہوں سے چیف افسر کا جائزہ لیا۔ وہ بے چارہ سہم سا گیا تھا۔ میں نے دانت پیسے۔ ہر جگہ یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں سیدھا کیپٹن کے پاس جا کر اسے تمام صورتحال سے آگاہ کر دوں اور ان بدمعاش اسمگلروں کو روکنے کی کوشش کروں۔

چیف آفیسر معمولی سے انداز میں اِدھر سے اُدھر دیکھنے لگا۔ دوسری طرف ہشمان ذکری کے عرب قلیوں نے ہیگ کا سامان لانچ پر بار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں بے چینی سے کیپٹن کو تلاش کرنے لگا اور پھر تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔ میں نے

اس سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے ادھر کیا ہو رہا ہے مسٹر کیپٹن؟"

کیپٹن نے اس انداز میں مجھے دیکھا جیسے اسے میری یہ مداخلت ناگوار گزری ہو۔ لیکن بہرحال وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرا تعلق برٹش بحریہ سے ہے۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے جناب؟"

"ادھر دیکھئے۔ وہ سامان اس لانچ پر کیسے بار کیا جا رہا ہے؟"

"وہ سامان اسکندریہ کے میئر ہشمان ذکری کا ہے۔"

"تو کیا اسکندریہ کے میئر پر جہاز کا قانون لاگو نہیں ہوتا؟"

"وہ دراصل وہ......"

"سنیے مسٹر کیپٹن! مقتول پروفیسر کی فولادی تختی مسٹر ہیگ کے سامان میں موجود ہے اور اس وقت وہ مصری کسٹم کی لانچ پر پہنچائی جا رہی ہے۔"

"کیا آپ ٹھیک کہتے ہیں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ میں نے ایک لمحے میں محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ کرنے سے جی چرا رہا ہے۔ پھر بھی میرے کہنے پر وہ تیزی سے مین ڈیک پر پہنچا۔ اتنی دیر میں ہیگ کا سارا سامان لانچ میں پہنچا دیا گیا تھا اور چھوٹا گین وے ہٹایا جا رہا تھا۔ میں نے لانچ پر نگاہ ڈالی۔ ہیگ لانچ میں نظر نہیں آیا۔ وہ شاید انجن روم میں چلا گیا تھا۔ دوسری جانب ہشمان ذکری پُر اطمینان انداز میں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے لانچ کے اندر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اوپر جھانکتے ہوئے کیپٹن کو دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ کیپٹن کے چہرے پر بے چارگی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ نے کچھ کیا نہیں کیپٹن۔ وہ لوگ اس تختی کو لے جا رہے ہیں۔ اور یقیناً احتشام بے کا قاتل بھی ان میں شامل ہے۔"

لانچ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔ کیپٹن کچھ سٹپٹایا ہوا تھا۔ اس نے جاتی ہوئی لانچ کو دیکھا پھر اپنے اردگرد ماتحتوں پر نگاہیں ڈالیں اور اس کے بعد تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز ابھری۔

"سنیے مسٹر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسٹم کی یہ لانچ میری اجازت سے جہاز سے لگی ہے اور اسکندریہ کے میئر مجھ سے اجازت لے کر اپنے ایک معزز مہمان کو اتارنے آئے تھے۔ آپ پتہ نہیں کس شبہے کا شکار ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ہے جس پر آپ اعتراض

کریں۔''

میں نے دانت پیستے ہوئے کیپٹن کو دیکھا۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پتہ نہیں ہشمان ذکری کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے۔ ویسے یہ بات سوچنے کی تھی کہ کیا ہشمان اتنا طاقتور آدمی ہے کہ اس اہم جہاز راں کمپنی کا کیپٹن اس کے مقابلے میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا؟ شدید غصے کے عالم میں، میں نے غصے سے کہا۔

''حالانکہ آپ جانتے ہیں کیپٹن! کہ آپ نے جان بوجھ کر پروفیسر احتشام بے کا قاتل چھوڑ دیا ہے۔''

''سر! بے شک آپ کا تعلق ایک اہم بحری محکمے سے ہے۔ لیکن کم از کم اس جہاز پر آپ صرف ایک مسافر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے زیادہ مجھے آپ کے سلسلے میں کوئی ہدایات نہیں کی گئی ہیں۔ میں کیا جانتا ہوں اور کیا نہیں جانتا یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور سنیئے، آپ کتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اس لانچ سے پروفیسر احتشام بے کا قاتل فرار ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ چنانچہ آپ میری اجازت کے بغیر جہاز چھوڑنے کی کوشش نہ کریں۔ پروفیسر کے کیس میں مجھے ابھی آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

کیپٹن نے یہ الفاظ کہے اور گھوم کر ایک طرف ہو گیا۔ میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ ایسی بے بسی اور ایسی شکست زندگی میں بہت کم ہی نصیب ہوئی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ جائز نہیں ہے۔ کیپٹن وہاں سے چلا گیا تھا۔ پروفیسر کا قاتل آزاد تھا۔ اور میں جو قانون کی مدد کرنا چاہتا تھا، اس بیوقوف شخص یعنی جہاز کے کپتان کی بزدلی یا سازش کی وجہ سے الٹا پھانس دیا گیا تھا۔

میری نگاہیں چیف آفیسر پر پڑیں جس کی ہمدرد آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ مجھے قابل رحم سمجھتا ہو۔ بہر حال اس کے بعد وہ بھی گھوم کر واپس چلا گیا۔ میں تنہا کھڑا رہ گیا تھا اور اس وقت میرے سارے وجود میں گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی۔ کیسی تکلیف دہ بات تھی۔ میں نے جب بھلائی کرنی چاہی تو چاروں طرف سے مصیبتوں اور مصائب نے مجھے آن گھیرا اور اب تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں پیروں میں رسیاں باندھ دی گئی ہوں۔ آہ...... یہ سچائی کے پہلے راستے پر میرے لئے بدترین شکست تھی۔ جتنی شدید جدوجہد میں نے کی تھی وہ میرے لئے عذاب بن گئی تھی اور اب میں خود پھنس گیا تھا۔

کپتان کے الفاظ ہلکے پھلکے نہیں تھے۔ میری ذات میں تو کچھ ایسے معاملات تھے جس میں، میں بری طرح پھنس سکتا تھا۔ اور اب یہ خیال دل میں بار بار جنم لے رہا تھا کہ میں شیطانی راستے پر ہی پھل پھول سکتا ہوں۔ میں نے برائی کے راستے پر چلتے ہوئے بہت سی مشکلیں آسان ہوتے دیکھی تھیں۔ اور اب جبکہ میں نے ایک سفاک قاتل کو گھیرا اور اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہا تو ہر چال الٹ رہی ہے۔

میں اپنے پاؤں بے جان محسوس کرنے لگا اور اس احساس کی شدت نے مجھے دلی طور پر بہت ہی افسردہ کر دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور خالی ڈیک کی ایک چیئر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ ہے دھیان کا وہ راستہ جس پر میں نے اب اپنی یاترا شروع کی ہے۔ میں وہ روایتی باتیں نہیں کروں گا کہ نیکیوں کے راستے دشوار گزار ہوتے ہیں اور ان میں کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں۔ نیکیوں کے سفر پر حوصلہ شکن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا اور نیک بندوں کو امتحانات دینے پڑتے ہیں۔ راہِ حق پر سفر کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن کیا میں راہِ حق پر سفر کرتے ہوئے ان تمام مصائب کا سامنا کر سکتا ہوں جو میرے راستے میں آئیں گے؟ ممکن نہیں ہے۔ میں تو ایک عام سا دنیا دار آدمی ہوں، اچھا کام کرنا چاہتا ہوں اور عام آدمیوں کی طرح یہ چاہتا ہوں کہ اگر میرے لئے آسانیاں نہ بھی پیدا ہوں تو کم از کم مجھے نت نئی ناکامیوں کا سامنا تو نہ کرنا پڑے۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک چہرہ ابھرنے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے سورج اُفق کی پہاڑیوں کے پیچھے سے سر نکالتا ہے۔ وردان سادھانی کا چہرہ اُبھر رہا تھا۔ مجھے وہ لمحات یاد آئے جب میں نے اس جہاز کے لاؤنج سے نامعلوم سمتوں کا سفر کیا تھا اور وردان سادھانی کے روبرو پہنچا تھا۔ وردان سادھانی کے چہرے پر رنج و ملال کی جو کیفیت تھی وہ میری نگاہوں سے ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے، وہ کیسا وجود ہے۔ عالم عدم میں ہے یا عالم وجود میں؟ کیا کہہ سکتا ہوں میں۔ وہ پراسرار قوتوں کا مالک، بدھ مت کا پیروکار جس کے بارے میں یہ بات میرے علم میں لائی گئی ہے کہ وہ بدھ مت کا ایک اور فرقہ ہے جو اپنے طور پر اپنی برتری کا پرچار کرنا چاہتا ہے۔ وردان سادھانی کیا چاہتا ہے؟ اس کا صحیح طور سے اندازہ مجھے اب بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے نیکیوں کے راستے پر بھی گزارنا چاہتا تھا اور برائیوں کے راستے پر بھی وہ میرا ہمسفر ہے اور دونوں حالتیں اسے قبول ہیں۔ پتہ نہیں وہ میری تباہی کے درپے ہے یا مجھے اس

نئے فرقے کا روحانی پیشوا بنانا چاہتا ہے؟ اس نے میرا انتخاب کس لئے کیا تھا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے انوکھی روحانی قوتوں سے نوازنا چاہتا ہے۔ اگر ایسی بات ہے وردان سادھانی، تو اب ان حالات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تیری ضرورت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اب میں جس صورتحال سے دوچار ہوں اس میں تو میری مدد کر سکے؟

"کیوں نہیں...... یہ بالکل ممکن ہے۔" ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے یہ آواز کھلے سمندر کے رُخ سے آتی ہوئی محسوس کی تھی۔ میں ہڑبڑا کر ڈیک چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری گردن چاروں طرف گھومنے لگی۔ میرے عقب میں کوئی نہیں تھا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ بھکشو کی آواز پھر سنائی دی۔

"اچھائی تو اچھائی ہوتی ہے بودھی ستو! اور کون کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا۔ تم نے بہت سوچ بچار کے بعد جیسا اچھا کام چنا ہے اس میں ہم اور تمہارے پرکھوں کی آتمائیں تمہارا ساتھ دیں گی، سمجھے؟ اچھائی تو اچھائی ہی ہوتی ہے۔"

یہ آواز کچھ ایسی تھی جیسے کوئی ریڈیو پر بول رہا ہو۔ میں نے ہوش وحواس کے عالم میں یہ آواز سنی تھی اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ گویا مجھے میرے سوال کا جواب دیا گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا۔ مشکل آتی ہے تو ان پراسرار قوتوں کے علاوہ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ میں نے ایک لمحے کے اندر یہ فیصلہ کر لیا کہ اس انداز کی آواز کو جو وردان سادھانی نے سنائی ہے سنتا رہوں گا اور اس پر عمل بھی کروں گا۔

بہر حال یہ میرے مقاصد سے نہیں ٹکراتی تھی۔ یہ پہلی اچھی آواز ہے جو وائسرائے چیمبر کے قیامت خیز ہنگامے کے بعد میں نے سنی ہے۔ اور اس کے بعد میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہو اور میں اسے ایک چھوٹے سے گلوب کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ میرے اشاروں پر ناچ رہی ہو۔ میں نے حقارت سے جہاز کے برج کی طرف دیکھا۔ یہ کیپٹن اگر ہیگ اور ہشمان ذکری سے خائف ہے یا بکا ہوا ہے تو اب یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تو خود اب اتنی توانائی رکھتا ہوں کہ آسانی سے اسے زمین پر لٹا سکوں۔ میں جس مقصد سے مصر تک آیا ہوں وہ بھی یہی ہے کہ اپنی رُسوائی اور تباہی کا بدلہ لوں اور اپنا حساب بھی چکاؤں اور پروفیسر احتشام کا انتقام بھی لوں گا۔ ان حالات میں بھی اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں اس قدر بے بس نہیں ہوں جتنا

اب سے چند لمحے پہلے تھا۔ یہ آواز یہ آواز مجھے بلا سبب سنائی نہیں دی ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو گا میرے حق میں ہو گا۔

"ہاں...... اب جو کچھ بھی ہو گا تمہارے حق میں ہی ہو گا۔ بے فکر رہو۔"

مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی میرے برابر کھڑا ہوا ہو اور میری ہر سوچ اس کے علم میں ہو۔ وہ مجھے احساس دلا رہا ہو کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھے گاشر بھرم کی پہاڑیوں کے دھار کا وہ تجربہ یاد آیا جب میں وردان سادھانی کے ابدی چشمے پر کھڑا اپنے آپ میں نئی قوتوں کو سمو رہا تھا۔ میں نے آبشار کی گونج بھی سنی اور دل ہی دل میں دوہرایا۔

"نموست...... نمو بدھا۔"

میرے بدن پر لرزہ سا طاری تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سارے وجود میں سرور و کیف کی کیفیت ابھر رہی ہو۔ ہاں، میں اب بالکل ہی الگ کیفیت میں تھا۔ آہستہ آہستہ میری حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ میں کچھ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا اور پھر میری نگاہیں جہاز پر ہونے والی کارروائیوں کا جائزہ لینے لگیں۔

امیگریشن پولیس کی لانچیں اور اسکندریہ کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے گائیڈ موٹر بوٹوں میں جہاز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ برابر سے ایک سیاہ فام نکل کر آیا اور ہمارے جہاز کے برابر کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹگ ہمارے جہاز کو دھکیل کر گودی پر لگانے لگا تھا۔ ہمارے جہاز کے گرد ہوٹلوں کے موٹر بوٹ اس طرح گردش کر رہے تھے جیسے مٹھائی پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ شوخ رنگوں میں پینٹ کئے ہوئے ان موٹر بوٹوں پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے اور ان پر ہوٹلوں کے ناموں کے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے۔

میں مایوسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں ریلنگ پر کھڑا بندرگاہِ اسکندریہ کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھتا رہا۔ مجھے اب بھی احساس تھا کہ کیپٹن کی بزدلی سے ہاتھ آیا ہوا شکار نکل گیا ہے۔ ہیگ ایک بار پھر مجھ پر کاری ضرب لگا گیا تھا۔ وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اب اسکندریہ کے بھرے پُرے شہر میں اس کی تلاش میں مجھے بھٹکنا پڑے گا۔ خیر کچھ وقت اور سہی۔ ہیگ کی لانچ دور کرنوں کے جنگل میں گم ہونے والی تھی۔ میں نے حسرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور خالی خالی آنکھوں سے جہاز کے گرد گھومنے والی موٹر بوٹوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک ہی مجھے ایک آواز اپنے کانوں میں سنائی دی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔

"خاقان صاحب! خاقان صاحب!" انجنوں کے شور میں پکارنے والے کی آواز مجھے

صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور یہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر ادھر دیکھا، ایک شخص سفید سوٹ میں ملبوس قریب ہی کی ایک موٹر بوٹ پر کھڑا مجھے متوجہ کر رہا تھا۔ اس کی آواز پھر سنائی دی۔ ''خاقان صاحب! میں ہوں، آپ کا دوست۔ مجھے پہچانئے۔ میں ہوں آپ کا دوست، رحمان یزدانی۔''

میں نے اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی اور میرے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

''رحمان یزدانی...... میں تو اسکندریہ میں رہنے والے کسی رحمان یزدانی کو نہیں جانتا۔''

مجھے یوں لگا جیسے یہ چہرہ میرا دیکھا ہوا ہو۔ یزدانی...... یزدانی...... میں سوچنے لگا۔ موٹر بوٹ پر کھڑے ہوئے اس شخص نے مجھے پھر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں رحمان یزدانی ہوں، سلطان میاں کا ساتھی۔ اب بھی نہیں یاد آیا آپ کو؟ ارے میرا اور آپ کا تو بچپن سے ساتھ رہا ہے۔''

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا اور مجھے ماضی کے بہت سے واقعات یاد آ گئے۔ بابا جان اور سلطان میاں کے ساتھ میں کتنی ہی بار شکار کو گیا تھا۔ اس وقت سلطان میاں کے ساتھ رحمان یزدانی ہوا کرتا تھا وہ ان کا شکاری دوست تھا۔ میں ایک دم چیخا۔

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے یزدانی! ارے باپ رے باپ، تم پر تو جیسے عمر ٹھہر گئی ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تم میں۔ کیسے آئے ہو؟''

''بس آپ کو لینے آیا ہوں۔ آپ بوٹ پر آ جائیے۔ میں بوٹ کو قریب لگواتا ہوں۔''

رحمان یزدانی نے اس طرح کہا جیسے یہ سب آسان سی بات ہو اور جہاز سے فرار ہونا کوئی مشکل عمل نہ ہو۔ میں نے اس کے الفاظ حیرت سے سنے اور اس کے بعد چاروں طرف حیرت سے دیکھا تو رحمان یزدانی بولا۔

''سوچئے مت۔ آئیے، لانچ پر کود جائیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں وہی کروں جو یزدانی کہہ رہا ہے۔ ویسے ایک لمحے کے لئے میرے بدن میں تھرتھراہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ یہ سلطان میاں بھی معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے ہاتھ کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے جہاز سے کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ موٹر بوٹ قریب آ کر تقریباً جہاز سے لگ گئی۔ میں ریلنگ کو تھام کر باہر کی طرف جھول گیا اور سر جھکا کر نیچے دیکھا، موٹر بوٹ مجھ سے دس بارہ فٹ نیچے ڈول رہی تھی۔ میں نے کودنے کی کوشش ہی کی تھی کہ میں نے دیکھا چیف آفیسر اور

امیگریشن کا ایک سارجنٹ میری طرف دوڑتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

''ارے مسٹر، ٹھہرو ٹھہرو...... کہاں جا رہے ہو؟'' چیف افسر دھاڑا۔ پولیس سارجنٹ بھی میری جانب دوڑ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے سر گھما کر نیچے موٹر بوٹ کو دیکھا، یزدانی ہاتھ ہلا کر مجھے کودنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

اچانک ہی سارجنٹ نے اپنا ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ''رک جاؤ لیفٹیننٹ! نہیں تو......'' اس نے دھمکانے کے لئے میرا نشانہ لیا اور میں نے چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے جہاز نے میرے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ میرا جوتا ریلنگ کے پار اور لوہے کے ستون میں پھنس گیا تھا۔ امیگریشن پولیس کا آدمی اور جہاز کا چیف افسر مجھ سے بمشکل تمام پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ منحوس جوتا اگر نہ نکلا تو میں مارا جاؤں گا۔ نیچے سے یزدانی مجھے پکار رہا تھا اور اوپر سے پولیس والا یعنی وہ سارجنٹ جو چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''لیفٹیننٹ، رک جاؤ...... ورنہ گولی مار دی جائے گی۔ رک جاؤ۔''

وہ دونوں اب مجھ سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر تھے کہ میں نے پوری طاقت لگا کر جھٹکا دیا۔ میرا پیر ریلنگ کے ستون اور تاروں کے رسے سے آزاد ہو گیا تھا اور دوسرے لمحے میں نے پیچھے کی طرف جھکولا دے کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ سارجنٹ اپنا ریوالور لہراتا رہ گیا۔ میں بڑے بے ڈھنگے انداز میں بوٹ پر گرا تھا۔ یزدانی نے بھی چیخ کر موٹر بوٹ کے ڈرائیور سے کہا اور موٹر بوٹ گولی کی طرح اچھل کر کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاز کے عرشے پر امیگریشن اور جہاز کے عملے کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ بیس منٹ تک ہم لانچوں اور ماہی گیر کشتیوں کے ہجوم میں راستہ تلاش کرتے رہے، پھر ایک قدیم محراب والا پل نظر آیا۔ دور سے میں اسے بھی لوہے کا پل سمجھا تھا مگر اس پر تو برسوں سے کائی جمی تھی اور سمندری کیڑے اپنا گھر بناتے رہے تھے۔ اس پل کے نیچے سے گزر کر ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر کا پانی پتلی نہر کی شکل میں اندر گنجان بستی میں چلا گیا تھا۔ کچھ دور اس سمندری نہر میں چلتے رہنے کے بعد موٹر بوٹ ایک اور پتلی سی نہر کی جانب مڑ گئی۔ یزدانی کی موٹر بوٹ کا ڈرائیور ان راستوں سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔

کوئی دس منٹ تک ان بھول بھلیوں میں چلنے کے بعد موٹر بوٹ ایک مضبوط سلاخوں والے ایک بہت بڑے پھاٹک کے سامنے رک گئی۔ زنگ اور سمندری کائی سے پھاٹک کی سلاخیں اس حد تک خراب ہو گئی تھیں کہ اچھا خاصا لوہے کا دروازہ پتھر یا لکڑی کا دروازہ

معلوم ہوتا تھا۔ آخر کار ڈرائیور نے انجن بند کر دیا اور موٹر بوٹ کے چھوٹے سے تختے پر کھڑے ہو کر دو انگلیاں منہ میں دے کر زور سے سیٹی بجائی۔ اس لق و دق سنگیں عمارت میں کہیں دور ایسی ہی سیٹی جوابی طور پر سنائی دی اور پھر اوپر کی ایک خستہ حال کھڑکی سے کسی سیاہ فام نے جھانک کر نیچے دیکھا اور کچھ کہا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ لیکن پھر دو تین منٹ تک ہمیں انتظار کرنا پڑا، پھر گڑگڑاہٹ کے ساتھ یہ وزنی پھاٹک آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔ اوپر کسی طرح کی قلیلیں لگائی گئی تھیں جن کی مدد سے یہ منوں وزنی پھاٹک اٹھایا جا رہا تھا۔ پھر اندر سے کمر کمر پانی میں چلتا ہوا وہی سیاہ فام آگے آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس دبا ہوا تھا جس کے سرے پر لوہے کا ایک ہُک لگا ہوا تھا۔ اس نے موٹر بوٹ کے کسی تختے پر یہ ہُک پھنسایا اور بار برداری کے بیل کی طرح آگے جھک کر اس نے بوٹ کو کھینچنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں موٹر بوٹ اس عمارت کے نیم تاریک ماحول میں پہنچ گئی۔ پھر سیاہ فام نے ایک سوئچ آن کیا اور چھوٹے سے بلب کی زرد روشنی سے اس آبی گیراج کی فضا اور زیادہ اُداس ہو گئی۔ اس نے دوبارہ پھاٹک گرا دیا اور پھر یزدانی نے مجھ سے کہا۔

"آؤ۔"

ہم لوگ موٹر بوٹ سے نیچے اترنے لگے۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ سیاہ فام اندر سے ایک بہت بڑی ترپال گھسیٹتا ہوا آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ترپال اب یقیناً موٹر بوٹ پر ڈال دی جائے گی اور اس طرح قصہ ختم ہو جائے گا۔ میں بڑی محویت سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا کہ یزدانی میرے اس تعجب کو دیکھ کر ہنسا اور بولا۔

"خاقان صاحب! اب یہ بوٹ امیگریشن کے باپ کو بھی نہیں ملے گی۔ ہفتے دو ہفتے کے بعد یہ نئے رنگ و روغن کے بعد نیا نمبر لے کر یہاں سے باہر جائے گی اور اپنا کام شروع کر دے گی۔"

"لیکن یزدانی! جہاز کے قریب تو یقیناً تمہارے بہت سے جاننے والے بھی ہوں گے اور انہوں نے تمہیں فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہو گا۔"

"سو فیصدی۔ میرے بہت سے شناسا قرب و جوار میں موجود تھے اور میری کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔"

"تو پھر......؟"

"وہ سب جانتے ہیں کہ یہ بوٹ رحمان یزدانی کی ہے۔"

"تو کیا وہ امیگریشن والوں کو نہیں بتا دیں گے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ اسکندریہ کی بندرگاہ ہے جناب خاقان صاحب! کیا سمجھ رہے ہیں آپ۔ یہاں رحمان یزدانی کسی گمنام ملازم کا نام نہیں ہے۔ میرے پیشے کے لوگ بہت نیک اور ایماندار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کو ایسی کوئی بات نہیں بتاتے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی مخبری نہیں کرتے۔ اگر امیگریشن والوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہے تو بھی کوئی فکر کی بات نہیں۔ وہ ہمارا اور ہم ان کا خیال کرتے ہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی۔ رحمان یزدانی کی عمر بہت زیادہ تھی یعنی اس وقت وہ سلطان میاں کے ساتھ ان کا دست راست ہوا کرتا تھا جب میری عمر کچھ بھی نہیں تھی اور میرے والد زندہ تھے۔ لیکن آج بھی وہ اتنا ہی چست و چالاک اور تندرست نظر آتا تھا۔ بہر حال اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

"آیئے۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے ایک تنگ و تاریک راستے سے لے چلا۔ سرزمین مصر پر میرا یہ سفر ختم ہوا تھا لیکن اس کے بعد نجانے کیسے کیسے ہنگامے میرے منتظر تھے۔ زینے طے کرتے ہوئے مچھلی کی بدبو، سیلن، تاریکی اور کیڑے مکوڑوں کی مسلسل آوازیں ہمارا استقبال کرنے لگیں۔ ہم ان آوازوں سے گزرتے ہوئے عمارت کی دوسری منزل پر پہنچے اور پھر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ انتہائی وسیع و عریض کمرہ تھا۔ لیکن عجیب و غریب حیثیت کا حامل۔ دیواروں کا پلستر، رنگ و روغن کب کا اکھڑ گیا تھا۔ ننگے فرش پر جابجا دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ تنگ و تاریک سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے گھٹن کا سا احساس ہوتا تھا۔ لیکن کمرے میں سمندر کے رخ پر دو کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جس سے یہ گھٹن ختم ہو گئی تھی۔

بہر حال ہمیں اس کمرے میں نہیں رُکنا پڑا۔ چونکہ کمرے کے اندرونی حصے میں ہی ایک اور زینہ بنا ہوا تھا جو اوپر کی سمت جاتا تھا چنانچہ ہم کچھ لمحوں کے بعد اس عمارت کی تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اس بار جس کمرے میں ہم داخل ہوئے تھے اس میں کھڑکیوں کے نیچے دو چوکیاں سی بنی ہوئی تھیں جن پر بجھے بجھے سے رنگوں میں روایتی مصری ڈیزائن والی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ فرش پر جابجا ریشمی غالیچے اور مخمل کے تکیے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے نقشیں کام کی کرسیاں اور اسی طرز کی تپائیاں رکھی ہوئی

تھیں۔ تپائیوں پر پیتل کے بہت ہی خوبصورت برتن سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ لمبی گردن والی صراحیاں اور پیالے دیکھ کر مجھے کشمیری آرٹ کے وہ ایمپوریم یاد آ گئے جہاں سے ملازمت کی مدت پوری کر کے وطن لوٹنے والے انگریز دو چار سو روپے کا سامان خرید کر جہاز میں سوار ہو جاتے تھے اور گھر پہنچتے تو اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے بیٹھتے اور ڈینگیں مارتے کہ یہ پیالہ مہاراجہ کپورتھلا نے اپنی سالگرہ پر مجھے تحفے میں دیا تھا۔ اس پیالے میں احمد شاہ ابدالی شربت پیا کرتا تھا۔ یا یہ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے کی صراحی ہے۔ اور یہ اکبر بادشاہ کا وہ مشہور حقہ ہے جو اکثر مغل پینٹنگز میں نظر آتا ہے۔ یہ یقینی طور پر ایسے ہی عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ بہر حال میں اپنے طور پر سوچتا رہا کہ یہ مصر ہے اور میں اسکندریہ کے فش ہاربر میں ایک باحیثیت مکان کے آرام دہ کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہی سیاہ فام شخص کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو چھوٹے چھوٹے بنڈل تھے۔ اس نے ایک بنڈل مجھے اور دوسرا رحمان یزدانی کو تھما دیا۔ رحمان یزدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''آئیے خاقان صاحب! غسل کا پانی تیار ہے۔ آپ غسل کر لیجئے اور اس کے بعد کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ غسل خانے بھی مکان کی طرح قدیم اور ٹھاٹھ دار تھے۔ میں نے غسل خانے میں بند ہو کر اپنے کپڑے اور منی بیلٹ اتاری اور کھونٹیوں پر لٹکا دی۔ گرم پانی اور خوشبو دار فرانسیسی صابن سے نہاتے ہوئے میں اپنی موجودہ حالت کے بارے میں سوچتا رہا۔ عارضی طور پر ہیگ اور اس کا ساتھی ہشمان میرے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ پروفیسر احتشام کی فولادی تختی ان سفاک مجرموں کے قبضے میں جا چکی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی بے بس ہو گیا تھا۔ اگر سلطان چچا اپنا کمال نہ دکھاتے اور رحمان یزدانی بروقت موٹر بوٹ لے کر نہ پہنچ گیا ہوتا تو پتہ نہیں مجھ پر کیا بیت رہی ہوتی۔ اگر جہاز کا کپتان مجھے نقصان پہنچانے پر تل ہی جاتا تو پھر میں اس وقت امیگریشن پولیس کی حراست میں ہوتا۔ مگر تقدیر نے مجھے بچا لیا تھا اور اس وقت میں اس قلعہ نما مکان میں بیٹھا غسل میں مصروف تھا۔

بہر حال غسل سے فارغ ہوا اور یزدانی مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں بہت ہی عمدہ قسم کا لذیز کھانا میرا منتظر تھا۔ رحمان یزدانی میرے ساتھ ہی تھا اور خوش تھا۔ میں رحمان

یزدانی پر غور کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے عمر کو کھا لیا تھا۔ میں اس وقت بھی اسے اتنا ہی جوان دیکھ رہا تھا جتنا اس وقت جب یہ سلطان چچا کا شکاری تھا اور سیتا گڑھی میں ہمارے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بہر حال بہت سے واقعات یاد آ رہے تھے۔ یزدانی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بہت زبردست طریقے سے فٹ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا قد و قامت بہت لمبا تھا۔ جسم بھی اسی مناسبت سے چوڑا چکلا تھا۔ بہر حال اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ مسلسل سلطان چچا سے منسلک رہا ہے اور اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ بمبئی بڑی عجیب جگہ تھی۔ سیدھے سادھے سپاٹ میدان میں ہر طرف آدمی ہی آدمی۔ نہ جنگل نہ پہاڑ۔ مزا نہیں آیا تھا۔ بہر حال اس نے بتایا کہ اسکندریہ میں اس کا دل لگ گیا ہے۔ میں نے اسے وہ واقعات یاد دلائے جو شکار کے دوران پیش آئے تھے تو وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔

''بس خاقان! زندگی اسی کا نام ہے۔ ویسے میں سچ بتاؤں تمہیں، انسان کو جو کچھ مل جاتا ہے وہ اسے سچ مچ تسلیم نہیں کرتا۔ آج یاد کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سیتا گڑھی میں جو مزے تھے وہ کہیں اور نہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ سیتا گڑھی ہمیشہ یاد آتا ہے۔''

''ہاں یقیناً۔ ویسے میں تمہیں دیکھ کر واقعی خوش ہوا ہوں۔ ایک لمحے کے لئے تو میں تمہیں پہچان بھی نہیں سکا۔ مجھے معاف کرنا، اصولی طور پر تو تمہیں اب ایک بوڑھا آدمی ہونا چاہئے تھا۔ مگر تم نے تو جیسے دوسرا جنم لیا ہے۔''

پھر ہم نجانے کیسی کیسی باتیں کرتے رہے۔ بچپن میں ہمارے ایک اور ساتھی تھے، یہ سلطان چچا کا بھتیجا تھا اور اسے پرنس کہا جاتا تھا۔ پرنس بہت پرخلوص اور پینترے باز، لڑکیوں کے معاملے میں انتہائی ناقابل اعتبار اور خوش باش بلکہ مست آدمی تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر سے لڑکیوں کے چکر میں رہنے لگا تھا اور ابھی تک وہی عیش و عشرت ہو رہی تھی۔

یزدانی نے کہا۔ ''مگر کمال کی شخصیت تھی یہ پرنس بھی۔''

''کہاں ہے آج کل؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیا بتائیں بس کہاں ہے۔''

''کیوں خیریت، کیا ہوا؟''

''بڑی لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت سناؤں گا۔ ویسے پرنس قاہرہ میں ہیں اور مزے کر رہے ہیں۔ میرا مطلب مصر میں ہی ہیں۔''

پرانی باتیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔ جب یزدانی نے مجھ سے اس بارے میں سوال کیا تو میں نے اسے مختصراً بتایا کہ میں بھی اپنے دشمن سے ایک پرانا حساب چکانے آیا ہوں۔

''دشمن...... بدلہ؟'' یہ الفاظ سن کر یزدانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہاں۔''

''قصہ کیا ہے؟''

''بس میرا ایک دوست پروفیسر احتشام بے قتل ہو گیا تھا۔'' پھر میں نے اسے فولادی تختی کی چوری اور اسکندریہ کے میئر ہشمان ذکری کے ساتھ ہیگ کے فرار کی تفصیلات بتا دیں۔ یزدانی خاموشی سے یہ واقعات سنتا رہا۔ ذکری کے نام پر وہ چونکا اور پوچھنے لگا۔

''اسکندریہ کا میئر ذکری، وہ جو خوبصورت سوٹ پہنتا ہے اور فرنچ کٹ داڑھی ہے؟ ایک آنکھ کا چشمہ لگاتا ہے اور موٹا تازہ ہے؟''

''بالکل وہی۔''

''کیا اس نے جہاز کے آدمیوں سے کہا تھا کہ وہ اسکندریہ کا میئر ہے؟''

''ہاں۔''

یزدانی نے ایک زبردست گالی دی اور پھر بولا۔ ''وہ میئر ویئر کچھ نہیں ہے، اسمگلر ہے حرامی ایک نمبر کا اور یہاں قاہرہ میں اس کا منشیات کا بہت بڑا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ محلوں میں رہتا ہے۔ ایک محل اس کا اسکندریہ میں ہے اور قاہرہ میں ایک عالی شان ہوٹل ہے۔ ویسے ہے بڑا با اثر اور خبیث آدمی۔ نجانے کتنے افراد کو قتل کر چکا ہے۔ پولیس اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ باقاعدہ پولیس کو بھتہ دیتا ہے وہ۔ خیر، کوئی ایسی بات نہیں۔ اللہ کا فضل ہے، ہمارا بھی یہاں ایک باقاعدہ گروہ ہے۔ ہشمان ذکری جیسوں کو اڑا کر رکھ دیں گے۔''

''یزدانی بھائی! میں ہشمان ذکری پر نہیں بلکہ براہِ راست ہیگ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں اور اس سے پہلے وہ تختی حاصل کرنا چاہتا ہوں جو یہ دونوں جہاز سے چرا کر لائے ہیں۔''

یزدانی کچھ دیر سوچتا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ خود پتہ نہیں کون کون سے دھندوں میں پھنسا ہوا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے وہ اسکندریہ میں دشمنیاں بڑھا لے۔ اور پھر یہ اصول کی بات تھی کہ ہیگ میرا دشمن تھا، مجھے خود ہی اپنا حساب چکانا چاہئے۔ اور یہ الفاظ میں نے یزدانی سے کہے تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا، پھر بولا۔

''بات اصل میں یہ ہے خاقان صاحب! کہ وقت انسان کو کتنا ہی تبدیل کر دے، اگر

اس کے اندر ظرف ہے تو وہ اپنا ماضی نہیں بھول سکتا۔ آپ کا دشمن میرا دشمن ہے۔ آپ بڑے گھر کے آدمی ہیں۔ میں تو آپ کا ملازم تھا لیکن آپ نے مجھے دوست بنایا ہے تو دوستی کا حق بھی ادا کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہیگ ہشمان ذکری کے ساتھ ہی ہو گا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ کریں گے۔''

''ایک بات اور رحمان یزدانی! میں پروفیسر احتشام کے ساتھ ہی اس انگریز جوڑے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسکندریہ میں ایسے ہوٹل کم ہی ہیں جن میں غیر ملکی ٹھہرتے ہیں۔ ہم انہیں چند ہی گھنٹوں میں تلاش کر لیں گے۔''

''میں یہی چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔''

یزدانی کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک اس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ وہ کسی خاص خیال کے تحت مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوال کیا۔ ''خاقان! آپ نے داڑھی کتنے عرصے سے رکھی ہوئی ہے؟''

''پہلے میں کلین شیو رہتا تھا۔ بس ذرا تھوڑی سی گڑبڑ کے بعد یہ حلیہ اختیار کیا تھا۔''

''جہاز پر ہیگ نے آپ کو پہچانا تو نہیں تھا؟''

''جہاز میں، میں شاہی بحریہ کے لیفٹیننٹ کی وردی میں تھا اور داڑھی نے میرا حلیہ مکمل کر دیا تھا۔ میں چشمہ بھی پہنتا تھا۔ اس کے علاوہ ہیگ سے میرا سامنا بھی بہت کم ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس عرصے میں اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔'' میں اسے بتا رہا تھا اور وہ میری صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلائی اور بولا۔ ''ابھی آتا ہوں۔''

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شیونگ کٹ اور بڑا سا آئینہ تھا۔

''یہ......''

''ہاں، اسے صاف کر دو۔''

''مگر اس سے ایک مسئلہ ہے۔''

''کیا؟''

''وہ مجھے خاقان کی حیثیت سے پہچان لے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم تمہیں اس حیثیت سے نہیں پہچانا جائے گا جو تمہاری

موجودہ حیثیت ہے۔ امیگریشن پولیس بھی جو تمہارے جہاز سے اچانک فرار ہو جانے کی وجہ سے تمہاری تلاش میں ہو گی، تمہیں شناخت نہیں کر سکے گی۔ اس طرح تم اسکندریہ میں آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔“

”او کے.....“ میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک بار پھر میں بغیر داڑھی کے نظر آنے لگا۔ مجھے خود اپنا وجود ہلکا پھلکا اور ایک عجیب سی کیفیت کا حامل محسوس ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ بہر حال یہ بہتر ہے۔

”اب ایسا کرو کہ کم از کم دو گھنٹے آرام کرو۔ اس کے بعد باہر نکلیں گے۔ آؤ میں تمہیں تمہارے آرام کی جگہ دکھا دوں۔“

جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا تھا وہ بھی ہر لحاظ سے ایک آرام دہ کمرہ تھا۔ بستر پر لیٹ کر بہت سی یادیں ذہن سے گزرنے لگیں۔ لیکن میں نے اپنی قوتِ ارادی کا ساتھ حاصل کر کے نیند کو اپنے قریب بلا ہی لیا تھا۔

※☆※

دو گھنٹے تک آرام کے بعد خود یزدانی نے مجھے جگایا۔ وہ خود بھی لباس وغیرہ تبدیل کر چکا تھا۔ اس نے میرے لئے بھی لباس کا بندوبست کر دیا تھا۔

بہر حال تیاریاں ہوئیں اور ہم عمارت کے دوسرے رُخ پر روشن سیڑھیوں سے اتر کر چوڑی گلی میں پہنچے جس میں پتھروں کا فرش کیا گیا تھا۔ یزدانی کے مکان کے سامنے ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی موٹر کار کھڑی تھی اور وہی پراسرار سیاہ فام ملازم ایک کپڑے سے گاڑی کے شیشے چمکا رہا تھا۔

”واہ...... یہ کار شاندار ہے۔“

”بس اس سلسلے میں آپ یوں سمجھئے کہ سلطان صاحب نے میری بھرپور مدد کی ہے۔ ویسے کبھی کبھی پرنس بھی اسکندریہ آ جاتے ہیں اور وہ بھی دو چار دن کے لئے۔ لیکن جب بھی آتے ہیں کسی لڑکی وڑکی کے چکر میں آتے ہیں۔“

میری زبان پر ایک لمحے کے لئے یہ الفاظ آنے لگے کہ میں پوچھوں کہ آخر ان لوگوں کا دھندا کیا ہے مگر اس وقت یہ مناسب نہیں تھا۔ مجھے سب سے پہلے مسٹر اور مسز اسمتھ کی تلاش تھی جو کم از کم مجھے یہ بتا سکتے تھے کہ جہاز سے میرے فرار ہونے کے بعد کیا حالات پیش آئے۔

آخر کار یزدانی نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور ہم پیچ در پیچ راستوں سے گزرنے لگے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پوری بستی میں یزدانی کے مکان جیسا اور کوئی شاندار مکان نہیں تھا۔ ویسے پختہ مکانات بھی تھے، پتھر کی عمارتیں بھی دو تین نظر آئیں لیکن وہ قلعہ نما مکان جس میں، میں نے پناہ لی تھی سب سے مختلف تھا۔ بہت ہی بلند و بالا اور شاندار حیثیت کا مالک۔ کچے مکانات اور جھونپڑیاں بے شمار تھیں۔ گلیوں میں نیم برہنہ سیاہ فام حبشی اور مصری بچے لمبے لمبے کرتے پہنے دوڑتے پھر رہے تھے۔ یزدانی کی گاڑی دیکھ کر بچوں کا ایک غول پیچھے لگ گیا۔ وہ نجانے کیا کیا چیخ رہے تھے۔ یزدانی ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں جواب بھی دے رہا تھا۔ پھر کسی اور چوراہے سے کچھ اور لڑکے اس ہجوم میں آ ملتے، کچھ پیچھے رہ جاتے۔ غرض یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ کھجور کی چٹائی کے سائبانوں کے نیچے لوگ ٹوکریاں اور مٹی کے برتنوں میں سودا سلف سجائے بیٹھے تھے۔ یہ ماہی گیروں کی اس بستی کا بازار تھا۔ مکھیاں، شور، گرد و غبار۔ ویسے یہ بستی خاصی غربت زدہ لگ رہی تھی۔ یزدانی کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اسکندریہ کی گنجان بستیوں کی سیر کرا رہا ہو۔ ویسے مصر کے اس علاقے میں بے پناہ غربت تھی۔

آخر کار ماہی گیروں کی بستی ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گرد و غبار، مچھلی کی بو اور گھٹن کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اب ہماری کار کشادہ سڑکوں سے گزرتی ہوئی اسکندریہ کی نئی بستی سے گزر رہی تھی۔ یہاں موٹر کاریں، گھوڑا گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں شانہ بشانہ چل رہی تھیں۔ مصری اور مغربی لباس پہنے مقامی لوگوں کے ہجوم آہستہ روی کے ساتھ سڑک کے کنارے آ جا رہے تھے۔ اسکندریہ کا یہ علاقہ خاصا اچھا لگا۔ مصر کی تیز دھوپ سے سنگلائے ہوئے چہرے کوئلے کی طرح سیاہ چمکدار، کھلے ہوئے گندمی رنگ کے چہرے اور سفید فام چہرے جو مصری بھی تھے اور مغربی ملکوں سے آئے ہوئے آباد کار بھی، بھانت بھانت کے لباس پہنے ہوئے لوگ۔

آخر کار یزدانی نے ایک شاندار ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی اور پھر بڑی دیر کے بعد خاموشی ٹوٹی۔ ”خاقان! آپ یہاں ٹھہریں، میں یہاں آپ کے دوست ہنری اسمتھ اور اس کی بیوی کا پتہ کر کے آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے بعد میری نگاہیں قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا عجیب و غریب وقت گزر رہا ہے۔ ہر لمحہ نئی حیثیت کا

حالِ، ہر لمحہ عجیب و غریب کہانیاں لئے ہوئے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے، قسمت کے کھیل ہوتے ہیں یہ۔

تھوڑی دیر کے بعد یزدانی واپس آ گیا اور میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ''نہیں، وہ لوگ یہاں نہیں ہیں۔ آئیے، دوسرے ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

بہرحال ہم ایک اور شاندار ہوٹل میں پہنچ گئے جس کے دروازوں پر باوردی دربان مجسموں کی طرح منجمد تھے۔ شام ہونے والی تھی اور مقامی لوگ لمبی لمبی کاروں اور بگھیوں سے اتر اتر کر آ رہے تھے۔ ہماری کار اس ہوٹل کے سامنے آ کر رکی تو ایک لمبا تڑنگا دربان لپکا اور دروازہ کھول کر جھکا۔ اس نے بڑے ادب سے یزدانی کو سلام کیا تھا۔ یہ کوئی عام سلام نہیں تھا، اس کا مطلب تھا کہ یزدانی یہاں کے مستقل گاہکوں میں ہوگا۔ اس نے گھسے ہوئے پختہ مصری لہجے میں اس سے کوئی بات کی اور اس کے بعد اندر داخل ہونے لگا۔ لیکن پھر اچانک ہی رک کر اس نے مصری دربان سے کہا۔

''یہاں ایک انگریز جوڑا آیا ہوا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسٹر ہنری اسمتھ اور مسز اسمتھ آج ہی ہندوستان سے یہاں پہنچے ہیں۔''

ہنری اسمتھ کے نام پر دربان ذرا جھکا اور بولا۔ ''میں ہوٹل کے مرکزی ہال سے ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔''

''بہت شکریہ۔'' یزدانی نے کہا اور وہ شخص یزدانی کی بات معلوم کرنے کے لئے چل پڑا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر بولا۔

''وہ لوگ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ کمرہ نمبر سات سو چھ۔ اور کوئی حکم آقا؟''

''بہت بہت شکریہ۔''

''لیکن وہ اس وقت موجود نہیں ہیں اور کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ آرام سے تشریف رکھئے، میں آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔''

یزدانی نے اس کی محنت کا معاوضہ ادا کیا اور کچھ رقم ادا کی جسے جیب میں رکھ کر اس نے سلام کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ ہم مرکزی ہال سے ملحقہ لیونگ روم میں پہنچ گئے۔ یزدانی نے کافی منگوالی اور ہم دونوں مسٹر اور مسز اسمتھ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ اسکندریہ پر بحیرہ روم کی شاندار شام اتر رہی تھی۔ خاصی رونق تھی۔ دوہری ٹھوڑیوں والے آفندی تھل تھل کرتے جسموں پر نئی تراش کے سوٹ چڑھائے سرکاری حکام، سرخ بنات کی ترپوش پہنے یا

سیاہ بالوں کو تیل سے چپکائے غیر ملکی پرفیوم کی خوشبوئیں اڑاتے ہوئے ہر طرح کے لوگ یہاں آ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ گٹھے ہوئے جسموں والی یہودی اور ترک حسینائیں تھیں جو فرانسیسی انداز کے بھڑکیلے اور سنجیدہ لباس پہنے یورپین عورتوں سے زیادہ یورپین بنی ہوئی بات بات پر اترا رہی تھیں۔

ہم دونوں بہت دیر تک یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر جب وہاں سے اکتاہٹ ہوئی تو باہر نکل آئے۔ یزدانی نے کاؤنٹر پر جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ سات سو چھ کے مہمان ابھی تک واپس نہیں آئے۔ چنانچہ ہم دونوں وقت گزاری کے لئے باہر نکل آئے اور اسکندریہ کی روشنی دیکھنے لگے۔ رحمان یزدانی تو اس ہنگامہ خیز بندرگاہی شہر کے ماحول میں اس قدر رچ بس گیا تھا جیسے پانی میں مچھلی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کافی مقبول حیثیت کا شخص ہے۔ قیمتی لباس اور ہیرے جڑی انگوٹھیاں پہنے کتنے ہی مصری باشندے اسے پہچان کر لپکتے اور مصافحہ کرتے۔ کوئی آدھے ہی گھنٹے میں درجن بھر ملاقاتیوں سے صاحب سلامت ہوئی۔ تین چار نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت بھی دی اور اسے سگار پیش کئے۔ بھڑک دار کپڑوں میں ملبوس بنی سنوری کئی مصری، یہودی اور ترک حسینائیں اٹھلاتی ہوئی آئیں اور رحمان یزدانی سے ایک آدھ فقرہ کہہ کر اور ایک آدھ فقرہ سن کر تتلیوں کی طرح پر مارتی ہوئی گزر گئیں۔ تب رحمان یزدانی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''آپ کو تو یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہوگا۔ اصل میں اس طرح کے ہوٹل ایسی عورتوں کا زبردست اڈا ہوتے ہیں۔ یہ جو بے شمار چڑھی مونچھوں والے مرد اور سرخ، سنہری اور سیاہ لٹوں والی عورتیں نظر آ رہی ہیں، ان کے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ پر نہ جائیے، ان میں کتنی ہی عورتیں ان بڑی مونچھوں والے دلالوں کے قبضے میں ہیں۔ چار چار چھ چھ گھوڑوں کی بگھیوں میں آنے والی کتنی ہی خواتین رات ڈھلے یہاں سے گاہک پھانس کر اپنے عالیشان محلوں کی خلوتوں میں لوٹ جاتی ہیں اور ان پر خرچ کئے ہوئے قیمتی کھانوں، شراب اور دوسری چیزوں کا پورا پورا حساب وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ سے کہوں، یہ مصر کا اصل چہرہ نہیں ہے، یہ ایک بندرگاہی شہر کا سب سے بڑا ہوٹل ہے اور کسی بندرگاہی شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں اس شہر کے اور ملک کے نمائندہ لوگ نہیں پہنچتے۔ مصر کے کسان، سپاہی، عالم، دانشور اور اہل دل نیم تاریک گھروں میں اس نامراد شہر پر شام اترتی ہوئی دیکھتے ہیں اور صبح کے سورج کی لو لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تو سطح نیل پر بہتا ہوا کچرا

ہے جو مدتوں یورپ کے کونوں کھدروں میں سڑتا رہا، پھر نیل کے مقدس پانی پر آٹھہرا اور اگلے سیلاب تک سڑتا رہے گا۔ مگر یقین کیجئے خاقان! مصر دریائے نیل کی ایک ایسی انگڑائی کا انتظار کر رہا ہے جو بین الاقوامی غلاظت کا یہ انبار بحیرہ روم کو لوٹا دے گی۔ مصری ملاحین اور مصری عالم اور مصری سپاہی اور مچھیرے اس زندہ سرزمین کی عظمت کو واپس چھین لیں گے۔ یہ تمام خوبصورت دلّے اور یہ نرم و نازک فاحشائیں اگلے سیلاب کے بعد دیکھنے تک کو نہیں ملیں گی۔ انہیں آج رات جی بھر کر دیکھ لیجئے اور ویسے اگر دل کو لگے تو حکم کیجئے، وہ چھ فٹا دربان جسے میں نے ابھی تھوڑے سے نوٹ دیئے ہیں، آپ کے انگریز دوستوں کے آنے تک اسے کسی کمرے میں پہنچا دے گا اور کمرے کو باہر سے مقفل کر دے گا۔ ابھی ملاحظہ کر لیجئے، جی چاہے تو فرصت سے کھائیے۔ جیسا آپ پسند کریں۔'' اس کی آواز کی تلخی کو میں نمایاں طور سے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔

''رحمان یزدانی! آپ کو بزرگ کہنے کو تو دل نہیں چاہتا لیکن آپ کے لہجے کی تلخی کا کچھ اندازہ ہے مجھے۔ کیا کہنا چاہتے ہیں، براہِ کرم صاف الفاظ میں کہیے۔''

''خاقان! میں نے اتنی مختصر زندگی میں یہاں کے لاتعداد رنگ دیکھے ہیں۔ تین بار میں گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا ہوا ہوں اور اب یہی فیصلہ کیا ہے میں نے بلکہ یہ میرا بہترین تجربہ ہے کہ ہماری چھوٹی سی سیتا گڑھی اس کائنات کا سب سے حسین علاقہ ہے۔ وہاں نیکیاں بستی ہیں۔ میری سیتا گڑھی ایسے ہزاروں بین الاقوامی شہروں سے لاکھ درجے اچھی ہے۔ یہاں فاحشائیں آپ کا قیمتی لباس دیکھ کر آپ سے ٹکراتی ہوئی، قہقہے مارتی ہوئی گزرتی ہیں۔ میری سیتا گڑھی میں ماں بہنیں سر پر چادر ڈال کر کبھی کام سے گلیوں میں نکلتی ہیں تو بڑے سے بڑا بدترین انسان دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے کہ میری ماں، میری بیٹی، میری بہن گزر جا یہاں سے۔ ہم تیرے گاہک نہیں، تیرے محافظ ہیں۔ دنیا ہمیں پسماندہ ملک کا شہری کہتی ہے لیکن ہمارے ہاں ابھی انسان زندہ ہیں۔ انسان تو یہاں بھی ہیں مگر برائیوں نے انہیں یرغمال بنا لیا ہے۔ بس کیا کہا جائے۔ تم دل ہی دل میں ہنس رہے ہو گے خاقان! اور سوچ رہے ہو گے یہ شخص کتنی پارسائی کی باتیں کر رہا ہے۔ تمہیں خود بھی اندازہ ہو گا کہ میں یہاں مسواک اور وضو کے لوٹے نہیں بیچتا، حشیش اور کوکین سپلائی کرتا ہوں جو یورپ کے بازاروں میں اور فاحشاؤں کے اڈوں پر پہنچتی ہے اور میں اس کی رقم وصول کرتا ہوں۔ میں بھی ثواب نہیں کما رہا، عذاب جھیل رہا ہوں۔ مگر اتنا جانتا ہوں میں کہ

چمکدار مونچھوں والے دلال اور لال سنہری زلفوں والی طوائفیں کچھ ہی دن کے مہمان ہیں۔ آخر میں وہی لمبے کرتوں والے نیم برہنہ بچے جو ماہی گیروں کی بستی میں ہماری موٹر کے ساتھ دوڑ رہے تھے ان شہروں کو ان گندگیوں سے پاک کریں گے اور انہیں آباد کریں گے۔ خاقان! میں جان بوجھ کر اس مکان میں رہتا ہوں کیونکہ ابھی تک مجھے اپنا وہ کچی اینٹوں کا مکان یاد ہے جہاں میرے ماں باپ نے دم توڑا تھا۔ وہ ٹیڑھی میڑھی گلیاں میری زندگی کی سب سے بڑی یادگاریں ہیں جن میں دس برس کا رحمان یزدانی روتا ہوا گزرتا تھا۔ وہ ایسی ہی کوئی بستی تھی جس میں، میں رہتا ہوں۔ بس میں نجانے کہاں سے کہاں روتا ہوا چلا جاتا تھا اور ایک دن میں روتا ہوا جا رہا تھا کہ جب سلطان صاحب مجھے ملے اور دعائیں دوں انہیں، میرے پاس تو دعاؤں کے لئے بھی الفاظ نہیں ہیں، وہ مجھے پرانی گاڑی سے اتر کر دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا، میرے گاؤں کا نام پوچھا اور جب میں نے اپنی کچی اُردو میں انہیں بتایا کہ میرے ماں باپ کو کسی نے مار ڈالا ہے اور میرا کوئی وارث نہیں ہے تو انہوں نے میرے ماں باپ کے قاتلوں کو ماں کی گالی دی تھی اور مجھے گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ تھرمس کی بوتل سے گرم چائے انڈیل کر مجھے پلائی تھی اور کہا تھا، رحمان بیٹا! روتا کیوں ہے؟ تو مرد ہے سالے! اور مرد رویا نہیں کرتے۔ چل میرے ساتھ، میں تیرے اندر کی کیفیت خوب سمجھتا ہوں۔ تو میرے ساتھ چل...... چل میرے ساتھ۔''

رحمان یزدانی کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں نجانے کیسی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جس شخص کے ساتھ میں نے اپنے بچپن کا ایک اچھا خاصا وقت گزارا ہے وہ اندر سے ایک انوکھی کہانی کا شکار ہے۔ یہ وقت اور انسانوں کا ایسا سماں رکھتا ہے۔ اس شخص نے زندگی کے ایسے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ نجانے کیوں ایک لمحے کے لئے میرے دل میں اس کے لئے بے پناہ محبت کا احساس ہوا۔ ہم لوگ ٹیرس پر جھکے ہوئے خاموشی سے جگمگاتے ہوئے اسکندریہ اور لمحہ لمحہ مرتی اور زندہ ہوتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ہوٹل کا وہی ملازم ہمارے پاس پہنچ گیا اور اس نے گردن خم کر کے کہا۔

''مسٹر اسمتھ تو ابھی نہیں آئے لیکن ان کی مسز، سلام نوری کے ساتھ ابھی ابھی بار میں آ کر بیٹھی ہیں۔''

''سلام نوری؟'' رحمان یزدانی کے منہ سے نکلا۔ مصری دربان یہ اطلاع دے کر چلا گیا

تھا۔ میں جن حالات کا شکار تھا ان کا تقاضا تھا کہ میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ سلام نوری کوئی ایسی شخصیت نہ ہو جو میرے لئے نقصان دہ بن جائے۔ پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے اسکندریہ کی پولیس مجھے تلاش کر رہی ہو گی۔ لیکن مسز اسمتھ سے ملاقات کرنا بھی ضروری ہے۔ میں نے رحمان یزدانی سے کہا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا مشورہ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا مسز اسمتھ سے اس وقت ملنا مناسب ہو گا؟ ویسے سلام نوری کے بارے میں کیا کہتے ہو، کیا یہ شخص پولیس کا آدمی ہے؟''

''سلام نوری۔ اگر یہ پولیس کا آدمی ہے تو میں یقیناً اس کو جانتا ہوں گا۔ ایسا کرو یہاں رُکو، میں دربان سے پوچھتا ہوں وہ لوگ کہاں بیٹھے ہیں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میں نے بائیں سمت دیکھا، اس طرف باتھ روم بنے ہوئے تھے اور باتھ روم کے دروازے سے جو کوئی باہر نکلا تھا اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ہنری اسمتھ تھا جس کی حالت بہت خراب نظر آ رہی تھی۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس پر بے پناہ شکنیں تھیں۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو گئی تھی، کالر کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ ویسٹ کوٹ کے نیچے سے قمیض کا دامن باہر نکلا ہوا نظر آیا۔ میں پھرتی سے اٹھا۔ رحمان یزدانی ابھی دور نہیں گیا تھا، مجھے دیکھ کر رکا۔ میں نے آگے بڑھ کر ہنری اسمتھ کا ہاتھ تھاما تو وہ آہستہ سے بولا۔

''چھوڑ دو مجھے...... میں کہتا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو۔''

اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اُڑ رہے تھے اور اس کی آنکھوں کا خالی خالی پن بتاتا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ اس کی پتلیاں سکڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں بے نور تھیں۔ میں نے نرمی سے اسے آواز دی۔

''ہنری! مجھے پہچانتے نہیں ہو؟''

''کسی کو نہیں جانتا میں اس کائنات میں۔ پوری کائنات میں کسی کو نہیں جانتا۔''

رحمان یزدانی میرے قریب آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''کون ہے یہ؟''

''یہی ہنری اسمتھ ہے۔''

''اوہ......'' رحمان یزدانی نے سر ہلایا اور پھر اس نے ہنری اسمتھ کے شانے پر ہاتھ رکھا

اور اسے تقریباً دھکیلتا ہوا باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میں بھی ان دونوں کے ساتھ باتھ روم میں آ گیا تھا۔ رحمان یزدانی نے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔

''تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو...... واقعی تم بھی مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔ کمال ہے، سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ سب مجھے لوٹتے رہتے ہیں۔ میرے پاس اب ایک دھیلا بھی نہیں ہے، میں نے اپنی گھڑی وارمین کو دے دی ہے۔ میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں۔ پیسے تو کبھی ہوتے ہی نہیں ہیں۔ وہ کتیا کی بچی مجھے پیسے نہیں دیتی۔ جانتے ہو نا وہ کتیا کی بچی کون ہے۔ میری بیوی، میری بیوی۔''

بہر حال یہ عجیب و غریب صورتحال تھی۔ شراب کے نشے میں انسان سچ بولتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہنری اسمتھ کی بیوی نے اس کو بڑا کنگال کر کے رکھا ہوا ہے۔ بہر حال یہ میاں بیوی میرے دوست اور ہمدرد تھے۔ ہیگ کے خلاف میں نے جو محاذ بنایا تھا وہ اس کا حصہ تھے۔ ہنری کو یہ سمجھانا بڑا مشکل کام تھا کہ ہم چور اچکے نہیں ہیں۔ بہر حال بڑی کوششوں سے یہ کام سرانجام دیا گیا اور ہنری کسی قدر رام ہو گیا۔ اس نے خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ رحمان یزدانی نے گرم پانی میں تولیہ بھگو کر اسمتھ کا منہ دھلایا، لباس درست کر کے اس کے بال سنوارے۔ وہ کھڑا کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ شخص بہت بیمار ہے۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا اور بولا۔

''ہنری! میں لیفٹیننٹ ہوں، تمہارا دوست! ہم ایک ہی جہاز میں بمبئی سے آئے تھے۔ میں نے داڑھی صاف کر دی ہے۔ ہم دوست بن گئے تھے اور تم لوگوں نے مجھے پروفیسر احتشام کے منصوبے میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ یاد آیا کچھ؟''

اس کی پتلیاں پھیلنا شروع ہو گئیں اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ارے ہاں...... ہاں تم...... تم تو وہ ہو، خاقان جمشیدی...... خاقان جمشیدی۔''

میں بری طرح چکرا کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ جہاز پر میرے اصل نام سے اس سے بات چیت نہیں ہوئی تھی بلکہ میں خالی لیفٹیننٹ ہی کہلاتا رہا تھا۔ اسے میرا اصل نام کیسے معلوم ہوا؟ میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''یہ نام تمہیں کس نے بتایا...... بولو، میرا یہ نام تمہیں کس نے بتایا؟''

وہ خوف سے کانپنے لگا اور پھر بولا۔ ''جانے دو، پلیز مجھے جانے دو۔ چھوڑ دو مجھے۔''

میں اس کے کان کے قریب ہو گیا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہنری اسمتھ! پلیز مجھے اس نام کے بارے میں بتاؤ۔ تمہیں یہ نام کس نے بتایا؟''

وہ آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کا ذہن جیسے اب تک دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ ''کیا تم خاقان نہیں ہو؟''

''میں کہتا ہوں تم یہ نام کیوں لے رہے ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم نے کس سے یہ نام سنا؟ کس نے بتایا تمہیں یہ نام؟ اور اگر تم یہ بات نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں یہ نام کس نے بتایا تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں یہیں اسی باتھ روم میں گردن دبا کر مار دوں۔''

اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے۔ اور پھر اس نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''اُسی نے...... اُسی نے بتایا تھا۔''

''کس نے......؟'' میں غرایا۔

''اُسی نے۔ وہ اس وقت بھی میری بیوی کے ساتھ بار میں بیٹھا ہوا ہے۔''

میرے ذہن میں پھر ایک بار چھناکا ہوا تھا اور رحمان یزدانی بھی چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا تھا۔ چونکہ مصری دربان نے ابھی کسی سلام نوری کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ شخص بھی شاید اسی کا ذکر کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''کون ہے وہ...... کیا نام ہے اس کا؟''

''سلام...... سلام...... سلام نوری۔ مگر تم دیکھ لینا میں اس کتے کو قتل کر دوں گا۔ اس نے میری بیوی مجھ سے چھین لی ہے۔ اور مجھے ترسا دیا ہے۔ تم دیکھنا میں قتل کر دوں گا اسے۔''

''بیوی چھین لی ہے؟''

''ہاں اس نے مجھے ترسا دیا ہے۔ میں نے خوشامد بھی کی، غصہ بھی کیا۔ مگر اس کے دل میں تمہیں معلوم ہے یہ لت اسی نے لگائی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے اس کا عادی کر دیا اور اب اتنی سی بات پر......''

ہنری اسمتھ ہانپنے لگا۔ وہ واش بیسن کا سہارا لئے جھول رہا تھا۔ رحمان یزدانی اس کی بے ربط باتیں غور سے سنتا رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ لگا کر ہنری کا چہرہ اوپر اٹھایا، پھر دوسرے ہاتھ سے کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح اس کے پپوٹے اٹھا کر دیکھے، پھر آستین الٹ کر بازو دیکھا۔ ہنری نے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تب رحمان یزدانی نے ہنری کے کان کی طرف منہ لے جا کر کہا۔

''مسٹر اسمتھ! وہ روزانہ تمہیں کتنی دیتا ہے؟''

''کتنی......'' ہنری اسمتھ نے کھڑے کھڑے جھولتے ہوئے جیسے رحمان یزدانی کو پہلی بار دیکھا، پھر ڈوبتی آواز میں بولا۔ ''صرف دو وائل۔''

''دو وائل؟'' رحمان یزدانی نے حیرت سے کہا۔

''ہاں صرف دو وائل۔'' وہ مدھم لہجے میں بولا۔

''تمہیں کب سے نہیں ملی؟''

''جہاز پر دی تھی اور بس۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے رحمان یزدانی کی طرف دیکھا۔ ''پتہ نہیں کیا چکر ہے رحمان۔''

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے یہ شخص مارفین کا عادی ہے۔ کہتا ہے سلام نوری نے اسے اس نشے کی لت لگائی ہے اور شاید اس کی بیوی سے تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ سفر کے دوران وہ اسے مارفین دیتا رہا ہے لیکن اب کسی وجہ سے بند کر دی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی یہ حالت ہے۔''

میرے ذہن میں بجلی کے کوندے لپکنے لگے۔ یہ شخص سلام نوری جو کچھ بھی ہے، اگر جہاز پر ہمارے ہی ساتھ آیا ہے تو اسے بھی ساری باتیں معلوم ہوں گی۔ مسز اسمتھ چالاک عورت ہے اور اس نے اس کو بھی اس مسئلے میں الجھا لیا ہوگا۔ مسز اسمتھ سے اگر اس کا کوئی معاملہ ہے تو ہیگ کے قبضے سے فولادی تختی حاصل کرنے میں یقیناً وہ مسز اسمتھ کی مدد کر رہا ہوگا۔ بہرحال مجھے اس نشے باز اسمتھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے رحمان یزدانی سے کہا۔

''اگر تم چاہو تو اسے سنبھالو، میں ان دونوں کے پاس جاتا ہوں اور جہاز کے حالات معلوم کرتا ہوں۔'' پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ یہ شخص یعنی سلام نوری میرا اصل نام جانتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس نے یقیناً مجھے ہندوستان میں اور پھر جہاز پر دیکھا ہوگا۔ اسے ضرور معلوم ہوگا کہ میں جہاز سے فرار ہوا ہوں اور اسکندریہ کی پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے۔ ان معلومات کے ساتھ یہ آدمی میرے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ لیکن اسمتھ کا دوست ہونے کی وجہ سے اسے ہیگ کے خلاف مؤثر طور پر استعمال بھی تو کیا جا سکتا ہے۔

میں شدید کشمکش کا شکار تھا اور رحمان یزدانی میری صورت دیکھ رہا تھا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں سن گن لوں گا۔ میں نے رحمان یزدانی کو تفصیل سے ساری باتیں بتائیں

اور رحمان یزدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ہو سکتا ہے۔ مگر پتہ نہیں یہ شخص کون ہے۔''

اس نے مسٹر اسمتھ کو ایک جگہ بٹھا دیا۔ اسمتھ کی حالت بدستور خراب تھی۔ میں نے کہا۔
''جس طرح اس مصری شخص نے سلام نوری کا نام لیا، اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔''

''مگر پتہ نہیں میں اسے کیوں نہیں جانتا۔ اس نام کا کوئی شخص پہلے کبھی اسکندریہ میں نہیں دیکھا گیا۔ میں یہ نام پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔ اگر یہ مارفین، حشیش وغیرہ سے متعلق ہے تو میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔''

''تو پھر ایسا کرو کہ پہلے تم اسے دیکھ لو اور اپنا اطمینان کر لو۔ اس کے بعد میں اس سے مل لوں گا۔''

''ہاں، یہی مناسب ہے۔ تم یوں کرو کہ اس کے پاس ٹھہرو، میں اسے جا کر دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر یزدانی مجھے اور اسمتھ کو باتھ روم میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس عرصے میں ہنری اسمتھ سے اور پوچھ گچھ کر لی جائے۔ میں نے اس سے بہت سے سوالات کئے مگر اس کی کیفیت خاصی خراب تھی۔ بہت جھنجھوڑنے اور چیخ پکار کرنے پر اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور نیند اور ٹوٹتے ہوئے نشے کے عالم میں کہا۔

''کہیں سے مجھے ایک ہی وائل لا دو۔ میں مر رہا ہوں۔ مر جاؤں گا۔'' وہ اسٹول پر اس طرح ٹکا ہوا تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہ گر ہی نہ جائے۔ میں اسے تھامے کھڑا رہا اور یزدانی کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد باتھ روم کے دروازے پر مخصوص کھٹکا ہوا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ رحمان یزدانی اندر آیا تو سخت ہیجان کے عالم میں تھا۔ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور تیزی کے ساتھ اردو میں بولا۔

''خاقان! اسے جلدی سے یہاں سے نکال کر دوسری منزل پر کمرہ نمبر تیس میں پہنچانا ہے۔ یہ کام تم کر لو، میں ایک بیرے کو بھیج رہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ اسے لے کر وہاں پہنچو اور بیرے کے آنے تک باتھ روم کا دروازہ بند رکھو۔ او کے۔'' اس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے چلا گیا۔ میں ششدر رہ گیا تھا۔ یا الٰہی! یہ نیا کھیل کیا ہے؟ رحمان یزدانی تو بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ یہ اسے کیا ہو گیا؟ ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ چند ہی لمحوں کے بعد پھر وہی مخصوص دستک

ہوئی اور دوسری طرف سے کسی نے مصری لہجے میں انگریزی میں کہا۔
''سیّدی پاشا...... سیّدی پاشا! دروازہ کھولو۔''

ایک لمحے تک میں نے سوچا اور اس کے بعد دروازہ کھول دیا۔ ایک وردی پوش بیرہ جو انتہائی شاندار جسامت کا مالک تھا، باتھ روم میں آ گیا۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر ہنری اسمتھ کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کیا۔ اس کا ایک بازو اپنی گردن میں حمائل کیا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آہستہ آہستہ قدم چلاتا ہوا اسے باتھ روم سے باہر لے چلا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی بیرا ہے جسے رحمان یزدانی نے بھیجا ہو گا۔ ہنری اسمتھ سوتا جاگتا، کسی قدر لڑکھڑاتا بیرے کے شانے پر پورا بوجھ ڈالے چلا آ رہا تھا۔ یہی شکر تھا کہ وہ اس وقت خاموش تھا۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر پیچھے پیچھے چل پڑا۔ مرکزی ہال سے گزرتے ہوئے ہم راہداری میں پہنچے جہاں اوپری منزلوں تک سامان پہنچانے کے لئے پرانے طرز کی لفٹ لگی ہوئی تھی۔ لفٹ میں پہنچتے ہی اسمتھ نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

''میں تم سب کو جانتا ہوں۔ سب اسی کے گرگے ہو۔ آہ...... وہ اُس کے ساتھ میرے بستر میں سو رہا ہو گا۔ اور تم لوگ...... میں جانتا ہوں تم لوگ مجھے چھت پر سے دھکا دے دو گے۔ بس ایک وائل۔ تمہیں خدا کا واسطہ مجھے ایک وائل لا دو۔''

لفٹ میں اس کی بڑبڑاہٹ مجھے بڑی عجیب لگ رہی تھی اور مجھے غصہ بھی آ رہا تھا۔ میں نے اس دن پر لعنت بھیجی جس دن پروفیسر احتشام سے مڈبھیڑ ہوئی تھی اور اس منحوس انگریز جوڑے سے میرا تعارف ہوا تھا۔

بہر حال دوسری منزل کا کمرہ نمبر تیس ایک بیڈ والا کمرہ تھا۔ بیرے نے چابکدستی سے ہنری اسمتھ کا لباس تبدیل کیا اور اسے بستر پر لٹا کر کمبل سے ڈھک دیا۔ ہنری بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ اب وہ پیلا پڑ رہا تھا۔ کوکین نہ ملنے کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑتے جا رہے تھے اور ہونٹوں پر کف جمع ہو رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کئی سال سے مارفین کا عادی ہے اور شاید یہ پہلا موقع ہے کہ اسے مارفین نہیں ملی۔

بیرا خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس نے شروع سے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا سوائے اس وقت جب مجھے آواز دینے کے لئے سیّدی پاشا، سیّدی پاشا کہا تھا۔

میں خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کمرے کے دروازے

پر دستک سنائی دی اور اس دستک کا انداز مخصوص تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو رحمان یزدانی اندر آ گیا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے ہنری کی نبضیں ٹٹولیں، اس کی آنکھیں دیکھیں اور پھر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر اس نے کرسی کھینچ کر ایک طرف کی اور اس کے بعد اس پر آ بیٹھا۔

"سب کچھ...... سب کچھ وہی ہے جس کا مجھے شبہ تھا مائی ڈیئر خاقان! تمہارے خلاف کوئی زبردست سازش ہو رہی ہے۔"

"سازش؟" میں نے سوالیہ انداز میں رحمان یزدانی کو دیکھا۔

"ہاں سازش۔" وہ بدستور پُراسرار لہجے میں بولا۔ نجانے کیا معاملات تھے، اس کی سرگرمیاں میرے لئے ناقابلِ فہم تھیں۔ پھر اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور مجھے سگریٹ پیش کر کے اپنی اور میری سگریٹ سلگائی۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے مسلسل خاموش پا کر کہا۔

"کچھ تو بتاؤ مجھے۔ میں کس کیفیت کا شکار ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

"جو شخص بار میں مسز ہنری اسمتھ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے وہ سلام نوری نہیں ہے۔" رحمان یزدانی نے انکشاف کیا۔

"تو پھر......؟"

"وہ بحیرہ روم کے اس علاقے کا سب سے بڑا اسمگلر ذاکر قباشی ہے۔"

"خوب۔ ظاہر ہے میں اسے نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"ذاکر قباشی سے میری پرانی دشمنی ہے۔ کچھ تو تجارتی معاملات ہیں اور کچھ دوسرے چکر۔ کتنی ہی بار مجھے اس کے ہاتھوں شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"

"مگر میرے خلاف کیا سازش کی جا رہی ہے؟ ابھی تم نے مجھے بتایا تھا۔"

"پتہ چل جائے گا۔ پہلی بات تو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہشمان ذکری کا تعلق ذاکر قباشی سے ہے۔" رحمان یزدانی نے کہا اور میں سچی بات ہے چکرا کر رہ گیا۔ الٰہی، دنیا بھر کی مشکلات میری ہی تقدیر میں لکھی گئی ہیں؟ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ یہ شخص ذاکر قباشی تو ہنری اسمتھ اور اس کی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ اگر ہشمان ذکری کا ساتھی ہے تو یہ دونوں میاں بیوی ذکری اور ہیگ کے خلاف میری مدد کیوں کر رہے ہیں؟ نہیں یار! کچھ اور ہی گڑبڑ ہے۔ یقینی طور پر کچھ اور ہی

گڑبڑ ہے۔ میرا دماغ ان باتوں کو تسلیم نہیں کر رہا۔"

رحمان یزدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہرحال یہ معمہ حل ہو جائے گا۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہاں تمام چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں اور اس ہوٹل میں بھی اسٹاف میں میرے کارندے گھسے ہوئے ہیں۔ یہ بیرا جو ابھی ابھی اس انگریز کو لاد کر لایا ہے میرا ہی آدمی ہے۔ ابھی چند منٹ میں اپنے آدمیوں سے مجھے یہ سن گن ملی ہے۔ اس سے مجھے کچھ اور ہی شبہ ہو رہا ہے۔ بہرحال میں نے اس سلسلے میں فوری کارروائی شروع کر دی اور خود بھی ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ کیا سمجھے؟" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک ڈبہ نکالا۔ شاندار پیکنگ میں دو وائل رکھے ہوئے تھے جو یقیناً مارفین کے ہوں گے۔ رحمان یزدانی نے کہا۔ "ذاکر قباشی اور مسز اسمتھ ابھی تک یہاں موجود ہیں۔ ہم اس حرام زادے کو......" اس نے بستر کی طرف اشارہ کر کے ہنری کی نشاندہی کی اور کہا۔ "ہم اسے یہاں بند کر جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح چھپ کر قباشی کو پہچان لو۔ ہمیں اس طرح جانا ہوگا کہ وہ یا مسز اسمتھ تمہیں یا مجھے نہ دیکھ سکیں۔"

میں بہرحال شدید اعصابی کھنچاؤ کا شکار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسمگلر قباشی جو ہشمان ذکری کا ساتھی ہے آخر اس جوڑے کو کہاں سے جانتا ہے اور کیسے جانتا ہے؟ جہاز پر تو میں نے ان لوگوں کو کسی عرب کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال یہ میرے سوچنے کی باتیں تھیں اور میں درحقیقت خود اپنے بارے میں سوچتا تھا تو بھی احساس ہونے لگتا تھا کہ میں دنیا کا سب سے پُراسرار آدمی ہوں۔

رحمان یزدانی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ پھر کمرے کو مقفل کرنے کے بعد لفٹ کا انتظار کرنے لگے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر اتر کر ہم مرکزی دیوار کے ملحقہ دروازے سے بیرونی گیلری میں نکل آئے۔ یوں لگتا تھا جیسے رحمان یزدانی اس ہوٹل کے چپے چپے سے واقف ہے۔ گیلری کے نیم تاریک ماحول میں ہم ایک ایسی کھڑکی کے پاس جا کر رُکے جو اس طرف کھلتی تھی جہاں بار تھا اور بار تقریباً کھلا ہوا تھا۔ رحمان یزدانی کھڑکی کے پردے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ میں بھی اس کے برابر ہی جا کھڑا ہوا تھا۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد اس مختصر سے ہال میں، میں نے مسز اسمتھ کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ مگر وہ تنہا تھی اور اس وقت جھلمل کرتے ہوئے اس سیاہ گاؤن میں محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے۔ جہاز میں تو اس نے اپنا حلیہ کچھ عجیب سا بنا

رکھا تھا۔ میں نے اسے اتنا دل آویز کبھی نہیں پایا تھا جتنی وہ اس وقت لگ رہی تھی۔ اس وقت شاید اس نے اپنے آپ کو اس قدر دل آویز بنانے کی کوشش کی تھی۔ انتہائی حسین میک اپ تھا اس کا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی مسز اسمتھ ہے۔ اس کے بال بھی نئے انداز سے سنوارے گئے تھے اور کھلے گلے کے گاؤن میں اس کا بدن اس قدر دلکش لگ رہا تھا کہ انسانی نگاہیں اس پر سے ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ مجھے تو وہ اس وقت خود بھی بہت اچھی لگ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ جہاز پر تو ڈھیلے ڈھالے لبے اور پرانے طرز کے کپڑے پہنتی تھی مگر اسکندریہ کے اس ہوٹل میں اس رات فتنہ بن کر آنے کا مقصد کیا تھا؟ یقیناً وہ کوئی بے مقصد عورت نہیں تھی اور جانتی تھی کہ انسانی ذہن کو کس طرح گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت جب وہ جہاز میں تھی اس نے ایک بار بھی اس طرح کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔ رحمان یزدانی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ہے...... وہ ہے...... دیکھو، وہ ہے۔"

میں چونک پڑا۔ "کون......؟" میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"ذاکر قباشی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ دائیں ہاتھ پر تیسری میز کے پاس سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس۔" اس نے کہا اور میں اس طرف دیکھنے لگا۔ نازک اندام عورتوں کے جھرمٹ میں نفیس تراش کے سیاہ رنگ کے سوٹ میں جو شخص لمبے تڑنگے قد و قامت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اس قدر بدحواس ہوا کہ میں نے رحمان یزدانی کا بازو پکڑ لیا اور اس قدر سختی سے بھینچا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو...... یہ...... یہ......" اس نے کہا۔

"میرے خدا...... میرے خدا...... یزدانی، یہ ہیگ ہے۔ وہی حرامی جس کے پیچھے لگ کر میں نجانے کتنی صعوبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔"

رحمان یزدانی کے چہرے پر نجانے کیوں اطمینان کے آثار نظر آئے۔ میرے ان الفاظ سے وہ خود متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے شبہ تھا۔ یقین کرو مجھے شبہ تھا کہ ہیگ اور قباشی ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ گڈ...... وری گڈ۔ اب آؤ ذرا ہنری اسمتھ سے کچھ دل کی باتیں ہو جائیں۔" رحمان یزدانی نے مجھے بازو سے پکڑا اور گیلری کے سرے کی طرف چل پڑا جہاں لکڑی کے زینے اوپر کی سمت جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے مسٹر اسمتھ کی جو کیفیت دیکھی تھی، وہ کیفیت بے شک نشہ ٹوٹنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ لیکن

اس وقت ان حالات نے مجھے اس طرح چکرا کر رکھ دیا تھا کہ میں اندر سے اپنی کیفیت خود اس سے بہتر محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایسی الجھنوں نے مجھے گھیر لیا تھا جو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ ذاکر قباشی، ہیگ کا دوسرا نام ہے۔ ہیگ مجھ سے کلکتے میں متعارف ہوا تھا۔ اس نے وائسرائے کے چیمبر سے خفیہ کاغذات چرانے کے لئے مجھے استعمال کیا تھا۔ اور میں اس کی پیدا کی ہوئی مصیبت سے بچ بچا کر بمبئی آیا تھا اور اتفاقی طور سے میں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنی دیوانگی کا شکار ہوا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے جہاز میں سوار ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا تعاقب کرتا ہوا مصر تک آ گیا تھا۔ اپنی دانست میں، میں نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ جہاز پر بھیس بدل کر گھومتا پھرا تھا اور مطمئن تھا کہ ہیگ مجھے نہیں پہچان سکا۔

بہرحال اچانک ہی مجھے ایک بات یاد آئی۔ ایک بار میں اس کمپنی کے دفتر میں گیا تھا جہاں سے ہیگ نے اس جہاز میں اپنے لئے بکنگ کرائی تھی اور کلرک نے شاید اسے سلام نوری کہا تھا۔ اس وقت میں ان الفاظ کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ نام اگر یاد آتا تو بڑی الجھنوں سے بچ جاتا۔ ذاکر قباشی کے بارے میں تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بہرحال ہیگ کی شخصیت کے بارے میں میرے سارے اندازے اب تک غلط ہی رہے تھے۔ میں نے اسے ایک عام قسم کا مجرم سمجھا تھا۔ لیکن یہاں مصر میں آ کر مجھے اس کی اصل شخصیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ذاکر قباشی کے نام سے وہ یہاں کا بہت بڑا اسمگلر تھا اور انگریز میاں بیوی اور پروفیسر کا قتل اور یہ تختی تمام باتیں اتنی الجھی ہوئی تھیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کون سا رخ اختیار کروں۔ اپنے طور پر کیا کر رہا ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں اس کا کوئی نتیجہ بھی ہے یا نہیں؟ ہاں البتہ ایک بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ اگر ادھر اسکندریہ میں یہ شخص مجھے نہ مل جاتا یعنی رحمان یزدانی تو نجانے مجھ پر کیا گزرتی۔ اس کے اثر و رسوخ اور اس کی اسکندریہ میں رہنے والوں کے بارے میں معلومات اس وقت میرے اس قدر کام آ رہی تھیں کہ میں دنگ رہ گیا تھا۔ واقعی کمال کی شخصیت تھی رحمان یزدانی کی بھی۔ اس قدر ذہین، اس قدر سمجھدار کہ تصور نہ کیا جا سکے۔ وہ لمحات بھی مجھے یاد تھے جب وہ میرے بابا جان اور سلطان چچا کے ساتھ ہمارے درمیان ہوا کرتا تھا۔ مگر اس وقت اس کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ اب تو میں یقیناً موت سے بال بال بچ گیا تھا اور اب جبکہ میں نسبتاً محفوظ تھا اور پسینے پسینے ہو رہا تھا کہ میں جو زندہ ہوں، وہ چند خوشگوار اتفاقات کی بدولت ہے ورنہ میرا جو

کچھ ہوتا دنیا اس کا تماشہ دیکھتی۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ رحمان یزدانی نے اگلا منصوبہ کیا بنایا ہے۔ اس نے مارفین کے انجکشن مجھے دکھائے تھے۔ ظاہر ہے وہ انجکشنوں کو ہنری اسمتھ سے پوچھ گچھ کے لئے استعمال کرے گا۔

بہرحال جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو ہنری اسمتھ اسی طرح بستر پر نیم مردہ پڑا ہوا تھا۔ رحمان یزدانی نے کمرہ اندر سے مقفل کیا اور بستر کے سرہانے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہ اس کے چہرے کی طرف اٹھی تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ بہرحال اس نے میز پر سے پانی کا گلاس اٹھایا اور چلو بھر پانی اسمتھ کے منہ پر چھینٹے کے طور پر مارا۔ اسمتھ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، رحمان یزدانی نے جیب سے وہ ڈبہ نکالا اور دونوں وائل اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دور سے اسے دکھائے اور بولا۔

''اسمتھ، دیکھو یہ کیا ہے۔ میں تمہاری چیز لے آیا ہوں۔'' یہ بھی ایک کمال کی بات تھی۔ پتہ نہیں یہ انسان کیسی کیسی صفات کا مجموعہ ہے۔ میں نے دیکھا اسمتھ جو مردہ پڑا ہوا تھا، تڑپ کر اٹھنے کی کوشش میں تکیے پر دوہرا ہو گیا۔

''لے آئے...... لے آئے تم۔ کیا یہ تمہیں نوری نے دی ہیں؟''

رحمان یزدانی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''کیوں، نوری تمہارا باپ ہے؟ یہ وائل تمہارے لئے خاقان لائے ہیں۔''

ہنری اسمتھ کی نظریں رحمان یزدانی کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آہ...... کتنے اچھے ہیں میرے دوست۔ لاؤ، یہ مجھے دے دو۔ میں مر رہا ہوں۔ میں مر جاؤں گا اگر یہ مجھے نہ ملی تو۔ لاؤ دے دو۔'' وہ زور لگا کر ذرا سا اٹھا اور مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

''دے دو...... خدا کے واسطے یہ مجھے دے دو۔''

''ابھی نہیں میری جان، ابھی نہیں۔ جہاں اتنی دیر صبر کیا ہے وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔ خاقان صاحب تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''بعد میں کر لینا، یہ تو دے دو مجھے۔''

''نہیں ہنری، پہلے باتیں ہوں گی۔''

''آہ...... کیوں ستا رہے ہو مجھے؟'' وہ روہانسا ہو گیا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر چیز کی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ ہمارے تم سے کوئی تعلقات ہیں ہیں، کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارے درمیان۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہر انسان ایک دوسرے ے لئے اسی وقت یہ سب کچھ کرتا ہے جب اس کا اپنا کوئی لالچ ہوتا ہے۔ تم ایسا کرو پہلے اری باتوں کے جواب دو۔ اس کے بعد تمہاری چیز تمہیں مل جائے گی۔''

ہنری نے اسے دیکھا اور پھر غصیلے لہجے میں کہا۔ ''دے دو مجھے۔ دے دو۔ کیوں تنگ کر ہے ہو حرام زادے، کتے۔ میں مر جاؤں گا۔ تمہیں میری موت کا احساس نہیں ہے؟''

''تو مر جاؤ۔'' رحمان یزدانی نے مٹھی بند کر کے کہا اور لاتعلقی سے فرش کی طرف دیکھنے ا۔ اسمتھ کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر آگے کی طرف جھکا اور بولا۔

''رحم کرو...... رحم کرو میرے حال پر مسٹر...... مسٹر خاقان! اسے سمجھاؤ، مجھے یہ دلوا دو۔ یہ یوں مجھے......'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ اس کی آواز میں سسکیاں پیدا ہو گئیں۔ میں اٹھا اور ں کے بستر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''ہنری! ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں، ہم تمہارے دوست ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاری چیز لے کر آئے ہیں۔ مگر سنو ہم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں وہ ہمیں بتا دو۔''

''آہ...... سنو تو سہی۔'' اس کی گردن آگے کی طرف ڈھلک گئی۔ کچھ دیر تک وہ اسی رح گردن جھکائے بیٹھا رہا، پھر بولا۔ ''دیکھو، جو کچھ تم پوچھو گے وہ میں تمہیں بتا دوں ا۔ یہ دے دو مجھے۔ بتا دوں گا۔'' پھر وہ گردن ہلا کر ایک طرف کو جھک گیا۔ رحمان یزدانی ی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اٹھایا اور چیخ کر کہا۔

''میں آخری بار پوچھ رہا ہوں اسمتھ! ہمیں ذاکر قباشی کے بارے میں ساری باتیں بتا گے تو یہ دونوں خوراکیں تمہیں مل جائیں گی۔ نہیں تو تم یہیں اس کمرے کے بستر پر ڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔'' اتنا سفاک تھا رحمان دانی کا لہجہ کہ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ میرے علاوہ سبھی اپنا اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں۔ ا کے لہجے نے اسمتھ پر اثر کیا۔ یا تو وہ بالکل مرنے کے قریب ہو رہا تھا یا پھر کوشش کر ے سرہانے سے ٹک کر بیٹھ گیا اور کمزور آواز میں بولا۔

''میں کسی ذاکر قباشی کو نہیں جانتا۔''

''کیا تم سلام نوری کو جانتے ہو؟''

''ہاں سلام نوری...... سلام نوری...... مگر ذاکر قباشی؟''

"وہی جسے تم سلام نوری کہہ رہے ہو، وہی ذاکر قباشی ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا اسمگلر اور منشیات کا سوداگر۔" رحمان یزدانی نے کہا اور ہنری اسمتھ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ رحمان یزدانی پھر بولا۔ "تم اسے کب سے جانتے ہو؟"

"دو سال سے۔ مگر تم اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھو۔"

"کیوں؟"

"اسے پتہ چل گیا کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"سنو ہنری اسمتھ! اس کی فکر نہ کرو۔ اس کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ یہ میں کہہ رہا ہوں، میں رحمان یزدانی۔ وہ اب تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ میں اسکندریہ میں اکیلا نہیں ہوں، سمجھے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔"

ہنری اسمتھ کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ وہ واقعی تکلیف میں تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"سنو رحمان یزدانی! تم آج تو مجھے میری خوراک دے دو گے مگر کل کی، اگلے ہفتے کی اور اگلے مہینے کی کون ضمانت دے گا؟ یہ تو عجیب شہر ہے۔ میں نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا ہوں۔ کسی نے مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ قباشی یا سلام نوری وہ جو کوئی بھی ہے مجھے میری خوراک تو دیتا رہے گا۔ تمہارا کیا ہے، آج کے بعد تمہاری شکل بھی نظر نہیں آئے گی۔"

رحمان یزدانی ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اچھا سنو، اگر میں تمہیں ایک مہینے کا کوٹا ابھی اسی وقت دے دوں تو کیسا رہے گا؟ پھر تو ہماری تمہاری باتیں ہوں گی؟" رحمان یزدانی نے کہا اور اسمتھ کی بجھی ہوئی آنکھوں میں جیسے روشنی جلنے لگی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر حریصانہ لہجے میں بولا۔

"لاؤ...... لاؤ...... ایک مہینے...... ایک مہینے کی خوراک۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ رحمان یزدانی کے پاس اس چھوٹے سے پیکٹ کے علاوہ اور کچھ بھی ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا پیکٹ نکالا اور اسے لاپرواہی سے بستر پر پھینک دیا۔ ہنری اسمتھ نے چیل کی طرح پیکٹ پر جھپٹا مارا تھا۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پیکٹ تک پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ توازن بگڑ گیا اور وہ بستر پر منہ کے بل لڑھک گیا۔

"نہیں میری جان! اتنی جلدی نہیں...... اتنی جلدی نہیں۔ اتنی قیمتی چیز اتنی آسانی سے کیسے ملتی ہے۔" یہ کہہ کر رحمان یزدانی نے بستر پر پڑے پیکٹ کو اچک لیا اور واپس اپنے

کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ چوہے بلی کی طرح ہنری اسمتھ سے کھیل رہا تھا اور ہنری اسمتھ کی شکل دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے کہا۔

"ایسا کرو مجھے ایک گولی ہی دے دو، میں سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ حرام زادہ قباشی، وہ ہمارا دوست نہیں ہے۔ سنو، میں بتاتا ہوں، میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ مجھے اور میری بیوی کو وہ جواہرات کی اسمگلنگ میں استعمال کرتا ہے۔ دو برس پہلے ہمارا کاروبار بمبئی میں تھا۔ ہم ہندوستان سے پرانے نوادرات خریدتے تھے اور یورپ میں بڑی بڑی قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ اس نے بھی ہم سے کئی مرتبہ سامان خریدا تھا۔ ایک دفعہ وہ ہمارے پاس آیا اور اس نے کانسی کی بہت سی مورتیاں خریدیں۔ اس نے ہمیں اس کی منہ مانگی قیمت دی اور پھر کہا کہ اگر ہم اس کا ساتھ دیں تو سال بھر میں اتنی دولت حاصل کر سکتے ہیں کہ ہزار زندگیاں ملیں تو بھی اس کا دسواں حصہ اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس کی بات سے دلچسپی لی تو اس نے بتایا کہ ان مورتیوں کو چابکدستی کے ساتھ کاٹ کر ان میں خفیہ خانے بنا دیئے جائیں گے اور ہیرے، یاقوت، زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر اس میں بھر دیئے جائیں گے۔ پھر یہ مورتیاں یورپ میں مختلف پتوں پر پارسل کر دی جائیں گی۔ اس نے بتایا کہ منافع کی رقم کا آدھا ساجھا ہوگا۔ چوتھائی ہمیں پیشگی ملے گا اور چوتھائی مال پہنچ جانے کے بعد ملے گا۔ میں تو ذرا ہوشیار رہا تھا مگر وہ کمینی، وہ فوراً رضامند ہو گئی۔ میں اپنی بیوی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ لالچی عورت، آہ...... جس نے زندگی میں کبھی عورت کی بات مانی، میں نے اسے پنپتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ رضامند ہو گئی میں نے شروع شروع میں مداخلت کی مگر خیر سال بھر تک ہم نے بے حساب دولت کمائی اور اس دوران میں جو کچھ گنواتا رہا، ان میں میری بیوی بھی تھی۔ اس نے میری بیوی پر ڈورے ڈالے اور مجھے مارفین کا چسکا لگا دیا۔ سمجھ رہے ہو نا، اب میری بیوی اس کی داشتہ ہے اور میں اس کا غلام۔ ہندوستان اور انگلستان کے بینکوں میں ہمارے پاس بے تحاشہ دولت ہے مگر کس کام کی...... جہاز پر...... جہاز پر......" وہ رکا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا تو رحمان یزدانی نے کہا۔

"اسمتھ! جہاز پر ایک شخص قتل ہوا تھا۔ ہمیں اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"ارے وہی پروفیسر احتشام۔ بیوقوف پروفیسر احتشام۔ اسے اسی شخص نے قتل کیا۔ اس کا نام تم ذاکر قباشی لے لو یا سلام نوری یا پھر ہیگ۔"

"کیوں قتل کیا؟"

"اصل میں پروفیسر، خاقان کو خبردار کر دینا چاہتا تھا۔"

"کس بات سے خبردار کرنا چاہتا تھا وہ خاقان کو؟" رمضان یزدانی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذاکر قباشی...... ذاکر قباشی اسے قتل کرنا چاہتا ہے، یعنی خاقان کو اس نے جہاز پر دیکھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انڈین کسٹمز کے آدمی ہیں اور جہاز پر ہی مال برآمد کرنا اور ہمیں پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ خاقان اسے ہیگ کے نام سے جانتا ہے اور کسی پرانی دشمنی کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانے کے لئے جہاز پر سوار ہوا ہے۔ خاقان کے خلاف منصوبہ تیار کرنے کے لئے ہم لوگ رات کو پروفیسر کے کیبن میں داخل ہوئے تھے۔ وہ حرام زادہ میری ہی کیبن میں سوتا تھا اور شام کو کافی لاؤنج میں مجھے میری خوراک پہنچایا کرتا تھا اور آدھی رات گزرنے کے بعد میرے کیبن میں آجاتا تھا۔ صبح میری آنکھ کھلتی تو میں فرش پر پڑا ہوتا اور وہ میری بیوی کے ساتھ۔ آہ...... میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کتنی ہی راتوں میں جاگتا ہوتا تھا اور...... اور......"

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ رحمان یزدانی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور پھر بولا۔

"تختی کا کیا چکر ہے؟"

"تختی...... کون سی تختی؟" اس نے کہا۔

"وہی مصری خزانے والی تختی۔"

"وہ تو...... وہ تو اسی ذاکر قباشی کی حرام زدگی تھی۔ ہیروڈوٹس سے یادداشتوں کے واقعات لے کر اس نے احتشام کو یہ پوری کہانی سنائی تھی۔"

یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں اور میں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا لیکن اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے کہا۔ "پروفیسر احتشام کو ایسی کیا مجبوری تھی کہ اس نے مجھے بہکانے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا؟"

اسمتھ میری طرف گھوما۔ اس نے کہا۔ "اس نے قاہرہ میں پروفیسر کی نوجوان بیوی کو روک رکھا ہے۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔ اس نے اس کی بیوی کو روک رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

"پروفیسر نے مصر میں نوادرات کی کھدائی کے لئے قباشی سے قرض لیا تھا۔"

"پھر؟"

"مہم ناکام ہو گئی۔ قباشی نے رقم کی واپسی کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر اتنی بڑی رقم کہاں سے دیتا۔ وہ اور اس کی بیوی ارسلا قاہرہ سے بھاگے مگر......"

"ارسلا......؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا یہ اس کی بیوی کا نام ہے؟"

"ہاں۔ پروفیسر نے جو تصویر دکھائی تھی وہ ارسلا کی ہی تھی۔"

"کمال ہے۔ پھر؟"

"وہ دونوں قاہرہ سے بھاگنے میں تو کامیاب ہو گئے مگر قباشی نے انہیں لیبیا میں جا پکڑا اور ارسلا کو یرغمال کے طور پر وہاں سے قاہرہ منتقل کر دیا گیا اور وہ ہم لوگوں کو ہندوستان لے گیا۔"

"کیوں؟"

"وہ ہندوستان سے جواہرات لانا چاہتا تھا۔ پروفیسر کو اس لئے ساتھ لے کر گیا تھا کہ اس کے گرگوں نے تبت میں بدھ مت کی کوئی قدیم تختی چرائی تھی اور قباشی اس کا سودا کر رہا تھا۔ پروفیسر کا کام یہ تھا کہ وہ اس تختی پر لکھی تحریر پڑھ کر سنائے۔"

"اس کے بعد قباشی نے وہ تختی بیچ دی؟"

"نہیں، سودا نہیں ہوا۔"

"تختی اب کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی کے پاس ہے۔ امریکی یونیورسٹی کے ایک ہندو پروفیسر سے اس سلسلے میں بات چیت ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا، بے چارہ پروفیسر احتشام اب اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اسے مار دیا۔ آپ یقین کریں خاقان وہ ایک پتھر سے کئی شکار کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو پروفیسر سے اسے نجات مل جاتی ہے اور دوسرا پروفیسر کی لاش کے پاس تمہاری موجودگی سے تم پولیس کے شکنجے میں پھنس جاتے۔ یہی اس کا منصوبہ تھا۔"

میں حیرت کی تصویر بنا اسمتھ کے انکشافات سن رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پروفیسر احتشام بے بھی اس شخص کی سفاکی کا شکار ہوا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر ہیگ کا سارا کھیل

میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ مجھے اب پتہ چلا تھا کہ اس نے مجھے جہاز پر دیکھ کر فوراً پہچان لیا تھا اور پھر مجھے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اس نے بے چارے پروفیسر کو مجبور کیا کہ وہ مصر کے خزانے کا فرضی قصہ سنا کر صحرا میں لے جانے پر تیار کرے اور پھر وہاں آسانی سے مجھے ٹھکانے لگا دے۔ ادھر میں پروفیسر کے جھانسے میں آ گیا۔ لیکن پروفیسر نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے یہ غلطی نہیں کی کہ اس انگریز جوڑے کے سامنے ہی مصری خزانے کی فرضی تختی کا قصہ مجھے سنایا اور اپنے کیبن میں آنے کی دعوت دی۔ میں ادھر کینٹین کی طرف اور پروفیسر اپنے کیبن کی طرف گیا۔ ادھر اسمتھ کی بیوی نے ہیگ کو بتا دیا کہ پروفیسر، خاقان کو خبردار کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہیگ نے فوراً ہی دوسرا منصوبہ تیار کر لیا۔ اس نے پروفیسر کو اسی کے کیبن میں ہلاک کر دیا اور میری گھات میں بیٹھ گیا کہ جونہی میں پروفیسر کے کیبن میں داخل ہو جاؤں، وہ باہر سے دروازے بند کر دے یا کوئی اور ترکیب کرے۔ مگر میری خوش قسمتی یا اس بھوج پتر کا کارنامہ تھا کہ میں نے پروفیسر کی پشت پر اٹھے ہوئے ہاتھ کا منظر دیکھ لیا۔ دوڑتا ہوا جب پروفیسر کے کیبن کی طرف جا رہا تھا تو بیرے سے ٹکرا گیا۔ اور بیرا ٹوٹے ہوئے برتن اکٹھا کرنے کے لئے بہت دیر تک راہداری میں رہا۔ اگر راہداری سنسان ہوتی تو پروفیسر کی لاش کے ساتھ مجھے بند کرنے کے بعد ہیگ جہاز کے کپتان کو اطلاع دیتا اور اس کے بعد میں بغیر کسی کوشش کے پھنس جاتا اور ہیگ اپنے دو مخالفوں سے نجات پانے کے بعد آرام سے اتر جاتا۔ آہ..... کیا ہی خوفناک انسان ہے یہ۔ ذہنی طور پر کس قدر طاقت ور۔

بہر حال ہنری اسمتھ کو جو کچھ بھی معلوم تھا اس نے مجھے اور یزدانی کو بتا دیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہیگ اسے اس لئے سزا دے رہا ہے کہ جہاز پر اس نے اپنی بیوی سے جھگڑا کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسکندریہ پہنچ کر طلاق کی کارروائی کرے گا۔

بہر حال یہ پوری داستان تھی اور اس کے علاوہ ہنری سے اور کچھ معلوم کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ چنانچہ رحمان یزدانی نے اسے اس کی خوراک دے دی۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے تھے۔ اس نے سرور میں بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے مجھے اور یزدانی کو دیکھا۔

”تم بہت اچھے دوست نکلے۔ بہت ہی اچھے۔ یہ بتاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں کیا کروں؟“

”کھانا کھاؤ۔ اور کیا کرو گے۔“ رحمان یزدانی کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ”ہنری! تم

دو تین دن اسی کمرے میں رہو، بالکل باہر نہ نکلو۔ وہی بیرا جو تمہیں باتھ روم سے یہاں تک لایا ہے تمہیں یہاں ضرورت کی تمام چیزیں پہنچاتا رہے گا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں قباشی سے حساب چکانا چاہتا ہے۔ اسے اگر ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ تم نے اس کے جرائم کی داستان کسی کو سنا دی ہے تو وہ تمہیں بلا تکلف مار دے گا۔ اسے یہی سمجھنے دو کہ مارفین کی تلاش میں تم کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھ گئے ہو۔“

ہنری نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ بہر حال رحمان یزدانی نے اسے اچھی خاصی رقم دی اور اس کے بعد اسے آخری ہدایت دے کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ پھر ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک عجیب سا تاثر ہم دونوں کے ذہنوں پر تھا۔ ہیگ یا جو بھی اس کا نام ہو ذاکر قباشی یا سلام نوری، اب ہماری زد پر تھا۔ رحمان یزدانی کے گروہ کے بارے میں مجھے صحیح طرح نہیں معلوم تھا کہ اس کا گروہ کتنا طاقتور ہے۔ پھر بھی ہوٹل میں انسے جو اہمیت دی گئی تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر با اثر آدمی ہے۔ اچانک ہی رحمان یزدانی نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور انجن بند کر دیا۔ میں چونک کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے کہا۔

”خاقان! آج کی رات واقعی اتفاقیہ طور پر بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ذاکر قباشی اور اس کے دست راست ذکری کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ جہاز سے فرار ہونے کے بعد تم پر کیا بیتی۔ لیکن وہ لوگ اسکندریہ کو اپنی سلطنت سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے ذاکر قباشی۔ تم دیکھو وہ کتنی آزادی سے اپنی داشتہ کو لئے گھوم رہا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ خاقان جمشیدی کو میں نے جہاز سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ ذرا کچھ دیر انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

”کہاں......؟“

”یہاں میرا ایک اسٹیشن ہے۔ میں اپنے کچھ ساتھیوں کو ان حالات کے بارے میں اطلاع دے کر آ رہا ہوں۔“

”او کے۔“ میں نے کہا اور وہ گاڑی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ...... دس منٹ...... پندرہ منٹ...... میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو گاڑی سے اتر کر سڑک پر آ گیا اور سڑک کے کنارے لگی گھاس پر ٹہلنے لگا۔ اندھیرے میں دور دور تک کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

ابھی میں سوچوں میں ہی گم تھا کہ یکایک مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی اور میں چونک کر پلٹا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں ایک زبردست چھناکا ہوا...... میرے سامنے سیوک سندھورتی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھے اور جھک گیا۔

''بودھی ستو...... پرکھوں نے جیسا بتایا ویسا ہی ہوگا۔ آپ نے اپنا آپ پہچان لیا۔ سچائی اور بھلائی کا راستہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک بات ذہن میں رکھئے، اشبھ بھاؤنائیں آپ کو کہیں سے کہیں لے جاسکتی ہیں اور گیان کے راستے سے ہٹا سکتی ہیں۔ مگر مہتر بدھ کوئی بدکردار شخص نہیں ہوسکتا۔ اب آپ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ ایک بات یاد رکھئے، آج رات آپ کو اس کے گھر جانا ہے جو یہاں اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتا ہے، میرا مطلب ہے ہشمان ذکری۔ کہیں اور نہیں جائیں گے آپ۔ وہاں آپ کو پتھر کی وہ تختی ملے گی جو بڑوں نے تبت کے مہان دھار میں سنبھال رکھی تھی، پھر چور اسے اڑا لائے۔ اس کی کہانی کچھ اور ہے جو آپ تک نجانے کیسے کیسے ذریعے سے پہنچائی گئی ہے۔ یاد رکھئے بودھی ستو! آپ کو ہشمان ذکری کے گھر جانا ہے۔''

میں عجیب سے انداز میں اس کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ اچانک اس نے گردن اٹھا کر دور دیکھا اور اسے بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا، گردن خم کی اور بولا۔ ''میں چلتا ہوا بودھی ستو...... اتھا پرموتھا۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

آنے والے کوئی پندرہ بیس آدمی تھے جو آہستہ آہستہ چل کر میرے نزدیک پہنچ گئے۔ ان کے لباس صاف اور ڈھیلے ڈھالے تھے۔ میں نے حیرانی سے دیکھا، رحمان یزدانی ان میں نہیں تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات عجیب سے تھے۔ ایک لمحے کے اندر مجھ پر وحشت سوار ہوگئی۔ میں نے وحشت کے عالم میں یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچا مگر دوسرے لمحے آنے والوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ایک بار پھر میں نے مور کی طرح گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، ان آدمیوں کے سوا سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

☆

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کسی اچھے ارادے سے میرے گرد نہیں پھیلے ہیں۔ میں بالکل نہتا تھا۔ اگر مسلح بھی ہوتا تب بھی اتنے سارے افراد سے تنہا نمٹنا آسان کام نہیں تھا۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنیاں آنے والوں کے چہروں پر اپنا عکس ڈال رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا باقی چہرہ رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ ان میں سے ہر شخص مسلح ہے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی جو خاصا لمبے قد و قامت کا مالک تھا، ریوالور تانے آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا۔ باقی دوسرے حلقہ بنائے ساکت کھڑے تھے۔ آنے والا میرے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے انتہائی نرم و ملائم لہجے میں مجھ سے کہا۔

''سیّدی خاقان! ہمیں ہدایت دی گئی ہے کہ آپ کو عزت و احترام کے ساتھ لے آئیں۔ ہماری خواہش ہے کہ کوئی ناخوشگوار بات نہ ہونے پائے۔ اگر آپ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلنا منظور کرلیں تو ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے اور اس میں آپ کا فائدہ بھی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں بڑی مجبوری کے عالم میں ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

اس نے اپنے ریوالور کو جنبش دی اور میں نے وحشت سے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہورہا تھا کہ یہ عام لٹیرے یا راہزن نہیں ہوسکتے کیونکہ انہوں نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ لازمی امر ہے کہ یہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے ہوں گے۔ صرف ایک ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ یہ ہیگ کے ساتھی ہوں گے۔ اس وقت اگر میں ان سے بھڑ جانے کی دلیرانہ حماقت کروں تو سچ مچ کی حماقت ہوگی اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایک لمحے میں فیصلہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کرکے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ رحمان یزدانی اس وقت دھوکا کھا گیا۔ وہ یہاں اپنے

ساتھیوں کی موجودگی کی خبر دے کر گیا ہوا تھا، یقیناً یہیں آس پاس اس کے گروہ کے افراد بھی موجود ہوں گے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ رحمان یزدانی کے اپنے علاقے میں دشمنوں نے مجھے گھیر لیا۔

میں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے آخری بار اندھیرے میں اس طرف دیکھا جدھر رحمان یزدانی گیا تھا۔ دور دور تک سڑک پر کوئی موجود نہیں تھا۔ ریوالور والے لمبے تڑنگے مصری نے میرے پیچھے آ کر جھٹکے سے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور انہیں پشت کی طرف موڑ دیا۔ اس کے انداز میں شدید جارحیت تھی۔ پھر وہ مضبوطی سے میرے ہاتھوں کو ڈوری سے باندھنے لگا۔ اس کے ایک اور ساتھی نے آگے بڑھ کر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کے بعد منہ پر رومال باندھ کر کس دیا۔ غصے اور بے بسی نے میرے سارے وجود کو لرزا دیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت کچھ بھی کرنا موت کو آواز دینے کے مترادف ہوگا۔

آخر کار وہ لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے چلے۔ میں اپنے قدموں ہی سے چل رہا تھا لیکن بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ سڑک پار کرنے کے بعد ایک ڈھلان آیا اور وہ مجھے ڈھلان سے نیچے اتارنے لگے۔ ڈھلان کا اختتام کچی زمین پر ہوا تھا اور اس کچی زمین پر اتنے بہت سے لوگوں کے چلنے کی آواز بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ اسی طرح طے کیا گیا اور اس کے بعد سڑک آ گئی۔ سڑک پر ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ مجھے لے کر اس پل کے نیچے پہنچے۔ اغوا کرنے والوں میں سے کسی نے میری پسلی میں اپنا پستول چبھو کر کہا۔

”بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ...... نیچے بیٹھ جاؤ۔“

میں ان کی ہدایت پر عمل کرنے لگا تو وہ سب سکون سے میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کوئی خشک نالا تھا۔ نالے کا ریتلا فرش توقع کے خلاف صاف شفاف تھا۔ اوپر اینٹوں کی محراب تھی اور پھر پختہ سڑک۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہم اس جگہ سے جہاں رحمان یزدانی کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی کوئی دو فرلانگ نکل آئے تھے اور یہ فاصلہ تقریباً پندرہ بیس منٹ میں طے کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رحمان یزدانی کو گئے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ پتہ نہیں یہ لوگ یہاں بیٹھے کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اوپر سڑک پر ایک کار کی آواز سنائی دی اور وہ اس قدر برق رفتاری سے گزری کہ اپنی آواز ایک لکیر کی شکل میں چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ ایک لمحے تک کچھ

سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن دوسرے لمحے میری سمجھ میں آیا۔ کسی نے اندھیرے میں سرگوشی کی۔

”ہاں...... وہی تھا۔ اُسی کی گاڑی تھی یہ۔“

”بکواس بند کرو۔ تم سے خاموش نہیں رہا جا سکتا؟“ اسی لمبے تڑنگے آدمی کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”مگر وہ تو چلا گیا“ دوسری آواز نے کہا۔

”وہ ابھی واپس آئے گا بیوقوف۔ انتظار کرو۔“

کچھ دیر اور گزری اور اس کے بعد دوبارہ گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور یہ آواز مخالف سمت سے آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس لمبے آدمی کا کہنا بالکل درست ثابت ہوا۔ بات میری سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ رحمان یزدانی ہی ہو جو مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ گاڑی ایک بار پھر پلیا سے گزر گئی تھی۔ اس کے بعد پانچ دس منٹ تک سناٹا طاری رہا۔ اسکندریہ کا یہ رہائشی علاقہ ضرورت سے زیادہ ہی ویران تھا۔ میں اندھیرے میں نظریں گاڑھے آہٹوں پر کان لگائے ان لوگوں میں گھرا بیٹھا تھا اور کسی ایسے واقعے کا منتظر تھا جو مجھے ان لوگوں کے قبضے سے رہائی دلا دے۔ کوئی ایسا راہ گیر جو ادھر سے گزر رہا ہو۔ بہر حال یہ ایک احمقانہ خواہش تھی۔ نجانے کیوں میرے دل میں یہ احساس تھا کہ کچھ ہونا چاہئے اور میں کسی عمل کا منتظر تھا۔ میرے دشمن بھی دم سادھے بیٹھے تھے۔ ایک بار پھر ہم نے گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ لیکن اس بار کئی گاڑیاں تھیں۔ غالباً دو یا تین گاڑیاں تیزی سے گزر گئیں اور پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک شخص کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہلی...... وہ تین گاڑیوں میں بھر کر اس طرف گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میدان صاف ہے۔ چلو چلیں۔“ وہ سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور میری پشت میں ریوالور لگائے ہوئے مجھے پلیا سے نکال کر سڑک پر لے آئے۔ ان میں سے ایک نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی ایک تاریک گلی میں موٹر کار کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھنے کی کوشش کی تو ریوالور والے نے اپنے ریوالور کی نال سختی سے میری پشت میں چبھو دی۔

”دیکھو، تعاون کرو ہم سے۔ ورنہ تمہاری موت بھی ہمارے لئے مشکل نہیں ہو گی۔ آرام سے وہ ہر عمل کرتے رہو جس کی ہم تمہیں ہدایت کرتے رہیں۔ ورنہ گولی چلانے میں

اب کوئی تکلف نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ تمہارے حمایتی جا چکے ہیں۔''

اس کا مطلب ہے کہ وہ تین گاڑیاں جو ابھی سڑک پر سے گزری تھی، رحمان یزدانی کے ساتھیوں کی تھیں اور وہ لوگ میری تلاش میں نکلے ہیں۔ ممکن ہے وہ ہوٹل پہنچ کر ہیگ کو گھیر لیں اور یزدانی میرا پتہ چلانے کے لئے اس پر تشدد کرے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہیگ وہاں ملے گا ہی کیوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب تک یہ شبہ دل میں تھا کہ ان لوگوں کو یہ نہیں پتہ چل سکا ہے کہ میں رحمان یزدانی کی تحویل میں ہوں لیکن اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ رحمان یزدانی بھی روشنی میں آ گیا ہے۔ میں اس وقت جن لوگوں کے قبضے میں تھا وہ یقیناً ہیگ کے بھیجے ہوئے تھے اور انہیں یہاں بھیج کر وہ ہوٹل میں لمحے بھر کو نہیں رکا ہو گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کو میرے بارے میں کس طرح معلوم ہوا؟ آہ......

کیا حیران کن اور پراسرار واقعات تھے۔ میرا ذہن سوچ سوچ کر ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد اندھیرے میں سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہمارے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا، پہلے ایک شخص گاڑی میں بیٹھا پھر مجھے دھکا دیا گیا اور اس کے بعد تیزی سے وہ سب کے سب گاڑی میں بھر گئے۔ کافی بڑی گاڑی تھی پھر بھی دس بارہ آدمیوں کے لئے جگہ نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لوگ اوپر تلے بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی کے دروازے بند کئے اور شیشے چڑھا دیئے اور پھر ایک شدید جھٹکے کے ساتھ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر تک یہ اسی شاہراہ پر چلتی رہی۔ پھر ایک چوراہے سے گزری اور ایک چھوٹی سی سڑک پر مڑ گئی۔ شاید وہ راستوں کی بھول بھلیوں کو خاص طور سے استعمال کر رہے تھے تاکہ سمتوں کا پتہ نہ چل سکے۔ یہاں تک کہ گاڑی آبادی سے کافی دور نکل گئی۔ سڑک ختم ہو گئی اور اب ریتلا چٹیل میدان تھا جس سے گاڑی گزر رہی تھی۔ یہاں رفتار خود بخود سست ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس ریتلے میدان کو عبور کر کے آخر کار گاڑی ایک پختہ سڑک پر آ گئی اور کچھ دور چلنے کے بعد آخر کار اس سفر کا اختتام ہوا اور وہ ایک کمپاؤنڈ میں اخل ہوئی تھی۔ میں اس وقت کئی آدمیوں کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے گردن گھما کر میں نے دیکھا کہ یہ ایک بہت بڑا احاطہ ہے۔ اس احاطے کی دیواریں کافی بلند تھیں۔ ادھر کمپاؤنڈ میں نخلستان کا سا سماں تھا۔ بلند و بالا کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ بکھرے پڑے تھے۔ روش کے برابر گھاس کے قطعے تھے مگر نیم تاریکی میں یہ قطعے پورے طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

گاڑی رکی تو میں نے دیکھا کہ بڑا پُر فضا باغ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ گاڑی پتھر کی ایک اونچی دیوار کے پاس رکی تھی۔ آخر کار وہ خود بھی گاڑی سے اترے اور مجھے بھی اتارا گیا۔ پھر وہ لوگ مجھے اسی بے دردی سے دھکیلتے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس لے گئے۔ یہاں ایک مسلح آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا نکالا اور تالہ کھول دیا۔ دروازے سے گزر کر ہمیں ایک تنگ گلی نظر آئی۔ یہاں دیواروں میں لوہے کی جالیوں کے پیچھے کم طاقت کے بلب لگے ہوئے تھے جن کی ہلکی روشنی میں یہ راستہ بڑا ڈراؤنا اور پراسرار لگ رہا تھا۔ کچھ دور جا کر ہمیں دائیں طرف مڑنا پڑا اور پھر ایک بڑے دروازے سے اس جیل نما عمارت میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک راہداری تھی جو دور تک چلی گئی تھی اور بالکل ویران پڑی تھی۔ عمارت کی چھت اتنی اونچی تھی کہ چھت سے لٹکے ہوئے بلب راہداری کو پوری طرح روشن کرنے سے قاصر تھے۔ اتنے بہت سے لوگوں کی چاپ سے راہداری میں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی زیر زمین مقبرے میں لے آیا گیا ہو۔ نجانے میرے اندر ایک احساس سا کیوں ابھر رہا تھا۔ یہ احساس تھا کہ یہ لوگ مجھے آخر کار یہاں قید کر کے چلے جائیں گے اور میں بھوک، پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔

راہداری کے سرے پر ایک لوہے کا جنگلا نظر آیا تھا جس کے بعد نیچے ایک زینہ چلا گیا تھا۔ یہ کسی تہہ خانے کا راستہ تھا۔ کوئی دس سیڑھیوں کے بعد سیلا ہوا فرش آ گیا۔ ایک بار پھر یہاں سے راستوں کی بھول بھلیاں شروع ہو گئی تھیں۔ پُر پیچ راستوں میں خبر نہیں یہ مجھے کتنی دیر تک چلاتے رہے۔ دائیں بائیں مڑتے ہوئے میں سمتوں کو بھول چکا تھا۔ آخر کار یہ زمین دوز بھول بھلیاں ختم ہوئیں اور پھر ایک صحن جیسی جگہ نظر آئی۔ اس پورے صحن میں پتھر کا فرش تھا اور چاروں طرف محراب دار دروازے بنے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر یہ لوگ منتشر ہو گئے۔ مجھے لانے والے تمام ہی افراد کسی نہ کسی دروازے سے چلے گئے تھے۔ بس وہ لمبا تڑنگا سرغنہ جسے ہلی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ رک گیا تھا۔

''آؤ......'' اس نے بدستور اپنی پاٹ دار آواز میں کہا اور اس کے بعد ویسے ہی ایک محراب میں داخل ہو گئے۔ اندر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی پرانا اصطبل ہے۔ دیوار میں لوہے کے بڑے بڑے کنڈے لگے ہوئے تھے جیسے جانوروں کو باندھنے کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ اس محراب میں ایک اندرونی برآمدے کے بعد چار کوٹھڑیاں تھیں جن کے چوبی دروازوں میں لکڑی کی چھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہلی بدستور مستعد تھا اور اب وہ پستول تانے

میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے زور سے دروازہ کھولا اور اس کے بعد ہلی نے کہا۔

''تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔ ہوش و حواس قائم رکھنا۔ زندگی کھونے کے لئے نہیں ہوتی۔ جبکہ ہمیں زندگی لینے کی کافی مشق ہے۔ بہتر یہ ہے کہ موت کا فاصلہ کم نہ کرو۔''

اس کی یہ چھوٹی سی تقریر میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال میں نے کوئی عمل نہ کیا۔ پہلے انہوں نے میرے ہاتھ کھولے پھر منہ پر کسا ہوا رومال بھی کھول دیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اندر چلا گیا تو ان لوگوں نے دروازہ بند کر دیا۔

یہاں آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ جس کوٹھڑی میں مجھے لایا گیا ہے اس کے دروازے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ برآمدے کی زرد روشنی یہیں سے اندر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ کوٹھڑی میں مکمل تاریکی تھی۔ کوٹھڑی کے فرش پر ایک ترپال بچھی ہوئی تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ کوئی روایتی قسم کا قید خانہ ہے۔ بہت سے افسانوں اور داستانوں میں، میں نے قید خانوں کی منظر کشی پڑھی تھی۔ لکھنے والوں یا سنانے والوں نے شاید اسی کوٹھڑی کا حال بیان کیا ہوگا۔

میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ڈھیر تک پہنچا اور اس کے اوپر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ چند گھنٹوں پہلے میں رحمان یزدانی کے ساتھ ہیگ اور ہشمان ذکری پر حملے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مگر اب صورتحال بدل گئی۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اسکندریہ میں ان لوگوں کے ہاتھ کس قدر وسیع ہیں۔ یقینی طور پر ان کا گروہ رحمان یزدانی کے گروہ سے زیادہ طاقتور ہے۔ رحمان یزدانی اپنی دانست میں بڑی چالاکی سے کام لے رہا تھا اور ہم نے ہنری اسمتھ کو اسی ہوٹل میں چھپا کر اپنی طرف سے بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ مگر شاید ہیگ ہماری نقل و حرکت کی برابر نگرانی کر رہا تھا۔ ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے تھے اور یہی ہماری غلطی تھی۔ اگر ہم اس قدر مطمئن نہ ہو جاتے تو اتنی آسانی سے ان لوگوں کے شکنجے میں نہیں پھنس سکتے تھے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے ریڈیم کے ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا، ڈھائی بجنے والے تھے اور صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کوٹھڑی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے پر کان لگا کر باہر کی آوازیں سنیں، ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ پہلے تو یہ لگا جیسے باہر کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر پھر کچھ دیر کے بعد دور سے

آہٹیں سنائی دیں اور پھر باتیں کرنے کی مدھم مدھم آوازیں۔ غالباً دو آدمی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ پتہ نہیں ان کا رخ اس طرف ہے یا نہیں۔ اگر وہ ادھر ہی آ رہے ہیں تو میرا دروازے کے پاس کھڑا ہونا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ اگر وہ اس طرف آ رہے ہیں تو مجھے یہ تاثر دینا چاہئے کہ میں نے اپنی اس قید کو قبول کر لیا ہے۔ میں نے آنکھیں بھی بند کر لیں اور قدموں کی چاپ اور آنے والوں کی آوازوں پر کان لگا دیئے۔ میرا اندازہ درست تھا، وہ سیدھے میری ہی کوٹھڑی کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے سلاخ دار کھڑکی سے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی اور اس روشنی نے میرے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

''یہی ہے۔ لیکن کیا یہ بے ہوش ہے؟'' ایک لمحے کے اندر یہ آواز میرے کانوں کے ذریعے ذہن تک پہنچی اور ذہن نے زبان کو اس کا نام دے دیا۔ یہ ہشمان ذکری تھا۔

''بے ہوش تو نہیں ہو سکتا جناب! یا تو سو رہا ہے یا سوتا بن گیا ہے۔'' دوسری آواز ہلی کی تھی۔ اس شخص کی جو مجھے اغوا کر کے یہاں تک لایا تھا اور غالباً اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔

ذکری نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، یہاں پہرے لگا دو۔ سیّدی ذاکر قباشی صبح اس سے بات کریں گے۔''

پھر میں نے ان دونوں کی واپسی کی چاپ سنی۔ زمین دوز صحن میں انہوں نے زور سے کسی کو پکارا، کچھ کہا اور خاموش ہو گئے۔ پھر ایک اور آدمی میری کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ آنے والے نے اندر روشنی ڈالی اور بدمزاجی کے ساتھ منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔ پھر نپے تلے قدموں سے اس نے کوٹھڑیوں کے سامنے مختصر برآمدے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ غالباً کوئی ضرورت سے زیادہ جلا سڑا آدمی تھا۔ میں کوئی آدھے گھنٹے تک اپنی جگہ پر پڑے پڑے اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ اس بار ان عیار قاتلوں کے شکنجے میں بری طرح جکڑا گیا ہوں اور اب اسکندریہ کے نواح میں کئی ایکڑ پر بنے ہوئے اس محل کے تہہ خانے میں قید ہوں۔ یہاں سب ہی میری جان کے دشمن ہیں۔ ایک بھی دوست نہیں ہے۔ اور پھر صبح قباشی، ہیگ جو کچھ بھی اس کتے کا نام ہے مجھے اس طرف دیکھنے آئے گا جیسے کوئی قصائی چھری چلانے سے پہلے بکرے کو دیکھتا ہے اور اس کے بعد شاید مجھے قتل ہی کر دیا جائے اور اسی تہہ خانے کی بھول بھلیوں میں گاڑھ دیا جائے۔ یہ تو کچھ نہ ہوا۔ کیا موت کی

یہی شکل ہوتی ہے؟ ایک بے نام سے کیڑے کو پیروں تلے روند دیا جاتا ہے اور پھر اسے کوئی مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ انسان اور کیڑے کی موت میں اتنا فرق تو ہونا چاہئے۔

صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے آپ کو حوصلہ دینے لگا کہ چاہے کچھ بھی ہو، اتنی آسانی سے ان لوگوں کے ہاتھوں نہیں مارا جاؤں گا۔ اگر انہی اسمگلروں اور قزاقوں کے ہاتھوں میری موت لکھی ہے تو ان میں سے کم از کم دو تین کو مرنے سے پہلے ٹھکانے لگاؤں گا۔ کاش! ہیگ سے بدلہ لیا جا سکتا اور کاش میں ہشمان ذکری کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کر سکتا۔ یہ تمام خیالات صرف کاش سے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ کاش تو ایک حسرت بھرا لفظ ہے۔ صورتحال کا جائزہ لے کر کچھ کرنا چاہئے۔ ویسے ابھی تک ان لوگوں نے میری تلاشی نہیں لی۔ جواہرات اور کرنسی میرے بیلٹ میں محفوظ تھے۔ بدن پر مانگے کا وہی سوٹ تھا جو جہاز پر مائی لیڈی نے اپنے امریکی دوست کے سامان سے چرا کر مجھے دیا تھا۔ کلائی کی گھڑی، رومال، لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، قمیض کی آستینوں میں لگائے جانے والے بٹن جو خالص سونے کے تھے، جرابیں، جوتا اور ٹائی۔ سوٹ کے علاوہ میرے بدن پر کل یہ سامان تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ان چیزوں کا جائزہ لیا اور یہ سوچنے لگا کہ ان میں سے کس کس چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میری نگاہ جوتے پر پڑی اور مجھے ہنسی آ گئی۔ جوتا بے شک ذلیل کرنے کا ایک موثر ہتھیار ہے مگر اس سے ایک مسلح آدمی کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ جرابیں، منی بیلٹ، رومال، لائٹر۔ ہاں لائٹر سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ خودکشی کے برابر ہوگا۔ اگر میں کوٹھڑی میں پڑے ہوئے اس گھاس پھونس کو آگ لگا دیتا ہوں تو لازمی طور پر کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی پہرے دار شور مچا دے گا اور پھر کتنے مسلح بدمعاش دروازہ کھول کر اندر داخل ہوں گے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں، بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے ہاں وقت سے پہلے ہلاک ہونے کے مواقع ضرور ہیں۔ ممکن ہے کہ اس آگ میں مجھے خود ہی جلنا پڑے یا دھوئیں سے ہی میرا دم گھٹ جائے۔ نہیں، یہ سوچ بالکل بے کار ہے۔ لائٹر میرے کام کا نہیں ہے۔ اب رہ جاتی ہے دوسری کوئی چیز۔ ٹائی...... ہاں ٹائی۔ اگر مناسب ترکیب کر لی گئی تو ٹائی سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ ریشمی ٹائی پھندے کا کام دے سکتی ہے۔

میں نے ٹائی کی گرہ کھولی اور اس کے دونوں سروں کو بل دے کر نیچے سے کھینچا۔ خالص ریشمی کپڑے سے بنی ہوئی ٹائی جلاد کے پھندے کی طرح مضبوط تھی۔ میں سوچنے

ا۔ اور اب میں نے یہ سوچا کہ جس طرح بھی بن پڑے پہریدار کو کوٹھڑی میں بلایا جائے ر موقع پا کر ٹائی کا پھندا اس کے گلے میں کس دیا جائے۔ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ں کوٹھڑی سے باہر نکل آؤں۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پہرے دار بے شک مسلح ہو ا اگر وہ میرے قابو میں آ جائے تو میں اسے ہلاک یا بے ہوش کر کے ہتھیار حاصل کر لوں ا۔ پھر ان بھیڑیوں کے بھٹ سے نکلنے کے امکان بڑھ جائیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہرے دار کو کس طرح اتنے قریب لایا جائے کہ اس پر وار کرنے کا موقع مل جائے۔

میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس مختصر سی کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ کوٹھڑی کے باہر ہرے دار کے قدموں کی چاپ بڑی یکسانیت سے آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر ھانکا، اس کے اندر کاہلی تھی اور وہ چلتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پھیلی ہوئی کیفیت کو دیکھا اور پھر اس کے بدن کو۔ اس کے جسم پر گہرے رنگ کا وہی ڈھیلا ھالا لباس تھا جو دوسروں کے جسموں پر میں نے دیکھا تھا۔ یقیناً یہ اسی گروہ کا کوئی فرد ہے مجھے پکڑ کر لایا ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا لہ یہ شخص دیہاتی ہے اور یقیناً شہر والوں سے مختلف مزاج رکھتا ہوگا۔ یہ بات نوٹ کر کے ں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ یہ دیہاتی میرے لئے ذرا غور و خوض کا باعث تھا۔ میرا ہن اپنی سرزمین کی جانب لوٹ گیا۔ سیتا گڑھی کا کسان اور مصر کا ملاح قدرتی آفات اور طرے کے وقت ایک ہی جیسا ردعمل دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا راس کے بعد میں زمین پر لوٹنے لگا اور پھنسی ہوئی آواز میں پکارنے لگا۔

”سانپ...... سانپ...... آہ سانپ نے کاٹ لیا مجھے...... سانپ نے کاٹ لیا۔ ارے رگیا میں...... سانپ، سانپ......“ میں نے غور کیا، باہر قدموں کی چاپ رک گئی تھی۔ پھر ہرے دار دوڑتا ہوا کوٹھڑی تک آیا۔ میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ اس نے تیز روشنی اندر ڈالی۔ میں ستور تڑپ رہا تھا۔

”مر گیا میں...... سانپ...... سانپ نے کاٹ لیا ہے مجھے بھائی...... سانپ نے مجھے اٹ لیا ہے۔“ میں نے اب باقاعدہ پچھاڑیں کھانا شروع کر دیں اور ایک ہاتھ سے رے ہاتھ کا پنجہ بھینچ لیا۔ پہرے دار نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

”کہاں ہے سانپ؟“

میں نے مرتے ہوئے جانور کی طرح آنکھیں پھرا کر وہیں پڑے پڑے اس کی طرف

دیکھا اور پھر اشارہ کر کے کہا۔ "وہ.... وہاں...." اور گردن کے اشارے سے گھاس کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں.... وہاں ہے.... اس نے مجھے کاٹ لیا ہے بھائی! میں مر رہا ہوں۔"

"ٹھہرو...... میں دیکھتا ہوں۔"

توقع کے مطابق اس کے اندر کا کسان بیدار ہو گیا۔ میں نے تالہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ پہریدار ایک ہاتھ میں رائفل تھامے، دوسرے میں ٹارچ پکڑے کوٹھڑی کے اندر آ گیا۔ میں کہنیوں کے بل گھسٹتا ہوا وہاں سے دور چلا گیا۔ میں یہ تاثر دے رہا تھا کہ گویا پہرے دار کو سانپ مارنے کے لئے جگہ دے رہا ہوں۔ مگر میں اصل میں چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے پہنچ جاؤں۔ کھلی ہوئی ٹائی میری مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ پہرے دار نے میری جانب دیکھا۔ میں نے اب باقاعدہ سانپ کی طرح لہریں لینا شروع کر دی تھیں اور میرے ہونٹوں پر کف جمع ہوتا جا رہا تھا۔

پہرے دار نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ پہلے وہ سانپ کو مارے گا پھر مجھے دیکھے گا۔ ویسے بھی میری زندگی اس کے لئے کوئی بہت بڑی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ چھپا ہوا سانپ اس کے لئے بھی خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے میری طرف پشت کر لی اور جھک کر رائفل کی نال سے گھاس پھونس کو کریدنا شروع کر دیا۔ میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنے بدن کو جھٹکا دیا اور فرش سے اٹھ کر پنجوں کے بل بے آواز چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ کسی قسم کی آواز نکالتا یا کسی کو پکارتا، میں نے مضبوطی سے تھامے ہوئے ٹائی کے دونوں سروں کو تھام کر بجلی کی سی تیزی سے اس کی گردن میں ڈال کر پوری طاقت سے بل دے دیا۔ وہ بلا کا طاقتور نکلا۔ پہلے جھٹکے میں رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گری اور اس کے گھٹنے مڑ گئے۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گرنے لگا۔ لیکن اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش جاری رکھی تھی۔ اس کے فولادی پنجے شانوں پر سے ہوتے ہوئے میری کلائی میں پیوست ہو گئے۔ میں جانتا تھا اور اسے بھی احساس تھا کہ اس حالت میں جبکہ نرخرے پر ریشمی ٹائی کے پیچ تنگ ہوتے جا رہے تھے وہ زیادہ عرصے تک مدافعت جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے وہ اپنا گلا چھڑا لے۔ جبکہ میرا منصوبہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ اپنی گرفت بڑھاتا جاؤں۔

اچانک ہی اس نے میری کلائیاں چھوڑ دیں اور دونوں کہنیوں کی پوری قوت سے پیچھے

کی طرف پھینکا۔ یہ وار اتنا بھرپور تھا کہ اگر میں پہلے سے سمجھ نہ گیا ہوتا تو لازمی طور پر دونوں کہنیاں دولتی کی طرح میرے چہرے پر آ کر لگتیں، میری گرفت کمزور ہوتی اور پھر جھٹکے سے وہ میرے شکنجے سے آزاد ہو جاتا۔ بہرحال کہنیوں کے اس وار کو میں نے برداشت کیا اور جواب میں اس کی پشت پر گھٹنے کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ دوہرا ہو گیا اور میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگے۔ زرد روشنی میں اندازہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی ہیں اور منہ سے خون بہنا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر کچکچا کر کچھ اور جھٹکے دیئے اور دوسرے لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ میں نے احتیاطاً کچھ دیر اور اپنی گرفت قائم رکھی، پھر آہستہ سے اسے فرش پر لڑھکا دیا۔ اس کے بعد میں نے گھاس پر سے ٹارچ اٹھائی اور اسے جلا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی کمر کی پیٹی میں خنجر اڑسا ہوا تھا۔ رائفل تو میرے لئے بیکار تھی لیکن پھر بھی میں نے رائفل کا میگزین خالی کیا اور خنجر اپنے قبضے میں کر لیا۔

کوٹھڑی سے باہر آ کر میں نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور چابی اپنی جیب میں ڈال کر دائیں بائیں دیکھتا ہوا صحن میں آ گیا۔ اس زمین دوز صحن میں ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ صحن میں کھلنے والی بے شمار محرابوں میں کم روشنی کے بلب جل رہے تھے اور جھینگروں اور صحرائی کیڑے مکوڑوں کی آواز کے سوا مکمل سکوت تھا۔ مجھے جن بھول بھلیوں سے گزار کر لایا گیا تھا، واپس ان سے ہو کر اوپر تک پہنچنا تو ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ صحن میں کھلنے والی اتنی بہت سی محرابوں میں سے بلا سوچے سمجھے کسی بھی محراب میں داخل ہونا خطرے میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا۔ اس لئے کہ میں نے دیکھا تھا کہ مجھے اغوا کرنے والے انہی محرابوں میں داخل ہو کر گم ہو گئے تھے۔ مگر میں اس زمین دوز صحن میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ خدا معلوم کب کون نکل آئے۔

میں نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے اور صرف موزے پہنے تیزی کے ساتھ بے آواز چلتا ہوا اس منحوس جگہ سے نکلنے کے لئے راستے تلاش کرنے لگا۔ زیادہ تر محرابوں میں ایسی ہی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جیسا کہ میرا قید خانہ تھا۔ میں نے کئی محرابوں کو دیکھا اور پاگلوں کی طرح ان میں جھانکتا پھرا۔

نجانے کتنی ہی دیر میں اس کیفیت کا شکار رہا۔ ایک محراب میں داخل ہوا تو اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ بس چھٹی حس ہی تھی جس نے مجھے فوراً ہوشیار کر دیا تھا۔ میں ستون

کی آڑ میں ہو گیا۔ اگر ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو میں دھر لیا جاتا کیونکہ جونہی میں محراب میں داخل ہوا، ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر تین تنومند سیاہ فام ڈھیلے ڈھالے لباس میں نکلے اور برابر کی دوسری کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے دروازے پر دستک دی، کسی نے فوراً ہی دروازہ کھولا اور تینوں دروازے سے داخل ہو گئے۔ ان میں سے آخری آدمی نے احتیاط سے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے ان کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اوپر کی جانب سیڑھیاں طے کر رہے ہوں۔ چونکہ اس وقت گہرا سناٹا تھا اس لئے ہلکی سے ہلکی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔
پھر قدموں کی چاپ ختم ہو گئی اور اس طرح اس زمین دوز دنیا میں سناٹا چھا گیا۔ ان لوگوں کا یکایک برآمد ہونا اور چلا جانا میرے اعصاب کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی تھا۔ میں بال بال بچا تھا۔ لیکن اس تجربے نے مجھے روشنی دکھائی تھی۔ اتنی دیر سے میں جس راستے کو تلاش کر رہا تھا، وہ مجھے مل گیا تھا۔ یہ دروازہ اوپر جانے والی سیڑھیوں پر بنا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے یہ حبشی لوگ اندر سے کنڈی نہ چڑھا گئے ہوں۔

بہر حال دو تین منٹ انتظار کے بعد پھر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دروازے کو دھکا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے چپکے سے پہلی سیڑھی پر چڑھ کر کنڈی چڑھا دی۔ سیڑھیوں پر اسی طرح کمزور سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بیس پچیس سیڑھیوں کے بعد ایک مختصر سی لینڈنگ تھی۔ یہاں مختلف سمتوں والے دروازے بنے ہوئے تھے۔ پھر کچھ سیڑھیاں اوپر کو چلی گئی تھیں۔ میں پھر تیزی سے سیڑھیاں اوپر چڑھتا چلا گیا۔ ایک بار پھر بیس پچیس سیڑھیوں کے بعد لینڈنگ ملی۔ یہاں بھی دروازے بنے ہوئے تھے۔ میں نے آہستگی سے ان دروازوں کے پٹوں کو دھکیلا، دروازے اندر سے بند تھے۔ اس لینڈنگ کے بعد چند سیڑھیاں اور تھیں۔ اور پھر چھت نظر آنے لگی تھی۔ شاید زمین کی سطح تھی۔ بہر حال میں تیزی سے چڑھتا ہوا یہ سیڑھیاں بھی طے کر گیا۔ سیڑھیاں ختم ہو گئیں۔ لیکن یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ ایک جنگلا سا بنا ہوا تھا۔ اس جنگلے کے پار میں نے دیکھا کہ طویل راہداری دور تک چلی گئی ہے۔ دونوں طرف دروازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بڑے بڑے ہال بھی بنے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ راہداری طے کی اور کھلے آسمان تلے آ گیا۔

یہ ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب چاند نہیں نکلتا۔ اوپر تارے چمک رہے تھے اور صحرا کی سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں اس خوفناک زمین دوز

ل کی بھول بھلیوں سے نکل آیا تھا اور اب اپنے سفاک دشمنوں سے بچ نکلنے کی ایک کرن مودار ہو گئی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے پہنچ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی اندرونی ہن تھا اور چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ دور ایک مختصر سا دروازہ ظر آیا جس پر معمول کے مطابق مدھم بلب جل رہا تھا۔ میں نے اس بات کو خاص طور سے وٹ کیا تھا کہ اس عمارت میں بہت ہی کم روشنی والے بلب جل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں عمارت میں بجلی پیدا کرنے کے لئے کوئی چھوٹا سا جنریٹر لگا ہوا ہو۔ اس کے سوا ڈھندلی ور گدلی روشنیوں کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ابھی میں ماحول کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دور سے اس دروازے پر کوئی سایہ نظر آیا۔ ہی ڈھیلے ڈھالے سیاہ کپڑے۔ لمحے بھر کے لئے رائفل کی نال چمکی اور میں دبک گیا۔ یہ بھی کوئی پہرے دار تھا۔ میرے لئے یہ نئی آزمائش کی سب سے بڑی کڑی تھی۔ طویل صحن کے دوسرے سرے پر باہر نکلنے کا دروازہ تھا اور دروازے پر مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ دروازہ مقفل ہو گا۔ پتہ نہیں اس کی چابیاں کہاں ہوں۔ صحن پار کر کے اس سنتری پر قابو پانا اور پھر دروازے کا تالا کھولنا بہت ہی مشکل اور سنسنی خیز کام تھا۔ مگر ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔ کیا کروں۔ رائفل کے مقابلے میں خنجر کی بساط کیا ہوتی ہے۔ پھر بھی میں نے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ بہر حال رائفل بھی میرے لئے بے مقصد ہی تھی۔

چند لمحات انتظار کرنے کے بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ پہرے دار پچھلے دروازے کے سامنے رکا، پھر اس نے کندھے سے رائفل اتاری اور منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید وقت کا اندازہ لگا رہا ہو۔ وہ جتنی دیر صحن کی طرف رخ کر کے کھڑا رہا، میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا، سانس روکے دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ پھر وہ مڑا اور دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل گیا اور دروازہ بھیڑ گیا۔

میرے لئے اب کچھ کر گزرنے کا وقت تھا۔ میں تیزی سے جھپٹ کر دروازے پر پہنچا اور دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا اور دروازے کے باہر میں نے جو کچھ دیکھا، مجھے حواس باختہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ مجھ پر یہ ہولناک حقیقت منکشف ہوئی کہ دروازہ باہر کو نہیں کھلتا، اس کے آگے ایک ڈیوڑھی تھی اور پھر ایک وسیع احاطہ نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی تک اپنے دشمنوں کے علاقے میں تھا جبکہ میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں باہر نکل گیا ہوں۔

مجھ سے چند ہی گز کے فاصلے پر وہی پہرے دار میری طرف پشت کیئے جھک کر فرش سے کچھ اٹھا رہا تھا۔ میں نے چونکہ اپنے جوتے بغل میں دبائے ہوئے تھے اور اس وقت میری تمام تر توجہ اس پہرے دار کی طرف تھی اور میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیا اٹھا رہا ہے کہ اچانک ہی میری بغل سے ایک جوتا نکل کر فرش پر جا گرا۔ آواز سنتے ہی پہرے دار تیزی سے گھوما۔ اور اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اعصاب سوچ سے زیادہ قوت رکھتے ہیں اور انہیں فیصلہ کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے بجلی کی سی چمک کے ساتھ جھپٹ کر اس کے سینے میں بائیں طرف اپنا خنجر پیوست کر دیا۔ میرا یہ حملہ اس قدر اچانک اور وار اس قدر بھرپور تھا کہ پہرے دار کوئی آواز نکالے بغیر تیورا کر فرش پر گرا اور ڈھیر ہو گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا، یہ بھی سیاہ فام تھا۔ رات کے سناٹے میں اپنے دو دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ آزادی ابھی کتنی دور ہے۔ میں واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔ واپس لوٹنے کا مطلب یہ تھا کہ میں پھر سے ان نامعلوم خطرات میں لوٹ جاؤں جن سے میں بچ نکلا تھا۔ نامعلوم خطرے تو آگے بھی میرے منتظر تھے۔ مگر ایک خاموش آواز مجھ سے برابر کہہ رہی تھی کہ میں ایک بڑے خطرے سے آزاد ہو گیا ہوں۔ آگے جو کچھ آنے والا ہے میرے لئے اس سے نمٹنا مشکل نہیں ہو گا۔

بہرحال میں نے احتیاطاً اس شخص کی بھی تلاشی لی۔ رائفل کے علاوہ اس کے پاس ایک پستول بھی برآمد ہوا جس کا میگزین لگا ہوا تھا۔ اس کی بیٹی میں بہت سے فالتو راؤنڈ بھی تھے۔ میں نے پہلے ہی کی طرح اس رائفل کا میگزین بھی خالی کیا اور ایک طرف سے قالین کا کونا اٹھا کر قالین کے نیچے رائفل چھپا دی۔ اب میرے پاس ایک خنجر، ایک بھرا ہوا پستول اور بہت سے کارتوس تھے۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا، سامنے ایک کوٹھڑی سی تھی جو شاید پہرے دار کے لئے مخصوص ہو گی۔ آگے بڑھ کر میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور پہرے دار کی لاش اندر ڈال دی اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر میں نے وہ جگہ عبور کی اور ایک پختہ دالان میں پہنچ گیا۔ یہ مربع عمارت تھی جس میں چاروں طرف دالان نکالا گیا تھا۔ کافی روشنی تھی یہاں۔ میں نے دیکھا کہ دالان میں گہرے رنگوں کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دالان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سادہ فانوس بھی لٹک رہے تھے جو نیچے کی نسبت زیادہ روشن تھے۔ دالان میں سنہری لکڑی والے دروازے تھے جن میں رنگین شیشوں سے مربع، مثلث اور مستطیل بنا کر پہاڑیوں، وادیوں اور پھول پتیوں کے نقش ابھارے گئے تھے۔ ان

رنگین شیشوں سے باہر کی روشنی چھن چھن کر اندر پہنچتی ہو گی تو ہر دروازے سے سحر کی طرح رنگین اور روشن مناظر دکھائی دیتے ہوں گے۔ دروازے بے شمار تھے۔ یہ حجروں کے دروازے تھے۔ میں نے اس قدر خوبصورت دروازے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ دو دروازوں کے درمیان دیوار کا جو مختصر حصہ ہوتا ہے اسے بھی ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھ چھ فٹ کے شفاف آئینے خاصی بلندی پر بڑی ترتیب سے دیوار پر جڑے ہوئے تھے۔

ابھی میں دالان کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے عقب میں کسی وحشی جانور کے غرانے کی سی آواز سنی۔ میرا پستول میرے پاس موجود تھا۔ اس پر میری گرفت سخت ہو گئی اور میں خاموشی سے ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر آواز کا جائزہ لینے لگا۔ یہ یقیناً چیتوں کے غرانے کی آواز تھی اور میرے عقب سے آئی تھی۔ چیتے ایک بار پھر غرائے۔ میں نے جنگلوں میں بہت عمر گزاری تھی۔ درندوں وغیرہ کی آوازیں میری مکمل شناسا تھیں۔ اندھیرے اور اجالے میں کتنے ہی فاصلے سے مختلف درندوں کی آوازیں پہچان لینا میرے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ چنانچہ ایک لمحے میں مجھے پتہ چل گیا کہ یہ چیتے تھے اور ان میں ایک مادہ تھی۔ مگر ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔ میں نے ستون کے پیچھے کھڑے کھڑے سامنے والے ستونوں کی رنگین قطار پر نگاہیں دوڑائیں، سارے دروازے بند تھے۔ اندر مکمل تاریکی تھی چیتوں کی غراہٹ کے سوا جو وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی اب ہر طرف مکمل سناٹا تھا۔ میں نے ہشمان ذکری جیسے دولت مند مجرموں کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سنی تھیں مگر یہ بہت عجیب مسئلہ تھا۔ اگر یہ ہشمان ذکری کا محل ہے تو اس سفاک مجرم نے یہاں پر خونخوار جانور کیوں اکٹھے کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا کوئی کاروباری مسئلہ ہی ہو۔ اکثر اس طرح کے لوگ افریقہ کے مختلف جنگلوں سے اس طرح کے جانور حاصل کر کے یورپ اور امریکہ کے ملکوں کو بیچتے ہیں۔

بہرحال میں ستون کی آڑ میں کھڑا ہو کر سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا اور دو عورتیں ایک بڑا سا دھات کا برتن اٹھائے باہر آئیں۔ یہ دونوں بھی سیاہ فام عورتیں تھیں۔ دونوں افریقہ کی کسی نامعلوم زبان میں باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ میں دالان کے ستون کے پیچھے دبک گیا۔ یہ تنومند اور کرخت خدوخال والی حبشی عورتیں تھیں۔ برتن ہاتھ میں اٹھائے وہ سیدھی نکل گئیں۔

آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے لیکن صحن میں خاصی تاریکی تھی۔ صحن کے بیچ و بیچ

درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ جدھر یہ حبشنیں گئی ہیں ادھر سے یقیناً کوئی باہر جانے کا راستہ نکلتا ہوگا۔ کیوں نہ میں ان کا پیچھا کروں۔ لیکن اگر میں ان کے پیچھے جاتا ہوں تو چھت کے بے شمار فانوسوں کی روشنی میں دور سے ہی میری موجودگی کا پتہ چل جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ صحن پار کر کے میں ان کے پیچھے پیچھے جاؤں۔ چنانچہ میں درختوں کے اس جھنڈ کی جانب چلنے لگا۔ لیکن ابھی تھوڑا سا ہی آگے بڑھا تھا کہ میں نے کوئی بیس فٹ اونچی فولادی جالی کا جنگلا دیکھا۔ پہلی نظر میں یہ فولادی جالی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اب میں نے دالانوں سے آتی روشنی میں دیکھا کہ صحن میں ہر طرف جنگلا بنا ہوا ہے۔ گویا صحن پار کر کے ان حبشی عورتوں کے پیچھے جانے کی صورت نہیں تھی۔ مجھے ہر حال میں دالانوں سے گزرنا ہوگا۔ مگر دالانوں کی یہ تیز روشنی میرے لئے انتہائی خوفناک تھی۔ مجھے جلدی کچھ کرنا تھا۔ اس لئے کہ دالانوں سے گزرتے ہوئے وہ عورتیں اب بائیں ہاتھ پر پہنچ گئی تھیں۔ اب اگر میں حجروں کے سامنے سے گزرتا ہوا جاتا ہوں تو شاید انہیں جا پکڑوں ورنہ وہ تو میرے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایسی جگہ روپوش ہو جائیں جس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکے۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور ہاتھوں سے اس فولادی جنگلے کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ مجھے اچانک اس فولادی جنگلے کے حصار میں ایک پھاٹک سا بنا نظر آیا۔ لوہے کے فریم میں ایک زنجیر جڑی ہوئی تھی۔ میں نے زنجیر کھول کر فریم کو اندر کی طرف دھکیلا، پھاٹک کھل گیا تو میں نے پیروں سے ٹٹول کر دیکھا۔ دو سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جن سے اتر کر میں صحن کے حصار میں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس فولادی جنگلے میں داخل ہو جاتا ہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دوسرا کوئی اس حصار سے باہر جانے کا پھاٹک بھی ہوگا۔ اور اگر اس اندھیرے میں وہ مجھے مل بھی جائے گا تو میں......

ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ ایک بار پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اور مجھے ایک لمحے میں اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی چوکیدار ہے۔ میں نے خوف کی جھرجھری لی۔ ایک چوکیدار کو تو میں موت کے گھاٹ اتار آیا ہوں، اب یہ کون آرہا ہے؟ قدموں کی چاپ برابر قریب آتی جارہی تھی۔ میں نے صحن کے اندھیرے میں درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا۔ بچنے کی بس ایک یہی صورت رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سیڑھیاں اتر کر فولادی جنگلے کا راستہ تلاش کیا اور آہستگی سے لوہے کا یہ پھاٹک بھیڑ دیا۔ صحن میں روشیں بنی ہوئی تھیں اور چھوٹی چھوٹی مصنوعی جھیلوں میں پانی چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ پام، کھجور اور

دوسرے درختوں کے پودوں کے قطعے تھے۔ میں خاموشی سے درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں جا کھڑا ہوا اور روشن دالانوں اور قدرے تاریک ڈیوڑھی کی طرف آنکھیں گاڑھ دیں۔ آنے والا ڈیوڑھی سے گزر کر دالان میں آکھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں ملبوس ایک سیاہ فام حبشی کندھے سے رائفل لٹکائے تجسس کے عالم میں صحن کی طرف دیکھ رہا ہے۔

وہ بہت دیر تک خاموش کھڑا شاید کسی قسم کی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر جیسے اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے کمر پر سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر پھیرے، جماہی لی اور اسی طرح نپے تلے قدموں سے واپس جانے کے لئے مڑا۔ لیکن جیسے ہی وہ مڑا اچانک ہی مجھے اپنے عقب سے چیتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی...... اور میں نے گھوم کر دیکھا۔ مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر افریقی چیتوں کا ایک جوڑا ان مصنوعی جھاڑیوں سے سر نکالے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور ان کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں......!

انتہائی خوف نے کچھ لمحے کے لئے میرے دل و دماغ سے سارے رابطے منقطع کر دیئے۔ میں بدحواسی کے عالم میں سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔ خوف کی وجہ بالکل درست تھی۔ میرے ایک جانب مسلح شخص کھڑا ہوا تھا اور دوسری جانب خونخوار چیتے جن کا انداز یہ بتا رہا تھا میرے تجربے کی بنیاد پر کہ یہ مجھ پر جست لگانے ہی والے ہیں۔ اس شخص نے غالباً مجھے نہیں دیکھا تھا اور چیتوں کی اس غراہٹ کی جانب متوجہ ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔

”سو جاؤ...... ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔ تمہاری بھوک نے تو میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ آخر دوسرے بھی تو سو رہے ہیں۔ صرف تمہی ہو جنہیں بھوک لگ رہی ہے۔“

یہ لفظ ”دوسرے“ اس سے زیادہ خوفناک تھے۔ یعنی اس کے علاوہ یہاں اور بھی چیتے ہیں۔ اس فولادی حصار میں ہر طرف میرے لئے موت ہی موت ہے۔ سر چکرایا جا رہا تھا۔ ادھر دونوں چیتے شعلہ بار آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ میں پتھر بنا، سانس روکے تقریباً ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے پہریدار نے ان چیتوں کی اس کیفیت پر بالکل غور نہیں کیا۔ پھر وہ ان سے واقف ہی نہیں تھا کہ چیتوں کی یہ کیفیت کیسے دیکھ کر ہوتی ہے۔ پہرے دار نے زور سے جماہی لی اور منہ

سے ہو ہو کی آوازیں نکالنے لگا۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ ایک ایک سیکنڈ پہاڑ کی طرح گزر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیتوں پر پستول سے گولیاں چلاتا ہوا جنگلے کا پھاٹک کھول کر باہر نکل بھاگوں چاہے اس کے لئے مجھے اس چوکیدار کی زندگی بھی کیوں نہ لینی پڑے۔ اس عذاب ناک وحشت سے تو چھٹکارا ملے گا۔ اس کے بعد چاہے سارا اسکندریہ ہی جاگ پڑے اور مجھ پر گولیوں کی بارش شروع ہو جائے۔

سرد خوف کے اس عذاب سے اگر مجھے فوراً ہی نجات نہ ملی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا دماغ اچانک خربوزے کی طرح پھٹ جائے گا۔ دوسری طرف سپاہی ایسا لگتا تھا جیسے وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے گا۔ آخر کار میں نے پستول پر اپنی گرفت سخت کر لی۔ میں نے سوچا کہ چیتوں کے جوڑے کے چھلانگ لگانے سے پہلے اگر یہ شخص یہاں سے نہ ہٹا تو میں گولی مار کر اسے ہلاک کر دوں گا اور اس کے بعد چیتوں پر گولی چلا کر یہاں سے بھاگوں گا۔ اس کے لئے صرف دس تک گنتی گننا کافی ہے۔

ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ...... چھ...... سات...... آٹھ...... پستول کے ٹریگر پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ میں چیتوں کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر پہرے دار کے بدن میں جنبش ہوئی اور وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ پتہ نہیں یہ کس طرح کے چیتے تھے۔ یا تو وہ خود بھی صورتحال کا جائزہ لے رہے تھے اور فوراً ہی مجھ پر حملہ نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر میری تقدیر انہیں روکے ہوئے تھی۔ میں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ یہ یقیناً پہریداروں کی دوسری کوٹھڑی کا دروازہ ہوگا۔

چیتے میرے بے حس و حرکت جسم پر نگاہیں گاڑھے تھک گئے تھے۔ یہاں تک کہ پہلے نر نے جماہی لی اور اس کے بعد مادہ نے۔ پھر نر نے جھاڑیوں میں اپنا سر چھپا لیا البتہ مادہ میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی غراہٹ دھیمی ہو گئی، پھر بند ہو گئی۔ اور اس کے بعد میں نے ہلکی سی جنبش سے یہ محسوس کیا کہ وہ واپس چلے گئے ہیں۔ میں تیزی سے فولادی جھاڑیوں کے اس حصار سے باہر نکل آیا اور پھاٹک بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ دالانوں سے گزر کر راستہ تلاش کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ فانوسوں کی روشنی میں دالانوں میں بچھے قالین پر دبے پاؤں چلتا ہوا آخر میں اس طرف روانہ ہو گیا جدھر میں نے ان دونوں عورتوں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ویسے یہاں تمام حجرے ایک طرح کے تھے۔ دالان کی

چھت پر ایک طرح کے ہی فانوس لٹک رہے تھے اور دالان سے اتر کر نیچے جالی کا چوطرفہ حصار تھا۔ میں نے وسیع و عریض صحن میں نگاہ ڈالی۔ چیتوں نے میری بو سونگھ لی تھی یا شاید ان کے شور مچانے کا وقت تھا۔ کیونکہ ایک بار پھر وہ جوڑا فولادی جالی کے اس پار غراتا ہوا جالی کے قریب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ بڑی پریشانی کی بات تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ اپنی رفتار ہلکی کر دوں۔ اگر میں دوڑتا تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے چیتے غرا غرا کر لوگوں کو وہاں جمع کر لیتے۔

جیسے ہی میری رفتار ہلکی ہوئی ان کا جوش و خروش بھی کم ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ چیتوں کا ایک اور جوڑا ان کے ساتھ ساتھ آ گیا ہے۔ میں اس طرح کتنی دور تک چلتا رہا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

دالان میں ایک اور موڑ آیا۔ میں نے دھیان ہٹا کر حجروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ سب حجروں میں اندھیرا تھا اور سناٹا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس عمارت کا یہ حصہ بالکل خالی ہے۔ مگر میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے ان عورتوں کو وزنی برتن اٹھائے ایک حجرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان چوکیداروں کو بھی۔ خیر ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ حصہ بھی آباد ہوگا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ رات کے اس پہر کی نیند خاصی گہری ہوتی ہے اور اسی نیند نے ابھی تک مجھے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

اچانک ہی میں نے دالان کے دوسرے سرے پر رنگین روشنیوں کی چمک دیکھی اور اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ نرم قالین پر بے آواز چلتا ہوا میں اس روشن حجرے کی طرف بڑھا۔ پستول پر انگلیوں کی گرفت آپ ہی آپ سخت ہو گئی۔ تمام حجروں کی طرح اس حجرے کے کیواڑ بھی رنگین شیشوں سے مزین تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا حجرے کے دروازے کے برابر جا کھڑا ہوا۔ پالش کی ہوئی کھڑکی میں کوئی بالشت بھر کا مثلث تراشا گیا تھا اور اس میں سرخ شیشہ جڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سرخ مثلث سے آنکھیں لگا دیں۔ سرخ شیشے کے اس مثلث سے اندر ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ حجرے میں گہرے سرخ رنگ کے قالین بچھے تھے۔ سرخ رنگ کے ایک چھپر کھٹ پر ریشمی جالی تنی ہوئی تھی اور سرخ دیوار پر قابل اعتراض تصویریں آویزاں تھیں۔ چھت پر سرخ فانوس لٹک رہا تھا اور کمرے میں سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سب کچھ سرخ نظر آ رہا تھا۔ سرخ گلدان، سرخ پھول۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آہ...... آہ، یہ طلسم کب ٹوٹے گا؟ کس مشکل میں پڑ گیا ہوں میں؟ کس مشکل میں پڑ گیا

ہوں؟ میں نے ہر طرف گردن گھما پھرا کر دیکھا، کمرہ خالی تھا۔ مگر نہیں، یہ غلطی تھی میری۔ کمرہ خالی نہیں تھا۔ سرخ آئینے کے سامنے سرخ ملبوس والا سرخ رنگ کا ایک مجسمہ ایستادہ تھا۔ قد آدم مجسمہ۔ میری طرف مجسمے کی پشت تھی۔

دفعتہً ہی مجسمے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک بازو اٹھا کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔ ڈھیلے ریشمی گاؤن کی آستینیں سمٹ کر کہنی سے اوپر آ گئیں میں نے دیکھا کہ وہ مجسمہ نہیں بلکہ گداز بانہوں والی ایک خوبصورت عورت ہے۔ جیتی جاگتی عورت جس نے ایک جھٹکے کے ساتھ دونوں ہاتھ گرا دیئے اور سرخ ریشمی گاؤن کی آستینوں نے لٹک کر سرخ گداز بانہوں کو ڈھک لیا۔

عورت کی آواز ابھری۔ غالباً اس نے لمبی جماہی لے کر منہ سے یہ آواز نکالی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور شیشے کے پاس سے ایک چوڑا سا کنگھا اٹھا لیا اور اس کے بعد اپنے گہرے سرخ بالوں کو سلجھانے لگی۔ اس کے ہاتھ کنگھا چلا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں حسین مالائیں پڑی ہیں۔ سرخ موتیوں کی مالائیں اس کی سرخ بانہوں پر پھیلتی رہیں۔ پھر یکایک اس نے جھنجلا کر کنگھا پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور جھک کر شیشے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک میری طرف پشت کئے کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ لمحے وہ اسی طرح کھڑی رہی اور اس کے بعد سیدھی تن کر کھڑی ہو گئی اور اپنے ریشمی گاؤن کی ڈوریوں سے کھیلنے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سیدھی کھڑی ناک، بھرے بھرے سرخ ہونٹوں والی اس عورت کا یہ آدھا رخ اتنا دلکش تھا کہ میرے پاؤں وزنی ہو گئے۔ میں جو باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا اب خاموشی سے اس ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں تک وہ اپنے لبادے کی ڈوریوں سے کھیلتی رہی۔ اور پھر جیسے ایک زوردار آواز کے ساتھ محل کی چھت میرے سر پر آ گری۔ اس نے جھٹکے سے اپنے لبادے کی ڈوریاں کھول دی تھیں۔ ریشمی لبادہ اس کے بھرے بھرے شانوں پر پھسلتا ہوا اس کے پیروں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا لال بھبھوکا بدن سرخ شیشے کے مثلث میں کوندنے لگا۔ اب وہ میرے بالکل مقابل کھڑی تھی جلتے ہوئے دیئے کی لو کی طرح۔ وہ ایک بار کانپی، اس نے شیشے کے سرخ مثلث کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ بلا کی حسین عورت تھی۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک تل تھا اور اس کی آنکھوں میں صحرائے عظیم کی تمام راتیں رچی ہوئی تھیں۔ میں پتھرا گیا

تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بار پھر مجھے وردان سادھانی نے سنبھلنے کا موقع دیا تھا۔ لیکن کیا انسان یہ سب کچھ دیکھ کر سنبھل سکتا ہے؟

وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے ہر قدم کی آواز آگ میں تپائی ہوئی ہتھوڑوں کی طرح میری کنپٹیوں پر پڑ رہی تھی۔ ادھر میرے عقب میں چیتوں کے جوڑے رات کے سناٹے کو بھنبھوڑ کر کھائے جا رہے تھے۔

شعلے نے پھر ایک آہ بھری اور مجھ آدم کے بیٹے کو زندہ درگور کر دیا...... میں دیوانگی کے عالم میں آگے بڑھا اور یہ سب میرا عمل نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن بس انسانی فطرت جو شاید خود انسان کی سمجھ میں بھی آج تک نہیں آئی۔ وہ اگر اپنے حواس میں ہوتی تو میرے اس طرح اچانک گھس آنے پر چیخ مار دیتی اور میں دھر لیا جاتا۔ مگر اس کی آنکھیں نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے دروازے سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا اور نشہ آور انداز میں مسکرا دی۔ میں نے ایڑی کی چوٹ سے دروازہ بند کیا اور آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ باہر شاید صحن میں موجود چیتے لڑ پڑے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور پھر کچھ لمحات گزر گئے...... وہ لمحات جن کے لئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں ان سے بچوں تو تب ہی مہتر بدھا بن سکتا ہوں۔ اشبھ بھاونائیں میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ جن برے راستوں پر نکل گیا تھا ان سے واپسی شاید اب میرے لئے ممکن نہیں رہی تھی۔ ایلس فیوری سے آغاز ہوا تھا اور انجام کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں ہو۔ بہرحال سنگ سرخ کا یہ مجسمہ آہستہ آہستہ سکون پاتا چلا گیا۔ اور پھر اچانک ہی اس کے اندر جیسے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ بری طرح تڑپی اور حسین آواز میں کہا۔

''کون ہو تم......؟''

میں نے قالین پر ایک کہنی ٹکائی، جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس کا نشہ تو اتر گیا تھا لیکن میرا سارا وجود نشے میں سرشار تھا۔ میرے منہ سے آواز نکلی۔

''میں چیتا ہوں...... خاموش رہو۔''

''کک...... کیا بکواس کر رہے ہو...... تم یہاں کیسے آئے؟''

''میں نے کہا نا خاموش رہو۔''

''بتاتے کیوں نہیں۔ کہاں سے آئے ہو تم؟''

"اس آئینے سے نمودار ہوا ہوں۔ کیا تم نے میرا خواب نہیں دیکھا تھا؟" میں نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں اپنا وہم سمجھی تھی۔"

"اور اب کیا سمجھی ہو تم؟"

"چیتا۔" وہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ٹھیک ہے...... اب تم صحیح سمجھی ہو۔"

"جانتے ہو میں تمہیں گولی بھی مار سکتی ہوں۔"

"اس سے پہلے میں تمہیں چبا جاؤں گا۔"

"ہشمان ذکری کو جانتے ہو؟" اس نے پھر کہا۔ انداز میں طنز تھا۔ میرے دماغ کو پہلا جھٹکا لگا اور تھوڑی دیر پہلے جو نشہ میرے سارے حواس پر طاری تھا اس میں کچھ کمی واقع ہونے لگی۔

"تو یہ ہشمان ذکری کا محل ہے؟"

"ہاں...... اور کچھ ہی لمحے جاتے ہیں کہ وہ آنے والا ہے۔"

یہ الفاظ میرا پورا نشہ اتارنے کے لئے کافی تھے۔ میں نے کمرے کو گردش کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اگر ایسا ہے تو یہ صورتحال تو انتہائی خطرناک ہے۔ اتنے خطرناک حالات سے گزر کر آزادی کی ایک امید پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ہشمان ذکری کا نام سن کر میرا دماغ چکرا گیا اور پھر لڑکی کے یہ الفاظ کہ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا ہے۔ اگر وہ اس ماحول میں آ گیا اور اس نے صورتحال کا صحیح اندازہ لگا لیا تو جو نتیجہ ہو سکتا ہے مجھے اس کا پورا اندازہ تھا۔ لڑکی کو یقینی طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ میری تھوڑی دیر پہلے کی ساری خوش فعلیاں ختم ہو گئی ہیں اور ہشمان ذکری کے نام نے میرے ہوش و حواس درست کر دیئے ہیں۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"نام نہیں بتایا تم نے اپنا ڈیئر؟"

میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "چیتا...... کیا تمہیں یہ نام پسند نہیں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر آہستہ سے بولی۔ "وہ تو پرانی بات ہے...... میں تمہارا نیا نام پوچھ رہی ہوں۔ کیا سمجھے؟"

میں اس کے الفاظ کے طنز کو محسوس کر کے واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے کہا۔

"میرا نام خاقان جمشیدی ہے۔"

"نام تو بڑا اچھا ہے۔ ویسے تم بھی کم اچھے نہیں ہو خاقان! سچ جانو، میں برے کردار کی عورت نہیں ہوں، لیکن تم نے مجھے خرید لیا ہے۔"

"تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"امینہ۔" اس نے جواب دیا۔

"ویسے امینہ! بس کیا کہوں میں تم سے۔ بعض اوقات اپنا وجود بھی بے مقصد اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ تم پر کتنا اختیار رکھ سکتا ہوں۔"

وہ بھی جذباتی ہو گئی اور اس نے کہا۔ "خاقان! ہم سب مجبور ہیں۔ ہم سب بہت مجبور ہیں۔ ہشمان ذکری میرا مالک ہے۔ اس نے مجھے خرید لیا ہے۔ وہ بے پناہ دولت مند ہے۔ لیکن دولت سب کچھ نہیں ہوتی۔ تم...... تم میرے وجود کی گہرائیوں میں اتر گئے ہو اور جو شخص روح کو خریدے اس پر کائنات قربان ہے۔ سونے چاندی کے چھپرکھٹ، مخمل کے لحاف اور زردار پردوں میں قید ہو کر صرف ایک سونے کے پنجرے کا قیدی تو سمجھا جا سکتا ہے اپنے آپ کو۔ لیکن اپنی روح کے خریدار سے صحیح معنوں میں محبت ہوتی ہے۔ نجانے تم کیا سمجھ رہے ہو گے میرے ان الفاظ سے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی تو وہ آہستہ سے بولی۔ "بتاؤ تو، تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں میں؟ مجھ سے کچھ مانگو، کچھ بھی مانگ لو مجھ سے۔ بس آزادی مت مانگنا۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں...... میں بھی کیا کہہ سکتا ہوں امینہ! حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی تم سے دور نہیں جانا چاہتا۔"

"آؤ...... میں تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی۔ تم میری خواہشات کی تکمیل ہو۔ تم میری بے کیف زندگی کا کیف ہو۔ آؤ پلیز......" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے وہاں سے نکال کر لے چلی۔ ذرا سی الجھن ضرور تھی ذہن میں لیکن امینہ کے انداز سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ درحقیقت مجھ پر مرمٹی ہے۔ ایک نئی کہانی شروع ہو گئی تھی۔ بے چارہ وردان سادھانی جو ہر بار مجھ پر اعتبار کرتا تھا اور ہر بار میرے لئے نیکیوں کے تھال لے کر آ جاتا تھا اچانک ہی میں ان تھالوں میں سوراخ کر دیا کرتا تھا۔

بہرحال اس کے ساتھ میں دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک آبنوسی

صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بیٹھو...... میں آتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ سرخ قالین کے چاروں کونوں پر چار آبنوسی صوفے بچھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ درمیانی حصہ خالی تھا۔ آتش دان کے کارنس میں ڈائمنڈ کٹ شیشے کے کنٹر میں شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں جن کے اردگرد چھوٹے گلاس اور پیالے سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف میزوں پر طاؤس، رباب، دف اور دیگر ساز رکھے ہوئے تھے۔ چھت میں جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے تھے جن میں ہلکے بلب روشن تھے۔ ایک طرف خوشبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور ہلکے ہلکے دھوئیں سے کمرہ مہک رہا تھا۔

اب سے کچھ دیر پہلے خوفناک درندوں اور سفاک پہرے داروں کے نرغے میں پھنسا ہوا تھا، ایک بدنصیب قیدی تھا، میں جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کربناک صدیوں پر محیط تھا۔ دو خونخوار پہرے داروں کو جہنم رسید کر کے اب میں ایک الف لیلوی اور بغداد کی رنگین شام کے حسین مناظر سے گزر رہا تھا۔ اس وقت ہیگ، اسمتھ، ہشمان ذکری، رحمان یزدانی سب کے سب پس منظر میں چلے گئے تھے جہاں میں کیف ونشاط کی بلند پروازیں کر رہا تھا اور اسکندریہ کی حسین سرزمین، مصر کی قلوپطرہ کے سوا اور کوئی میرا شریک سفر نہیں تھا۔

امینہ کو دوسرے حجرے میں گئے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ میں انتظار کرتے کرتے اکتا کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ برآمدے سے ملحق کمرے کی طرف والا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں اس کو مخدوش تصور کرتے ہوئے کنڈا چڑھانے کے لئے آگے بڑھا، اسی وقت کسی نے برآمدے سے امینہ کا نام لے کر آواز دی اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا......
یہ ہشمان ذکری کی آواز تھی۔

ایک لمحے کے لئے میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھاتا، امینہ بجلی کی طرح دوسرے کمرے سے نکلی اور مجھے ایک طرف دھکیل کر باہر جھانکنے لگی۔ لیکن پتہ نہیں کیا ہوا، امینہ نے عربی میں کچھ کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ابھی تک دروازے کے درمیان ہی کھڑی ہوئی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور میری طرف مڑ کر بولی۔

''شکر ہے مشکل ٹل گئی۔ اب تم آرام کرو۔''

''کون تھا؟''

''نہیں، اگر تم اسے ہشمان ذکری سمجھ رہے ہو تو وہ نہیں تھا۔ بہر حال خطرہ تو ہے۔ کیا سمجھے؟'' اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا پھر بولی۔ ''چلو...... اب تم آرام کر لو۔ میرا مطلب ہے کہ اب مجھے بتاؤ کہ زندگی کیا ہے۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ بہر حال میں اسے بتاتا رہا کہ زندگی کیا ہے۔ اور اس کے بعد وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سو گئی۔ جس وقت ہماری آنکھ کھلی، روشن دانوں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو گیارہ بج چکے تھے۔ امینہ بھی جاگ گئی اور پھر اچانک جیسے وہ سہم سی گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی اور وہ بولی۔

''میں باہر جا رہی ہوں۔ تم اس وقت تک باہر نہ نکلنا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔''

اس کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر پھر دروازہ بند کر دیا اور سوچنے لگا۔ صورتحال اس وقت اتنی غیر سنگین تو نہیں ہو گی۔ یقیناً ہشمان ذکری کو پہرے داروں کی لاشوں کا پتہ تو مل گیا ہو گا اور پتہ نہیں باہر کیا ہو رہا ہو۔ کون جانتا ہے کہ ان پہرے داروں کا قاتل ابھی تک اسی قلعے نما عمارت میں ہے۔

بہر حال یہ جگہ کوئی مستحکم حفاظت گاہ نہیں تھی۔ کسی بھی لمحے راز کھل سکتا تھا۔ درحقیقت میں بھڑوں کے چھتے میں پھنس گیا تھا۔ اور امینہ جو اس وقت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی، پتہ نہیں آگے چل کر کیا بن جائے۔ نہیں خاقان! میرے دوست، اگر زندگی چاہتے ہو تو نکل بھاگو یہاں سے۔ نجانے کہاں سے میرے ذہن میں تیر کی طرح ایک ہی خیال آ گھسا۔ وہ تختی جسے میں بھول ہی گیا تھا، وہ تختی جس کے لئے میں نے یہ تمام خطرات مول لئے تھے یہیں تو ہے۔ آہا...... کیا یہ ممکن ہے کہ امینہ اس کی تلاش میں کوئی مدد کر سکے۔ ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ باہر سے مجھے آمینہ کی آواز آئی۔

''دروازہ کھولو!''

میں نے تیزی سے دروازہ کھولا تو وہ اندر آ گئی۔ کہنے لگی۔ ''سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ میں ہوں نا، تمہارے چہرے پر خوف کی ایک شکن نظر نہیں آنی چاہئے۔ تم میری جاگیر ہو، میری مملکت ہو، میرے محبوب ہو۔ آؤ چلو، منہ ہاتھ دھوؤ، ناشتہ تیار ہے۔''

''ہشمان ذکری کے بارے میں کچھ نہیں پتہ چل سکا؟''

''وہ شام تک نہیں آئے گا۔ اس وقت وہ سب کے سب ان لاشوں کو ٹھکانے لگا رہے ہیں جو انہیں محل میں ملی ہیں۔'' اس نے کہا پھر مسکرا کر بولی۔ ''اور ایک لاش یہاں موجود

ہے۔ اینہ کی لاش۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو اینہ؟"

"واقعی تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ ختم کر دیا ہے تم نے مجھے۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ ذرا منہ دھو لو۔ باقی ساری باتیں بعد میں کریں گے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا بھی ہے۔"

میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ دو کمروں سے گزرنے کے بعد اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور بولی۔ "وہ غسل خانہ ہے۔"

جب میں منہ ہاتھ دھو کر واپس ہوا تو وہ میز پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے چائے تیار کرنا شروع کر دی۔ بہترین ناشتہ سامنے موجود تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے کچھ پوچھو گی؟"

"ہاں...... پہلا سوال، کیا تم ہندوستان سے آئے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسی کون سی بات ہے کہ ہشمان ذکری اور اس کا گروہ تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی خزانہ موجود ہے یا تم کوکین، سونا یا کرنسی کے اسمگلر ہو؟ آخر وہ کیا بات ہے کہ وہ تمہیں اغوا کر کے لائے ہیں اور...... اور......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اینہ! میں تو صرف ایک سرکاری افسر ہوں۔"

"کیا کسٹم آفیسر؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے؟ ہشمان کسی معمولی آدمی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ وہ لاکھوں اور کروڑوں مالیت سے کم کاروبار نہیں کرتا۔ ایک بات بتاؤ، کیا تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟"

"نہیں ڈیئر! میں تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ اور اس بات کی امید بھی رکھتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ پھر بولی۔ "مگر میں محسوس کرتی ہوں کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ حالانکہ میں ان چند لمحوں میں تمہارے قدموں کی خاک بن چکی ہوں۔ سنو...... عورت ایسی ہی بیکار اور بے تکی سی چیز ہوتی ہے۔ کسی کو زندگی کا مالک بنا لے تو اپنے

آپ کو مٹا ڈالے۔ اب تم مجھے یہاں مت چھوڑنا، میں زندگی کا ہر لمحہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو مجھے اپنے ساتھ ہندوستان لے چلو۔ میں اب کسی کے کام کی نہیں رہی ہوں۔"

میں اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا۔ "یہ تمہاری محبت ہے۔ اور میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ سنو...... مجھے لوہے کی ایک ایسی تختی کی تلاش ہے جس پر ناقابل فہم زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے۔ اور میرے اور ہشمان ذکری کے درمیان یہی محاذ آرائی ہے۔"

"لیکن وہ تختی کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ذکری کے قبضے میں ہے۔ لیکن کس جگہ ہے یہ نہیں معلوم۔ ایک بات بتاؤ اینہ! کیا تم میرے لئے اس کا پتہ لگا سکتی ہو؟"

"یہ بتاؤ اس میں کیا ہے؟ کوئی بڑا خزانہ، کوئی قدیم دفینہ؟"

"اس سے بھی بڑھ کر کوئی چیز۔ اگر وہ دستیاب ہو جائے تو ہم کئی سلطنتیں حاصل کر سکتے ہیں۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا اور اینہ سوچ میں ڈوب گئی۔ میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ وہ بھی بہت دیر تک کچھ نہیں بولی تھی۔ آخر اس نے کہا۔

"بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا ہے تم نے میرے لئے۔"

"نہیں...... اصل میں تم نے اس طرح مجھ سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار کیا تو دل کی بات زبان تک آ گئی۔ ورنہ یہ تمہارا فرض نہیں ہے۔ میں صرف تم میں دلچسپی رکھتا ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے لئے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

"نہیں میری زندگی، میرے اور تمہارے معاملات اب الگ الگ نہیں رہے۔"

"ہاں واقعی، میرے اور تمہارے معاملات اب الگ نہیں رہے۔"

بڑی خوفناک عورت تھی۔ میں اس سے تھوڑا سا مخلص بھی ہوا تھا جو فطرت بن گئی تھی۔ ایلس فیوری کی قربت کے بعد وہ کم بخت بار بار ابھر آتی تھی۔ ایک حسین عورت، ایک ایسی دلکش عورت جسے خوابوں کا تصور سمجھا جا سکے اگر اس قدر قریب ہو اور اس کا حصول اتنا آسان ہو تو خیر میں یہ نہیں کہتا کہ عمر کے ہر حصہ میں انسان اسی انداز میں سوچتا ہے۔ لیکن جس عمر میں اس وقت میں تھا اس میں اس عورت سے زیادہ قیمتی کوئی چیز میرے لئے نہیں تھی۔ جب بگڑ چکا ہوں تو بگڑ ہی چکا ہوں۔ بہرحال دوپہر تک ہم لوگ ساتھ رہے اور

نجانے کون کون سے جہانوں کی سیر کرتے رہے۔ میں نے اسے چکنا چور کر دیا تھا اور اس نے مجھے۔

لیکن وقت سدا ایک سا نہیں رہ سکتا۔ تیسرے پہر کی چائے کے بعد اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور یہ صور اسرافیل پھونکنے میں ایک کالی مصری حسینہ کا ہاتھ تھا جو چائے کی ٹرے میں زیادہ سامان دیکھ کر اینہ کے طرزِ عمل پر کھٹک گئی تھی اور واپس جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں چھپ گئی۔ پھر جب ہم چائے پینے لگے تو کیواڑ کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ چائے پیتے پیتے سامنے والے دروازے کی طرف میری نگاہ اتفاقیہ طور پر اٹھ گئی تھی اور یہ وہ لمحہ تھا جب وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد آہستہ آہستہ کواڑ بند کر رہی تھی۔ صرف ایک لمحہ...... صرف ایک لمحہ میری نظریں اس سے ملیں اور کواڑوں کی درز ہموار ہو گئی۔ میں اینہ سے کچھ کہے بغیر تیزی سے اٹھا اور لباس سے خنجر نکالتا ہوا دروازے کی طرف جھپٹا۔ اینہ میرے طرزِ عمل سے حیران ہو کر میرے پیچھے لپکی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے دروازہ کھولا تو وہ بغیر جدوجہد کے کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو کنیز کواڑ کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر وہ باہر کی طرف بھاگی۔ میں نے پلٹ کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا لیکن اس سے پہلے کہ میری گرفت مضبوط ہوتی، اینہ کو سامنے دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو اندر گھسیٹا، خنجر دانتوں میں دبایا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی۔ میرے ہاتھوں کی گرفت غیر اختیاری طور پر انتہائی سخت تھی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

اینہ حیران حیران اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں یہ اندازہ ہو گیا کہ کنیز ختم ہو گئی ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے فرش پر لٹا دیا۔ اینہ نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا، پھر وہ بولی۔ ”خاقان! آؤ...... یہاں چھپ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔“

وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے سازوں والے کمرے میں جا پہنچی۔ یہاں صوفوں کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے پیچھے چھپا جا سکے۔ جس طرف سے میں اندر داخل ہوا تھا اس کے علاوہ باہر نکلنے کا کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ روشندان اتنے اونچے تھے کہ سیڑھی کے بغیر ان تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال میں یہاں چھپ گیا تھا۔ لیکن مجھے یہ اندازہ تھا کہ اس کمرے میں چھپنا چوہے دان میں بند ہونے کی مثال تھا۔ بہر حال اور کوئی جگہ تو نظر نہیں آئی، میں کواڑ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر نکل گئی تھی۔ خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

مجھے یہاں کھڑے ہوئے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ تیسرے کمرے سے اینہ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیز لہجے میں کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں نے کواڑ کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ درمیان والا کمرہ عبور کئے بغیر کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ ابھی کچھ بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک مردانہ آواز آئی۔

”وہ باہر نہیں نکلی خانم!“

اب میری سمجھ میں کچھ آنے لگا تھا۔ یقیناً کوئی کنیز کی چیخ سن کر اندر آیا تھا اور اسی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ یہ صورتحال کافی خطرناک تھی۔ اگر وہ مطمئن نہ ہوا تو کمروں کی تلاشی لئے بغیر نہ رہے گا۔ یہ سوچ کر میں دروازے سے نکل کر دبے پاؤں درمیانی کمرے میں آیا اور دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا، کمرے کے درمیان میں ایک خدمت گار قسم کا آدمی اس کمرے کی طرف منہ کر کے کھڑا تھا جس میں اس کنیز کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا اور خدمت گار کہہ رہا تھا۔

”نہیں خانم! آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ وہ انتہائی خطرناک آدمی ہے اور ابھی تک پکڑا نہیں جا سکا۔ جبکہ آقا کا خیال ہے کہ وہ ابھی تک محل ہی میں ہے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ وہ پہرے دار کو قتل کر کے نکل گیا ہو گا۔ کیا محل اتنی بڑی جگہ ہے کہ ایک آدمی کو تلاش نہ کیا جا سکے؟“

”بس آقا ہی کا یہ خیال ہے۔ آقا آج رات کو اس کے ہوٹل میں بھی جا کر دیکھیں گے۔ بس میں اس لئے الجھا ہوا ہوں کہ کہیں وہ اس طرف نہ آ گیا ہو۔“

”پاگل ہو تم...... مجال ہے کسی کی کہ کوئی یہاں آ سکے؟ اور دیکھو، وہ کہاں گئی؟“

میری نگاہیں اس شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اینہ بظاہر تو صحیح انداز میں بول رہی تھی لیکن اس کے لہجے کا پھسپھسا پن صاف محسوس ہو رہا تھا اور یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ پہرے دار اس طرح نہیں جائے گا۔ اب اس وقت میرے لئے ہی کچھ کرنا ضروری تھا۔ اینہ بہر حال عورت ہے، کہیں اس کا عورت پن مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ پہرے دار شک و شبے میں مبتلا ہو کر یہاں سے جائے گا اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دے گا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد اور لوگ بھی باہر نکل آئیں۔ چنانچہ کچھ کرنا بہت ضروری تھا...... بہت ہی ضروری۔

اینہ اپنے طور پر میرا دفاع کر رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر نہ پائے گی۔ چنانچہ میں آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اس کے بعد برق کی طرح کوند کر

پہریدار پر جا پڑا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کیا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر اس کے حلقوم پر رکھ دیا۔ اینہ اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پہریدار نے اپنے منہ پر سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی لیکن خنجر کا دباؤ پڑتے ہی اس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا لیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر پر دباؤ ڈال دیا اور پھر جیسے ہی میں نے ہاتھ گھسیٹا، خنجر نرخرے کو کاٹ کر شہ رگ سے گزر گیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ اٹھا کر اسے پیچھے سے دھکیلا اور وہ منہ کے بل فرش پر گر کر پاؤں رگڑنے لگا۔

میں نے اس کے کپڑوں سے خنجر صاف کیا اور اینہ کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ اس خونی منظر کو دیکھ کر اینہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ جائے گا لیکن وہ بھی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کا شائبہ تک نہیں تھا۔ نظریں ملتے ہی وہ اس طرح مسکرائی جیسے کسی انسان کی بجائے کوئی بکرا ذبح کر دیا گیا ہو۔ پہریدار کے جسم کی جنبش آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کے لئے اس کا بدن پھڑپھڑایا اور آخر کار ہاتھ پیروں کا ہلنا بند ہو گیا۔

''چھٹی ہوئی۔'' اینہ کی آواز ابھری۔

''ہاں...... اس کی چھٹی ہونا ضروری تھی۔'' میں نے کہا۔

''چلو اسے بھی اسی کمرے میں ڈال دو۔ میں فرش صاف کرتی ہوں۔'' اینہ پُر اطمینان لہجے میں بولی اور میں نے جھک کر لاش کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ پھر اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ اس کا پٹکا کھول کر اس کا لباس اتارا اور اسے اسی کنیز کی لاش پر پھینک دیا۔ پھر میں اس کا لباس لے کر باہر آیا اور خون پر ڈال دیا۔ ادھر اینہ نے چند پرانے پردے نکال لئے تھے۔ اس نے کہا۔

''نہیں، تم اندر جاؤ۔ میں یہ صورتحال سنبھال لوں گی۔ تمہارا اس کمرے میں رہنا خطرناک ہے۔''

میں کمرے کی طرف چل پڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ اب میرے اعصاب کا تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ روشن دانوں سے آنے والی روشنی مدھم ہونے لگی تھی۔ تقریباً ساڑھے چھ بج چکے تھے اور شام ہونے لگی تھی۔ میں ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے متعلق سوچنے لگا۔ اینہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اسے دیر ہوئی تو میں نے

دروازہ کھول کر باہر دیکھا، وہ گیلا پردہ ہاتھ میں لئے فرش کو صاف کر رہی تھی۔ غالباً یہ اس کا آخری کام تھا کیونکہ اس کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر مسکراتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

''تمہاری ہر کوشش مجھے بچانے کے لئے ہے اینہ! آخر یہ کھیل کب تک جاری رہے گا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ کھیل میری موت پر ہی ختم ہوگا۔''

''نہیں...... میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ کیا سمجھے؟ چاہے اس کے لئے مجھے تمہیں یہاں سے نکالنا ہی کیوں نہ پڑے۔'' اس نے پلٹ کر تمام روشنیاں جلا دیں۔

''ان لاشوں کا کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ان کی پرواہ مت کرو۔ میرا ایک غلام انہیں ٹھکانے لگا دے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اتنی ہی بے بس ہوں؟''

میں خاموش ہو گیا۔ لمحات تو تبدیل ہو ہی رہے تھے۔ اچانک کسی نے باہر والے کمرے کا دروازہ بجایا تو میں نے چونک کر اینہ کو دیکھا۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پستول نکال کر کواڑوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی تو کہنے لگی۔

''زندال کو بلایا ہے میں نے۔ اسے اس کام کے لئے تیار کرنا ہے۔''

''وہ کیسے تیار ہوگا؟''

''بس سنہری چمک سارے کام کر دیتی ہے۔ اچھا سنو، کھانا آ رہا ہے۔ لیکن میں تمہارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکوں گی کیونکہ مجھے ہشمان ذکری کے آنے کی اطلاع ملی ہے۔ اس کے یہاں آنے سے پہلے مجھے اس کے پاس پہنچ جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور وہ واپس چلی گئی۔ ایک بار پھر میں اس تمام صورتحال کے بارے میں سوچنے لگا۔ بری طرح پھنس گیا تھا۔ ان کمروں سے نکلنے کا ایک کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر یہاں کوئی خفیہ تہہ خانہ ہوتا تو آنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ رہا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو قدم قدم پر میری نشاندہی ہو جاتی ہے۔ کتنے افراد کو قتل کروں گا۔ اور کیا ضروری ہے کہ میں ہی سب پر قابو پاتا رہوں؟

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ اچانک پھر بیرونی کمرے میں کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ میں چونک کر اس طرف متوجہ ہوا اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ اینہ کسی مرد کے ساتھ بات کر رہی تھی۔ میں نے فوراً ذہن دوڑایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز زندال کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہوسکتی کیونکہ اینہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن بولنے والے کا لہجہ خادمانہ نہیں تھا، وہ تحکمانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس وقت نجانے کیوں میں اس آواز کو پہچان نہیں پا رہا تھا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ہشمان ذکری کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ دروازہ اندر سے بند کر دوں۔ لیکن یہ زیادہ خطرناک بات تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ صرف اینہ کی کوششوں پر بھروسہ کرنا حماقت کی بات تھی۔

اچانک ہی میری نگاہیں آتش دان کی جانب اٹھ گئیں۔ پہلی نگاہ میں وہ مجھے بے حد آرائشی نظر آیا تھا۔ اس میں آگ روشن کی جانے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ کارنس پر گلدان اور دوسرے ڈیکوریشن پیس رکھے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھا اور میں نے اس کی چمنی میں جھانکا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آتش دان کی چمنی بلندی تک گئی ہوئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ ایک آدمی چوڑا اترچھا ہو کر اینٹوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ چمنی کے اندر نکلی ہوئی اینٹوں پر اگر ہاتھ جما کر اوپر پہنچنے کی کوشش کی جائے تو کامیابی ہوسکتی تھی۔ چمنی کے اختتام پر برجی بنی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف روشن دان نما چوڑے سوراخ تھے۔ مشرقی سمت والے سوراخوں میں سے خاصی روشنی اندر آ رہی تھی۔

میں نے کسی آہٹ یا خطرے کا اظہار کئے بغیر پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا اور اس کے بعد چمنی کے وسط میں پہنچ کر سیدھا ہوا، دونوں ہاتھ بلند کئے اور اینٹوں کے سرے پکڑ کر پورا زور لگا کر اپنے جسم کو اوپر کھینچا۔ میرے دونوں پاؤں نچلی اینٹوں پر ٹک گئے اور میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی میں آدھے راستے پر پہنچا تھا کہ دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی کی غراتی ہوئی آواز۔

''میں نہیں جانتا تم میرے دروازہ کھول کر دیکھنے میں اتنی شدت سے اعتراض کیوں کر رہی ہو۔'' ایک لمحے تک کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اینہ کی آواز ابھری۔

''ہاں دیکھ لو، کیا ہے یہاں۔ بتاؤ، کیا ہے؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اتنا ہی اعتماد کرتے ہو مجھ پر؟''

''دیکھو میری بات سنو، میں جس صورتحال سے دوچار ہوں اس کا تمہیں صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ بس نجانے کیوں تمہارے انداز سے مجھے شک ہونے لگا تھا۔''

''ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک۔ اب مجھ پر شک بھی کرنے لگے ہو تم۔ ایسا ہی ہوتا ہے ہشمان ذکری، ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''تم پاگل ہو...... پاگل ہو تم۔'' ہشمان ذکری کا لہجہ اب معذرت آمیز ہو گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری اس گمشدگی سے اینہ پر کیا گزر رہی تھی۔ لیکن شاید وہ پُراعتماد ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک غلام مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ٹھیک ہے جیسا تم پسند کرو۔''

''پاگل ہو تم...... پاگل ہو اینہ! حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ وہ بدبخت ہم لوگوں کو اُلّو بناتا پھر رہا ہے۔ ایک آدمی ہے اور اس کے مقابلے پر ایک عظیم الشان گروہ۔ پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے جا کر۔ میں سخت پریشان ہوں۔ خیر چھوڑو۔''

''تم اسے اس کے ہوٹل میں تلاش کرو۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔ جب تم خود کہہ رہے ہو کہ وہ اس قدر چالاک اور تیز آدمی ہے تو تمہارا کیا خیال ہے وہ یہاں جھک مار رہا ہوگا؟''

آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں مکمل سکوت رہا۔ اور پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ بند ہوا اور اینہ کی آواز ابھری۔

''کہاں ہو تم خاقان! کہاں ہو بھئی...... کہاں ہو تم؟ کہاں غائب ہو گئے؟ باہر تو آؤ۔ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔''

میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ اور جب میں آتش دان سے جھک کر باہر نکلا تو وہ حیران حیران سی کمرے کے وسط میں کھڑی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے حیرت زدہ انداز میں گردن ہلائی اور بولی۔ ''خدا کی پناہ، تم یقین کرو خود میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ ویسے اس وقت میں جن حالات سے گزری ہوں، تم یہ سمجھ لو کہ میرا خون بے پناہ کم ہو گیا ہوگا۔ میں بس سمجھ رہی تھی کہ اب یہ میرے آخری لمحات ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی ہشمان ذکری پہلے مجھ پر گولی چلائے گا پھر تم پر۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے اینہ۔ میں قتل عام کا عادی ہو گیا ہوں۔ اگر ہشمان ایسی کوئی کوشش کرتا تو شاید یہ اس کی زندگی کے آخری لمحات ہوتے۔ مگر ابھی اس کی زندگی باقی

ہے کہ اس نے مجھے اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے اب؟''

''بس کچھ نہیں، یہ لاشیں ٹھکانے لگ جائیں تو سارا خطرہ ٹل جائے گا۔''

''اگر ان لاشوں کے لئے کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو پھر میں انہیں رات کی تاریکی میں اٹھا کر چیتوں کے پنجرے میں پھینک آؤں گا۔''

''نہیں، بے فکر رہو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' اس نے کہا اور پھر رات کو تقریباً گیارہ بجے وہ مجھ سے اجازت لے کر باہر گئی اور خود اس نے اپنے اس غلام کو جس کا نام زندال تھا بلایا اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ رات کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس نے کمرہ خالی ہونے کا اعلان کیا اور کچھ دیر کے بعد وہ ہمیں کھانے کی ٹیبل پہنچا گیا۔ اسی سے اینہ کو اطلاع ملی تھی کہ ہشمان ذکری چلا گیا ہے۔

''وہ کہاں گیا ہوگا اینہ؟'' میں نے سوال کیا تو اینہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''عیاش طبع انسان ہے، بہت سی حسینائیں اس کی منتظر ہوں گی۔ وہ کس رات کہاں جائے گا، کوئی بھی نہیں جانتا۔ اچھا ایک بات بتاؤ، کیا تم اس جگہ پہنچنا چاہتے ہو جہاں وہ اپنے قیمتی جواہرات اور دولت رکھتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو افسوس وہ کمرہ مقفل ہوتا ہے اور دروازے پر مسلح پہریدار ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہاں تک جانے والی سیڑھیوں میں بجلی کی گھنٹیوں کا سلسلہ ہے۔''

''تم میرے وہاں جانے کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہو؟''

''ظاہر ہے تم اس تختی کی تلاش وہیں کرو گے۔ حالانکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تختی وہیں موجود ہو۔''

''اوہ..... تم بہت ذہین ہو اینہ! بہت دور تک سوچتی ہو۔ ویسے وہ کمرہ کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اوپر کی منزل کے مغربی کونے میں آخری کمرے سے پہلا۔ دروازے کے سامنے پہریدار سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اب بولو کس طرح وہاں پہنچو گے؟''

''ہاں..... اوہو، ایک بات بتاؤ اینہ! یہاں دوسرے کمروں میں بھی آتش دان ہیں اس طرح کے؟''

''آتش دان؟''

''ہاں۔''

''وہ تو ہر کمرے میں ہیں۔''

''تو پھر کامیابی کا پورا پورا امکان ہے۔ میں اسی طریقے سے کوشش کروں گا۔''

''واہ..... لگتا ہے باقاعدہ نقب زنی کرتے رہے ہو۔''

''نہیں باقاعدہ نہیں اینہ! یقین کرو بس ضرورت ہے، مجبوری ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔ لیکن خطرہ تم سے دور نہیں ہوگا خاقان! سوچ لو، ویسے بھی تم چہرے سے چور یا ڈاکو نہیں لگتے۔''

''تمہارا شکریہ......''

''کیا کرتے رہے ہو باقی زندگی میں۔ میرا مطلب ہے ابتدائی زندگی میں؟''

''بہت کچھ۔'' میں نے جواب دیا اور میرے ذہن میں چھناکے ہونے لگے۔ میں کیا کرتا رہوں گا، یہ مجھے یاد آنے لگا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اب جو کچھ میں کر رہا ہوں کیا وہ بھی ایسا ہے کہ وقت مجھے اس کے لئے معاف کر دے؟

اینہ نے کہا۔ ''اور اب ایک بات تم بھی سن لو۔ تمہاری زندگی اب تمہاری نہیں ہے، میری بھی ہے۔ میں تمہیں اپنی آنکھوں کی بینائی کی طرح محفوظ رکھنا چاہتی ہوں، اپنی لگن میں میری طلب کو نہ بھول جانا۔ میں نے بھی زندگی کی بازی لگا کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ ویسے تو یہ دیوانوں کی طرح نثار ہوں گے، ہمارے بدن کا طواف کریں گے لیکن کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو تم یہ سمجھ لو کہ یہ انسان کو جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔''

''میں جانتا ہوں اینہ!''

''زندہ رہنا اب اپنے لئے نہیں، میرے لئے۔'' اس نے کہا۔

بہر حال آتش دان کا پہلا تجربہ میرے لئے خاصا حوصلہ بخش تھا۔ چنانچہ اس بار اس آتش دان کی اینٹوں پر پاؤں رکھ کر اوپر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور زیادہ وقت بھی نہیں لگا۔ میں برجی تک پہنچ گیا۔ دو تین منٹ کے بعد میں برجی کی محراب دار ہوا داروں سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری نظروں سے چار فٹ نیچے اس کمرے کی چھت تھی جو نیچے چھوڑ آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے کمروں کی چھتیں بھی تھیں جو قطار در قطار شمال سے جنوب کی جانب چلی گئی تھیں۔ میں ان محدود سوراخوں سے باہر نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ

ایک زاویے پر آ کر نگاہ رک جاتی تھی۔ اب مجھے یہاں سے باہر نکلنا تھا اس لئے میں نے خنجر نکال کر اینٹوں کے درمیان سے چونا کھرچنا شروع کر دیا اور پھر تھوڑی سی کوشش سے ایک اینٹ نکل آئی۔ میں نے اسے آہستہ سے بیرونی سمت ہاتھ بڑھا کر چھت پر چھوڑ دیا اور اس کے بعد مسلسل یہ کام کرتا رہا۔ حالانکہ پہلے سے صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب اتنی آسانی سے یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اب میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے اپنا بدن سکوڑا اور باہر اتر کر چھت پر چڑھ گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔

صحن والے سرے پر آ کر میں نے شمالی سمت والے کمروں کی طرف نظر ڈالی۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہونے کے باعث صحیح کمرے کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ایک کمرے کے سامنے مجھے روشنی نظر آئی اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ پہریدار یہیں ہونا چاہئے۔ بہرحال میں دبے پاؤں چلتا ہوا متعدد کمروں کی چھتیں عبور کر کے اس طرف پہنچا اور چمنیاں گن گن کر ہشمان ذکری کے کمرے کا تعین کیا اور پھر شمال مغربی کونے کے آخری کمرے کی چمنی کی اینٹوں کو جوڑ کر کریدنا شروع کر دیا۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل اور انتھک محنت سے جس میں آواز نہ ہونے کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ میں نے چار اینٹیں نکال لیں اور پھر میں چمنی پر چڑھ کر نیچے اترنے لگا۔ ابھی آدھا فاصلہ طے کیا تھا کہ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی کا احساس ہونے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد میرے پاؤں اس فرش پر ٹک گئے۔ میں نے رک کر آہٹ پر پاؤں لگائے۔ اندر مکمل سکوت طاری تھا۔ میں نے جھک کر آتش دان سے باہر سر نکال کر کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کارنس سے کچھ بلندی پر صرف ایک بلب روشن تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بیش قیمت قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ مسہری پر ریشمی بستر اور لحاف تھے۔ کمرہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ الماریوں کے درمیان خوبصورت میزوں پر طرح طرح کا آرائشی سامان سجا ہوا تھا۔ میری آنکھیں ان چیزوں کی جگمگاہٹ سے چکاچوند ہو گئی تھیں اور کچھ لمحوں کے لئے میں اپنا اصل مقصد بھول گیا تھا۔ اس کمرے کی شاندار آرائش پر غور کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس الماری کی دراز سے سلسلہ شروع کیا جائے۔ لوہے کی ایک بدوضع سی تختی اس خوبصورت کمرے میں رکھی بھی گئی ہو گی یا نہیں؟

کافی دیر تک کسی سحر زدہ انسان کی طرح کمرے کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اپنا مشن یاد

آیا اور وقت ضائع ہونے کا احساس ہوا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ پھر میں نے مسہری کے قریب پڑی ہوئی پہلی الماری کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا۔ سب سے اوپر والے خانے میں ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا، دوسرے میں سگریٹ کے چند پیکٹ، وہسکی کی بوتلیں اور گلاس وغیرہ، تیسرے میں کچھ انگریزی رسالے۔ اس کے سوا اس میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے الماری بند کر کے دوسری، تیسری اور پھر اسی طرح یکے بعد دیگرے کئی الماریاں دیکھیں، تختی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ مسہری کا کشن اور تکیے الٹ پلٹ کر ڈالے، یہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ پھر میں نے تمام کمرے کا پھر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر پر نظر ڈالی، مسہری کی پائنتی کی طرف ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر فریم میں جڑی ہوئی ایک ایسے زاویے پر آویزاں تھی جہاں سے مسہری پر سونے والا لیٹے لیٹے اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں ہشمان ذکری کی اس کیفیت پر ہنس پڑا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویر شاہکار تھی لیکن اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت اسے نگاہوں کے سامنے رکھنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں کچھ سوچ کر آگے بڑھا، تصویر کو دیوار سے ہٹانے لگا۔ اوپر کا ایک سرا ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرا حصہ دیواروں پر لگی کیلوں پر ٹکا ہوا تھا۔ تصویر آسانی سے علیحدہ ہو کر میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ مگر اس کا وزن دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا تمام فریم ٹھوس فولاد کا بنا ہوا ہے۔ میں نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا، پچھلی طرف رنگین کاغذ چپکا ہوا تھا۔ میں نے ناخن سے کرید کر تھوڑا سا کاغذ کو پھاڑ کر دیکھا، کاغذ کے نیچے ایک فولادی پلیٹ تھی جس پر کچھ حروف نظر آ رہے تھے۔ اور دفعتہً ہی میرے سارے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ وہی تختی تھی جسے میں تلاش کر رہا تھا۔

میں نے بمشکل تمام خود کو سنبھالا اور کاغذ کو اتارنے کی کوشش ترک کر کے خنجر کی نوک سے ایک طرف کی کیلیں اوپر کی طرف موڑ کر تختی کھینچ لی۔ تختی مسہری پر رکھ کر میں نے تمام کیلیں پھر دبا کر اس فریم میں تصویر کو مضبوطی سے جمایا اور اسی زاویے پر لٹکا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ عریاں تصویر محض ایک پردہ تھا۔ یہ قیمتی اشیاء کو رکھنے کا مقام تھا۔

میں نے کمرے میں ایک بار پھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی بے ترتیبی یا الٹ پلٹ نہیں ہونے پائی تھی۔ میں نے اپنی تمام تلاش کے دوران کسی چیز کو اس طرح تتر بتر نہیں کیا تھا کہ اس کے بارے میں اندازہ ہو جائے۔ صرف آتش دان کے فرش پر چونا اور کوڑا کرکٹ پڑا نظر آیا

لیکن اسے بھی صاف کرنا ضروری تھا۔ آہ...... مجھے اس طرح کامیابی حاصل ہو جائے گی میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

بہرحال میں نے اس کوڑے کو اٹھا کر قالین کے نیچے پھیلا دیا۔ اب اگر ہشمان ذکری اس کمرے میں آنے کے بعد اس تصویر پر سرسری نگاہ ڈالے گا تو اسے کوئی شبہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ ال بات ہے کہ صبح کہ اسے اس بارے میں پتہ چل جائے گا۔

بہرحال میں نے تختی اٹھائی اور آتش دان کے راستے اوپر چڑھنے لگا۔ اپنی اس کامیابی پر میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اب بعد میں جو کچھ ہوگا وہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال میری یہ کوشش کارگر ثابت ہوئی تھی۔ پہرے دار تک کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اندر کچھ ہو رہا ہے۔

اب میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ تھا یہاں سے نکلنے کا۔ میں چھت پر پہنچ گیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بیرونی دیوار کی طرف جا کر نیچے نظر ڈالی۔ چھت کی بلندی کم از کم پچاس فٹ تھی اور سیڑھی یا رسی کی مدد کے بغیر زمین پر نہیں اترا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو مصیبت بن جائے گی۔ مجھے اس وقت تک حاصل کی ہوئی تمام کامیابی آخری مرحلے پر کھونے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ یہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہاں سے نکلنا مشکل نہیں، ناممکن ہے۔

آخر کار میرے قدم آہستہ آہستہ اسی روشن دان کی طرف اٹھنے لگے جو امینہ کے کمرے میں اترتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے لئے ہشمان کی واپسی تک یا زیادہ سے زیادہ صبح تک بچ نکلنے کی کوشش کا وقت تھا۔ اگر اس مختصر وقفے میں امینہ میرے لئے کوئی راستہ نکال سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ صبح ہونے کے ساتھ نہ میں بچوں گا اور نہ وہ۔ کیونکہ ہشمان ذکری پہلے ہی اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا ہے۔ اور اب ٹوٹے ہوئے آتش دان کو دیکھنے کے بعد تو وہ امینہ کو خاک و خون میں ہی نہلا دے گا۔ اور اگر میں کسی طرح نکل بھی جاؤں تو امینہ کم از کم نہیں بچ سکے گی۔

میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ میں ٹوٹے ہوئے روشن دان سے اندر داخل ہوا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اتر کر کمرے میں پہنچ گیا۔ امینہ اپنی خوابگاہ میں جا چکی تھی۔ میں نے کیواڑوں پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا، اس نے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ آہٹ پاتے ہی چونک کر اٹھ گئی اور میری طرف

دیکھ کر بولی۔

"آہ...... تم آ گئے۔ تم خیریت سے تو ہو خاقان؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ یہ دیکھو۔" میں نے تختی اس کے سامنے کر دی۔

"واہ...... واہ...... تم واقعی ایک دلیر مرد ہو۔ لیکن اب کیا ہوگا؟"

"اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو امینہ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"لیکن کیسے؟ کس طرف سے؟"

"یہ مجھے تم ہی بتا سکو گی میری زندگی! صبح ہونے سے پہلے اگر ہم یہاں سے نہ نکلے تو ہم دونوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہ بات اب تم بھی جانتی ہو کہ تم یہاں رہ کر زندہ نہیں بچ سکتیں۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے اچھا مجھے دو منٹ دو، میں ابھی آتی ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔" وہ مجھے درمیانی کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اپنے کپڑوں سے گرد و غبار جھاڑ کر سگریٹ سلگایا۔ جب وہ واپس لوٹی تو دوسرے لباس میں تھی۔ اس نے کندھے پر ایک لبادہ سا ڈالا ہوا تھا اور ہاتھ میں سیاہ برقع تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"لو، تم یہ لبادہ پہن لو اور چہرہ مفلر میں لپیٹ لو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ کوئی تمہاری طرف متوجہ نہ ہو۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے برقع پہنا اور چلنے لگی۔ میں نے گلے اور چہرے پر مفلر لپیٹ لیا تھا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ اس نے برآمدے والا دروازہ کھول کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ نپے تلے قدم رکھتی ہوئی چلتی رہی۔ پھر ہماری نگاہ ڈیوڑھی میں ایک پہریدار پر پڑی جو مسلح تھا اور اسٹول پر مستعد بیٹھا ہوا تھا۔ امینہ کو دیکھ کر وہ چونکا تو امینہ نے اس سے کہا۔

"زنداں کہاں ہے؟ یہاں موجود ہے یا آقا کے ساتھ گیا ہے؟"

"خانم! وہ آقا کے ساتھ تو نہیں گیا۔ مگر آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟"

"کیا تمہیں اس کا علم نہیں ہے؟"

"نہیں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"میں ایک اہم جلسے میں شرکت کرنے کے لئے جا رہی ہوں۔ مجھے اس کی ہدایت کی گئی تھی۔ اے، تم کیا بیوقوفوں کی طرح کھڑے منہ دیکھ رہے ہو۔ جاؤ باہر جا کر کوئی ٹیکسی

تلاش کرو۔" اس نے میری طرف رخ کر کے کرخت لہجے میں کہا اور میں تیزی سے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا جو ذرا فاصلے پر تھا۔ مجھے رات کو اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ امینہ نے برقع سے ہاتھ نکال کر پہریدار کو کچھ رقم دی اور بولی۔

"سنو..... میں صبح دس بجے لوٹوں گی۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے جانے اور آنے کا ذکر آقا سے نہ کرو۔ ٹھیک ہے؟" پہریدار کو غالباً خاصی رقم مل گئی تھی۔ اس نے گردن خم کی۔

بہر حال امینہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگی۔ میں نے صدر دروازہ کھولا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ روشوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پھاٹک کے قریب پہنچے تو امینہ نے مجھے رک جانے کا اشارہ کیا اور پہرے دار سے کرخت لہجے میں بولی۔

"تم میری صورت کیا دیکھ رہے ہو۔ دروازہ کھولو، میں امینہ ہوں۔" اس نے برقع کا نقاب ایک طرف کیا تو پہرے دار نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں خانم! ہم مجبور ہیں۔ آقا کا حکم ہے کہ اس وقت کسی کو بھی باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم حکم کے غلام ہیں۔ اصل میں خانم، کسی شخص کی تلاش ہے جس کے لئے....."

"چلو..... تم احمق ہو گیا۔ آقا نے تم سے یہ بھی کہا ہے کہ امینہ کو بھی باہر نہ نکلنے دیا جائے؟ اے، تم کیا کھڑے دیکھ رہے ہو۔ عجیب احمق آدمی ہو تم، چلو باہر نکلو۔ سمجھے تم۔ پہرے دار، میں کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اجازت ہے۔" میں نے محسوس کر لیا کہ امینہ، پہریدار کو الجھا رہی ہے۔

بہر حال میں باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ پہریدار کسی بھی قیمت پر امینہ کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے گا۔ چنانچہ میں نے پچھلا راستہ استعمال کیا۔ جنگلے کی بلندی کا اندازہ کر کے میں جنگلے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ کچھ لمحوں کے بعد میں جنگلے کے اوپر پہنچ گیا اور اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا آدھا جسم جنگلے سے گزر گیا لیکن دوسری ٹانگ لبادے کی وجہ سے پھنس گئی اور میں لٹک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے لبادے کا کنارہ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی تو پورا بدن لبادے پر آ گیا اور نوک دار جنگلا لبادے میں پوری طرح پیوست ہو گیا۔ میں دونوں ہاتھ چھوڑ کر کود پڑا۔ ایک جھٹکا لگا اور لبادے کا کچھ حصہ پھٹ کر اوپر رہ گیا۔ میں دھڑام سے نیچے گرا تھا۔ میرے گرنے کی آواز سن کر پہریدار نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اسی وقت امینہ نے چیخ کر کہا۔

"اے بیوقوف! یہ کیا ہوا؟" اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ تختی میرے لبادے سے نکل کر نیچے گر پڑی تھی۔ اچانک ہی امینہ نے کہا۔

"یہ کون ہے..... پکڑو اسے۔ یہ میرے ساتھ تو نہیں آیا۔"

"کیا.....؟" پہرے دار چیخا۔ اس نے چابی نکال کر امینہ کی طرف پھینکی اور بولا۔ "تالا کھولئے۔ ورنہ یہ بھاگ جائے گا۔"

امینہ دروازہ کھولنے لگی۔ میں بھاگنے کی بجائے ایک دم رکا اور چوکیدار برق رفتاری سے آگے بڑھا۔ لیکن اس کی بدنصیبی تھی کیونکہ دوسرے لمحے میں نے اس کی کنپٹی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کی چیخ پستول کے دھماکے میں گم ہو گئی اور وہ دیوار کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے امینہ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں سامنے بنے ہوئے مکانوں کی طرف دوڑنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ایک گلی کے قریب پہنچ کر ہم رکے، پلٹ کر پیچھے دیکھا تو محل میں اسی طرح خاموشی تھی۔ راستہ بھی سنسان پڑا ہوا تھا۔ اس وقت صبح کے تقریباً پانچ بج چکے تھے لیکن ابھی قرب و جوار اور ماحول میں زندگی بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اسکندریہ کے اس علاقے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ مکانوں کی آڑ میں پہنچ کر میں نے وہ تختی امینہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"امینہ! اسے برقع میں چھپا لو۔ کیا خیال ہے، یہاں زندگی کس وقت بیدار ہوتی ہے؟"

"اصل میں یہ علاقہ ذرا مختلف قسم کا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آگے چل کر ہمیں کم از کم چائے خانے کھلے ہوئے مل جائیں گے۔" امینہ نے جواب دیا۔

"آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر اس دوران کوئی گڑبڑ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو خیال رکھنا تم الحمرا پہنچنے کی کوشش کرنا۔ میں وہیں تمہیں مل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے تختی اس کے حوالے کی تو اس نے تختی چھپاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے..... لیکن تمہیں اپنا نام تبدیل کرنا ہوگا۔ کوئی ایسا نام جو تمہیں پسند ہو۔"

"جو بھی تم چاہو۔"

"مسٹر برک۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا حرج ہے، اچھا نام ہے۔ اس نام سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اب ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دو تین گلیوں سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ بازار آ گیا۔ گلی سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک پولیس مین نظر آیا جو غور سے ہماری

طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگلی اٹھا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

"ہیلو سر! کیا آپ اٹیلین ہیں؟" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں آفیسر برٹش کیپٹن آف اے مرچینٹشپ۔"

"سوری سر، سوری۔" پولیس مین نے ٹوپی چھو کر سلام کرتے ہوئے کہا۔

"اور کچھ؟"

"نو تھینکس۔" وہ بولا اور وہاں سے واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں ایک چھوٹا سا ریستوران نظر آیا جس میں صرف ایک آدمی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا خیال ہے، اگر ہم اس ریستوران میں داخل ہوں تو کوئی ہمیں تعجب کی نگاہوں سے تو نہیں دیکھے گا؟"

"دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ ویسے یہاں فیملی کیبن بھی ہوا کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

"آؤ پھر چلتے ہیں۔"

ہم دونوں ریستوران میں داخل ہو گئے۔ میز پر بیٹھا ہوا آدمی غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اینہ آگے بڑھ کر زینے طے کرنے لگی۔ نیچے باورچی خانے کے دروازے سے ایک خانساماں نے اس کو عربی میں خوش آمدید کہا اور پھر بولا۔ "آپ کیا پسند کریں گی؟"

اینہ نے چائے، قہوہ اور ناشتے کی چند چیزوں کے نام لئے اور ہم پہلی منزل میں پہنچ کر ایک فیملی کیبن میں داخل ہو گئے۔ دروازے پر پہنچتے ہوئے اینہ نے کہا۔

"آؤ بیٹھو...... نام میں بھول گئی۔"

"برک...... برک۔" میں نے کہا۔

"کیا تمہارے پاس رقم ہے؟"

"ہاں۔ بلکہ ایسا کرو اس میں سے تم تھوڑی سی رقم رکھ لو۔ کام آئے گی۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے خاصے ڈالر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے میرا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس انگلش پاؤنڈ ہیں۔ انہیں رہنے دو۔"

اسی وقت بیرا ناشتے اور چائے کی ٹرے لئے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس سے اخبار طلب کر لو۔ کیا اخبار آ گیا ہو گا؟"

"ہاں...... یہاں اخبار ساڑھے چار بجے تک مل جاتا ہے۔" اینہ نے جواب دیا۔ جب

ویٹر ٹرے رکھ کر جانے لگا تو اس نے عربی میں اسے ایک انگریزی اخبار لانے کو کہا اور وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ ہم نے چائے پینی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا انگریزی اخبار دے کر چلا گیا۔ میں نے سرخیوں پر ایک نظر ڈالی اور اس کے بعد اینہ سے وہ فولادی تختی طلب کی۔ فولادی تختی کو ہم نے اخبار میں لپیٹ لیا۔

آفتاب آہستہ آہستہ طلوع ہوتا جا رہا تھا اور ریستوران میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ کچھ جوڑے بھی آئے تھے جو اوپر کی جانب رخ کر رہے تھے۔ میں نے اینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری طرح اور بھی لوگ صبح کو جاگ جاتے ہیں۔"

"یہ سب وہ لوگ ہیں جو مختلف جگہوں پر ملازمتیں کرتے ہیں اور اپنے کام پر جانے سے پہلے صبح کا ناشتہ اس طرح کے ریستورانوں میں کر لیا کرتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے، چلا جائے یا کچھ اور پینا ہے؟"

"نہیں چلو۔" وہ اٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف رخ کر کے گردن ہلائی اور پھر اینہ نے نقاب اپنے چہرے پر ڈال لیا اور بولی۔ "تو پھر کیا خیال ہے۔ کیا، کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے تم الحمرا پہنچو اور اس کی لابی میں میرا انتظار کرو۔ میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔"

"کیا تمہارا قیام الحمرا میں ہے...... میرا مطلب ہے کہ کیا وہاں تمہارے پاس کوئی کمرہ ہے؟"

"نہیں، میں دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں لیکن وہاں جانا نہیں چاہتا۔ اصل میں الحمرا کے بارے میں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ ہوٹل میرے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ہے۔"

"ٹھیک ہے......" اس نے کہا، پھر کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے کے بعد ہم دونوں دروازے سے باہر نکل آئے۔ اینہ نے رخ تبدیل کر لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دور نکل گئی۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ سلگانے لگا۔ جب اینہ اتنی دور نکل گئی کہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک بک اسٹال کھل گیا تھا اور اس پر سیل شروع ہو گئی تھی۔ میں اس کے سامنے رک کر رسالوں کے نام پڑھنے لگا اور پھر میں نے ایک انگلش میگزین ہاتھ میں اٹھا لیا اور بک اسٹال والے کو سکہ دے کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میری نگاہیں دور دور تک اینہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر کچھ

لمحوں کے بعد میں نے اسے ایک ٹیکسی میں اسی طرف آتے دیکھا۔ الحمرا جانے کے لئے اسے ادھر سے گزرنا تھا۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر برقع میں لپٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔ اب تک کہ ہنگامہ آرائی بڑی سنسنی خیز تھی۔ آخر کار مجھے اس محل سے نکلنا نصیب ہو ہی گیا تھا۔

آہستہ آہستہ دھوپ چڑھتی جا رہی تھی اور قرب و جوار کی دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ سڑک پر لوگ چل پھر رہے تھے، ٹیکسیاں وغیرہ بھی آ جا رہی تھیں۔ لیکن میں پیدل ہی چلتا رہا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فاصلہ طے کر لیا جائے اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں چلتا رہا۔ اندازے کی بنا پر میں الحمرا ہی کی جانب جا رہا تھا۔ حالانکہ یہاں سے خاصا فاصلہ تھا الحمرا کا لیکن مجھے بھی جلدی نہیں تھی۔ ذرا اپنے آپ کو مطمئن بھی کرنا چاہتا تھا اور صورتحال سے واقفیت بھی چاہتا تھا۔

تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک انٹرسیکشن آ گیا تو میں بائیں جانب گھوم گیا۔ اس سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا۔ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ پیدل تو کوئی بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ عمارتوں میں بڑی شان پائی جاتی تھی اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں خوشحال اور بڑی حیثیت والے لوگ رہتے ہیں۔

بہرحال میں چلتا رہا۔ یہ حماقت نہیں تھی بلکہ میں اپنے طور پر سوچنا بھی چاہتا تھا اور اس وقت میری سوچیں بڑی مختلف نوعیت کی تھیں۔ نجانے کیوں مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ گزرے ہوئے لمحات میں اس عورت نے جس کا نام امینہ تھا مجھے کس طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اصل میں اس کی پہلی جھلک ہی میرے ہوش و حواس پر بجلی گرانے کا باعث بن گئی تھی۔ وہ اس قدر دلکش اور حسین تھی اور اس نے بالکل بے خیالی کے انداز میں جس طرح اپنے مرمریں وجود کو نمایاں کیا تھا اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ میں ایک بار پھر وردان سادھانی کا وردان بھول گیا تھا اور پھر اسی کیفیت میں گرفتار ہو گیا تھا جس کیفیت نے مجھے دربدر کیا تھا۔

اس وقت اچانک ہی مجھے یہ ساری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک بھٹکا بھٹکا سا خیال بھی تھا۔ ایک ایسے خیال کا وجود میری آنکھوں میں ترتیب پا رہا تھا جو میرے لئے بڑا اجنبی تھا۔ ایک اجنبی، سلگتا ہوا سا گداز چہرہ...... یہ کون ہے؟ میں حیران نگاہوں سے اپنے خیالوں میں اتر آنے والے اس چہرے کو دیکھنے لگا اور دفعتہً ہی میرے سارے

وجود میں ایک چھنا کا سا ہوا۔ یہ چہرہ اس وقت مجھے کیوں یاد آیا ہے...... یہ چہرہ، یہ آنکھیں، یہ انداز جیسے وہ مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ بھی اس کردار کو نہ بھولے ہوں گے۔ یہ کلاڈیا تھی، کرنل صغیر کی بیٹی۔ وہ عجیب و غریب کردار جو غیر ملکی ہونے کے باوجود ایک عجیب و غریب اور پراسرار کردار تھا۔ میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میں نے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے پورے بدن میں لرزش طاری ہو گئی تھی۔ کلاڈیا کا اس وقت میرے ذہن میں آنا یوں لگتا تھا جیسے کسی خاص مقصد کے تحت ہو۔ اصل میں بات وہی تھی، وردان سادھانی نے مجھے پاکیزگی کا درس دیا تھا اور اشبھ بھاوناؤں سے بچنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن امینہ کا وجود ایک مکمل بھاونا بن گیا تھا اور یہ اشبھ بھاونا میرے سارے وجود کو لرزائے ہوئے تھی۔ بے شک وہ اس وقت میرے لئے انتہائی اہمیت اختیار کر گئی تھی کیونکہ وہ تختی اس کے پاس موجود تھی جو نجانے آگے چل کر مجھ پر کتنے رازوں کے دروازے کھولنے والی تھی۔ اور اب وہ میرے لئے اس لحاظ سے اور زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

میں یہی سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے قریب سے ایک گاڑی گزرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور پھر اتنی زور کے بریک چرچرائے کہ میں اچھل پڑا۔ میرے اعصاب کچھ دیر کے لئے کشیدہ ہو گئے تھے اور میں حیرت سے اس گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر گاڑی رُک گئی۔ بائیں طرف کا دروازہ کھلا اور دو آدمی اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر میں لرز گیا تھا...... میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا......!

※☆※

زندگی کب تک مجھ سے آنکھ مچولی کھیلتی رہے گی...... کب تک یہ حالات میرے وجود پر سواری کرتے رہیں گے۔ ایک انوکھا تصور، ایک انوکھا احساس ہوا تھا۔ گاڑی پر سے اترنے والے دو آدمیوں میں سے ایک ہشمان ذکری تھا اور وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ کیا عجیب بات ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت میں کھلی سڑک پر تھا، اس کے محل میں نہیں تھا جہاں میں اس کی پوری فوج کو، چیتوں کو اور نجانے کسے کسے چکمہ دے کر باہر نکل آیا تھا۔ میں نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول کا دستہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں خوف کو دل سے نکال دوں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ میرے اندر سے خوف نکل گیا تھا۔ میں حیرت کا اظہار کئے بغیر اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ ہمارے درمیان فاصلے کم ہوتے جا رہے تھے۔ اور پھر جب میں قریب پہنچا تو ہشمان ذکری نے داہنا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

''خاقان جمشیدی! رک جاؤ۔ بے فکر رہو، اس وقت میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

میں رک کر اسے دیکھنے لگا۔ میرے چہرے پر اس وقت مکمل بے خوفی آ گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم کمال کی شخصیت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے تم جیسے شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور اب میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ تم جیسے دلیر اور شاندار انسان بہت کم نظر آتے ہیں اور ایسے لوگوں سے دشمنی کی بجائے دوستی فائدہ مند رہتی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، جو کچھ تم کر کے آئے ہو میں بھی اسے بھول جاتا ہوں اور تم بھی اسے بھول جاؤ۔''

میرے ہونٹوں پر ایک بے خوف مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ہشمان ذکری! میں بھی دوستیاں پسند کرتا ہوں۔''

''تمہاری ذہانت اور دلیری نے میرے دل میں تمہارے لئے ایک بہت بڑا گھر بنا لیا

ہے اور میں بغیر کسی تمہید کے تم سے ایک بات کہوں کہ جو کچھ تم میرے اس محل سے حاصل کر کے لائے ہو میرے تعاون کے بغیر تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے اب تم میری دوستی قبول کرو۔ آؤ، ہم الحمرا میں چل کر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔''

الحمرا کے نام پر میں نے ذرا سرسراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ اصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ الحمرا کا نام اس نے ایسے ہی لے دیا ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی راز ہے؟ بہرحال سوچ کر اس شبے کو زیادہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بے خوفی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ہشمان ذکری! میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن تمہاری پسندیدہ جگہ پر نہیں۔ وہ دیکھو تھوڑے فاصلے پر ایک اور ریسٹوران نظر آ رہا ہے۔ غالباً اس کا نام نخلستان ہے۔ دور ہی سے مجھے اس کے سائن نظر آ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم نخلستان میں چل کر بیٹھیں۔''

ہشمان ذکری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ''واقعی! بہت چالاک ہو تم۔ غالباً تم نے سوچا کہ میں نے تمہیں الحمرا کی پیشکش کیوں کی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہاں تمہارے لئے خطرات موجود ہوں۔ ایسی بات نہیں میرے دوست! لیکن پھر بھی تم نخلستان چلو، تمہاری مرضی ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کار کو پیچھے لانے کے لئے کہا۔ لیکن یہاں بھی میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں میری جان! تم نخلستان پہنچو، میں وہیں آ رہا ہوں۔''

ہشمان ذکری کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے جھنجلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ لیکن جھنجلایا تو اس پر جاتا ہے جس پر اختیار حاصل ہو۔ آخر کار اس کے چہرے پر بے بسی پھیل گئی اور اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ تمہیں مجھ سے زیادہ کھلے دل والا دشمن دنیا میں نہیں ملے گا۔''

''میں نے تمہیں دشمن کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ تم چلو، میں آ رہا ہوں۔''

وہ برا سا منہ بنا کر اپنی کار میں جا بیٹھا اور کار آگے بڑھ گئی۔ اس نے کئی بار پیچھے پلٹ پلٹ کر مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا۔

نخلستان سڑک کے مخالف سمت میں تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر الحمرا بھی تھا۔ لیکن بہرحال میں نے الحمرا جانے سے گریز کیا تھا کیونکہ خود میرے

ذہن میں چور تھا۔ بہر حال میں الحمرا جا کر اپینہ کے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں نخلستان پہنچ گیا۔ ہشمان ذکری دروازے میں داخل ہونے سے پہلے گاڑی سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ روشوں کے درمیان گھاس کے قطعات پر جگہ جگہ میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے اکثر پر مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ ذکری اس وقت اکیلا ہی تھا اور وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے پورچ میں داخل ہوا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی آگے بڑھ کر دو ویٹروں نے استقبال کیا۔ دروازے سے کیفے ہال پہنچے تو منیجر نے آقاء ذکری کہہ کر اس سے مصافحہ کیا۔ وہ دوستوں کی طرح میری کمر پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھتا چلا گیا اور ایک کشادہ بوتھ میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی ویٹر کو ناشتہ اور کافی لانے کا آرڈر دیا اور پردہ کھینچ کر میری طرف مخاطب ہوا۔

"ہاں ڈیئر خاقان! کمال کی شخصیت ہے تمہاری۔ لمحوں کے اندر اندر میرے پانچ آدمیوں کو ہلاک کر دیا تم نے۔ میری پستول، میری محبوبہ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہ لوح تمہارے قبضے میں ہے۔ کمال ہے، ایک اجنبی اسکندریہ میں آ کر اگر ہشمان ذکری کے خلاف یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو پھر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ تنہا نہیں بلکہ ایک پوری فوج ہے۔ میں تمہیں اس شاندار کارکردگی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میرا خیال ہے تم جن چیزوں کی فہرست مجھے بتا رہے ہو ان میں کچھ زیادتی سے کام لے رہے ہو۔ تمہارا پستول اور وہ تختی میرے قبضے میں ہے، تمہارے آدمیوں کو بھی میں نے ہی مارا ہے لیکن تم جس محبوبہ کی بات کر رہے ہو وہ کون ہے اور کہاں ہے اس کے بارے میں اگر تم خود مجھے بتا دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم سچ بول رہے ہو؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میں نے کہا نا جو حاصل کیا ہے میں نے، مجھے اس کے بارے میں علم ہے۔ باقی کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

"ویسے میں تمہارے ساتھ کچھ ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔"

"ڈیل؟"

"ہاں۔"

"تفصیل؟"

"جلدی کیا ہے۔ کھاؤ پیو۔ کیا خیال ہے۔" اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیا پھر بولا۔ "یہ بھی تمہارے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ویسے اگر میں جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دوں مائی ڈیئر ہشمان ذکری! تو یقین کرو تمہارا سب کچھ میرا ہے۔"

وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنس پڑا، پھر بولا۔ "چلو ٹھیک ہے، میں تمہاری خوش فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تک جب تک تمہاری طرف سے مایوس نہ ہو جاؤں۔"

"تو پھر تم مایوس ہو جاؤ" میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، ویٹر ٹرے لئے ہوئے اندر آ گیا۔ اور پھر جب وہ چلا گیا تو بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ہشمان ذکری نے کافی پیالیوں میں ڈالی اور ایک پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں......تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

"میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ قانون مجھے اس راستے پر چلنے سے روکتا ہے جس پر تم مجھے چلانا چاہتے ہو۔"

"خوب، خوب......" اس نے کہا اور کافی کے گھونٹ لینے لگا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "کافی لو......ضرورت سے زیادہ احتیاط اچھی چیز نہیں ہوتی۔"

"جی......" میں نے کافی کے چند گھونٹ لئے۔ وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

"میری پہلی پیشکش دو ملین ڈالر ہے، سمجھے۔ دو ملین ڈالر اس تختی کی قیمت۔ یہ رقم تم پہلے ایڈوانس لے سکتے ہو۔ تختی بعد میں دینا۔"

"اور اگر میں سوری کہوں تو؟"

"تو پھر یہ چار ملین ہو جاتے ہیں۔" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"دس ملین بھی نہیں۔"

"ہوں......اس کا مطلب ہے گیارہ ملین۔ ٹھیک ہے یہ......؟"

"میں نے کہا نا اس پر سودا نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر آخری پیشکش۔ جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اس کا آدھا۔ باقی سب کچھ میرے ذمے۔"

"اور کچھ......؟"

"دیکھو...... میں نے اپنی طرف سے ہر تعاون کی پیشکش کی ہے۔اب باقی اگر تمہاری کوئی شرط ہو تو تم بتا دو۔"

"ہاں۔ یہ ذرا دلچسپ بات ہے۔ مگر اس کے لئے مجھے سوچنے کا موقع دو۔"

"کتنا وقت؟ بولو، چوبیس گھنٹے کافی ہوں گے؟"

"ہاں، تقریباً کل اسی قت اسی ہوٹل کے لان میں۔ صرف ہاں یا نہیں دو لفظوں میں۔"

"مجھے منظور ہے۔" اس نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ بہرحال میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اس کے بعد کھانے پینے سے فراغت حاصل کر کے ہم اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو مینجر نے پھر اسی انداز میں سلام کیا۔ ہشمان ذکری نے اس سے کچھ کہا اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

میں اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بل ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مینجر نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب، پے منٹ ہو چکا ہے۔ شکریہ۔"

میں شانے ہلا کر باہر نکل آیا۔ باہر میں نے دیکھا کہ ہشمان ذکری اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا ہے۔ پھر جب اس کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں محتاط انداز میں سڑک عبور کرنے لگا۔ میرا ذہن بدستور الجھنوں میں الجھا ہوا تھا اور میں گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس کے بعد کے واقعات پڑھنے
کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کریں
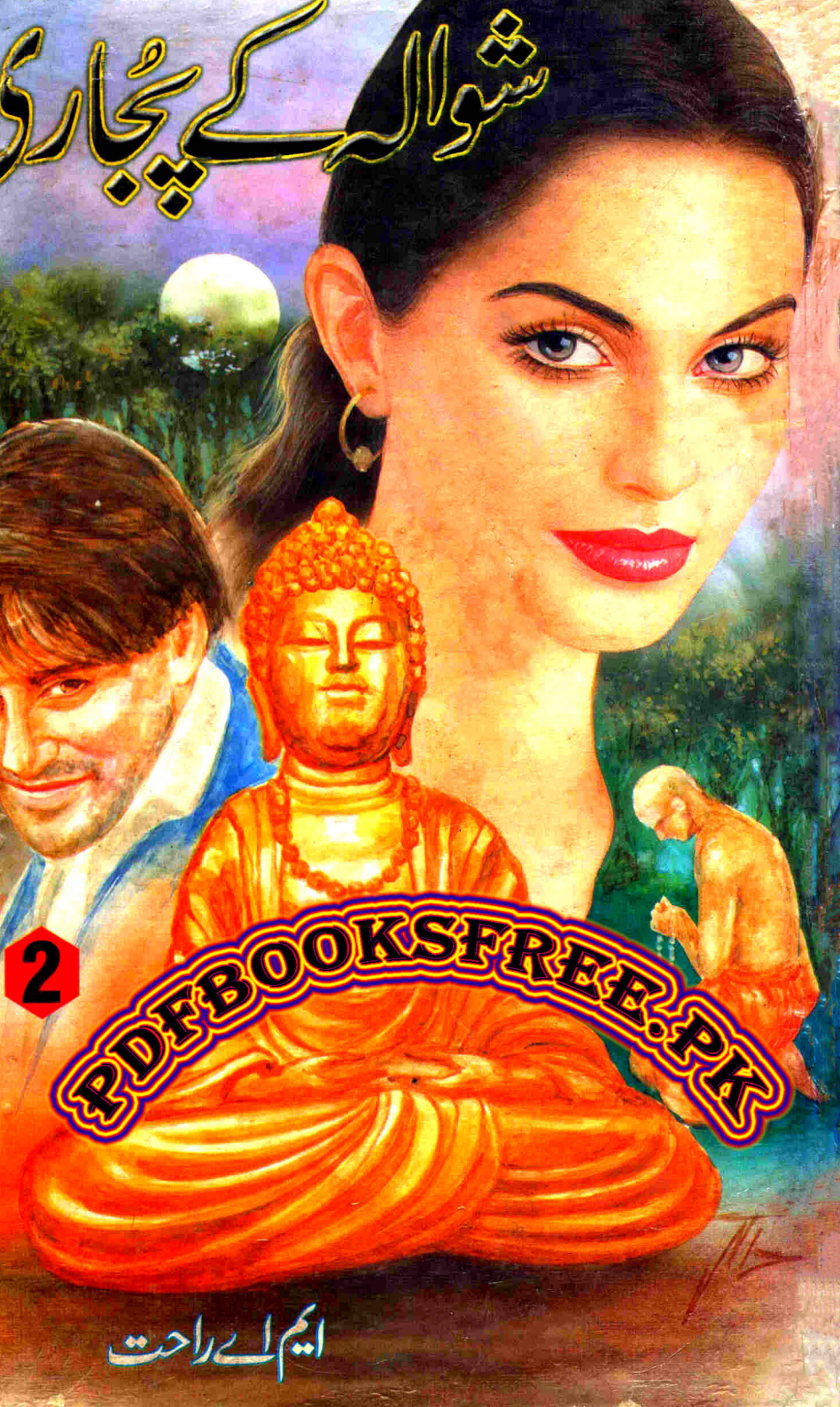
شوالہ کے پجاری
2
PDFBOOKSFREE.PK
ایم اے راحت

کچھ دیر کے بعد میں الحمرا کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی تعاقب نہیں کر رہا تو صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر لابی میں ہر طرف نگاہ دوڑائی لیکن امینہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ لاؤنج کی طرف جانے لگا تو ریسیپشن کاؤنٹر سے مینجر نے غور سے میری طرف دیکھا، اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور شستہ انگریزی میں کہنے لگا۔

''سر! کیا آپ کا نام مسٹر برک ہے؟''

میں ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر مسکرا کر کہا۔ ''ہاں میرا نام برک ہے۔ ایم کے برک۔''

''ایک خاتون پانچویں منزل پر روم نمبر دو سو بارہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... بہت بہت شکریہ۔ حالانکہ میں نے ان کو لابی میں ٹھہرنے کے لئے کہا تھا۔ روم میرے ہی نام پر ہے نا؟''

''جی آپ کے نام پر ہے۔ لیکن آپ کا سامان آنے پر رجسٹرڈ کیا جائے گا۔ آیئے۔''

وہ مجھے ساتھ لے کر لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا۔ روم نمبر دو سو بارہ کا بزر دبا دیا۔ کی ہول سے ایک آنکھ نظر آئی اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔ مینجر چلنے لگا تو میں نے اسے روک کر سو ڈالر کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہو تو ہمیں آف دی ریکارڈ ہی رکھیے۔ کوئی وزیٹر بھی نہیں آنا چاہئے۔''

مینجر نے سو ڈالر کا نوٹ دیکھا اور پھر کنپٹی کھجانے لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں، یہ کسی اکاؤنٹ میں نہیں ہیں۔ ہم پیمنٹ جاتے ہوئے کریں گے۔''

''بے حد شکریہ جناب! آپ اطمینان رکھیے۔'' مینجر کا رویہ بدل گیا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ امینہ دروازے کے پاس ہی موجود تھی۔ اس نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا اور دونوں ہاتھ میری گردن میں حمائل کر

دیئے۔
''مائی ڈیئر برک! شکر کرو تم مجھے زندہ دیکھ رہے ہو۔''
''تم زندہ ہی رہو گی۔ شاید تم ہشمان ذکری کو ادھر سے گزرتا دیکھ کر گھبرا گئی ہو گی۔''
''تمہیں معلوم ہے؟''
''ہاں۔''
''کیسے؟''
''میں اس سے مل کر بلکہ اس کے ساتھ کافی پی کر آ رہا ہوں۔''
وہ بے اعتباری سے ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔ ''ایسا مذاق مت کرو جس پر یقین کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہ ہو۔''
میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''بالکل یہی بات ہے جو میں نے تم سے کہی۔''
''کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں؟''
''وہ مجھے ہر طرح کا تعاون پیش کر چکا ہے۔ میری تمام زیادتیوں کو اس نے برداشت کرنے کا اعلان کیا ہے اور مجھے پیشکش کی ہے کہ میں اس کے ساتھ مل کر کام کروں۔''
''ممکن تو نہیں ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ تم پہلے شخص ہو جس کے سامنے وہ جھکا ہے۔''
''تمہارا کیا خیال ہے، کیا وہ مجھے دھوکا دے کر کوئی جال بچھا رہا ہے میرے لئے؟''
''یقیناً ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ تم مجھے پوری بات بتاؤ۔'' وہ بولی اور میں نے مختصر الفاظ میں اسے تمام واقعہ سنا دیا۔ وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔
''بہت بڑی رقم پیش کی ہے اس نے۔''
''مگر ایک بات سوچو ڈیئر! وہ سب کچھ کتنا ہو گا جس کے لئے وہ اتنی بڑی قربانی دے رہا ہے۔ اس کا کچھ تصور کر سکتی ہو؟''
''یقیناً، وہ کوئی بہت بڑا خزانہ ہے۔ لیکن پھر تم نے وعدہ کیوں کیا؟''
''بس پیچھا چھڑانے کے لئے۔ اب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائے گا اور ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ تختی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے۔''
''محفوظ ہاتھوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جہاں اور جس کے پاس اسے ہونا چاہئے۔''
''تمہارا مطلب ہے کوئی اور پارٹی؟''
''پارٹی تو نہیں کہا جا سکتا، اپنے ہی تصرف میں سمجھو۔ لیکن میں اس پر سودے بازی نہیں کر سکتا۔''
''کل صبح اگر تم نہ پہنچے تو ہشمان پوری شدت سے تمہاری تلاش میں مصروف ہو جائے گا بلکہ تم سے زیادہ اس تختی کی تلاش میں۔''
''اس وقت تک یہ تختی کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہو گی۔ اور پھر تم مجھے نہیں جانتی ڈیئر! ہشمان ذکری کو اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزرنا ہو گا اور اس کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔''
ایمنہ غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر مسکرا کر خاموش ہو گئی۔
دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مجھ پر کچھ غنودگی سی سوار ہوئی اور میں پڑ کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بجے تھے۔ ایمنہ صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیڈ لیمپ کی روشنی میں میرا لایا ہوا رسالہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور پھر اس نے کمرے کی تمام بتیاں روشن کر دیں۔
''بھوک لگ رہی ہے ایمنہ! کھانا کھلاؤ۔''
''میں روم سروس کو فون کرتی ہوں۔''
''او کے۔'' میں نے کہا اور باتھ روم کی جانب چل پڑا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ایمنہ سے کہا۔ ''کیا خیال ہے، ہم باہر چلیں؟''
''کیسی باتیں کرتے ہو...... کیا یہ مناسب ہو گا؟''
''ابھی تک تو کچھ نہیں ہے۔ نکلتے ہیں۔ ساحل سمندر وغیرہ پر چلیں گے۔ خطرہ تو آنے والی صبح کے بعد ہو گا۔''
لیکن ایمنہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل ہی میں چہل قدمی کر لیتے ہیں۔ ہم ہوٹل کے ٹیرس میں پہنچ گئے۔ یہاں جابجا گملوں میں پھول دار پودے اور ان کے درمیان بنچوں پر متعدد جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہم تھوڑی دیر تک چھت کی دیوار کے پاس کھڑے روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے شہر اور بازار کے مناظر دیکھتے رہے۔ ہماری نگاہیں دور دور تک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر ہم دونوں ایک گوشے میں بنچ پر بیٹھ

گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے لیکن ٹیرس پر رونق کا وہی عالم تھا۔ جگہ جگہ لوگ بنچوں پر بیٹھے مشروبات سے شغل کر رہے تھے۔ بیرے آ جا رہے تھے۔ نوجوان جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔ رنگ برنگی روشنیوں میں ہر طرف زرق برق ملبوسات کے ساتھ خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ الحمراء، اسکندریہ کے حسن و شباب اور دولت مند ماحول کی نمائندگی کر رہا تھا جس میں قہقہے رچے ہوئے تھے۔ خوش باش اور زندگی سے بھرپور قہقہے۔ لیکن بہرحال کچھ دیر کے بعد یہ سب بھی کچھ بے اثر سے ہو گئے اور میں نے بیزاری سے کہا۔

"کیا خیال ہے، اپنے کمرے میں چلیں امینہ؟"

"ہاں...... آؤ، چلتے ہیں۔ میں بھی یہاں کے ماحول سے اکتا گئی ہوں۔"

پھر ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور وہاں سے چل پڑے۔ ویسے اب میرے ذہن میں کچھ اور خیالات گردش کر رہے تھے۔ اسکندریہ میں میرا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور اب اس کا ردعمل شروع ہونے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہاں میرے لئے خطرات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ تختی جس کے حصول کے لئے میں یہاں تک آیا تھا میرے ہاتھ آ گئی تھی۔ چنانچہ مجھے اسکندریہ چھوڑ دینا چاہئے۔ جہاں تک ہیگ کا معاملہ تھا میں اس کی نئی شخصیت سے روشناس ہونے کے بعد حقیقت کی دنیا میں آ گیا تھا اور یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ اس کی شخصیت بہت بڑی ہے۔ وہ تو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ہشمان ذکری ہی کے جال میں پھنس گیا تھا اور اسی سے مجھے نجات پانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن بہرحال ایک بہت بڑا کام ہو گیا تھا یعنی تختی مجھے حاصل ہو گئی تھی۔ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ البتہ اب ذرا اور مسئلہ میرے لئے مشکل ہو گیا تھا وہ تھا امینہ کا ساتھ۔ امینہ کی اور میری قربت کچھ اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے امینہ کو چھوڑ دینا میرے لئے ممکن نہ ہو اور میں اسے دھوکا دے کر یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھا تو بولی۔

"کیا بات ہے...... کچھ پریشان ہو؟ چلو اپنے کمرے میں چل کر سوتے ہیں۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

ہم دونوں اس راہداری میں پہنچ گئے جو ہمارے کمرے کی طرف جاتی تھی۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ اس وقت موسم اور ماحول کچھ اس طرح کا تھا کہ زیادہ تر لوگ اپنے

کمرے بند کر کے ٹیرس پر پہنچ گئے تھے یا پھر اگر کوئی اس طرح کا آدمی ہو گا جو سکون سے رہنا چاہتا ہو گا تو وہ اس وقت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔

آخر کار ہم اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے جیب سے چابی نکالی اور پھر چابی کو کمرے کے قفل میں گھمایا تھا کہ اچانک چمپا کے پھول کی مخصوص خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔ اس وقت کچھ ایسی بے اختیاری ذہن پر سوار ہوئی تھی کہ امینہ کو بھی ایک دم سے کسی انہونی بات کا احساس ہو گیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"خیر تو ہے...... کیا ہوا؟"

میں ابھی پوری طرح نہیں سنبھل پایا تھا کہ دور سے مجھے لکڑی کے کھڑاؤں پہن کر چلنے کی کھٹ کھٹ سنائی دینے لگی۔ اور پھر میری نگاہ اس آواز کی سمت اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وردان سادھانی اسی طرف چلا آ رہا ہے...... میں نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھول دیا۔ امینہ کمرے میں داخل ہونے لگی۔ پھر بولی۔ "کیا بات ہے...... بتاؤ گے نہیں؟"

"نہیں امینہ، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرا ایک پرستار آ رہا ہے۔ ذرا اس سے مل لوں۔"

وردان سادھانی کو دیکھ کر اس نے ہونٹ سکوڑے اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ سادھانی آہستہ آہستہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے مخاطب ہو میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے اندر لے جاؤں۔ وہ مجھ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ وردان سادھانی بھی بے تکان اندر آ گیا تھا۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور "دھم راج بودھی ستو" کہہ کر میرے قدموں میں آ گیا۔ امینہ اس عجیب و غریب انسان کی اس مضحکہ خیز حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھک کر وردان کا بازو تھاما اور اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نتھا ستو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مہان بدھی ستو! آپ کی سپھلتا پر، آپ کی سیوا میں دھنے واد ارپن کرتا ہوں۔ آپ کی کٹھن پریکشا ختم ہوئی اور اب ہم آپ کو مہان بدھی ستو کے روپ میں دیکھنے کو بے چین ہیں۔"

''سادھانی! یہ اپنی امانت سنبھالو۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ کر وہ تختی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ میں نے کہا۔ ''سدھارتا خود بھی سمجھ سکتا ہے۔ ابھی میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مہان بدھی ستو! آپ کو اس موہ مایہ میں پڑنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ بندھن مہا پرشوں کی مہاتما ختم کر دیتے ہیں۔ خیر ہمیں معلوم ہے کہ اس دیوی نے کسی کارن آپ کے لئے بہت بڑا بلیدان دیا ہے اور آپ کے لئے خود اس کو تیاگ کر چل دینا بڑا کٹھن ہے۔''

''کٹھن نہیں، ناممکن کہو وردان سادھانی!''

وہ میرے ان الفاظ پر مسکرا دیا اور سر جھکا کر بولا۔ ''نہیں بدھی ستو! سنسار کا تمام روپ، تمام دھن آپ کے چرنوں میں ہے۔ آپ مہان شکتی کے مالک ہیں۔ لیکن شکتی کو پراپت کرنے کے لئے آپ کو گاشر برہم ضرور جانا پڑے گا جہاں مہان بھکشو مندر میں اشمھ سدھانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آؤں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی وہاں آنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ تم ایسا کرو......''

''دھم راج، ضد نہ کیجئے۔ آپ کا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن اگر آپ وہاں جا کر یہاں واپس آنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو صبح ہونے سے پہلے گاشر برہم اور پھر اس سمے یہاں واپس پہنچا سکتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لئے ایک عجیب سا احساس مجھے ہوا۔ سری لنکا کہاں اور قاہرہ کہاں۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا۔ میرے اب تک کے تجربات مجھے یہی بتاتے تھے۔ میں نے کہا۔

''وردان، آج نہیں، کل۔''

''جو آگیا بدھی ستو۔ پرنتو ساودھان رہئے۔ آج رات یہاں ایک اکشماد کا سمھو ہے۔''

میں ہنس دیا۔ اس نے جھک کر میرے پاؤں چھوئے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ امینہ نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''کیا باتیں کر رہے تھے تم لوگ؟ میں تو تمہاری زبان سن کر ہی پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ یہ قصہ کیا تھا؟ کیا چیز ہے یہ؟ ٹھہرو ایک منٹ، میں دروازہ بند کر دوں۔'' اس نے دروازہ بند کیا اور پلٹتی ہوئی مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''پر یہ تھا کون؟ مصر میں تو فینسی ڈریس شو بھی نہیں ہوتے۔ اور اس نے عجیب و غریب لباس پہنا ہوا تھا۔''

میں نے گہری سانس لے کر اس کے بازوؤں کو تھامتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کی پراسرار طاقت سے واقف نہیں ہو۔ یہ تختی جو میں نے اس کے حوالے کی ہے وہ ہندوستان سے اسے لینے آیا تھا۔ اور اب واپس وہاں پہنچ گیا ہوگا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ سری لنکا کی بات کرتا ہوں میں۔''

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی تو میں نے ہنس کر اسے تکیے پر گرا دیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ یہ کیا، دنیا کا کوئی بھی فرد میری ان باتوں کو سنتا تو ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حسین وجود، ایک مست شباب میری قربت میں موجود تھا۔ لیکن وردان سادھانی نے یہاں آ کر میرے ذہن کو متردّد کر دیا تھا اور میں چوکنا ہو گیا تھا۔

امینہ کے ساتھ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ پھر ہم نیم غنودگی کی کیفیت میں گرفتار ہو گئے۔ رات کا کوئی ڈیڑھ بجا ہو گا کہ اچانک امینہ نے میرے بازو میں چٹکی لے کر سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ چونکہ مکمل طور پر نیند نہیں آئی تھی اس لئے میں نے بھی چونک کر ادھر دیکھا۔ امینہ نے جس طرف اشارہ کیا تھا، وہ کھڑکی تھی اور کھڑکی کا پردہ ہل رہا تھا۔ لیکن بہرحال میں غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کمبل سرکا کر پائنتی کی طرف پھینکا اور تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالا۔ پھر میں دبے پاؤں بستر سے اتر کر چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میں کھڑکی کے بالکل سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اس کی سائیڈ میں تھا۔ پردے کے پیچھے یقیناً کوئی موجود تھا۔ میری چھٹی حس مجھے اس کا احساس دلا رہی تھی۔

پھر اچانک ہی پردے کے پیچھے سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے دانت پیس کر پوری طاقت سے پستول کا دستہ اس چہرے پر مارا۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ کھڑکی میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور دوسرے لمحے سڑک پر کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ امینہ بھی برق رفتاری سے چھلانگ لگا کر میری طرف لپکی۔ میں نے پردے کی آڑ سے کھڑکی سے باہر جھانکا، فٹ پاتھ پر ایک سیاہ پوش آدمی کا جسم بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اتفاق سے پاس ہی کوئی پولیس مین بھی موجود تھا جو تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ کھڑکی کے بائیں جانب تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر ایک پائپ

لائن تھی جو چھت تک جا رہی تھی۔ آنے والا شاید اسی کے ذریعے اوپر چڑھ کر آیا تھا۔ میں نے امینہ کو کھڑکی سے پیچھے ہٹایا اور اس کا بازو پکڑ کر واپس مسہری پر آ گیا۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہشمان ذکری نے ہمیں ڈھونڈ نکالا۔''

میں پُر خیال انداز میں رخسار کھجانے لگا، پھر میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''ایسا ہی لگتا ہے امینہ!''

لیکن میرا ایک اور اندازہ بھی ہے۔'' وہ بولی۔ ''یقیناً اس نے اس شخص کو ہمیں قتل کرنے کے لئے نہیں بھیجا ہوگا۔''

''تو پھر؟ کیا وہ ہمیں اپنے آپ سے ہوشیار کرنے آیا تھا؟''

امینہ نے مسکرا کر میرے سینے پر سر ٹکا دیا۔ میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اچانک دس یا پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور امینہ سہمی ہوئی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ...... یہ کون ہوسکتا ہے؟''

''دیکھتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دروازہ دوبارہ بجایا گیا۔ اس مرتبہ ذرا زور سے دروازہ بجایا گیا تھا۔ بہرحال میں نے ہمت کر کے دروازہ کھولا۔ کوریڈور میں ہوٹل کا منیجر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''تکلیف دینے کے لئے معذرت چاہتا ہوں مسٹر برک! لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ......''

''ایک منٹ رکو۔'' میں نے کہا اور واپس پلٹ کر گاؤن پہنا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ''کیا بدتمیزی ہے یہ رات کے اس وقت؟''

''پلیز...... آپ اپنی مسز کو جگائیے۔ اور مہربانی فرما کر میرے ساتھ آئیے۔''

''لیکن کیوں؟''

''آپ کی کھڑکی کے عین نیچے ایک آدمی اوپر چڑھتا ہوا مر گیا ہے۔''

''تو پھر؟''

''دیکھئے، میں نے بے شک آپ کی ہدایت کے مطابق آپ کا نام درج نہیں لیکن اگر پولیس اب اس سلسلے میں مجھے کچھ کہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''دیکھئے، مہمانوں کے مفاد کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ آپ ہم سے تعاون کیجئے۔''

''اوکے، اوکے...... رُکو یہاں۔'' میں نے کہا اور واپس آ کر امینہ کو سمجھایا۔ اس کے کپڑے اور برقع دیتے ہوئے کہا۔

''ہم دوسرے کمرے میں چل رہے ہیں۔''

امینہ کو صورتحال کا صحیح طور پر اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ کپڑے پہنے، پرس کندھے پر ڈالا اور ایک لفظ کہے بغیر باہر آ گئی۔ منیجر ہمیں ساتھ لئے ہوئے زینے کے پاس آیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''یہاں کوئی نہیں آ سکے گا۔ کیونکہ یہ کمرہ ریزرو ہے۔ اور جس شخص کے نام پر یہ کمرہ ریزرو ہے، وہ ایک ہفتے سے پہلے یہاں نہیں آئے گا۔ البتہ آپ اس کا نام ضرور یاد رکھیں، سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ آپ اس کمرے میں منتقل ہو جائیں۔ تاکہ اگر پولیس آپ کے کمرے کا جائزہ لے تو ہم اسے خالی قرار دے سکیں۔''

''اوہ، بہت بہت شکریہ منیجر۔''

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا نا جناب! کہ مہمانوں کے مفادات کا خیال رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔ آپ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے۔''

بہرحال ہم نے منیجر کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ مسہری پر بیٹھ کر امینہ نے آہستہ سے کہا۔ ''برک! یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا منیجر ضرورت سے زیادہ ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کر رہا؟ اس نے ایک طرح سے ایک مجرمانہ عمل کیا ہے۔''

''ہاں...... ایسا لگتا ہے جیسے ہماری موجودگی کی اطلاع اسی شخص نے ہشمان ذکری کو دی ہے ورنہ......''

''میری بات سنو...... پہلے تم اس کمرے کا جائزہ لو۔ کہیں ہمیں یہاں چھپا کر کسی کا شکار بنانے کی کوشش نہ کی جا رہی ہو۔''

میں ایک دم اچھل پڑا۔ واقعی بے مثال خیال تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکالا اور جھک کر مسہری کے نیچے نظر ڈالی۔ یہاں کچھ نہیں تھا۔ باتھ روم اور کلاتھ روم کھول کر دیکھا، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں، ایک کونے میں سنگھار میز رکھا تھا جس میں قد آدم شیشہ لگا ہوا تھا۔ ترچھے زاویئے میں رکھے ہونے کے

باعث اس کے پیچھے کافی جگہ تھی۔ اتنی جگہ کہ آسانی سے دو تین آدمی چھپ سکتے تھے۔ سیٹنگ کے لحاظ سے بھی یہ زاویہ کچھ اسٹائل سے ہٹا ہوا تھا۔ عام طور سے سنگھار میز مسہری کے قریب دیوار سے لگی ہوتی ہے اور اس کے قریب صوفے سیٹ وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ یہاں اتنے فاصلے پر کیوں ہے؟ یہ سوچتا ہوا میں آگے بڑھا اور سنگھار میز کے عقب میں نظر دوڑائی، یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن میز اور کونے کی دیوار کے درمیان ایک بڑا سا بکس رکھا ہوا تھا جو تقریباً تین فٹ اونچا اور اتنا ہی چوڑا اور پانچ فٹ لمبا تھا۔ اس بکس کی یہاں موجودگی بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس میں بھی کچھ افراد چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بکس یہاں ہونا بے مقصد نہیں ہے۔ بہرحال پستول پر میری گرفت مضبوط تھی۔ میں نے گردن گھما کر امینہ کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی اس نے اشارہ کیا اور بولی۔

”کیا ہے......؟“

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر میں دبے پاؤں اس تک پہنچا، پھر اس کے کان پر منہ رکھ کر کہا۔ ”اس بکس میں مجھے لوگوں کے چھپنے کا شک ہے۔ میں پھر واپس جاتا ہوں۔ تم میرے اشارے پر لائٹ آف کر دینا اور پھر ایک دو منٹ توقف کر کے دوبارہ جلا دینا۔ اندر کوئی ہے تو اندھیرا ہوتے ہی نکلنے کی کوشش کرے گا۔“

امینہ نے گردن ہلائی۔ پھر مسہری سے اٹھ کر سوئچ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ میں نے میز کے قریب جا کر اشارہ کیا اور اس نے سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ہماری نگاہیں ڈھکن پر جمی ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے تھوڑی تھوڑی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جس میں کمرے کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ ہماری نگاہیں کچھ لمحوں ہی میں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ امینہ بھی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پستول دیکھ کر تعجب ہوا۔ چند منٹ اسی تامل میں گزر گئے اور پھر دفعتہً ہمارے دل دھڑکنا بند ہو گئے۔ بکس کا ڈھکن آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہوا تھا۔ ہم اس کے مزید کھل جانے کا انتظار کرتے رہے اور میں نے امینہ کو اشارہ کیا اور وہ پنجوں کے بل دوڑتی ہوئی سوئچ کے پاس پہنچ گئی ڈھکن آٹھ دس انچ اوپر اٹھا ہو گا کہ کمرے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ ڈھکن آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ اس کا رخ دیوار کی طرف تھا اس لئے اس کا چہرہ

تو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن ایک ہاتھ جو ڈھکن تھامے ہوئے تھا، صاف نظر آ رہا تھا۔

ڈھکن بند ہوتے ہی دیوار کی طرف ایک پنسل صندوق میں سے فرش پر گری اور ڈھکن مکمل طور پر بند ہو گیا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور صندوق کی کنڈی لگا دی۔ پھر میں نے جھک کر وہ پنسل اٹھائی جو غالباً ڈھکن کے نیچے ہوا کے لئے تھوڑی سی درز کھولنے کے علاوہ صندوق کی کنڈی کو بھی بند ہونے سے روکے ہوئے تھی۔ اب جو کوئی بھی اندر تھا، پوری طرح چوہے دان میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے امینہ کو مسہری کی چادر میں سے ایک لمبی دھجی پھاڑ لینے کو کہا اور خود ڈھکن پر بیٹھ کر صندوق کے دوسرے پہلو کا جائزہ لینے لگا۔ اس طرف بھی کوئی سوراخ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مکمل طور پر یہ ایئر ٹائٹ ہو چکا تھا اور اس ایئر ٹائٹ قبر میں بند ہو جانے والے بدنصیب ایک دو یا تین جتنے بھی تھے، دس پندرہ منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ امینہ نے کپڑے کی اس دھجی کو بل دے کر بنائی ہوئی پانچ چھ انچ لمبی ڈوری میرے ہاتھ میں تھما دی اور میں نے ڈھکن پر بیٹھے بیٹھے صندوق کی کنڈی کو مضبوطی سے باندھ دیا۔

دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ بکس کے اندر ڈھکن پر ہاتھوں اور سروں سے ضربیں لگائی جانے لگیں۔ صندوق بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے تختے غالباً جہاز کے کیبنوں کے تختوں سے بنائے گئے تھے چنانچہ اس کے ٹوٹنے اور کھلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اندر سے طرح طرح کی بے ربط آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ میں نے امینہ سے کہا۔

”امینہ! تم دروازے اور کھڑکیاں بند کر دو۔“

امینہ نے فوراً ہی میری اس ہدایت پر بھی عمل کیا اور میرے پاس آ کر ڈھکن پر بیٹھ گئی۔ صندوق میں تھوڑی ہی دیر بعد دھاکوں اور آوازوں سے ہنگامہ سا برپا ہوتا چلا گیا۔ لیکن پھر یہ ہنگامہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ ہم لوگ آدھے گھنٹے تک صندوق پر بیٹھے رہے اور آدھے گھنٹے میں اندر سے تمام کوششیں ختم ہو گئیں اور سکوت طاری ہو گیا۔ تب میں نے امینہ کو اشارہ کیا اور ہم صندوق سے اتر کر نیچے کھڑے ہو گئے۔ صندوق میں اب کسی کے زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بہرحال جس نے بھی یہ کوشش کی تھی اس نے ان لوگوں کے لئے اس صندوق کو تابوت ہی بنایا تھا۔

ہم اس منحوس صندوق سے اتر کر صوفوں کے پاس آئے اور گلاس میں پانی انڈیلنے

لگے۔ پانی پیتے پیتے گھٹ کر مرنے والوں کی اذیت ناک موت کے تصور سے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اپنے سفاکانہ فعل پر غور کرتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو تین بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے امینہ سے کہا۔

''کیا کہتی ہو اب...... یہاں رُکیں یا نکلنے کی کوشش کریں؟''

''دیکھو، جو کچھ ہوا ہے اس میں یہ سوچنا تو بالکل حماقت ہے کہ منیجر اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ یہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ لیکن بھاگ نکلنے کا کون سا راستہ ہو سکتا ہے؟''

''اگر ایک گھنٹہ اور گزر جائے تو ساڑھے چار بجے نکلنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ لیکن اچانک ہی پھر میرے ذہن میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''آؤ...... میرا خیال ہے منیجر سو چکا ہوگا اور کاؤنٹر پر ایک کلرک بیٹھا اونگھ رہا ہوگا۔ اس کو میں اپنی بیماری کا بہانہ کر کے فوراً ہسپتال پہنچانے کا انتظام کرنے کو کہوں گا۔ اس دوران تم مجھے بیماروں کی طرح تھامے رہنا۔ اگر کاؤنٹر کلرک کوئی گڑبڑ کرے تو اسے تھوڑی بہت رقم دے دینا۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے اور اس کے بعد ہم ٹیکسی کر کے قاہرہ کی طرف چل پڑیں گے۔''

''خیال تو اچھا ہے۔ لیکن ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں پوچھو؟''

''اگر منیجر سے ملاقات ہو گئی تو پھر؟''

''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آؤ چلتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ راہداری زینے کے موڑ تک خالی پڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے زینے کی طرف پہنچے اور خاموشی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے پہلی منزل پر آ گئے۔ امینہ نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا۔ کلرک دونوں بازو میز پر رکھے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے آرام سے سو رہا تھا۔ ہم نے اپنے قدموں کی رفتار اور محتاط کر دی اور بغیر آواز پیدا کئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پورا کاؤنٹر عبور کر گئے۔ کلرک بے خبر سو رہا تھا۔ ہم آگے بڑھے اور گھوم کر دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن دیوار کے قریب ایک پہریدار اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، سلام کر کے بولا۔

''صاحب! ابھی تو سیر کا وقت نہیں ہوا۔''

''میرے شوہر کی طبیعت خراب ہو گئی ہے میں انہیں ہسپتال لے جانا چاہتی ہوں

اچھا ہوا تم مل گئے۔ ذرا مہربانی کر کے جلدی سے ٹیکسی لا دو۔''

پہرے دار نے گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیا۔ میں نے اپنے چہرے پر نقاہت کے آثار پیدا کر لئے۔ وہ بولا۔ ''افسوس خانم! میں دروازہ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''دیکھو، یہ میری مجبوری ہے۔ اور شاید یہ تمہاری مجبوری ہو۔'' اس نے ایک ڈالر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ہچکچایا تو امینہ بولی۔ ''دروازے پر تو ہم کھڑے ہی ہیں۔ جاؤ ذرا جلدی کرو۔''

پہرے دار نے نوٹ جیب میں ڈالا اور جلدی سے سڑک کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دروازے سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا اور میدان صاف پا کر امینہ کو اشارہ کیا اور امینہ باہر نکل آئی اور بولی۔

''کیا ٹیکسی کا انتظار نہیں کرو گے؟''

''آ جاؤ......'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور اس کا بازو تھام کر تیزی سے سڑک عبور کرنے لگا۔ سڑک عبور کر کے ہم سامنے والی عمارتوں کے عقب میں پہنچ گئے اور مخالف سمت چلنے لگے۔ کچھ عمارتیں گزرنے کے بعد ایک اسٹریٹ کے کونے پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا، پہریدار ایک ٹیکسی میں بیٹھا ہوا ہوٹل کی طرف آ رہا تھا۔ ہم عمارت کی آڑ میں ہو گئے تو گاڑی ہوٹل میں داخل ہوئی تو پچھلی سیٹ پر بھی ایک آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا۔

''دیکھا...... کیا خیال ہے۔ ہم رک گئے ہوتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔''

''میرے خدا، ایسا لگتا ہے جیسے پورا ہوٹل ہمارے خلاف سازش میں مصروف ہو۔ شاید پہرے دار بھی۔''

''ہاں، لعنت بھیجو اس پر۔ لیکن ہمیں ٹیکسی فوراً ملنی چاہئے۔ کیونکہ انہیں فوراً ہی ہمارے فرار کا احساس ہو جائے گا اور ذرا سی دیر میں وہ ہم تک پہنچ جائیں گے۔ تیزی سے گلی تک پہنچو۔ یہ گلی تو دور تک سیدھی جا رہی ہے اور وہ سڑک سے ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔''

ہم نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ دائیں طرف کوئی گلی وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر دوڑتے تو وہ بھی خطرناک تھا۔ کیونکہ کسی بھی گشتی پولیس کے آدمی سے سامنے ہونے کے امکانات تھے۔ اس وقت چار بجے تھے۔ صبح ہونے میں دیر تھی۔ بہرحال ہم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔

کوئی دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ تھوڑی دیر میں سڑک کا دوسرا سرا نظر آنے لگا تھا جو کسی بڑی سڑک سے ملحق تھا۔ ہم نے یہ فاصلہ بھی طے کر لیا اور سڑک پر آ گئے۔

''کیا تم اس علاقے سے واقف ہو؟''

''بالکل نہیں۔ ذرا آہستہ چلو۔ اصولی طور پر ہمیں یہاں ٹیکسی مل جانی چاہئے۔ اوہو، تھوڑا تھوڑا سا پہچان رہی ہوں اس علاقے کو؟ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تھوڑے فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ ہونا چاہئے۔''

میں نے گردن ہلائی۔ پستول جیب میں رکھا ہوا تھا اور اس پر میری گرفت قائم تھی۔ آخر کار ہم ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ گئے اور ہمیں یہاں ٹیکسیاں بھی نظر آ گئیں۔ ڈرائیور پچھلی سیٹوں پر پڑے سو رہے تھے۔ امینہ نے پہلی ٹیکسی کے ڈرائیور کا شانہ ہلایا، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ٹوپی سر پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ ہم پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ امینہ نے میری طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا۔

''بتاؤ، کہاں چلیں؟''

''پورٹ کی طرف۔''

''او کے۔'' امینہ نے ڈرائیور کو راستہ بتایا اور اس نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''ڈرائیور! تمہاری ٹیکسی کے ٹینک میں فیول کتنا ہے؟''

''ٹینکی بھری ہوئی ہے میڈم! کہئے، کیا بات ہے؟''

''قاہرہ جا سکتے ہو؟''

''جا تو سکتا ہوں میڈم! لیکن آپ کو دونوں طرف کا کرایہ دینا پڑے گا اور چائے وغیرہ کے لئے ایک گھنٹہ ٹھہرنا پڑے گا۔ ساڑھے پانچ بجے سے پہلے نہیں جا سکتے۔''

''پورٹ پر ناشتہ کریں گے۔ یہ منظور ہے؟'' میں نے کہا۔

''جی سر! لیکن کرایہ؟''

''ہاں ہاں، کرایہ تمہیں دے دیں گے۔''

''قصور میرا نہیں ہے جناب! قاہرہ سے سواری ملنا مشکل ہے۔''

''چلو چلو، ٹھیک ہے۔ او کے.....''

یہ مذاکرات ختم ہوئے تو اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہم بندرگاہ میں داخل ہو گئے۔ میرا ذہن برق رفتاری سے گزرے ہوئے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہماری تلاش میں دوڑتے پھر رہے ہوں گے۔ بہر حال یہ ہنگامہ آرائی تو ہونی ہی تھی۔ وردان ساودھانی شاید ہمیں میرا مطلب ہے مجھے اس ہنگامہ آرائی کی خبر دینے ہی آیا تھا۔ بندرگاہ کے سامنے کئی ہوٹل اور ریستوران کھلے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے ریستوران کے سامنے ہم نے گاڑی رکوائی اور ڈرائیور سے کہا۔

''آ جاؤ ڈرائیور! اس وقت تم ہمارے مہمان ہو۔''

ڈرائیور نے نیاز مندی سے گردن ہلا دی تھی۔

پانچ بجے کے قریب چائے ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے چلنے کا فیصلہ کیا اور بل ادا کر کے ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر پارکنگ لاٹ پر چھٹی ساتویں گاڑی پر نظر پڑتے ہی میں چونکا۔ یہ وہی ٹیکسی تھی جو ہم نے اس وقت دیکھی تھی جب ہوٹل کا پہرے دار ہمارے لئے لے کر آیا تھا۔ اس میں اس وقت تین آدمی بیٹھے تھے۔ یہ ٹیکسی میری نگاہوں میں آئی تھی، امینہ نے اسے نہیں دیکھا تھا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھ جائیے جناب!''

میں نے صرف ایک لمحے سوچا اور اس کے بعد ڈرائیور سے کہا۔ ''چلو۔''

ہماری ٹیکسی بیک ڈور سے نکلتے ہی وہ دوسری ٹیکسی بیک ہوئی۔ امینہ نے مجھے کچھ محتاط انداز میں پیچھے دیکھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''خیریت، کیا بات ہے برک؟''

میں نے فوراً جواب دینے کی بجائے اپنا پستول جیب سے نکال لیا۔ امینہ نے میرے اس عمل کو حیرانی سے دیکھا اور پھر پیچھے بیک کر کے دیکھنے لگی۔ ٹیکسی سڑک پر آتے ہی فراٹے بھرنے لگی تھی۔ اور اس سے کچھ پیچھے وہ دوسری ٹیکسی بھی اسی رفتار سے آ رہی تھی۔ میں نے امینہ کی طرف دیکھا، امینہ کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے لیکن وہ گھبرائی نہیں تھی۔

آخر کار ٹیکسی مختلف سگنلوں اور انٹر سیکشنوں سے گزرتی ہوئی بیرونی شہر میں جانے والی شاہراہ پر آئی اور اس کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''سنو..... کتنے سال سے گاڑی چلا رہے ہو؟''

''زندگی گزر گئی جناب۔''
''اپنے آپ کو ماہر کہہ سکتے ہو؟''
''کیوں نہیں۔''
''پھر کتنی رفتار سے گاڑی چلا سکتے ہو؟''
''جتنی رفتار سے آپ کہیں صاحب! لیکن خرچہ کچھ زیادہ ہو جائے گا۔''
ڈرائیور کے اس کمینے پن پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن گاڑی اتنی رفتار سے چلانی پڑے گی کہ خرچہ دیتے ہوئے خوشی ہو۔''
''آپ جتنی تیز کہیں صاحب۔''
''تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ لو۔'' میں نے کہا اور دس ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
''ارے صاحب، کیا آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟''
''بالکل نہیں۔ چلو، دیکھتا ہوں کتنی تیز چلا سکتے ہو۔''
''ٹھیک ہے صاحب!'' ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا اور سپیڈو میٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ ایک میل تک جاتے جاتے ٹیکسی نوے اور سو کے درمیان دوڑنے لگی۔ میں ڈرائیور کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ بولا۔
''اور صاحب؟''
''ہاں چلو۔'' میں نے کہا اور اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ پھر اچانک ہی وہ بولا۔
''صاحب! ایک بات بتایئے؟''
''ہاں پوچھو۔''
''کیا کوئی آپ کا پیچھا کر رہا ہے؟''
''ہاں...... وہ بھی ایک ٹیکسی تھی۔ لیکن اب نظر نہیں آ رہی ہے۔''
ڈرائیور کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیوں، کیا بات ہے؟''
''کچھ نہیں صاحب، ایسے ہی۔''
''دیکھو ڈرائیور! ہر شخص کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے اور دوسروں کی جنگ میں کوئی شامل نہیں ہوتا۔ اگر تم اس خیال سے خوفزدہ ہو گئے ہو کہ دوسری ٹیکسی میں میرے دشمن موجود ہیں تو بے فکر رہو اور قریب ترین نخلستان میں ہمیں چھوڑ دو، اپنا کرایہ لو اور واپس لوٹ

جاؤ۔ ہم خود بھی تمہارے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔''
میرے ان الفاظ نے ڈرائیور پر اثر کیا اور وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''نہیں صاحب! ایسی بزدلی تو میں نہیں کر سکتا۔ اور پھر ہر پیشے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ہم اتنے بے اصول لوگ نہیں ہوتے۔ آپ کے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔ ہمیں ان کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔''
''بہت شکریہ۔ اب ایک ایسا مرحلہ بھی آ رہا ہے کہ میں تمہیں تیز رفتاری کے خطرے میں ڈالے بغیر اپنا کام کر سکوں۔ میں ان کا مقابلہ کروں گا۔''
ڈرائیور نے ایک نظر پچھلے راستے پر ڈالی اور پھر بولا۔ ''صاحب! وہ ٹیکسی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ لگتا ہے یا تو ان کا پٹرول ختم ہو گیا ہے یا پھر وہ واپس چلے گئے ہیں۔''
میں نے پلٹ کر شیشے سے دیکھا، حد نظر تک سڑک خالی پڑی تھی۔ صبح ہوتی جا رہی تھی اور ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میری ہدایت پر ٹیکسی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ ہم لوگ شہری آبادی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ دونوں طرف ویران صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بہت دور کہیں کہیں کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آ جاتے اور پیچھے رہ جاتے۔ مشرق کی طرف شفق کا منظر بھی ٹیلوں کے ذرات چمکانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ چند میل چل کر ایک نخلستان آیا جہاں سو ڈیڑھ سو کھجور کے درختوں کے درمیان سڑک کے قریب چند مکانات نظر آ رہے تھے۔ یہاں ایک چشمہ بھی تھا اور قہوہ خانہ بھی جو دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔
''کیا خیال ہے، اس طرف چلیں؟''
''جیسا حکم صاحب!'' اس نے کہا اور میرے اشارے پر اس نے قہوہ خانے کی طرف گاڑی موڑ دی۔ اس وقت قہوہ خانے میں اور کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ جب ہم وہاں پہنچ کر گاڑی سے اترے تو قہوہ خانے کا مالک ہمیں دیکھ کر تعظیم کے لئے اٹھ کر باہر آیا۔ ڈرائیور نے عربی میں اس سے کار کھڑی کرنے کی جگہ بتانے کو کہا اور اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ڈرائیور ہمیں اندر جانے کا کہہ کر گاڑی لے کر اس طرف چل پڑا اور میں ایینہ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا یہاں اس وقت صرف دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک میز پر قہوے کے فنجان رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھے اور قہوہ خانے کے مالک کو چند سکے دے کر چل دیئے۔ ہم ایک کونے کی میز پر پہلو بہ پہلو

بیٹھ گئے۔ اینہ نے چند چیزوں کے نام لئے اور قہوہ خانے والا نفی میں سر ہلاتا رہا۔ آخر کار چند اُبلے ہوئے انڈے، بسکٹ اور کافی کا ناشتہ کر کے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہم قاہرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس دوران میری نگاہیں باہر کا جائزہ لیتی رہی تھیں لیکن اب اس ٹیکسی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید ہمیں گاڑی پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو اور ممکن ہے وہ سرے سے ہمارا تعاقب ہی نہیں کر رہے ہوں۔ اینہ سے اس سلسلے میں میں نے کہا تو وہ بولی۔

"نہیں برک! وہ گاڑی وہی تھی جسے وہ پہرے دار لے کر آیا تھا۔ اور ویسے بھی میں نے اس میں ہشمان ذکری کے ایک آدمی کو شناخت کر لیا تھا۔"

"اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ پھر میرا خیال غلط ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ قاہرہ اب صرف چند میل رہ گیا تھا اور بلند عمارتیں نظر آنے لگی تھیں۔ ہماری ٹیکسی کوہستانی سلسلے کی اونچی نیچی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی اور پھر ایک ہموار میدان کے ایک موڑ پر پہنچ گئی۔ ابھی وہ ایک موڑ مڑی ہی تھی کہ سامنے سے ایک کار سڑک کے بیچ و بیچ تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ فاصلہ بے شک کافی تھا لیکن وہ جس انداز میں چلا آ رہا تھا وہ بڑا خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ ڈرائیور بار بار ہارن بجانے لگا لیکن وہ کار اسی طرح چلتی رہی۔ ڈرائیور نے رفتار کم کی اور ٹیکسی کو ایکسٹریم لیفٹ پر لے جانا چاہا لیکن سامنے والی کار رفتار کم ہوتے ہی مزید بائیں جانب ہو گئی۔ اور پھر اس کے بریک لگے۔ اس نے راستہ روک لیا تھا۔ ہماری ٹیکسی کے بریک بھی چرچرانے لگے اور پھر ٹیکسی اس کار سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ ڈرائیور نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر کہا۔

"کیا چاہتے ہو پاگل تم؟"

پچھلی سیٹ سے دو آدمی اترنے کے بعد آگے بڑھے۔ اور اب صورتحال کسی قسم کے شک وشبے سے بالاتر تھی۔ لیکن دوسرے لمحے میں نے پستول نکال کر ٹیکسی کے دائیں طرف آنے والے آدمی کے سینے کا نشانہ لے کر غراتی آواز میں کہا۔

"رُک جاؤ......"

پستول پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم چپک گئے۔ میں نے پھرتی سے دروازہ کھولا، باہر نکلا اور پستول اس کی طرف کئے اس کی طرف لپکا۔ اسی وقت بائیں جانب والے نے

میری طرف پستول کیا اور چیخ کر بولا۔

"ہینڈز......"

لیکن اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اینہ نے گولی چلا دی اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گر پڑا۔ اینہ بھی دوسرا دروازہ کھول کر میرے قریب آ گئی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر سامنے کھڑے آدمی سے پستول چھین کر اینہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہتھیار چھنتے ہی اس شخص کے دونوں ہاتھ خود بخود سر سے اونچے اٹھ گئے۔ میں نے اسے کار میں دھکیلا اور پستول کا کندہ کنپٹی پر مار کر گرا دیا۔ ڈرائیور نے رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے زخمی کے قریب پہنچا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے سڑک پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کا ریوالور کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ میں نے اینہ کو اسے اٹھانے کا اشارہ کیا اور زخمی آدمی کو پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ کراہتا ہوا ایک ہاتھ سے پیٹ دبائے لڑکھڑاتے قدموں سے کار کی طرف چلنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈگمگا کر پھر گرتا، میں نے اسے دھکیل کر کار میں گھسیڑ دیا اور ڈرائیور کی گردن پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اس سے پہلے کہ پولیس کی گاڑی آ کر تمہیں سرکاری مہمان خانے میں لے جائے، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

ڈرائیور نے نیچے اترنے کے بعد اپنے دونوں ساتھیوں کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور اس کے بعد اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میں نے چلتے چلتے کہا۔

"سنو...... ذکری سے کہنا کہ اتنے گھٹیا آدمیوں کے بھروسے پر تخت حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بس جاؤ۔"

ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی بیک کر کے بائیں جانب لی اور اسکندریہ کی جانب دوڑ گیا۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی دور نکل گئی تو میں نے اپنے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں دوست! اب یہ بتاؤ کہ اپنی زبان بند رکھنے کے لئے مزید کتنی رقم پیش کروں؟"

"سر! اب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کا دشمن کون ہے۔ اب مجھے اپنا خادم سمجھئے۔"

"گڈ...... چلو پھر۔" میں نے گاڑی کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ "اور سنو، کوشش کرنا کہ اعتماد پر پورے اترو۔"

ڈرائیور نے باہر نکل کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا وعدہ ہے جناب! کہ میں کبھی بھی زبان نہیں کھولوں گا''۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر ٹیکسی آگے کی طرف چل پڑی۔ میں نے ایمنہ کی طرف دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ ایمنہ کی زبردست خوبی تھی۔ ابھی اس نے ایک آدمی کو شدید زخمی کر دیا تھا لیکن وہ بالکل نارمل تھی۔ اصل میں وہ جس ماحول میں گھری ہوئی تھی، وہاں انسانی زندگی کی قیمت ایک کارتوس سے زیادہ نہیں تھی۔ دفعتہً ہی وہ بولی۔

''ہرک! اب میری سمجھ میں آیا کہ ٹیکسی نے ہمارا پیچھا کیوں نہیں کیا تھا''۔

''ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں صاحب! اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلانے والے آپ کو یہاں دو چار ہی ملیں گے''۔

''یہ واقعی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ بہت ایکسپرٹ ڈرائیور ہیں''۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''شاید وہ ہماری گاڑی کی تیز رفتاری دیکھ کر اسکندریہ لوٹ گئے اور ذکری نے تار کے ذریعے قاہرہ میں اپنے آدمیوں کو یہ اطلاع دے کر حملہ کرایا''۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ذکری کا یہ حملہ کس حد تک کامیاب رہا ہے یہ تم سے زیادہ کون جان سکتا ہے''۔

وہ ہنس کر خاموش ہو گئی تو ڈرائیور نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ ''ایک بات میں بھی کہوں صاحب! میرا خیال ہے اب آپ کا قاہرہ جانا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کے دشمنوں کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ آپ قاہرہ جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں کسی قریے میں آپ کے رہنے کا انتظام کر دوں؟''

''کیا کہتی ہو ایمنہ؟''

''نہیں، ہم کسی غیر معروف ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔ تم چلتے رہو''۔ ڈرائیور نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ اس سے زیادہ شاید وہ کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دارالخلافہ قاہرہ کی حدود سے ایک میل اس طرف ایک چھوٹے سے قریے میں تیسرے درجے کا دو منزلہ ہوٹل تھا بلکہ اسے ہوٹل کہنا مناسب نہیں تھا، زمانہ قدیم کی کوئی وسیع سرائے معلوم ہوتی تھی جسے از سر نو تعمیر کر کے ہوٹل کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کے گرد

وسیع چار دیواری تھی۔ چوک میں جگہ جگہ اونٹ، خچر اور گدھے بندھے ہوئے تھے۔ درختوں کے نیچے جابجا دریوں، کمبلوں اور بوریوں پر ڈھیلے ڈھالے لباس والے عرب بیٹھے گپیں لڑا رہے تھے۔ بہرحال خاصی غیر مناسب جگہ تھی۔ ہر طرف متعفن کوڑا کرکٹ، اور غلاظت کے انبار تھے، مکھیوں کی یلغار تھی۔ ایک چبوترے پر ہیئر کٹنگ سیلون کم سرجیکل وارڈ قائم تھا۔ یعنی ٹاٹ کی دو بوریوں میں سے ایک پر ایک حجام ایک ادھیڑ عمر کے دیہاتی کا سر گھٹنے پر رکھے دس انچ لمبے استرے سے اسے آلو کی طرف چھیل رہا تھا۔ چاروں طرف سفید اور سیاہ منڈے ہوئے بالوں کے گچھے بکھرے پڑے تھے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک کمبل، تولیوں کا خام سامان اِدھر اُدھر لڑھک لڑھک کر ضائع ہو رہا تھا۔ دوسرے بورے پر ایک لحیم شحیم چالیس سالہ حجام کم جلاد نما جراح ایک چودہ پندرہ سال کے لڑکے کے بائیں ہاتھ کو اپنی دونوں رانوں کے درمیان دبائے کلائی کے پھوڑے میں بھیڑوں کی اون کترنے والی قینچی سے اس کی کھال کو گتے کی طرح گول دائرے میں کتر رہا تھا۔ زخم سے پیپ اور خون کا فوارہ ابل رہا تھا اور لڑکے کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ دہاڑ رہا تھا لیکن تڑپ نہیں سکتا تھا کیونکہ پیچھے سے ایک دوسرے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اِدھر اُدھر خون پر مکھیوں کے جھنڈ بھنبھنا رہے تھے۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے رحم طلب نگاہوں سے ڈرائیور کو دیکھ کر کہا۔ ''میرے دوست! ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی ہے کہ تم سلطنت رومہ کے اس ایرینہ میں ہمیں لے آئے ہو؟''

ڈرائیور کچھ نہیں سمجھا، مسکرا کر بولا۔ ''یہاں کا ماحول دیہاتی ہے۔ لیکن اندر دارالاقامہ صاف ستھرا ہے''۔ اور پھر اس نے رازداری سے کہا۔ ''اور محفوظ بھی''۔

ٹیکسی کے اردگرد بچے جمع ہوتے دیکھ کر میں خاموشی سے ایمنہ کو ساتھ لے کر نیچے اترا۔ ڈرائیور نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ آگے آگے بڑھتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا۔ پھر وہ کھڑکی کے زینے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ہمیں اوپر جاتے دیکھ کر ایک شخص ہمارے ساتھ چل پڑا۔ اس نے پہلی منزل پر پہنچ کر اپنی دانست میں بہترین کمرہ کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہاں ایک بڑی سی مسہری، ایک قالین، ایک میز، چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کمرہ کافی بڑا تھا۔ ہوٹل والے نے کھڑکیاں کھولیں اور کھانے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"یار! ایک بات بتاؤ۔ جب ہمارے درمیان ضرورت سے زیادہ گہرے تعلقات ق
ہو چکے ہیں تو کم از کم ہمیں تمہارا نام تو معلوم ہونا چاہئے۔"

"میرا نام حارث ہے جناب۔"

"تم بہت اچھے انسان ہو حارث! واقعی جس طرح تم نے اس سفر میں ہمارا ساتھ
ہے، ہمیں تمہارا احسان مند ہونا چاہئے۔ بہت بہت شکریہ۔ ویسے میرا نام برک ہے۔"

"ویسے صاحب! آپ یقین کریں، میں خود بھی اپنا نام آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ مگر م
نے سوچا کہ جب آپ نہیں پوچھ رہے تو میں زبردستی کیوں بتاؤں۔"

"تم دیکھ رہے ہو دوست! ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں تو انسان ا
اپنا نام تک بھول جاتا ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ یہاں آرام کریں۔ میں اسی لئے آپ کو یہا
لایا ہوں۔ ویسے ایک بات بتاؤں، یہاں آپ جیسی شخصیت کے قیام کے بارے میں کو
سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لحاظ سے یہ جگہ محفوظ بھی ہے۔"

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو اب کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد دیکھیں گے
آگے کیا کرنا ہے۔"

کھانے سے فراغت ہوئی۔ ڈرائیور نے بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ پھر م
نے اسے چند نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "حارث! گاڑی میں پٹرول ضرور ہونا چاہئے
نامعلوم کس وقت ضرورت پیش آ جائے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" اس نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ "پٹرول یہاں تو نہ
مل سکتا۔ شہر جانا پڑے گا۔ اور یہ میں نہیں چاہتا۔"

"اوہو، ہاں واقعی۔ اچھا ایک کام کرو، کسی گدھے والے کو انعام دینے کا وعدہ کر
شہر بھیجو اور پرچہ لکھ کر قریبی پٹرول پمپ سے چار چار گیلن کے دو جیری کین منگوا ا
صرف اتنا سمجھا دو کہ اگر اس سے پوچھا جائے تو اس کے سوا کچھ نہ کہے کہ ایک صاح
کی کار کا پٹرول ختم ہو گیا ہے اور وہ جنگل میں رکے ہوئے ہیں۔"

"ترکیب تو اچھی ہے جناب۔ لیکن اگر وہ لوگ تلاش میں ہوئے اور اس علاقے م
پہنچ گئے تو گدھے پر جیری کین دیکھ کر اس کا پیچھا کئے بغیر نہیں رہیں گے۔"

"مگر اس کے سوا اور کوئی طریقہ ہے بھی تو نہیں۔ اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔"

"ایک طریقہ ہے صاحب۔" اس نے کہا۔

"کیا؟"

"اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو میں خود گاڑی لے کر جاتا ہوں۔ اگر ایک گھنٹے میں
واپس نہ لوٹ آؤں تو آپ سمجھ لیں میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میں انہیں چکر میں ڈال کر
آنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا صاحب تو......"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہاری ترکیب سے اتفاق کرتا ہوں۔ لو، یہ رقم
لو اور اسے اپنے پاس رکھ لو۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو پھر تم واپس چلے جانا۔"

"صاحب! آپ بے فکر رہیں، کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔" اس نے کہا اور پھر وہ باہر نکل
گیا۔ امینہ نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور واپس آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ویسے میرا خیال ہے اتنے پیسے اسے نہیں دینے چاہئیں تھے۔"

"کیوں؟"

"دنیا بہت بری ہے برک۔ ذاتی مفاد ختم ہونے کے بعد وعدے اور معاہدے کوئی
معنی نہیں رکھتے۔"

میں ہنسنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں اس وقت تک کسی کو بے ایمان نہیں کہنا
چاہئے جب تک وہ بے ایمان ثابت نہ ہو جائے۔"

"عملی زندگی میں بے اصولی ایک فطری چیز ہوتی ہے۔ یہ باتیں کتابوں میں تو اچھی
لگتی ہیں لیکن باہر کی دنیا میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتیں۔ اگر وہ دھوکا دے گیا تو یہ
بتاؤ کیا کرو گے؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بس دیکھیں گے۔ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ
ہو جائے گا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں اٹھ کر باہر آیا اور زینے کی کھڑکی سے ہوٹل کے ملازم کو آواز
دی۔ تھوڑی دیر میں ملازم اندر آ گیا اور بولا۔ "جی سر! حکم دیجئے۔"

"دیکھو ہم یہاں خاموشی سے وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ تم یہ رقم رکھ لو، جس وقت بھی
تم سے کھانا طلب کریں تم ہمیں کھانا پہنچا دیں۔"

ہوٹل کے ملازم نے گردن ہلائی اور باہر نکل گیا۔ اس کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ
گئے تھے۔ نجانے کس وقت نیند نے آ دبوچا۔ جاگے تو شام ہو چکی تھی۔ ڈرائیور کا کہیں کوئی

وجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ طبیعت پر ایک گھبراہٹ سی سوار ہو گئی۔ میں نے اینہ سے کہا۔

"آؤ اینہ! باہر چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے باہر ڈرائیور ہمارا منتظر ہو۔"

اینہ نے اپنے آپ کو بنایا سنوارا اور اس کے بعد میرے ساتھ باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ہم باہر آ گئے۔ چوک میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا، کہیں کہیں کوٹھڑیوں میں لیمپ اور شمعیں جل رہی تھیں جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں اکا دُکا گدھے بندھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ چوک سے نکل کر ہم محراب دار دروازے سے باہر نکلے اور سڑک پر آ گئے۔ یہاں بھی ہر طرف اندھیرا تھا۔ کھمبوں پر چوکور شیشوں میں جلنے والے تیل کے لیمپ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ دس قدم کے فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی رات کے آٹھ نہیں بجے تھے لیکن لوگوں کی آمد و رفت برائے نام تھی۔

اینہ نے تاریکی اور ویرانی سے گھبرا کر میرا بازو تھام لیا۔ میں نے سامنے کی طرف نگاہیں دوڑائیں، سڑک کے دونوں طرف ایک منزلہ مکانوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا جن میں کسی کسی دُکان میں روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ یہ بازار ہو سکتا ہے۔ اس طرف جانا مناسب نہیں تھا چنانچہ ہم دائیں طرف والی سڑک پر نکل آئے۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک مقبرہ نظر آیا۔ مقبرے کی شکستہ دیوار پر چراغ جل رہا تھا۔ آس پاس کھجوروں کے جھنڈ اور اونچی اونچی پہاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور عجیب وحشت کا سماں تھا۔ میں یہاں پہنچ کر رکا اور دیوار کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا تو اینہ بولی۔

"اُف میرے خدا! کیسی ہولناک جگہ ہے۔"

"ہاں واقعی۔"

"کیا تم مجھے خوفزدہ کر کے مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"نہیں جانِ من۔ یہ تمہیں زندہ رکھنے کی کوشش ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں آئے ہو؟ اس سنسان قبرستان میں کیا کام ہے؟"

"بس میں تھوڑا سا الجھا ہوا ہوں۔ تمہاری موجودگی مجھے سہارا دیتی ہے۔ مجھے حارث کی تلاش ہے۔ ابھی تک اس کا نہ آنا میرے لئے پریشان کن ہے۔ اور یہ بھی اندازہ لگا چاہتا ہوں میں کہ اگر وہ آئے تو ہمیں یہ پتہ چل جائے کہ تنہا ہی آیا ہے یا پھر کوئی اس

پیچھا کر رہا ہے۔"

اینہ خاموش ہو گئی۔ میں نے ذرا سرک کر چراغ کو آڑ میں لے لیا اور راستے پر اندھیرا ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ بائیں طرف سے دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ وہ قریب آئے تو میں نے مقبرے کی دیوار کی طرف پلٹ کر دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ اینہ نے بھی فوراً ہی میری تقلید کی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور گھوم کر دارالاقامہ کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ کچھ دور جا کر وہ دائیں جانب مڑے اور آبادی میں داخل ہو گئے۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ ہم اس سنان ماحول میں کھڑے کھڑے اکتا گئے تھے۔ اینہ نے پھر شکایتی انداز میں کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ؟ حارث کو نجانے کیا ہوا۔ اس کا کہیں بھی پتہ نہیں ہے۔"

"وہ یقیناً مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو گا ورنہ اب تک یہاں پہنچ چکا ہوتا۔" میں نے فکر مندی سے کہا۔

"پتہ نہیں کس خیال میں ہو تم۔ وہ اسکندریہ پہنچ گیا ہو گا اور ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں بلکہ جھوٹی فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ اور جب میرا دم نکل جائے تو سچی فاتحہ پڑھتے ہوئے یہاں سے نکل جانا۔" اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی اور اس نے برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ابھی چند ہی قدم طے کئے تھے کہ اچانک آبادی کی طرف سے ایک کار دارالاقامہ کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ ہم نے اسے فوراً پہچان لیا، یہ حارث کی کار ہی تھی۔ اینہ پیچھے ہٹ کر میرے قریب آ گئی۔ میں نے کہا۔

"حارث ہی تھا نا؟"

"سو فیصدی۔"

"اکیلا تھا؟"

"اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ پھر کہنے لگی۔ "لیکن ہو سکتا ہے کوئی اور بھی ہو۔ کیا آگے چل کر دیکھوں؟"

"نہیں، ممکن ہے اس کے پیچھے کوئی گاڑی ہو۔"

بمشکل تمام چند منٹ گزرے ہوں گے کہ دارالاقامہ کے دروازے سے ٹیکسی باہر نکلتی دکھائی دی۔ میں نے حارث کو دیکھ کر آگے بڑھ کر سیٹی بجائی اور گاڑی جو بائیں طرف ٹرن لے رہی تھی، ایک دم رک گئی۔ پھر حارث دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میں نے اینہ کو آنے کا اشارہ کیا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ حارث سلام کر کے بولا۔

''صاحب! پٹرول مل گیا ہے۔ آپ ہوٹل چلیں، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... تم چلو، ہم آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور حارث ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ وہ ٹیکسی میں آگے بڑھ گیا تو ہم دونوں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ پھر ہم ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ حارث گاڑی کھڑی کر کے آ گیا تھا۔

''ہاں حارث! جلدی سے بتاؤ، اتنی دیر کیسے ہو گئی؟''

''صاحب، پٹرول پمپ پر ایک پرانا دوست مل گیا۔ وہ مجھے کھینچ کر ہوٹل لے گیا اور اس کے بعد کمبخت نے اس طرح گھیرا کہ چھوڑا ہی نہیں۔ میں بار بار وہاں سے چلنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے پتہ نہیں کہاں کہاں کے قصے سناتا رہا تھا۔ پھر جب میں یہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ آپ تھوڑی دیر پہلے نکلے ہیں۔''

''اتنا وقت تم نے اس کے ساتھ گزار دیا؟''

''آپ یقین کریں صاحب! کچھ لوگ ایسے ہی بے تکے ہوتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''مجھے صرف یہ بات بتاؤ کہ کوئی مشکوک بات تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ دوست کے جانے کے بعد میں دو تین چکر ادھر اُدھر کے لگا چکا ہوں، میرا مطلب ہے سواریاں لے کر۔ لیکن اصل مقصد میرا ان سواریوں کے ذریعے رقم کمانا نہیں تھا بلکہ میں یہ جائزہ لینا چاہتا تھا کہ کوئی میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔''

اینہ بے اختیار مسکرا دی۔ لیکن حارث اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اینہ کی مسکراہٹ کا مقصد کچھ اور تھا لیکن حارث اگر اس مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کا مطلب سمجھ جاتا تو یقیناً برا مان جاتا۔ بہرحال وہ بولا۔

''آپ بے فکر رہیں صاحب۔ کچھ ہوا نہیں ہے۔''

''میں بے فکر ہوں۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ آرام کریں گے۔ کھانا وغیرہ کھا لو۔ میں ہوٹل کے ملازم کو رقم دے چکا ہوں۔ کھانے سے فراغت حاصل کر کے تم برابر والے

کمرے میں سو جاؤ۔ صبح کو چائے پی کر چلیں گے۔ اس کے بعد تم اسکندریہ لوٹ جانا۔''

''کمرہ لینے کی ضرورت نہیں ہے صاحب! میں گاڑی میں سو جاؤں گا۔ اصل میں گاڑی اکیلی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ آپ بے فکر رہیں، میں کھانا بھی کھا لوں گا۔ اچھا شب بخیر۔'' وہ چل دیا اور ہم اسے باہر جاتے دیکھتے رہے۔

دس بجے کھانے سے فراغت ہوئی تو اینہ نے دروازہ بند کر کے مسہری کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ ''کل ساری رات جاگتے ہوئے گزری ہے۔ چلو گہری نیند سو جائیں۔''

''نہیں اینہ، تم آرام کرو۔ مجھے ابھی جاگنا ہے۔ اس کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔''

''کس کے؟'' اینہ نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

''جسے کل تم نے دیکھا تھا۔ بھول گئیں اس کو؟ تم نے کہا تھا کہ مصر میں تو کوئی فیشن شو بھی نہیں ہو رہا۔''

''اوہو...... اچھا وہ...... وہ ننگا جادوگر؟''

''نہیں اینہ، ایسا مت کہو۔''

''ایک بات بتاؤ...... میں تمہارے انداز میں ذرا سی الجھن، ذرا سی تبدیلی محسوس کر رہی ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو۔ ویسے اس وقت بھی میں نے یہ اندازہ لگایا تھا جب تم ڈرائیور سے باتیں کر رہے تھے۔

''کیسا اندازہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ کہ جیسے تمہیں اس کی باتوں پر یقین نہ آیا ہو۔''

میں نے گہری نگاہوں سے اینہ کو دیکھا اور کہا۔ ''ہاں اینہ، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کا جواب مجھے مطمئن نہیں کر سکا تھا۔''

''تو پھر اب کیا کرو گے؟''

''انتظار۔''

''کس کا؟''

''وردان سادھانی کا۔''

''وردان سادھانی؟''

''وہی جسے تم نے ننگا جادوگر کہہ کر پکارا ہے۔''

''اس کا نام وردان سادھانی ہے؟''

''ہاں۔''

''ہے کیا چیز؟''

''بدھسٹ ہے۔''

''اوہو...... میں نے بدھوں کے بارے میں پڑھا ہے۔ واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ دلائی لامہ وغیرہ۔''

''ہاں۔''

''مگر اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے تعلق تو ہے اس سے میرا۔ یہ سارا چکر اسی سلسلے میں تو چل رہا ہے۔ وہ تختی جس کی مختلف شکلیں میرے سامنے آئی ہیں، اب اسی کے پاس ہے۔''

''اس کے آنے سے تمہیں کوئی فائدہ ہو گا؟''

''ہاں۔''

''ایک بات میرے دل میں آ رہی ہے بار بار۔''

''ہاں بولو؟''

''کیوں نہ یہاں سے نکل چلیں۔''

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میری چھٹی حس مجھے کچھ اور احساس دلا رہی ہے۔''

''کیا؟''

''مجھے لگ رہا ہے جیسے ہم گھر چکے ہیں۔ حارث حالانکہ اس نے ہمارا بھرپور ساتھ ... ہے، لیکن نجانے کیوں اب مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

اینہ میری صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''میں باہر نکل کر دیکھتی ہوں۔ ہمارا یہاں سے نکل چلنا ہی بہتر ہو گا۔ اگر کوئی شبہ نہ ہوا مجھے تو پھر میں واپس آ جاؤں گی۔ تم ایسا ... راہداری کی کھڑکی سے دیکھتے رہنا۔''

میں نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر اینہ کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔ ...نے برقع مفلر کی طرح گلے میں ڈالا اور مسہری کی چادر اوڑھ کر آنکھوں کے سوا تمام ... ڈھک کر باہر نکل آئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں آیا اور کھڑکی سے جھانکنے

وہ نیچے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔ دروازے کے قریب پہنچتے پہنچتے میرے اور اس کے درمیان ایک سائبان کا کونا آ گیا اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ابھی وہ بمشکل دروازے تک ہی پہنچی ہو گی کہ دفعتہً اس کی چیخ فضا میں گونجی اور حلق میں گھٹ کر رہ گئی...... بالکل اس طرح جیسے حلق پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔

میں نے جیب سے پستول نکالا اور پلٹ کر تیزی سے زینے کی جانب دوڑ پڑا۔ کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں زینے سے اترا۔ آخری چار سیڑھیوں سے زمین پر چھلانگ لگاتے ہوئے میری ناک میں چمپا کی تیز خوشبو آئی اور ساتھ ہی میری آنکھیں خودبخود بند ہو گئیں...... مجھے یوں لگا جیسے زمین پھٹ گئی ہو اور میں بے وزن ہوا کے جھونکے کی طرح آہستہ آہستہ خلا کی پنہائیوں میں اترتا جا رہا ہوں۔ ایک لمحے کے اندر میرے سارے وجود میں ایک شدید سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے ذہن سے سب کچھ نکل گیا۔ صرف اپنا چھلانگ لگانا یاد تھا۔ لیکن کیوں اور کس لئے؟ یہ سب کچھ ذہن سے فراموش ہو چکا تھا۔ اپنا جسم اتنا ہلکا پھلکا ہو جانے پر غور کرنے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ نجانے کیوں میں انہیں کھولنے سے کچھ خوفزدہ سا ہو رہا تھا۔ اپنی اس وقت کی کیفیت کو میں صحیح انداز میں بیان نہیں کر پا رہا۔

بہرحال آخر کار زمین پر پاؤں ٹکے اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ میں ایک سرسبز و شاداب جنگل میں ایک بلند پہاڑ کے سامنے غار کے سامنے کھڑا تھا۔ دفعتہً کسی نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور میں آگے کی طرف قدم اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو وہ وردان سادھانی تھا۔ نگاہیں اس پر پڑی تھیں۔ اسی نے میرے گھٹنے چھوئے تھے۔

''اوم نموستو......'' اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میرا سارا وجود حیرتوں کا شکار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''یہ کیا ہوا وردان سادھانی؟''

''سنگل دیپ کی پوتر دھومی دھرم راج کا سواگت کرتی ہے۔'' اس نے پیچھے کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ اسی وقت قرب و جوار سے آوازیں ابھرنے لگیں۔

''شبھ آگمن...... شبھ آگمن...... شبھ آگمن۔''

وردان سادھانی آگے بڑھ کر غار کی طرف چل پڑا۔ میرے پاؤں اس غار کی طرف اٹھنے لگے۔ غار کے اندر پہنچ کر مجھے غار کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ کوہستانِ گاشربرہم میں یہ غار کسی درے کی طرح سے نظر آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ اوپر سے یہ درہ کھلا ہوا نہیں تھا لیکن اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا اس نے مجھے شدتِ حیرت سے دیوانہ کر دیا۔ کچھ ہی قدم کے فاصلے پر سینکڑوں بھکشو قطاریں بنائے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمپا کے ہار تھے۔ غار میں حد نظر تک ایک عجیب قسم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسات کی دوپہر میں اُفق تا اُفق کالی گھٹا چھائی ہوئی ہو اور سورج نگاہوں سے دور ہو۔ خواب ناک سیاہی شب پر غالب اور ہلکی ہلکی مدھم روشنی جسے روشنی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، روشنی کے درمیان کی چیز جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا الفاظ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ یہ صرف احساس تھا۔ اس روشن تاریکی میں یا تاریک روشنی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میرے قدم اب جیسے میرے بس میں نہیں تھے۔ میں بالکل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور مجھ سے آگے وردان سادھانی تھا۔ اس غار میں داخل ہوتے ہی شبھ آگمن...... دھم راج...... شبھ آگمن کا شور بلند ہوتے جا رہا تھا۔

دفعتہً ہی مجھے ایک تحریک ہوئی اور میں نے نتھا استو کہہ کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنے ہاتھوں میں پستول کا احساس بھی ہوا۔ اس بے ضرر، تارک الدنیا ماحول میں پرستاروں کی موجودگی میں عالم خونریزی پر مجھے ایک شرمندگی کا سا شدید احساس ہوا اور میں نے تیزی سے پستول پتلون کی جیب میں سرکا لیا اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر استقبال کرنے والوں کا جواب دینے لگا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ ہوٹل کی سیڑھیوں سے چھلانگ لگانے کے بعد میرے دل و دماغ پر تعطل کی کیفیت کیوں طاری ہوئی تھی۔ خیالات کا سلسلہ وہاں سے شروع ہو کر امینہ کی چیخ تک پہنچا تھا کہ ایک بوڑھے بھکشو نے آگے بڑھ کر پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور پھر بڑے احترام سے میری کمر کے پیچھے ہاتھ رکھ کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں طرف کھڑے ہوئے بھکشوؤں نے اوم نموستو...... اوم نموستو...... کے جاپ کے ساتھ میرے گلے میں ہار ڈالنے شروع کر دیئے۔ اور جب ہم غار کے اختتام پر پہنچے تو میرا گلا ہاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وردان سادھانی بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ دیوار کے ساتھ پتھر کے تراشے ہوئے چبوترے پر ایک کشادہ استھان پر ہیرے کی تراشی ہوئی ایک مورتی رکھی تھی جس سے روشنی کی شعاعیں

نکل رہی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں سونے کے برتن میں سلگتے ہوئے مصالحے ہلکی ہلکی خوشبو اور دھواں دے رہے تھے۔ پرشوتما نے مجھے یہاں ایک مجسمے کے پہلو میں بٹھا کر ایک خوشبودار شربت کا گلاس دیا اور جھک کر بولا۔

''اسے پی لیں مہاراج!''

میں تو اس وقت خود اپنے وجود سے دور تھا۔ چنانچہ میں نے اسے پی کر ایک عجیب سا سرور محسوس کیا۔ تبھی وردان سادھانی نے اپنے بھکشوؤں کو طلب کر کے ان دشواریوں کا ذکر کیا جو مجھے تختی حاصل کرنے میں پیش آئی تھیں۔ اور یہ کہ اس پراپتی کے لئے میں نے جو مہا بلیدان دیا وہ ایک یگ کی عبادت کے برابر تھا۔ وردان سادھانی نے کہا۔

''بھگوان کی یہ قیمتی مورتی اسی خزانے سے برآمد ہوئی تھی جو مہتر بدھ کی ملکیت تھا۔ اور ایک بار پھر مہتر بدھ کے ہاتھوں ہی یہ تختی دوبارہ نمودار ہوئی ہے۔''

تمام بھکشوؤں نے بیک آواز بھگوان کو کال کوٹھڑی سے نکالنے پر مبارکباد دی اور اس کے بعد کچھ منتر پڑھے جانے لگے۔ میں تو خاموش کھڑا ہوا تھا لیکن وردان سادھانی مسلسل یہ منتر پڑھ رہا تھا۔ دیر تک یہ آوازیں فضاؤں میں بلند ہوتی رہیں اور اس کے بعد وردان سادھانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''دھم راج مہاراج! آپ کا بلیدان سوئیکار ہوا۔ آج سے آپ مہان شکتیوں کے مالک ہیں۔ ہر یدھ میں آپ کا وجے ہوگا۔ کوئی شاستر آپ کے جسم کو سپرش نہ کر پائے گا۔ آپ کی ہر شبھ کامنا پوری ہوگی۔ اوم نموستو بدھی۔'' تین بار یہ الفاظ دہرانے کے بعد اس نے پلٹ کر کہا۔

''کریا کرم سماپتھ ہوا۔''

آخری جملہ سنتے ہی سب نے جھک کر پرنام کیا اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب باہر نکلنے لگے۔ اب اس وقت ماشرہ اور وردان سادھانی میرے پاس بیٹھے۔ ماشرہ وہی بوڑھا آدمی تھا جس نے میری کمر پر ہاتھ رکھا تھا، بعد میں وردان سادھانی نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ مہتر بدھ کا دست راست اور غلامِ خاص تھا۔ وہ دونوں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے وردان سادھانی سے کہا۔

''پریاترا! میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان شکتیوں کا بھی جو آپ نے مجھے دی ہیں۔ مثلاً ہر معرکے میں فتح، ہر جگہ میری مدد، تمام ہتھیاروں سے محفوظ اور

میری ہر جائز خواہش کی تکمیل۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حق و صداقت کی شرط بھی ہے۔ تو اب آپ یہ بتائیے کہ مجھ جیسے دنیا دار کے لئے ذاتی مفاد سے ہٹ کر سوچنا ناممکن نہیں ہے کیا؟"

ماشرہ نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "خاقان جمشیدی! ہم نے تم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی ہے۔ لیکن سچائی اگر اپنی جگہ ایک بڑی طاقت ہے تو سچائی کے راستوں پر چلنے والوں کے لئے ہی ہے نا۔ اس راستے سے ہٹ کر چلنے والوں کو اس سے کس طرح فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ سچائی کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ ہر شخص اپنے آپ کو سچا ہی سمجھتا ہے۔"

میرے یہ الفاظ ان لوگوں کے لئے ذریعہ فکر تھے۔ کچھ لمحے خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد وردان سادھانی نے کہا۔ "خاقان جمشیدی! مرتبے کے لحاظ سے تم مجھ سے بہت بڑے ہو اور میں تمہیں سمجھانے یا حکم دینے کا مجاز نہیں ہوں۔ لیکن اتنا میں ضرور کہوں گا تم سے کہ حق اور ناحق کے فیصلے انسان نہیں کر سکتا۔ یہ صرف آسمانوں میں ہوتے ہیں اور ہمیشہ آسمانوں ہی میں ہوں گے۔ ماشرہ نے جو کچھ تم سے کہا اس کا مطلب ہے کہ جو طاقتیں تمہیں دی گئی ہیں وہ صرف اسی وقت تمہارا ساتھ دیں گی جب تم حق پر ہو اور سچائی کے لئے لڑ رہے ہو، تمہارے سامنے کوئی عظیم مقصد ہو۔ غلط اقدام یا ذاتی اغراض و مقاصد نہ ہوں۔ لیکن نہیں، یہ نہیں کہنا چاہئے۔ تم بہت بڑے انسان ہوں دھم راج۔ تم سے کسی غلط اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔ میں نے کہا۔ "میں بہت بڑا انسان ہوں۔ لیکن ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں ماشرہ اور وردان سادھانی، عظیم انسان بننے کے لئے تو بہت سے بندھن توڑنے پڑتے ہیں اور میں ابھی انہیں نہیں توڑ پایا اور شاید کبھی نہ توڑ پاؤں کیونکہ ان بندھنوں کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ یہ ایک دوسرے میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ انہیں سلجھانا ممکن نہیں ہے اور توڑتے توڑتے انسان خود ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

کچھ لمحات کے لئے ادھر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ لوگ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وردان سادھانی نے گردن اٹھائی اور بولا۔ "تیاگ...... دھم راج!

بندھنوں کو توڑ ڈالتا ہے۔"
تیاگ...... تیاگ ایک ہی جھٹکے میں تمام

"تیاگ؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تیاگ زندگی سے شکست کھا جانے کا نام ہے وردان سادھانی! تیاگ ایک فرار ہے۔ تیاگ ایک صورت ہے، تیاگ سے کوئی بندھن نہیں ٹوٹتا، انسان ٹوٹ جاتا ہے اور خود ٹوٹ جانے کو بندھن ٹوٹ جانا سمجھتا ہے حالانکہ بندھن اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں اور ان لوگوں کو توڑنے پڑتے ہیں جن کو وہ بندھنوں میں جکڑا ہوا چھوڑ آیا۔ سمجھ گئے یا اور کھل کر کہوں؟"

"فرمائیے مہاراج، آپ فرمائیے......" وردان سادھانی نے کہا۔

"سنو...... میں خاقان جمشیدی ہوں۔ مجھے ایک بات کا جواب دو، آخر تم نے ایک غیر قوم اور ایک غیر مذہب کو وہ درجہ کیوں دیا ہے جو تمہیں اپنے ہی مذہب کے کسی شخص کو دینا چاہئے تھا؟"

"دین دھرم ساری چیزیں بعد میں آتی ہیں مہاراج! ایک بات مجھے بتائیے، جب آپ کسی گھر میں پیدا ہوتے ہیں تو آپ کا دھرم کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ بات آپ کو معلوم ہوتی ہے کہ آپ کون سے دھرم میں پیدا ہوئے ہیں؟ مہاراج، جو دھرم آپ کے ماتا پتا کا ہوتا ہے وہیں سے آپ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس جہان میں جتنی بڑی آبادی ہے اس میں سے دس فیصد بھی ایسے نہیں ہوں گے جنہوں نے سوچ سمجھ کر کوئی دھرم اپنایا ہو۔ بس جس دھرم میں وہ پلتے ہیں وہی ان کا دھرم بن جاتا ہے۔ تو انسان پہلے، دھرم بعد میں۔ اور ایک انسان بدھا کے چرنوں میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور بدھا کا سایہ اس کے سر پر ہوتا ہے تو وہی ہمارے لئے بدھی ستو ہے۔ وہی نموستو وردان ہے۔ مہاراج، ہم نے آپ کو ایسا ہی پایا اور آپ کو کیا پتہ کہ کون سی روشنی آپ پر چمک رہی تھی۔ یہ تو آپ کو اس سے پتہ لگے گا جب آپ مہتر بدھ بن کر دھرم کی روشنی پھیلائیں گے۔ نتھا ستو کہہ کر سنسار واسیوں کے دکھ کا وردان بنیں گے۔ مہاراج، آپ کو یہ مرتبہ ملا ہے۔"

"مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی، میں نیک راستوں کا راہی تھا۔ بے شک میرے والد ایک عیاش طبع آدمی تھے لیکن میں نے جس ماحول میں پرورش پائی اس میں برائیوں کو میں نے اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ اور پھر وہ واقعہ ہو گیا جو میرے بچپن میں ہی پیش آیا تھا۔ مجھے یوں لگتا ہے وردان سادھانی، کہ برائی کے راستے میری جانب لپکتے رہے اور تم مجھے نیکیوں کا درس دئے رہے۔ مجھے برائی کی جانب جانے ہی کیوں دیا

گیا جبکہ ہر جگہ میری نگرانی کی جاتی رہی تھی؟"

"یہ ضروری تھا مہاراج، یہ ضروری تھا۔ نیکیاں کرنے کے لئے برائیوں کو جاننا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔"

"مگر انسان اندر سے تو مر جاتا ہے۔"

"اندر کا جیون ہی تو سب سے بڑا ہوتا ہے اور اس کے اندر نیکی اور برائی کی تمیز ہو جاتی ہے۔"

"تم کہہ رہے ہو جس لڑکی کو میں تنہا اور اکیلا چھوڑ آیا ہوں اس کی تڑپ میرے دل میں ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ سری لنکا کے گاشر برہم اور اس مندر سے وہاں تک کا سفر میرے لئے کیسے ممکن ہو گا۔"

وردان سادھانی ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "یہ صرف آپ کا خیال ہے دھرم راج! آپ نہ کہیں گئے نہ آئے، یہ سب موہ مایا کا دھوکا ہے۔ آنکھیں بند کر کے دیکھئے، آپ جن حالات میں گرفتار تھے، انہی میں اب بھی ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آپ وہاں سے دور گئے ہیں۔ یہ صرف من کی مایا ہے۔ من کی مایا۔ آپ ذرا ایک منٹ کے لئے آنکھیں بند کیجئے۔ کیجئے آنکھیں بند۔ آنکھیں بند کیجئے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میری پلکوں کے پپوٹے جڑے جا رہے ہوں...... صرف ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

✲✫✲

وہ ایک لمحہ ہی بہت کچھ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پھر سے بے وزن ہو گیا ہوں...... میرا وجود ہوا میں معلق ہوتا محسوس ہوا۔ دوسرے لمحے میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسی ہوٹل کے زینے کے سامنے کھڑا ہوا تھا، وہی گرد و پیش تھے، وہی نیم تاریک ماحول۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور زمین پر پاؤں ٹکتے ہی ایک لمحے کے اندر میرے حواس جاگ اُٹھے اور میں چھلانگ لگا کر گیٹ کی طرف دوڑا۔

اسی وقت دائیں سمت کی کوٹھڑی سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور گولیاں میرے کندھے کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ میں پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ راستے پر ایک کار دھول اڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔ موڑ پر پہنچتے ہی مجھے اینہ کی چیخ سنائی دی تو میں تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا۔ لیکن جب موڑ پر پہنچا تو کار کافی آگے نکل چکی تھی۔ میں وقت ضائع کئے بغیر پلٹا اور ہوٹل کی طرف دوڑا۔ دروازے پر پہنچ کر مڑتے مقبرے کی طرف سے صرف ایک فائر ہوا لیکن میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ فائر خالی گیا اور مجھے اس طرف دھیان دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ میں جلد از جلد ٹیکسی تک پہنچنا چاہتا تھا جو بائیں جانب دالان میں کھڑی ہوئی تھی۔ باہر نکل کر جس کوٹھڑی سے مجھے دو فائر کئے گئے تھے، اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا میں جھپٹ کر ٹیکسی کے پاس پہنچا۔ پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور بندھا ہوا پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے رومال باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے اس کا منہ اور ہاتھ پاؤں کھول کر سیٹ پر بٹھایا۔ اس کے حواس بحال ہونے میں خاصا وقت لگا تھا۔ دوسرے لمحے وہ چیخ کر بولا۔

"صاحب! آپ پر حملہ تو نہیں ہوا؟"

میں نے تیزی سے اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم اسٹیئرنگ پر آؤ اور گاڑی نکالو۔ وہ خانم کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

ڈرائیور ایک دم مستعد ہو گیا اور چھلانگ لگا کر باہر نکلا، پھر اگلی سیٹ پر پہنچ گیا۔ گاڑی

اسٹارٹ کر کے باہر نکالتے ہوئے بولا۔

"یہ تو بڑا غضب ہو گیا صاحب! میرے ہاتھ پاؤں صحیح کام نہیں کر رہے۔"

"اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہاری اعصابی کیفیت بہتر ہو جائے گی۔" میں گھوم کر اس کے برابر آ بیٹھا۔ گاڑی بیک ہو کر گیٹ سے نکلنے لگی۔ میں نے کوٹھڑیوں اور دالانوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیسے مردہ لوگ ہیں یہ۔ اتنی دیر سے ہنگامہ برپا ہے اور کسی میں جھانک کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ واقعی انسان جتنا ذلیل اور مفلوک الحال ہوتا اتنا ہی زیادہ زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔"

میرا غصہ عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی نے بائیں جانب ٹرن لیا، ہوٹل کی دیوار کا فاصلہ طے کیا، پھر بائیں جانب مڑی اور سڑک پر آتے ہی اس کی اسپیڈ تیز ہونے لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور ڈرائیور کی جیب میں سرکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا پیشگی انعام ہے۔"

اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور جیب سے نوٹ نکالنے لگا۔ "نہیں صاحب! اب بات نوٹوں کی نہیں رہی ہے۔"

"بس بس ٹھیک ہے۔ تمہارے اعصاب کام کرنے لگے ہیں نا، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے صاحب، لیکن یہ وقت انعام کا نہیں ہے۔ ہمیں پہلے ان سے نمٹنا ہے۔ اور اب تو انہوں نے مجھے بھی اس لڑائی میں گھسیٹ لیا ہے۔"

"صرف گاڑی چلاتے رہو۔ میں اپنا اور تمہارا قرض ان سے وصول کر کے دکھا دوں گا۔"

ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ پہاڑی سلسلے کے ایک موڑ سے گزرتے ہی اس دوسری گاڑی کا پچھلا حصہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ شاباش...... وہ جا رہی ہے۔ اور اسپیڈ بڑھاؤ۔"

ڈرائیور نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ چار پانچ ہیں صاحب۔"

"تم فکر ہی مت کرو۔ پرواہ نہیں ہے۔ تم اوور ٹیک کر کے سامنے سے روکنے کی

کوشش کرو۔ میں انہیں فائر کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

ڈرائیور نے اسپیڈ کچھ اور بڑھائی۔ اگلی گاڑی سے ہمارا فاصلہ کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خطرناک راستے پر بہت تیز گاڑی دوڑانا بہت دل گردے کا کام تھا جبکہ ہمارا ڈرائیور یہ ظاہر کر چکا تھا کہ وہ ایک اچھا ڈرائیور ہے۔ چنانچہ رفتار اور بڑھی اور فاصلہ کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ میں نے ونڈ شیلڈ کو تھوڑا اوپر اٹھا کر گاڑی کے ٹائر کا نشانہ لیا۔ اسی وقت سامنے سے فائر ہوا اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ دو فائر تو اوپر سے گزر گئے، ایک بائیں مڈگارڈ پر لگا۔ بند گاڑی ہونے کی وجہ سے وہ دونوں کھڑکیوں ہیں سے فائرنگ کر رہے تھے اس لئے صحیح نشانہ لینا ممکن نہیں تھا، اگر کوئی گولی اتفاقیہ طور پر ہمیں لگ جائے تو اور بات تھی۔

ہمارا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا اور ادھر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے ونڈ شیلڈ تھوڑا سا اور اٹھایا اور ٹائر پر یکے بعد دیگرے کئی فائر کئے۔ چوتھے فائر کے ساتھ ہی ٹائر کے برسٹ ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔ ڈرائیور نے ٹائر کا دھماکا سنتے ہی ایکسیلیٹر پر سے پاؤں اٹھا لیا اور کلچ دبانا شروع کر دیا۔ ہماری گاڑی کی رفتار تیزی سے کم ہونے لگی۔ ٹائر پھٹتے ہی دوسری گاڑی ٹیڑھی ہو گئی اور جھٹکے کھا کر لڑکھڑانے لگی۔ اس مسئلے پر ڈرائیور ایکسپرٹ ہوتا تو فوراً گاڑی روکنے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ روکنے کی بجائے اسی رفتار پر سنبھالنے کی کوشش کئے جا رہا تھا اور اس کے ساتھی کھڑکیوں میں سے فائر کئے چلے جا رہے تھے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر اسی طرح جاری رہا۔ لڑکھڑاتی گاڑی سے فائر کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ گولیاں ضائع کئے جا رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار اس وقت دس میل سے بھی کم تھی۔ میں نے ڈرائیور کو رفتار اور کم کرنے کو کہا اور اسی وقت سامنے والی گاڑی جھٹکا کھا کر بائیں جانب جھک گئی اور اس طرف کی کھڑکی سے فائر کرنے والے کا جسم جھٹکے کے ساتھ آدھے سے زیادہ باہر نکل آیا۔ گاڑی دوبارہ سیدھی ہونے سے پہلے میں نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ گاڑی سے پھسل کر باہر گر پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے شور مچایا اور لڑکھڑاتی ہوئی گاڑی دس قدم پر جا کر رک گئی۔

ہمارے ڈرائیور نے گاڑی روکتے روکتے دونوں وہیل سڑک پر پڑے ہوئے آدمی پر سے گزار دیئے اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔ اگلی گاڑی کا دائیں جانب والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے نیچے کودتے ہوئے ڈرائیور پر فائر کر دیا۔ وہ تیزی سے گھٹنوں کے بل

بیٹھ گیا۔ میں نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ ٹانگیں باہر نکالیں اور گولی ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی میرے سر کے پاس سے گزر گئی۔ دوسرے لمحے میں نے فائر کرنے والے کو سڑک پر گرتے دیکھا۔ میں نے باہر نکل کر اپنی گاڑی کے انجن کا کور لے کر سامنے والی گاڑی سے نکلنے والے تیسرے آدمی پر فائر کیا۔ گولی اس کے دائیں بازو پر لگی اور اس کا ریوالور چھوٹ گیا اور وہ بائیں ہاتھ سے بازو کو تھام کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں انجن کے سامنے سے گھوم کر دائیں طرف آیا۔ ٹھوکر سے اس کا پستول دور پھینکا۔ اس طرف میرا ڈرائیور دوسرے آدمی کا پستول تھامے اس کے سینے پر سوار تھا۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا لیکن وہ دونوں بری طرح الجھے ہوئے تھے اور اتنی تیزی سے الٹ پلٹ ہو رہے تھے کہ گولی چلانے میں اپنے ڈرائیور کو نشانہ بنا دینے کا خطرہ محسوس ہوا۔ میں نے پستول نیچے کر کے پوری طاقت سے اس کے سر پر بوٹ کی ٹھوکر لگائی اور وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کا پستول میرے ڈرائیور کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''زندہ باد'' کہہ کر میں اپنے سامنے والی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کا ڈرائیور فرار ہو چکا تھا اور ایمنہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے ایمنہ کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ لاش کی طرح سیٹ سے لڑھک گئی۔ میں نے زخمی بازو والے آدمی کو بھاگنے کی کوشش کرتے دیکھ کر اس کی کمر کا نشانہ لیا۔ وہ دھماکے کے ساتھ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو پکارا اور پھر ایمنہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ایمنہ کی نبض ساکت ہو چکی تھی لیکن دل کی حرکت بہتر تھی۔ میرا ڈرائیور آواز سن کر دوڑتا ہوا آیا اور ہانپتا ہوا کہنے لگا۔

''نکل گیا صاحب...... ڈرائیور نکل گیا۔''

''کوئی بات نہیں، اسے بھی دیکھ لیں گے۔ اسے سنبھالو۔''

''اچھا'' اس نے جھک کر ایمنہ کے تنفس کا جائزہ لینے کی کوشش کی، پھر بولا۔ ''خانم بے ہوش ہیں صاحب!''

''ہاں، چلو انہیں اپنی گاڑی میں ڈالو۔ اور پانی...... لیکن پانی یہاں کہاں سے آیا۔ خیر ہمیں قاہرہ پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ صبح ہونے والی ہے۔ جلدی کرو۔''

ہم دونوں نے مل کر ایمنہ کو اٹھایا اور گاڑی میں لا کر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی اسٹیئرنگ سنبھال کر گاڑی بیک کی، پھر ٹرن لے کر تیزی سے قاہرہ کی طرف چل پڑا۔ میں بھی پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا تھا اور میں نے ایمنہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی چند میل کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ڈرائیور نے کہا۔

''صاحب! قاہرہ جانا مناسب نہیں ہے۔ ہماری گاڑی کا ونڈ اسکرین ٹوٹا ہوا ہے، گاڑی گرد آلود ہو رہی ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار ہو جائیں گے۔''

''تو پھر کسی قریے میں چلو۔''

''نہیں صاحب! گاڑی کو سڑک سے اتارنا خطرناک ہے۔ کھوجی زمین سونگھ کر بتا دیں گے کہ ہم کس طرف گئے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم پولیس کے نرغے میں ہوں گے۔''

''تو پھر کیا، کیا جائے؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ آپ خود پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں اور تمام واقعہ بیان کر دیں۔ ہمیں ہوٹل سے گواہ مل جائیں گے۔'' وہ بولتے بولتے رک کر سوچنے لگا، پھر بولا۔ ''نہیں، شاید کوئی شہادت دینے کو تیار نہ ہو۔ اصل میں ہشمان ذکری بہت خطرناک چیز ہے، اس کا نام آتے ہی لوگ کانپ جائیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا، کیا جائے۔''

''قاہرہ کے مضافات میں تمہارا کوئی دوست وغیرہ نہیں ہے؟''

''ایسا کوئی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ اگر روپیہ دے کر ان کے منہ بند کرنے کی کوشش کی جائے تو ان کے منہ پھیلتے جائیں گے اور......''

''میں سمجھ گیا۔ تمہارے خلوص کا بہت بہت شکریہ۔ چلے چلو، شاید کسی نخلستان یا مضافاتی باغ میں پانی مل جائے۔ بس یہ ہوش میں آ جائے تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔''

ڈرائیور نجانے کیوں سوچ میں ڈوب گیا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''اور اگر یہ ہوش میں نہ آئیں تو؟''

''اللہ مالک ہے، دیکھا جائے گا۔'' میں ایک بار پھر ایمنہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن اس پر ہلانے جلانے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''میری سمجھ میں آتا ہے صاحب! لیکن آپ کی ناراضگی۔''

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا میرے دوست۔ تم میرے دوست ہو۔''

''جن حالات میں آپ ہیں صاحب، اب تو میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو چکا ہوں، ایک بات کہوں آپ سے۔''

"ہاں بولو۔"

"آپ کے لئے لاش گلے میں ڈال کر پھرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"مگر یہ ابھی زندہ ہے، مری نہیں ہے۔"

"صاحب معافی چاہتا ہوں۔ یہ لاش بے شک ابھی نہیں ہے لیکن ہو جائے گی۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ یہ آپ کی بیوی نہیں، محبوبہ ہے۔ صاحب! یہ تو زندگی کے کھیل ہوتے ہیں، اور بہت سی مل جائیں گی آپ کو۔ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کیجئے۔"

نجانے کیوں میرے بدن میں ایک لرزش سی پیدا ہو گئی۔ وہ واقعی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں یہاں جن حالات میں گھرا ہوا تھا ان کو دیکھتے ہوئے اس کا مشورہ بہت بہتر تھا۔ اب اس بیچارے کو کیا معلوم کہ امینہ نے میرے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے یا میں اس کے لئے کس حد تک جا سکتا ہوں۔ ڈرائیور جیسے میرے جواب کا انتظار کرتا رہا، پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"چار بجنے والے ہیں صاحب، دو گھنٹے بعد دن نکل آئے گا اور پھر یہ چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آپ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اگر شہر میں داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر انہیں ہسپتال یا پولیس اسٹیشن جانے کا مشورہ دے تو آپ اس پر عمل کر سکیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی، ڈرائیور کے الفاظ پر میرا دل ڈوبنے لگا۔ ڈرائیور کو جواب دینے کی بجائے میں نے جھک کر امینہ کے منہ پر منہ رکھا اور پوری قوت سے اسے تنفس دینا شروع کر دیا۔ دو تین مرتبہ یہ عمل کیا ہو گا کہ امینہ کے تنفس میں باقاعدگی رونما ہونے لگی۔ میں نے اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر بائیں جانب کان رکھ کر دل کی دھڑکن کا جائزہ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نبضیں اعتدال پر آنے لگیں اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"امینہ...... امینہ! ہوش میں آؤ۔" امینہ کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں اور پھر اس نے میری کلائی پر گرفت کر لی۔ پھر اس کی کمزور آواز ابھری۔

"اب ٹھیک ہوں میں۔ تم کہاں رک گئے تھے؟ ان ظالموں نے تو میرا......" وہ گ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ امینہ میر کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی تو ڈرائیور نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے جناب! کیا حکم ہے؟"

"اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے رہو۔ قاہرہ کے مضافات میں ہمیں اتار کر پہلے گاڑی کی مرمت کراؤ اور پھر......"

"یہ خطرناک ہوگا جناب! آپ مقامی زبان نہیں جانتے۔ اور خانم شاید ہی پیدل چل سکیں۔ اگر پھر بے ہوش ہو گئیں تو مصیبت ہو جائے گی۔"

میں نے امینہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "اب کیسی ہو امینہ! یہ بتاؤ۔"

"گاڑی سے اترنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اسے تفصیل سے وجہ سمجھائی تو وہ بولی۔ "پھر تو بہتر یہی ہے کہ ہم کسی نخلستان میں اتر جائیں۔ ڈرائیور گاڑی لے کر چلا جائے اور شہر میں جا کر شیشے وغیرہ تبدیل کرائے۔ پھر واپس آ کر ہمیں لے جائے۔"

"کیا خیال ہے دوست، سنا تم نے؟"

"جی صاحب، ٹھیک ہے، سن لیا۔ خانم اب ٹھیک ہیں، ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر گاڑی ٹھیک ہونے تک اس واقعے کی اطلاع شہر میں نہ پہنچے تو پھر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے کھانے پینے کا سامان بھی لیتا آؤں گا۔ اور پھر قاہرہ یا جہاں آپ کہیں وہاں جائیں۔"

میں نے امینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "قاہرہ کے سوا اور کہاں جا سکتے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔"

"اگر قاہرہ ہی جانا ہے صاحب! تو میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی ہے۔ قاہرہ کے اس طرف نخلستانی حصے میں ایک ہوٹل ہے۔ میں قاہرہ کو بائیں جانب چھوڑ کر آپ کو اس طرف نکال لے جاتا ہوں۔ اس ہوٹل میں آپ کا قیام کرا کے واپس قاہرہ آ کے گاڑی ٹھیک کرا لوں گا۔"

"یہ تو بہت بہتر ہے۔ گویا تم یہ چاہتے ہو کہ مخالف سمت سے قاہرہ داخل ہونے پر اسکندریہ والی سڑک کے واقعے سے اس گاڑی کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔"

"بالکل یہی جناب! پانچ میل کا چکر کوئی بڑا چکر نہیں ہے اور صبح ہونے تک وہاں پہنچ جانے پر کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکے گا کہ ہم کس طرف سے آئے ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ چلو۔" اور اس کے بعد ڈرائیور نے گاڑی سنبھال لی۔ اور اس بار

گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ہم نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ ڈرائیور کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھ پر نیند کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور کی آواز ابھری۔

''صاحب، سوئیے نہیں۔ باتیں کیجئے، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ اگر سو گیا تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟''

''سو جاؤ یار پھر۔'' میں نے کہا اور ڈرائیور زور سے ہنسا اور بولا۔

''سو جاؤں؟''

''ہاں ہاں، سو جاؤ۔'' میں نے غنودگی کے عالم میں کہا۔

''اور ایکسیڈنٹ میں جو کچھ ہوگا صاحب اس کا آپ کو اندازہ ہے؟''

ایکسیڈنٹ کا نام سن کر میں ایک دم ہوش میں آ گیا اور میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا میں؟''

''آپ مجھے بھی سونے کا مشورہ دے رہے تھے۔''

''نہیں نہیں، سوری۔ چلو باتیں کرو۔''

بہرحال ڈرائیور مجھے وہ واقعات بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ ان لوگوں کو پہچان گیا ہے۔ وہ ذکری ہی کے آدمی تھے۔ انہوں نے ہوٹل میں پہنچ کر اچانک اسے پیچھے سے آ کر خاموش رہنے کے لئے کہا اور پھر باندھ کر ٹیکسی میں ڈال دیا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ بولا۔

''آپ سو گئے کیا؟''

''نہیں، میں جاگ رہا ہوں۔ دراصل میں خاموش اس لئے ہوں کہ مجھ کو خانم کی چیخ سن کر مدد کو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔'' یہاں تک پہنچ کر ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتہ مجھے خیال آیا کہ میں اسے جو کچھ بتاؤں گا وہ اس کے لئے قابل یقین نہیں ہوگا۔ اس نے مجھے خاموش ہوتے دیکھ کر کہا۔

''آپ اس وقت سو رہے تھے صاحب؟''

''نہیں، زینے پر پستول لئے تیار کھڑا تھا۔ بس کچھ لمحوں کی دیر ہو گئی۔''

اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر آپ یقیناً کھڑے کھڑے سو گئے ہوں گے۔ خیر اب نہ سوئیے گا۔ آگے پہاڑی سلسلہ آ رہا ہے۔ راستہ بہت خطرناک ہے

اور میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی ہیں۔ کاش ایک پیالی چائے مل جاتی۔''

''تیز چلاؤ۔ تا کہ ہم جلدی ہوٹل پہنچ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''زیادہ تیز نہیں چلا سکتا جناب! چڑھائی شروع ہو چکی ہے۔''

میں نے پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور امینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ امینہ بے خبر سو رہی تھی۔ گاڑی بلندی پر چڑھتی بار بار مڑتی اور گھومتی جا رہی تھی۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس سے ہم یہاں تک آئے تھے۔ بلندی پر پہنچنے کے ساتھ ہی ہر موڑ پر سڑک کے کنارے کنارے بڑے بڑے پتھروں پر سفید کر کے خبردار لکھا گیا تھا۔ سڑک پر دو طرف ٹریفک گزرنے کے لئے کہیں کہیں چٹانیں کاٹ کر کشادہ کر لی گئی تھیں۔ میں کھڑکی سے جھانک کر نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بھی سبزے کا نام ونشان نہیں تھا۔ درخت نہ جھاڑیاں، حد نظر تک دشت بے آب و گیاہ۔ کہیں کہیں کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ انتہائی وحشت ناک ماحول تھا۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ گاڑی کسی چیز سے ٹکرائی اور ایک زبردست جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی ڈرائیور کی چیخ سنائی دی۔

''یا اللہ!''

میں نے آنکھیں کھلتے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ اسی وقت گاڑی نیچے لڑھکنے لگی...... ایک لمحے میں میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ میں نے باہر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے لمحے گاڑی کا پچھلا حصہ پتھروں سے اوپر اٹھا اور گاڑی ڈھلان پر لڑھکنیاں کھاتی ہوئی گہرائیوں میں جانے لگی...... میں نے سڑک کی طرف لڑھک کر آنکھیں بند کر لیں...... آہ، میرا عزیز ترین رفیق سفر اور ایک قابل اعتماد انسان، جو مختصر سے عرصے میں بہترین دوست بن چکا تھا اس طرح موت کے منہ میں جاتے دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی...... اس صدمے نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کچھ دیر بے حس وحرکت پڑا رہنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس دوران میں گاڑی کو انتہائی گہرائیوں میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر ان گہرائیوں نے گاڑی کو نگل لیا...... نہ کوئی دھماکا ہوا نہ شعلے بھڑکے۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں کچھ دیر تک دیوانوں کی طرح نیچے دیکھتا رہا۔ دور دور تک پتھروں کی چھوٹی بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں...... گاڑی اس طرح گم ہو گئی تھی جیسے

اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو! میرے دل پر چوٹ لگی اور آنکھیں بھر آئیں۔ یہ حادثہ اس قدر تیزی سے ہوا تھا کہ بدحواسی میں مجھے امینہ کا خیال تک نہ رہا اور جان بچانے کے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اندھا دھند چھلانگ لگانے کے سوا اور کچھ نہ سوچا۔

اے کاش! کاش! گاڑی کا دروازہ کھلنے میں ایک لمحے کی دیر ہو جاتی اور میں بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہینڈل پر ہاتھ پڑتے ہی دروازہ کھل گیا اور میں اس طرح باہر نکل گیا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اٹھا کر چٹان پر رکھ دیا ہو۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر رخساروں پر بہہ گئے اور میں انسانی جبلت پر بے اختیار غور کرنے لگا۔ میں خاقان جمشیدی، جو اس وقت تک اختیاری اور غیر اختیاری طور پر حالات سے مجبور ہو کر متعدد قتل کر چکا تھا اور انسانی زندگی کو اب کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا تھا، قانون مکافات کا شدت سے قائل ہونے کے باوجود اپنے دو رفیقوں کی الم ناک موت پر رو رہا تھا۔ ذہن کی اس نئی کروٹ سے مجھے اپنا کردار مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ حیات نے ایک اور پلٹا کھایا اور شام سے اس وقت تک گزرے ہوئے تمام واقعات میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے اور میں سحر زدہ ہو کر ان میں ڈوب کر رہ گیا۔ آج کی رات میرے عروج و زوال کی رات تھی۔ کامیابی اور ناکامی کی رات تھی۔ خطرناک دشمنوں پر غالب ہو کر مغلوب ہو جانے کی رات تھی۔ اور ابھی تو یہ رات باقی ہے۔ ابھی نجانے کب اس کی سحر ہو گی۔ پتہ نہیں سحر ہو گی بھی یا نہیں ہو گی۔ ویسے اب مجھے صبح شام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے لئے کوئی سحر شادمانی یا مسرت کا پیغام لے کر نہیں آسکتی تھی۔ کاش! اس رات کے اندھیرے مجھے نگل لینے کے بعد دن کے اجالے میں تبدیل ہوں۔ کاش...... کاش......

مجھے بڑے زور کا چکر آیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں اور میں خود کو گرتا ہوا محسوس کر کے ایک پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ دل شکستہ، مایوس اور افسردہ جسم پر ایک خراش تک نہ آنے کے باوجود زخموں سے چور بیٹھتے ہی نظروں کے سامنے پھر وہ تمام مناظر آنے لگے اور یوں لگا جیسے میرے دماغ میں کوئی چرخی سی چل رہی ہو۔ آنکھوں کے سامنے شدید اندھیرا آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیفیت کتنی دیر تک رہی۔ لیکن میں جب چونک کر بیدار ہوا تو صبح نہیں ہوئی تھی۔ میرے بیدار ہونے کی وجہ کسی کار کے انجن کی آواز تھی۔ سڑک پر اس کی روشنیاں گردش کر رہی تھیں۔ دوسرے لمحے کار میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اسٹیئرنگ پر ایک شخص عربی لباس میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر کوئی عورت تھی جس کا چہرہ مخصوص عربی انداز میں کالے نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک انتہائی نفیس اور پُرسحر خوشبو اس کے وجود سے اٹھ رہی تھی۔ دفعتہً اس کی آواز ابھری۔

''یہاں مرنے کا ارادہ ہے؟ آؤ، کار میں بیٹھ جاؤ۔''

حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ الفاظ اردو میں ادا کئے گئے تھے اور تلفظ بھی انتہائی نفیس تھا۔ ذہن کے پردے پر ایک لہر سی گزر گئی۔ یہ حسین آنکھیں جو میری نگاہوں کے سامنے ہیں، کہیں دیکھی ہیں میں نے۔ اور یہ آواز، دماغ ہی خراب ہوا ہے شاید۔ صحرائے مصر کے ان پُرخطر راستوں پر اتفاقیہ طور پر ایک گاڑی میں بیٹھی ہوئی ایک عورت بھلا میری شناسا کیسے ہو سکتی ہے؟ اصل میں ہر ایسے وجود کو ہوس کی آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ہر عورت جانی پہچانی محسوس ہوتی تھی۔ امینہ تو خیر اپنا سفر پورا کر کے میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ظاہر ہے اب میں بھٹکنے والوں میں سے تھا۔ ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہی حسین آواز مجھے پھر سنائی دی۔

''دیوانے ہو چکے ہو تم، کیا سماعت سے بھی محروم ہو؟ بینائی تو خیر تمہاری کبھی کی ختم ہو چکی ہے لیکن سماعت بھی ختم ہے۔ میں کہہ رہی ہوں یہ جگہ خطرناک ہے تمہارے لئے۔ یہاں تم کسی بھی مصیبت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکو گے۔ کار میں بیٹھ جاؤ۔ ڈرائیور! اسے اپنے پاس جگہ دو۔''

عربی ڈرائیور نیچے اتر آیا اور اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ ''واقعی، آپ یہاں خطرے میں ہیں جناب۔ آئیے اس طرف بیٹھ جائیے۔'' وہ گھما کر مجھے دوسری سمت لایا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا جسے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے اندر بٹھایا اور پھر پیچھے دیکھ کر بولا۔

''آگے چلوں عالیہ حضرت؟''

''ہاں چلو۔''

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اردو میں بولی۔

''بھٹکنا انسانی فطرت ہے۔ انسان اور شیطان ازل کے ساتھی ہیں۔ شیطان ہر وہ دروازہ کھولتا ہے جو برائی کی طرف جائے کیونکہ اس کا عمل ہی یہ ہے۔ لیکن بچنے کی تلقین بھی تو بار بار کی گئی ہے۔ کب تک بھٹکتے رہو گے، کہاں کہاں بھٹکتے رہو گے؟ پوچھنا چاہتی

ہوں میں تم سے۔ کیوں بھٹک رہے ہو؟ آغاز جہاں سے کیا تھا، انجام وہیں ہو سکتا تھا۔ بے شک تعلق ایک بڑے گھرانے سے تھا۔ جو بھوکے ہوتے ہیں تو خدا کے قریب ہوتے ہیں، اسے یاد کرتے رہتے ہیں۔ برائی صرف یہ تھی کہ تم پیٹ بھرے تھے۔"

میں حیرت سے اس کی حسین آواز سن رہا تھا اور غور کر رہا تھا کہ کون ہے یہ...... کون ہو سکتی ہے؟ میرے بارے میں اس طرح باتیں کر رہی ہے جیسے مجھے بہت عرصے سے جانتی ہو۔

"ہاں۔ ہم لوگ صرف ایک ہی بات سوچتے ہیں۔ اگر کوئی ہم سے مخاطب ہے تو وہ کون ہے، ہمارا اس سے کیا تعلق ہے۔ جاننا چاہتے ہو میں کون ہوں اور میرا تم سے کیا تعلق ہے؟ کچھ وقت کے لئے ان گندگیوں سے نکل آئے ہو جو تم جان بوجھ کر اپنے سر پر اوڑھ لیا کرتے ہو۔ یہ دیکھو اور پہچانو میں کون ہوں......"

یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور میرے دل کی دھڑکنیں جیسے بند ہو گئیں...... وہ کلاڈیا تھی۔ کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا جس سے میری ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی جو اس وقت بھی ایک پراسرار کردار تھی اور اب تو مزید پراسرار ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے تفصیلات پتہ چل چکی تھیں۔ ایک انگریز ماں کی اولاد تھی۔ کرنل صغیر نے اس عورت کو آخری وقت تک مسلمان نہیں کیا تھا لیکن کلاڈیا یہاں ان حالات میں اور اس انداز میں مجھ سے گفتگو کر رہی تھی جیسے اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو۔ میں شدت حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بولی۔

"بہت سے اعترافات کرنا پڑتے ہیں۔ تم حیرت کے جن لمحات سے گزر رہے ہو، وہ غیر فطری نہیں ہیں۔ اور میں جن حالات سے گزر رہی ہوں وہ بھی غیر فطری نہیں ہیں۔ یہ کمبخت دل کبھی کبھی ایسے جذبوں سے آشنا کر دیتا ہے جو بے اختیار جذبے ہوتے ہیں۔ میں تم سے محبت کرنے لگی تھی، اسی وقت جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں اور میں نے نجانے کتنے خواب تمہیں اپنی آرزوؤں میں بسا کر سوچے تھے۔ لیکن پھر تم ان راستوں پر بہت دور تک نکل گئے جو برائی کے راستے تھے اور میں نے اپنے قدم روک لئے۔ میں نے سوچا کہ کیسے انسان ہو تم جو خود اپنی بہتری کی بھی نہیں سوچتے۔ تم سمجھدار تھے، ہوش و حواس میں تھے لیکن تم سے زیادہ بے حواس کوئی نہیں رہا تھا۔ ارے بیوقوف آدمی! موت کی قوتیں نجانے کیسے کیسے عمل کرتی

ہیں، نجانے کون کون کیسے کیسے راستوں کا راہی ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو بھٹکانے کے لئے ہر جدوجہد کرتا ہے۔ برائی کی اسی منزل سے بچنا تو ایمان کا راستہ ہے۔"

"کلاڈیا ہو نا تم؟"

"ہاں۔"

"مگر کلاڈیا......"

"کچھ نہیں۔ موقع ہی کہاں دیا تم نے۔ میں نے پہلا ہی خواب دیکھا تھا تمہارے لئے کہ تم نے راستے بدل لئے۔ ایلس فیوری اور دوسری بہت سی لڑکیاں۔ بولو، غلط کہہ رہی ہوں؟ چلو لڑکیوں کو جہنم میں جھونکو، مجھے بھی جہنم میں جھونکو۔ لیکن مجھے ایک بات بتا دو، تمہارا اپنا دین، اپنا ایمان کیا ہے؟ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے؟ کیا یہ غور کیا ہے تم نے کہ تمہارا تعلق کس مذہب سے ہے؟ اور وہ افضل ترین مذہب ہے۔ اور اس کے لئے کچھ جستجو کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اس کائنات کا اخلاقی مذاق ہے جو تمام مذاہب کی نفاستوں، بڑائیوں اور محبتوں سے بسا ہوا ہے۔ سب اپنے اپنے مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہمیں اپنے مذہب کا کوئی بڑا انسان بنانے کے بارے میں سوچتا ہے تو کیا تم یہ نہیں جانتے ہو یا پھر تمہاری تربیت ہی نہیں کی گئی ہے کہ خود تمہارا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اس میں ایک ادنیٰ سا انسان ان بڑی بڑی قوتوں سے زیادہ طاقتور ایمانی قوت رکھتا ہے جو دوسرے مذاہب کی آخری قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ تو ہر طرح سے یہ چاہیں گے کہ تمہیں اپنے آپ میں شامل کر کے اپنا مرتبہ بلند کریں۔ اس کے لئے وہ جادوئی قوتوں کے جال بچھائیں یا کچھ بھی کریں، کم از کم تمہیں تو سوچنا چاہئے کہ تم خود کیا ہو۔"

"کلاڈیا، تم...... تم یہاں......"

"میں ہر جگہ ہوں۔ وہاں بھی تھی میں جب تم وائسرائے کے آفس میں بند ہو گئے تھے۔ ہم تمہاری مدد کے لئے وہاں تیار تھے۔ اور اس کے بعد ہر جگہ، سمندری جہاز پر اور دوسری جگہوں پر تمہارے لئے نجانے کون کون کمربستہ تھا۔ مگر تم تو حسن و جمال کے دیوانے تھے، اپنی زندگی کی حفاظت یا پھر اپنی انا کی تسکین، اپنی ہوس کی تسکین اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کیا تھا۔ کبھی وقت کے فاصلوں کو طے کر کے دیکھو، کبھی ان راستوں کی طرف چل کر تو دیکھو جو...... جو......"

اچانک ہی کار کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ رک گئی۔ میں کلاڈیا کی باتوں میں گم تھا۔ ڈرائیور نے سامنے دیکھ کر کہا۔ ”وہ لوگ سامنے راستہ روکے کھڑے ہیں۔“

”ہاں، میں دیکھ رہی ہوں۔“

میری نگاہیں بھی سامنے اٹھ گئیں۔ اور دفعتہً ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دو کاریں اس طرح راستہ روکے کھڑی ہوئی تھیں کہ کار کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ کلاڈیا بھی دوسری طرف سے اتر گئی۔ میرے لئے بھلا اس کے علاوہ چارہ کار کیا تھا کہ میں بھی نیچے اتر جاؤں۔ چنانچہ میں بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ سامنے والی دونوں گاڑیوں کے قریب بہت سے افراد کھڑے ہوئے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا اور چند قدم آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ ہشمان ذکری کے آدمی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

”یہ میرے دشمن ہیں اور یقیناً میری ہی وجہ سے......“ یہ کہہ کر میں نے پیچھے دیکھا۔ لیکن دوسرے لمحے میری کھوپڑی بھک سے اڑ گئی...... وہاں نہ کوئی کار تھی نہ کلاڈیا تھی، نہ اس کا ڈرائیور تھا۔ میں نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں، پھر قرب و جوار میں دیکھا۔ دائیں بائیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کسی کار کو پوشیدہ کیا جا سکے۔ یہ کیا قصہ ہے...... آہ، یہ کیا قصہ ہے؟ لیکن قصے پر غور کرنے کی نوعیت نہیں آئی۔ میں نے ہشمان ذکری کو دیکھا جو پستول میری طرف تانے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں بے حواس تھا۔ بالکل بے حواس تھا۔ کلاڈیا، کار، ڈرائیور اور اس کی باتیں...... سب نہ کھیل تھا نہ فریب نظر نہ میرا وہم۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں کلاڈیا نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی میں نے کبھی اس سے ملنے کے بعد دوبارہ اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس وقت وہ کہاں سے آ گئی اور یہ سارا کھیل کیا ہے؟ میرے تصور میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

ہشمان ذکری آہستہ آہستہ میرے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ”ہمارا تمہارا ساتھ نجانے کہاں سے کہاں تک کا ہے میرے دوست۔ تم چاہے کتنی ہی فرار کی کوشش کرو لیکن تمہیں میرے سامنے ہی آنا ہے۔“

”ہشمان ذکری! میری ایک درخواست مان لو گے؟“ میں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

”بولو، بولو۔“

”میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے ختم کرنے میں دیر نہ کرو۔“

وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ”تمہیں ختم کرنا میری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے میری جان! لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تم اب بھی چال چل رہے ہو۔ ایک بات بتاؤ، کیا تمہارے ریوالور میں گولیاں ختم ہو گئی ہیں؟“

”نہیں، گولیاں ختم نہیں ہوئیں، میں خود مر چکا ہوں۔ آؤ اپنے ہاتھ سے میرا پستول میری جیب سے نکال لو۔“ میں نے کہا۔

”ہوں...... یہ بھی ہو جائے گا۔ چلو دیکھو ذرا۔“ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور دو آدمی میری طرف بڑھے۔ میں نے ان کے اپنے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا، خود ہی میں نے پستول جیب سے نکال کر اس طرف اچھال دیا۔

”یہ لو۔“

اس نے پستول لپک لیا۔ آنے والے دونوں آدمیوں نے بڑھ کر مجھے تھام لیا تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اس احتیاط کی ضرورت نہیں ہے ذکری! پستول اٹھاؤ اور کھیل ختم کر دو۔“

”کر دوں گا...... کر دوں گا۔ پہلے مجھے یہ تو سمجھنے دو کہ اس وقت تم کیا کھیل کھیلنا چاہتے ہو۔ بہت بڑے کھلاڑی ہو تم اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں تم مرنا نہیں چاہتے، بکواس کر رہے ہو بالکل۔“

”تم کچھ بھی سمجھ لو، میں تمہیں اس کا موقع دے رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اب ہر بازی ہار جانا چاہتا ہوں۔“

”مثلاً......؟“ اس نے اپنا سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ منتخب کیا اور اپنے ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

”چھوڑو ذکری! بیکار وقت ضائع نہ کرو۔“

”چلو، چلو دیکھتے ہیں۔ اسے گاڑی میں بٹھاؤ...... بٹھاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور ان دونوں نے مجھے کار میں بٹھا دیا۔ ذکری میرے برابر ہی آ گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”سنو...... اگر یہ کسی قسم کی گڑبڑ کرے تو فوراً گولی مار دینا۔“ پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ”ہاں بھئی، شروع ہو جاؤ۔ کیا کہانی ہے تمہاری؟“

"بس میری کہانی تو کافی پیچھے ختم ہو گئی ہے اگر تم نے اس گاڑی کو نیچے گر کر تباہ ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ کیا سمجھے؟ اور سنو، میری بات غور سے سنو ذکری! شاید اس کے بعد تم میری آواز پھر کبھی نہ سن سکو گے۔ تم یقین کرو، میں نے تم سے شکست نہیں کھائی۔ تم یا تمہارا دوست ہیگ مجھے کبھی شکست دے ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن میری روح قرض کے بوجھ تلے دب گئی ہے جو اس وقت تک تمہیں شکست دینے کے نتیجے کے طور پر میرے ساتھ ہو چکا ہے۔"

"بکواس کئے جا رہے ہو۔ تم جیسے چوروں کے ذمے کوئی قرض نہیں ہوتا۔"

"اگر میں واقعی چور ہوں تو۔"

"کیا مطلب؟"

"چور تم ہو ذکری...... چور تم ہو۔"

"کیا بکواس کرتا ہے تو؟" ذکری نے غرا کر کہا۔

"ہاں...... تم سے بڑا چور اور کوئی نہیں ہے۔ میں زر و جواہر یا مال و دولت کے بارے میں نہیں کہہ رہا، میں انسانی خون کے متعلق کہہ رہا ہوں جو مجھے اپنی مدافعت میں بہانا پڑا اور جو میں اپنے خون سے ادا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے اور تمہارے درمیان لین دین کا حساب ہے اور میں حساب اتارنا جانتا ہوں۔"

ذکری خاموشی سے بیٹھا رہا۔ گاڑی متعدد چکر کاٹتی ہوئی پہاڑی کی بلندیوں سے سطح زمین کی ہموار سڑک پر آ گئی۔ میں نے گردن گھما کر اس وادی کی طرف دیکھا۔ وہ جگہ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے جہاں یہ حادثہ ہوا تھا اور میں پچھلی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً ہی ذکری میرا شانہ ہلا کر بولا۔

"دل کے پرزے تلاش کر رہے ہو شاید...... لیکن اس وسیع صحرا میں کارواں گم ہو جایا کرتے ہیں، ٹوٹی پھوٹی چیزوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تم تو روح کی بات کر رہے تھے۔ پھر روح کی بات کرو۔"

"ہاں میں روح کی بات کر رہا ہوں جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"بیوقوف ہو خاقان! بیوقوف ہو...... بیوقوف ہو۔ کیا سمجھے؟"

"تم جو کچھ بھی کہہ لو، جو کچھ بھی کہہ لو۔ لیکن بیوقوف میں نہیں، تم ہو۔"

"بہک رہے ہو۔ بہت زیادہ بہک رہے ہو۔ اصولاً مجھے تمہاری لاش اب تک

دریائے نیل کی تہہ میں پہنچا دینی چاہئے تھی۔ لیکن تم خود جان سے بیزار ہو کر مجھے مشتعل کرنے کے لئے پورا زور لگا رہے ہو۔ لگاتے رہو، میں بھی ذرا مختلف قسم کا کھلاڑی ہوں۔ میں ابھی تمہیں اس ذہنی کرب سے نجات دلانے کے لئے تیار نہیں ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

"شکریہ۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارا قرض اتارنا چاہتا ہوں اور صرف اس لئے کہ تمہارے ساتھ تعاون کر کے میں جرائم پیشہ نہیں بن سکتا اور نہ تمہیں اس قابل سمجھتا ہوں کہ تمہارے خلاف محاذ آرائی میں مصروف رہوں اس وقت تک جب تک میں قانون کے محافظ کی حیثیت نہیں اختیار کر لوں۔"

"ذرا ایک منٹ رکو۔" اس نے میرے الفاظ کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"تم میرا قرض اتارنا چاہتے ہو نا، تو اس کے لئے زندگی جیسی بیش قیمت چیز پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا قرض تم اتار سکتے ہو۔"

"ہاں، وہی جاننا چاہتا ہوں میں۔"

"وہ تختی میرے حوالے کر دو۔ میں اپنے آدمیوں کا خون، امینہ کا اغوا سب کچھ معاف کر دوں گا تمہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دو ملین ڈالر اور دنیا کے کسی بھی ملک میں جہاں تم جانا چاہو تمہیں پہنچانے کے اخراجات اور ذمہ داریاں پوری کروں گا اس تختی کے عوض۔ بولو، کیا کہتے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ رفتہ رفتہ صبح ہوتی جا رہی تھی۔ ہشمان ذکری نے مجھے آسمان کی طرف دیکھتے پا کر کہا۔ "شکر ادا کرو، ذکری تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رہا ہے خاقان! ورنہ تم تو صرف اس قابل ہو کہ تمہاری کھال ہی کھنچوا دی جائے۔"

"ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ تم سے زیادہ رحم دل جلاد اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا۔"

"خیر ٹھیک ہے۔ بکتے رہو۔ لیکن میرا خیال ہے تمہیں صرف تختی کے بارے میں بات کرنی چاہئے۔"

"وہ میرے پاس نہیں ہے۔ تمہیں خود بھی اس کا اندازہ ہو گا۔"

"جہاں بھی ہے وہ تمہیں وہاں سے مجھے دینی ہے۔ میں تمہیں زیادہ سے زیاد
اڑتالیس گھنٹوں کا وقت دے سکتا ہوں، صرف اڑتالیس گھنٹوں کا۔ سمجھے؟" اس نے گرد
گھما کر اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا اور اس شخص نے میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ میں
نے کوئی مدافعت نہیں کی تھی۔ نجانے اس نئے عمل کا کیا مطلب تھا۔ ذکری نے ہاتھ بڑھ
کر دونوں طرف کی کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے۔ بہر حال پھر گاڑی ہشمان ذکری کے مح
کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ میں کھلی آنکھوں سے پھر خود کو اسی زندانِ بلا میں گرفتا
ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر گاڑی رکی اور ذکری دروازہ کھول کر باہر نکلا او
مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گاڑی سے باہر آ کر اپنے منہ پر چپکائی ہوئی ٹیپ ک
طرف اشارہ کیا۔ ذکری نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سگریٹ کیس نما ٹارچ نکالی او
ٹیپ کے قریب لا کر گرمی پہنچاتا ہوا بولا۔

"ٹیپ کا سرا نوچ لو۔"

میں نے ٹیپ نوچ کر پھینکتے ہوئے کہا۔ "شکریہ دوست۔"

اس نے میرا بازو تھاما اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ کار کے اندر ٹیپ لگانے کا مقص
یہ ہو سکتا تھا کہ آبادی میں داخل ہونے کے بعد میں چیخنے چلانے کی کوشش نہ کروں۔ میں
نے ان دونوں آدمیوں کو دیکھا جو میرے پیچھے پستول لئے چل رہے تھے۔ طویل صحن او
راہداریاں طے کرتے ہوئے آخر وہ مجھے اسی دالان میں لے آئے جہاں سے میں فرار ہ
تھا۔ سرخ قالینوں والے کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے اینہ کے عشرت کدے میں
داخل ہوتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کچھ اشعار پڑھنے لگا۔ اس نے کہا۔

"نغمے کے بعد ذہن میں آواز مرتعش ہوتی ہے۔ پتی مرجھانے کے بعد زیادہ آرام د
ہوتی ہے اور ان کے جانے کے بعد ان کی یاد۔"

"واہ...... کیا حسین اشعار ہیں۔ واقعی بڑی خوبیوں کے حامل ہو۔" اس نے ایک
خوفناک قہقہہ لگایا اور میری آواز دب کر رہ گئی۔

"اڑتالیس گھنٹے...... صرف اڑتالیس گھنٹے۔ کیا سمجھے۔ اگر تم نے تختی فراہم نہ کی
دیکھ لو گے کہ قتل گاہیں کیا ہوتی ہیں۔ کیا سمجھے؟"

بہت دیر تک وہ مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران اس نے سگریٹ
کیس نکالا، لائٹر جیب سے نکال کر پھینکا اور پھر اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پڑا۔

میں آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ نجانے رات بھر کی جگار تھی یا پھر ذہنی تھکن کی انتہا
کہ میں صوفے پر ہی سو گیا اور اس وقت تک سوتا رہا جب کسی نے میرا شانہ پکڑ کر
جھنجھوڑا۔ میں چونک کر اٹھ گیا اور ذکری کو اپنے قریب پا کر میں نے نفرت سے منہ پھیرا
اور کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں بھوک کی
شدید کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے جماہی لی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر
اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ تم نے خودکشی کر لی ہو گی۔"

"تم اس کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتے ہو ذکری!"

"اینہ یاد آ رہی ہے؟" وہ بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، زندگی کے کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق یادوں
سے ہوتا ہے۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں نے تمہیں کیٹس کے اشعار سنائے تھے۔"

"ہاں۔ معلوم ہوتا ہے آغازِ شباب میں تم بھی انسانیت کی سرحدوں سے گزرے ہو
گے، اس طرح جیسے آدم خور چیتا بھٹک کر کسی آبادی میں آ جاتا ہے اور آدم زاد کی پذیرائی
سے خائف ہو کر بھاگ جاتا ہے پھر پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ مائی ڈیئر ہشمان ذکری!
انسانیت مسلسل برائیوں سے پرہیز کا نام ہے۔"

"واہ، کیا عمدہ باتیں کر رہے ہو تم۔ تمہارے اندر یہ پارسائی کہاں سے گھر کر آئی؟"

دفعتہً ہی میرے ذہن میں وہ لمحات گزر گئے جب کلاڈیا مجھے میرے دین و مذہب کا
احساس دلا رہی تھی۔

خداوند عالم! کہاں بھٹک رہا ہوں میں؟ ایک طرف بدھ مت کے پیروکار مجھے اپنا
پیشوا بنانا چاہتے ہیں اور مہتر بدھ کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے مجھ پر
اپنے پراسرار عمل کے دروازے کھول رکھے ہیں اور دوسری جانب کلاڈیا مجھے میری برائیوں
سے روکنا چاہتی ہے۔ تیسری جانب محبت کا یہ شدید احساس جو میرے دل میں اینہ کے
لئے ابھی تک موجود ہے میرے حوصلے پست کر رہا ہے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
پھر میں نے کہا۔

"تم سے زیادہ مکار انسان روئے زمین پر کوئی دوسرا نہیں ہو گا ہشمان ذکری!"

"سنو، بہت کچھ کہتے رہے ہو تم۔ میں برداشت کرتا رہا ہوں۔ اور اب بھی میں تمہیں برداشت کروں گا، آخری حد تک کوشش کروں گا کہ تم دوستوں کی طرح مجھ سے گفتگو کرو۔ اور جب دیکھوں گا کہ اس میں ناکام رہا ہوں۔ اوہو، تم بھوکے بھی ہو گے۔ پہلے مجھے تمہارے کھانے کا بندوبست کرنا چاہئے۔"

"رہنے دو ذکری! یہ اڑتالیس گھنٹے بھی گزر ہی جائیں گے۔ میرا خیال ہے بارہ گھنٹے گزر گئے ہیں، چھتیس گھنٹے اور گزر جائیں گے۔ اس کے بعد تو مجھے مرنا ہی ہے۔ کیوں نہ بھوک پیاس سے مر جاؤں۔"

"تم زندہ رہنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسے کروں؟"

"تختی میرے حوالے کر کے۔"

"کہاں سے لاؤں وہ تختی؟"

"دیکھو، بکواس نہ کرو۔ مجھے غصہ بھی آ سکتا ہے۔" اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں کچھ بھی آئے، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تو پھر ایک بات کان کھول کر سن لو کہ میں تم سے اپنے تین اور چار سات اور سات اور چار گیارہ آدمیوں کے قتل کا بھیانک انتقام لوں گا۔"

میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "گیارہ ہوئے ہیں اب تک؟"

"تمہیں یاد نہیں؟"

"کون یاد رکھتا ہے۔ لیکن ایک خواہش ضرور ہے دل میں، یہ قتل پورے بارہ ہونے چاہئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی مجھے ایک اور چوہا مارنا ہے۔"

"دیکھتے رہو..... خواب دیکھتے رہو۔ اصل میں، میں اس وقت اپنی فطرت کے خلاف لڑ رہا ہوں۔ وہ کر رہا ہوں جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہارے ساتھ رعایت۔ حالانکہ میرا سلوک تمہارے ساتھ وہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"یہ خواب نہیں ہے۔ تم یقین کرو، یہ دیکھو میرا ہاتھ دیکھو۔" میں نے اپنی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس ہاتھ سے ابھی ایک قتل اور ہونا ہے ہشمان ذکری! اور وہ قتل

تمہارے سوا کسی اور کا نہیں ہوگا۔"

وہ دانت پیسنے لگا۔ پھر وہ صوفے سے اٹھا اور قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ پہرے دار نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

ہشمان ذکری کے جانے کے بعد میں دیر تک خاموش بیٹھا مختلف سوچوں میں گم رہا۔ یہاں جس جگہ میں موجود تھا، میری زندگی کے حسین ترین لمحات گزرے تھے۔ اینہ کی موت ناقابل فراموش تھی اور وہ بے چارہ ٹیکسی ڈرائیور جو گھر سے روزی کمانے کے لئے نکلا تھا اس طرح میرے جال میں پھنسا کہ پھر زندہ اپنے گھر نہ جا سکا۔ کیا ہی دردناک اختتام تھا ان دونوں کا۔ اینہ کے لئے میں نے بہت کچھ کیا تھا۔ وہ تھی بھی اتنی دلکش اور دلفریب اور محبت کرنے والی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کی موت نے بری طرح دل توڑ دیا تھا۔ اب اس کے بعد کلاڈیا، یہ ایک نیا کھیل شروع ہوا تھا۔ حیران کن بات تھی، کلاڈیا کے الفاظ میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ایک انگریز ماں کی اولاد جس کا باپ مسلمان تھا۔

دفعتہً ہی میرے ذہن میں کچھ اور خیالات آئے۔ یہ خیالات میرے لئے بہت حیران کن تھے۔ کلاڈیا نے کہا تھا کہ وہ میری تمام مصروفیات سے واقف ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ کلکتے میں ان لمحات میں جب میں مشکلات میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے بعد بمبئی میں جب سلطان چچا اور اپنے دوست کے مسئلے میں مصروف تھا، مجھے کچھ انوکھا احساس ہوتا رہا تھا، بالکل ایسا احساس جیسے کوئی میرے ہمراہ ہو۔ دو آنکھیں مجھے دیکھتی رہی ہوں۔ ایک بار بھی میں نے اس احساس کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اب مجھے وہ آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ کیونکہ میں نے انہیں نقاب کے پیچھے سے دیکھا تھا۔ اے خدا! یہ کلاڈیا میرا تعاقب کیوں کر رہی ہے؟ اس نے جس انداز میں مجھے سرزنش کی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میری اہمیت اس کی نگاہوں میں کچھ اور ہی ہے۔ فیوری اور اس کے بعد عالیہ پھر اینہ اور کب کلاڈیا۔ میرے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس کمرے میں پانی یا پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہاں اس جگہ ساغر و مینا کا ہجوم رہتا تھا۔ مگر اس وقت گلاس تک موجود نہیں تھا۔ آتش دان بند کرا دیا گیا تھا اور کارنس بند پڑا تھا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا، پیاس ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک میرا دل ڈوبتا رہا۔ میں نے ٹانگیں اوپر گھسیٹیں اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ نقاہت سے میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اور اب میرا دل و دماغ ایک سکرات کی سی

کیفیت محسوس کر رہا تھا کہ اچانک میرے نتھنوں سے ایک خوشبو ٹکرائی۔ چمپا کی خوشبو......
اور میرا دماغ معطر ہو گیا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور چونک کر سیدھا ہو
گیا۔ آہ...... وہ میرے سامنے موجود تھا۔ وردان سادھانی میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔
جیسے ہی میری اس سے نگاہیں ملیں، وہ سر جھکا کر بولا۔

''کیا کھویا، کیا پایا دھن راج!'' میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مایوسیوں کے
اندھیروں میں موت کی جانب قدم قدم بڑھتے ہوئے اگر کوئی ایسا روپ نظر آ جائے جس
میں زندگی چھپی ہوئی ہو تو انسان فطری طور پر اسی جانب بڑھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو
پھر اسے انسان نہ کہا جائے۔ کیونکہ باقی سب مکر و فریب اور جھوٹ ہوتا ہے۔ میں
پرمسرت لہجے میں بولا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے وردان سادھانی! کھونے اور پانے کا چکر تو چلتا ہی
رہتا ہے۔''

''اوم نموستو'' اس کے منہ سے آواز نکلی اور اس نے کارنس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
پھر ایک پیتل کا گلاس اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا جو دودھ کے شربت سے بھرا ہوا
تھا۔ میں نے بدحواسی سے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر پینا شروع کر
دیا۔ آہ...... کیا بتاؤں اس کی خوشبو اور لذت الفاظ سے بالاتر ہے۔ میں اس خوشبو اور
لذت کو مرتے وقت تک نہیں بھلا سکوں گا۔ میں نے جلدی جلدی گلاس خالی کر کے
وردان سادھانی کو دیکھا اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

''بہت بہت شکریہ تمہارا۔ واقعی مجھے اس وقت اس کی اشد ضرورت تھی۔''

اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے کر کارنس پر رکھ دیا اور بولا۔ ''اب کیا ارادہ ہے
دھم راج؟''

''میرا ارادہ......؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہاں۔''

''صحیح بتاؤں؟''

''مجھے پورا یقین ہے کہ آپ جو کچھ بھی مجھے بتائیں گے، صحیح ہی بتائیں گے۔''

''میں ایک اور قتل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے دونوں ہاتھ کانوں
رکھ لئے۔ پھر بولا۔

''نہیں دھم راج، زندگیاں لینا اچھا کام نہیں ہوتا۔''

''بس تم نے مجھ سے میری خواہش پوچھی میں نے بیان کر دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ
یہ میری بہت بڑی خواہش ہے۔ بس تم یوں سمجھ لو وردان سادھانی! کہ اپنا اپنا اصول، اپنی
اپنی سوچ ہے۔ کوئی ناگ کو دودھ پلاتا ہے، کوئی دیوتا سمجھ کر پوجتا ہے اور کوئی موذی سمجھ
کر سر کچلتا ہے۔ اپنا اپنا نظریہ ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ سانپ کا سر کچلنے والا انسانیت کا
بھلا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کو ڈسنے سے بچاتا ہے۔ دودھ
پلانے والا اور پوجا کرنے والا دونوں احمق ہیں۔ اور میرے اپنے نظریے کے مطابق
انسانیت کے دشمن بھی۔ تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

وردان سادھانی سر جھکا کر بولا۔ ''آپ کے وچار کی مخالفت کرنا میرا دھرم نہیں دھم
راج۔''

''یہ بھی تمہاری کمزوری ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اگر میرا خیال غلط ہے تو اس کو
غلط ثابت کر کے صحیح راستہ دکھانا بھی تمہارا دھرم نہیں ہے کیا؟''

''وہ تو ہے۔'' وردان سادھانی مسکرا دیا۔

''تو پھر؟''

''آپ ودوان ہیں، شکتی مان ہیں۔ ہم نے برسوں کے گیان اور تپسیا میں جو کچھ
پرایت کیا، وہ آپ نے چند دنوں میں اتنا پیچھے چھوڑ دیا کہ ہم جنم جنم کے بلیدان میں بھی
حاصل نہیں کر سکتے۔ اتنا علم کہاں سے لائیں ہم کہ آپ کو غلط ثابت کر سکیں اور اتنی طاقت
کہاں سے پائیں کہ سانپ کا سر کچل سکیں۔''

''اچھا دوست! یہی تو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو سانپ کا سر کچلنے دو۔''

''کک...... کیا مطلب؟''

''صرف اتنی مہربانی کر دو اس وقت کہ ایسے چار پانچ گلاس اور رکھتے جاؤ تاکہ میں
کل شام تک زندہ رہ سکوں۔''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''آپ چار پانچ کیا پچاس گلاس پئیں۔ وہ ہے
نا آپ کے پاس۔''

''وہ......؟'' میں نے کہا۔

''ہاں۔''

''وہ تو میں پی چکا ہوں۔''

''نہیں مہاراج! وہ تو ساگر ہے۔ ساگر کبھی خالی نہیں ہوتے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میری نگاہیں گلاس کی جانب اٹھ گئیں۔ لیکن پھر میں نے دیکھا کہ گلاس دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''دھرم راج! آپ ابھی تک اپنی شکتیوں سے واقف نہیں ہیں۔ آپ نے وہ الفاظ بھلا دیئے ہیں جو ماشرہ نے آپ سے کہے تھے۔ یاد کیجئے اس کے الفاظ۔ اگر آپ اس کے راستے پر چل پڑے ہیں تو پھر بھلا یہ دیواریں آپ کا راستہ کیا روکیں گی۔ یہ ہتھیار آپ کو کیا نقصان پہنچائیں گے۔ مہاراج! آپ بڑے شکتی مان ہیں۔ آپ نے اپنی شکتیوں پر غور نہیں کیا۔ آپ آنکھیں بند کر کے ہر اس جگہ پہنچ سکتے ہیں جہاں جہاں کا تصور کریں۔ آپ نے دوسروں کو خود بڑا بنایا ہے، وہ آپ سے بڑے تو نہیں ہیں۔''

میرے بدن میں ایک دم سرد لہریں دوڑ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے میں نے غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ نہیں، یہ قوتیں مجھ میں نہیں تھیں۔ یہ قوتیں شاید مجھے فوری طور پر دی گئی ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ کلاڈیا نے مجھے میرے مذہب کی جانب راغب کیا ہے۔ میں ایک لمحے کے لئے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میری نگاہیں گلاس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ میں آگے بڑھا اور میں نے گلاس دوبارہ اٹھا لیا اور اسے پینے لگا۔ دفعتہً ہی مجھے احساس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میں نے شربت پیتے پیتے گھوم کر دیکھا، وردان سادھانی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بہرحال میں نے گلاس پھر خالی کر کے کارنس پر رکھ دیا اور اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بدن میں میری اپنی قوتیں ہی نہیں بلکہ کچھ اور پراسرار قوتیں موجود ہوں۔ میں اپنے آپ کو بے پناہ طاقتور محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال جسم کو جن لذتوں کا احساس ہوا تھا انہوں نے ایک بار پھر آنکھوں میں نیند جیسی کیفیت پیدا کر دی اور آخر کار میں گرد و پیش سے غافل ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ ایک گہری نیند آئی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہوش و حواس بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔

صبح کو اس وقت میری آنکھ کھلی جب کسی نے زور سے صوفے پر ٹانگ ماری تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، روشن دان سے دھوپ نظر آ رہی تھی۔ جس نے میرے صوفے پر ٹھوکر ماری تھی اور اسے ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ ایک انتہائی مضبوط تن و توش والا مسلح حبشی تھا۔ میرے منہ سے لاحول نکل گئی اور پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چائے۔''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا۔ ''تم نے مجھ پر لاحول پڑھی؟''

''ہاں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے لاحول کی توہین کر ڈالی۔ تم جیسے منحوس شکل کے کالے جانور کو دیکھ کر لاحول پڑھنے کے علاوہ اور کیا، کیا جا سکتا ہے؟''

''ہوں...... ٹھیک۔''

''سنا نہیں تم نے۔ جاؤ، ہشمان ذکری سے کہو مجھے چائے بھجوائے۔''

وہ بری طرح جل بھن گیا۔ لیکن پھر اچانک ہنس پڑا اور بولا۔ ''مالک نے مجھے کسی اور ہی کام سے تمہارے پاس بھیجا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے اسے گھور کر کہا۔

''اس نے کہا تھا کہ اگر تم مر گئے ہو تو ہم مل بانٹ کر تمہیں بھون کر کھا لیں اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم زندہ ہو تو تمہیں گھسیٹ کر اس کے پاس لے جائیں۔ چائے پلانے کا کوئی حکم نہیں دیا اس نے۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور فرش پر پیر ٹکاتے ہوئے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ حکم میں تمہیں دے رہا ہوں۔ جاؤ اور چائے لے کر آؤ اور ہشمان ذکری کو یہاں بھیجو۔''

اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر خوفناک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''پاگل ہو چکے ہو۔ اب مجھے آقا کو یہ بات بتانی پڑے گی کہ اس کا قیدی پاگل ہو گیا ہے۔''

''تمہارا آقا خود پاگل ہے۔'' میں نے کہا اور کالے حبشی نے منہ اوپر کر کے خوفناک قہقہہ لگایا۔ لیکن یہ قہقہہ بڑا عجیب تھا۔ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اونچا ہونے لگا اور سر پیچھے کی طرف ڈھلکنے لگا۔ وہ بھیانک آواز میں ہنسے جا رہا تھا اور اس کا چہرہ اٹھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا رخ چھت کی طرف ہو گیا۔ گردن ٹیڑھی ہو گئی اور قہقہہ کربناک کراہ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ گردن سیدھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہر مرتبہ جھٹکا کھا کر رہ جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اس کے سر کو پیچھے کی جانب جھکا رہا ہو۔ قہقہہ تو اب ختم ہو گیا تھا لیکن اس کی ہولناک چیخیں فضا کو لرزا رہی تھیں۔ میں حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتہً ہی اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔

''آقائی......'' لیکن اس طرح جیسے کوئی قے کر رہا ہو۔ وہ اتنی زور سے بکرے کی طرح چیخا تھا کہ جیسے کوئی آخری آواز نکال رہا ہو۔ اس کی آواز سن کر دو آدمی دوڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہشمان ذکری تھا۔ ہشمان ذکری نے آتے ہی دھاڑ کر کہا۔

''کیا ہوا؟'' اور پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اس کے چہرے کے نقوش تبدیل ہونے لگے۔ ''وہ کہاں گیا؟''

''پتہ نہیں آقا! یہیں تو تھا۔ اور یہ...... یہ اسے یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ ہشمان ذکری مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن اس طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کی نگاہوں ہی میں نہ آیا ہوں۔ وردان سادھانی کے الفاظ مجھے یاد آنے لگے۔ وہ جو کچھ کہہ کر گیا تھا وہ صرف ایک کہانی نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا کوئی خاص مقصد ہے۔ اور میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوں۔ وہ دونوں پہلے آنے والے حبشی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میں پوچھتا ہوں وہ کہاں گیا...... دیکھو کہاں گیا وہ؟''

''معلوم نہیں آقا! یہ تو اکیلا ہی نظر آ رہا ہے۔''

حبشی کی کیفیت تھوڑی سی بہتر ہوئی، اس کے پاؤں جیسے بے جان سے ہو گئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اپنا گلا سہلانے لگا۔ ہشمان ذکری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''کتے کے بچے! تو یہاں حلق پھاڑ رہا ہے۔ قیدی کہاں ہے؟''

''یہیں تھا آقا...... یہیں تھا۔ میں...... میں...... مر رہا ہوں۔ میرے حلق میں پھندا۔''

ہشمان ذکری نے شدید طیش کے عالم میں اس کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''کالے دیو! اگر تو اس سے بھی شکست کھا گیا تو تیرا یہ بدگوشت کس کام آئے گا۔ میں تجھے کیوں پالوں؟''

حبشی نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو گرتے گرتے بچا۔ وہ اپنے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون پونچھ رہا تھا۔ ہشمان ذکری نے پلٹ کر دوسرے آدمی سے کہا۔

''تم نے اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے؟''

''نہیں میرے آقا! یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔''

''حرام زادے، وہ ایک مرتبہ نکل چکا ہے۔ میرے سوال کا جواب دے۔'' ہشمان ذکری غصے سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

''ہم آپ کو یقین دلا رہے ہیں آقا کہ اس وقت وہ نہیں نکلا اور کم از کم دروازے سے نہیں نکلا۔ چھت پھاڑ کر نکل گیا ہو تو ہمیں پتہ نہیں۔''

''مجھ سے بدزبانی کرتے ہو کتو! تلاش کرو اسے، پکڑ کر لاؤ جہاں بھی ہو۔ ورنہ میں تمہیں چیتوں کے سامنے ڈلوا دوں گا۔ تکا بوٹی کرا دوں گا تمہاری۔ تکا بوٹی کرا دوں گا، سمجھے۔ جاؤ، نکل جاؤ۔ جاؤ، اسے تلاش کرو اگر زندگی چاہتے ہو۔ ورنہ جس موت تم مرو گے وہ تمہارے تصور سے بھی باہر ہو گی۔''

وہ سب باہر نکل گئے۔ ہشمان ذکری کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر اچانک ہی اس کی نظر کارنس پر پڑی۔ اس نے جھپٹ کر گلاس اٹھایا اور بڑبڑانے لگا۔

''یہ کہاں سے آ گیا؟''

اس نے ناک کے قریب لا کر اسے سونگھا اور پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ ''کہاں سے آیا...... ارے یہ کہاں سے آیا؟''

میں نے اس کے سامنے آنے کی خواہش دل میں کی اور اس سے کہا۔ ''یہ سری لنکا سے آیا ہے ہشمان ذکری!''

اس نے میری آواز سنی اور اچھل پڑا۔ گلاس سے شربت چھلک گیا۔ اس کے منہ سے خوفزدہ سی آواز نکلی۔ ''تم کہاں سے آ گئے؟''

''یہیں تھا میں، تمہارے سامنے۔ اب تم اندھے ہو گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہشمان ذکری، جب انسان کی بینائی ختم ہو جاتی ہے تو اسے یہ جان لینا چاہئے کہ اس کا وقت بھی قریب آ گیا ہے۔ تم تو مجھے ختم کر رہے تھے میری جان۔ اڑتالیس گھنٹے پورے ہو گئے ہیں اور جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے اس کا تمہیں اندازہ ہے۔ کھانا تو کھانا تم نے مجھے پانی تک نہیں دیا۔ یہ سلوک کسی کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اس کے جواب میں تمہارے ساتھ میں کیا کروں؟''

''تت...... تم...... تم کہاں...... تم کہاں غائب تھے میں نہیں سمجھ سکتا...... میں نہیں سمجھ سکتا۔'' وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ کو اِدھر سے اُدھر گردش دینے لگا۔ یوں لگ رہا تھا

جیسے اس کی عقل نے اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا ہو۔ پھر اس کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ وہ کبھی شربت کے گلاس کو دیکھتا تھا، کبھی مجھے۔ میں آگے بڑھا اور میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر کارنس پر رکھ دیا۔ پھر میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''میری جان! چلو، اڑتالیس گھنٹے پورے ہو چکے ہیں۔ پستول نکالو اور اپنا حساب پورا کرلو مجھ سے۔''

ہشمان ذکری بدستور کانپ رہا تھا۔ غالباً اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''نہیں، نہیں...... بہت بڑے آدمی ہو تم ہشمان ذکری۔ یہاں نہیں، ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔ آؤ ذرا۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

''ہاں، اب تم یہ بتاؤ۔ مگر نہیں، تمہارا ایک احسان ضرور ہے مجھ پر۔ وہ یہ کہ تم نے اپنی بات منوانے کے لئے مجھ پر کوئی تشدد نہیں کیا۔ ورنہ ہشمان ذکری، اس وقت میں تمہیں تمہارے ہی اس محل میں زندہ دفن کر دیتا سمجھے۔ اور میں ایسا کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔ کیا تم اس بات کو تسلیم نہیں کرو گے؟''

میرے ان الفاظ پر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاں خاقان! میں نے واقعی تمہارے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا جس سے تمہیں جسمانی اذیت پہنچتی اور مجھے اس بات کی خوشی ہے۔ ویسے تم یقین کرو میں تمہارا دشمن بھی نہیں ہوں۔ حالانکہ تم نے مجھے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ میرا مقصد تو صرف......''

''صرف تخت حاصل کرنا تھا، کیوں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں واقعی۔''

''تم نے مجھ پر قاتلانہ حملے بھی نہیں کرائے؟''

''کرائے تھے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ لیکن اس کے لئے تم مجھے معاف کر دو۔''

''ارے تمہارے رویے میں یہ تبدیلی کیسے واقع ہو گئی؟''

''نہیں...... میں یہ بات نہیں جانتا تھا۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ تم پراسرار قوتوں کے مالک ہو۔ میں تو تمہیں ایک عام سا آدمی سمجھا تھا۔

میرے اور تمہارے درمیان تو بہت ہی معمولی سی لڑائی تھی۔ مجھے تو بس کیا بتاؤں تمہیں، ذاکر قباشی...... ذاکر قباشی نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا تھا ایک عجیب و غریب کہانی کے ساتھ۔''

''ارے ہاں، تم سے تو مجھے اور بھی بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کہتے ہو تم؟''

''شکست قبول کرتا ہوں اپنی۔ مکمل شکست۔''

''کون سی شکست؟ ہم کون سی سلطنت کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں ذکری؟''

''تم یقین کرو، وہ بھی ایک سلطنت تھی خاقان!'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے اشارہ کر کے کہا۔

''نہیں، بیٹھو بیٹھو...... کون سی سلطنت کی بات کرتے ہو تم؟ ایک بات بتاؤں، وہ سلطنت جس کی طرف تمہارا اشارہ ہے میرے پاس نہیں ہے۔ کیا تم میری اس بات پر یقین کرو گے کہ میں آج بھی اسی طرح قلاش ہوں اور مجھے اس کی بالکل پرواہ نہیں ہے۔''

''مجھے اٹھنے دو۔ اب میں تم سے دوسری زبان میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''سنو خاقان! میں اپنی آدھی دولت تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔ اب تم خود کو امیر آدمی سمجھو۔ یہاں کا مکمل جائزہ لے لیا ہے تم نے۔ میری کنیزوں میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو اسے اپنی تحویل میں لے لو۔''

''یہ سب کچھ میرے لئے بے معنی ہے ہشمان ذکری! چونکہ میں تو پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہارا سب کچھ میرا ہی ہے۔ تمہاری اس وقت پیشکش کا مطلب تو یہ ہے کہ تم آدھی دولت بچانا چاہتے ہو۔ رہیں تمہاری کنیزیں، وہ مجھ جیسے خانہ بر انداز شخص کے لئے نہیں، محلوں والوں کے لئے ہوتی ہیں۔ اس لئے تمہاری پیشکش تو ایک مذاق ہے۔''

''سنو...... ایسی باتیں مت کرو۔ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ میں تمہیں قاہرہ میں ایک ایسا عالی شان محل دوں گا کہ تم تصور بھی نہ کر سکو۔ یا پھر اپنے وطن جا کر کچھ لینا چاہتے ہو تو بمبئی میں تمہارے لئے ایسی رہائش گاہ دوں گا جو وہاں کے رئیسوں کے پاس بھی نہیں ہو گی۔ میرے اختیار اس سے بھی وسیع ہیں، دنیا کے ہر گوشے میں، میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔''

''ہندوستان...... کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ وہاں بھی مجھ پر قتل کے کئی مقدمے

ہیں۔ کیا سمجھے؟"

"ایسی باتیں مت کرو۔ بھلا تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ تم نگاہوں سے غائب ہو سکتے ہو، اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں میں۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس نجانے کون کون سی قوتیں ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ تم اب تک اس طرح کی کوششیں کیوں کرتے رہے ہو؟ اگر امینہ تمہیں پسند تھی تو تم نے اسے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

میرے ذہن میں ایک بار پھر امینہ کا تصور ابھر آیا۔ دفعتہً ہی وہ چونک کر بولا۔

"ایک بات بتاؤ۔ بتاؤ گے مجھے؟"

"ہاں ہاں، پوچھو۔"

"کیا تمہارے اندر پیدا ہو جانے والی یہ قوتیں اس پراسرار تختی کا کرشمہ تو نہیں ہیں؟ میرے ذہن میں یہی بات آتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے تم اس قدر قوتوں کے مالک نہیں تھے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا، پھر میرا ہاتھ تھام کر گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا۔ "خاقان! معاف کر دو مجھے۔ بس تمہیں خدا کا واسطہ دے سکتا ہوں، معاف کر دو مجھے۔"

میرے دل و دماغ پر اس وقت جو کچھ بیت رہی تھی، میرا دل ہی جانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امینہ کی موت میرے لئے ایک گہرے صدمے کا باعث تھی۔ یہ قوت جو مجھے حاصل ہو گئی تھی میں نہیں جانتا تھا کہ کس طرح ہوئی تھی۔ اگر واقعی کچھ وقت پہلے ایسا ہوتا تو شاید امینہ میری زندگی سے دور نہ ہوتی۔ ایک بار پھر کرنل صغیر کی بیٹی کا خیال آ گیا۔ یہ کلاڈیا آخر کیا ہے..... آہ، کیسی کیسی انوکھی قوتیں میرے پیچھے لگی ہوئی ہیں، مجھے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔"

"کیا سوچ رہے ہو خاقان! کیا سوچ رہے ہو؟" ہشمان ذکری کی آواز پھر ابھری۔

"ہشمان ذکری! میری تم سے دشمنی شاید ختم ہو گئی ہے۔ اگر تم میری جانب اس طرح دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو تو میں بھی انسان ہی ہوں۔"

ہشمان کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے اٹھ کر بے اختیار میری پیشانی چومی اور مسکرا کر بولا۔ "آج سے تم میرے مہمان ہو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہو گا۔"

"نہیں ہشمان، یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے اب چلنا ہے۔"

"براہِ کرم! میرے ساتھ ناشتہ کرو، میں تم سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور دوسری بات یہ کہ آخر جا کہاں رہے ہو۔ تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔"

"اس وقت مجھے جانا ہے۔"

"پھر بھی آؤ....."

اس کی ضد پر میں خاموش ہو گیا۔ وہ صحن میں آتے ہوئے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ برآمدہ عبور کر کے اس کے کمرے کے سامنے پہنچے تو پہریدار نے سلام کیا اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہوتے ہشمان نے اس سے کچھ کہا اور دروازہ بند کر کے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں پہلے بھی اس کمرے میں آ چکا ہوں۔"

ہشمان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہاں..... لیکن براہِ کرم ان باتوں کو بھلا دو۔ پہلے ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اب....."

"ہشمان، ہو سکتا ہے میرا دوست ہونے کے باعث تمہیں نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ ویسے ہماری دوستی کے کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ مثلاً یہ کہ ہمیں ایک دوسرے کے ذاتی مشاغل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا ہو گا۔"

"تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی سی الماری کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اس پر نگاہ رکھی۔ اس نے الماری سے پستول نکالا تھا اور جب وہ پستول لے کر صوفے کی طرف مڑا تو میں اس کے پیچھے مسہری کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے گھوم کر صوفے کی طرف دیکھا، ایک لمحے کے لئے مجھے نہ پا کر اس کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر مجھے اپنے پاس دیکھ کر وہ ہنس دیا۔ پستول اس نے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں خاقان! واقعی اتنی جلدی کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمہارا پستول ہے جو میں تمہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے آگے بڑھ کر پستول اٹھایا اور اس کا چیمبر چیک کر کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا نہیں تمہارا ہے۔"

''کبھی تھا، اب نہیں ہے۔ اب تمہارا ہے، اسے جیب میں رکھو۔''

میں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ہشمان کے اشارے پر ایک بہترین ناشتہ ہمارے سامنے آیا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا اور پھر میں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے ہشمان! اب میں چلتا ہوں۔''

''کہاں جاؤ گے...... مجھے بتاؤ؟''

''پتہ نہیں کہاں جاؤں گا۔ یوں سمجھو کہ آزادی کا جشن منانا ہے۔ اسکندریہ کی سیر کرنی ہے اور بس، میرا خیال ہے اور کچھ نہیں۔''

وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''آزادی کا جشن شام کو منائیں گے۔ اس وقت سیر کر آؤ۔ میں تمہیں جانے سے نہ روکوں گا۔ لیکن کچھ دیر تو رکو، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''کیا......؟''

''جو اب تک تم مجھ سے چھپاتے رہے ہو۔''

''گڈ...... جو میں تم سے چھپاتا رہا ہوں، وہ تم مجھے بتاؤ گے؟'' میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں جو کچھ تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ تمہارے لئے بہت دلکش ہوگا۔ باہر میری کار کھڑی ہے، وہ لے جاؤ اور جس ہسپتال کا تمہیں پتہ بتا رہا ہوں وہاں چلے جاؤ۔ شعبۂ حادثات میں تمہیں میرے ان الفاظ کا جواب مل جائے گا۔''

''تمہاری باتیں پراسرار ہیں۔ غالباً تم مجھے میری پراسرار طاقتوں کا جواب دینا چاہتے ہو۔''

''نہیں میرے دوست! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہسپتال میں دو افراد داخل ہیں۔ ان میں ایک کا نام امینہ ہے اور دوسرا ایک ٹیکسی ڈرائیور۔''

میں اچھل پڑا تھا...... میری نگاہیں بے یقینی کے انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر میں نے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''کیا خیال ہے، دوستی کے جواب میں یہ ایک اچھا تحفہ نہیں ہے؟''

''مجھے ایک بات بتاؤ ہشمان! کیا یہ مذاق ہے؟''

''نہیں، اب جبکہ میں تمہیں بھائیوں کی مانند سمجھنے لگا ہوں تو ایسی باتیں مذاق میں نہیں کہہ سکتا جن سے تمہارا دلی رابطہ ہے۔''

''کیا وہ دونوں زندہ ہیں؟''

''ہاں، اور اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ بچ جائیں۔'' خوشی کی ایک لہر میرے سارے وجود میں گردش کرنے لگی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو واقعی یہ میرے لئے سب سے بڑی خوشخبری ہے۔''

''کچھ وقت توقف کر لو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ بے فکر رہو، میں امینہ کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہوش میں آ گئی ہو گی۔''

''تب میں تمہارا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہوں ہشمان!''

''ایک منٹ رکو۔'' اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک بٹن دبایا اور دوسرے لمحے پہریدار نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ''گاڑی نکالو۔''

''آقا......'' پہرے دار نے گردن خم کی اور دروازہ بند کر کے چل دیا۔ ہشمان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، پھر بولا۔

''اور خاقان! اب میری سمجھ میں آیا۔ تمہارے زندگی سے بیزار ہونے کا سبب امینہ کو حادثہ پیش آ جانا تھا۔ ویسے ایک سوال کروں، کیا تم اس وقت اسی کی تلاش میں جا رہے تھے؟''

''ہاں، میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میں جائے حادثہ پر جا کر کم از کم یہ تو دیکھوں کہ ان لوگوں کا حشر کیا ہوا۔ ویسے یہ سچ ہے کہ اس وقت یہاں اسکندریہ میں ان دونوں کے سوا میرا اور کوئی نہیں ہے۔ ویسے مجھے حیرت ہے وہ اتنی گہرائی میں چلے گئے تھے اور ان کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا تو پھر وہ بچ کیسے گئے؟''

''خوش قسمت تھے دونوں۔ ٹیکسی سوفٹ نیچے جانے کے بعد ایک درخت کے تنے اور شاخوں میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ کچھ گڈریوں نے اسے دیکھا اور نزدیک کے قریے سے لوگوں کو اکٹھا کر کے ان دونوں کو گاڑی سے نکال لیا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے، انہیں زیادہ چوٹیں بھی نہیں آئی ہیں۔ لیکن بہرحال وقت کو ان کی زندگی بچانا مقصود تھی۔ اگر ٹیکسی نیچے چلی جاتی تو بہرحال ان کا قیمہ ہی نکالنا پڑتا۔ درخت میں اڑ جانے کی وجہ سے اس میں آگ بھی نہیں لگی۔ ویسے ایک بات تم مجھے بتاؤ، تم اس سے کس طرح نکل آئے؟''

''بس گاڑی ٹکراتے ہی میں نے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہی زندگی کا معاملہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

"ویسے میرے لئے یہ حیران کن بات ہے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ تم نے ایمنہ کو چھوڑ کر بچنے کی خود کوشش کی۔ میرا خیال اس سلسلے میں کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سوال کیا اور وہ پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

"چلو پھر بتاؤں گا۔ آؤ چلیں، گاڑی آ گئی ہو گی۔ میرا مطلب ہے ڈرائیور نے سامنے لگا دی ہو گی۔ ویسے تو وہ یہیں موجود تھی۔"

میں ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا، پھر میں نے کہا۔ "ہشمان، تم میرے ساتھ نہ آؤ تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟" اس نے سوال کیا اور پھر اچانک وہ گھوما اور الماری کی جانب چل پڑا۔ میں دروازے کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے الماری کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور پھر میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"میں ہر طرح تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔ یہ اپنے پاس رکھ لو اور میرے ڈرائیور کو لے کر چلے جاؤ۔ لیکن شام کو میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"مجھے ان نوٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں، پلیز...... کم از کم اس حد تک مجھے خدمت کا موقع دو۔"

"ٹھیک ہے، بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور نوٹ اس سے لے لئے۔ اس نے پہریدار کو کچھ ہدایات دے کر میرے ساتھ بھیج دیا۔ ڈیوڑھی سے آگے نکلا تو باوردی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور دروازہ کھول دیا پھر اس کے بعد میں گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا تھا۔

شاندار ہسپتال کے شعبہ حادثات میں ایک خاتون اور اس مرد کے بارے میں معلوم کیا اور ہمیں گائیڈ کیا گیا۔ پھر چند لمحات کے بعد ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازے پر ایک نرس نے ہمیں ریسیو کیا اور جب ہم نے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"وہ دونوں زخمی ابھی تک آکسیجن فلیٹ میں ہیں اور ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"ہم انہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"آیئے۔" نرس ہمیں لے کر اندر آئی اور ایک بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "یہ ہے مریض لڑکی۔"

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا، ایمنہ ٹرانس پیرنٹ پلاسٹک میں ملبوس تھی، اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، سانس کے ساتھ سینے کے اتار چڑھاؤ سے باقاعدگی کا احساس ہوتا تھا۔ میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ آخر کار ایک ڈاکٹر کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔

"سر! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ہاں۔"

ڈاکٹر نے نرس کو نوٹ کرنے کو کہا اور وہ میز سے رجسٹر اٹھا لائی۔ ڈاکٹر نے سوالات کرنا شروع کر دیئے اور میں جوابات دیتا رہا۔ نرس لکھتی رہی۔ یہ تمام خانہ پری کرنے کے بعد وہ مجھے ڈرائیور کے بستر کے قریب لے گئے۔ وہ بھی اسی حالت میں تھا۔ میں اس بہترین انسان کو دیکھتا رہا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر وقت نے میرا ساتھ دیا تو اس اچھے دوست کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

بہرحال میں نے ڈاکٹر کو تمام تفصیلات نوٹ کرائیں اور اس کے بعد اسے ہدایت دی کہ جیسے ہی یہ دونوں ہوش میں آئیں یا ان میں سے کوئی ایک ہوش میں آئے تو ہشمان ذکری کے نمبر پر فوراً اطلاع دی جائے۔ ڈاکٹر ہشمان ذکری کے نام پر الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے گردن خم کر کے کہا۔

"بہتر جناب۔"

پھر میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ بہرحال مجھے اور بھی کچھ کام کرنے تھے۔ دوپہر کو میں نے باہر ہی کھانا کھایا اور پھر اس ٹیکسی سے اندر پہنچ گیا جہاں سے میں نے ڈرائیور کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ حارث کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی۔ میں الجھن میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈرائیور نے کہا۔

"سر اصل میں چونکہ آپ عربی سے ناواقف ہیں، لوگ آپ کو غیر ملکی سمجھ کر کچھ گھبرا جاتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر کوئی کچھ جانتا بھی ہے تو آپ کو کچھ بتاتا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا، کیا جائے؟"

"میں اس سلسلے میں آپ کی کسی نہ کسی طرح مدد کروں گا۔"

بہرحال شام کو پانچ بجے کے قریب میں واپس آ گیا۔ جب میں ذکری کی رہائش گا
پر پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔
”ہسپتال جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”بس مجھے وہیں جانا ہے۔“
”اگر اجازت دو تو میں بھی چلوں؟“
”ٹھیک ہے، مرضی ہے۔“ میں نے اس وقت لاپرواہی سے کہا۔ ہشمان ذکری اب
بالکل موم محسوس ہونے لگا تھا۔ ہم دونوں ہسپتال روانہ ہو گئے۔ راستے میں اس نے کہا۔
”اصل میں ہسپتال سے میرا رابطہ قائم ہوا ہے۔ میں نے ڈاکٹروں سے ان کے
بارے میں پوچھا تھا۔ پہلے ڈاکٹروں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ان کی چوٹیں شدید نہیں ہیں
اور اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ بچ جائیں۔ لیکن اب......“
”اب کیا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
”اصل میں انہیں مکمل طور سے ہوش نہیں آیا۔ اور ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ مسلسل بے
ہوشی کافی خطرناک ہو سکتی ہے۔“
میں نے گہری سانس لی پھر آہستہ سے کہا۔ ”میری دلی خواہش ہے کہ وہ دونوں بچ
جائیں۔ لیکن بہرحال دیکھ لیں گے۔ کیا، کیا جا سکتا ہے؟“
کچھ دیر کے بعد ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ میں نے ڈرائیور کے پاس کسی شخص کو بیٹھے
ہوئے دیکھا، یہ شخص حارث کا ہم شکل تھا۔ وہ اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔
”آپ شاید مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے، مجھے ٹیکسی اسٹینڈ سے معلوم ہوا۔ میں
حارث کی تلاش میں پریشان پھر رہا تھا کہ مجھے اس طرح کی اطلاع ملی اور پھر آپ کے
ڈرائیور نے مجھے اس ہسپتال کے بارے میں بتایا۔“
”اوہ......تم کون ہو؟“
”میں حارث کا بھائی ہوں۔ میں نے تفصیلات معلوم کی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ
کی بیگم چند منٹ کے لئے ہوش میں آئی تھیں۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ مسٹر برک آپ کو
دیکھنے آئے تھے اور ہم انہیں پھر بلا رہے ہیں۔“
”پھر......؟“ میں نے بے تابی سے کہا۔
”وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش میں آئی تھیں، مسکرائیں اور پھر کچھ کہا بھی تھا انہوں نے

لیکن سنا نہ جا سکا۔ اس کے بعد وہ پھر بے ہوش ہو گئیں۔“
”اور حارث...... کیا وہ بالکل ہوش میں نہیں آیا؟“
”ہاں...... وہ ہوش میں نہیں آیا۔“ اس کے بھائی نے غمزدہ لہجے میں کہا۔
”اب تم یہاں آ گئے ہو تو یہیں رکنا اور اس کی نگرانی کرنا۔ اخراجات کی بالکل پرواہ
نہ کرو۔ یہ کچھ نوٹ رکھ لو۔“ میں نے خاصی بڑی رقم اسے دی اور وہ ممنون نگاہوں سے
مجھے دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔
”حارث میرا دوست ہے اور میں اس کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔ تم
یہاں رکو۔“ اس کے بعد میں امینہ کے پاس آ گیا۔ جب میں امینہ کے بستر کی طرف جا رہا
تھا تو ہشمان ذکری نے کہا۔
”میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہوش میں آ جائے۔“
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر امینہ کی نگرانی کر رہے تھے۔
انہیں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا تعلق کسی طرح ہشمان ذکری سے ہے۔ بہت
دیر تک میں امینہ کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے چہرے پر زندگی تھی لیکن لگ رہا تھا کہ وہ ابھی
ہوش میں نہیں آئے گی۔ اور پھر ہم واپس لوٹ آئے۔
نجانے کیوں میرے دل پر اُداسی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ امید و بیم کی یہ کیفیت
کس قدر روح فرسا ہوتی ہے یہ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ بہرحال ہشمان ذکری کے
انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ میرا غلام بن چکا ہو۔ پتہ نہیں کم بخت واقعی مخلص
ہو چکا تھا یا پھر یہ بھی اس کی کوئی چال تھی۔ کیونکہ بہرحال وہ پراسرار تختی اسے دستیاب
نہیں ہو سکی تھی جس نے واقعی ایک عجیب و غریب جال پھیلا دیا تھا۔
کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل ہوئی اور پھر اسی رات ساڑھے بارہ بجے ہسپتال
سے اطلاع ملی کہ امینہ کا انتقال ہو گیا ہے...... میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ بلاوجہ یہ اتنا
وقت اس انداز میں گزرا۔ یہ کام پہلے ہی ہو جاتا تو اچھا تھا، اس وقت جب ان دونوں کی
گاڑی گہرائیوں میں گری تھی۔
ہشمان ذکری چند آدمیوں کے ساتھ مجھے لے کر ہسپتال پہنچا۔ لاش حاصل کر کے اس
کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور دوسرے دن گیارہ بجے اسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پھر اسی
شام میں حارث کے گھر پہنچا اور اس کے اہل و عیال کو خاصی رقم دی تا کہ اس کا علاج بھی

ہو سکے اور اس کی دیکھ بھال بھی۔

ہشمان ذکری کے ہاں چار پانچ دن گزارے۔ ہشمان ذکری نے اس دوران م
بڑی خاطر مدارت کی حالانکہ امینہ اس کی محبوبہ تھی، اس کی ملکیت تھی لیکن اب وہ اس ط
مجھ سے تعزیت کرتا تھا جیسے امینہ میری منکوحہ ہو۔ میرے ذہن میں پچاسوں قسم کی سو
تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک بڑی حیران کن بات یہ تھ
جہاز پر میں نے دیکھا تھا کہ ہشمان ذکری بڑی چابک دستی سے ہیگ کا سارا سامان
پر لاد کر لے گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اسکندریہ کا میئر بتایا تھا۔ بہت بڑا رسک
تھا اس نے۔ لیکن اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان سے ہیگ یا پھر ان لوگوں کے
کے مطابق ذاکر قباشی بالکل ہی اسکرین آؤٹ ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اس کے بار
میں ہشمان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ابھی تک تختی کا معاملہ بھی زیر بحث تھا اور ہش
نے شاید خود جان بوجھ کر ہیگ یا ذاکر قباشی کے معاملات میں الجھنے کی کوشش نہیں ک
اور اس وقت میرا دوست بنا ہوا تھا۔ جب میں نے اس سے رخصت مانگی تو اس و
اس کا پارٹنر بداخشانی بھی موجود تھا۔ بداخشانی سے میری ملاقات ہشمان کے ساتھ
ہوئی تھی۔ اب ہشمان نے اسے میرے بارے میں بتایا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا
اس وقت جب میں نے اس سے اجازت مانگی تو وہ بولا۔

”کہاں جاؤ گے خاقان جمشیدی؟“

”میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

”کیا ہندوستان؟“

”میں نے کہا نا کچھ بھی طے نہیں کیا میں نے ابھی تک۔“

”ایک بات بتاؤ، اگر تم انگلینڈ جانا چاہو تو میں تمہیں بھجوا سکتا ہوں۔“

”کیا میرے کاغذات بن سکتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں موجود ہوں نا۔ کاغذات کی کیا ضرورت ہے۔ تم اسی طرح انگلینڈ بھی جا
ہو جس طرح بمبئی سے یہاں تک آئے ہو۔ پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ کا خیال
سے نکال دو۔ اس میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔“

میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اب دنیا
کوئی ملک ایسا نہیں رہا جہاں کی شہریت مجھے مل سکے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ ہنس کر بولا۔

”واقعی ہم جیسے لوگوں کے لئے کم از کم یہ پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ بے کار چیزیں ہیں مسٹر خاقان! یہ ہمارے پاس ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”بڑا فرق پڑتا ہے مائی ڈیئر! جرائم پیشہ لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں کے حقوقِ شہریت حاصل ہوتے ہیں۔ انسان خانہ بدوش ہو کر زندہ رہ سکتا ہے، بے وطن ہو کر نہیں۔“

”اپنے اپنے نظریات ہیں، بات اصل میں یہ ہے کہ اسی کا گھر ہے تمام دنیا جس کا دنیا میں کوئی گھر نہیں ہے۔“

”کاغذ پر یہ باتیں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ قیامِ تہذیب اور تشکیل معاشرہ سے پہلے واقعی گھر کوئی مسئلہ نہیں تھا میرے دوست! اس وقت وطن کا تصور بھی نہیں تھا۔ لیکن اس وقت جغرافیائی حدود قائم ہو چکی ہیں۔ انسان طبقوں اور علاقوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اب زندہ رہنے کے لئے عمر خیام یا غالب کا دیوان نہیں، ڈومیسائل سرٹیفکیٹ چاہئے ہوتا ہے۔ سرحدیں عبور کرنے کے لئے سقراط کے اقوالِ زریں نہیں، انٹرنیشنل پاسپورٹ درکار ہوتا ہے۔“

”لیکن ایک بڑی عجیب بات ہے، انسان کو جو ملتا ہے وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ آخر ہر شخص خلاؤں میں دیکھنے کا عادی کیوں ہوتا ہے؟“

”مطلب؟“ میں نے سوال کیا۔

”اسکندریہ بھی تو بری جگہ نہیں ہے۔ یہ پورا محل پڑا ہوا ہے۔ اور یہی نہیں، ہر چیز نہارے لئے موجود ہے۔ یہاں رہو۔“

میں ہنس دیا۔ میں نے کہا۔ ”تم کب تک میری زندگی کا ٹیکس ادا کرتے رہو گے اور کیوں؟“

”ویسے میں ایک بات بتاؤں مسٹر خاقان جمشیدی! ہشمان ذکری نے جو کچھ تمہارے رے میں کہا اگر وہ سچ ہے تو تم دنیا کی تمام حکومتوں سے خراج وصول کر سکتے ہو۔ تم ٹمان ذکری جیسے ہزاروں آدمیوں کو نوکر رکھ سکتے ہو۔ مصر بے شک ایک پراسرار زمین ہے اور اس پراسرار سرزمین پر تم جیسے پراسرار لوگ حکمرانی کر سکتے ہیں۔“

”بات اصل میں یہ ہے میرے دوست بدخشانی! کہ ہشمان ذکری میری طرف سے ت زیادہ غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔“

"اب ایسا نہ کہو۔ تمہاری بے پناہ طاقت میرے علم میں ہے اور میں اس سے بری طرح مرعوب ہوں۔ ورنہ آج میں تمہیں اپنے بارے میں سچ بتا رہا ہوں کہ زندگی میں کسی سے مرعوب ہونا تو میں نے سیکھا ہی نہیں۔"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔"

"بالکل۔ میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ یوں کرو فی الحال تم کچھ دن کے لئے باہر ہو آؤ۔"

وہ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ بدخشانی نے کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو خاقان! میں اگلے ہفتے دو تین مہینے کے لئے اسکندریہ سے باہر جا رہا ہوں۔ ویسے تمہاری دعا سے تمہارا یہ دوست بھی بالکل بے دست و پا نہیں ہے۔ جہاں تم کہو گے وہیں میں تمہارے قیام و طعام کا بندوبست کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔" میں نے ذہنی تھکن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ بہرحال یہاں سے کہیں نہ کہیں تو نکلنا ہی تھا۔ یہاں رُک کے رہنے کا کوئی خاص جواز بھی نہیں تھا۔ ادھر ہشمان ذکری نے مخلص دوست کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے میرے لئے بہت سے سوٹ سلوائے۔ ریشمی قمیصیں، ٹائیاں، جوتے اور دوسری ضروری چیزیں، بہت ہی خوبصورت قسم کا ایک بریف کیس اور ہولڈال اور اٹیچی کیس وغیرہ فراہم کیے اور مسلسل میرے لئے خریداری کرتا رہا۔ اس کی ان کوششوں سے مجھے سلطان چچا یاد آ گئے تھے۔ ماضی کی تو ساری کہانی ہی عجیب تھی۔ میرے لئے نجانے کیا کچھ کرنے والے بہت سے لوگ تھے جبکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ میری ذات کسی کے لئے بھی اس طرح فائدہ مند نہیں ہے کہ وہ میرے لئے اتنا کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

عجیب پراسرار کہانی زندگی سے لپٹ گئی تھی۔ حالانکہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو میں بھی سیتا گڑھی کا ایک معزز انسان اور معزز زمیندار ہوتا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ورثے میں چونکہ حسن پرستی ملی تھی اس لئے حسن پرست بھی ہوتا۔ لیکن چونکہ فطری طور پر برے ذہن کا انسان نہیں تھا اس لئے یہ حسن پرستی بے ضرر ہوتی۔ کوئی نہ کوئی زندگی میں شامل ہو جاتا۔ کبھی زندگی میں شامل ہونے والے کا تصور کرتا تو عجیب و غریب شکلیں ذہن میں ناچنے لگتی تھیں۔

بہرحال ہشمان ذکری بڑی مہربانیاں کر رہا تھا اور اس کا انداز دیکھ کر کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کچھ ہی دن پہلے ہم ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے۔ میں سب سے زیادہ حیران اس بات پر ہوں کہ ان دنوں ہیگ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا۔ حالانکہ یہ ساری کہانی ہیگ ہی کے گرد گھومتی تھی۔ وردان سادھانی تو خیر ایک الگ کردار تھا، سیوک سندھورتی بھی میری زندگی سے بہت دور ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اور دوسرے بھی بہت سے کردار مثلاً ماشرہ جو ایک انتہائی پراسرار کردار تھا اور بھی بہت سے کردار جن کا تعلق گاشر برم سے تھا۔

بہرحال روانگی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اور پھر ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ ہم روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ ہشمان ذکری نے مجھے بہت سے نوٹ اور ٹریولر چیک دیتے ہوئے انگلینڈ میں مقیم چند دوستوں کے ایڈریس بھی دیئے۔ ایک بار پھر اس نے مجھے پاسپورٹ فراہم نہ کرنے کی معذرت کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ انگلینڈ اور جرمنی میں ناجائز طریقے سے داخل ہونے والوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک جگہیں ہیں۔ بہرحال میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اسی رات گیارہ بجے بدخشانی کی کار مجھے لینے آئی اور پھر کسی نامعلوم ساحل پر چھوڑ کر چلی گئی۔ یہاں بدخشانی میرا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑی لانچ لنگر انداز تھی۔ ایک چھوٹی کشتی میں میرا سامان بار کرانے کے بعد وہ مجھے لے کر لانچ کی طرف چل دیا اور ایک بار پھر سمندر میرے ہمرکاب تھا......!

***

رات کے تقریباً ایک بجے لانچ آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کیپٹن سے باتیں کرنے کے بعد بداخشانی مجھے اپنے کیبن میں لے آیا۔ یہاں دو تین صوفے، ایک ٹیبل اور ایک کیبنٹ، ایک بلٹین شیلف اور کاؤچ وغیرہ تھے۔ فرش پر انتہائی قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ چھت کے درمیان لیمپ سے خوشگوار روشنی اٹھ رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں دوست! مجھے یہ بتاؤ میں تمہاری اور کیا خدمت کروں؟''

''میں کیا بتاؤں؟'' میں نے کہا اور وہ مسکرا کر اٹھا۔ الماری سے رم کی بوتل اور دو گلاس لے کر واپس آیا۔ ایک گھنٹے تک ہم رم پیتے رہے۔ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر اس کیبن میں چھوڑ گیا جہاں میرے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے سامان پر نگاہ ڈالی اور کاؤچ پر دراز ہو گیا۔ بدخشانی شب بخیر کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ اور پھر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

صبح نو بجے کسی نے کیبن کا دروازہ بجایا۔ میں تھوڑی دیر پہلے جاگا تھا اور منہ ہاتھ دھو کر ٹوائلٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک نوجوان لڑکے نے جو دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے ہوئے تھا، مسکرا کر صبح بخیر کہا اور اندر داخل ہو کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ میں نے اس کے لہجے سے متاثر ہو کر غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم ایرانی ہو؟''

وہ چلتے چلتے رک کر بولا۔ ''بلے آغا۔''

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خوب...... کیا فرصت ملنے پر تم میرے پاس آ سکتے ہو؟''

اس نے جھک کر کہا۔ ''بسر و چشم، قربانت شوم۔''

میں نے چائے انڈیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''ضرور آؤ۔ میں ایران کے متعلق

تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ میں اس کے جملے پر غور کرنے لگا۔ آخر کار پہلی بار میری سمجھ میں آیا کہ فارسی زبان کی شیرینی کا راز الفاظ سے زیادہ فارسی بولنے والے لوگوں کے ان پُرخلوص جذبات میں منحصر ہے جن کا وہ اظہار کرتے ہیں۔

''میں تیرے قربان ہوں جاؤں۔'' ہر زبان میں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کہتا کون ہے، صرف ایرانی۔ ہاں ایرانی ہی الفاظ کا جادو جگانا جانتے ہیں۔ ایک معمولی نیم خانہ نوجوان پہلی ملاقات کے دو جملوں میں مجھے اس قدر متاثر کر کے چلا گیا تھا کہ میں نے اس کے متعلق، اس کی زبان کے متعلق اور پورے معاشرے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اسے جادو ہی کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال ان خیالات سے پیچھا چھڑا کر میں چائے کی طرف متوجہ ہوا اور پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ پھر اس کے بعد وقت بالکل تنہا ہی گزر رہا تھا اور ایک طرح سے نیم خوابی کی سی کیفیت طاری رہی تھی مجھ پر۔ دوپہر کو وہی لڑکا کھانا لے کر آیا اور بولا۔

''کھانا کھانے کے بعد آپ کو فرصت ہو گی آغا؟''

''ہاں بالکل۔ بلکہ اس وقت بھی فرصت ہے۔ تم چاہو تو بیٹھ جاؤ۔ میں کھانے کے دوران بھی تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے دروازہ بند کیا اور میرے نزدیک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کھانا کھاتے کھاتے اس کا نام پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

اس نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے خادم کو گوہر آفندی کہتے ہیں آغا۔''

میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ ''بداخشانی تمہارے ہم وطن ہیں شاید؟''

''جی، آپ کا خیال بالکل درست ہے آغا۔''

''ویسے یہ بداخشاں میں لعل نکلتا ہے۔ یہ سچ ہے یا محض افسانے؟''

''نہیں آغا، یہ سچ ہے۔ لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں بتاؤ، کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ شاید یہ کہ یہ لعل صرف چند لوگوں کی ملکیت ہوتے ہیں، عوام کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔''

"ہاں بالکل، میں یہی کہنا چاہتا تھا آغا! ہم تو صرف بداخشانی لعلوں کی کہانیاں ہی سنتے ہیں۔"

"صرف بداخشاں ایران ہی نہیں میرے دوست! تمام دنیا ہی ایسی ہے۔ انسان خود غرض ہے۔ چھوڑو، تم یہ بتاؤ لعل، یاقوت اور زمرد کی پہچان کر سکتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں، تھوڑا بہت پہچانتا ہوں آغا! لیکن زیادہ نہیں۔"

"ذرا یہ دیکھو۔" میں نے اپنا بایاں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا اور اس کی نگاہیں میرے ہاتھ پر جم گئیں۔ "میری انگوٹھی میں جو نگینہ ہے وہ دیکھو اصلی ہے یا نقلی؟"

اس نے میری انگوٹھی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آغا، آپ برا تو نہیں مان جائیں گے؟"

میں ہنس دیا۔ پھر اس نے غور سے انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آغا! یہ نقلی یاقوت ہے۔ اس کا تعلق انڈیا سے ہے۔ لیکن کہیں آپ نے اصل کی قیمت پر تو یہ نہیں خریدا؟"

"نہیں، یہ نقلی ہی ہے۔ نقلی ہی کی قیمت پر خریدا ہے۔ صرف معمولی سی قیمت کے عوض۔ واقعی تم جواہرات کی شناخت رکھتے ہو۔"

"شکریہ۔ مجھے نام یاد نہیں ہے ورنہ بتا سکتا ہوں کہ یہ نگینے کہاں تراشے جا سکتے ہیں۔"

"جے پور تو نہیں کہنا چاہتے تم؟"

"ہاں آغا! وہ بھی ایک جگہ ہے جہاں یہ صنعت ہے۔ لیکن آپ کا نگینہ وہاں کا نہیں ہے بلکہ بمبئی کے قریب ایک مسلمان ریاست کا ہے۔"

"کیمبے۔"

"شکریہ آغا! میں نام بھول گیا تھا۔"

"بڑی خوبیوں کے مالک ہو گوہر! اس عمر میں جواہرات کے بارے میں تمہاری معلومات کافی ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، کھانا اٹھاؤ۔ میں ہاتھ دھونے کے بعد تمہیں ایک اور نگینہ دکھاتا ہوں۔ اس کو پرکھ کر بتانا۔"

اس نے تمام پلیٹیں جمع کیں اور پلٹ کر نکل گیا۔ میں نے ٹوائلٹ میں جا کر ہاتھ تولیے سے پونچھے اور بیلٹ کھول کر اس کا زپ کھینچا۔ اپنے اور ذکری کے دیئے ہوئے ڈالر اور ٹریولر چیک نکال کر ایک طرف رکھے اور بیلٹ کے اندرونی پرس کا زپ کھینچا، پرس میں جواہرات کی بجائے چند مڑے تڑے کاغذوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں سناٹے میں آ

گیا..... تمام بیلٹ الٹ پلٹ کر جھک جھک کر دیکھے، جھٹک جھٹک کر دیکھا۔ کسی چیز کا نام و نشان نہیں تھا۔ جواہرات غائب ہو چکے تھے اور اب افسوس کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے تمام چیزیں بیلٹ میں ڈالیں اور زپ بند کر کے بیلٹ باندھتا ہوا باہر نکلا اور کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حرکت ہشمان ذکری کی تو نہیں ہو سکتی۔ جو شخص مجھ پر اتنا خرچ کر چکا ہو، وہ اتنا ذلیل کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے اتنی ہی مالیت کے جواہرات اڑا کر اپنی عزت اور شہرت کو خطرے میں ڈالنا تھا تو پھر اتنا بڑا آدمی ظاہر نہ کرتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنا نہیں گر سکتا۔ پھر.....؟

میں یہیں تک سوچنے پایا تھا کہ گوہر آفندی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

"بیٹھو گوہر، بیٹھو۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور شکریہ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ "آغا! آپ سے پہلے کسی نے میری اتنی عزت افزائی نہیں کی۔ آپ میرے تجربے میں پہلے بڑے آدمی ہیں جو خادم کو انسان کی حیثیت دے رہے ہیں۔"

"سگریٹ پیتے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں شکریہ۔"

"کیا بات ہے گوہر! انسان کی حیثیت حاصل کرنا پسند نہیں ہے کیا؟"

"آغا! آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کے ساتھ تھوڑی دیر باتیں کرنا ہی میری عزت افزائی ہے۔ ہاں، آپ مجھے کچھ دکھانا چاہتے تھے۔"

"ہاں..... لیکن اب شاید نہ دکھا سکوں۔"

"آپ کی مرضی۔ لیکن کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ جو کچھ میرے پاس تھا وہ ضائع ہو گیا۔"

"ضائع ہو گیا..... کیسے آغا؟"

"چھوڑو گوہر! مجھے ایران کے بڑے بڑے شہروں کے بارے میں بتاؤ۔"

"بتاؤں گا آغا! پہلے آپ مجھے یہ تو بتائیں وہ کیا چیز تھی جو ضائع ہو گئی؟"

"کچھ ہیرے، یاقوت اور زمرد وغیرہ تھے۔"

"یہ تو بڑی مالیت کے ہوں گے آغا۔"

"ہاں، مگر اب ان کا ذکر کرنا بیکار ہے۔"

"یہ تو بڑی افسوسناک بات ہے۔ آپ کو کسی پر شک ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور باہر نکل گیا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے بھی اسے دوبارہ بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب بدخشانی میرے پاس آیا اور بولا۔

"ایک بات بتاؤ خاقان جمشیدی! کیا واقعی تمہارے جواہرات چرا لئے گئے ہیں؟"

"اوہ......تو اس نے آپ کو بتا دیا؟"

"مجھے جواب دو۔"

"ہاں، ایسا ہوا ہے۔"

"اسکندریہ سے روانہ ہوتے وقت موجود تھے؟"

"یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں رکھے تھے؟"

"میری بیلٹ میں تھے۔"

"تمہیں یاد ہے رات کو تمہیں کیبن میں کس نے پہنچایا تھا؟"

"اندازہ نہیں ہے۔ مجھے رات کو زیادہ ہوش نہیں تھا۔"

یہ سنتے ہی وہ پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لیتا ہوا باہر عرشے پر آ گیا۔ میرا خیال تھا بدخشانی جواہرات کے سلسلے میں عملے کے افراد سے تحقیقات کرنے گیا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسے اطمینان سے کیبن میں بیٹھے دیکھا۔ وہ پائپ منہ میں لگائے ہاتھوں سے میز بجا رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں کئی منٹ تک اسے اس حالت میں دیکھتا رہا، آخر کار آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا جنگلے کے پاس پہنچ گیا اور سمندر کی لہروں پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کا منظر دیکھتا رہا۔ ہمیں اسکندریہ کا ساحل چھوڑے ہوئے تقریباً تیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ نامعلوم کتنا سفر طے کیا تھا ہم نے، کتنا سفر طے کرنا تھا۔ اس وقت ہمارے پورے اطراف میں پانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چاروں طرف حد نظر تک پانی ہی پانی یا پھر اوپر آسمان جس پر کہیں کہیں تارے نمودار ہونے لگے تھے اور تاریکی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں دیر تک جنگلا تھامے اس منظر میں کھویا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوا کے تیز جھونکوں میں خنکی بڑھنے لگی تو میں جنگلا چھوڑ کر کیبن کی طرف چل دیا۔ بدخشانی ابھی تک اپنے کیبن سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس کی لاپرواہی کو شدت سے محسوس کیا۔ اگر اس نے مجھ سے دریافت کرنے کی زحمت نہ کی ہوتی تو میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا تھا کہ اس بیچارے کو تو اس بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ وہ خود بڑھ کر تحقیقات کا آغاز کر چکا تھا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ ضرور مجھ سے کچھ نہ کچھ کہے گا۔

بہرحال کھانا کھانے کے بعد میں دیر تک جنگلے کے قریب ٹہلتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے واپس آیا تو بدخشانی میرے کاؤچ پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"خاقان! میں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کر لی لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"لعنت بھیجو دوست! جہنم میں جائیں۔ میری تقدیر میں ہی نہیں تھا۔ اگر تقدیر میں ہو گا تو اب بھی مل جائیں گے۔"

"کہاں سے مل جائیں گے؟ میرا خیال ہے وہ اسکندریہ سے باہر نہیں نکلے۔"

میں نے ہنس کر گردن ہلائی۔ "چھوڑو اس ذکر کو۔ پتھر کے چند ٹکڑوں کے کھونے یا پانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا لیکن پھر رک گیا۔ بدخشانی چونک کر بولا۔

"ہاں، تم کچھ کہہ رہے تھے۔"

"بس اتنا کہ میرے پاس ویسے بھی بہت کچھ ہے۔ ٹریولر چیک، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں دولت حاصل کرنا جانتا ہوں۔ صرف ساحل تک پہنچنے کی دیر ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ لیکن خاقان! کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے جواہرات کی چوری لانچ پر آنے کے بعد ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی یقین ہے کہ اسکندریہ میں نہیں ہوئی چونکہ میں ہشمان ذکری کے محل کے سوا کہیں گیا ہی نہیں۔"

وہ خاموش ہو کر ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ کو جھانکنے لگا۔ اسی وقت ایک لڑکا کافی کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا اور ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کافی کا پاٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ گوہر آفندی کہاں گیا؟"

"سونے چلا گیا ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے کافی پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "پیالی ایک ہی ہے بدخشانی، پہلے تم پی لو۔"

"ارے نہیں، تم لو۔ میں صرف اب ایک اول ٹین پیوں گا۔"

"او کے۔" میں نے کہا اور وہ شب بخیر کہہ کر باہر چلا گیا۔ میں نے اسے کیبن سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور سگریٹ کا دھواں باہر خارج کرتے ہوئے کافی کی چسکیاں لینے ہی لگا تھا کہ دفعتہً میرے بائیں پہلو سے ایک دبلا پتلا ہاتھ آگے بڑھا اور پیالی ہونٹوں سے دور ہوگئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا تو وردان سادھانی میرے پہلو میں کرسی کے اس طرف کھڑا تھا۔

"دھم راج۔" اس نے جھک کر کہا۔

"ارے تم؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"اس وقت؟"

"وجہ ہے۔"

"کیا؟"

"تم مہا سنکٹھ میں گھرے ہوئے ہو۔"

"کیا مطلب کیسا سنکٹھ؟"

"اس پیالی میں سنکھیا ملا ہوا ہے دھم راج! بدخشانی تمہیں زہر دے کر سمندر میں پھینکنا چاہتا ہے۔"

"کیا......؟" میرے پورے وجود میں ایک چھناکا سا ہوا۔ "اسے مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

"ایک منٹ۔" وردان سادھانی نے کہا اور جواب دینے کی بجائے پیالی اٹھائی اور کونے میں انڈیل دی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک سازش ہے دھم راج! ہشمان ذکری تم سے ڈرتا ہے اس لئے اس نے یہ چال چلی ہے۔"

"اوہ میرے خدا! اتنی گہری چال؟ اچھا ایک بات بتاؤ وردان۔"

"دھم راج پوچھیں۔"

"میرے ہیرے کہاں گئے؟"

"بدخشانی کے پاس ہیں۔ کل رات تم شراب کے نشے میں بے ہوش کر دیئے گئے تھے۔ اس نے ایک آدمی کی مدد سے انہیں تمہاری پیٹی میں سے نکلوا لیا۔"

"اس آدمی کا نام...... میرا مطلب ہے اس لڑکے کا نام گوہر آفندی تو نہیں ہے؟"

"نہیں، وہ اچھا لڑکا ہے اور تمہاری عزت کرتا ہے۔ تم اسے انعام اکرام دے کر اپنا بنا سکتے ہو۔ اچھا خیر چھوڑو، اب یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے تمہیں؟"

"میرا خیال ہے تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ بلکہ زندگی بچالی ہے تم نے میری۔"

"ایسا نہ کہیں دھم راج! آپ کی رکھشا تو ہمارا دھرم ہے۔ آپ کا جیون ہمارا جیون ہے۔ ہماری آنکھیں تو ہر وقت آپ کی طرف لگی رہتی ہیں۔"

"واقعی، تم ہمیشہ میرے ایک بہت اچھے ساتھی ثابت ہوئے ہو۔"

"دھم راج! آپ کی ماتر بھومی ہمیشہ آپ کو یاد کرتی رہتی ہے۔ آپ بلاوجہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کیا لینا ہے آپ کو یہاں۔ یم سدھو، سدھو پرماتما، بدن سدھو کا آپ کا وردان ہیں۔ وہ آپ کو ہر سمے یاد کرتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں بھٹکنے کی بجائے ان کے ساتھ اپنی منڈلی کیوں نہیں لگاتے؟"

"چلوں گا میں وہاں۔ لیکن ابھی نہیں۔ آج رات تو ایک چوہے کو پاتال کی یاترا کرنی ہے۔ تم بھی دیکھ لو تو اچھا ہے۔"

"نہیں مہاراج! جیون بتیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔" یہ کہہ کر وہ اچانک ہی شمع کی طرح گل ہوگیا۔ میں اس کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔

اس کے غائب ہونے کے بعد میں نے دروازے کا بولٹ چڑھایا اور پستول ہاتھ میں لے کر بستر پر دراز ہوگیا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ لانچ میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سمندر کی پُرشور موجیں اور انجن کی آواز ماحول کو متاثر کئے ہوئے تھی۔ میں بستر پر لیٹا نیند پر غالب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب نیند غالب آنے لگی تو میں نے بند ہوتی آنکھوں سے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر بستر سے اتر آیا۔ ٹوائلٹ میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور تولیے سے منہ پونچھتا ہوا

باہر نکل آیا۔ پھر پُر خیال انداز میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زہر دینے کے بعد اب تک بدخشانی یا اس کے آدمی کیوں نہیں آئے؟ لاش ٹھکانے لگانے کے لئے اس سے اچھا موقع اور وقت کون سا ہو سکتا ہے؟ میں دیر تک ان خیالات میں ڈوبا رہا۔ پھر میں نے بستر سے پستول اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ عرشے پر آتے ہی ہوا کے تیز جھونکوں نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور میدان خالی پا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بدخشانی کے کیبن پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے پورٹ ہول کے شیشے سے اندر کی طرف دیکھا، بدخشانی کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وہ کتاب پڑھ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں بدستور سگار دبا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا، پستول والا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر آہستہ سے کواڑ کھولا۔ ہلکی سی آواز ہوئی تو بدخشانی نے کتاب رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں اندر داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی بستر پر اٹھ بیٹھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"تم...... خاقان جمشیدی، اس وقت؟"

میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ "ہاں بدخشانی! میں۔ مجھے زندہ دیکھ کر تمہیں تعجب ہوا؟"

"کک...... کیا مطلب...... مم...... میں سمجھا نہیں؟"

"لو، تمہیں یہ بات سمجھانے کے لئے میرے پاس ایک آلہ موجود ہے۔" یہ کہہ کر میں نے پستول نکالا اور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ لرزتے ہوئے انداز میں اوپر اٹھ گئے تھے اور اس کے چہرے پر شدید خوف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"یہ...... یہ...... یہ کیا مذاق ہے خاقان؟"

"بالکل ویسا ہی مذاق جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔"

"مم...... میں نے؟"

"ہاں، کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ تم نے مجھے زہر پلایا، میں تمہیں پگھلا ہوا سیسہ پلا رہا ہوں۔"

"زہر...... مم...... میں، جھوٹ ہے یہ۔ بالکل جھوٹ ہے۔"

"نہیں جان! جھوٹ نہیں ہے۔ کیا سمجھے؟"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت میری نظر کیبن کی دیوار پر لٹکے ہوئے آئینے پر پڑی۔ میرے پیچھے چھ سات فٹ کے فاصلے پر دروازے میں ایک

آدمی کھڑا تھا۔ اچانک اس نے پستول سیدھا کر کے میرے سر کا نشانہ لیا اور میں پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ عین اسی لمحے اس نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ دھماکا ہوا اور گولی بدخشانی کی پیشانی میں لگی۔ اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اس دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور گولی چلانے والے کی ٹانگوں میں سر ڈال کر اسے پیچھے کی طرف ڈال دیا۔ وہ منہ کے بل کاؤچ پر گرا۔ اسپرنگ دار کشن میں لچک پیدا ہوئی اور وہ پلٹ کر کاؤچ کے دوسری طرف جا پڑا۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس پر حملہ کرنے کی بجائے دوڑ کر اپنے کیبن میں آیا۔ اندر آ کر میں نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔ اسی وقت باہر آدمی کے دوڑنے اور چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے اتارے اور سلیپنگ سوٹ پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد کیبن کے سامنے عرشے پر قدموں کی آہٹ ہوئی اور میری کیبن کا دروازہ بجایا جانے لگا۔ تین چار بار دستک سننے کے بعد میں نے اٹھ کر لائٹ جلائی اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ سامنے کیپٹن اور میٹ کھڑے ہوئے تھے میں نے حیرانی سے اسے دیکھا اور کہا۔

"خیریت کیپٹن! کیا صبح ہو گئی؟"

وہ دونوں غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر کیپٹن نے کہا۔ "آپ سو رہے تھے مسٹر برک؟"

"ظاہر ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ ابھی ٹھیک طرح سے صبح بھی نہیں ہوئی۔"

کیپٹن مجھے دیکھ کر چکرانے لگا، پھر بولا۔ "کیا آپ نے گولی چلنے کی آواز سنی؟"

"گولی؟" میں نے حیرت سے کہا اور اس نے میٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بورسیلو بکواس کرتا ہے۔ یہ اسی کا کام ہے۔"

"کیا آپ مجھے بتائیں گے نہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"آپ باہر آئیے پلیز، آغا بدخشانی کو کسی نے شوٹ کر دیا ہے۔" وہ غمگین لہجے میں بولا۔

"شوٹ؟" میں نے زبردست اداکاری کی۔

"ہاں۔ بورسیلو اس وقت کیبن میں ہے۔ اس کے پاس پستول ہے جس سے ایک فائر بھی کیا گیا ہے لیکن وہ جو کچھ کہتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"کیا کہہ رہا ہے وہ؟"

"بس میں کیا بتاؤں۔ وہ بدمعاش آپ کا نام لے رہا ہے۔"

"میرا نام؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔"

"مگر میں تو سو رہا تھا اور بدخشانی، وہ تو میرا عزیز ترین دوست ہے۔ کہاں گولی لگی اسے؟" میں نے بدخشانی کے کیبن کی طرف دوڑ لگائی اور دو قدم چل کر رکتے ہوئے کیپٹن سے کہا۔ "کیپٹن! آپ جس طرح سے چاہیں اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ میرا پستول بھی دیکھ لیجئے، وہ تکیے کے نیچے رکھا ہوا ہے۔"

"نہیں مسٹر برک! سوری، ہم سمجھ گئے، وہ آپ کو اس معاملے میں پھنسانا چاہتا ہے۔"

"بے حد شکریہ کیپٹن۔ لیکن براہ کرم آپ میرا پستول ضرور چیک کر لیجئے، میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔"

"او کے۔" کیپٹن نے میٹ کی طرف اشارہ کیا اور وہ میرے کیبن میں داخل ہو کر پستول نکال لایا۔ پستول اس نے کیپٹن کے ہاتھ میں دیا۔ کیپٹن نے پستول کی نالی سونگھی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مسٹر برک، اس پستول سے کوئی فائر نہیں کیا گیا۔"

یہ کہہ کر اس نے پستول میری جانب بڑھا دیا تو میں نے پستول اس کے ہاتھ سے لے کر میگزین کھولا، کارتوس نکال کر اسے دکھائے تو اس نے ایک بار پھر کہا۔ "مجھے یقین ہے، آپ اسے بند کر دیں۔"

میں نے میگزین بند کر دیا اور کیپٹن سے کہا۔ "کیپٹن! میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں جو میرا نام لیتا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر برک! یہاں اس جہاز پر ہم خود فیصلہ کر لیں گے۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ویسے یہ کارکین ہوتے ہی دغا باز ہیں۔"

"اس کا فیصلہ تو میں بھی کر چکا ہوتا کیپٹن، لیکن وہ مجھ پر کیونکر الزام لگا رہا ہے؟ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کوئی یہ کہے کہ میں نے اپنے خلاف بولنے کے خوف سے اسے ختم کر دیا۔ پھر بھی میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ بدخشانی کا قاتل سورج کی کرن نہ دیکھنے پائے۔ وہ میرا گہرا دوست تھا۔"

"وہ ہمارا باس تھا۔ اس لانچ کا مالک۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

بہرحال یہ میرے لئے کوئی انکشاف نہیں تھا۔ ہشمان ذکری نے مجھے اس کے حوالے اسی لئے کیا تھا۔ کیپٹن نے اپنی ٹوپی کو چھو کر رخصتی سلام کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں کچھ دیر کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا اور پھر واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ بدخشانی کا بدلا ہوا طرزِ عمل میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ سوچنے کی بات تھی آخر اس نے مجھے زہر دے کر مارنے کی کوشش کس لئے کی۔ کیا صرف جواہرات کے چوری ہو جانے کے خوف سے؟ لیکن یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ مجھے آسانی سے جھٹلا سکتا تھا۔ اس لانچ یا چھوٹے جہاز پر بھلا میری کیا چل سکتی تھی۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے گوہر آفندی نے یہ جواہرات اس کے پاس دیکھنے کے بعد ہی اس سے کہا ہو کہ آقائی برک کے جواہرات چوری ہو گئے ہیں۔ بہت دیر تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ زینے کے قریب ایک بیرا ہاتھ میں چائے کی ٹرے لئے ہوئے کیپٹن کے کیبن کی طرف جاتا ہوا نظر آیا تو میں نے اسے روک کر اس سے گوہر کے متعلق معلوم کیا۔

"آقائی! وہ کینٹین کے بغلی ہال میں سو رہا ہے۔ اگر آپ کو چائے درکار ہے تو میں آپ کے کیبن میں لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا اور زینہ اترنے لگا۔ پھر میں کینٹین کے بغلی ہال تک پہنچ گیا۔ یہاں تین چار میزوں پر خانساماں اور بیرے سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں گوہر کو تلاش کیا اور اسے جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی حیرت زدہ ہو گیا۔

"آقائی آپ......؟"

"ہاں گوہر، میرے لئے چائے لے کر میرے کیبن میں آ جاؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"ابھی لے کر آیا۔ کوئی خاص بات ہے آقائی؟"

"بہت اہم بات۔ تم جلدی آ جاؤ۔" میں نے اس سے کہا اور پھر زینہ چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ گوہر چائے لینے کے لئے چل پڑا تھا۔ بدخشانی کے کیبن میں اس وقت کئی آدمی موجود تھے اور بورسیلو سے انگریزی میں طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ میرے کانوں میں بس ایک ذرا سی باتیں پہنچیں۔ وہ کہنے لگا کہ بدخشانی پر برک نے پستول سے گولی چلائی تھی۔

یہاں رکنا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں اپنے کیبن کی طرف چل پڑا۔ اس کی غلط بیانی نے خود اسے مجرم بنا دیا تھا۔ اگر وہ حقیقت بتا دیتا تو شاید کیپٹن اس کی بات مان لیتا۔

تھوڑی دیر کے بعد گوہر آفندی چائے لے کر آ گیا اور میرے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

''فرمایئے آغا؟''

''دروازہ بند کر دو۔'' میں نے اسے اشارے سے کہا اور اس نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اپنی چائے بناتے ہوئے کہا۔ ''ایک افسوس ناک خبر ہے گوہر آفندی، آغا بدخشانی کو بورسیلو نے شوٹ کر دیا۔''

''کیا؟'' گوہر آفندی اچھل پڑا۔

''ہاں۔ آغا بدخشانی مر چکا ہے۔''

''مگر کب آغا؟''

''رات کو تقریباً دو بجے مجھے کیپٹن نے سوتے سے جگا کر بتایا۔''

''اوہو...... شاید اسی لئے اس وقت اس کے کیبن میں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ بس آغا، قدرت......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اس نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔''

''ایسا نہ سمجھئے آغا، بس یونہی۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی ہے گوہر۔ ویسے تم یقین کر لو، تم پہلے آدمی ہو جسے میں نے دوستی کے لئے پسند کیا تھا۔''

وہ شرمندہ ہو کر جھکتے ہوئے بولا۔ ''آغا! میں آپ کا خادم ہوں۔ لیکن اس جہاز کے قانون سے ڈرتا ہوں۔'' اس نے انگلی سے ٹریگر دبانے کا اشارہ کیا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آفندی! پہلے ساحلی شہر پر پہنچتے ہی میں اس لانچ کو چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم ان جرائم پیشہ افراد کے چنگل سے نکل کر شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ آنے کی پیشکش کرتا ہوں۔''

وہ آہستہ سے بولا۔ ''آغا! آپ میرا امتحان تو نہیں لے رہے؟''

''امتحان...... کیسا امتحان؟''

''یہی کہ میں اپنے آقاؤں سے کس حد تک وفادار ہوں؟''

میں نے چائے کی پیالی اٹھا کر چند گھونٹ لئے اور آہستہ سے بولا۔ ''جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔''

''ایک سوال کرنا چاہتا ہوں آقا! کیا آپ ان لوگوں کے شریک نہیں ہیں؟''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر بولا۔ ''شریک؟''

''ہاں۔''

''نہیں گوہر! میں ان میں سے کسی کا شریک کار تو کیا دوست بھی نہیں ہوں اور اسی لئے مجھے ایک دوست کی ضرورت ہے۔ بولو، کیا تم میرے دوست بننا پسند کرو گے؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''قربانت شوم۔ میں آپ کا خادم ہوں آغا! آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ اب آپ کو میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے جواہرات بدخشانی نے بورسیلو کے تعاون سے اڑائے تھے اور غالباً اسی وجہ سے بورسیلو نے......''

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟''

''میں نے شام کو بدخشانی کو چند یاقوت میز پر رکھے محدب شیشے سے معائنہ کرتے دیکھا تھا۔ جیسے ہی میں کیبن میں داخل ہوا اس نے ان پر کتاب رکھ دی لیکن میرے منہ سے نکل ہی گیا۔

''کیا یہ جواہرات آقائی برک کے ہیں آغا؟''

''اوہو، پھر تو وہ تم پر بگڑ گیا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں آغا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ بمشکل سنبھل کر بولا۔ برک کے جواہرات، کیا اس نے تم سے ایسا کہا ہے؟''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے چوری کے متعلق تو کچھ نہیں کہا آغا! لیکن اتنا ضرور کہا کہ ہاں وہ اپنے کھوئے ہوئے جواہرات تلاش کر رہے ہیں۔ اس پر وہ بولا کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ زیادہ بکواس مت کیا کرو۔''

''یہ تو تم نے بڑی غلطی کی تھی گوہر! خیر اب جواہرات کا ذکر نہ آئے ورنہ بدخشانی کے قتل کا الزام ہم پر آ جائے گا۔ اچھا اب ٹرے اٹھاؤ اور بدخشانی کے کیبن میں جا کر ذرا کی معلومات حاصل کرو اور مجھے بتاؤ۔ اگر ایک مرتبہ ہم یہاں سے بچ کر نکل گئے تو پھر

ہمارے سامنے دنیا پڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے آغا!" اس نے ٹرے اٹھائی اور سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ میں ایک بار بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ باہر عرشے پر لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ میں پڑا ستتا ر[ہا] یہاں تک کہ جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو کسی نے دروازہ بجایا۔ میں نے پستو[ل] سنبھال کر جیب میں رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ گوہر ناشتے کی ٹرے لے کر ا[ندر] داخل ہوا تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے ٹرے تپائی پر رکھی اور بولا۔

"خدا کا شکر ہے آغا! سب ٹھیک ہو گیا۔ ایک اطلاع میں آپ کے لئے لایا ہوں۔"

"کیا؟"

"بورسیلو کو بھی بدخشانی کی لاش کے ساتھ سمندر کی تہہ میں پہنچا دیا گیا۔"

"اوہو...... اچھا؟"

"ہاں، اسے موقع پر ہی اس قتل کی سزا دے دی گئی۔"

"اب اس لانچ کا مالک کون ہے؟"

"بدخشانی کا ماموں زاد بھائی علی حکمت۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہو...... کیا اس کا کوئی بھائی بھی یہاں لانچ پر موجود تھا؟"

"ہاں، وہ اس وقت بدخشانی کے کیبن میں ہے۔"

"ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے آغا!" گوہر بولا تو میں نے چائے پیتے ہوئے اس طرف دیکھا اور وہ قریب آ گیا اور بولا۔ "آپ بدخشانی کے مارے جانے کا افسوس کرنے کے بعد اس سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے کچھ جواہرات بدخشانی کے پاس رکھوائے تھے۔ مجھے یقین ہے تفصیل پوچھنے کے بعد وہ آپ کو لوٹا دے گا۔"

"نہیں دوست! ہزاروں ڈالر کی قیمت کے جواہرات کون لوٹاتا ہے۔ الٹی مصیـ[بت] گلے پڑ جائے گی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اور جب میں ناشتہ کر چکا تو وہ ٹرے لے کر چلا گیا۔ اس [کے] جانے کے بعد میں نے شیو وغیرہ کی اور کپڑے پہن کر بدخشانی کے کیبن میں پہنچ[ا]۔ یہاں علی حکمت دو تین آدمیوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بدخشانی کے قتـ[ل پر] اظہارِ افسوس کیا اور اس سے اپنے دوستانہ تعلقات کا تذکرہ کیا اور پھر تعزیت کرنے [کے] بعد وہاں سے چلا آیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں نے پھر علی حکمت کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران گوہر آ کر مجھے بتا گیا تھا کہ لانچ اب نیپلز سے کوئی ایک سو تیس میل کے فاصلے پر ہے اور آج رات کو دس بجے کے بعد کسی وقت وہاں لنگر انداز ہو جائے گی۔ یہ اطلاع بھی میرے لئے خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ نیپلز پہنچتے ہی جہاز چھوڑ دوں گا۔ گوہر میرا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ نیپلز کے علاوہ اٹلی کے دوسرے بہت سے شہروں میں بھی بہت سی بار آ جا چکا ہے اور تمام مشہور مقامات اور قیام گاہوں سے کافی واقفیت رکھتا ہے۔ میں کیبن سے نکل ہی رہا تھا کہ وہ آ گیا اور مسکرا کر بولا۔

"آغا! میں نے علی حکمت سے سرسری طور پر تذکرہ کیا تھا کہ مسٹر برک، آقائی بد خشانی اور ہشمان ذکری کے خاص رفیقوں میں سے ہیں۔ وہ کئی لانچوں کے مالک ہیں جو ہندوستان اور چین کے درمیان لاکھوں روپے کا سامان اِدھر سے اُدھر منتقل کرتی ہیں۔ فی الحال اس سلسلے میں اٹلی اور فرانس وغیرہ گھومنے نکلے ہیں۔"

"واہ...... تم نے اس سے ہم پیشہ کی حیثیت سے میرا تعارف کرا دیا۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ "یہ تمہید ضروری تھی آغا! اب اگر آپ اس سے جواہرات کا تذکرہ کریں گے تو وہ یقیناً بدخشانی کے سامان سے ان کو تلاش کرے گا اور اگر وہ مل گئے تو فوراً لوٹا دے گا۔ یہ لوگ دوسروں کے لئے خواہ کتنے ہی بے ایمان اور ظالم ہوں لیکن خود جیسے لوگوں کے ساتھ نہایت خوش معاملہ ہیں۔ آپ یہ کہئے کہ آپ جواہرات، کرنسی اور افیون اسمگل کرتے ہیں۔"

"تم تو بہت چالاک ہو گوہر! واقعی کام کے آدمی لگتے ہو۔"

پھر میں باخشانی کے کیبن کی طرف چل دیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ تین چار مرتبہ دستک دینے کے بعد علی حکمت نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ "واہ...... مسٹر برک، میں تمہارا ہی کام کر رہا تھا۔"

"میرا کام، وہ کیا؟" میں نے سوال کیا تو وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے بدخشانی کے پاس کوئی چیز رکھوائی تھی۔"

"اوہو...... لیکن اس کے لئے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے حکمت علی۔ تھوڑے سے ہیرے اور یاقوت وغیرہ تھے، کوئی اتنی بڑی چیز تو نہیں۔ ابھی تو میرے دل

سے بدخشانی کے قتل کا صدمہ بھی ہلکا نہیں پڑا۔" میں پیشانی پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حکمت بھی میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"علی حکمت! بدخشانی کے نہ ہونے سے میرا تمام پروگرام تلپٹ ہو گیا۔ وہ اٹلی فرانس کے تمام بڑے شہروں میں ہم پیشہ تاجروں سے میرا تعارف کرانے کے لئے تھا۔ یہاں بھی بہت سی چیزوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ ہمارا کاروبار وسیع ہوتا۔ ہم ا دوسرے کو بڑے بڑے فائدے پہنچاتے۔ لیکن ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔"

علی حکمت گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیتا رہا، پھر آگے بڑھ کر بولا۔ "کوئی با نہیں مسٹر برک، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جتنے لوگوں سے واقف ہوں ان سب تمہارا تعارف کرا دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ مسٹر حکمت!"

"اچھا یہ بتایئے، جواہرات کی کل تعداد کتنی تھی؟"

"میں نے کہا تھا، ایک چھوٹی سی بات ہے۔ بارہ یا چودہ ہیں، مل جائیں گے۔ نہ ملے تو کیا ہوتا ہے۔ اتنے معمولی قیمت کے ہیروں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ ہاں اتنا ض ہے کہ وہ ہزاروں میں سے چن کر نمونوں کے طور پر دکھانے کے لئے لائے گئے تھے۔"

وہ جواب دینے کی بجائے اٹھا اور بدخشانی کے ٹرنک کا قفل کھولنے لگا۔ میں اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا علی حکمت، میں چلتا ہوں۔ ہیرے اگر مل جائیں تو مجھے بھجوا ورنہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سے ہمارے تعلقات پر کوئی اثر نہیں سکتا۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے کیبن سے نکل کر دروازہ بند کیا اور واپس ا کیبن کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک اچھا اسٹارٹ تھا اور آگے چل کر اس سے بہت فائدے ہو سکتے تھے۔

※☆※

اس وقت شام کے تقریباً ساڑھے سات بجے تھے۔ میں بھوک لگنے کی وجہ سے جل کھانا کھا چکا تھا اور پھر کھانا کھا کر کیبن سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ علی حکمت گھ ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ ایک چرمی پیکٹ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

"یہ پیکٹ بدخشانی کے سامان میں ملا ہے۔ اسے چیک کرو برک! یہ تمہارے ہیر

ہیں یا نہیں"

میں نے پیکٹ کھول کر دیکھا، یہ میرے ہی ہیرے تھے۔ میں نے ایک نظر میں پہچان کر کہا۔ "شکریہ علی حکمت! یہ ہیرے میرے ہی ہیں۔ بہت بہت شکریہ، تم قابل اعتماد دوست ثابت ہوئے۔"

وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "شکریہ مسٹر برک! لیکن انہیں اپنی اندرونی جیب میں رکھو۔ کیش اور ٹریولر چیک وغیرہ بھی کسی واٹر پروف کور میں رکھو۔ میں تمہیں ایک بری خبر سنانے آیا ہوں۔"

"کیا......؟" میں نے پیکٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم گھر چکے ہیں مسٹر برک! تین چار لانچیں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ اور یہ کسٹمز کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتیں۔"

میں نے غور سے اس کی بات سنی اور پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایک لمحے کے اندر اندر میرے ذہن کی چرخیاں چل پڑیں اور بہت کچھ سوچ ڈالا میں نے۔ جو کچھ میں نے سوچا اسے سوچ کر میرے دل کو تسلی سی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ لمحے سوچ کر اس سے کہا۔

"نیپلز کتنی دور ہے؟"

"تقریباً اٹھائیس میل۔"

"تو کیا ہم لوٹ نہیں سکتے؟"

"ممکن نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "برک! میں تمہیں ایک لائف جیکٹ دیتا ہوں، اسے پہن لو۔ اب کسی بھی لمحے وہ ہمیں گھیر کر پکڑ سکتے ہیں۔"

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔ "شکریہ، مجھے لائف جیکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں آخر...... کیا گرفتار ہونا چاہتے ہو یا زندگی عزیز نہیں ہے؟" اس نے کہا۔

"نہیں میرے دوست، دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ تم مجھے بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" میرے اندر ایک جولانی سی پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے میں بڑی سے بڑی بات پر نہیں اتراتا تھا، لیکن نجانے کیوں اس وقت طبیعت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔

حکمت ایک قدم آگے بڑھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ لیکن اس وقت اس مدد کا کوئی چانس نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف یہ کہ ان اطالوی کسٹم افسروں سے تم بات کرو۔ کیونکہ وہ مجھے پہچانتے ہیں۔ بلکہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ ان کے سامنے آنے کی بجائے میں سمندر میں چھلانگ لگانا پسند کروں گا۔''

میں نے گردن ہلائی۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور ہم نے کپتان کو دیکھا جو پریشان اور فکرمند دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آواز ابھری۔

''آقائی، وہ بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ کوکین کے تمام پیکٹ تو پھینک دیئے گئے ہیں لیکن دوسری چیزیں موجود ہیں۔ سینکڑوں بکس ہیں اور اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم انہیں سمندر میں گرا سکیں۔''

''رُک جاؤ، برک کو ان سے بات کرنے دو۔ شاید مان جائیں۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''مائی ڈیئر برک! تم برطانوی تاجر کی حیثیت سے ان سے بات کرو اور پچاس ہزار ڈالر تک کی پیشکش کر کے دیکھو۔ ہوسکتا ہے تمہیں انگریز سمجھ کر وہ دوستی کے لئے تیار ہو جائیں۔ بلکہ تھوڑا سا یقین ہے مجھے۔''

''مگر مائی ڈیئر علی حکمت! میں اطالوی زبان نہیں بول سکتا۔''

''اوہ...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ انگریزی سمجھتے ہیں۔ اور پھر کیپٹن تمہارے ساتھ ہوگا۔ جلدی بولو، کیا کہتے ہو؟''

''اوکے، میں کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔ لیکن اگر وہ نہ مانے تو میرے لئے فرار کا راستہ بھی بند ہو جائے گا اور بہرحال میں کسی قیمت پر گرفتار ہونا پسند نہیں کرتا۔''

''ٹھیک ہے، اگر ایسا ہے تو تم بے فکر رہو۔ ہم مقابلہ کریں گے اور تمہارے لئے موقع فراہم کریں گے۔ بلکہ......'' وہ ایک لمحے کو رُکا پھر بولا۔ ''میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ آؤ کیپٹن، لانچ رکواؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔''

کیپٹن انجن روم کی طرف چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد لانچ رک گئی۔ میں ریلنگ پر پہنچ گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک لانچ کی روشنی ہماری جانب بڑھ رہی تھی۔ کیپٹن نے کہا۔ ''یہی ہے۔ دوسری دو لانچیں اس کو کور کئے ہوئے ہیں۔''

میں خاموشی سے سمندر میں یہ کھیل دیکھنے لگا۔ لانچ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر وہ رک گئی تو میں نے کیپٹن سے کہا۔ ''ان سے رابطہ قائم کرو کیپٹن!''

کیپٹن نے ٹارچ روشن کر کے روشنی آنے والی لانچ پر پھینکی۔ دو کسٹم آفیسر ڈیک پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی، دوسرا دستی مائیکروفون لئے ہوئے تھا۔ لائٹ دیکھتے ہی اس نے مائیک پر کہا۔

''ہیلو، کسٹمز اور کوسٹ گارڈ تمہاری لانچ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

کیپٹن نے میری طرف دیکھا۔ لانچ آہستہ آہستہ اور قریب آ گئی۔ میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''آفیسرز! آپ شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں۔''

کسٹم آفیسر نے پیچھے کی طرف رُخ کر کے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ چار آدمیوں نے ایک چھوٹا سا گین وے گھسیٹ کر اس کا سرا ہماری لانچ پر رکھ دیا۔ آگے آنے والے دونوں آفیسر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لانچ پر آ گئے۔

''ہیلو......'' میں نے مسکرا کر ان کو ریسیو کیا۔ انہوں نے بھی میرے اس تپاک کا جواب تپاک سے ہی دیا۔

''آئیے۔'' میں نے ان سے کہا اور بدخشانی کے کیبن کی طرف چل پڑا۔ روشنی میں آتے ہی دونوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

''آپ مصری ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور کیبن میں داخل ہو گیا۔

''تو پھر......؟''

''آفیسر، میں برٹش ہوں۔ میرا نام برک ہے۔ ویسے آپ کس سلسلے میں میری لانچ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟''

''ظاہر ہے سمندر میں کس سلسلے میں تلاشی لی جاسکتی ہے مسٹر برک۔''

''آئیے بیٹھئے، کیا ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ سلوک نہیں کر سکتے؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔ لیکن قانون کے مطالبات پورے ہونے کے بعد۔''

''کیا خیال ہے کیپٹن! پچیس ہزار ڈالر کیسے رہیں گے؟''

''اوکے سر۔'' کیپٹن واپس مڑا تو کسٹم آفیسر نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''تمیں؟''

اس نے پھر نو موسیو کہا تو میں نے یہ رقم چالیس ہزار کر دی۔ جب اس پر بھی کسٹمز
آفیسر نے گردن لہرائی تو میں نے ہمتی لہجے میں کہا۔

''آفیسر! پچاس ہزار ڈالر'' یہ کہہ کر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کہا۔ ''یہ فائنل ہے
قبول کر سکتے ہو تو کر لو۔ ورنہ تلاشی میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ ہم ایک سیکنڈ میں سب کچھ
سمندر کی تہہ میں پہنچا سکتے ہیں۔''

دونوں آفیسر میری بات سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کیپٹن کی
طرف دیکھ کر کہا۔ ''لے آؤ کیپٹن! اٹالین آفیسر بے وقوف نہیں ہوتے۔''

کیپٹن سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ بہرحال انہوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں نے
کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب تو ہم دوست بن گئے ہیں۔ پلیز بیٹھئے۔ یہ ہماری دوستی کا آغاز ہے اور یہ
سلسلہ جاری رہے گا۔ ہم بہت جلد پھر ملیں گے۔ اور یہ پیشکش جاری رہے گی۔''

وہ مسکرا دیئے لیکن اسی طرح کھڑے رہے۔ میں ان کی احتیاط پر ہنس دیا اور میز سے
سگریٹ کیس اٹھا کر انہیں پیش کیا۔

''نہیں شکریہ۔'' انہوں نے میرا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال کر
سلگاتے ہوئے کہا۔

''ہم برطانوی لوگ دوستی کا ہاتھ بڑھا کر دھوکے سے وار نہیں کیا کرتے آفیسر۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! لیکن ابھی ہم دوست نہیں ہیں۔''

پھر اس نے اپنے ساتھی کی طرف رخ کر کے اطالوی زبان میں کچھ کہا۔ ریلنگ کے
پاس جا کر اس نے اپنی لانچ میں کھڑے ہوئے سپاہیوں سے دو تین جملے تبدیل کیے، پھر
واپس آ گیا اور اس کے پیچھے ہی ہمارا کپتان ہاتھ میں ایک بریف کیس لئے ہوئے کیبن
میں داخل ہو گیا اور بریف کیس میز پر رکھ کر چابی میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے
بریف کیس کھول کر ڈالروں کی گڈیاں باہر نکالیں اور کسٹمز آفیسر کے سامنے سو سو ڈالر
والے پچاس ہزار ڈالر رکھ دیئے۔ دونوں نے ایک ایک نوٹ کو چیک کیا پھر کسٹمز آفیسر
نے رقم بریف کیس میں رکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے جناب۔''

''کیا خیال ہے، اب تو ہم دوست ہیں اور ہاتھ ملا سکتے ہیں؟''

دونوں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور باری باری مصافحہ کیا۔ میں نے کسٹمز آفیسر کا نام
دریافت کرنے کے بعد کہا۔

''موسیو! اب آپ ہمیں کس قسم کا پروٹیکشن دیں گے؟''

میرا یہ سوال سن کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر کسٹم آفیسر نے مجھ
سے کہا۔ ''آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟''

میں نے کپتان کی طرف دیکھا تو کپتان بولا۔ ''نیپلز۔''

کسٹم آفیسر نے اپنے اسسٹنٹ سے اطالوی زبان میں دو تین جملے تبدیل کیے، پھر
جیب سے پین نکالا اور کپتان کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک نشان بنا کر اپنے دستخط کیے
اور مجھ سے کہا۔ ''آپ بارہ بجے کے قریب ٹورسٹین کی سیڑھیوں کے قریب لانچ روک کر
سامان اتاریں۔ ہوٹل میں ہمارا ایک آدمی ملے گا، وہ آپ کی ہر طرح مدد کریں گا۔
سمندر میں ہمارے سوا اس وقت اور کوئی نہیں ہے اور آپ کو ہمارے پیچھے کچھ فاصلہ
دے کر چلنا ہے۔''

میں نے کپتان کی طرف دیکھا تو کپتان نے گردن ہلا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر برک۔''

''اوکے آفیسر! بہت اچھا۔'' میں نے مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور
دونوں مصافحہ کر کے بریف کیس اٹھا کر چل دیئے۔ کسٹمز کی لانچ ان کے پہنچتے ہی چلنے
لگی۔ میں نے ریلنگ سے انہیں سیز موگراف کے ذریعے دوسری لانچوں کو سگنل دیتے اور
پھر تینوں کو کلوز اپ ہو کر نیپلز کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔

''ٹھیک ہے کپتان، چلو۔'' میں نے کپتان کو اشارہ کیا اور وہ انجن روم کی جانب چل
پڑا۔ میں پھر واپس بدخشانی کے کیبن میں آ گیا۔ جیسے ہی لانچ چلی، علی حکمت اندر داخل
ہوا اور کہنے لگا۔

''واہ مائی ڈیئر برک! تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میں ان سے کبھی اتنی
آسانی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔''

میں تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''ڈالر ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے علی
حکمت۔ صرف حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاش تم علی حکمت کی بجائے حکمت عملی
ہوتے۔''

علی حکمت نے میری بات پر قہقہہ لگایا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''برک تم دوست

ہو۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہو۔"

میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے جذبات کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن میرے دوست، یہ میری لائن نہیں ہے۔ اس وقت میں نے بے شک تمہاری مدد کی ہے صرف اس وجہ سے کہ بوریلو نے مجھے بدخشانی کے قتل میں ملوث کرنے کی جو کوشش کی تھی تم لوگوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔"

"ہم اندھے نہیں ہیں، صحیح اور غلط کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خیر اس ذکر کو چھوڑو۔ میں تمہیں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"ہمارے پارٹنر بن جاؤ۔ صرف پانچ لاکھ ڈالر کا چیک دے دو، تم پچیس فیصد کاروبار کے مالک بن جاؤ گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"نہیں میری جان! میں نے زندگی میں پانچ لاکھ بینک کے سوا کہیں نہیں دیکھے۔ تم مجھے اتنا امیر نہ سمجھو۔"

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "پرواہ نہیں ہے برک! تم صرف ایک نوٹ لکھ دو۔ ہشمان ذکری خوشی سے تمہارے نام پر یہ رقم ادا کر دے گا۔"

"نہیں دوست! میں دوستوں سے قرض نہیں لیا کرتا۔ خیر جانے دو، نیپلز میں ہم دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں گے اور پھر شاید ہی کبھی دوبارہ ملیں۔"

وہ کچھ لمحے سوچتا رہا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر کی جانب چل پڑا۔ دو گلاسوں میں وہسکی انڈیل کر اس نے ایک میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"لو پیو آغا! ہم مشکل ہی سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ سکیں گے۔ اگر کسٹمز والوں نے ہمیں کوئی دھوکا نہ دیا تو ہمیں ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ عرصے نیپلز میں ٹھہرنا ہو گا۔ سیر و تفریح، اٹالین لڑکیاں، پومپائی کے مٹ کر دوبارہ ابھرے ہوئے نقوش کا مطالعہ اور کیا نہیں۔ میں تمہارے لئے بہترین کمپنی کا انتظام کروں گا اور تم اس کے حسن میں ڈوب کر وطن اور عزیز و اقارب تو کیا خود کو بھی بھول جاؤ گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے عمر خیام بنانا چاہتے ہو۔ بنا دینا۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ حسین سے حسین غزلوں کی ورق گردانی کرتے کرتے مر جاؤں گا لیکن ایک بھی رباعی تخلیق نہ کر پاؤں گا۔"

"نہ کرنا، کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا کے بازار میں ڈالر، پاؤنڈ، دینار، تومان، ریال اور روپیہ چلتا ہے۔ رباعیاں اور شعر نہیں چلتے۔"

میں ہنسنے لگا۔ علی حکمت اچھے جواب دیتا تھا۔

بہرحال ہم سفر کرتے رہے۔ گیارہ بجے ہماری لانچ نیپلز سے کچھ فاصلے پر ساحل پر لنگر انداز ہو گئی اور صبح کے تین بجے تھے جس وقت حکمت مجھے ساتھ لے کر ٹوریسٹنٹ کے ایک کمرے میں داخل ہوا تو کسٹم آفیسر سادہ سوٹ میں ملبوس پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور دروازے کے قریب جاتے ہوئے بولا۔

"موسیو برک! آپ کا تمام سامان آپ کے آدمیوں کی نگرانی میں شہر بھجوا دیا گیا ہے۔ ہم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب پھر کسی وقت ملیں گے، شب بخیر۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ حکمت نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا خیال ہے حکمت! یہ صحیح کہہ رہا تھا؟"

"امکان تو یہی ہے۔ لیکن کیا کہا جا سکتا ہے جب تک کہ ڈلیوری کی رسید نہ مل جائے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "جہاں تک میرے تجربے کا تعلق ہے اس کے الفاظ سچائی پر ہی مبنی تھے۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس نے ہمیں ڈبل کراس کیا ہے تو میں پچاس ہزار ڈالر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اگلوا سکتا ہوں۔ چاہے اس کے لئے مجھے اسے پچاس حصوں میں ہی کیوں نہ تقسیم کرنا پڑے۔"

نجانے کیوں علی حکمت ایک دم جذباتی سا ہو گیا۔ "قسم کھاتا ہوں......"

"نہیں، کوئی قسم نہ کھاؤ...... مردوں کی طرح سینہ تان کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بس میرا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے الگ ہو۔ اگر تم واقعی اتنے ہی طاقتور ثابت ہوئے تو میں کسی قیمت پر تمہیں جانے نہیں دوں گا۔"

میں نے ہنس کر بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں اس طاقت سے ایک ہی بار کام لے سکتا ہوں حکمت! اس لئے اتنا کارآمد نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ خیر تم جاؤ، بے فکر ہو کر جاؤ۔"

لیکن وہ جانے کی بجائے صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ میں نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر چھت کی طرف دھواں چھوڑا اور

دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں سلیپنگ سوٹ لے کر پارٹیشن کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے سے ٹیک لگا کر سگریٹ پیتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔

"کیا بات ہے حکمت! کچھ اور کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"مسٹر برک! پتہ نہیں کیوں مجھے نیند نہیں آرہی۔"

"تم ابھی تک شاید خطرہ محسوس کر رہے ہو۔"

"ہاں کسی حد تک۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی کچھ اور ہے جو مجھے معلوم نہیں۔"

"اپنے کمرے میں جا کر ایک پیگ لو۔ نیند آجائے گی۔"

وہ سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر صوفے سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر بولا۔ "آؤ، بولٹ چڑھا دو۔ میں چل رہا ہوں۔"

میں بستر سے اٹھا تو وہ جا چکا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لیتا ہوا دروازے پر آیا۔ بولٹ چڑھا کر لوٹنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ دروازہ ایک بار پھر بجایا گیا اور میں نے بولٹ سرکا کر دروازہ کھولا تو چمپا کی بو کا ایک جھونکا میری ناک سے ٹکرایا۔ میری توقع کے مطابق دروازے پر وردان سادھانی کھڑا ہوا تھا۔ چمپا کی تیز خوشبو کا جھونکا اندر آیا۔ میں نے نگاہیں ملتے ہی "شبھ آگمن" کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کے پیچھے ہی ماشرہ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ جے جے دھم راج کہتا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا کمرے کے درمیان میں پہنچ کر ماشرہ بولا۔

"دھم راج! مجھے اس لئے آنا پڑا۔"

"بیٹھو ماشرہ۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ابھی نہیں۔"

"بیٹھ جاؤ، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

"آپ جانتے ہیں بدھی ستو! کہ میں نے کتنی دور جانا ہے۔ بیٹھنے کا وقت کہاں۔"

"ٹھیک ہے، مجھے پتہ ہے کہ تمہیں کتنی دور جانا ہے۔ مگر خیر میں اس وقت کیا کر سکتا ہوں تمہارے لئے؟"

"دھم راج! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ان ایوگیاہ کاموں میں ان لوگوں

سے سہ کار نہ کیجئے آپ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو انسان کی ذلت کے لئے کسی بھی روپ میں بڑائی ثابت ہو۔ آپ کو تو صرف بھلائی کرنا ہے۔"

"ہاں، میں سمجھ چکا ہوں اس بات کو۔ واقعی مجھے سب کے ساتھ بھلائی کرنا چاہئے۔"

میرے طنزیہ الفاظ پر وہ ہنس دیا اور بولا۔ "سب کے ساتھ نہیں دھم راج! آپ پاپی آتماؤں کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتے۔ سماج دشمنوں کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتے آپ۔ ان کے ساتھ دھرم نیتی انوسار سلوک کر سکتے ہیں۔ اچھا اوم نموستو بدھی ستو، چلتا ہوں۔"

"کیا تم مجھے یہی بتانے آئے تھے؟"

"ہاں بدھی ستو۔ یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ اوم نموستو۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر رخصتی سلام کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وردان سادھانی بھی اس کے پیچھے ہی نکل گیا تھا۔ میں بستر پر آ کر لیٹ گیا اور دونوں کی آمد پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ کچھ اس طرح ذہن الجھا تھا کہ دروازہ بھی لاک نہیں کر پایا اور بستر پر لیٹ کر سوچ کی آغوش میں پہنچ گیا اور سوچ نے میری پلکوں کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

نجانے کب تک سوتا رہا کہ علی حکمت نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھایا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا تو خوب روشنی ہو گئی تھی۔ کلائی پر بندھی گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔

"صبح بخیر آغا!" علی حکمت صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں، اب تم بتاؤ علی حکمت، مال کی کیا رپورٹ ہے؟"

"وہ پہنچ گیا۔ تم جیت گئے۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ، میں تمہارے ساتھ چائے پیوں گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور ٹوائلٹ کی طرف چل پڑا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ میں نے شیو و غسل وغیرہ میں صرف کیا۔ واپس آیا تو میز پر ناشتے کی ٹرے رکھی ہوئی تھی اور علی حکمت کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میری پیالی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"برک! ہوٹل میں، میں نے تمہارا نام رجسٹر نہیں کرایا ہے۔ اس لئے تمہیں کہیں جانا ہو تو میرے ساتھ چلنا تاکہ پاسپورٹ کے سلسلے میں کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو جائے۔"

میں نے لاپرواہی سے چائے کی پیالی اٹھائی اور چائے پینے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"ناشتے کے بعد سیر کرنے چل رہے ہیں۔ کیا چلنا پسند کرو گے؟"

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ویسے ایک بات کہوں تم سے؟''

''کہہ ڈالو، پوچھتے کیوں ہو؟''

''میں نے رات کو تم سے ایک جھوٹ بولا ہے۔ اب اس کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''علی حکمت! اعتراف جرم تو جرم سے بدتر سمجھا جاتا ہے۔ تم اس تکلف میں نہ پڑو تو کیا حرج ہے۔''

''نہیں، میں مصلحتاً یا کاروباری تقاضوں سے مجبور ہو کر جھوٹ بولنے کو جرم نہیں سمجھتا۔ لیکن دوست پر اعتماد نہ کرنے کو سنگین جرم سمجھتا ہوں۔ خصوصاً تم جیسے دوست پر۔''

''مگر قصہ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''وہ جو میں نے کہا تھا کہ کوکین تلف ہو گئی ہے، جھوٹ تھا۔ سچ یہ ہے کہ پورا کیس حفاظت سے ایجنٹ تک پہنچایا جا چکا ہے۔''

''یہ تو اچھا ہوا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہاں، بہت اچھا ہوا۔'' اس نے کپ ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہیں تمہارا حصہ پیش کر رہے ہیں۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے روک لینے کے خیال سے یہ رقم یا حصہ پیش کر رہے ہو تو میری رائے ہے کہ اسے ضائع نہ کرو۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو گا سوائے اس کے کہ کچھ راتیں خوبصورت ہو جائیں گی۔''

''چلو یہی سہی۔ میں دو تین دن تک تمہارے ساتھ رہوں گا، اس کے بعد چلا جاؤں گا۔ اس عرصے میں تم اس شہر سے واقف ہو جاؤ گے۔ اگر رک سکو تو یہیں رک جانا۔ ورنہ تین ماہ کے بعد ہماری لانچ پھر یہاں آئے گی۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھ لوں گا، فیصلہ کر لوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بات ختم کر دی اور میز سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے کپڑے وغیرہ پہنے اور باہر نکل آیا۔ لانچ کے سیکنڈ میٹ سے گوہر آفندی کے بارے میں پتہ کیا تو پتہ چلا کہ چند افسروں کے علاوہ تمام چھوٹے ملازمین لانچ پر ہی موجود ہیں۔ میں نے ایک نوٹ لکھ کر اس کو دیا کہ گوہر کو پہنچا دیا جائے۔ اس نے پرچی جیب

میں رکھتے ہوئے کہا۔

''آغا! شام کو چھ بجے میں خود پرچہ پہنچا دوں گا۔ اگر زبانی کچھ کہنا ہو تو وہ بھی فرما دیجئے۔''

''بس یہی کہنا ہے کہ اسے جتنی جلدی ممکن ہو سکے میرے پاس پہنچا دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' اس نے کہا اور میں وہاں سے بار کی طرف چل دیا۔ ایک ویٹر نے میری رہنمائی کی اور دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک طویل و عریض کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے چھ سات حسین بار میڈس کھڑی ہوئی تھیں۔ دو تین کے سامنے پینے والے موجود تھے جن کو وہ جام بھر بھر کر پلا رہی تھیں۔ کچھ اور لڑکیاں جن کے سامنے کوئی نہیں تھا وہ ہال میں بیٹھے ہوئے مہمان جوڑوں کے لئے لے جانے والی لڑکیوں کے آرڈر کے مطابق سپلائی کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ آپس میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ تمام ہال ہنسنے بولنے کی ملی جلی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میں ہال میں بیٹھنے والوں پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھا اور ایک لڑکی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

''ہیلو۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے کاؤنٹر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ڈبل وہسکی، سوڈا کے ساتھ۔''

اس نے پلٹ کر بکس سے سوڈا اور واٹر کی کانچ کی بوتلیں نکالیں اور گلاس میں انڈیل دیں۔ ایک لڑکی میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''ٹورسٹ؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلا کر گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''ایرانی یا جرمن؟''

''نہیں، برٹش۔'' میں نے جواب دیا۔

''پلیز۔'' کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے پیتے پیتے میری طرف مڑ کر دیکھا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی کو پتہ نہیں مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ کہنے لگی۔

''آفیسر یا بزنس مین؟''

''بزنس مین۔''

''تھینک یو سر! کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں آپ؟''

''یہیں روم نمبر سکسٹی نائن میں۔''

"تھرڈ فلور پر؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے صرف یہاں کا ماحول دیکھنے کے لئے یہ شراب طلب کی تھی
پھر میں پانچ ڈالر کا ایک نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کر چلنے لگا تو اس نے دراز کھینچتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ پلیز۔"

"شام کو پھر آؤں گا میں۔"

"میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"برک۔" اور اس کے بعد میں وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ کاؤنٹر پر کھڑے آدمی
پیتے پیتے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

شام چار بجے میں چائے پینے کے بعد حکمت کے ساتھ سیر کو جانے کے لئے اس
کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے میز کے پاس جا کر ریسیو
اٹھایا اور ہیلو کہہ کر اطالوی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ دو تین جملے تبدیل کرنے کے بع
میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"مسٹر برک! کوئی لڑکی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"شاید بارمیڈس ہو گی۔ تم دیکھ لو، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "برک اسپیکنگ۔"

"مسٹر برک! میں آف ہو کر گھر جا رہی ہوں۔ آپ......"

"ہاں بولو؟"

"میرا مطلب ہے......"

"ایسا کرو تم یہیں آ جاؤ۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔ "ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔ وہ اصل میں آپ
کی باقی رقم......"

"اگر بہت زیادہ بے چینی ہے تو پورا کیش بکس اٹھا لاؤ۔" میں نے کہا اور اس
ہنس کر ریسیور رکھ دیا علی حکمت ہنستا ہوا میرے قریب آ کر بولا۔

"شاید تم سیر کو نہیں چل رہے مسٹر برک؟"

"چل رہا ہوں۔ مگر تم ذرا ٹھہر جاؤ۔"

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگا اور کمرے میں
ٹہلنے لگا۔ کچھ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ مسکراتی
ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی جس کے دلکش خطوط اور سیاہ
آنکھیں دیکھ کر میں سکتے میں آ گیا۔ بارمیڈس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جولیانا۔ اور یہ مسٹر برک ہیں۔"

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔"

"ہیلو" وہ بولی۔

"آپ بیٹھئے۔" بارمیڈس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" جولیانا بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں اس لڑکی نے ایک لمحے کے اندر اندر میرے
ذہن پر ایک ضرب سی لگائی تھی۔ وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا اور ذہن پر یہ
ضرب سی کیوں لگی تھی۔ لیکن پھر خود ہی اپنے خیال پر ہنسی بھی آ گئی۔ میری فطرت میں
میرے باپ کی شخصیت شامل تھی۔ والد مرحوم اپنے دائرہ عمل میں بہت سے کھیل، کھیل
چکے تھے۔ خاص طور سے سلطان چچا نے اسی بات کا اظہار کیا تھا۔ ہر خوبصورت چہرے کو
دیکھ کر میری بھی کوئی رگ پھڑک اٹھتی تھی اور یہی رگ اس وقت جولیا اور میڈس کو دیکھ کر
پھڑکی تھی۔ بارمیڈس نے میری بقیہ رقم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے تو آپ یہ رکھ لیں جو میرے ذہن پر بوجھ بنا ہوا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ اسے آپ اپنے پاس رکھیں اور اگر زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں تو
میری امانت سمجھ کر رکھیں۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس لئے کہ اس معمولی سی رقم کے عوض آپ کی قربت تو حاصل رہے گی اور آپ
میرا تعارف اتنے اچھے اچھے لوگوں سے کراتی رہیں گی۔"

"بہت چالاک ہیں آپ۔ آپ نے میرا تو نام بھی نہیں پوچھا۔"

"میں خود اس بات پر حیرت کا اظہار کرنے والا تھا کہ آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں
بتایا بلکہ ایک طرح سے میں شکایت بھی کرنے والا تھا۔" میں نے سلیقے کی گفتگو کرتے
ہوئے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"میرا نام رائینہ جولیس ہے۔"

''آپ سے مل کر تو ہمیشہ ہی خوشی ہوتی ہے مس رائینہ جولیس۔''

''شکریہ۔ ویسے ایک بات کہوں اگر آپ محسوس نہ کریں تو؟''

''جی فرمائیے؟''

''اصل میں ہم لوگ تو دن رات ہی اس ہوٹل میں اپنی ڈیوٹیاں سرانجام دیتے ہیں او
جب فرصت ہوتی ہے تو ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہم یہاں سے نکل
بھاگیں۔ اگر اس کے بعد بھی ہمیں یہیں وقت گزارنا پڑے تو آپ یقین کریں بڑی ذہن
کوفت ہوتی ہے۔ کیوں نہ باہر نکلیں۔ بلکہ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں آپ ک
میزبان......''

''ارے نہیں رائینہ ڈیئر! چلو چلتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

''جولیانا کے پاس اس کی اپنی کار موجود ہے۔ اسے آپ ہماری طرح نہ سمجھیں، نہ ہ
اس کا تعلق اس ہوٹل سے ہے۔ یہ اپنا کاروبار کرتی ہے۔''

''واہ، چلیں پھر چلتے ہیں۔''

اور اس کے بعد میں ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بس وہی فطرت ک
بات کرتا ہوں کہ والد صاحب کی سرشت خون میں سرایت کر رہی تھی اور ان لوگوں کے
درمیان وقت گزارنے میں لطف آ رہا تھا۔ خاص طور سے جولیانا کچھ ایسی شاندار شخصیت
کی مالک تھی کہ دل اس کی جانب کھنچتا تھا۔ باہر نکلا تو حکمت سامنے سے آتا نظر آیا۔ مل
نے کہا۔

''لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے''

حکمت نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''انسان بڑا خودغرض ہوتا ہے۔ اپنی کسی پسند پر وہ اپ
دوستوں کا ساتھ اسی طرح چھوڑ دیتا ہے۔ او کے، میں انتظار کروں گا۔''

دونوں لڑکیاں ہماری گفتگو پر مسکرا رہی تھیں۔ جولیانا نے اپنی کار کا لاک کھولتے
ہوئے کہا۔ ''ویسے مسٹر برک بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔''

ہم کار میں بیٹھ گئے۔ رائینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال سکتی
ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ جولیانا مکمل طور پر آپ پر قبضہ جما لے مسٹر برک! ویسے
ہمارے درمیان یہ مشترکہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ آپ آدھے آدھے ہم دونوں میں تقسیم ہو

جائیں گے۔''

''چلو، میں تو ختم ہوا۔''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے اگر آدھا آدھا تقسیم ہوا تو دو حصے ہو جائیں گے میرے۔''

جولیانا نے ہنستے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ رائینہ میرے برابر ہی بیٹھ گئی تھی۔ کار
مختلف علاقوں میں گھومتی رہی اور ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ میرا ذہن ہواؤں میں اڑ
رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم مضافاتی علاقے میں نکل آئے۔ میں نے جولیانا سے کہا۔

''کیا خیال ہے، ڈرائیونگ ہی کرتی رہیں گی میڈم؟''

''آپ ان علاقوں سے واقف نہیں ہیں۔ میں آپ کو سیگل لے جا رہی ہوں۔ مصنوعی
سمندر جس کے کنارے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ ان
جھونپڑیوں میں اگر چوبیس گھنٹے گزار لئے جائیں تو پھر جنت کی خواہش نہیں رہے گی۔''

ہم تینوں ہنسنے لگے تھے۔ سیگل نامی علاقہ شہر سے کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا
اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی مثال آپ تھا۔ وہاں ایک ریزرٹ بنایا گیا تھا جس کے
احاطے میں یہ مصنوعی سمندر لہریں لے رہا تھا۔ واقعی کمال کی جگہ بنائی گئی تھی۔ اور یہ
جھونپڑیاں اور ان کے آس پاس نظر آنے والے خوش ذوق لوگ جنھوں نے دنیا کی ہر
مشکل سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور کسی قسم کی تہذیبی قید سے آزاد آرام سے مٹرگشت کر
رہے تھے۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے ان بے لباس اور بے حجاب لوگوں کو دیکھا۔
بلاشبہ زندگی کا ایک دور اسی طرح کا ہوتا ہے کہ ایسے مناظر بڑی دلکشی کے حامل ہوتے
ہیں۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت جھونپڑی کے دروازے پر جولیانا نے کار روکی اور ہم تینوں
نیچے اتر آئے۔

''یہ میری ہٹ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے رائینہ، کہ جولیانا ایک دولت مند خاتون ہیں۔''

ہم تینوں ہنستے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ''لیکن جس طرح یہ لوگ گھوم
پھر رہے ہیں کم از کم میں اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔''

''ارے کیوں؟ یہ تو زندگی کی ایک بہت بڑی سچائی ہے۔'' جولیانا نے کہا۔

''اتفاق کی بات یہ ہے کہ جس ماحول سے میرا تعلق ہے وہ ان باتوں کو قبول نہیں

کرتا۔"

"اوہ، کیا بات لے بیٹھے ڈیئر۔ جیسا دیس ویسا بھیس والی بات کہو نا۔"

"نہیں، مجھے ایک بھاگے ہوئے قیدی کی حیثیت دے کر اسی جھونپڑی میں قید رہنے دو۔"

"او کے، او کے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ بیٹھو۔ کم از کم باہر کا نظارہ تو کر سکو گے۔" میں ہنس دیا۔ اب اس وقت میں پوری طرح ان دونوں لڑکیوں کے جال میں جکڑ چکا تھا اور میری اپنی سوچنے سمجھنے کی قوتیں پس پردہ جا سوئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بے لباس تو میں کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا تھا لیکن جہاں تک باہر کے نظاروں کا تعلق ہے بس ان سے گریز نہیں کر پایا تھا۔ دونوں لڑکیاں بڑی دلچسپ باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں بھی باہر بھٹک رہی تھیں اور وہ نظر آنے والوں پر تبصرے کر رہی تھیں۔

دفعتہً ہی مجھے ایک عجیب و غریب جگہ نظر آئی اور میری نگاہیں ادھر جم کر رہ گئیں۔ وہ جگہ بڑی عجیب و غریب تھی۔ تھی تو وہ جھونپڑی ہی لیکن اس کا ڈیزائن بدھ پگوڈے کی طرح بنایا گیا تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت پگوڈا جو دور سے بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن کے تار اس پگوڈے سے بندھ گئے ہوں۔ کچھ لمحوں کے لئے میں یہاں کے ماحول کو نظرانداز کر بیٹھا۔ پھر کس طرح اور کیا کہہ کر میں اس جھونپڑی سے باہر نکل آیا، اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ بس ایک سحر سا میرے ذہن پر طاری تھا اور میرے قدم اس چھوٹے سے پگوڈے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

جب میں اس دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ آہستہ سے کھلا اور میرے پاؤں اندر کی جانب چل پڑے۔ میں اندر داخل ہو گیا تھا۔ اندر چاروں طرف مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی، سامنے ہی بدھا کا مجسمہ نظر آ رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی آنکھیں بند کئے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ میں سحر زدہ سا مجسمے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف دھواں پھیلتا جا رہا ہو۔ میں اپنے آپ کو اس دھوئیں میں گم ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ چمپا کی جانی پہچانی خوشبو میرے دل و دماغ کو معطر کئے ہوئے تھی۔ آہستہ آہستہ دھواں چھٹا اور وردان سادھانی کی آواز ابھری۔

"جنم ستو..... بدھی نموستو..... نمو بدھی، نمو بدھی، نمو بدھی، بدھی مان! آپ کو بار بار

یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ مستقبل کے ہونے والے مہتر بدھ ہیں اور آپ کے لئے پاکیزگی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بدھی ستو! یہ پاکیزگی آپ یوں سمجھ لیجئے آپ کے جیون کا سدھان ہے۔ اور اگر آپ کا وجود یونہی ناپاکیوں میں ڈوبا رہا تو بدھ مت کی تاریخ بدل جائے گی۔ بڑا غلط ہو جائے گا بدھی ستو! آپ کو ایک بار پھر متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ دنیا کی برائیاں چھوڑ دیں۔ یہ جو آپ کے راستے میں جگہ جگہ استھان آ جاتے ہیں یہ درحقیقت سچائیوں کی طرف آپ کے سفر کو روکتے ہیں اور سچائیوں کی طرف آپ کے سفر کا رکتا رہنا بہت بڑا نقصان ہے۔ کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ اندازہ ہے کہ آنے والے سے آپ کو کتنا بڑا منصب سنبھالنا ہے۔ ہمارا دلائی لامہ ایک سو چودہ سال کا ہو چکا ہے اور وہ اس لئے زندہ رہے گا کہ آپ کو مہتر بدھ کا تاج پہنا دے۔ پر جیون کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم جلد از جلد آپ کو آپ کے استھان پر لے چلتے ہیں بدھی ستو! ہمیں اس کا موقع دیجئے۔ آپ نے تو صحیح معنوں میں ابھی تک ایک بھی ایسا کام نہیں کیا ہے جو آپ کے راستوں کو کھولے۔"

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میری زبان جیسے بند ہو چکی تھی۔ میں نے کچھ لمحے خاموشی ہی اختیار کئے رکھی۔ پھر جیسے میری زبان پر سے تالا کھل گیا۔ میں نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہ سمجھ ہی نہیں سکا ہوں کہ مجھے آگے جا کر کیا کرنا ہے۔"

"بدھی ستو! آگے کی باتیں تو آگے چل کر ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ میں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا ہے۔ کیا میرے لئے اپنے دین دھرم کو بدلنا آسان کام ہو گا؟"

وردان سادھانی نے سیوک سندھورتی کو دیکھا اور سیوک سندھورتی کہنے لگا۔ "مہا بدھی ستو! کبھی کبھی جنم استھان غلط ہو جاتے ہیں۔ آپ کو گاشر برم میں مہان مندر کے بڑے مجسمے کی آغوش میں دیکھا گیا اور بدھی مان دھرم وستو تسلیم کر لیا گیا اور پھر ہر جگہ آپ کے ساتھ وہی پیش آیا جس کی توقع کی جاتی رہی ہے۔ ہاں، پرنتو آپ کو آپ کا استھان اس وقت نظر آئے گا جب آپ نیل سنگھاسن پر بیٹھیں گے۔ نیل سنگھاسن آپ کا سواگت کرنے کے لئے تیار ہے۔ پر آپ نے اپنے راستے لمبے کر لئے ہیں۔"

"سنو..... جو واقعات میری زندگی میں پیش آ رہے ہیں اگر میں ان سے گریز کروں تو میرا نظریہ ہی بدل جائے گا۔"

"مہان ستو! اصل میں آپ نے اپنے راستے پہچانے نہیں ہیں۔ ان راستوں پر
بہت سی شاخیں نکلتی ہیں اور بہت سی قوتیں آپ کو ان راستوں پر بھٹکا رہی ہیں۔ آپ
ایک سیدھا راستہ اختیار کرنا ہے۔ آپ کو بھوج پتر دیا گیا ہے، اس بھوج پتر پر آپ اپنے
راستوں کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ حالانکہ آپ اس کا تجربہ
کر چکے ہیں کہ بھوج پتر پر جو کچھ ہوتا ہے بالکل سچ ہوتا ہے۔"

"تو پھر میں انتظار کروں گا کہ میرا ذہن تمہاری بتائی ہوئی سچائیوں کو قبول کرے۔"

"مہان ستو، آپ جتنا راستہ لمبا کرتے جائیں گے اتنے ہی آپ کے راستے کٹھن
ہوتے چلے جائیں گے۔ آپ بالکل اس طرح نہ سوچیں، خود کو ستندر سر دھان کے راستے
پر لگا دیں۔ اور اگر آپ نے اپنا راستہ خود کھوٹا کیا تو بدھی ستو، وہ پریشانی بھی آپ کو اکیلے
ہی اٹھانی پڑے گی جس کے چھوٹے چھوٹے نظارے آپ دیکھ چکے ہیں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہ تختی جو آپ نے ہمیں دی ہے، آپ کو اس کا گیان حاصل کرنا ہوگا اور اس کے
بعد آپ نیل سنگھاسن تک جا پہنچیں گے۔"

"میں نہیں جانتا کہ میں ایسا کبھی کر سکوں گا یا نہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میرا دل
یہ سب کچھ کرنے کو چاہتا بھی نہیں ہے۔ میں اپنی پسند اور اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہوں۔"

"مہا بدھی ستو...... ایسی بات نہ کریں۔ سنسار کا توازن بگڑ جائے گا۔ وہ سب کچھ
نہیں ہو پائے گا جو سوچا جاتا رہا ہے۔ ایسا نہ کیجئے مہان بدھی ستو، بڑی مشکل پیش آ
جائے گی۔"

"بہر حال میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں، غور کرنا چاہتا ہوں میں۔" میں نے کہا اور مجھے
یوں لگا جیسے میری پلکیں آپس میں جڑتی جا رہی ہوں۔ ایک لمحے کے لئے مجھ پر نیند کا
جھونکا طاری ہوا تو میرے کانوں میں بارمیڈس کی مترنم آواز ابھری۔

"یہ تو غلط ہے۔ اتنا حسین ماحول، ایسے دلکش نظارے اور آپ گم صم بیٹھے ہوئے
ہیں۔"

میں نے چونک کر گردن جھٹکی، رائینہ اور جولیانہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں
شدتِ حیرت سے آنکھیں پھاڑنے لگا اور میرے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ ابھی چند
قدم پہلے تو اتنی دور چل کر گیا تھا اور میں نے اس پگوڈے میں وہ تمام مناظر دیکھے تھے۔

بے اختیار میری نگاہیں سامنے کی جانب اٹھ گئیں اور پھر میں بوکھلائے ہوئے انداز میں
گردن گھمانے لگا۔ اس پگوڈے کا اب کہیں وجود نہیں تھا۔ بارمیڈس کسی قدر الجھی ہوئی
نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی، پھر بولی۔ "لگتا ہے آپ ذہنی طور پر منتشر ہیں۔ جولیانا! تم
نے اپنے مہمان کی کوئی خاطر نہیں کی۔"

میں کچھ اس طرح نڈھال ہو گیا تھا ان تمام حالات سے کہ میں نے اپنے آپ کو ان
کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے مجھے کیا پلایا اور میں نے ان کے ساتھ کیسے لمحات
گزارے اس کے کچھ نقوش میری آنکھوں میں تو تھے لیکن صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ یہ
سب کیا ہوا ہے۔

بہر حال میں خاصا الجھ گیا تھا اور مجھ پر ایک شدید غنودگی سی سوار ہو گئی تھی۔ پھر نجانے
کب ہوش آیا۔ لیکن جب ہوش آیا تھا تو جو منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا وہ میرے
ہوش و حواس چھین لینے کے لئے کافی تھا۔ ایک عجیب و غریب جگہ تھی اور میری سمجھ میں
نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں ایک برفانی علاقے میں تھا۔ میرے قرب و جوار
میں برف میں نہائے ہوئے چیڑ کے درخت کھڑے ہوئے تھے اور میں ایک ایسے ہی
درخت سے ٹیک لگائے اپنے دل و دماغ کو یکسو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعض خواب
بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ خواب میری زندگی کا سب سے انوکھا خواب تھا۔ چیڑ کا
کوئی جنگل معلوم ہوتا تھا پورے کا پورا۔ لیکن علاقہ ایسا تھا جہاں ہر طرف برف ہی برف
نظر آ رہی تھی۔ سردی بھی اچھی خاصی تھی۔ میں نے اپنے سینے کو جکڑنے کے لئے دونوں
ہاتھ اپنے جسم پر گھمائے تو مجھے یوں لگا جیسے میں انتہائی گرم اور قیمتی سوٹ پہنے ہوئے
ہوں۔ زور زور سے آنکھیں جھٹکیں اور اپنے آپ پر غور کرنے لگا۔ میرے پیروں کے
برابر ہی ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی خواب نہ دیکھ رہا ہوں۔
ایک بار پھر میں نے آنکھیں بند کر کے یہ غور کیا کہ ابھی مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ بارمیڈس
رائینہ اور جولیانا دونوں یاد آ گئیں اور وہ ہٹ بھی اور سامنے نظر آنے والا پگوڈا بھی۔
حکمت اور اس کے بعد ماضی کے بہت سے واقعات۔

دفعتہً ہی مجھے اپنے پیچھے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور میں گردن جھٹک کر
اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ خونخوار کتے میری ہی جانب آ رہے تھے۔ میں نے گردن گھما کر
دیکھا، بہت سے لوگوں کی آوازیں ہی نہیں بلکہ شکلیں بھی نظر آئیں۔ وہ میری ہی طرف آ

رہے تھے اور ان کے جسموں پر فوجی وردیاں تھیں۔ یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ خواب ہے یا حقیقت؟ حقیقت کا تو خیر تصور ہی نہیں کر سکتا تھا لیکن خواب میں کیا اس طرح ہوش و حواس قائم رہ سکتے ہیں؟ کتوں کے پیچھے گھسٹ کر آنے والوں نے مجھ پر گنیں تان لیں اور پھر ان میں سے ایک شخص غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"برٹش جاسوس۔"

انہوں نے اپنی اپنی رائفلیں مجھ پر تان لیں اور میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے بلکہ ایک انوکھی سچائی ہے۔ میرے ہاتھ خودبخود اوپر اٹھ گئے۔ فوجی افسر نے اپنی رائفل سے ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور بولا۔

"اس کے سوٹ کیس کی تلاشی لو۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تلاشی لو۔"

سپاہی نے بڑے زور سے مجھے دھکا دیا اور چیڑ کے ایک درخت سے پشت لگا کر مجھے کھڑا ہونے کے لئے کہا۔ میں خاموشی سے ان حالات سے نمٹ رہا تھا۔ دل و دماغ کی جو حالت تھی اس کا اندازہ تو باآسانی کیا جا سکتا تھا۔ یہ انوکھی افتاد پڑی تھی۔ اور اگر خواب نہیں تھا تو سوچنے کی بہت سی باتیں موجود تھیں۔ میں یہاں تک کیسے آ گیا؟ یہ سب ہوا کیا ہے؟

میرے پورے بدن کی تلاشی لی گئی اور اس کے ساتھ ہی سوٹ کیس کی بھی۔ لیکن ان کے رویے میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"مگر تم اس طرح جرمنی میں کیوں داخل ہوئے ہو؟" مجھ سے سوال کیا گیا اور میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ج... ج...... جرمنی؟" بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔ سامنے کھڑے ہوئے افسر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم انگریز جاسوس ہو۔ برٹش نیوی سے تمہارا تعلق ہے اور تم جاسوسی کے لئے یہ سرحد عبور کر کے اندر داخل ہوئے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو جرمن بیوقوف ہیں؟ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے ہمیں کہ تم ہندوستانی ہو اور تمہارا نام خاقان جمشیدی ہے۔ بولو، کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں؟"

مجھ پر جو کچھ بیت رہی تھی وہ تو میں ہی جانتا تھا۔ ان لوگوں کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ انتہائی وحشی قسم کے لوگ ہیں۔ لیکن اس قدر معلومات کے ساتھ مجھے برٹش نیوی

کے ایک رکن کی حیثیت سے جو مخاطب کیا جا رہا تھا وہ میرے لئے موت کے نشان کی مانند تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ میں نے اگر ان سرپھرے فوجیوں سے بحث کرنے کی کوشش کی تو یہ مجھے کتے کی موت مار دیں گے۔ بہرحال اب صورتحال بڑی سنگین ہو گئی تھی۔ وہ لوگ مجھ سے میرے کاغذات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے نہ یہ سوٹ کیس میرا تھا نہ میرے لباس میں ایسا کوئی کاغذ تھا۔ اب انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام خاقان جمشیدی ہے، یہ ایک الگ بات ہے۔

بہرحال وہ مجھے وہاں سے آگے لے گئے۔ تھوڑے فاصلے پر چوکی بنی ہوئی تھی اور یہاں عارضی طور پر مجھے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔ کمرہ کیا تھا بس ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ لکڑی کی ننگی دیواریں، زمین سے اونچا فرش۔ بیرک نما جگہ تھی۔ وہ لوگ مجھے بند کر کے چلے گئے تو میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس افتاد کے بارے میں نئے سرے سے غور کرنے لگا۔ وہ دونوں لڑکیاں یعنی جولیانا اور رائینہ عام سے حالات میں مجھے ملی تھیں۔ حکمت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ ہوا کیا تھا؟ کیوں ایسا ہو گیا تھا؟ اور میں کس جال میں پھنس گیا تھا؟

وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نجانے کیا کیا چکر چلائے ہوئے تھے۔ اب تو دماغ کی چولیں بھی ہل گئی تھیں اور عقل ساتھ دینا چھوڑ چکی تھی۔ البتہ بہت سے دوسرے ایسے خیالات دل میں آ رہے تھے جو پریشان کن تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ لوگ مجھے بدھ مت کے ایک اوتار کا درجہ دینا چاہتے تھے لیکن ابھی تک میں انہی کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ بذاتِ خود مجھے کوئی ایسی طاقت نہیں دی گئی تھی جس سے میں اپنے طور پر بھی کم از کم اور کچھ نہیں تو اپنی بچت ہی کر سکتا۔ کتنی ہی بار ایسے خطرناک ترین حالات سے واسطہ پڑا تھا۔ ہشمان ذکری کی اس حویلی میں جہاں پلے ہوئے چیتے موجود تھے اور جہاں بیچاری اینہ ملی تھی، میری زندگی لمحہ لمحہ موت سے ہمکنار رہی تھی۔ بس وقت اور حالات اور میری جدوجہد نے ہی مجھے بچایا تھا ورنہ نہ میری مدد وردان سادھانی نے کی نہ سیوک سندھورتی نے۔ کوئی ایسی قوت مجھے حاصل نہیں تھی جس سے میں خود بھی اپنے طور پر کوئی عمل کر سکتا۔ کہاں ہو تم دونوں، اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ بڑا دیوتا بنائے ہوئے تھے مجھے۔ مہتر بدھ، بدھی ستو اور نجانے کیا کیا۔ اب یہاں اس طرح ان دنیا داروں کے عتاب کا

شکار ہو کر پڑا ہوا ہوں اور آنے والے وقت میں نجانے میرے ساتھ کیا ہوگا۔ بہر حال کسی
رعایت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے پھر اس جگہ سے نکالا گیا اور اس بار مجھے اعلیٰ افسروں کی ایک
جماعت کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کم بختوں نے مختلف قسم کے سوالات کر کر کے میری
ناک میں دم کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے میں انہیں اور کیا بتاتا۔ البتہ ایک اور نئی چیز کے بارے
میں بتایا گیا، وہ یہ کہ انہوں نے مجھے میری کچھ تصویریں بھی دکھائی تھیں اور ان تصویروں
میں، میں برٹش نیوی کی وردی میں ملبوس تھا۔ میری حیرت آخری حدود کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ
تصویریں اس وقت کی تھیں جب میں جہاز پر اپنے دوست کے پاس چھپا ہوا تھا اور اس
نے مجھے بحریہ کی وردی فراہم کی تھی۔ کئی تصویروں میں برٹش نیوی کا وہ جہاز بھی نظر آ رہا
تھا اور اس کا نام بھی۔ گویا کسی طرح کا شبہ نہیں تھا۔

بہر حال یہ لوگ مجھ سے معلومات حاصل کرتے رہے۔ میرے پاس کہنے کے لئے
کچھ نہیں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی کے اندر بند کر دیا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں
پہلے مجھے بند کیا گیا تھا بلکہ ایک دوسری جگہ تھی جہاں صرف ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔
میں نجانے کب تک اس چارپائی پر پڑا اپنی تقدیر کو کوستا رہا۔

صبح نو بجے ایک سپاہی اندر آیا اور مجھے اپنے ساتھ چوکی میں ایک بڑے کمرے میں
لے گیا جہاں ایک میجر اور ایک کیپٹن میرا بیان لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک
عورت بھی تھی جو میرے لئے اجنبی تھی۔ میجر نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا اور میز کی
دراز سے میرا پاسپورٹ نکال کر اس پر لگی تصویر سے مجھے شناخت کیا پھر اس نے کہا۔

''ہوں...... تم اس علاقے میں آنے کی وجہ بتاؤ؟''

''آپ یقین کیجئے، مجھے بے ہوشی کے عالم میں یہاں پہنچایا گیا ہے۔''

''بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم برٹش ایجنٹ ہو۔ کسی خاص
مقصد کے تحت جرمنی کے اس علاقے میں داخل ہوئے ہو۔ یہ دیکھو۔'' اس نے ایک نقشہ
نکال کر میرے سامنے پھیلا دیا اور میں نقشے پر جھک گیا۔ پھر میں نے خالی خالی نگاہوں
سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ''یہ تمہارے سوٹ کیس سے برآمد ہوا ہے۔''

''مم...... میرے سوٹ کیس سے؟'' میں نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔

''ایکٹنگ مت کرو۔ ہم اتنے نادان نہیں ہیں کہ تمہاری اس چالبازی کو نہ سمجھیں۔

میں بہت جلد یہ ثابت کر دوں گا کہ تم برطانوی سیکرٹ سروس کے آدمی ہو۔ کیا سمجھے؟ اور
اب تمہیں ہمارے سوالات کے جوابات دینا ہوں گے۔''

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے آپ کو اس کے
لئے تیار کر لیا۔ اب حماقت کی دنیا سے نکل کر عقل سے کام لینا چاہئے ورنہ یہاں کھال
اتر جائے گی اور کوئی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھئے جناب۔''

''گڈ...... یہ ہوئی نا بات۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جرمنی میں برطانیہ کے خفیہ فوجی اڈے کہاں
کہاں قائم ہیں اور ان کی پوزیشن کیا ہے؟''

''برطانیہ کا سب سے بڑا فوجی اڈا ہینور میں ہے جہاں ٹینک ڈویژن موجود ہے۔''

''ہوں...... بولے جاؤ۔''

کلکتہ میں، میں نے اپنے برطانوی دوستوں سے اور کچھ ایسے لوگوں سے جو میرے
ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے ان جگہوں کے بارے میں تفصیل وغیرہ سنی تھی اور وہ میرے
ذہن میں موجود تھی۔ میں نے اسی کے مطابق فضول بکواس شروع کر دی۔ لیکن میری اس
بکواس سے جرمن میجر بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''ویری گڈ...... اب تم مجھے اپنی ملٹری سروس کے بارے میں بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں
کہ اگر تمہاری اطلاع درست پائی گئی تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔''

''آپ یقین کریں جناب! کہ میں نے اب تک آپ کو جو معلومات دی ہیں، انہی کی
بنیاد پر مجھے وطن واپس پہنچتے ہی شوٹ کر دیا جائے گا۔''

''گھبراؤ مت، ہم تمہارا بیان خفیہ رکھیں گے اور تمہاری حکومت کو تمہارے اس بیان
کے متعلق بالکل نہیں پتہ چل سکے گا۔ تم پورے اطمینان سے ساری بات بتا دو۔ بتاؤ، تم
برطانوی فوج میں کیا کام کرتے ہو؟''

''میرا کام دہشت پسند گروہ کے ساتھ مل کر تخریبی کام کرنا ہے۔ ٹرینوں کو بم سے
اڑانا، ہوائی جہاز تباہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔''

''ہوں، مجھے پہلے ہی شبہ تھا، تمہارا کیس معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔ تمہیں اب اعلیٰ
حکام کے سامنے بیان دینا ہوگا۔'' اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا۔
اس کے بعد مجھے ایک گارڈ کے حوالے کر دیا گیا جو مجھے اسی کوٹھڑی میں لے گیا۔ اس نے

مجھے بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

دوسرے روز ایک اردلی کے سوا جو میرے لئے کھانا لایا تھا میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب نجانے میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ بہر حال بڑی سنگین صورتحال ہو گئی تھی اس بار۔ جس نے بھی میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا وہ بہت ہی ذہین اور طاقتور آدمی تھا۔ خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ۔ اب کیا ہوگا؟ اب تو یہاں بچنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔

رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں اسی چارپائی پر دراز تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک لیفٹیننٹ اندر آیا اور مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ رات کے مہیب سناٹے میں سرحدی چوکی کے باہر ایک جیپ کھڑی تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح سپاہی بھی تھے۔ لیفٹیننٹ نے مجھے جیپ میں بٹھایا اور میرے قریب بیٹھ گیا اور آخر کار ہم ایک نامعلوم منزل کی جانب چل پڑے۔ تھوڑا فاصلہ طے ہوا تو میں نے کہا۔

''جناب! مجھے اس وقت کہاں لے جایا جا رہا ہے؟''

''بکواس بند کرو خاموش بیٹھے ہو۔ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔'' لیفٹیننٹ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے تک جیپ ایک سنسان اور تنگ سڑک پر دوڑتی رہی جس کے دونوں طرف تاریک جنگل تھا۔ ٹھیک دو بجے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک بڑی سی عمارت کے صدر دروازے پر جیپ روکی گئی۔ یہ عمارت اپنے حلیے سے جیل خانہ معلوم ہوتی تھی۔ لیفٹیننٹ مجھے لے کر جیلر کے پاس پہنچ گیا۔ جیلر تھا یا جا... وہ مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے عمارت کے اندر داخل ہو گیا جہاں بہت سی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کوٹھڑی کے سامنے وہ رُکا اور اس نے آہنی دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے دھکا دیتا میں خود ہی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جیلر جب دروازہ بند کر کے چلا گیا تو میں نے ٹٹول کر دیکھا، وہاں کوئی چارپائی وغیرہ نہیں تھی، فرش پر صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں چھوٹی سی ٹیبل پڑی ہوئی تھی اور ایک دوسرے گوشے میں ایک لوہے کا گندا سا کموڈ پڑا ہوا تھا جس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ دروازے کے علاوہ اس کمرے میں دو فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی ایک کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے چٹائی کو کموڈ سے دور گھسیٹ کر اس پر اپنا کوٹ بچھایا اور ٹانگیں سکوڑ کر سونے

کی کوشش کرنے لگا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ اس جیل خانے کے اندر میرے علاوہ اور بھی بہت سے قیدی جمع ہیں جن کی کوٹھڑیوں سے مختلف آوازیں میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں اور کچھ اس طرح کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

معبود کریم! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے گناہ کئے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ان گناہوں میں سو فیصدی میرا ہاتھ نہیں تھا۔ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جب آنکھ کھلی تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اگرچہ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور میں کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا لیکن ایک آواز نے زور سے کہا۔

''چھ بج گئے ہیں۔ سات بجے تک ناشتہ ملے گا۔ تیار ہو جاؤ۔''

بہر حال مجھے تیار ہونا تھا۔ ناشتے کا اہتمام ایک سارجنٹ کے سپرد تھا۔ بے پناہ لمبا تڑنگا اور قوی ہیکل تھا۔ ٹھیک سات بجے ناشتہ آ گیا۔ ایک بھدے سے چینی کے پیالے میں گرم گرم قہوہ اور اُبلے ہوئے نمکین چاول دروازے میں سے ایک سپاہی نے مجھے تھمائے تھے۔ میں نے عجیب سے انداز میں ان چیزوں کو دیکھا۔ ماضی کی ایک لہر میرے ذہن سے گزر گئی اور میں یہ سوچنے لگا کہ وقت کیسی کیسی کہانیاں تحریر کرتا ہے۔ بظاہر تو اس وقت میں جس جنجال میں پھنسا ہوا تھا اس سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میری زندگی بدترین حالات سے دوچار ہوئی تھی۔ کیا کرنا چاہئے۔ آخر کیا کرنا چاہئے؟ اور میرا ذہن فضاؤں میں تحلیل ہونے لگا۔

☆

ایک پراسرار سا تصور، ایک انوکھا خیال میرے دل و دماغ میں سرایت کرنے لگا۔ اس وقت کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ نہ زردان سادھانی، نہ سیوک سندھورتی نہ کوئی اور۔ گاشر برم میں جو آوازیں میرے کانوں تک پہنچائی گئی تھیں اور جس طرح انہوں نے مجھے اپنا دیوتا بنانے کی کوشش کی تھی اور میرے راستوں میں آنکھیں بچھائی تھیں، کہاں چلے گئے وہ سارے کے سارے؟ اور کلاڈیا جس نے مجھے بڑی انوکھی تلقین کی تھی اور جو صحیح معنوں میں سب سے زیادہ پراسرار کردار تھی، آخر کس طرح غائب ہو گئے یہ لوگ؟

میں چٹائی پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اندر ہی اندر میں اپنے ان مددگاروں کو یاد کر رہا تھا اور نجانے کیا کیا الفاظ میری زبان سے نکل رہے تھے۔

پھر ٹھیک دو بجے میرا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ وہی لمبا تڑنگا سارجنٹ دروازہ کھول رہا تھا۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور پھر ایک وسیع و عریض کمرے میں لے گیا۔ یہاں کئی نوجوان لڑکیاں پانی کے ٹب میں قیدیوں کے کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ کمرہ بیک وقت غسل خانہ اور باورچی خانہ ہے۔ سارجنٹ نے الماری سے ریزر اور آئینہ نکال کر میرے سامنے کیا اور لڑکیوں سے کہا۔

”اس کے لئے نہانے کا بندوبست کر دو۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ لڑکیاں حیرت سے مجھے دیکھتی رہی تھیں۔ میں ان کی قومیت کے بارے میں صحیح طرح اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون ہیں، جرمن ہیں یا فرنچ ہیں یا برٹش وغیرہ۔ لیکن پھر ان میں سے ایک نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

”تم نے کیا جرم کیا ہے؟“

”بس کوئی جرم نہیں کیا۔ میں انڈین ہوں اور یہ لوگ مجھے جاسوسی کے الزام میں پکڑ کر لائے ہیں۔“

لڑکیوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ مجھے بے حد خوفزدہ محسوس ہوئی تھیں۔

اس کے بعد میں نے ان سے بہت سے سوالات کئے لیکن ان میں سے کسی نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے میرے لئے ایک ٹب میں پانی بھرا اور صابن دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف چور نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں اور کافی خوفزدہ ہیں۔

میں نے جلدی جلدی شیو بنائی اور غسل سے فارغ ہو کر کپڑے پہن لئے۔ سارجنٹ ہاتھ میں رائفل لے کر نمودار ہوا اور مجھے کوٹھڑی میں لے گیا۔ میرا خیال تھا یہ لوگ پھر مجھ سے معلومات حاصل کریں گے۔ لیکن پورا دن، رات اور تقریباً اسی طرح آٹھ دن گزر گئے۔ اب یہ قید تنہائی مجھے ناقابل برداشت عذاب کی مانند لگ رہی تھی۔ پینے کے لئے وہی قہوہ اور کھانے کے لئے نمکین اُبلے ہوئے چاولوں کے علاوہ مجھے کچھ نہ دیا گیا۔ ایک بار میں نے ان سے شکایت بھی کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

نویں روز چار بجے مجھے پھر کوٹھڑی سے نکال کر کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک فوجی افسر میرا منتظر تھا۔ گفتگو کا آغاز ہوا۔

”ہاں، تو تم کو اپنے بارے میں کچھ اور کہنا ہے؟ دیکھو جتنی جلدی تم حقیقتیں اُگل دو گے اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ہم نے ابھی تک تم پر تشدد نہیں کیا لیکن تم ہمیں مجبور کر رہے ہو۔“

”میں نے جو کچھ بتایا اس سے زیادہ میں کچھ جانتا بھی نہیں ہوں۔“

”سوچ لو۔“

”سوچنا تو آپ کو ہے جناب۔ میں تو آپ کا قیدی ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ کچھ دیر تک ٹیلی فون پر کسی سے بات کرتا رہا اور اس کے بعد اس نے گھنٹی بجا کر اسی سارجنٹ کو بلایا اور سارجنٹ نے مجھے پھر کمرے میں پہنچا دیا۔ مزید دس روز تک میں اسی کوٹھڑی میں بند رہا۔ اب مجھے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ گیارہویں دن مجھے پھر اسی افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ مجھ سے سوالات کرنے لگا جن کا میں نے وہی جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، تم یوں نہیں مانو گے۔ لیکن ہم تمہیں مجبور کر دیں گے کہ تم ہمیں مزید اور کچھ بتانے پر مجبور ہو جاؤ۔ کیا سمجھے؟“

”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہو۔“

”وہ سب کچھ جس کے لئے تم یہاں آئے تھے۔ تمہارے پاس سے ان علاقوں کے

نقشے دریافت ہوئے تھے۔"

"یقین کرو وہ سوٹ کیس ہی میرا نہیں تھا جو تمہیں ملا۔ میں اسکندریہ میں تھا اور
کے بعد اسمگلروں کا ایک گروہ مجھے اپنے جال میں پھانس کر نیپلز لے آیا اور نیپلز سے
نجانے کس طریقے سے یہاں تک پہنچا دیا گیا۔"

"بالکل بکواس...... تمہارے کاغذات، تمہارا پاسپورٹ، تمہاری بحریہ کی وردی
بات تو طے ہے کہ تم انڈین ہو۔ تم نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔"

"آہ...... تب تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں ایک پراسرار الجھن میں
ہوا ہوں۔ کیا تمہیں یہ معلوم ہے کا شر برم کے بدھ مجھے اپنا دیوتا بنانا چاہتے ہیں۔"

جواب میں وہ شخص ہنس پڑا اور بولا۔ "اب تم پاگل بننے کی کوشش کر رہے ہو۔
اب ہم تمہیں ایک ایسے جیل خانے میں بھیج رہے ہیں جہاں جاسوسوں کو ہلاک کرنے
سوا وہ ہر ممکن اذیت دی جا سکتی ہے جس کا تصور انسانی ذہن میں آ سکتا ہے۔ کیا سمجھے

"تمہارا جو دل چاہے کرو۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ اب مجھے احساس ہوا تھا کہ
تک بلاوجہ وقت ضائع کیا ہے۔ صحیح معنوں میں، میں ایک ناکام انسان تھا۔ ماں
نے مجھے نجانے کس مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اگر میرے والد شکاری نہ ہوتے اور
طرح مجھے اس بدھ مندر تک نہ لے جاتے جہاں میں مجسمے کی آغوش میں جا بیٹھا تھا
سب کچھ نہ ہوتا۔ تعلیم حاصل کرتا اور کسی اچھے عہدے پر کام کر رہا ہوتا۔ سب کچھ جو
ہو گیا تھا۔ کلکتے میں مجھے بدمعاش ہیگ ملا تھا جس نے میری زندگی کا جغرافیہ ہی پلٹ
تھا۔ ویسے میری زندگی کا جغرافیہ پلٹنے والے تو بہت سے لوگ تھے مگر اب سب کے
پیچھے ہٹ گئے تھے۔ گویا مجھے امتحان کی ایک دنیا میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ٹھیک ہے دوست
میرا امتحان لے لو اور اس کے بعد فیصلہ کرنا میرا کام ہوگا کہ اب مجھے آگے کیا کرنا چا
اس وقت اگر کوئی قوت میری مدد کر سکتی ہے تو میں اس سے مدد مانگتا ہوں۔ لیکن اس
بعد اگر کسی بھی پراسرار قوت نے مجھے اپنا پیروکار بنانے کی کوشش کی تو خدا کی قسم میں
فریب کروں گا صرف فریب۔ اور اگر یہیں اسی جگہ موت لکھی ہوئی ہے تو یہ بھی سہی۔

دفعتہً ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے خدا کی قسم کھائی تھی۔ اس کا مط
ہے کہ میں اپنے اندر ایک استحکام رکھتا ہوں۔ خدا میرا اول و آخر ہے۔ پراسرار قوتیں
کسی بھی راستے پر لے جائیں، میں اپنی حیثیت میں اٹل ہوں۔ یعنی وہ حیثیت جو

ابتداء ہے۔

ویری گڈ...... ایک عجیب سا اعتماد، ایک عجیب سا احساس میرے دل میں پیدا ہوا اور
نجانے کیوں ہلکی سی سکون کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ لیکن عارضی۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے
جس قید خانے میں پہنچایا گیا تھا وہ واقعی ایک ہولناک جگہ تھی۔ قید خانے کے منتظم نے
سب سے پہلے میرے کپڑے اتروا کر میری تلاشی لی اور مطمئن ہو کر مجھے قید خانے کی
کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا۔ یہ کوٹھڑی پچھلی کوٹھڑیوں کی نسبت کچھ کشادہ تھی اور یہاں
چارپائی پر ایک نرم گدا بھی پڑا ہوا تھا۔ دروازے میں چھوٹا سا بلب لگا ہوا تھا جو ہر وقت
جلتا رہتا تھا۔

کوٹھڑی میں داخل ہو کر میں بستر پر لیٹا اور بے خبر سو گیا۔ اب میں اپنے آپ کو حالات
سے بے پرواہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک فوجی نے مجھے آ کر جھنجھوڑا۔
تھکن، جھنجھلاہٹ اور نیند کے باعث میں اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھا۔ بہرحال یہ
یاد تھا کہ قید خانے میں ہوں۔ چنانچہ ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح میں اس سپاہی کے
ساتھ لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا چل پڑا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز کے
پیچھے چار فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے مجھ سے میرے بارے
میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ مجھ پر نیند اور تھکن غالب تھی لیکن میں جانتا تھا
کہ ان کے لئے مجھ پر تشدد کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ ایک افسر اعلیٰ نے کہا۔

"اپنے بارے میں، اپنے باپ کے بارے میں، اپنے بچپن اور بچپن سے اب تک
تمام تفصیل رُکے بغیر بتاتے چلے جاؤ۔ اور خبردار، رُکنے کی کوشش مت کرنا۔"

میں اپنے بچپن اور ماضی کے بارے میں نجانے کیسی کیسی باتیں سوچنے لگا۔ لیکن
بہرحال ان کا اظہار ان لوگوں کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ دماغ پر قابو بھی مشکل ہو رہا
تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں نجانے کیا کیا بکواس کرتا رہا تھا ان سے۔ یہاں تک کہ
میرا سر چکرانے لگا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا اور جب ٹانگیں کانپنے لگیں تو میں فرش پر
بیٹھ گیا۔ مجھے کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ نجانے کتنے گھنٹوں تک یہ بدبخت مجھ
سے سوالات کرتے رہے تھے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ میں بولنے پر بھی قادر نہیں
رہا تو دو سپاہیوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ اور پھر کوٹھڑی
میں لا کر پھینک گئے۔ نجانے کتنی دیر مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری رہی تھی کہ دروازہ

پھر کھلا اور ایک سپاہی نے آ کر مجھے اٹھانا چاہا۔ لیکن نقاہت کی وجہ سے میں حرکت کرنے
کے قابل بھی نہیں تھا۔

"آہ..... میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میری کیفیت بہت خراب ہے۔ میں اٹھ بھی نہیں سکتا۔"

"کتے کے بچے! بہت زیادہ نخرے مت کرو۔ اٹھو، تمہیں ڈیوٹی آفیسر بلا رہا ہے۔"

دفعتہً ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت مجھ میں قوت کی
لہر کہاں سے آ گئی تھی کہ میں نے لیٹے ہی لیٹے سپاہی کے دونوں پاؤں پکڑ کر اسے نیچے گرا
دیا اور پھر اس پر اندھا دھند گھونسوں کی بارش کر دی۔ سپاہی پہلے تو ششدر رہ گیا تھا
لیکن جب میرے گھونسے اس کے جبڑوں پر پڑے تو اس نے اپنی مدافعت کے لئے میرا
گلا دبانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اونچی آواز میں دوسرے سپاہیوں کو
پکارنے لگا۔ اسی اثناء میں، میں نے اسے خوب پیٹ لیا تھا۔ آخر کار وہ بھاگنے میں
کامیاب ہو گیا۔ اس نے جلدی سے دروازے میں تالا لگایا اور دیوانوں کی طرح چیختا ہوا
دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف لپکا اور پھر دو ہی منٹ کے بعد میں نے لکڑی کی
سیڑھیوں پر بہت سے قدموں کی آوازیں سنیں۔ وہی سارجنٹ اور اس کے ساتھ کئی مسلح
سپاہی اور گارڈ جن میں وہ سپاہی بھی شامل تھا جس کی میں نے مرمت کی نمودار ہو گئے اور
ایک لمحے کے اندر اندر صورتحال میرے ذہن میں واضح ہو گئی۔ وہ حشر کریں گے یہ لوگ
میرا کہ مزا آ جائے گا۔ چنانچہ میں نے پاگل بن جانا ہی بہتر سمجھا۔ انہیں دیکھتے ہی میں
نے حلق پھاڑ پھاڑ کر گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔ جیکٹ
اتار کر پھینکی، انگلیاں دانتوں سے کاٹیں اور دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔ یہ ترکیب بہتر
ثابت ہوئی۔ وہ میری ان وحشیانہ حرکتوں کو دیکھتے رہے۔ جب میں نے دیکھا کہ
سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے تو میں نے ایک خوفناک نعرہ لگایا اور اس کی
جانب لپکا۔ وہ گھبرا کر پیچھے مڑا اور سپاہیوں سے کچھ کہنے لگا۔ ان سب نے جلدی سے
دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب کے سب وہاں سے چلے گئے۔ میں نے
اطمینان کا سانس لیا تھا۔ میری یہ تدبیر کارگر ہوئی ورنہ وہ مار مار کر میرا بھرتا بنا دیتے۔

تیسرے دن البتہ میں نے اپنے آپ کو پُرسکون ظاہر کیا تھا۔ پہلے انہوں نے مجھے تنگ
کیا اور یہ دیکھنا چاہا کہ میں مستقل پاگل تو نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن میں نے ایک لمحے کے
لئے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پاگل بنا رہوں گا۔ اور اس

کے بعد میں پھر شروع ہو گیا۔ دوسرے افسران میری حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ
یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں یا صرف اداکاری کر
رہا ہوں۔ لیکن یہی وقت ایسا تھا اور ویسے بھی سچی بات یہ ہے کہ ان حالات نے مجھے
پاگل ہی کر دیا تھا۔ جس قدر ہنگامہ آرائی کر سکتا تھا، میں نے کی اور وہ لوگ مجھے بند کر
کے چلے گئے۔ اس کے بعد پھر چھ دن اسی طرح گزر گئے۔

ساتویں دن مجھے کوٹھڑی سے نکالا گیا، میری بھرپور تلاشی لی گئی، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں
پہنائی گئیں، آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی اور اس کے بعد جیل خانے سے باہر جا کر ایک
جیپ میں بٹھا دیا گیا جو نہایت تیز رفتاری سے ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔
جیپ تیزی سے جا رہی تھی۔ راستے میں کوئی موڑ نہیں آیا جس سے میں نے اندازہ لگایا
کہ سفر بہت لمبا ہے۔ انجن کی پُرشور آواز گہرے سناٹے کو چیرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ
رہی تھی۔ جیپ میں نجانے میرے ساتھ کون کون بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی میں مکمل خاموشی
طاری تھی۔ میری آنکھوں پر سیاہ کپڑے کی پٹی سختی سے بندھی ہوئی تھی اور ہاتھ پشت پر
بندھے ہوئے تھے۔ ذہن اس وقت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم تھا اور معمول
کے مطابق نجانے کیسے کیسے الٹے سیدھے خیالات ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

تقریباً چار گھنٹے کے بعد یہ اکتا دینے والا سفر ختم ہوا۔ راستے میں صرف دو جگہ موڑ
آئے تھے اور جیپ جس رفتار سے چل رہی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم نے
ڈیڑھ دو سو میل کا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ بہرحال اس کے بعد جیپ رکی اور مجھے جیپ
سے اتار کر کافی دور تک پیدل لے جایا گیا۔ جب میری آنکھوں سے پٹی کھلی تو میں نے
اپنے آپ کو ملگجے اجالے میں گھری ہوئی ایک عظیم الشان عمارت کے صدر دروازے پر
کھڑے ہوئے پایا۔ بہرحال یہ کوئی آبادی تھی۔ غالباً کوئی شہر۔ مجھے دروازے کے بائیں
جانب چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا اور اس کے بعد میرے ہاتھ بھی کھول دیئے
گئے۔ چند افراد وہاں موجود تھے اور وہ مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میری جو حالت
ہو رہی تھی وہ قابل رحم تھی۔

مجھے ایک بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ایک اندرونی دروازے سے ایک
شخص باہر نکلا اور اسے دیکھ کر میرے دماغ میں ایسا دھماکا ہوا کہ میری آنکھیں ہی بند ہو
گئیں...... اور دماغ میں جیسے بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ میں نے آنکھیں بھینچ کر گردن جھکا

لی تھی اور دیر تک گم صُم بیٹھا رہا تھا۔ جو چہرہ میں نے دیکھا تھا، آہ...... آنے والے شخص کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن کوئی وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ ایک کامیاب حکمران کی حیثیت اختیار کر جائے گا اور میں ایک مصیبت زدہ انسان قرار پاؤں گا۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اگر وہ سچ ہے تو میری مصیبتوں کے بادل اور گہرے ہو گئے ہیں۔ میری تقدیر میں روشنی کی کوئی کرن نہیں رہی ہے۔ آخر کار وہ منحوس آواز میرے کانوں میں اُبھری جسے میں بہت سی بار سن چکا تھا۔

''خاقان جمشیدی، میری جان! آنکھیں کھولو۔ تم اتنے کچے انسان نہیں ہو جتنا اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہو یا واقعی اپنی وہ قوتیں کھو چکے ہو جو تمہیں ممتاز کرتی تھیں۔ خاقان! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں میرے دوست! سنبھالو خود کو اور مجھ سے گفتگو کرو۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس واقعی کامیاب شخص کو دیکھنے لگا جس کا نام ہیگ تھا۔ میرا بدترین دشمن، میرا صحیح معنوں میں برباد کنندہ۔ ہیگ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے صرف کرسی گھسٹنے کی آواز سنی تھی۔ پھر میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، یہ وقت میری زندگی کا کٹھن ترین وقت تھا اور مجھے جن لمحات سے گزرنا پڑ رہا تھا بس مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ انسان کو ہر طرح کی گنجائش رکھنی چاہئے۔ اپنے آپ کو فاتح اعظم نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ وقت کی کہانی مختلف ہوتی ہے اور فیصلہ کرنے والا صرف وقت ہوتا ہے جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال میں نے اپنے آپ کو پوری طرح ذہنی طور پر سنبھال لیا اور ہیگ کو دیکھنے لگا۔ ہیگ بغور مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''نہیں، اصل میں دشمنی کا بھی ایک رشتہ ہوتا ہے۔ دوست تو خیر ہوتے ہی دوست ہیں۔ لیکن دشمنوں کا بھی ایک مقام ہوتا ہے۔ یہ ساری کہانی تمہیں دلچسپ لگنی چاہئے اگر صاحب ذوق ہو۔''

''یہ تم ہی ہو نا مسٹر ہیگ؟'' میری آواز ابھری۔

''کوئی شبہ ہے تمہیں؟''

''نہیں حیرت ہے۔'' میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''وہی میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ کسی کے بارے میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہئے۔ دراصل تمہاری تو خیر عمر بہت چھوٹی ہے، بڑے بڑے لوگ جن کی عمریں اچھی خاصی ہوتی ہیں غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''اب تم دیکھو نا، ذرا سا غور کرو۔ کلکتے میں میری تمہاری ملاقات بڑے دوستانہ انداز میں ہوئی اور اس بات کے بڑے امکانات تھے کہ اگر تم مجھ سے تعاون کرتے تو ہم لوگ دوست ہی بنے رہتے۔ تم مجھ سے منحرف ہو گئے اور عذابوں نے تمہارا گھر دیکھ لیا۔ مجھے ایک بات کا جواب دو کیا تم نے کبھی اپنے آپ کو مجھ پر فتح پاتے ہوئے دیکھا؟ ایک بار بھی نہیں۔ اس سے تمہیں یہ اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ تم بہت پیچھے کے انسان ہو میری نسبت۔ اب تم نے دیکھ لیا، تم نے وہاں کلکتہ میں میرا راستہ کاٹنا چاہا، نقصان اٹھایا۔ ایک قاتل کی حیثیت سے تمہیں اپنی پوری زندگی داؤ پر لگانی پڑی اور نجانے کیسی کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہوئے تم۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے مددگار میرے لئے حیرت ناک ہیں لیکن تم سے ان کے بارے میں بھی سوال کروں گا میں۔ بہرحال میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جو لوگ اس قدر اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں ان کے وسائل کیا ہیں۔ بس یوں سمجھو یہ میرا طریقہ کار ہے۔ میں ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو میرے خلاف کسی بھی شکل میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔''

''مسٹر خاقان! ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ پوری کہانی تمہارے سامنے کہنا چاہتا ہوں۔''

''تم چھپے چھپے پھر رہے تھے۔ اتفاقیہ طور پر تمہیں میرے سفر کے بار میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ جہاز پر کیا تم اس لئے سوار نہیں ہوئے تھے کہ تم مجھے ہلاک کر دو۔ جواب دیتے جاؤ تو زیادہ بہتر ہو گا۔''

''ہاں، میں تمہاری ہلاکت چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں۔''

''یہی تو مزیدار بات ہے۔ اگر تم یہ کہہ دیتے کہ میں معافی چاہتا ہوں ہیگ، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تو یقین کرو مجھے تم سے نفرت ہو جاتی۔ میں نے کہا نا انسان اگر اپنے آپ کو ہوش مند رکھنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اپنے دشمن بنائے۔ سمجھے۔ دشمنوں کا موجود ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح اسے جینے میں آسانی ہو جاتی ہے، وہ محتاط رہتا ہے اپنے دشمنوں سے اور اسے دنیا بڑی دلکش لگتی ہے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟ اچھا خیر چھوڑو، جہاز پر مجھے اول وقت سے معلوم تھا کہ تم موجود ہو اور اس کے بعد جہاز پر جو ہنگامہ آرائیاں ہوئیں، ان کا مجھ سے زیادہ

تمہیں علم ہے۔ بہت سے لوگ راستے میں آئے۔ اصل میں اس جہاز سے سفر کرنا میرے لئے بڑا ضروری تھا۔ چونکہ وہ شخص جس کا نام احتشام تھا مجھے اس کی بڑی ضرورت تھی اور اس سے مجھے بہت سے کام لینے تھے۔ بہرحال جہاز کا کھیل بڑا دلچسپ رہا۔ پھر ہم اسکندریہ آ گئے۔ یہاں ہشمان ذکری موجود تھا۔ میرا دوست سمجھ لو۔ دست راست سمجھ لو۔ یوں سمجھ لو میرے آدھے کاروبار کا مالک ہے وہ۔ اتنی معمولی شخصیت نہیں ہے جتنا تم نے اسے سمجھا ہو گا۔ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب وہ لوح تمہارے ہاتھ لگ گئی۔ وہ بڑا غلط ہو گیا تھا۔ اور پھر تم نے اسے اس طرح غائب کیا کہ وہ مجھے مل ہی نہیں سکی۔ بہت غور کیا میں نے۔ میں جانتا تھا کہ کچھ پراسرار قوتیں، کچھ ایسی قوتیں جن کے بارے میں صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا کہ کون لوگ ہیں، کہاں رہتے اور کہاں سے آتے ہیں؟ تمہاری مدد کر رہی تھیں۔ لوح کا میرے ہاتھ سے نکل جانا میرے لئے بڑے دکھ کا باعث رہا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے اسے کہاں پوشیدہ کر دیا اور مجھے یہ بھی حیرت ہے کہ وہ قوتیں کون سی ہیں اور ان کا تعلق کہاں سے ہے جو تمہاری مددگار رہی ہیں اور جنہوں نے بہت سے نازک مرحلوں پر اتنے حیرت انگیز طریقے سے تمہاری مدد کی ہے کہ مجھ جیسا آدمی بھی ان کا پتہ لگانے میں ناکام رہا۔ خیر چلو چھوڑو، بڑے غور و خوض کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں ان قوتوں سے اتنی دور کر دیا جائے کہ تم ان کی مدد نہ لے سکو اور میرا خیال ہے اپنی اس کوشش میں، میں بھرپور طریقے سے کامیاب رہا ہوں۔ جتنے عرصے سے تم یہاں جرمنی میں پھنسے ہوئے ہو اتنے عرصے تک میں ایک ایک لمحہ، دن اور رات تمہاری نگرانی کرتا رہا ہوں اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ وہ کون ہے جو تم تک پہنچ سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ہپناٹزم کا ماہر ہوں۔ میں نے اس سے بھی تمہارا ذہن پڑھنے کی کوشش کی لیکن تم خاموش رہے اور میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ وہ پراسرار قوتیں کون سی ہیں جو تمہاری مددگار اور محافظ ہیں۔ یہ چیز بھی میرے لئے بہت حیران کن ہے۔ چونکہ بہرحال میں اپنے اس علم میں بھی اضافہ چاہتا ہوں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟'' میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ بڑے عجیب و غریب انکشافات کر رہا تھا ہیگ۔

''تم مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا کہ میں اس سے کیا سوال کرنا پسند کروں گا۔ میرے اور اس کے درمیان

دشمنی کا جو رشتہ ہے وہ شدید ہے لیکن کرنا کیا چاہئے؟ جو باتیں اس نے کی تھیں وہ بڑی تعجب خیز تھیں۔ ہو سکتا ہے میری معلومات میں بھی کچھ اضافہ ہو جائے۔ میں نے اس سے کہا۔

''ہاں، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''بولو، بولو۔ میں تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔'' وہ نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے یہاں مجھے اس جال میں کیسے پھنسا لیا؟''

''میرے عزیز، میرے دوست! اسکندریہ میں تم کچھ لمحوں کے لئے میرے چنگل سے نکل بھاگے تھے۔ تم نے دیکھا کہ اسکندریہ کا سب سے بڑا آدمی میرے لئے غلاموں کی طرح کام کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اس قدر دولت مند ہے کہ آدھا اسکندریہ خرید سکتا ہے۔ لیکن بہرحال میرے کچھ اور نام بھی تمہارے علم میں آئے ہیں، وہ غلط نہیں ہیں۔ اصل میں ہر انسان کی اپنی ایک سوچ ہوتی ہے۔ میں نے اس دنیا میں اپنے جینے کے لئے ایک معیار مقرر کیا تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ کسی ملک کے حکمران کی حیثیت سے نہیں جیوں گا جبکہ میں اگر چاہتا تو تم یقین کرو میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں کسی بھی ملک کا وزیراعظم بن سکتا تھا یا کم از کم اس کے مساوی حیثیت حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن ان لوگوں پر بھی لاتعداد پابندیاں رہتی ہیں۔ وہ سازشوں کا شکار ہوتے ہیں اور بیشتر انہیں اپنی مرضی کے خلاف ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ یہ سب کچھ میری فطرت میں ہی نہیں تھا۔ آخر کار میں نے یہ طے کیا کہ میں کسی ایک ملک کا سربراہ بن کر نہیں بلکہ ایک ایسا انسان بن کر زندہ رہوں گا جو سربراہی کے مساوی ہو لیکن اس پر کسی کا دباؤ نہ ہو اور بس سمجھ لو میں اسی انداز میں جی رہا ہوں۔ دنیا کے لاتعداد ملکوں میں جو کچھ میں کرنا چاہوں، کر سکتا ہوں۔ میرے مختلف شوق ہیں اور میں ان کی تکمیل کرتا رہتا ہوں۔ وہ تختی جو تمہاری تحویل میں ہے اور بلاشبہ تم نے اسے کسی ایسی جگہ چھپایا ہے جہاں واقعی میری ذہنی اور عملی رسائی نہیں ہو سکی یہ میرے لئے ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ اور یوں سمجھ لو کہ میں نے اس تجربے کی تکمیل کا عہد کر رکھا ہے اور یہ عہد پورا ہو جائے گا۔ ایسا کوئی کچا کام میں کبھی نہیں کرتا جس کی تکمیل نہ کر پاؤں۔ یہاں جرمنی میں میرے پاس ایسے وسائل تھے کہ میں تمہیں ایک برطانوی جاسوس کی حیثیت سے یہاں تک لا سکوں۔ تم جانتے ہو جرمنی کا ایک الگ

حساب ہے۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کی صورتحال کا تمہیں اندازہ ہے مگر یہ خالص سیاسی عمل ہے۔ تم دیکھ لو، تمہیں جن مدارج سے گزارا گیا ہے وہ اصل میں تمہارا حوصلہ توڑنے کے لئے تھے۔ تم نے دیکھ لیا کہ جگہ جگہ تمہارے ساتھ کیا نہیں ہو سکتا تھا، میں نے ابھی تک نہیں ہونے دیا۔ لیکن میرا ایک اشارہ تمہیں تمہارے جسم کی تمام کھال سے محروم کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کی تربیت کے بارے میں تم نے پڑھ ہی لیا ہوگا کہ اذیت رسانی میں ان کا کیا مقام ہے۔ میں تمہیں دھمکیاں نہیں دے رہا، وہ سچائیاں بتا رہا ہوں جو تم جاننا چاہتے ہو۔ کیا تم مجھے کچھ بتانے پر آمادہ ہو گے؟"

"ہاں، میں آمادہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"واہ...... کم از کم یہ اظہار کر کے تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب اگر تم چاہو تو کچھ وقت بھی لے سکتے ہو۔ تم چاہو تو اپنی یہ حالت بہتر بنا سکتے ہو۔ لیکن کھیل جتنی جلدی ختم کر دیا جائے بہتر ہوتا ہے۔ بولو کیا پسند کرو گے؟"

"زبان ہی ہلانی ہے تو اس کے لئے انتظار بے معنی چیز ہوتی ہے۔ جو کچھ میں جانتا ہوں تمہیں بتا دوں گا۔ اس کے بعد تم یہ فیصلہ کر لو گے کہ تمہیں میرے ساتھ کیا کرنا ہے۔"

"ہاں، میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ اس وقت دنیا کا سب سے خطرناک ترین آدمی میرے پاس ہے۔ وہ ذہن پڑھ لیتا ہے اور اپنی قوتیں مسلط کر سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی برائی کا سوچنا احمقانہ بات ہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہیگ! جو کچھ تم نے میرے ہاتھوں کرایا اور جس طرح ہندوستان میں میرے لئے زمین تنگ ہو گئی اور مجھے انگریز دشمنی کا شکار ہونا پڑا تم جانتے ہو ایسا صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں میری جان، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کے بعد اگر میں تمہارے قتل کے چکر میں پڑ گیا تو یہ کوئی مشکل یا اہم بات نہیں تھی۔"

"اہم ہو یا نہ ہو لیکن مشکل ضرور تھی۔ کیونکہ جب تم نے میرا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور جس طرح اپنے وسائل سے کام لے کر اس جہاز میں سوار ہوئے ساری باتیں میرے علم میں تھیں۔ میں اسی جہاز میں تمہارے ساتھ سفر کر رہا تھا اور تنہا نہیں تھا۔ میرے ساتھ

بہت سے لوگ تھے لیکن اس جہاز پر سفر کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تمہیں کھلاتا پلاتا چلا آؤں۔ بلکہ اس وقت بھی وہ تختی میری توجہ کا مرکز تھی۔ میں اس سے بہت سے کام لینا چاہتا تھا۔ تم یہ سمجھ لو کہ اس وقت وہ میری اہم ترین طلب ہے اور میں تمہیں یہ بات سچ سچ بتا دوں کہ میں ابھی تک یہ نہیں جان سکا کہ وہ کون سی پراسرار قوتیں ہیں جو تمہاری مدد کر رہی ہیں۔"

"آہ، یہی تو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھ پر بچپن ہی سے مسلط ہے ہیگ! تم یقین کرنا چاہو تو یقین کر لو اور اگر یقین نہ آئے تو تمہیں تو ہپناٹزم کی قوت حاصل ہے، مجھے تنویمی نیند سلاؤ اور یہ معلوم کر لو کہ میں تم سے سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ۔"

ہیگ کی آنکھوں میں گہری سوچ کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔ "تمہاری بات وزن دار ہے۔ مجھے اس پر غور کرنا ہوگا۔ اچھا ایسا کرو تھوڑا وقت آرام کر لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں پریشانی ہو یا تم جن مراحل سے گزرے ہو اور ان میں اپنی قوتیں کھو چکے ہو......"
وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "آؤ...... ہم دشمن تو رہے ہی ہیں۔ کچھ وقت کے لئے کم از کم دوستانہ انداز اختیار کر لیں جب تک ایک بار پھر ہم ایک دوسرے کے مقابل نہ آ کھڑے ہوں۔"

دلچسپ پیشکش تھی۔ مجھے بھی بھائی اور یہ حالات کا تقاضہ تھا۔ کیونکہ جو لمحات مجھ پر بیت چکے تھے انہوں نے مجھے واقعی تقریباً دیوانہ کر دیا تھا۔ مصنوعی دیوانگی کا مظاہرہ تو میں کر ہی چکا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ سچ مچ دیوانہ ہو جاؤں۔ اب اگر ہیگ سے تعاون نہ کیا اور اپنی ضد کا مظاہرہ کرتا رہا تو جو نتیجہ ہوگا مجھے خود بھی اس کا اندازہ تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اس سے تعاون کر کے اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کروں۔ ہیگ سے انتقام لینا اگر میری تقدیر میں نہیں ہے تو مجبوری ہے۔ لیکن کم از کم یکسوئی تو نصیب ہو۔ اونٹ اس کروٹ بیٹھے یا اُس کروٹ۔

ہیگ میری صورت دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے مسٹر ہیگ! ہم ایک دلچسپ تجربے کے لئے تیار ہیں۔ آپ بھروسہ کیجئے، میں بھی کسی گھٹیا قسم کا انسان نہیں ہوں۔ جب آپ سے کوئی وعدہ کروں گا تو اس کی تکمیل بھی کروں گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو میرا رویہ تمہارے ساتھ مختلف ہوتا۔ تم ایک اچھے خاندان کے صاحب ظرف اور معیاری انسان ہو۔ تمہارا دشمن ہونے کے باوجود میں اس

بات کا اعتراف کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کب اور کن حالات میں مجھ سے کیا رویہ اختیار کرو گے۔ اب ایسا کرو میں تمہارے لئے آرام کا بندوبست کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو بالکل بہتر حالت میں پاؤ تو مجھے اس کے بارے میں بتا دینا۔ میں تم سے ملاقات کرلوں گا۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔

☆☆☆

سینے کے اندر دل کی پھڑپھڑاہٹ بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو دماغ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ یہ کمبخت دل آخر چاہتا کیا ہے؟ کیوں اس بے ترتیبی سے دھڑک رہا ہے؟ بہرحال دل کی چاہت کا تصور صدیوں پرانا خیال ہے۔ میڈیکل سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے کم از کم مجھے نہیں معلوم تھا۔ سوچیں کیا واقعی دل میں ہوتی ہیں؟ فیصلے دل کرتا ہے یا دماغ، میرے خیال میں یہ ایک بے مقصد بحث تھی۔ ہیگ جس کے لئے میں اپنی زندگی کا ایک طویل وقت ضائع کر چکا تھا، زندہ سلامت موجود تھا۔ کوئی الجھن، کوئی تکلیف، کوئی پریشانی اسے نہیں تھی۔ بلکہ یہاں مغربی جرمنی میں وہ جس انداز میں میرے سامنے آیا تھا وہ قابل رشک تھا۔ اس نے کلکتہ میں مجھے اپنا تعارف غلط نہیں کرایا تھا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا اس نے مجھے اپنے بارے میں کہ وہ ایک اسمگلر ہے۔ میں نے ہی اس کے خلاف کام شروع کیا تھا اور وہ بھی کچھ خاص وجوہات کی بنا پر۔ لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ وہ حالات کا حکمران ہی رہا تھا اور مجھے اس کے سامنے ہر لمحہ شکست ہوئی تھی۔ اس نے ہزاروں ستون میرے راستے میں کھڑے کر دیئے تھے اور مجھے اس کے مقابلے میں ناکامیوں ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور اب وہ پھر میرے سامنے آیا تھا اور یہ ایک سچائی تھی کہ ایک فاتح کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔ بالکل بے بس کر کے رکھ دیا تھا اس نے مجھے۔ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا میں اس کے خلاف۔ بہرحال یہ ایک افسوسناک امر تھا اور اب وہ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو میرے مددگار، میری پشت پر تھے۔ کہاں مر گئے سارے کے سارے؟ ویسے تو عقیدت اور محبت کے طومار باندھ دیتے تھے اور اب جب میں ایک مستقل مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا تو سب میرا راستہ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے درحقیقت دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب دھوکا دہی سے کام لوں گا اور اپنا پچھلا رویہ تبدیل کر دوں گا۔ اپنی قوتِ ارادی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمیشہ

حالات کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا تھا، لیکن اب حالات کو اپنی انگلیوں پر نچاؤں گا۔ ہیگ کو ان لوگوں کے بارے میں بتایا جائے یا نہ بتایا جائے؟ پتہ نہیں کمبخت یقین بھی کرے گا یا نہیں کرے گا۔ ویسے جب کیمپ میں میری رپورٹ لکھی گئی تھی تب بھی میں نے اپنے بچپن، سیتا گڑھی، اپنے والد کے بارے میں تو سب کچھ بتا دیا تھا لیکن گاشر برم کی کہانی انہیں نہیں سنائی تھی۔ سیوک سندھورتی، وردان سادھانی یا اور کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ حالانکہ ماشرہ، اشم سندھانی اور نجانے کیا کیا میرے ذہن میں آیا تھا لیکن میں نے سوچا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ چنانچہ میں وہاں سے گزر گیا تھا۔ تو کیا اب ہیگ کو اس بارے میں بتاؤں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہیگ میری تمام تر حقیقتیں جاننے کے بعد کوئی گڑبڑ کرے۔ بہرحال آج بھی دل میں یہ حسرت تھی کہ ہیگ سے انتقام لے لوں۔ کبھی کبھی انسان خود اپنی ذات کو نہیں سمجھ پاتا۔ میں اس دوران بہت سے کرداروں سے متعارف ہوا تھا، ان سے ذہنی قربت بھی رہی تھی میری اور جسمانی قربت بھی۔ اس کا آغاز ایلس فیوری سے ہوا تھا۔

مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطان چچا یا دوسرے لوگ مجھے میرے باپ سے منسلک ضرور کرتے تھے اور یہ بات تو خیر میرے علم میں بھی تھی کہ والد صاحب قبلہ شوقین مزاج آدمی تھے اور خاص طور سے اپنی رنگین فطرت کی بنا پر شہرت کے حامل بھی تھے لیکن میرے ذہن میں تو یہ سب کچھ یوں لگتا تھا جیسے کسی شیطانی عمل کے تحت آیا ہو اور اس میں میری اپنی کاوشوں کا دخل نہ ہو۔ یا پھر وہی دوسری بات کہ انسان اپنے آپ کو معصوم سمجھتا ہے اور کبھی کبھی اپنے ہر گناہ کو اتفاقات اور حالات سے منسوب کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہیگ کے ہاتھوں بے بس ہو جاؤں؟ کیا کروں؟ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہاں مجھے تھوڑی سی آزادی دے دی گئی ہو۔ اپنی اس قید سے باہر نکل آیا تھا۔ حالانکہ کیمپ جیسی جگہ تھی یہ بھی۔ سنتری بھی تھے اور شاید دوسرے قیدی بھی۔ لیکن اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ ہیگ کی مہربانی ہے اس نے بہتر طریقہ کار اختیار کرنے کے لئے مجھے یہ آزادی دی تھی۔

جب بے چینی ضرورت سے زیادہ ہو گئی تو میں باہر نکل آیا۔ مجھے اندر رہ کر یہ اندازہ نہیں تھا کہ باہر مدھم مدھم بارش ہو رہی ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ پر بھی میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب باہر آ کر دیکھا تو مدھم مدھم بوندوں کے ساتھ بادل بھی گرج

رہے تھے۔ ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ میں بے مقصد ٹہلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہ ایک پتلی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف اونچی دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ پیروں میں کوڑا پڑا ہوا تھا۔ غالباً کوئی ایسی جگہ تھی جہاں سے صفائی وغیرہ نہیں کی جاتی تھی۔ البتہ بدبو وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ آگے چل کر دوسری سمت اختیار کروں اور کسی ایسی زیادہ کھلی جگہ پہنچ جاؤں جہاں ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا پھیپھڑوں میں کھینچی جا سکے۔ ابھی میں آہستہ روی سے چل ہی رہا تھا کہ دفعتہً ہی کسی نے میرا بازو پکڑا اور زور سے اندر گھسیٹ لیا۔ میرے حلق سے مدھم سی آواز نکل گئی تھی۔ بازو پکڑ کر کھینچنے والے نے کہا۔

''اُلّو کے پٹھے! مجھے بھی مرواؤ گے کیا؟ اپنا حلق بند رکھو۔'' جملے انگریزی میں کہے گئے تھے۔ میرا حلق تو خیر کیا ہی بند ہوتا آواز البتہ بند ہو گئی۔ گھسیٹنے والے نے مجھے گھسیٹ کر دور تک لے جانے کا عمل کیا اور پھر بولا۔

''چلو بیٹھو، بیٹھو۔ آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔ اور کوئی حماقت کا کام نہ کرو ورنہ بیٹے، ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے بے اختیار اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس عجیب سی جگہ میں بیٹھ کر گزرنے لگا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی سرنگ ہے، تنگ اور کچھ اس طرح کی جیسے فرار کے لئے بنائی گئی ہو۔ ریت کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے اور سرنگ بہت پتلی تھی۔ آگے والا شخص ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا مگرمچھ کی طرح آہستہ آہستہ اس قبر نما سرنگ میں سفر کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ میں الٹے قدموں واپس پلٹ جاؤں لیکن نجانے کیوں میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہم دونوں ایک ایک انچ کے حساب سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی نجانے کتنا راستہ طے کیا گیا تھا کہ اوپر سے کسی کے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی۔ لیکن پھر بھی ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ میں تو بلاوجہ ہی اس چکر میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن آنے والا شخص نجانے کون تھا۔ بہرحال اس تنگ اور گھٹی ہوئی سرنگ میں رینگتے ہوئے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔ یہاں تک کہ سرنگ کا خاتمہ ہوا اور آگے والا شخص سرنگ سے باہر نکل گیا۔ شاید وہ گالیاں بکنے کا عادی تھا اس لئے اس نے انگریزی میں دو چار گالیاں اور دیں اور بولا۔

''مر گیا کیا؟ یار، تو انسان ہے یا گدھا؟ ہر مرحلے پر اسی طرح گدھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔ گیرون اُلّو کے پٹھے باہر نکل آؤ ورنہ سرنگ میں ہی زندگی ختم ہو جائے گی۔''

میں نے حیرت سے سوچا کہ یہ گیرون کون ہے؟ اور اس کے بعد صورتحال میرے ذہن میں واضح ہو گئی۔ غلط فہمی...... کوئی بہت بڑی غلط فہمی۔ یہ آگے جانے والا شخص گیرون نامی آدمی کے ساتھ غالباً اس سرنگ کے ذریعے فرار ہونا چاہتا تھا جو اس نے خود یہاں بنائی تھی۔ لیکن بدنصیب گیرون کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر میں باہر نکل آیا۔ مدھم مدھم بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ آگے والا شخص جو ایک گٹھے ہوئے بدن کا آدمی تھا منہ اٹھا کر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

''بادل گہرے ہیں، بارش تیز ہو گئی تو......'' یہ کہہ کر اس نے مجھے دیکھا اور دفعتہً ہی پیچھے ہٹ کر اچھل گیا۔ اب ایک دم اسے اندازہ ہوا تھا کہ میں گیرون نہیں ہوں۔ اس نے اپنا خنجر سیدھا کیا تو میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''اگر تمہارے پاس وقت ہے تو واپس اس سرنگ سے اندر جاؤ اور گیرون کو تلاش کر کے لے آؤ۔''

وہ بدستور مجھے گھورتا رہا۔ شکر تھا کہ اس نے حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر کافی خطرناک نظر آ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس کی آواز ابھری۔ ''تم...... تم کون ہو؟''

''صرف ایک لمحے کے لئے گزرے ہوئے حالات پر غور کرو۔ میں اس راہداری میں چلتا ہوا کھلے علاقے کی جانب جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ راہداری کی اطرافی دیواروں میں کوئی پوشیدہ ہے۔ تم نے بازو پکڑ کر مجھے اندر گھسیٹ لیا اور اس طرح مجھے اس سرنگ میں آنے کا اشارہ کیا۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ میں بھی اس جگہ کا قیدی ہوں اور ظاہر ہے فرار کی آرزو میرے دل میں بھی تھی۔ لیکن اس کی امید نہیں تھی۔''

''آہ...... وہ اُلّو کا پٹھا اسی قابل تھا۔ رہ گیا پیچھے۔ حالانکہ یہ سرنگ بنانے میں اس نے مجھ سے زیادہ محنت کی تھی۔ ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔ اگر کوئی بیرک میں آ گیا تو سمجھ لو زندگی ختم۔ اب اس کی گنجائش بالکل نہیں ہے کہ میں واپس جا کر اس گدھے کی اولاد کو تلاش کروں۔ آؤ...... جلدی سے آگے آ جاؤ۔ تقدیر تم پر مہربان تھی۔ کبھی کبھی ہی کسی کو اس طرح بغیر محنت کے موقع ملتا ہے۔ اوہو، دیکھو یہ آواز سنو۔''

کیمپ کے اندر بگل بج رہا تھا۔ یہ قیدیوں کو بیدار کرنے کا بگل تھا۔ حالانکہ چھ بج گئے تھے لیکن ابھی کیمپ کے اندر کافی اندھیرا تھا اور پہرے دار سنتریوں کی کوٹھڑیوں میں سرخ رنگ کی بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ غم آلود انداز میں گردن ہلاتا ہوا بولا۔

”بدنصیب انسان۔ لیکن ہم کسی کی تقدیر کے ساتھ اپنی تقدیر نہیں جوڑ سکتے۔ زندگی کی یہ چند سانسیں اپنی ہی ملکیت ہونی چاہئیں۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ آؤ...... اوہو، لیٹ جاؤ...... لیٹ جاؤ۔“ اچانک ہی اس نے کہا اور میں زمین پر لیٹ گیا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے کیمپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ یہ موقع ایسا نازک تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی ہمیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ کیمپ میں چاروں طرف پہریدار موجود تھے اور ان کی عقابی نگاہوں سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ بہرحال مجھ سے زیادہ وہ خوفزدہ نظر آرہا تھا۔ اور پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

”مجھے اپنے ذہن کو اس غم سے نکالنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں ایک معمولی سی بات پر گولی مار دی جاتی ہے۔ آؤ میرے ساتھ...... اگر ہم اپنی تقدیر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب اس جنگل تک پہنچ جائیں جو صنوبر کے درختوں کا جنگل ہے تو پھر ہمیں آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔ آ جاؤ تقدیر کے دھنی، آ جاؤ۔“ اس نے کہا اور سڑک کی طرف رینگنے لگا۔ کیمپ میں اب ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ابھی تک کسی کو دو قیدیوں کے فرار کا علم نہیں ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی اس بدنصیب شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا نام گیرون تھا اور جس نے اس سرنگ کے ذریعے باہر نکلنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن نجانے کس وجہ سے وہ اندر ہی رہ گیا تھا اور میں باہر نکل آیا تھا۔ واقعات جس طرح پیش آئے تھے اس کے تحت ابھی تک یہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ میرا اس کیمپ سے نکل آنا میرے لئے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ۔ ہیگ نے مجھے سوچنے کی پیشکش کی تھی۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا جو میرے پس پشت تھے۔ اور اگر میں واقعی اسے وردان سادھانی، گاشر برم وغیرہ کے بارے میں بتاتا تو پتہ نہیں وہ اس پر یقین کرتا بھی یا نہیں؟ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انسان اگر اپنے دشمن کے سامنے اس سے تعاون کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ بے بسی کی انتہا ہوتی ہے اور ایسی بے بسی کو قبول کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ میرا بدترین دشمن تھا اور یہ بہت بڑی سچائی ہے کہ اگر وہ

مجھے ہپناٹائز نہ کرتا تو شاید میری زندگی کا رخ ہی بدلا ہوا ہوتا۔ میرا باپ اس غم سے مر گئے کہ میں نے مجرمانہ زندگی اختیار کر لی ہے۔ اس شخص کا شکریہ جس نے کم از کم آگے کے لئے جدوجہد کرنے کا موقع دیا۔ پتہ نہیں اس کا نام کیا ہے۔ بہرحال میں اس کی جانب ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔

”سنو، اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر ہم خوف سے اسی طرح رینگ رینگ کر آگے بڑھتے رہے تو ضرور پکڑے جائیں گے۔ اٹھو...... ویسے یہ وقت پہریداروں کی ڈیوٹیاں تبدیل کرنے کا ہے اور رات کے پہریدار ناشتہ کرنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں اور دن کو ڈیوٹی دینے والے ناشتہ کر کے اپنی ڈیوٹی پر آ جاتے ہیں۔“

بہرحال میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگایا کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں رہا اور ہم وہاں سے اٹھے اور اندھا دھند بھاگنے لگے۔ میں صرف اس کی تقلید کر رہا تھا اور اسی طرح پوری قوت کے ساتھ بھاگ رہا تھا جس طرح وہ۔ یہاں تک کہ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ اس نے ایک گڑھا تلاش کیا اور اس میں چھلانگ لگا دی۔ میں ایک مفرور قیدی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔

”آخری بار افسوس کر رہا ہوں کہ گیرون بدنصیب اسی قید میں رہ گیا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ نصیب بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”خاقان!“ میں نے جواب دیا۔

”صحرائے گوبی کے رہنے والے ہو؟“ وہ ازراہِ مذاق بولا۔

”بہرحال کہیں نہ کہیں کا ہوں۔“

”میرا نام مارک ہے۔ مارک گیو۔ تم چاہو تو مجھے گیو کہہ سکتے ہو یا مارک بھی کہہ سکتے ہو۔ مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔“

”اب آگے کا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”سب سے پہلے یہ لباس تبدیل کرنے ہیں۔ پتہ نہیں گیرون کا لباس تمہارے بدن پر پورا آتا ہے یا نہیں۔ تمہارا لباس تو بالکل ٹھیک ہے۔ میرا لباس البتہ بری طرح خراب ہو رہا ہے۔ میں لباس تبدیل کر لوں، اس کے بعد ہم سیدھے اسٹیشن جائیں گے۔“

”اسٹیشن؟“

”ہاں۔“

"تو کیا ٹرین کے ذریعے سفر کرنا ہے؟"

"لو اور کیا، تمہیں ہوائی جہاز لینے آ رہا ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے ہم ٹرین میں پہچانے نہیں جائیں گے؟"

"ہم تو ہواؤں میں بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔ پتہ نہیں تم کس سلسلے میں یہاں قید ہوئے ہو۔"

"وہ مجھے برطانوی جاسوس سمجھتے ہیں۔"

"برطانوی جاسوس؟"

"ہاں۔"

"یہ تو مجھے بھی سمجھا جاتا ہے۔"

"کیا تم برطانوی جاسوس ہو؟"

"اگر ہوں بھی تو کم از کم تمہیں تو نہیں بتاؤں گا۔" گیو نے کہا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں انڈین ہوں اور میرا تعلق برٹش نیوی سے ہے بلکہ تم یوں سمجھ لو کہ بحری انٹیلی جنس کا ایک رکن ہوں۔"

"اوہ مائی گاڈ...... اچھا، میں بھی برٹش ہوں۔ برٹش آرمی کا ایک رکن۔"

"تب تو تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کم از کم ہمارا تعلق ایک ہی مقصد سے ہے۔"

"ہاں......" وہ جلدی جلدی اپنا لباس اتارنے لگا۔ اور پھر اس نے اپنا لباس تھیلے میں رکھا، دوسرا تھیلا اس نے میرے حوالے کیا اور بولا۔

"آؤ...... چلو، ادھر سے اب چلتے ہیں۔"

جنگل میں کچھ اور آگے جا کر پانی کے پائپ سے ہم دونوں نے ہاتھ منہ اور پیر صاف کئے۔ وہ کہنے لگا۔ "یہ وردی ہمیں چھپانی ہے۔ اگر ہم اسے جنگل میں پھینک دیتے ہیں تو ضرور جلد یا بدیر پتہ چل جائے گا۔ وردی پر نمبر پڑا ہوا ہے۔ کم از کم میرے بارے میں وہ لوگ جان لیں گے۔ ویسے کمال کی بات ہے، میں سمجھتا ہوں بالکل پہلا موقع ہے ابھی تک ان لوگوں کو دو قیدیوں کے فرار کا علم نہیں ہوا اور سائرن کی آوازیں بھی نہیں ابھریں۔ آؤ چلیں۔"

میں اب اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ میں نے بھی اپنا ایک نظریہ اپنا لیا تھا اور نظریہ یہ تھا کہ ہیگ کے سامنے زبان کھولنے سے بہتر ہے کہ دوسرے خطرات قبول

لئے جائیں۔ میلوں دور تک پھیلا ہوا یہ جنگل نجانے کتنی دور تک چلا گیا تھا۔ صنوبر اور چیڑ کے درخت خاموش اور اداس کھڑے ہوئے تھے۔ دور دور تک کہیں انسانی وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ موسم انتہائی سرد تھا اور ہوائیں بے حد ٹھنڈی۔ اس وسیع جنگل میں کسی کا نکل آنا حماقت کی بات تھی۔ بہرحال گیو کو راستے کے بارے میں شاید کافی معلومات تھیں۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے اپنی وردی ایک گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر لوہے کا ایک پل نظر آ رہا تھا اور اس کے بعد ریلوے اسٹیشن تھا۔ پل عبور کر کے ہم لوگ آخر کار ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں اچھا خاصا رش تھا اور بہت سے لوگ گاڑی کے انتظار میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ گیو نے میرا ہاتھ دبایا اور بولا۔

بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لئے ایک ایک لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس منحوس کیمپ سے نکل آئے۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ وہ لوگ بڑے محتاط ہیں اور انہیں ہمارے فرار کا علم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد چاروں طرف ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔"

"ایسا کرو تھوڑا فاصلہ اختیار کر لو۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ اور ایک بات کا خیال رکھنا، اگر کوئی خطرناک مرحلہ آ جائے تو ہم ایک دوسرے کی فکر نہیں کریں گے بلکہ اپنی اپنی جان بچائیں گے۔ ہاں اگر ہم دونوں الگ الگ مشکل میں گرفتار ہوئے تو تم مجھے جنگل کے وائر ٹاور کے پاس مل جانا۔"

"کیا ہمیں ٹکٹ نہیں خریدنا چاہئے؟"

"ہاں بالکل۔ تمہارے پاس رقم موجود ہے؟ نہیں ہے تو یہ لو۔" اس نے کہا اور کچھ نوٹ میری جانب بڑھا دیئے۔ میرے پاس بھلا مقامی کرنسی کے ہونے کا کیا سوال تھا۔ مگر اس نے تمام انتظامات کئے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم نے اپنے درمیان فاصلہ پیدا کیا اور لاپرواہی کا انداز اختیار کرتے ہوئے اسٹیشن کے بکنگ آفس کی طرف گئے۔ ٹکٹ لینے والوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ گیو ٹکٹ خریدے بغیر سفر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ چیکر اگر بغیر ٹکٹ کے ہمیں چیک کر لیتا تو صورتحال خراب ہو جاتی۔ لیکن ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ ٹکٹ لینے والے سے اس کے بارے میں تمام تفصیل معلوم کی جا رہی تھی۔ گیو نے انگلی اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور خود قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہرحال

یہ شخص میرے لئے فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے ہیگ کے چنگل سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ گیو نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور بار بار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بکنگ آفس کے قریب پہنچ گیا تو میری نگاہیں لوہے کی جالی کے پیچھے اس لڑکی کے چہرے پر پڑیں جو مسکرا مسکرا کر کبھی کسی سے کوئی سوال کر دیتی تھی اور ٹکٹ اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ بعض مسافروں سے اس نے شناختی کارڈ بھی طلب کئے تھے۔

بہرحال گیو کی باری آ گئی۔ اس نے نجانے لڑکی سے کیا کہا کہ لڑکی مسکرا دی اور میں نے اسے دو ٹکٹ دیتے ہوئے دیکھا۔ قسمت کی دیوی مہربان نظر آتی تھی۔ گیو ٹکٹ لے کر باہر نکل آیا۔ پھر ہمیں دور سے ریل گاڑی کی سیٹی سنائی دی اور پلیٹ فارم پر ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اترنے والے مسافر ایک ایک کر کے باہر آ رہے تھے۔ ہم ہر شخص کو غور سے دیکھتے جا رہے تھے۔ مسافر یکے بعد دیگرے لوہے کے دروازے سے نیچے آتے رہے۔ چھوٹی سی ریل گاڑی تھی اور ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے پر گرا جا رہا تھا۔ ہر شخص ٹرین پر اس طرح چڑھنے کو تیار تھا کہ جیسے اس کے پیچھے کوئی بندوق لئے کھڑا ہے اور اگر وہ گاڑی میں نہ بیٹھ سکا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ راہداری میں اب بھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ اور آخر کار ہم ایک مختصر سے ڈبے میں گھس گئے جو انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جرمنی جیسے ملک کے شہر برلن میں یہ ہنگامہ آرائی میرے لئے خاص طور سے سخت حیران کن تھی۔ چونکہ میں نے جرمنی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن یہ وہ دور تھا جب جرمنی اپنے وقت کے عذاب سے گزر رہا تھا۔

گیو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"اگر ریل گاڑی میں ہمارے کاغذات چیک کر لئے گئے تو؟"

"بس خدا پر ہی بھروسہ کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

بہرحال سفر جاری رہا۔ چند گھنٹوں کا یہ سفر اس قدر ہولناک تھا کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں سوچ کے دوسرے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہیگ میرے فرار کے بعد کیا عمل کرے گا؟ ویسے اس نے جس طرح میرے مصیبتوں کا بندوبست کیا تھا اور جتنی محنت مجھے اپنے قبضے میں کرنے کے لئے کی تھی اس کے بعد یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ آسانی سے میرا فرار برداشت کرے گا۔ لیکن

بہرحال اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ہم اس جگہ سے نکل آئے تھے جس کا نام مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام برلن ہے۔ کچھ عجیب سی افراتفری کی فضا تھی یہاں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر شخص کسی کی تلاش میں ہو۔ لیکن یہ ہمارے اندر کا احساس تھا اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہر شخص ہمیں تلاش کر رہا ہے۔ آخر کار گاڑی پیٹ ہون نامی ایک ریلوے اسٹیشن پر رکی تو ہم نیچے اتر گئے۔ گیو نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"جب انہیں ہمارے فرار کا علم ہو گا تو وہ اپنے طور پر عقل کے گھوڑے دوڑائیں گے کہ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ بہتر جگہ چھپنے کے لئے کوئی بڑا شہر ہی ذہن میں آ سکتا ہے اور ہم نے ٹکٹ بھی دور کا ہی خریدا ہے۔ اگر ہم یہاں اتر جاتے ہیں تو یہ بہتر جگہ رہے گی۔"

چنانچہ ہم اس اجنبی جگہ اتر گئے۔ پیٹ ہون کچی پکی آبادی والا شہر تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد تقریباً ہم دو گھنٹے تک مارے مارے پھرتے رہے اور شہر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ اس سے آگے میلوں تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ گیو نے کراہتے ہوئے کہا۔

"آہ...... یوں لگتا ہے جیسے ٹانگیں جوڑ سے علیحدہ ہو جائیں گی۔ میں تو یہاں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر گیو! یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ دو برطانوی جاسوس اتنے بڑے کھلے میدان میں لیے پڑے ہوئے ہیں، کسی کی نگاہ بھی پڑ سکتی ہے۔ ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

گیو نے پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ میں اسے سہارا دوں اور اس کے بعد لڑکھڑاتے قدموں سے میرے ساتھ آگے بڑھا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ اور طے کیا گیا۔ نیند کے مارے یہ حال تھا کہ اگر اس وقت کوئی تنگ و تاریک قبر بھی ہمیں مل جاتی تو ہم اس میں سو جانے کے لئے تیار تھے۔ شدید پیاس سے حلق سوکھ گئے تھے اور زبان پر جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ آخر ایک بڑی سی عمارت نظر آئی جو کافی دور تھی۔ ایک چھوٹی سی نہر کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں رکے اور جی بھر کر پانی پیا اور عمارت کی جانب دیکھنے لگے۔

"اگر یہاں ہمیں آرام کے لئے جگہ مل جائے تو لطف ہی آ جائے۔"

یہ عمارت ایک اسکول کی عمارت تھی اور یہاں ہمیں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ پھر تھوڑی ہی دور آگے گئے تھے کہ ایک پائپ لائن نظر آئی۔ بڑے بڑے پائپ نیچے پڑے ہوئے تھے اور شاید کافی عرصے سے پڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے اندر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ یہ ہمارے آرام کے لئے اعلیٰ ترین جگہ تھی۔ چنانچہ ہم ایک بڑے پائپ میں گھس گئے۔ تھیلے ہم نے سر کے نیچے رکھ لئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ہماری پلکیں جڑ گئیں۔ ہر چند کہ سخت سردی تھی اور بدن کانپ رہے تھے لیکن پھر بھی ہمیں یہاں کافی آرام ملا تھا اور اس کے بعد ہم خوب دن چڑھے تک سوتے رہے اور بہت سکون ملا یہاں سونے سے۔ پھر نجانے کس وقت آنکھ کھلی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر گہری گہری سانسیں بھری تھیں۔

''ذرا الٹا نام ہے تمہارا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''کوئی آسان سا نام رکھ لو میرا۔''

''مثلاً؟''

''برک کہہ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''مگر یہ نام۔''

''بس یونہی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

گیو مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ''ڈیئر برک! عارضی طور پر یہ قیام گاہ ہمارے لئے بہترین ہے۔ آرام کی نیند سوئے ہیں۔ کسی نے ہماری جانب توجہ بھی نہیں دی۔ اس کا مطلب ہے کہ کچھ وقت یہاں گزار سکتے ہیں۔''

''ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔''

''آؤ پھر کھانے کی تلاش کریں۔''

میں پائپ لائن سے باہر نکل آیا۔ ہم لوگ دور دور تک نگاہیں دوڑانے لگے۔ تقدیر ہمارا بہترین ساتھ دے رہی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

''ہاٹ ڈاگ۔'' گیو نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا اور ہم دونوں اس جانب چل پڑے۔ بہترین قسم کے ہاٹ ڈاگ نہایت سستی قیمت پر دستیاب ہو گئے تھے۔ پیٹ بھر کر کھائے اور بڑا سکون محسوس ہوا۔ گیو نے کہا۔

''آوارہ گردی بالکل مناسب نہیں ہے۔ پیٹ بھر چکا ہے۔ ہمیں آگے کے لئے منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔''

''تو پھر بتاؤ کیا ارادہ ہے؟''

''ظاہر ہے یہاں سے آگے نکلنا ہوگا اور اس کے لئے سیدھی سی بات ہے لمبا سفر کرنا ہوگا۔''

''کوئی خاص منصوبہ ہے ذہن میں؟''

''دوست! برطانیہ جانے کے لئے ہمیں شدید محنت کرنا ہوگی اور ہر طرح کا خطرہ مول لینا ہوگا۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔''

''ہاں، ہمیں انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔''

پھر رات ہم نے اسی پائپ لائن میں گزاری اور اس کے بعد دوسرے دن صبح پھر اپنے لئے زندگی تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ اب یہاں زیادہ وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور گیو نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہمارے لئے موزوں نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ یہاں ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

''تو پھر کچھ سوچتے ہیں۔'' گیو نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ان مسلسل صعوبتوں نے دل و دماغ پر ایک ایسی کھولت اور بے حسی سی سوار کر دی تھی کہ بعض اوقات تو دل چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے گہری نیند سو جایا جائے چاہے جگہ کوئی بھی ہو اور حال کچھ بھی ہو۔ اگر اس کیمپ میں ہوتا تو ممکن ہے کچھ آسانیاں فراہم ہو جاتیں لیکن یہاں بھی تقدیر کا ہاتھ تھا کہ گیو مجھے اس طرح نکال لایا اور اب میں یہاں بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ نہ مارک کے ذہن میں کچھ تھا نہ میرے ذہن میں۔ بس ہم حالات کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ تو ظاہر ہے کسی ایک جگہ تو وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب تھکن ہو جاتی تو آوارہ گردی کر لیتے۔ کھانے پینے کی چیزیں دکانوں سے خرید لیا کرتے تھے۔

پھر اس دن ہم ایسے ہی اس جگہ سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی گیو نے کسی کو دیکھا اور ایک دم بے اختیار ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ برق رفتاری

سے بھاگا اور ایک شخص کے قریب پہنچ گیا۔ جس شخص کے قریب وہ پہنچا تھا اس کے کندھے پر جب اس نے ہاتھ رکھے تو وہ اس طرح دہشت زدہ ہو گیا جیسے موت نے اسے دبوچ لیا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ہکا بکا سا گیو کو دیکھتا رہا، اس کے بعد وہ گیو سے لپٹ گیا۔ میں نے گہری سانس لی، اس جگہ بھی ایسا کوئی شخص ہے جس سے گیو اس طرح مخاطب ہو سکتا ہے کہ دوسرے اس کی جانب متوجہ ہو جائیں۔ یقیناً کوئی ایسی ہی بات تھی جس سے گیو اتنا متاثر ہوا تھا۔ میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ وہ شخص مجھے دیکھ کر ایک دم سے دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ گیو نے کہا۔

"نہیں گیرون، یہ دوست ہے۔"

میں نے یہ نام سنا اور میرے دماغ کے سارے خانے روشن ہو گئے۔ گیرون کا نام میرے لئے اجنبی نہیں تھا، یہ وہی شخص تھا جسے گیو کے ساتھ فرار ہونا تھا لیکن اس کی جگہ گیو مجھے گھسیٹ لایا تھا۔ گیرون نے کہا۔

"یار گیو! تم تو بڑے بے مروت اور دھوکے باز نکلے۔"

"پاگل آدمی، یہ بتاؤ تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم تینوں یکجا ہو سکیں؟"

"بالکل نہیں، میں کچھ کوششیں کرتا پھر رہا ہوں لیکن کوئی بہتر جگہ نہیں تلاش کر سکا۔ بس کبھی یہاں کبھی وہاں۔"

"تب پھر آؤ ہمارے ساتھ۔"

ابھی تک وہ پائپ لائنیں ہمارے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوئی تھیں۔ کوئی اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ سنسان راستوں سے گزرتے ہوئے آخر کار ہم پائپ لائنوں تک پہنچ گئے۔ گیرون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں یہ جگہ بھی دیکھ چکا ہوں مگر میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ تمہارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ جگہ ویسے اچھی ہے۔ دور دور تک خاموشی اور سناٹے کا راج رہتا ہے سوائے اس دکان کے جہاں برگر وغیرہ ملتے ہیں۔ لگتا ہے وہ دکان ہمارے لئے کھلی ہوئی ہے۔ اچھا خیر تم سناؤ، کیسے نکلے وہاں سے؟"

"تمہیں کیا ہوا تھا؟ تم تو بالکل اس طرح غائب ہو گئے جیسے مجھے چھوڑ کر بھاگ آئے ہو۔ وہ تو شکر تھا کہ بارش میں وہ لوگ مست ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں تمہارا ہی انتظار کرتا رہ گیا تھا۔"

"یار بس گڑبڑ ہو گئی۔" گیو نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اس کی جگہ میں گیو کے ہاتھ لگ گیا تھا اور گیو رات کی تاریکی میں یہ سوچ کر مجھے باہر نکال لایا تھا کہ یہ گیرون ہے۔ گیرون نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولا۔

"برٹش ہو نا؟"

"ہاں برٹش ہی سمجھ لو۔"

"تمہارا چہرہ مہرہ تو انگریزوں جیسا ہے لیکن ایک تبدیلی ہے اس میں۔"

"ان کا نام خاقان ہے اور تعلق ہندوستان سے ہے۔"

"وہی تو میں کہتا تھا۔ بہرحال تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ اچھا ہوا تقدیر نے ایک اور شخص کو ہمارا ساتھی بنا دیا۔"

"ان کا تعلق بھی برٹش نیوی سے ہے۔"

"واہ، پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے۔"

"مگر دوستو کر کیا رہے ہو یہ بتاؤ؟"

"ابھی کچھ نہیں، صرف اپنی جان بچانے کے خیال سے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔"

"یہی کوشش تو میں بھی کر رہا ہوں۔ اصل میں اگر ہم یہاں سے نکل کر سویڈن پہنچ جائیں تو زندگی بچ جانے کی امید ہو سکتی ہے۔ میں اس سلسلے میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"تم نے کوئی ایسی جگہ تلاش کی ہے؟"

"ہاں، ایک ایسا کیفے ہے جہاں سویڈن کے اکثر ملاح آتے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے قسمت آزمائی جا سکتی ہے۔ ویسے تم بھی اپنے آپ کو سویڈن کا باشندہ ہی ظاہر کرنا۔"

گیرون ہمیں سمجھاتا رہا۔ وہ ہمیں جس کیفے میں لے گیا وہ معمولی جگہ نہیں تھی، نہایت سجی سجائی اور روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی جگہ تھی۔ وسیع و عریض ہال میں سینکڑوں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اسٹیج پر ایک موسیقار پیانو بجا رہا تھا، بے شمار فوجی آفیسر اور دوسری حسین و جمیل لڑکیاں تھیں۔ کھانا پینا اور خوش گپیاں چل رہی تھیں۔ ہم ایک میز پر بیٹھ گئے اور گیرون نے کھانے پینے کا آرڈر دے دیا۔

"کیا تمہارے پاس مقامی کرنسی ہے؟"

"کافی۔ اور یہ میں نے ایک جرمن کی جیب کاٹ کر حاصل کی ہے۔"

"واہ...... تم ہم سے بہتر زندگی گزار رہے ہو۔"

بہر حال ہم لوگ کافی دیر تک ہوٹل میں وقت گزارتے رہے اور اس کے بعد واپس اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ گیرون کو بھی یہی جگہ غنیمت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

''ایک شخص کو میں نے اپنے جال میں پھانسا ہے۔ تھوڑی بہت رقم بھی دے دی ہے اسے۔ بھلا ہو اس جرمن سرمایہ دار کا جس نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی بہر حال وہ شخص ہمارے یہاں سے نکلنے میں مدد کرے گا۔''

دوسرے دن بہت دیر تک گلیوں اور بازاروں میں گزرتے ہوئے آخر کار ہم ایک کیفے کے سامنے پہنچے اور کیفے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ فرش پر گرد اور کوڑے کے ڈھیر پڑے تھے۔ یہاں ایک شخص نے ہمارے قریب پہنچ کر کہا۔

''آ جاؤ۔ میں کسی حد تک تمہارا کام کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔''

''میری جان! میں تمہیں طے شدہ معاوضے کے علاوہ بھی بہت کچھ دوں گا۔''

''میرا ایک دوست یہاں سے موٹر بوٹ کے ذریعے سویڈن جا رہا ہے۔ میں نے اس سے تمہاری بات کی ہے۔''

''کہاں ہے وہ اس وقت؟''

''یہ تو میں نہیں بتا سکتا البتہ تمہیں ان کے پاس لے کر جا سکتا ہوں۔ چلنا چاہو تو چلو۔''

''ہاں، ہمیں چلنا چاہئے۔''

بہر حال ہم اس کے ساتھ چل پڑے اور پھر کئی گلی کوچوں، بازاروں میں گھومنے کے بعد وہ ایک مختصر سے مکان پر پہنچ گیا اور پھر وہ ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک بڑے سے کمرے میں ہم بیٹھ گئے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ شخص دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ دونوں اجنبی کافی قوی ہیکل تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لکڑی کا موٹا سا ڈنڈا تھا اور ڈنڈے والا شخص دروازے پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔ دوسرے شخص نے کہا۔

''ہوں...... تم لوگوں کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''سویڈن سے۔''

''نہیں، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم برٹین ہو۔''

''آہ...... اگر تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا تعلق برطانیہ سے ہے تو پھر یقیناً بتانے

والے نے ٹھیک ہی بتایا۔ ہم سویڈن جانا چاہتے ہیں۔''

''خیر...... ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ سنا ہے تم بہتر معاوضہ ادا کر سکتے ہو؟''

''اتنا جتنا ممکن ہو سکے۔''

ہمارے درمیان سودے بازی ہوئی اور سودا طے ہو گیا۔ پھر ایک موٹر بوٹ ہم تینوں کو لے کر چل پڑی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح اس بھیانک ماحول سے آزادی مل جائے گی۔ میں اب ان پراسرار قوتوں سے تو مایوس ہو چکا تھا جو میری مدد کرتی رہی تھیں۔ سب ڈرامہ بازی تھی۔ نجانے کیا کیا کھو گیا۔ اگر ان ساری باتوں میں سچائیاں تھیں تو پھر سارے کے سارے کہاں مر گئے؟ کہیں سے کوئی پذیرائی ہی نہیں ہوئی۔

موٹر بوٹ کا سفر آخر کار ختم ہوا اور ہم سویڈن پہنچ گئے۔ یہ دونوں یعنی گیو اور گیرون کمال کے ساتھی ثابت ہوئے۔ بھرپور مدد کی تھی انہوں نے۔ اور پھر مجھے لندن پہنچ کر یہ معلوم ہوا تھا کہ گیو ایک طرح سے شاہی فیملی کا فرد ہے اور لندن میں اچھی طرح صاحب حیثیت تھا۔ اس نے کہا۔

''میرے دوست! ہمارا ساتھ اتنا رہ چکا ہے کہ میں تمہیں اپنا بہترین دوست تصور کرتا ہوں۔ لیکن افسوس میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں ٹھہرا سکتا۔ کچھ ایسے ہی پوشیدہ معاملات ہیں۔ ابھی مجھے عام نگاہوں سے خاصے دن تک روپوش رہنا پڑے گا ورنہ میں تمہیں اپنی قیام گاہ پر لے جاتا۔''

''نہیں گیو! کوئی بات نہیں ہے۔ جتنا وقت تمہارے ساتھ گزرا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہم زندگی میں کبھی نہیں بھولیں گے۔''

''مگر تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ بالکل ہی فکر مت کرو، میں تمہارا بھرپور طریقے سے ساتھ دوں گا۔ میں کسی اچھے سے فائیو اسٹار ہوٹل میں تمہارے لئے بندوبست کرتا ہوں اس کے بعد میں اپنے گھر واپس جاؤں گا۔''

بہر حال ایسا بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت یقینی طور پر امداد کی ضرورت تھی۔ بالکل بے یار و مددگار اور بہت ہی گھٹیا انداز میں یہاں پہنچا تھا۔ انگریز بیوقوف نہیں ہوتے۔ میرا مسئلہ بہت خراب تھا۔ چنانچہ اگر کہیں سے مدد مل رہی ہے تو اسے قبول کر لینا کسی بھی طرح ناگزیر تھا۔ اور بہر حال یہ ایک ضروری عمل تھا۔ جبکہ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ برطانیہ این مورالس کا شہر ہے اور میں این مورالس کا قاتل تھا۔ ہندوستان میں تو خیر میرا داخلہ

ہی بند تھا۔ وہاں کسی بھی جگہ دیکھ لیا جاؤں تو ایک بدترین مجرم کی حیثیت سے سڑک پر ہی شوٹ کر دیا جاؤں گا یا پھر گرفتار کر لیا جاؤں گا اور اس کے بعد زندگی بھر ان انگریزوں سے نجات ملنا میرے لئے انتہائی مشکل تھا۔ چنانچہ گیو کا شکریہ ادا کیا۔ گیو نے میرے لئے خاصی خریداری کی اور آخر کار مجھے ہوٹل ہلٹن میں پانچویں منزل پر ایک کمرہ حاصل ہو گیا جہاں میں برک کی حیثیت سے مقیم ہو گیا۔ میرے پاس عمدہ لباس، ضرورت کی تمام چیزیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اچھی خاصی کرنسی موجود تھی۔ گیو نے کہا۔

''میں جا رہا ہوں ڈیئر! اپنے معاملات ٹھیک کرتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ اب میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں تو تمہیں ہوٹل سے اپنے گھر لے جاؤں گا اور اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ آگے ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''گیو! ہماری ملاقات جن حالات میں ہوئی انہوں نے ہمیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا لیکن میں بھی کوئی چوڑا چمار نہیں ہوں۔ میرا تعلق بھی ہندوستان کی ایک ایسی فیملی سے ہے جس کی زمینداری ناقابل یقین تھی۔ سیتا گڑھی کے علاقے میں اگر خاقان جمشیدی اور اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرو گے......''

''بس، بس، بس...... کیا ضرورت ہے یہ تمام باتیں کرنے کی۔ انسان کی شخصیت لمحوں میں نظر آ جاتی ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ اپنے آپ کو میرا احسان مند نہ بناؤ۔ دوستوں میں یہ سب کچھ چلتا ہے۔''

بہرحال کافی حد تک سکون نصیب ہوا تھا۔ اب یہ تو بالکل نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں سارے لوگ میرے ہی چکر میں ہوں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تھوڑا سا سکون اپنے طور پر بھی اپنے آپ کو دینا تھا۔ خدشات تو کبھی زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتے۔ کم از کم یہاں مجھے اپنی زندگی پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ اب تک جتنی آوارہ گردی کرتا رہا تھا اس کے بعد فائیو اسٹار ہلٹن کا شاندار کمرا میرے لئے جنت سے کم نہیں تھا۔ یہاں رہ کر میں اپنے ماضی کی کتاب الٹ سکتا تھا۔ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا میں نے۔ اپنے بستر پر لیٹا آرام سے سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ میری سوچوں کا آغاز اس جگہ سے ہوتا تھا جہاں میرے والد ہمدان جمشیدی نے مجھے اپنا دست راست بنا لیا تھا اور پھر شکار کی زندگی میں وقت بسر کر رہے تھے۔ وہ لمحات جب ہم اس تنہا مندر میں پہنچے تھے جس کا نام دھرم شوالہ تھا اور شو جی کے مندر میں وہ واقعہ میرے ساتھ پیش

آیا تھا۔ آہ...... وہیں سے تو گڑبڑ کا آغاز ہوا تھا۔ شو کے مجسمے کی آغوش میں کیا لیٹا کہ جون ہی بدل گئی اور اس کے بعد ان لوگوں کے جال میں پھنس گیا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، بدھ مذہب بھی اعلیٰ تعلیمات کا حامل ہے۔ وردان سادھانی، سیوک سندھورتی اور وہ تمام لوگ جو مجھے ملے تھے انہوں نے تلقین تو یہی کی تھی کہ میں برائیوں سے بچوں لیکن انداز کچھ عجیب سا تھا۔ مجھے ہر جگہ موقع دیا گیا تھا کہ اگر میں کبھی کسی برائی میں پھنس سکتا ہوں تو ضرور پھنسوں اور اس کی وجہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی۔

پھر اس کے بعد کلکتے میں تعلیمی زندگی، پھر ایلس فیوری جس نے صحیح معنوں میں مجھے زندگی کی لذتوں سے روشناس کرایا تھا۔ آہ...... جوانی کا ایک دور کیا دور ہوتا ہے۔ انسان لاکھ ایسے حالات سے بچنے کی کوشش کرے لیکن کہاں بچتا ہے۔ اور پھر سچی بات یہ ہے کہ بچنے کی کوشش کرنی بھی نہیں چاہئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ زندگی کے یہی چار دن تو ہوتے ہیں اور ان چار دنوں میں مجھے جتنے افراد ملے تھے انہوں نے زندگی کی ایسی ہی کہانیوں سے روشناس کرایا تھا۔ کون کون سے کردار نہیں ملے تھے مجھے اور کس کس نے کیا نہیں سکھا ڈالا تھا۔ کمال کی بات تھی۔ واقعی بڑے کمال کی بات تھی۔ نجانے کون کون۔ آدم زمان، عالیہ زمان، ایلس فیوری اور اس کے بعد امینہ...... اور وہ بہت سے کردار......

ادھر کلاڈیا اپنے طور پر نجانے کیا کیا مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ یہ کلاڈیا کیا بلا تھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بظاہر تو اس کا انداز بڑا پراسرار سا تھا جیسے وہ خود بھی انوکھے علوم کی مالک ہو لیکن معمول کے مطابق سب کے سب غائب ہو گئے تھے۔

بہرحال ہلٹن ہوٹل میں خوب عیش و عشرت کر رہا تھا اور وقت گزاری کر رہا تھا۔ عارضی طور پر گیو پر ہی بھروسہ کرنا تھا کیونکہ وہ ابھی تک اچھا دوست ثابت ہوا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ صاحب اختیار تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے میرے لئے کہ مجھے آئندہ زندگی میں کیا کرنا چاہئے۔ اصولی طور پر تو یہی ہونا چاہئے تھا کہ کہیں بھی زندگی کے بقیہ ایام گزار لیتا۔ سیتا گڑھی جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور پھر ماں باپ نہیں تھے۔ قرب و جوار کے رشتے داروں کو بھلا اتنی تڑپ کہاں ہوتی ہے۔ سب کے سب مجھے بھول بھی چکے ہوں گے۔ کیا فائدہ ان کے درمیان جانے کا۔ دل میں ایک ہی خیال آیا کہ گیو سے کہوں گا کہ یہیں لندن میں میرے لئے کوئی بندوبست کر دے، کسی بھی گوشے میں پڑ کر زندگی گزار لوں گا۔ اور اگر ہو سکا تو اپنے مستقبل کے لئے کسی ساتھی کا بندوبست

بھی کر لوں گا۔ جو لوگ میری زندگی میں آئے تھے وہ تو اتنی دور نکل گئے کہ اب ان سے ملاقات کا دوبارہ تصور بھی ممکن نہیں۔ تو پھر اس زندگی میں ایسا اچھا ساتھی جو مجھے ایک خوبصورت مستقبل دے سکے۔ دل میں کئی بار ہیگ کا خیال بھی آیا تھا۔ کمبخت کس قدر صاحبِ اختیار ہے۔ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ لیکن کوشش یہی کروں گا کہ اب اس کا سامنا کرنے سے گریز کروں۔ اسکندریہ میں اس کی کتنی قوت تھی۔ نچا کر رکھ دیا تھا بدبخت نے۔ وہ شکر ہے کہ لوح میرے ہاتھ لگ گئی اور اس کے بعد وہ وردان سادھانی تک پہنچ گئی ورنہ نجانے کتنا لمبا چکر چلتا رہتا۔ ہیگ کو واقعی بڑی شکست ہوئی تھی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ اب وہ لمحات آ گئے ہیں جب لوح کی کہانی منظر عام پر آ جائے گی اور ہو سکتا ہے وہ اسے حاصل بھی ہو جائے۔ حالانکہ لوح جن پراسرار لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی ان سے اسے حاصل کر لینا ایک مشکل کام تھا۔ لیکن ہیگ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ ترین وسائل کا حامل اور کمبخت ایک ہپناٹسٹ تھا۔

دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں جب ان تمام باتوں کو سوچتا تھا۔ اس دن کمرے میں پڑے ہوئے مجھے چوتھا دن تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اس طرح گھسے رہنا مناسب نہیں ہے۔ ہوٹل کے ویٹر وغیرہ بھی اب مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ لازمی طور پر سوچتے ہوں گے کہ یہ کیسا گاہک ہے یا کیسا مسافر ہے جو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اپنے آپ کو دوسروں کی توجہ سے ہٹانے کے لئے بھی اپنے اندر تھوڑی بہت تبدیلی کرنا ضروری تھا۔

بہرحال میں نے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور اس کے بعد لفٹ سے نیچے کی منزل پر آ گیا۔ لیکن یہاں رکنے کی بجائے میں نے باہر جانا مناسب سمجھا۔ ہوا حیرت انگیز طور پر تیز چل رہی تھی اور لوگ اس سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر درخت لگے ہوئے تھے۔ چوڑے پتوں والے یہ درخت ہوا سے ہل رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر سوئمنگ پول تھا جہاں خاصا رش تھا۔ لیکن میں اس سے بالکل مختلف سمت چل پڑا۔ حالانکہ سوئمنگ پول کے ساتھ اس وقت حسن و جوانی کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ رنگین لباس، چمکدار بدن، نقرئی قہقہے۔ یہ بڑا دلکش ماحول تھا۔ لیکن طبیعت پر کچھ ایسا جمود سوار تھا کہ میں نے دور سے اس ماحول کو دیکھنا چاہا اور درختوں کے نیچے پہنچ گیا۔ تیز ہوا سے درختوں کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ پھر میں ایک درخت سے کمر

لگائے دونوں ہاتھ سینے کے قریب باندھے دور سوئمنگ پول پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے انسانوں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب سی خوشبو میری ناک سے ٹکرائی اور ایک پتہ میرے چہرے سے آ کر چپک گیا۔ میں نے اسے ہاتھ سے اٹھا کر حیرت سے دیکھا۔ ویسے تو پتے اڑ ہی رہے تھے لیکن چمپا کی وہ خوشبو جو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی بھوج پتر تھا جو کئی بار میری نگاہوں کے سامنے آ چکا تھا۔ اسی سے یہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میرے سارے وجود میں ایک چھناکا سا ہوا۔

اس بھوج پتر کا میری زندگی سے بہت گہرا تعلق تھا اور اب تک میں اسے نفرت سے ٹھکراتا ہی چلا آیا تھا۔ لیکن اس وقت..... اس وقت میرا نظریہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ میں نے اسے نگاہوں کے سامنے کیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ بھوج پتر پر ایک تصویر ابھرتی آ رہی تھی۔ ایک خوبصورت عورت کا پُروقار چہرہ جس کی عمر پینتالیس سال سے کم نہیں ہو گی لیکن ایسا حسین نقش و نگار والا چہرہ بہت کم دیکھنے میں آتا تھا۔ بڑی بڑی دلکش آنکھیں میری ہی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ بس ایک لمحے کے لئے یہ چہرہ بھوج پتر پر ابھرا اور اس کے بعد میری نگاہوں سے معدوم ہو گیا۔ بھوج پتر پر اب تک جتنے نقوش ابھرے تھے ان میں سے ہر نقش میں ایک کہانی چھپی ہوئی تھی اور اتنی سچی کہانی کہ اس سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ عورت کون ہے اور کیا اب اس سے میرا تعارف بھی کسی نہ کسی شکل میں ہونے والا ہے؟ میں نے بھوج پتر کو اپنے چہرے کے سامنے رکھا۔ پتہ نہیں کس طرح کی کیفیت میرے دل پر آ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔ مگر اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اپنی سوچی ہوئی ایک اور بات بھی میرے ذہن میں تھی۔ کچھ وقت پہلے میں نے ایک دفعہ سوچا تھا کہ اب اگر یہ لوگ میرے قریب آئے جیسے وردان سادھانی، سیوک سندھورتی یا اسی طرح کا اور کوئی کردار جیسے ماشرہ یا اشمبھ کرھانی تو میں ان سے رابطہ کروں گا اور اب تک جو ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی ہے تو اب اس پر توجہ دینے کی کوشش بھی کروں گا۔ اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ کم از کم زندگی کی صعوبتوں سے تو نجات ملے۔ چنانچہ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بھوج پتر کو اپنے لباس میں چھپا لیا۔ ایسا میں نے پہلی بار کیا تھا۔

میری توجہ اب سوئمنگ پول پر نہانے والوں سے ہٹ گئی تھی اور میں نجانے کیوں اس

بھوج پتر کے مل جانے سے ایک انوکھی سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ گویا اس کے ذریعے زندگی کا رخ تھوڑا سا بدل سکتا ہے۔ کچھ ہو سکتا ہے۔ یقیناً کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے سینے کے پاس اسے تھپتھپا کر دیکھا۔ وہ عام پتا نہیں تھا۔ اس میں ایک خاص بات تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ چمپا کی خوشبو اس سے مسلسل اٹھتی رہتی تھی۔ پھر اس کے بعد وہاں جی نہ لگا اور میں چونکہ تین چار دن تک کمرے میں قید رہا تھا اس لئے چہل قدمی کرنے لگا۔ ہوٹل کا بیرونی حصہ بھی کافی وسیع تھا۔ اگر اس کے احاطے ہی کا ایک چکر لگا لیا جائے تو اچھی خاصی ورزش ہو جائے گی۔ ایک سنسان سے گوشے میں جا کر میں نے بھوج پتر کو پھر سے نکالا اور دیکھا۔ میری نگاہیں اس پر اب بھی وہی چہرہ تلاش کر رہی تھیں جو میں نے دیکھا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس چہرے سے میرا کیا تعلق ہے۔ یہ حسین عورت جو شکل وصورت سے ہندوستانی ہی لگی تھی کیا میرے ہاتھوں قتل ہونے والی ہے؟ حالانکہ بھوج پتر پر اس کی موت کا منظر نہیں ابھرا تھا۔ اس کا مطلب ہے کوئی اور معاملہ ہے۔ مگر یہ کون ہے اور کہاں ہے؟ بھوج پتر پر دوبارہ یہ چہرہ نہیں ابھرا تھا لیکن میں چشم تصور سے ان نقوش کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر میں نے گردن جھٹک کر خود کو پرسکون کر لیا۔

میری زندگی کے ہزاروں واقعات ایسے تھے جن میں میری قوت ارادی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ میرا ایمان جیسا بھی تھا وہ ایک الگ بات ہے لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا کرتا تھا اور یہ مجھے یقین تھا کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور تقدیر لکھنے والی ذات باری ہوتی ہے۔ گو میرا ایمان نادانستہ طور پر ہی صحیح سلامت تھا چنانچہ میں نے اپنے ذہن کو حالات سے آزاد کر دیا۔

بھوج پتر پر نظر آنے والے نقوش جن کی حیثیت کچھ بھی ہو اپنی جگہ سچ ہوا کرتے تھے اور اگر یہ سچ میرے سامنے آیا تو پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو یہ دلاسا دے کر میں نے مطمئن کر لیا اور اس طرح وقت گزرنے لگا۔

پھر شام جھک آئی اور باہر کی رونقیں سمٹ کر اندر چلی گئیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل ہالز کے مختلف فلور تھے اور بہت سے فلورز پر مختلف قسم کے تفریحی پروگرام ہوا کرتے تھے۔

کارڈ روم کی طرف چل پڑا۔ کارڈ روم میں مختلف قسم کے جوئے ہو رہے تھے۔ شوقین مزاج لاکھوں پونڈ کا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں بذات خود تو ان چیزوں سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں مجھے تھوڑی بہت معلومات ضرور حاصل تھیں۔ خاص طور سے اس وقت جب کلکتے میں اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ میں بھی تھوڑی بہت تفریحات میں حصہ لیا کرتا تھا۔ رولٹ مشین اور دوسرے اسی طرح کے گیم۔ میں انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک حسین خوشبو میرے پاس سے گزری اور میری نگاہیں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں۔ یہ خوشبو بہت دیر سے میں اپنے ساتھ ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن میں نے یہی سوچا تھا کہ دولت مند لوگ پرفیوم کا جس طرح استعمال کرتے ہیں چنانچہ اس خوشبو کا یہاں ہونا حیرت انگیز نہیں ہے۔ لیکن اس بار جو میری نگاہ اٹھی تو میرے ذہن میں ایک شدید دھماکا ہوا۔ وہ پراسرار آنکھیں مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایک بہت ہی متناسب جسم کی مالک خاتون، دودھ جیسا سفید چہرہ، بڑی بڑی کالی آنکھیں، انتہائی خوبصورت گھنگھریالے بال۔ حالانکہ عمر کی اس منزل میں تھی جب دوشیزگی کبھی کی رخصت ہو چکی ہوتی ہے بلکہ دو چار دوشیزاؤں کی سرپرست بھی ہو سکتی ہیں وہ۔ لیکن یہ چہرہ بھوج پتر پر نظر آنے والا چہرہ تھا اور پراسرار حسین آنکھیں میری ہی جانب متوجہ تھیں۔ اس بات کا تو خیر مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ بھوج پتر پر جو چہرہ نظر آیا ہے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق مجھ سے ضرور ہے لیکن اتنی جلدی یہ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ جائے گا یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ لباس بھی ہندوستانی ہی تھا۔ اعلیٰ درجے کی سفید سلک کی ساڑھی جس پر ہلکا سا کام بنا ہوا تھا، کاندھوں پر پشمینے کی انتہائی خوبصورت شال۔ میں چونک پڑا۔ ان تمام سوچوں نے مجھے کچھ لمحوں کے لئے ماحول سے بیگانہ کر دیا تھا۔ لیکن جب اس کے قدم میری جانب بڑھے تو میں چونک پڑا۔ وہ میرے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو میڈم۔“ میں نے بھی کہا۔

”ایک سوال کروں۔ برا تو نہیں مانو گے؟“ اتنی حسین اور مترنم آواز تھی کہ سننے سے تعلق رکھتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”نہیں، میں برا نہیں مانوں گا۔ آپ کیجئے سوال۔“

’’کیا تم ہندوستانی ہو؟‘‘

’’جی۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’اوہ...... ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے کیا میں تمہیں تھوڑی دیر کے لئے اپنے پاس دعوت دے سکتی ہوں؟‘‘

’’ضرور۔‘‘

’’بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کھیل نہیں رہے، صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے ہر چیز کو دیکھتے پھر رہے ہو۔‘‘

’’مجھے کھیلنا نہیں آتا۔ اور نہ میرے دل میں کھیلنے کی خواہش ہے۔‘‘

’’پھر تو ویری گڈ۔ آؤ یہاں سے چلتے ہیں۔ یہاں شور زیادہ ہے۔ نیچے کی منزل میں ایک بہت ہی پُرسکون گوشہ ہے، وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔‘‘ اس نے مجھے دعوت دی اور میں بغیر حیل و حجت کے اس کے ساتھ چل پڑا۔ لفٹ سے نیچے کی منزل پر جاتے ہوئے اس نے کہا۔

’’میرا نام سریتا ہے۔ چندی گڑھ سے میرا تعلق ہے۔ تمہارا نام پوچھ سکتی ہوں؟‘‘

’’خاقان جمشیدی۔ سیتا گڑھی کا رہنے والا ہوں۔‘‘

’’آہ...... تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اور مزید یہ جان کر کہ تم خاقان جمشیدی ہو۔‘‘

’’یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’بتا دوں گی۔ ادھر آؤ۔‘‘ اس نے کہا اور واقعی جس گوشے میں وہ مجھے لے کر آئی وہ بہت ہی پُرسکون تھا۔ یہاں بہت خوبصورت گلاس لگے ہوئے تھے اور اس کی دوسری طرف سے سوئمنگ پول کا منظر نظر آتا تھا۔

’’کیسی جگہ ہے؟‘‘ اس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’واقعی جیسا آپ نے کہا۔‘‘

’’خاقان جمشیدی! میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم خاقان جمشیدی ہو؟‘‘

’’جی۔‘‘

’’اصل میں ایک مسلمان خاندان سے تمہارا تعلق ہے۔ مجھے مسلمانوں کے بارے میں بہت سے تجربے ہیں۔ مذہبا ہی سہی، یہ لوگ قول و فعل کے پابند اور دوستوں کے دوست

ہوتے ہیں۔ دشمنوں سے تو خیر ہر کوئی دشمنی کرتا ہے لیکن اگر کسی اچھے مسلمان کی دوستی حاصل ہو جائے تو یہ سمجھ لو کہ بہت سے مسائل کا حل ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے۔‘‘

’’حالانکہ میں ایک مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ لیکن انسانی فطرت کے تحت مجھے آپ کے یہ جملے پسند آئے ہیں۔‘‘

’’گڈ۔ خاقان جمشیدی! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میرا نام سریتا ہے۔ لوگ مجھے سریتا دیوی کہتے ہیں۔ چندی گڑھ کے شمالی علاقے میں ایک چھوٹی سی ریاست قولی ہے۔ میں قولی کی رہنے والی ہوں اور تم یہ سمجھ لو کہ اس ریاست کی رانی ہوں۔‘‘

’’اوہو...... رانی سریتا دیوی۔‘‘ میں نے خوش مزاجی سے کہا۔

’’تم مجھے ایسا نہ کہو۔ میں جو کچھ بھی ہوں لیکن بہرحال انسان تو ہوں۔ اور اگر کوئی انسان یہ کہہ دے کہ وہ کبھی مصیبت میں نہیں پھنسا تو بڑا تعجب ہوگا اس بارے میں کیونکہ ایسا عموماً ہوتا نہیں ہے۔ وہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو کبھی نہ کبھی کسی ایسی مشکل میں گرفتار ضرور ہو جاتا ہے جو اس کے کنٹرول میں نہ آنے والی ہو۔‘‘

’’جی۔ ایسا ہوتا ہے اکثر۔‘‘

’’خاقان جمشیدی! اب ذرا اپنا مکمل تعارف کرا دو۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ انگلینڈ میں ہی رہتے ہو؟ پڑھنے کے لئے یہاں آئے ہو؟ کیونکہ شکل و صورت سے تم بس ایک اسٹوڈنٹ معلوم ہوتے ہو۔ البتہ یہ ذرا سی تبدیلی ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والا کوئی اسٹوڈنٹ اس طرح کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دیکھا جائے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟‘‘

’’جی کوشش کر رہا ہوں۔‘‘

’’ہاں، مجھے اندازہ ہے کہ میرے الفاظ بے ربط ہیں اور جب تک میں اپنے بارے میں تمام حقیقتیں نمایاں نہیں کروں گی میں جانتی ہوں کہ تم اصل بات کو نہیں سمجھ پاؤ گے۔‘‘

’’شاید۔‘‘ میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ میں اس عورت کا بھرپور طریقے سے جائزہ لے رہا تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ وہ کسی خاص وجہ سے میری جانب متوجہ ہوئی ہے۔ بھوج پتر پر یہ نقش بلاوجہ نہیں ابھرا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی یقینی ربط قائم ہونے والا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

’’دیکھو...... ایک بات کہوں تم سے۔ میں تمہیں جذباتی طور پر متاثر نہیں کرنا چاہتی۔

بڑی ٹھوس سی بات کہہ رہی ہوں جو سچائی ہے۔ میری عمر چھیالیس سال ہے اور تم ہر طرح سے میرے بیٹے کے برابر ہو۔ بے شک میرے بیٹے نہیں ہو لیکن میں اگر چاہوں تو بڑی بے تکلفی سے تمہیں بیٹا کہہ سکتی ہوں۔ اصل میں یہ دنیا بڑی عجیب ہے اور پھر خاص طور سے لندن کے اس ماحول میں رشتے ناتے، اقدار بڑی معمولی سی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہاں رشتے ناتوں کا احترام نہیں ہے لیکن جدید نسل اقدار چھوڑتی جا رہی ہے چنانچہ کہیں بھی کوئی برائی کسی بھی شکل میں منظر عام پر آ سکتی ہے۔ یہ نہ بھی آئے تو انسان اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے جو لندن سے واقف ہو۔ ہمارا اپنا ایک کلچر ہے۔ ہمارے ہاں کچھ عمروں کے معیار بھی ہیں۔ ہم رشتوں کی بات چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے بیٹے! میں تمہیں کھل کر بتاؤں، نہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتی ہوں نہ میرے ذہن میں تمہارے لئے کوئی برائی آ سکتی ہے۔ ہاں...... یہ میں ضرور کہوں گی کہ میں ایک خاص وجہ سے تمہاری جانب متوجہ ہوئی ہوں اور اس کی وجہ تمہارے دلکش نقوش اور تمہاری پُر وقار شخصیت ہے۔ یقین کرو اسے بھی خوشامد مت سمجھنا، کچھ حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے دوسری اور تیسری ملاقاتوں کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ میں اب بھی وہ الفاظ کہوں گی تم سے کہ میں بے ربط گفتگو کر رہی ہوں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے میڈم۔"

"مجھے میڈم مت کہو۔" وہ بولی۔

"پھر کیا کہوں؟"

"آنٹی کہو۔"

"بہتر۔"

"شکریہ۔" وہ پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی، پھر بولی۔ "اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟ دیکھو، میں نے تم سے کہا تھا کہ لندن کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کسی کا پایا جانا یہ ظاہر تو کرتا ہے کہ وہ اسٹونٹ نہیں ہے اور اگر ہے تو کسی راجے مہاراجے کا ہے۔ سیتا گڑھی کے بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتی کیونکہ چندی گڑھ اور سیتا گڑھی کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن بہرحال مجھے اس سوال کا جواب دو، سیتا گڑھی میں تمہارے والدین کیا کرتے تھے؟"

"ہمدان جمشیدی بہت بڑے زمیندار اور شکاری تھے۔"

"کہا تھا نا میں نے کہ تم کسی معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہو۔"

"مگر میں ایک معمولی حیثیت کا مالک ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ ہندوستانی ہیں اور ویسے بھی آپ جس انداز میں مجھ سے پیش آئی ہیں اس میں انسانیت اور شرافت کی جھلکیاں ہیں۔ پھر میری بزرگ ہیں۔ اور آپ نے مجھے خود اس کا موقع دیا ہے کہ میں آپ کو آنٹی کہوں۔ اس کے علاوہ آنٹی! اتنا تنہا ہوں میں کہ صحیح معنوں میں کوئی ہمدرد، کوئی ایسا ساتھی نہیں ہے کہ جس کے سامنے سچ بول سکوں۔ جھوٹ کی زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ سچ بولنا چاہتا ہوں لیکن اس امید پر کہ میرے اس سچ کو میرے لئے عذاب کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔"

سریتا دیوی حیرت سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "نہیں بیٹا! اگر تمہیں کسی بھی شکل میں میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"نہیں سریتا دیوی! بس ایسے ہی۔ آپ یوں سمجھئے کہ کچھ ایسے عجیب و غریب چکر میں پھنسا کہ پنپ ہی نہ سکا۔ کلکتے میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے منشیات کے اسمگلروں کے چکر میں پھنس گیا۔ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ جرمنی میں قید ہوا۔ اس سے پہلے اسکندریہ میں ان لوگوں نے مجھے فٹ بال بنائے رکھا۔ اور پھر اس کے بعد بڑی مشکل سے یہاں تک آیا۔ کچھ لوگوں نے دوستی کا ثبوت دے کر مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ ہندوستان میں مجھ پر کچھ انگریز افسروں کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ میں نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن میرے خلاف اس طرح ٹھوس ثبوت تیار کر دیئے گئے کہ میرے علاوہ قاتل کا لزیم کسی اور پر چسپاں نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ وہاں سے نکل بھاگا اور اب یہاں بھٹک رہا ہوں۔ مستقبل میرے لئے ایک تاریک سفر ہے۔"

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور اس کے بعد اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام سریتا دیوی ہے اور جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ ایک چھوٹی کی ریاست قولی کی مکمل حکمران ہوں اور وہاں میرے راستوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو خاقان جمشیدی! تو میں تمہیں اپنے ساتھ ہندوستان بھی لے جاؤں گی اور ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گی۔"

"میں نے عرض کیا نا آنٹی! کہ ہندوستان میرے لئے بارود کا ڈھیر ہے۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولی۔ ''نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جب تم آنٹی کے بھانجے کہلاؤ گے تو بارود کا کوئی ڈھیر تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں تمہیں ہندوستان لے جاؤں گی اور وہاں تمہیں اپنے بھانجے کی حیثیت سے رکھوں گی۔ کیا سمجھے؟''

''جی۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''سمجھ لو کہ یہ پیشکش میں نجانے کتنی ملاقاتوں کے بعد تمہیں کرتی۔ لیکن وقت نے کہانی ترتیب دے دی ہے اور جس طرح سے میری تم سے ملاقات ہوگئی ہے اس سے فاصلے لمحوں میں طے ہو گئے ہیں۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ جو حالات نے مجھے سنائے کیا ان میں تم میرا ساتھ دے سکتے ہو؟''

''آپ دیکھ لیجئے۔ جس طرح آپ پسند کریں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر سوچنے کے لئے وقت چاہتے ہو تو سوچ لو۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں، نہ سوچو تو بہتر ہے۔ تم نے جو حالات مجھے سنائے ہیں ان میں بیشتر لمحات ایسے آئے ہوں گے جب صورتحال تمہارے بس میں نہ رہی ہوگی اور تم۔ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہوگا۔ آج بھی ایسا ہی کرو، اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ زندگی ایک خطرے کا نام ہے اور اگر یہ خطرات ا لئے آسان بنا لئے جائیں تو زندگی گزارنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ انسا خطروں کا کھلاڑی بن جاتا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''تمہیں ایک ایسا کردار دینا چاہتی ہوں جو تم نہیں ہو۔ تمہیں میرے ساتھ وہ کردا بن کر میری کچھ مشکلوں میں ساتھ دینا پڑے گا اور اس کے لئے تمہیں تھوڑے خطرات بھی پیش آسکتے ہیں۔''

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ بی بی! بھوج پتر پر تمہاری تصویر کا ابھرا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ میرا تم سے گہرا تعلق ہر قیمت پر ہونے ہی والا ہے۔ بھی تمہارے کسی کام کے لئے تیار ہوتے ہوئے میں بھوج پتر کا سہارا ضرور لوں گا۔ نے اس سے کہا۔

''آنٹی! آپ اسی ہوٹل میں مقیم ہیں؟''

''بالکل نہیں۔ لیکن یہاں میرا کمرہ موجود ہے اور اس وقت میں یہیں گزارا کر رہی ہوں۔ جبکہ یہاں لندن میں لیگ ڈسٹرکٹ نامی علاقے میں میرا ایک فارم ہاؤس موجود ہے جہاں قولی کے چند افراد مستقل مقیم رہتے ہیں۔ جب بھی میں یہاں آتی ہوں وہ میرا استقبال کرتے ہیں۔ میرے اعتماد کے لوگ ہیں۔ میرا ایک بھتیجا بھی یہاں رہتا تھا۔ لیکن...... لیکن......'' وہ خاموش ہوگئی۔

بہرحال ایک پراسرار کہانی وجود میں آئی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ضرور اس کہانی کا ایک کردار بنوں گا۔ اور ویسے بھی سچی بات ہے کہ میری زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ لندن میں میرا آنے والا وقت کیسا ہوگا۔

اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ اگر یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے تو مجھے بہت سے سہارے مل جائیں گے۔ ورنہ غیر قانونی طور پر لندن جیسی جگہ میں رہنا آسان بات نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پھر سریتا دیوی نے میری سوچ کا سلسلہ منقطع کر دیا اور بولیں۔

''کون سی منزل پر مقیم ہو؟''

''پانچویں منزل پر۔''

''میں چھٹی منزل پر ہوں۔ آؤ...... یہاں سے اٹھیں۔ بلکہ میرے کمرے میں ہی چلو۔ وہاں پہنچ کر تفصیلی باتیں ہوں گی۔''

میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا اور ہم دونوں اس جگہ سے کچھ کھائے پیئے بغیر اٹھ گئے۔ لفٹ نے ہمیں چھٹی منزل پر پہنچا دیا تھا۔

وہ میرے ساتھ راہداری میں چل رہی تھی۔ بہت سے الجھے ہوئے مسئلے تو حل ہو گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ میں اسے اگر کوئی برا کردار سمجھتا تو یہ بات اس نے خود ختم کر دی تھی اور مجھ سے ایک مقدس رشتہ جوڑ لیا تھا جو بہرحال کچھ حیثیت کا حامل تھا۔ اس کی چال بھی بڑی پُروقار تھی۔ قد و قامت بہت شاندار۔ حالانکہ اچھی خاصی عمر کی مالک تھی لیکن بدن تناسب اور رکھ رکھاؤ بے حد شاندار تھا۔ ظاہر ہے رانی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باقی حیثیت کیا ہے۔ لیکن بہرحال اس کی ظاہری شخصیت بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا، اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور

پھر کمرے میں داخل ہوگئی۔ دروازہ اس نے اندر سے بند کرلیا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔ اچھا اب یہ بتاؤ کیا کھانا پینا ہے؟“

”اصل میں......“

”نہیں، اصل میں کچھ نہیں۔ اگر مجھ پر چھوڑتے ہو تو ہم لوگ کافی لیں گے۔ کیا خیال ہے؟“

”جب آپ کا اپنا ہی فیصلہ ہے تو میرے خیال کے بارے میں سوال کرنا بے معنی ہے۔“

”نہیں، اب ایسا بھی نہیں۔ اگر تم کافی نہ لینا چاہو تو......“

”نہیں، کافی مجھے پسند ہے۔“

اس نے ٹیلی فون کے قریب جا کر روم سروس کو کال کیا۔ کافی کے ساتھ کچھ لوازمات لانے کو کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر وہ میرے سامنے صوفے پر آ بیٹھی۔

”خاقان جمشیدی! تھوڑے سے اپنے خاندانی حالات بتاؤ گے؟“

”جتنے بتا چکا ہوں بس اتنا ہی سمجھئے آنٹی! اگر کچھ اضافہ چاہتی ہیں تو اتنا سا کرلیں کہ والد صاحب کے ساتھ سیر و شکار میں زندگی گزاری۔ دوست بنا لیا تھا انہوں نے مجھے اپنا۔ پھر تعلیم کے لئے کلکتہ بھیج دیا۔ وہاں دورانِ تعلیم کچھ ایسے لوگوں سے رابطہ ہو گیا جو میرے حق میں بہتر نہ ثابت ہوئے۔ بات اس سے آگے بڑھی اور کچھ خطرناک اسمگلروں سے رابطہ پڑ گیا۔ انہوں نے مجھے قتل کے الزام میں پھنسا دیا کیونکہ میں ان میں سے ایک شخص کے لئے خطرناک ثابت ہو چکا تھا۔ یہ الزام ایسے ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ مجھ پر عائد کیا گیا تھا کہ میں اس کی تردید نہیں کر سکا۔ نتیجے میں مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ سمندری جہاز کے ذریعے اسکندریہ پہنچ گیا۔ اسکندریہ سے مجھے عجیب و غریب انداز میں جرمنی پہنچا گیا جہاں زندگی لاتعداد خطرات میں گزری اور یوں سمجھ لیجئے کہ موت میرے ساتھ ساتھ آگے پیچھے بھاگتی رہی۔ مگر زندگی کو ہی فتح حاصل ہوئی اور میں لندن آ گیا۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ لندن میں اس وقت بے یار و مددگار زندگی گزار رہا ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ آنے والا وقت میرے لئے کون سے راستے منتخب کر سکتا ہے۔“

”میں تمہیں یہ پیشکش کر چکی ہوں مائی ڈیئر سن! کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو اور اپنے مستقبل سے بے فکر ہو جاؤ۔ اگر دولت کی بات کرتے ہو تو میں ایک ریاست کی

رانی ہوں۔ دولت میرے لئے ایک بے حقیقت شے ہے۔ اگر تحفظ کی بات کرتے ہو تو ریاست قولی میں جا کر تمہیں صرف وہ سمجھا جائے گا جو میں بیان دوں گی۔ بولو منظور ہے یہ؟ ایک سوال اور۔“

”جی آنٹی۔“ میں نے کہا۔ ایک لمحے کے اندر میرا ذہن سوچ میں ڈوبا تھا اور میں نے دل میں سوچا تھا کہ اگر اس عورت کے ذریعے واقعی ہندوستان تک پہنچا جائے تو باہر کی اس دنیا سے نجات حاصل کرلوں گا جو میرے لئے اب کچھ بھی نہیں رہی تھی۔

”کسی سے عشق کرتے ہو؟“ اس نے سوال کیا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔

”نہیں۔“

”سچ کی بات ہو رہی ہے۔ ہم لوگ اس وقت تک ایک دوسرے سے بالکل سچ بولیں گے جب تک کہ یہ سچ ہمارے لئے مشکل نہ بن جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گردن ہلائی۔

”عشق کرتے ہو کسی سے؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کچھ عوامل ایسے ہی تھے۔“

”بچپن میں بھی نہیں کیا؟“

”بالکل نہیں۔“

”کیا علیحدگی پسند ہو؟“

”نہیں۔“

”اور اگر مصلحتاً کسی لڑکی سے فلرٹ کرنا پڑے تو؟“

”کرلوں گا۔“

”کسی محبوبہ کی موت کا غم ہے؟“ وہ عجیب و غریب سوالات کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں اینہ داخل ہوئی۔ محبوبہ تو خیر نہیں تھی وہ میری لیکن پھر بھی میرا دل اس کی جانب راغب رہا تھا اور اس کی موت کا مجھے دلی صدمہ تھا۔ لیکن رات گئی بات گئی والی بات تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔

''نہیں، میں آپ سے کہہ چکا ہوں، محبوب تو زندگی کی بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں لیکن کوئی بھی چیز دل کا روگ بن جائے، ایسا نہیں ہوا۔''

''ویری گڈ۔ اس کا مطلب ہے سخت گیر اور سخت مزاج ہو۔''

''کیوں اس کا یہ مطلب کیسے ہوا؟''

''اپنے تجربے کی بات کر رہی ہوں۔''

''آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟''

''یہی کہ جو لوگ حسن سے متاثر نہیں ہوتے وہ تھوڑے سے غیر انسانی صفات کے مالک ہوتے ہیں۔''

''تو آپ مجھے غیر انسانی صفات کا مالک سمجھتی ہیں؟''

''تمہاری گفتگو کی روشنی میں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں حسن سے متاثر نہیں ہوتا۔''

''ہوتے ہو؟''

''جی بالکل۔ اب جیسے آپ۔''

''میں......؟''

''ہاں...... آپ یقین کیجئے کہ میں نے آپ کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا کہ جوانی میں آپ ایسی ہوں گی، ویسی ہوں گی۔ لیکن آپ اس وقت جو کچھ ہیں وہ بھی بہت کچھ ہے۔''

''شریر لڑکے! شرارتیں مجھے پسند نہیں۔''

''یہ شرارت نہیں ہے۔ یہ تو سچائی ہے۔ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ ہمارے درمیان سچ رہے گا جب تک کہ وہ سچ کسی کے لئے مشکل نہ بن جائے۔''

''ارے واہ...... تمہاری صلاحیتیں تو کھل رہی ہیں۔''

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی اور ویٹر مطلوبہ اشیاء لے کر اندر آ گیا۔ ویٹر کے واپس جانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

''ہاں، ہمارے درمیان جو گفتگو تھی وہ روا روی کی گفتگو تھی۔ کیونکہ میں انتظار کر رہی تھی کہ ویٹر آ جائے۔ اصل بات میں اس کے بعد شروع کرنا چاہتی تھی۔''

''جی آنٹی؟''

''ٹھہرو، میں تمہارے لئے کافی بناؤں۔''

میں نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس نے کافی بنا کر باقی چیزیں میرے سامنے کیں اور بولی۔ ''بلا تکلف لو۔ کھانے پینے کی عمر ہے، اس سے گریز مت کرو۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کاجو کے دانے اٹھا لئے تھے۔ میری نگاہ سریتا دیوی کے چہرے پر پڑی تو مجھے احساس ہوا جیسے وہ کچھ سوچ میں ڈوبی ہوئی ہو۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''اصل میں ہر شخص کی زندگی کے تجربات مختلف ہوتے ہیں۔ تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ ظاہر ہے تمہاری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ میری زندگی کی مشکلیں مختلف ہیں۔ البتہ یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہر شخص کی زندگی کے معاملات مختلف ہوا کرتے ہیں اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی طرح کی الجھن کا شکار نہیں رہا ہے۔ ریاستی معاملات بہت عجیب ہوا کرتے ہیں۔ میری صورتحال یہ ہے کہ میرے شوہر کو اب سے کوئی چار سال قبل قتل کر دیا گیا تھا اور اس سے پہلے ان کے بڑے بھائی کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک ریاست کے دو افراد کا قتل معمولی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ انگریز حکومت نے اپنے تمام وسائل سے کام لینے کے باوجود ان قاتلوں کا سراغ لگانے میں کامیابی نہیں حاصل کی اور ان کے قاتلوں کا کبھی کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ بہرحال مجھے بھی کوئی ایسی بات نہیں پتہ چل سکی جس سے یہ اندازہ ہو کہ میرے شوہر اور میرے جیٹھ کو کیوں قتل کیا گیا؟ ان کا ایک بیٹا تھا، میرا مطلب ہے میرے جیٹھ کا۔ میری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ راجہ ہردیپ سنگھ، راجہ دلاور سنگھ کا بیٹا تھا۔ نو سال کی عمر میں اسے کچھ تعلیمی امور کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ سینٹ لوسیا جو مشرقی بحیرہ کریبین میں واقع ہے وہاں کی ایک یونیورسٹی میں وہ تعلیم حاصل کرتا تھا اور کاسٹریٹ جو سینٹ لوسیاہ کا دارالحکومت ہے وہاں رہا کرتا تھا۔ وہاں اس نے اپنا تھوڑا سا کاروبار بھی پھیلا رکھا تھا۔ ہردیپ سنگھ تھا اس کا نام، شاید میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ پرنس ہردیپ سنگھ کے نام سے مشہور تھا۔ بہرحال اب وہی اس خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ پھر یہ ہوا کہ رانا جسپال سنگھ جن کا قیام ہمیشہ سے لندن میں ہی تھا اور جو میرے شوہر کے بہت ہی گہرے دوست تھے، ہندوستان گئے اور چندی گڑھ میں آ کر مجھ سے ملے۔ ان کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ان دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ بڑے ہی دکھ کا شکار ہوئے تھے انہوں نے ہردیپ سنگھ سے ملنے کا ارادہ کیا تو

میں نے انہیں بتایا کہ وہ سینٹ لوسیا میں ہے۔ بہت سی باتیں ہوئیں ہمارے درمیان۔ اکیلے ہی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ روپالیہ ان کی بیٹی ہے۔ ایک انگریز ماں کی اولاد جس کی وجہ سے وہ لندن ہی میں رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں پسند کروں تو ہردیپ سنگھ کو روپالیہ سے منسلک کر دیا جائے اور ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔ میں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ہمارے درمیان یہ بات طے ہو گئی کہ روپالیہ اور ہردیپ سنگھ کو یکجا کر دیا جائے۔ اس سے کچھ تھوڑے سے ریاستی امور بھی طے ہوتے تھے اور میری پوزیشن کا ایک حصہ بھی صاف ہوتا تھا۔ ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ میں سینٹ لوسیا سے ہردیپ سنگھ کو یہاں بلا لوں اور یہاں رانا جسپال سنگھ کی بیٹی سے اس کی شادی کر دوں۔ یہ تمام معاملات طے کرنے کے بعد میں یہاں لندن پہنچی اور میں نے ہردیپ سنگھ کو ساری تفصیل لکھی۔ وہ خوشی سے مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لندن میں جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میرا ایک باقاعدہ فارم ہاؤس ہے۔ ہردیپ سنگھ نے یہاں پہنچنے کے بعد مجھے اطلاع دی کہ وہ لندن آ چکا ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے۔ چنانچہ میں یہاں پہنچ گئی۔ لیکن یہاں پہنچ کر مجھ پر اس وقت بجلی گر پڑی جب مجھے پتہ چلا کہ ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش یہیں فارم ہاؤس میں موجود ہے۔

ڈرے اور سہمے ہوئے ملازمین نے جو ہندوستانی ہی ہیں، مجھے بتایا کہ ایک رات کچھ پراسرار لوگ یہاں آ گئے اور انہوں نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ ملازموں نے فوراً ہی مجھے بھی اطلاع دینا چاہی لیکن میں ہندوستان سے چل پڑی تھی۔

میں سکتے میں رہ گئی تھی۔ ہردیپ سنگھ کی لاش میں نے دیکھی اور ایک لمحے کے اندر اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ہردیپ سنگھ کی لاش نہیں ہے بلکہ اس کے چہرے پر ہردیپ سنگھ کا میک اپ کر دیا گیا ہے۔ بعد میں، میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے اس کے چہرے کا میک اپ اتار کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کوئی ہندوستانی ہی تھا۔ نوجوان آدمی تھا اور ہردیپ کا تھوڑا بہت ہم شکل بھی تھا۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حالات کس قدر پراسرار تھے۔ میں نے ہردیپ سنگھ کا انتظار کیا۔ سینٹ لوسیا سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ ہردیپ سنگھ وہاں سے اپنے ایک دوست راجکمار کے ساتھ لندن چلا گیا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ جس شخص کو قتل کیا گیا وہ راجکمار ہی تھا۔ لیکن ہردیپ سنگھ کہاں گیا اس کے بارے میں مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ اور آج تک میں اس کشمکش کا شکار ہوں کہ آخر

ہردیپ سنگھ گیا کہاں۔'' رانی سریتا رکی تو میں نے کہا۔

''ابھی تک آپ کو ہردیپ سنگھ کا پتہ نہیں چلا؟''

''نہیں۔''

''آپ نے رانا جسپال سے ملاقات کی؟''

''اتفاق سے نہیں ہوئی۔''

''کیا مطلب؟''

''رانا صاحب فرانس میں ہیں۔ ایک دو دن میں واپس آئیں گے۔ لیکن مائی ڈیئر خاقان جمشیدی! میں رانا صاحب پر بھی نہیں ظاہر کر سکتی کہ ہردیپ کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ بدک جائیں گے۔ کون اپنی بیٹی کے لئے خطرہ مول لیتا ہے۔ ہردیپ کے پتا اور چچا یعنی میرے شوہر بھی قتل ہوئے ہیں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔''

''رانا صاحب کو معلوم ہے کہ میں لندن آ چکی ہوں۔ وہ آتے ہی مجھ سے اور ہردیپ سے ملیں گے۔ یہ میری اصل مشکل ہے۔''

''پھر اب کیا کریں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''خاقان! تمہیں ہردیپ بننا ہو گا۔''

سریتا دیوی نے کہا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

✲✰✲

تھوڑی دیر تک تو میں اسی کشمکش کا شکار رہا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے وہی سریتا دیوی نے کہا ہے یا مجھے دھوکا ہوا ہے۔

''سنا تم نے خاقان......؟'' سریتا دیوی بولیں۔

''مجھے ہردیپ بننا ہوگا؟''

''ہاں۔''

''مگر کیسے......؟'' میں بدستور حیرت سے بولا۔

''یہ مشکل نہ ہوگا۔ بشرطیکہ......''

''بشرطیکہ؟''

''بشرطیکہ تم تیار ہو۔''

''فرض کیجئے آنٹی میں تیار ہو جاتا ہوں تو کیا رانا جسپال سنگھ......''

''یہی ایک آسانی ہے بچے۔''

''کیا؟''

''رانا جسپال سنگھ نے تمہیں یعنی ہردیپ کو دیکھا نہیں ہے۔''

''تصویر بھی نہیں دیکھی؟''

''ہاں، نہیں دیکھی۔''

''اور ان کی بیٹی روپالیہ نے بھی نہیں۔''

''اس نے بھی نہیں۔''

''کیا یہ کمال کی بات نہیں ہے آنٹی؟''

''نہیں ہے بیٹے۔'' رانی نے جواب دیا۔

''مجھے سخت حیرت ہے۔''

''آخر کیوں؟''

''اس دور میں بھی ایسا ہوتا ہے؟''

''کیسا......؟''

''نہ رانا جسپال سنگھ نے ہریپ کو دیکھا اور نہ ان کی بیٹی روپالیہ نے اور وہ لوگ شادی کے لئے تیار ہو گئے جبکہ خاص طور سے روپالیہ ایک انگریز ماں کی بیٹی ہے۔ ظاہر ہے اس کا مزاج......''

''آہ...... یہ ایک دلچسپ بات ہے۔''

''کیا؟''

''روپالیہ خاص طور سے خالص ہندوستانی مزاج کی حامل ہے اور پھر بڑے خاندانوں کی مان مریادائیں ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے رانی صاحبہ...... آپ اتنا بڑا جوا کھیلیں گی؟''

''بہت ضروری ہے خاقان!''

''اور آپ کا کیا خیال ہے کہ ہردیپ زندہ ہے؟''

''میں تمہیں اس خیال کی وجہ بتا چکی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ وہ آپ سے ملا تو؟''

''ملے گا۔ ضرور ملے گا۔''

''اس کے بعد آپ کیا کریں گی؟''

''دیکھو، میرا موقف سمجھو۔''

''واقعی میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا ہے۔''

''کافی اور پیو۔'' رانی نے میری کافی کی پیالی دوبارہ بھرتے ہوئے کہا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رانی نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر بولی۔ ''ہنسے کیوں؟''

''آپ کے انداز پر۔''

''میں نہیں سمجھی؟''

''آپ نے اس طرح کہا جیسے کافی سب کچھ سمجھ جانے کا ذریعہ ہو۔''

''واقعی ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔

''چلئے ٹھیک ہے۔ آپ کی بات مانے لیتا ہوں کہ کافی بہت سی باتوں کو سمجھانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے پیالی اٹھائی اور پھر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ رانی سریتا دیوی بھی اپنی کافی کی پیالی ہاتھ میں اٹھا کر سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''دیکھو اصل میں یہ میرے لئے ذرا سی سکون کی بات ہے کہ رانا جسپال سنگھ اور روپالیہ ہردیپ کو پہچانتے نہیں۔ ہردیپ جوان اور خوبصورت آدمی ہے۔ رانا صاحب نے بچپن میں کبھی اس کو دیکھا تھا لیکن اس وقت اس کی عمر آٹھ یا نو سال کی تھی۔ اس کے بعد سے رانا صاحب نے اسے نہیں دیکھا۔ جہاں تک میں اپنی مان مریاداؤں یا رسم و رواج کی بات کرتی ہوں تو ہمارے ہاں یہ قدیم رسم اب بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ بچوں کی تقدیر کا فیصلہ والدین ہی کیا کرتے ہیں اور بچے مان بھی لیا کرتے ہیں۔ رانا جسپال نے اپنی بیٹی کو وہ تمام باتیں سکھائی تھیں۔ حالانکہ اس کی ماں فطری طور پر ذرا مختلف تھی۔ لیکن رانا جسپال اور اس کی بیٹی کے معاملات میں اس کی ماں نے کبھی ٹانگ نہیں اڑائی۔ روپالیہ ویسے تو ایک ماڈرن لڑکی ہے جس طرح لندن کی انگریز لڑکیاں ہوتی ہیں لیکن اسے ہندوستانی ماحول بہت پسند ہے۔ اکثر ساڑھی باندھتی ہے اور ماتھے پر تلک لگا کر گنیش پوجا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تصویر کا مسئلہ یوں تمہارے ذہن سے صاف ہو جانا چاہئے اور ہردیپ کو نہ جاننے کا بھی۔ تم ہردیپ کی حیثیت سے ان سے ملو گے۔ یوں سمجھ لو کہ کسی کو کوئی حیرت نہیں ہوگی۔ ہردیپ چونکہ وطن سے باہر رہا ہے اس لئے بھی لوگ اسے نہیں جانتے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ عارضی طور پر کوئی بڑی گڑبڑ نہ ہونے پائے اور وہاں چندی گڑھ میں کچھ لوگ جو اس بات کے منتظر ہیں کہ رانا جسپال کی بیٹی سے ہردیپ کی سگائی نہ ہونے پائے اور شاید وہی لوگ ہردیپ کے قتل کے سلسلے میں بھی ملوث ہیں، انہیں شاک لگے گا۔ عارضی طور پر وہ کچھ نہیں کر سکیں گے جبکہ اپنی دانست میں ہردیپ کو قتل کر کے انہوں نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے پلیز میری مدد کرو۔ میں بالکل یہ پیشکش نہیں کروں گی کہ اس کا تمہیں منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ لیکن اگر تم چاہو گے تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''مجھے ایک سوال کا جواب اور دیجئے گا۔''

''بولو۔ پلیز بولو۔''

''ہردیپ اگر زندہ ہے اور جب وہ منظر عام پر آئے گا تو کیا ہوگا؟''

''بالکل کچھ نہیں ہوگا۔ میرے اور ہردیپ کے درمیان بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔''

''اور رانا جسپال کو؟''

''رانا جسپال کو بھی میں بتا دوں گی کہ اصل صورتحال کیا ہے۔ یہ اصل میں رانا صاحب بے چارے کو میں نے اپنے ذاتی معاملات سے آگاہ نہیں کیا جبکہ وہ ہمیشہ یہی چاہتے رہے ہیں کہ میری تنہائی مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے اور میں ان کا سہارا حاصل کر لوں۔ بہت ہی اعلیٰ ظرف انسان ہیں وہ۔ میرا مطلب ہے کہ اگر یہ عارضی مسئلہ حل ہو جائے تو آگے چل کر تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہردیپ کسی نہ کسی طرح مجھ سے رابطہ قائم کرے گا ہی۔ میں کم از کم اس ایک پہلو سے نمٹنے کے بعد زیادہ محتاط ہو کر ہردیپ کو تلاش کر سکوں گی اور ویسے بھی میں تمہیں پیشکش کر چکی ہوں کہ تم میرے ساتھ ہندوستان چل سکتے ہو۔ دنیا کا کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ تم ہردیپ نہیں ہو۔''

''رانی صاحبہ! مجھے سوچنے کا موقع دیں گی آپ؟''

''کب جواب دو گے؟''

''کل۔''

''میں انتہائی بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گی۔ اور دیکھو، میری لاج رکھ لینا۔ اس وقت تم میرے لئے بہت بڑا سہارا بن گئے ہو اور میں نے اپنا انتہائی راز تمہیں دے دیا ہے۔''

''آپ اطمینان رکھیں، جو کچھ بھی ہوگا بہتر ہی ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

رانی کے ساتھ کافی وقت گزارا اور پھر ہم دونوں الگ الگ ہو گئے۔ جاتے وقت رانی نے دوسرے دن دس بجے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا اور اس کے بعد بہت دیر تک میں اس عجیب و غریب کہانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہرحال احمق تو میں بھی نہیں تھا۔ رانی سریتا دیوی نے جو داستان سنائی تھی، وہ دلچسپ اور پُراسرار تھی لیکن اس میں خود رانی کا کردار بھی کم پُراسرار نہیں تھا۔

ہردیپ سنگھ، رانی کے شوہر کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔ بقول اس کے اس کا شوہر اور اس کا جیٹھ قتل ہو چکے تھے۔ ان کے قاتل کون تھے؟ اس کے بارے میں رانی نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا نہ ہی کسی خاص آدمی پر شبہے کا اظہار کیا تھا۔ کم از کم رانی کے ان

دشمنوں کی نشاندہی تو ہونی چاہئے تھی۔ کوئی نام تو سامنے آنا چاہئے تھا تاکہ یہ اندازہ لگایا جا
سکتا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ پھر ہردیپ کا معاملہ تھا۔ یہ ساری باتیں قابل غور تھیں۔
بقول رانی کے، راناجسپال ابھی لندن سے باہر تھے ورنہ ہردیپ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

بات میرے راستے سے ہٹ کر تھی اور اصولی طور پر جن حالات میں الجھا ہوا تھا ان
حالات میں کسی نئی الجھن کو قبول نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ایک جگہ آ کر یہ کہانی مجھ سے
منسلک ہو جاتی تھی۔ وہ یہ کہ بھوج پتر پر رانی کا چہرہ تھا اور اس کی وجہ سے ہی میں رانی
کی طرف متوجہ ہوا تھا اور پھر رانی نے اپنی یہ کہانی پیش کر دی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ
میری زندگی کے ساتھ گزرے ہوئے تمام واقعات کہیں نہ کہیں رانی سریتا دیوی کے اس
معاملے سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ بس یہ ذرا قابل غور بات تھی۔ بھوج پتر کا خیال آتے
ہی میں نے دل میں سوچا کہ اب جب میں اپنے طور پر ان تمام معاملات میں اپنے آپ
کو ملوث کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو پھر اس بھوج پتر سے بھی کنارہ کشی بیکار ہے۔
دیکھوں تو سہی یہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔ میں نے بھوج پتر نکال کر دیکھا اور واقعی
حیران رہ گیا۔ چونکہ بھوج پتر پر چند الفاظ لکھے ہوئے تھے جو یوں تھے۔

”ٹھیک ہے، جاری رکھو۔“

گویا یہ میرے سوال کا جواب تھا۔ میں دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھوج پتر پر لکھے
ہوئے ان جملوں کو دیکھتا رہا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے ذہن میں اپنا سوال دوہرایا۔

”کیا مجھے رانی سریتا دیوی کے ساتھ اس کی خواہشوں کی تکمیل کرنی چاہئے؟“

بھوج پتر پر جواب تو وہی لکھا ہوا تھا ٹھیک ہے جاری رکھو۔ لیکن حیرت انگیز طور پر
ٹھیک ہے سے پہلے ہاں کے الفاظ کا اضافہ ہو گیا اور اب یہ جملہ یوں بنتا تھا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔ جاری رکھو۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور بھوج پتر اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ واقعی بڑی
حیرت انگیز چیز تھی۔ اس سے پہلے میں اس کے ساتھ لاپرواہی برتتا آیا تھا اور میں نے
اسے کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ لیکن بہت سے سوالات کا جواب اس سے مل جاتا تھا اور یہ
ایک دلچسپ بات تھی۔ پھر میں بستر پر لیٹ کر بہت دیر تک گاشر برم، شومندر اور اس کے
قرب و جوار میں بکھرے ہوئے کرداروں کے بارے میں سوچتا رہا۔

ہیک کو ایک بار پھر میرے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہا ہوگا

جرمنی کے اس کیمپ میں مجھے پھنسا کر اس نے میرے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے ہیں۔ لیکن
میرا وہاں سے ایک مکمل فرار اس کے لئے بڑی بدنصیبی کا باعث تھا۔ اب یہ اندازہ میں
نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کہاں تک جان سکے گا، یہ پتہ چلا سکے گا یا نہیں
کہ میں لندن میں ہوں؟ ایک اور بات قابل غور تھی کہ وہ تختی جس کی تلاش میں ہیگ
ہے، آخر کیا حیثیت رکھتی ہے؟ ایک طرف تو کچھ مذہبی لوگ اس کے چکر میں پڑے
ہوئے تھے اور دوسری جانب ہیگ جیسا خطرناک آدمی جس کی دولت کی کوئی انتہا ہی نہیں
ہے ایک ایسے خزانے کی تلاش میں ہے جس کا تعلق اس تختی سے ہے اور جس کے بارے
میں یہ سنا جا رہا ہے کہ وہ دنیا کا عظیم الشان خزانہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصل
قصہ کیا ہے۔

بہرحال بھوج پتر پر یہ الفاظ ابھرنے کے بعد میں نے بھی اپنے آپ کو مطمئن کر لیا
تھا اور تو کوئی سہارا تھا نہیں جس کے بل پر اپنے ان فیصلوں میں تبدیلی کر سکتا۔ پتہ نہیں
وہ کمبخت وردان سادھانی جو سمندر میں رواں دواں جہاز پر آ موجود ہوتا تھا، اب کہاں
مٹ گیا تھا۔ کیمپ پر قید کے دوران بھی وہ مجھ تک نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی ہی
صورتحال ہو۔ لاتعداد باتیں میرے علم میں کہاں تھیں۔ بہرطور یہ ایک سنگین صورتحال تھی۔
لیکن اب تو کوئی چیز میرے لئے سنگین نہیں رہی تھی۔ جس طرح کے حالات سے واسطہ پڑ
چکا تھا وہ ایسے ہی تھے کہ ہر واقعہ کی سنگینی میرے لئے بالکل بے اثر تھی۔

دوسرے دن سریتا دیوی ٹھیک دس بجے میرے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ ان
کی دستک سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ آ گئی ہیں۔ ساری باتیں اپنی جگہ، یہ عورت اس
قدر دلکش تھی کہ اسے دیکھ کر ہمیشہ ایک خوشگوار کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے مسکرا کر
اس کا خیر مقدم کیا تو وہ بولی۔

”میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ تمہارے چہرے پر برہمی کے آثار ہوں گے۔“

”کیوں۔ بیٹھئے آنٹی پلیز۔“

وہ بیٹھ گئی، پھر بولی۔ ”بس دوسروں کے معاملے میں الجھنا اور وہ بھی ان خطرناک
حالات میں کوئی معمولی کام تو نہیں ہوتا۔“

”آنٹی! پھر بھی میرا یہ خیال ہے کہ انسان کو کسی کی مشکل میں اس کی مدد کرنی
چاہئے۔“

"تت...... تمہارا مطلب ہے کہ تم؟"

"ہاں، میں تیار تو پہلے ہی ہو چکا تھا، بس ذرا سی الجھن تھی۔ لیکن میں نے اپنے ذہن کو صاف کرلیا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ...... مائی گاڈ...... میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھولوں گی خاقان! باقی یہ مشکل کام ہے کہ کوئی کسی کے لئے خطرہ مول لے۔ بہر حال یہ وعدہ میں تم سے کرتی ہوں کہ خطرہ تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ "خطرہ تو ہے آنٹی۔"

"نہیں، نہیں ہے۔"

"آپ غور تو کیجئے ذرا۔"

"میں نے غور کرلیا ہے نا۔ میں ہوں نا تمہارے لئے ہر طرح سے۔"

"وہ تو میں مانتا ہوں۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ اگر کسی نے ہردیپ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور اس کا دوست ہردیپ کے دھوکے میں قتل ہو چکا ہے تو کیا قاتل ہردیپ کو دوبارہ دیکھ کر یا ہردیپ کی شکل میں مجھے دیکھ کر یہ نہیں سوچیں گے کہ میں کون ہوں اور کیوں ہردیپ بنا ہوا ہوں؟ اور کیا وہ میرے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

میرے ان الفاظ پر رانی سریتا سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"ہاں، یہ کسی حد تک ہے۔ تو پھر؟"

"نہیں سریتا دیوی! میں آپ کو صرف وہ حالات بتا رہا تھا جو آئندہ پیش آ سکتے ہیں ویسے کیا میں آپ سے یہ سوال کرسکتا ہوں کہ آپ کو ہردیپ کے دشمنوں یا پھر بالفاظِ دیگر ان دشمنوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں جنہوں نے آپ کے شوہر اور ان کے بڑے بھائی کو قتل کیا؟ پہلے بھی میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ ہر عمل کی کچھ کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت میں اس سوال کو دہرانے کا حق نہیں رکھتا تھا کیونکہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب...... اب باقاعدہ آپ کے ساتھ ملوث ہو چکا ہوں۔"

"مم...... مطلب یہ کہ ان حالات کا اندازہ لگانے کے باوجود تم میرے لئے ہردیپ بننے کو تیار ہو؟"

"ہاں۔ میں نے کہا نا وہ تو میں پہلے بھی تیار تھا بس تھوڑا سا سوچ بچار کرنا تھا۔ جو میں نے کرلیا ہے۔"

"اوہ...... مائی سن! کچھ باتیں آنے والے وقت کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ رفتہ رفتہ بہت کچھ تمہارے علم میں آجائے گا۔ فی الحال جتنا جانتے ہو اسی پر قناعت کرو۔"

میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا۔ "کیسی دلچسپ بات ہے آنٹی! میں بے لوث اور بے غرض آپ کے لئے کام کر رہا ہوں اور آپ مجھے وہ باتیں بھی نہیں بتانا چاہتیں جو آپ کے علم میں ہیں۔"

میرے ان الفاظ پر رانی کے چہرے پر شرمندگی کے نقوش نظر آئے۔ میں نے خود ہی بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"میں تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"تو اب صورتحال آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بتائیے کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں یہاں سے فارم ہاؤس چلنا ہوگا۔ تم اپنا کمرہ اسی طرح اپنے پاس رہنے دو۔ میں بھی اپنا کمرہ رکھتی ہوں۔ ہمیں کسی بھی وقت ان کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ لیکن فی الحال جب تک کہ کوئی خطرہ نہیں ہے ہم فارم ہاؤس میں ہی قیام کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، جیسا آپ پسند کریں۔" میں نے اپنا سامان سمیٹنا چاہا تو وہ بولی۔

"بالکل نہیں، تمہاری جسامت ہردیپ جیسی ہے، ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ تمہیں دنیا کی ہر چیز وہاں مل جائے گی۔ سب کچھ اسی طرح رہنے دو، اس طرح کسی کو شبہ بھی نہیں ہو گا۔ کیا خیال ہے، چلیں؟"

"ناشتہ کرلیا ہے آپ نے؟"

"ہاں کرلیا ہے۔ لیکن ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہاں سارے انتظامات موجود ہیں۔"

"اوکے۔"

میں نے بھوج پتر اپنے لباس میں ضرور چھپا لیا تھا اور دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ کسی بھی طرح اس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم ہونے دوں گا۔ یہ میرا بہترین ساتھی ہے۔ اور پھر میں رانی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دے کر میں باہر کی جانب

چل پڑا جہاں وہ ایک ٹیکسی لئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ لندن کی کہریلی فضا اور بہت ہی خوبصورت ماحول ہمارے سامنے تھا۔ ہندوستان کے بعد اسکندریہ پھر جرمنی اور اب لندن یہ سب کچھ میرے لئے بڑی دلکشی کا حامل ہوتا اگر ساتھ میں ذہنی سکون بھی ہوتا۔ اس وقت جو لمحات گزر رہے تھے وہ بھی برے نہیں تھے میرے لئے۔ رانی سریتا دیوی کی پراسرار کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے زندگی ایک نئی ڈگر کی جانب جا رہی تھی۔

ٹیکسی لندن کے حسین ماحول سے گزرتی ہوئی کسی قدر دیہی ماحول میں آ گئی۔ لیک ڈسٹریکٹ لندن کا ایک نواحی علاقہ تھا اور جھیلوں کا یہ شہر اپنے حسن میں بے مثال تھا۔ بلندیوں اور نشیبوں کی طرف سفر کرتے ہوئے آخر کار ہم سڑک سے کٹ کر ایک ذیلی سڑک پر آ گئے جس کے اختتامی سرے پر ایک خوبصورت فارم ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ بانسوں کا احاطہ بنایا گیا تھا اور اس میں ہندوستانی طرز کا دروازہ کاٹا گیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''کیا وہ فارم ہاؤس ہے؟''

''ہاں۔''

''اور یہ سڑک خاص طور سے بنوائی گئی ہے؟''

''ہاں۔''

میں نے دل میں سوچا کہ بات معمولی نہیں ہے۔ لندن جیسا شہر اور اس طرح وہاں اپنی پسند کی جگہ بنانا کسی معمولی حیثیت کی مالک شخصیت کا کام نہیں ہو سکتا۔

بڑے دروازے پر ایک چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔ ہندوستانی ہی تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ٹیکسی کو دیکھا تو رانی نے گردن نکال کر کہا۔

''دروازہ کھول دو دیال سنگھ! یہ میں ہوں۔''

چوکیدار ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے بدحواسی میں کئی سلام داغ دیئے اور پھر دروازہ کھلنے لگا۔ ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔ ایک چوڑی سی روش بنی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف انتہائی خوبصورت تختے تھے۔ بانسوں کے احاطے کے ساتھ ساتھ درخت لگائے گئے تھے جو کافی بڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے فوارے جگہ جگہ بنے ہوئے تھے جو ضرورت پڑنے پر ان پھولوں کی آبیاری کرتے ہوں گے۔ سنگ مرمر کی سفید بنچیں، کہیں راج ہنس کہیں

دیوی دیوتاؤں کے مجسمے۔ وہ ماحول پیدا کر دیا تھا اس فارم ہاؤس کو بنانے والوں نے کہ یقیناً مقامی لوگ اسے دیکھ کر عش عش کرتے ہوں گے اور ان پر کروڑوں روپیہ صرف کیا ہوگا۔

ٹیکسی اس عمارت کے سامنے رک گئی جس کے دونوں سمت سنگ مرمر کے راج ہنس پہرہ دے رہے تھے۔ رانی نیچے اتری۔ دو ملازم دوڑتے ہوئے آ گئے۔ سارے کے سارے ہندوستانی تھے۔ رانی نے کہا۔

''ڈرائیور کو کرایہ ادا کر دو۔ جتنا اس کا بل بنتا ہے اس سے دوگنا دے دو۔ آؤ۔'' رانی نے مجھ سے کہا اور ہم دونوں وہ پانچ سیڑھیاں طے کرنے لگے جو ایک چبوترے پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ چبوترے پر جو پتھر لگایا گیا تھا وہ اس قدر شفاف تھا کہ چہرے کے نقوش دیکھ لو۔ آگے ایک دروازہ تھا۔ رانی نے وہ دروازہ کھول کر مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''آؤ۔''

''رانی صاحبہ! بہت خوبصورت جگہ ہے یہ۔''

''شکریہ۔ آؤ۔'' رانی نے کہا۔ ایک چھوٹی سی راہداری عبور کر کے ایک اور دروازہ آ گیا۔ ٹیکسی کا بل ادا کرنے کے بعد وہ دونوں ملازم بھاگے بھاگے یہاں آئے تھے اور یہ دوسرا دروازہ انہوں نے ہی پُر ادب انداز میں کھولا تھا۔ ہم ایک ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم کی چھت گنبد کے انداز میں بنی ہوئی تھی اور اس پر کوئی بیس فٹ قطر کا حسین ترین فانوس لٹکا ہوا تھا جس کی قیمت ہی لاکھوں ڈالر ہو گی۔ نیچے جو فرنیچر پڑا ہوا تھا وہ انتہائی خوبصورت تھا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں شاہی خاندان کے محل میں گھس گیا ہوں۔

''بیٹھو..... تھوڑی دیر تک یہاں بیٹھتے ہیں۔ میں ملازموں کو تمہارا کمرہ تیار کرنے کے لئے کہہ دیتی ہوں۔ ویسے ایک بات کہوں؟''

''جی۔'' میں نے کہا۔

''تم خاموش ہو۔ مجھ سے ہر طرح کے سوال کر سکتے ہو۔ اس جگہ کے بارے میں، یہاں کے لوگوں کے بارے میں۔ کیونکہ اب تمہیں یہاں کچھ وقت ہردیپ سنگھ کی حیثیت سے گزارنا ہوگا اور ہم ہر مسئلے کا حل تلاش کریں گے۔''

"کتنے ملازم ہیں یہاں؟"

"سات۔ دو عورتیں، پانچ مرد۔ ایک گیٹ پر چوکیداری کرتا ہے، ایک مالی ہے،
کچن میں کام کرتے ہیں، ایک کیئر ٹیکر ہے، صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا ہے۔ عورتیں بھی
گھر کے اندرونی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ یہاں کا سارا کام ا
سات افراد میں بٹا ہوا ہے۔ سوائے گیٹ کے چوکیدار کے جو اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہتا ہے
باقی چھ افراد ضرورت کا ہر کام کر لیا کرتے ہیں۔ تم ان میں سے تین کو دیکھ چکے ہو، با
لوگوں کو بھی میرے آنے کی اطلاع تو مل گئی ہو گی۔ لیکن جب تک میں انہیں طلب نہیں
کروں گی وہ اندر نہیں آئیں گے۔ کچھ خصوصی ہدایات ہیں ان کے لئے۔"

"ایک بات بتایئے؟"

"ہاں۔"

"آپ جب ہندوستان سے آئی تھیں تو سیدھا فارم ہاؤس پہنچی ہوں گی۔"

"نہیں، پہلے میں نے یہاں ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا تھا۔ اصل میں جن حالات
میں گزر رہی ہوں ان میں احتیاط اول حیثیت رکھتی ہے۔ میں احتیاط کا دامن ہاتھ
نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد میں فارم ہاؤس پہنچی تھی اور مجھے ا
حادثے کا علم ہوا تھا۔"

"کیا یہاں ملازموں کو اس بات کا علم ہے کہ آپ نے ہلٹن میں اپنا کمرہ بک ک
ہوا ہے؟"

"کسی کو نہیں۔ یہاں تک کہ میں جب یہاں سے واپس ہوٹل گئی تھی تو فارم ہاؤس
گاڑی تک میں نہیں گئی تھی۔ جبکہ یہاں پانچ گاڑیاں موجود ہیں۔"

"ٹھیک۔ اس سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ملازموں میں کوئی شخصیت ایسی
ہے جسے آپ نے خصوصی طور پر......"

"دیکھو، ہردیپ کے قتل کے بارے میں تو سب ہی کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب
ہے میں نے ان سے کوئی بحث نہیں کی لیکن ان میں سے تقریباً سبھی یہ بات جانتے
کہ قتل ہردیپ سنگھ کا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا دوست مارا گیا ہے۔"

"اوہ...... یہ بات ان لوگوں کو معلوم ہے؟"

"ہاں ظاہر ہے۔ انہی کی مدد سے میں نے باقی کام کئے تھے۔ انہیں رازدار

ضروری تھا ورنہ یہ دیارِ غیر ہے، انگریزوں کا ملک ہے۔ میں خود مشکل میں پڑ جاتی۔"

"گویا آپ نے اس دوسرے قتل کی اطلاع کسی کو نہیں دی؟"

"بھئی دونوں لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ میں کسی کو اس بارے میں اطلاع نہ دیتی۔
ایک طرف تو مجھے پولیس کے سوالات میں الجھنا پڑتا اور دوسری طرف رانا جسپال کے
معاملے میں مار کھا جاتی۔ چنانچہ خاموشی سے سب کچھ کر دیا۔ بہرحال یہ گناہ تھا کہ میں
نے اس لاش کو جلانے کی بجائے زمین میں دفن کرا دیا۔"

"اوہ...... کہاں؟"

"یہیں، اس فارم ہاؤس کے ایک حصے میں۔ کسی کو اس بارے میں پتہ نہیں چل سکتا۔"

"بڑی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو یہاں کافی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔"

"نہ کرتی تو کیا کرتی؟ دو ہی باتیں ہیں، جس مصیبت میں، میں گرفتار ہوئی ہوں اس
میں ہر کام لمحوں کے اندر کرنا ضروری تھا۔ جہاں بھی کچی پڑتی، مار کھا جاتی۔ حالانکہ کتنی
ہی بار میرا دل دُکھا ہے اور مجھے ایک تھکن کا احساس ہوا ہے۔"

"رانی صاحبہ! بڑی دلچسپ بات ہے۔ اچھا آپ یہ بتایئے، یہ ساری جدوجہد کس کے
لئے کر رہی ہیں؟"

"مطلب؟"

"دیکھئے آپ نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں آپ سے ہر طرح کے سوالات کر سکتا
ہوں۔ آپ کی نہ کوئی اولاد ہے نہ اور کوئی ہے، آپ یہ سب کچھ کس لئے کر رہی ہیں؟"

رانی کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ "انسان کی اپنی
زندگی بھی کچھ ہوتی ہے نا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں خودکشی کر لوں گی؟ جب تک جیتی ہوں
کچھ نہ کچھ تو کر کے جینا ہے۔ پلیز! اس طرح کے سوالات نہ کرو مجھ سے۔ میرے دل پر
چوٹ لگتی ہے۔"

"سوری آنٹی، سوری۔ خیال رکھوں گا۔ لیکن بس ایسے ہی ذہن میں یہ سوال آ گیا تھا۔"

اس نے مضمحل انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنے
برابر لگی ہوئی کالے رنگ کی ایک عجیب سی چیز پر ہاتھ رکھ دیا، دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز
سنائی دی تھی۔ یہ خوبصورت سی چیز جو بظاہر ڈیکوریشن پیس معلوم ہوتی تھی اصل میں
ملازموں کو بلانے کے لئے کوئی گھنٹی تھی۔ دروازے سے جو لڑکی یا عورت اندر داخل ہوئی

اس کی عمر اٹھائیس سے لے کر تیس سال کے درمیان ہوگی۔ چہرے مہرے سے پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اندر آ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

"جے شری! سب کو بلا لو۔ چوکیدار سے بھی کہو کہ کچھ دیر کے لئے دروازہ لاک کر کے اندر آ جائے۔"

"جی رانی صاحبہ!" آنے والی نے جس کا نام جے شری لیا گیا تھا، گردن خم کر کے کہا اور پھر جدھر سے آئی تھی اسی طرف سے باہر نکل گئی۔ رانی کہنے لگی۔

"حالانکہ یہاں اس عمارت میں انتہائی موثر انتظامات ہیں، فارم ہاؤس کے بڑے گیٹ سے جب کوئی اندر داخل ہوتا ہے تو یہاں موجود تمام افراد کو پتہ چل جاتا ہے اور سب لوگ مستعد ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہردیپ سنگھ کے دوست کو قتل کر دیا گیا۔ بہرحال جو لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں وہ بھی معمولی نہیں ہوتے اور ان کے پاس مکمل انتظامات ہوتے ہیں۔ میں ان سب سے تمہارا تعارف کرائے دیتی ہوں تاکہ یہ محتاط رہیں۔"

"آپ کیا کہہ کر ان سے میرا تعارف کرائیں گی؟"

"یہی کہ تم ہردیپ ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہاں رانا جسپال بھی آئیں گے۔ انہیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے، مناسب قدم ہے آپ کا۔ ویسے کیا یہ سب قابل اعتماد ہیں؟"

"یہ سارے کے سارے چندی گڑھ کے ہی رہنے والے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے باپ دادا بھی ہماری ریاست میں ہمارے ملازم رہے ہیں۔ میں نے انہیں خاص طور سے وہاں سے یہاں بھیجا تھا کیونکہ یہ سارے کے سارے وفادار ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر اطمینان کی بات ہے۔" میں نے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد جن سات ملازمین کا رانی سریتا نے انکشاف کیا تھا وہ یہاں آ موجود ہوئے۔ دونوں عورتیں خاص طور سے قابل دید تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام جے شری تھا اور دوسری کا راج شری۔ دونوں جڑواں بہنیں ہی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک ہی شکل وصورت، ایک ہی جسامت۔ بہرحال میں نے ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ وہ دونوں ملازمائیں تھیں۔ لیکن دلکش تھیں اور اس طرح صاف ستھری کہ دیکھنے میں ہی اچھی معلوم ہوں۔

رانی نے کہا۔ "سنو، تم لوگوں کو حالات کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ یہ ایک سرکاری

عہدیدار ہیں جو تحقیقاتی مشن پر آئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ کسی بھی بیرونی آدمی کو یہاں ہونے والے واقعات کے بارے میں ایک لفظ کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔ اب بھی میری یہی ہدایات ہیں۔ رانا جسپال سنگھ، ان کی بیٹی یا ان کے متعلقین یہاں آئیں گے۔ تم پرنس ہردیپ سنگھ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ یہ صاحب جو ہیں یہ پرنس ہردیپ سنگھ ہیں۔ سمجھے؟ میں نے تم لوگوں کو مکمل اعتماد کے ساتھ یہ بات بتا دی ہے۔ ہر لمحے ان کا احترام پرنس کی طرح ہی کیا جائے اور کسی کو یہ شبہ نہ ہونے دیا جائے کہ یہ پرنس نہیں ہیں۔ سمجھے؟"

"جی رانی صاحبہ! آپ نے ہمیں حکم دیا، ہم نے اسے اپنے شریر میں اتار لیا۔ اب آپ بالکل چنتا نہ کریں۔"

"راج شری! تم انہیں ان کے کمرے میں لے جاؤ اور تمام چیزوں سے روشناس کرا دو۔"

"جی رانی صاحبہ!"

"ہردیپ، تم جاؤ۔ اور سنو، اب میں تمہیں ہردیپ کے سوا کچھ اور نہیں کہوں گی۔ تاکہ مجھے بھی عادت پڑ جائے۔ میں ذرا ان لوگوں کو کچھ اور ہدایت دینا چاہتی ہوں۔"

میں اس لڑکی کے ساتھ چل پڑا جس کا نام راج شری تھا۔ جے شری اور راج شری میں صرف اتنی ہی تمیز کی جا سکتی تھی کہ ان کے لباس الگ الگ تھے ورنہ جڑواں بہنوں میں وہ سب سے زیادہ حیرت ناک تھیں۔

بہرحال میں راج شری کے ساتھ اس محل نما عمارت کی مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا ایک بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں مشرق نے اپنے خاصے اثرات قائم کئے ہوئے ہیں۔ ریاست قولی کی اس رانی کے پرکھوں نے بھی لندن جیسے شہر کے اس خوبصورت حصے میں جو عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اسے خاص طور سے ہندوستانی طرزِ معاشرت کا نمونہ بنایا گیا تھا۔ عمارت بہت زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن بے پناہ خوبصورت تھی۔

بہرحال میں اس وسیع و عریض کمرے میں داخل ہو گیا جہاں دنیا کا اعلیٰ ترین فرنیچر اور قیمتی ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ راج شری مجھے ایک ایک چیز کے بارے میں بتانے لگی۔ سونے کے لباس کی الماریاں الگ تھیں، اعلیٰ درجے کے سوٹوں کی الماری الگ۔ گھر

میں پہننے کے کپڑے الگ، جوتے، ٹائیاں، موزے اور پھر واش روم۔ دیواروں میں جگہ جگہ خوبصورت بٹن لگے ہوئے تھے جو دیواروں کی خوبصورتی کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ لیکن پتہ یہ چلا کہ ان سے پوری عمارت میں کسی کو بھی اطلاع دی جا سکتی تھی۔ راج شری ایک ایک چیز کے بارے میں بتانے لگی تو میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

''سب کچھ بتا دیا تم نے راج شری۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پہلی بار اس کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ موٹی موٹی آنکھیں، پتھر کی دیویوں جیسے موٹے اور پتلے نقوش، ہونٹوں کی اعلیٰ تراش۔ ملازمہ کی حیثیت سے اگر وہ میرے سامنے نہ آتی اور خوبصورت لباس پہنا کر سامنے کی جاتی تو راجکماری ہی لگتی۔ اس وقت ایک احساس دل میں جاگا کہ انسان کے اندر بہت سے انسان چھپے ہوتے ہیں۔ ہم سطحی نگاہ سے جس چیز کو دیکھتے ہیں ہمارا ذہن اس کا عکس ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ انہیں ملازموں کی حیثیت سے میرے سامنے لایا گیا تھا، اگر کسی بڑی حیثیت سے سامنے لایا گیا ہوتا تو اس کی دلکشی کا انداز ہی اور ہوتا۔ اس نے میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمار جی! ہم اپنے بارے میں کیا بتائیں۔ داسی ہیں آپ کی۔ نام تو ہمارا پتہ ہے آپ کو کہ راج شری ہے۔''

''جے شری تمہاری بہن ہے؟''

''ہاں۔ جڑواں بہن۔''

''میرا یہی اندازہ تھا۔ بہرحال راج شری! تم یہاں کیا کرتی ہو؟''

''اصل میں کمار جی، یہاں ہم ہی لوگ رہتے ہیں۔ بہت پہلے یہاں کبھی زیادہ لوگ آ جاتے تھے ہندوستان سے۔ لیکن اب قولی میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ بہت سے لوگ وہاں نہیں رہے۔ رانی جی تو بہت کم آتی ہیں۔ اس لئے ہم سب ہی یہاں اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ کسی کی کوئی خاص ذمے داری نہیں ہے۔ بس سب کا ایک کام ہے، اسے چمکائے رکھیں۔ اصل میں اس میں ہندوستانی ثقافت بھی جھلکتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقامی لوگ مطلب یہ کہ بڑے لوگ ہندوستان میں رانی جی سے اجازت لیتے ہیں اور یہاں اس فارم ہاؤس کو دیکھنے اور کبھی کبھی یہاں ٹھہرنے آ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب رانی جی اس کی اجازت دیں۔ اس لئے ہم ہمیشہ اسے اسی طرح

چمکائے رکھتے ہیں۔''

''راج شری! تم کچھ پڑھی لکھی ہو؟''

''جی مہاراج! بس اتنی کہ کام چل جائے۔''

''گڈ...... چلو ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔''

اس نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے بعد باہر نکل گئی۔ لیکن یہ بھی میرے لئے ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ میں نے اس طرح مخاطب کیا تو اس کی بھی جرأت ہوئی کہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھے۔ بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، میں تو اس بھوج پتر کے اشارے پر یہاں آیا تھا۔ چونکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب فضول باتیں چھوڑ کر صرف اپنے مفاد کے لئے کام کروں گا اور اب میں اسی نظریئے پر باقی عمل کر رہا تھا۔ زندگی میں ایک پراسرار دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ حالات کی سنسنی خیزی نئی کہانیاں جنم دے رہی تھی۔ چنانچہ میں ان کہانیوں میں کھو جانا چاہتا تھا۔

غسل وغیرہ کر کے گھر میں پہننے کا ایک لباس منتخب کیا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری میں مجھے راج شری مل گئی۔ اس نے ایک نگاہ مجھے دیکھا اور نجانے کیوں دیر تک مجھ پر نگاہیں جمائے رہی۔ میں نے کہا۔

''رانی صاحبہ کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں ہیں۔''

''مجھے ان کے کمرے تک لے چلو۔''

''آیئے۔''

رانی کا کمرہ، رانی ہی کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی گئی تو اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے...... آ جاؤ۔''

پہلے راج شری اندر گئی اور اس نے شاید میرے بارے میں بتایا تو رانی صاحبہ کی آواز ابھری۔ ''ارے ارے تو باہر کیوں کھڑا کر رکھا ہے انہیں؟ لے آؤ۔ اندر لے آؤ۔''

میں اندر داخل ہو گیا تو رانی نے مجھے سر سے پاؤں تک تعریفی نگاہوں سے دیکھا، پھر بولی۔ ''بھگوان کی سوگند، تم واقعی شہزادے لگ رہے ہو۔ ویسے بھی تمہیں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا۔''

"ہاں۔ عجیب شہزادہ ہو میں۔ میرے بارے میں اگر سب کچھ جان لیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔"

"میں تو تمہیں دیکھ کر ہی حیران رہ گئی ہوں۔ چلو چھوڑو، آؤ بیٹھو۔ اچھا کیا کپڑے وغیرہ تبدیل کر لئے۔"

"آپ کیا کر رہی تھیں؟"

"بس میرے پاس سوچوں کے علاوہ اب کیا رہ گیا ہے۔ سوچوں ہی میں ڈوبی ہوئی تھی۔"

"کیا پروگرام ہے، ہم کہیں باہر نکلیں گے؟"

"کیا تمہارا دل چاہ رہا ہے باہر جانے کو؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ ابھی وقت کافی باقی ہے۔"

"ہاں۔ کافی تو نہیں ہے۔ بس تھوڑا سا وقت ہے۔ جیسے ہی رانا جسپال آئیں گے، تمہاری مصروفیت شروع ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں ہر مصروفیت کے لئے تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ میں رانی سریتا دیوی سے باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے چندی گڑھ کے بارے میں اور میں نے سیتا گڑھی کے بارے میں انہیں تفصیلات بتائیں۔ کلکتے میں اپنے تعلیمی دور کے بارے میں بھی بتایا۔

بہرحال رانی کی باتوں سے کسی بہت اہم بات کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "میں ذرا جاؤں گی۔ ہوسکتا ہے رات کو میری واپسی نہ ہو۔ اگر واپس آ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی ضرورت ہو تو تم مجھے ہوٹل فون کر سکتے ہو۔ نمبر تو ہے نا تمہارے پاس؟"

"جی۔" میں نے کہا اور رانی چلی گئی۔

اس خوبصورت فارم ہاؤس میں اب میں تنہا رہ گیا تھا۔ دل تو چاہا کہ یہاں کے ملازمین راج شری یا جے شری سے ہردیپ سنگھ کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ پتہ تو چلاؤں ہوا کیا تھا۔ لیکن پھر ذہن نے اس کام سے روکا۔ اگر میں ایسی تفتیش کرنے میں لگ جاتا ہوں تو رانی سوچے گی کہ میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا اور

اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کے چکر میں پڑا رہوں گا۔ اس طرح سے بے اعتمادی کا اظہار ہو گا۔ چنانچہ یہ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ پھر بھی رات کے خوشگوار دھندلکوں میں باہر نکل کر ٹہلنا بہت اچھا لگا۔ پھولوں کی خوشبوئیں چاروں طرف ہوا کے ساتھ چکراتی پھر رہی تھیں۔ آسمان سے دھند اتری ہوئی تھی۔ یہ نیلی کہر لندن کی زندگی کا ایک حصہ تھی۔ لیکن بہت خوشنما محسوس ہوتی تھی۔ اب یہ پتہ نہیں کہ کتنا عرصہ اسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ کوئی میرے نزدیک نہیں آیا۔ میں نے البتہ ان لوگوں کو اپنے اطراف میں مستعد پایا۔ غالباً یہ مسلح بھی تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال اور آیا وہ یہ کہ جن لوگوں نے پرنس ہردیپ سنگھ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی کہیں وہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کریں۔ لیکن میرے پاس ایک مضبوطی موجود تھی۔ اپنے بیڈ روم میں آ کر میں نے بھوج پتر دیکھا، وہ بالکل صاف تھا۔ گویا اس پر کوئی نئی ہدایت یا کوئی نئی پیشین گوئی نہیں تھی۔ کمال کی چیز تھی یہ جادو کی قندیل بھی۔ میں نے احتیاط سے اسے اپنے تکیے کے نیچے محفوظ کیا اور پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

نجانے کتنی دیر تک نیند نہیں آئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں اسے نیند تو نہیں کہہ سکتا تھا، بس غشی یا نیم خوابی کی کیفیت ضرور طاری ہو گئی تھی۔ دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر میں نے اینہ کو دیکھا جو اپنے سرخ حسین لباس میں دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اینہ کو دیکھ کر میرے وجود میں مسرت کی لہریں گردش کرنے لگیں۔ وہ میرے قریب آئی اور میرے بستر پر بیٹھ گئی۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں اینہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"موت کی وادیوں میں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو وہاں سے پلٹ کیسے آئیں؟"

"تمہارے لئے۔"

"میرے لئے؟"

"ہاں، تمہاری محبت مجھے تمہارے قریب کھینچ لائی۔"

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا اینہ! یقین کرو میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔"

"میں جانتی ہوں، میرے اور تمہارے درمیان نجانے کیوں اتنا گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔"

''آؤ اینہ! قریب آ گئی ہو تو اتنے فاصلے کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں؟''

''تمہارے کہنے کا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے اپنا سرخ لباس اپنے جسم سے جدا کر دیا اور میرے قریب آ کر میرے وجود میں سما گئی۔ اینہ کی ان گرم قربتوں نے مجھے سرشار کر دیا۔ میرے سانس بے ترتیب ہونے لگے۔ اینہ خود بھی بھرپور محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ ہم دونوں دنیا سے بیگانہ ہو گئے۔ اینہ کی قربتیں ہمیشہ ہی مجھے اپنے وجود سے بیگانہ کر دیتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس کی موت کو بھلا نہیں سکا تھا۔ وہ میرے وجود میں شامل تھی۔ اور میں آخر کار اس کے گرم وجود کو اپنے سینے سے لپٹا کر گہری نیند سو گیا۔

پھر اس وقت آنکھ کھلی جب اچانک ہی مجھے اپنے سینے پر دو ہاتھ چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کوئی مجھے اپنے آپ سے دور دھکیل رہا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ کی گرفت اس کے گرد اس طرح سخت تھی کہ اسے دقت ہو رہی تھی۔ میرے حواس جاگے تو مجھے اس سڈول اور چکنے بدن کا احساس ہوا جو میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھا...... میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور دفعتہً میرے جسم کو اس طرح کرنٹ لگا کہ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میری گرفت سے نکلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ کچھ لمحوں کے لئے اسے اپنے بےلباس وجود کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ اینہ نہیں تھی، وہ تو راج شری تھی...... راج شری جس کے چہرے پر گزری رات کا خمار منجمد تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ میں بھی حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

راج شری نے چاروں طرف دیکھا، پھر اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور کچھ تو اسے مل نہ سکا اس نے جلدی سے بستر کی چادر گھسیٹی اور اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی۔ پھر اس کی روتی ہوئی آواز ابھری۔

''میرے کپڑے...... میرے کپڑے۔'' اور پھر وہ اس طرح ایک طرف دوڑی کہ چادر میں الجھ کر زمین پر گر پڑی۔ بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔ چادر ایک بار پھر اس کے بدن سے اتر گئی۔ وہ اس طرف لپک رہی تھی جہاں ایک صوفے پر اس کا لباس پڑا ہوا تھا۔ اس نے جھپٹا مار کر اپنا لباس اٹھایا۔ چادر تو پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ لباس لے کر وہ غسل خانے کی جانب دوڑی اور ایک بار پھر راستے میں گری۔ میں اس کی بدحواسی کو حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ خود میرے حواس بھی ٹھکانے نہیں آئے تھے۔ یہ کیا ہوا؟

رات کا خواب میری آنکھوں میں در آیا۔ سرخ لباس میں ملبوس اینہ میرے پاس آئی تھی اور میری قربتوں سے لطف اندوز ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے اس کی موت کا علم تھا اور میں بار بار اس سے اس کی موت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اس کے وجود کا بھی احساس تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ وہ راج شری ہو گی۔''

کچھ لمحوں کے بعد راج شری باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے چور نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے اس سے کہا۔

''راج شری! ادھر آؤ۔'' وہ ٹھٹک کر رک گئی تو میں نے دوبارہ کہا۔ ''سنا نہیں تم نے، ادھر آؤ۔''

وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آئی۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ دفعتہً ہی وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

''بھگوان کی سوگند کمار! بھگوان کی سوگند۔ ہم جان بوجھ کر ادھر نہیں آئے تھے۔ کسی پراسرار قوت کا شکار ہو گئے تھے ہم۔ بھگوان کی سوگند کمار! ہم سو رہے تھے کہ خواب دیکھا۔ کمار، ہم نے خواب دیکھا کہ آپ ہمیں بلا رہے ہیں، کچھ حکم دے رہے ہیں آپ۔ بھگوان کی سوگند، جھوٹ بولیں تو کتے کی موت مر جائیں۔ ہم نیند میں چلتے ہوئے یہاں تک آئے ہوں گے۔ ہمیں نہیں پتہ کہ خود یہاں آئے تھے یا ہمیں کوئی لایا تھا۔ کمار! بھگوان کی سوگند ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔ ہمیں معاف کر دیں کمار، ہمیں معاف کر دیں۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی تو مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

''میں نے تم سے کچھ کہا تو نہیں ہے راج شری۔''

''کمار! ہم سے بڑا پاپ ہوا ہے کمار، ہم مر جائیں گے۔ ہم جیتے نہیں رہیں گے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے کہا۔

''کمار! ہم نے...... ہم نے اپنی اوقات سے بڑھ کر پاپ کیا ہے۔ کمار، ہم تو چرنوں کی دھول ہیں آپ کی کمار! ہمیں معاف کر دیں۔''

''اچھا، اچھا بابا اچھا۔ چلو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ ٹھیک ہے؟ ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں بھی خواب کے عالم میں تھا تو تم یقین نہیں کرو گی راج شری۔ میں نے خواب میں اپنی...... مگر چھوڑو، ان کہانیوں سے کیا فائدہ۔ جو کچھ بھی ہوا ہے اچھا ہوا ہے یا برا ہوا ہے لیکن ایک بات کا

یقین رکھو میری زبان سے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں نکلے گا۔ اور یہ مت سمجھنا کہ میں
ایک عیاش طبع آدمی ہوں اور صرف یہ محسوس کر کے میں نے تمہیں اپنی قربت میں قبول کر
لیا کہ تم خود اٹھ کر میرے پاس آ گئی ہو۔ تمہیں البتہ اس بات کا اندازہ ہونا چاہئے تھا کہ
میں نے تمہیں ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔''

''ہم جانتے ہیں مہاراج، ہم جانتے ہیں کمار۔ دوش ہمارا ہی ہے۔''

''دوش کسی کا بھی ہے، تم اس بات کو کسی سے کہو گی نہیں۔ رانی صاحبہ کو اس کی بھنک
بھی نہیں ملنی چاہئے۔ ورنہ پھر نتیجے کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔ اب جاؤ، کوئی آ بھی سکتا ہے
اتنی صبح تمہیں میرے کمرے سے نکلتے دیکھ کر لوگوں کو ویسے ہی شک ہو جائے گا۔ جاؤ۔''

وہ لرزتے قدموں سے واپس چلی گئی اور میں ان انوکھے واقعات پر غور کرنے لگا
وردان ساداھانی، سیوک سندھورتی سارے کے سارے لوگ مجھے نیکیوں کی تلقین کر
رہے تھے یہاں تک کہ میں نے خود بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں امینہ کے بعد اب ایسے
جال میں نہیں پھنسوں گا۔ جن خوفناک واقعات اور لمحات سے گزر کر مجھے اس زندگی
آنے کا موقع ملا تھا اس کے بعد تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ میں اور کچھ نہیں ملا تو اس بھ
پتر پر ہی انحصار کرنے لگا تھا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور
خانے میں داخل ہو گیا۔ میرا لباس بھی حیرت انگیز طور پر غسل خانے میں ٹنگا ہوا تھا۔

غسل کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ آخر یہ ہوا کیا تھا؟ بستر پر لیٹا تھا اور بڑے پُر
انداز میں لیٹا تھا۔ امینہ کا خواب آیا اور اس کے بعد امینہ کی جگہ راج شری نمودار ہوئی۔ یہ
تو بڑا عجیب چکر تھا۔ لیکن پھر راج شری کے گداز وجود کا احساس ہوا اور پچھلی بے شمار
باتیں یاد آ گئیں۔ عالیہ زمان، ایلس فیوری، امینہ اور کچھ اور کردار جو میری زندگی میں گھس
آئے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں یہی جملے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری زندگی میں گھس آ
آئے تھے، میں نے خود کسی کو تلاش نہیں کیا تھا۔ خدا جانے میری زندگی سے یہ اسرار کیوں
چمٹ گئے ہیں اور یہ مجھے کہاں سے کہاں لے جائیں گے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جے شری اندر داخل ہوئی اور اس نے دونوں ہاتھوں
مجھے پرنام کیا اور بولی۔ ''رانی جی نے کہا ہے کہ ناشتہ ان کے ساتھ کر لیجئے گا۔''

''رانی جی رات کو واپس آ گئی تھیں؟''

''نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، چلو مجھے بتاؤ کہاں ہیں وہ؟'' میں نے کہا اور جے شری کے ساتھ چل
پڑا۔ لیکن میں نے چور نگاہوں سے جے شری کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی
خاص بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام جے شری ہے نا؟''

''جی مہاراج۔''

''اور وہ تمہاری بہن راج شری...... تم میں سے بڑا کون ہے؟''

''میں اس سے بیس منٹ بڑی ہوں مہاراج۔'' جے شری نے کہا اور مسکرا دی۔

''کہاں ہے وہ؟'' میں نے اصل سوال کیا۔

''بستر میں لیٹی ہے۔ بخار چڑھا ہوا ہے بیچاری کو۔ شاید موسم کا اثر ہو گیا ہے۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور راج شری کے بارے میں سوچتا ہوا اس
خوبصورت ڈائننگ ہال میں داخل ہو گیا جو اس عمارت کے ایک خوبصورت گوشے میں
تھا۔ رانی سریتا دیوی سفید سلک کے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں کوہ قاف کی پری ہی معلوم
ہو رہی تھی۔ اس کا سفید خوشنما وجود اپنی تمام تر نفاستوں کے ساتھ موجود تھا۔ پُرمحبت انداز
میں آگے بڑھی اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ پھر میری
پیشانی چومی اور میرا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کر کے مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی مسکرا دیا۔

''آپ رات کو وہیں ہوٹل میں رہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں بیٹھو۔ ہوٹل میں ہی رہی اور رات کو تین بجے تک تمہارے بارے میں سوچتی
رہی۔'' سریتا دیوی نے کہا۔

''کیا سوچتی رہیں آنٹی؟''

''جے شری! چلو ناشتہ لگاؤ۔ بھوک لگ رہی ہے۔''

جے شری گردن جھکا کر باہر نکل گئی۔

''بتایا نہیں آپ نے، کیا سوچتی رہیں آنٹی؟''

''بس، انسان چاہے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جائے، رہتا انسان ہی ہے۔ میں یہ
سوچتی رہی کہ تم کس قدر پُرکشش اور پیارے نوجوان ہو۔ کاش تم میری اولاد ہوتے۔ کتنا
فخر کرتی میں تم پر ماں باپ نہیں ہیں نا تمہارے؟''

''جی کبھی کا کھو چکا ہوں میں انہیں۔''

"ایک بات کہوں خاقان! دین دھرم انسان کے جیون کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور بے شک ہر شخص اپنے دھرم کو اوپر رکھنا چاہتا ہے۔ اگر میں تم سے کہوں کہ اپنے دھرم کو میرے لئے مت بدلنا مگر مجھ سے دور بھی مت ہونا، کوئی بھی نام، کوئی بھی حیثیت اختیار کر لینا میرے پاس تو کیا تم میری بات مان جاؤ گے؟"

میں مسکراتی نگاہوں سے رانی سریتا کو دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا۔ "جھوٹ بولوں یا سچ؟"

"نہیں، پلیز سچ۔"

"رانی صاحبہ! آپ کو میری زندگی کے جتنے حالات معلوم ہوئے ہیں، ان سے آپ نے کم از کم یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں بھی ایک الجھا ہوا انسان ہوں۔ میری زندگی کی ڈور سلجھ جائے، مجھے یہ پتہ چل جائے کہ اس دنیا میں میرا کیا مقام ہے، فیصلہ تو تبھی کر سکتا ہوں نا اپنے مستقبل کے بارے میں۔ جذباتی طور پر کچھ بھی کہہ دوں، ایک بے حقیقت چیز ہوگی۔ اور کم از کم آپ جیسی شخصیت کو میں کسی بھی طرح کے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ؟"

رانی نے پیارا سا منہ بنا کر زور زور سے گردن ہلائی اور بولی۔ "ہاں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میری اس پیشکش کو تو ذہن میں رکھو گے نا؟"

"ہاں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو میں ایک لمبے عرصے تک آپ سے جدا نہ ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے رانی صاحبہ! کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ بلکہ آپ کی حیثیت سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں یہ الفاظ کہتے ہوئے کہ میں نے بھی شہزادوں ہی کی طرح زندگی گزاری ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ آپ کا یہ پیارا اس دنیا میں اپنی تنہائی کا شکار ہو کر اگر میں آپ کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کر دوں براہ کرم میری حیثیت پر شک نہ کیجئے گا۔"

"ایک بار پھر دل چاہ رہا ہے کہ اٹھوں اور تمہیں دیر تک سینے سے لگائے رکھوں۔ مگر پہلے ناشتہ پھر کچھ اور۔" رانی سریتا نے کہا اور ناشتے کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔ میں بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔ میں مصروف ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ سریتا کے ذہن سے محبت کا یہ بھوت اترتا چلا گیا۔ ناشتے سے فراغت تک وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک بات میں تمہیں بتاؤں، خود پرنس ہردیپ سنگھ بہت اچھا لڑکا ہے۔ لیکن کچھ

جذباتی سا ہے۔ حالانکہ خاقان، تم خود سوچو، جذبات ہی تو انسان اور جانور میں شناخت کرتے ہیں بلکہ یہ لفظ بھی میں غلط کہہ رہی ہوں، جانوروں میں بھی جذبات ہوتے ہیں جن کا مظاہرہ ہزاروں بار ہو چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا انداز ذرا مختلف ہوتا ہے اور ہم انہیں اپنی ترازو میں نہیں تولتے۔ میں نے بارہا اسے اپنی محبت کے ذریعے متاثر کرنا چاہا، یہ بتانے کی کوشش کی اسے کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ لیکن کبھی اس نے مجھے اس طرح جواب نہیں دیا، بس سپاٹ رہتا۔ بالکل سپاٹ۔ پتہ نہیں کیوں۔ البتہ ایک دل کی بات میں تم سے اور کہوں جیسا کہ میں اپنا تجزیہ تمہیں بتاتی رہتی ہوں، انسان ہر حالت میں جواب چاہتا ہے۔ وہ اگر کسی سے پیار کرتا ہے تو چاہے کتنا ہی انحراف کرے لیکن جواب میں وہ اس سے پیار ہی چاہتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کے دل میں بھی فاصلے پیدا ہونے لگتے ہیں اور یہ فاصلے ذہنی طور پر بہت دور لے جاتے ہیں۔ مجبوریاں الگ ہوتی ہیں اور محبت الگ۔ میں سمجھتی ہوں مجبوری کے ہاتھوں اگر کوئی عمل کرنا پڑے تو اس کا دل سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ جبکہ دل کے ہاتھوں اگر کچھ کرنا پڑے تو انسان کی کیفیت بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ پرنس ہردیپ سنگھ کے بارے میں بھی بس تم یہ سمجھ لو کہ میں جذبات سے نہیں ضرورت سے سوچتی ہوں۔ اس کی زندگی اور اس کا روپالیہ سے منسلک ہو جانا میرے ایک بہت بڑے مقصد کی تکمیل کرتا ہے اور میں یہ دعویٰ کرتی ہوں کہ جب تمہیں اس مقصد کے بارے میں معلوم ہوگا تو تم بھی میری اس جدوجہد کی تصدیق کرو گے۔ میں اس لئے تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں کہ کم از کم ایک شخص تو ایسا ہو جس سے میرا دلی لگاؤ ہو اس احساس کے ساتھ کہ اس نے میرے مشکل وقت میں میری مدد بھی کی اور مجھے میری پسند کا پیار بھی دیا۔ میرے الفاظ سمجھ رہے ہو نا تم؟ میری پسند کا پیار یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہوں۔ کیا بات ہے، تم رک کیوں گئے؟ ناشتہ کرو۔"

میں رانی سریتا کی جذباتی کیفیت پر غور کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اپنے دل کو بھی ٹٹولنا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے کیا میں اس پر عمل بھی کر سکوں گا؟ لیکن جو واقعات مجھ پر گزرے تھے، جتنے کردار میری زندگی میں آئے تھے ان میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ کہ اگر میں ان کی خواہش کے مطابق ان سے محبت کا اظہار کروں تو سب ٹھیک ہے ورنہ باقی کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ وہی ایک طریقہ مناسب ہوگا۔

ناشتے سے فراغت حاصل ہوگئی۔ یہ سن کر مجھے افسوس ہوا تھا کہ راج شری بیمار ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ راج شری کے پاس جاؤں اور اس سے اس کی طبیعت پوچھوں۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ راج شری کی قربت نے مجھے ایک عجیب سا سکون دیا تھا اور میں اس سے ناخوش نہیں ہوا تھا۔

بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں اور میں خاصی الجھنوں کے عالم میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے نجانے کب تک ہردیپ کا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ البتہ ایک اور تعجب خیز بات ہوئی تھی۔

واپس آنے کے بعد میں نے بھوج پتر پر آگے کی تصویریں دیکھنا چاہی تھیں۔ لیکن بھوج پتر کو رات کو میں نے تکیے کے نیچے رکھا تھا، وہ تکیے کے نیچے موجود نہیں تھا۔ میں نے اسے پورے کمرے میں ہی تلاش کر ڈالا اور دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔ الماری میں، باتھ روم میں، ہر جگہ دیکھا لیکن بھوج پتر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ کہاں گیا؟ کہاں جا سکتا ہے؟ ابھی تک کمرے کی صفائی بھی نہیں کی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں سے جو میرے کمرے میں آتے ہیں اس بارے میں معلوم کروں اور ترکیب سے میں نے جے شری اور دوسرے لوگوں سے معلومات بھی حاصل کر لیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک پتا میرے تکیے کے نیچے پڑا ہوا تھا، ان میں سے کسی نے اسے دیکھا تو نہیں ہے؟ سبھی نے انکار کر دیا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ وہ پراسرار چیز میرے پاس آتی جاتی رہی ہے اور چونکہ وہ خاص طور سے مجھے دی گئی تھی اس لئے میری ہی ملکیت تھی۔ اب اگر وہ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے میرے پاس سے چلے جانا تھا۔ اگر مجھے اس کی ضرورت ہوئی تو یقینی طور پر وہ پھر واپس آ جائے گا۔ بہر حال یہ میرے لئے فکر کی بات تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد سریتا میرے کمرے میں آ گئی۔

''ہیلو...... وہ کام ہو گیا جس کا ہمیں انتظار تھا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر قبل رانا جسپال کا فون آیا تھا۔ وہ فرانس سے واپس آ گیا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارے پاس پہنچ رہا ہے۔''

نجانے کیوں رانی سریتا کے ان الفاظ میں، میں نے ایک سنسنی سی محسوس کی تھی۔ اس کے بعد ہم رانا جسپال کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ملازموں کو ہوشیار کر دیا گیا

تھا۔ اس بات کے امکانات بھی تھے کہ رانا جسپال اپنے ساتھ روپالیہ کو بھی لے کر آئے گا۔

پھر رانا جسپال کی رولز رائس کو ہم نے فارم ہاؤس کی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا۔ رولز رائس رکی اور اس سے جو شخص نیچے اترا وہ لمبے چوڑے بدن کا ایک شاندار آدمی تھا۔ بہت ہی اسمارٹ اور چوڑے چکلے بدن کا مالک۔ سرخ وسفید چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں۔ وہ صرف اپنے ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا۔ رانی نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں اس کے استقبال کے لئے باہر نکل آئے۔ رانی صاحبہ نے بڑے پُرتپاک انداز میں رانا جسپال کا استقبال کیا اور رانا جسپال کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ رانی سے ملاقات کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور پُرتپاک لہجے میں بولا۔

''آہ، پرنس ہردیپ! مائی سن، کیسے ہو تم؟''

مجھے دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ میں ہی پرنس ہردیپ ہو سکتا ہوں۔ میں بغور اس کے چہرے اور اس کے عضلات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اصل میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا میں کہ رانا جسپال کہیں مجھے دیکھ کر چونکتا تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ کسی طرح اصل ہردیپ سنگھ کے چہرے کو پہچانتا ہو اور مجھے دیکھ کر حیران ہو جائے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے انداز میں بڑا پُرتپاک خیر مقدم تھا۔ میں نے بھی اس سے پُرجوش مصافحہ کیا، پھر ہم اسے لے کر اندر آ گئے اور رانا جسپال سے کہا۔

''غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں جس کام کے لئے جا رہا ہوں اس میں کچھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگیں گے مجھے اور میں واپس آ جاؤں گا۔ لیکن جن لوگوں سے مجھے ملنا تھا وہ وقت اور زبان کے پابند لوگ نہیں تھے۔ وہ صحیح وقت پر نہ پہنچے۔ لیکن ان کا انتظار کرنا بڑا ضروری تھا۔''

''آپ جس کام سے گئے تھے وہ کام ہو گیا رانا صاحب؟'' سریتا دیوی نے رانا جسپال کو ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کام تو ہو گیا۔''

''اور ہماری بیٹی کیسی ہے؟''

''روپالیہ بالکل ٹھیک ہے اور آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہے۔''

''ہم اس سے ملاقات کے لئے خود بے چین ہیں۔'' سریتا دیوی نے کہا۔ حالانکہ وہ

یہ بھی کہہ سکتی تھیں کہ رانا جسپال اسے لے کیوں نہ آیا۔ لیکن جس عزت و احترام کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا، وہی کیا جا رہا تھا۔ یہ کہنے والی بات نہیں تھی۔ رانا جسپال کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں اور جب میں اسے دیکھتا تو وہ دوسری جانب متوجہ ہو جاتا تھا گویا وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کس طرح کا انسان ہوں۔ البتہ اس بات کا تو مجھے بھی پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اسے پرنس ہردیپ کی اصل شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ بہر حال ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ رانا نے کہا۔

”رانی صاحبہ! یہ بتائیے کہ آپ کب ہمارے پاس آنے کے لئے وقت نکال سکیں گی؟“

”رانا صاحب! وقت نکالنے کی کیا بات کہی آپ نے۔ میں تو آئی ہی آپ کے لئے ہوں۔“

”ہاں، یقیناً۔ آپ تشریف لائیے۔ رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ وہیں آپ کی ملاقات روپالیہ سے ہو جائے گی اور اس کے بعد ہم اور بہت سی باتیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

تھوڑی بہت خاطر مدارت کے بعد رانا جسپال رخصت ہونے لگا۔ بولا۔ ”میں آپ لوگوں کے ساتھ اور بھی وقت گزارتا، خاص طور سے مجھے پرنس ہردیپ کی شخصیت بہت پسند آئی ہے۔ لیکن بعد میں سہی۔ اصل میں آنے کے بعد میں نے فوراً آپ سے رابطہ قائم کیا اور سوچا کہ پہلے آپ سے مل لوں پھر دوسرے کام کروں گا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

رانا جسپال کے جانے کے بعد رانی سریتا نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے خود بھی اس شخص کے بارے میں کچھ اندازہ لگایا؟“

”ذہین، زیرک اور سمجھدار آدمی ہے۔ لیکن میں پھر اپنی اسی تشویش کا اظہار کروں کہ اگر کسی وقت انہیں پتہ چل گیا کہ میں اصل ہردیپ نہیں ہوں؟“

”پلیز...... پلیز...... میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تم یہ تصور اپنے ذہن پر مسلط کر کہ تم اصل ہردیپ ہو۔ اس کے بعد کے معاملات ہم بعد میں دیکھیں گے۔ میں بس کچھ وقت ٹالنا چاہتی ہوں۔“

میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

دو گھنٹے تک سریتا دیوی مجھے بریف کرتی رہی، ایک ایک چیز کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ میں کسی بھی سلسلے میں مار نہ کھاؤں اور مجھ سے کوئی سوال کیا جائے تو میں اس کا تسلی بخش جواب دے دوں۔ میں نے بھی اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔ غرض یہ کہ یہ سارا سلسلہ جاری رہا۔ پھر رانی سریتا دیوی کسی کام سے چلی گئی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہاں اس فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کے علاوہ اور کوئی ایسی جگہ ہے جہاں وہ جاتی ہیں یا رات کو جہاں وہ رہی۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں رات گزارنے کی بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ البتہ جب وہ چلی گئی تو میرے ذہن میں راج شری کا خیال آیا اور میں بے اختیار اس کی طرف چل پڑا۔ اس عورت نے مجھے امینہ کی موت کے بعد اپنی قربت دی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا، نادانستگی میں ہوا تھا۔ لیکن بہر حال ہوا تو تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور جے شری ہمدردی سے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے ایک افسوس کا سا احساس ہوا۔ جے شری مجھے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی تھی۔

”وہ...... پپ...... پرنس...... مم...... میں......“

”کوئی بات نہیں ہے جے شری! آپ بیٹھئے۔ ظاہر ہے آپ راج شری کی بہن ہیں۔“

”شکریہ پرنس، میں چلتی ہوں۔ آپ راج شری کے پاس آئے ہیں، بیٹھئے باتیں کیجئے۔“ راج شری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس سے بھی کہا۔

”نہیں راج شری! اگر تم نے تکلف کرنے کی کوشش کی تو چلا جاؤں گا یہاں سے۔ بیٹھی رہو آرام سے اور یہ کمبل اپنے بدن پر ڈالے رکھو۔“ میں نے اس کے بستر کے قریب پہنچ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، اس وقت اسے بخار نہیں تھا۔ پھر میں نے اس کی گردن چھو کر دیکھی، راج شری کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ میں مسہری پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ جے شری جا چکی تھی۔

”بخار کیوں آ گیا راج شری؟“

”بس کمار جی، مجھے نہیں معلوم۔“

”راج شری! میرے دل میں بڑی شرمندگی کا احساس ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا ہے راج شری......“

”ہم جانتے ہیں مہاراج! دوش تو ہمارا ہی تھا۔“

"کیا واقعی تمہارا دوش تھا؟"

"مم......مہاراج......مم، میں......"

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ بڑا ساحرانہ عمل ہے۔ نجانے کس طرح تم اپنے قدموں سے چل کر میرے پاس پہنچیں اور نجانے کیوں میں تمہاری طرف متوجہ ہو گیا۔" میں نے جان بوجھ کر اس سے امینہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ کسی عورت کے لئے یہ اور تڑپا دینے والی بات تھی کہ اس کی قربت کسی اور کے دھوکے میں حاصل کی جائے۔ اس بے چاری کے پاس تو کچھ نہ رہا۔ چنانچہ یہ بتانا میں نے پسند نہ کیا کہ میں نے خواب میں امینہ کو دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"دیکھو راج شری! موجودہ زمانے میں اور خاص طور سے لندن جیسی جگہ پر بڑی کھلی آزادی ہے تو انسان آپس میں ہر طرح کے تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ لیکن راج شری، جو کچھ ہوا ہے بس سمجھ لو بالکل ایک اتفاق ہے۔ میں اس سلسلے میں ہر ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم مجھے گائیڈ کرو۔ مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

راج شری نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔ "ہم آپ سے کچھ کہنے کا ادھیکار نہیں رکھتے مہاراج! اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم خود دوشی ہیں۔ ہم ہی تو آپ کے پاس گئے تھے۔ آپ نے نہ ہمیں بلایا نہ آپ ہمارے پاس آئے۔ دوشی تو ہم ہی ہیں نا ہر طرح سے۔ پر اس کے باوجود آپ اتنی مہربانی سے کام لے رہے ہیں تو بس آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں بولو۔"

"آپ کو بھگوان کی سوگند، کسی سے یہ بات نہ کہیں۔ رانی جی سے بھی نہیں، کسی سے بھی نہیں۔ بولیں، وعدہ کرتے ہیں آپ؟"

عجیب سی بات تھی۔ پتہ نہیں راج شری کیا سوچ رہی تھی۔ لیکن بہرحال اس کی خواہش تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہاری بہن جے شری کو اس بات کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے تو بھی میری ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اطمینان رکھو، میرے منہ سے کبھی اس رات کی کہانی نہیں نکلے گی۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ دیر تک میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ اب میں

اس سے کیا کہتا کہ اس کی عزت کی قیمت کیا ادا کروں۔ بہرحال بہت زیادہ دیر اس کے پاس بیٹھنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ سریتا دیوی کسی بھی وقت آ سکتی تھی۔ اور جب راج شری یہ چاہتی تھی کہ میں یہ بات کسی سے نہ کہوں تو اس کی جانب التفات بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد میں بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس کی کوئی وجہ تو بظاہر نہیں تھی۔ سریتا دیوی دوپہر کو آئی۔ ہم دونوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد سریتا نے کہا۔

"اب ایسا کرتے ہیں دو گھنٹے آرام کئے لیتے ہیں، اس کے بعد تیاریاں کر لیں گے۔"

کھانے کے بعد میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ بھوج پتر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے پاس سے غائب ہو چکا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ تو چلنا ہی ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں بھی آرام کی نیند سو گیا۔

کوئی ساڑھے چار بجے آنکھ کھلی تو اٹھ کر تیاریاں کرنے لگا۔ رانی کو شاید یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں جاگ گیا ہوں۔ چنانچہ وہ بھی اپنی تیاریوں میں مصروف رہی۔ ایک خوبصورت رنگ کا سوٹ جو یقینی طور پر پرنس ہردیپ سنگھ کا ہو گا اور میرے جسم پر اس طرح فٹ تھا جیسے میرے پورے بدن کا ناپ لے کر تیار کیا گیا ہو، میں نے پہنا اور اس کے بعد ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس ہو گیا۔ رانی خود بھی تیار ہو کر ہی میرے پاس آئی تھی اور اس نے تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"ایک بات کہوں؟" وہ ایک حسین مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"جی آنٹی؟"

"بھگوان کی سوگند، ہردیپ تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی اچھا اور سندر جوان تھا، بالکل اپنے باپ کی طرح۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پتا جی بھی ایک کبرو جوان تھے۔ تم لحہ لحہ میرے دل و دماغ پر طاری ہوتے جا رہے ہو اور میں نہیں جانتی کہ کہاں تک پہنچو گے۔"

رانی سریتا نے خود بھی ایک انتہائی خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا اور اپنی پُروقار شخصیت کے ساتھ وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ نجانے کیوں خاموش سی ہو گئی تھی۔ ہم قیمتی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔ دیر تک رانی سریتا خاموش رہی پھر خود ہی بول پڑی۔

"اصل میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری کوئی سنتان نہیں تھی۔ ساری زندگی اولاد کے لئے ترستی رہی۔ پھر میرے پتی قتل ہو گئے۔ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ میں نجانے کیسی کیسی کیفیتوں کا شکار ہو گئی۔ اور وہ ہردیپ، اگر وہ میرے پاس رہتا تو ہو سکتا ہے مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہو جاتی۔ دور رہنے والے خودبخود دل سے دور ہو جاتے ہیں۔ یا پھر یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ دل سے دور نہیں ہوتے، بلکہ یہ فاصلے زیادہ لمبے ہو جاتے ہیں۔ چھوڑو، میں بھی کیسی باتوں میں الجھ گئی۔ رانا جسپال جی یہاں لندن میں بڑا اچھا مقام رکھتے ہیں۔ اعلیٰ حلقوں میں ان کا بڑا نام ہے۔ مقامی حکومت ان کی بڑی عزت کرتی ہے۔ بس کیا بتاؤں تمہیں کیسے عجیب و غریب حالات ہیں۔ ویسے میرے ساتھ قولی چلو گے نا؟"

مجھے ایک دم احساس ہوا کہ رانی ذہنی طور پر کچھ بھٹک گئی ہے۔ شاید کسی گہری سوچ میں گم ہے اور یہ سوچ کر اچانک بول پڑی ہے کہ کچھ نہ کچھ بات کرنی چاہئے۔ تاکہ میں کسی شبہے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اب اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا دنیا کے بارے میں کہ لوگوں کی سوچ سمجھ سکوں۔ رانی نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں طلب کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سوال اس نے جواب کے لئے کیا ہی نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اپنی طرف کے مناظر دیکھتا رہا۔

میرے ذہن میں یہی خیالات آ رہے تھے کہ دیکھیں یہ رانا جسپال کیا چیز ہیں اور رانی سریتا دیوی کے ہنگامے کب تک جاری رہتے ہیں۔ ویسے اس کے سوال پر بھی میں نے غور کیا تھا۔ وہ مجھے قولی لے جانا چاہتی تھی۔ ہندوستان...... کیا وہ ویسے واقعی خطرناک ثابت نہیں ہو گا؟ جبکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ انگریز حکومت اپنے اتنے بڑے افسر کے قاتلوں کو ہر قیمت پر تلاش کرے گی اور صورتحال میرے لئے سنگین ہو جائے گی۔ لیکن رانی بڑے پُراعتماد انداز میں کہہ رہی تھی کہ میرا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن ہردیپ سنگھ کی حیثیت سے۔

بھوج پتر آیا اور غائب ہو گیا۔ اور نجانے وردان سادھانی کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اب تو میرے بلانے پر بھی وہ نہیں آتا۔ بہرحال اب مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔

آخر کار رانی سریتا دیوی کی کار ایک شاندار عمارت کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

چھوٹی چھوٹی عمارتوں کا شہر لندن کے مضافاتی علاقے میں اعلیٰ درجے کی عمارتیں رکھتا تھا اور یہ عمارت بھی ایسے ہی ایک علاقے میں تھی۔ احاطے میں بہت سے ملازم نظر آ رہے تھے جو خاص قسم کی وردی میں ملبوس تھے۔ ایک بہت ہی خوبصورت حصے میں نشست گاہ رکھی گئی تھی۔ یہ اصل عمارت سے عقبی حصے کی طرف سوئمنگ پول کا حصہ تھا جہاں رنگین شیڈ لگائے گئے تھے اور مدھم مدھم روشنیاں شام کے اجالے میں ہی کر دی گئی تھیں۔ لیکن اس سے ماحول میں ایک عجیب سا حسن پیدا ہو رہا تھا۔ رانا جسپال نے یہیں ہمارا استقبال کیا۔ لان میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ رانا جسپال نے چند انگریزوں سے میرا تعارف کرایا۔ رانی سریتا کا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ ہمیں اعلیٰ درجے کی نشستیں پیش کی گئیں۔ کچھ انگریز عورتیں اور مرد رانی سریتا دیوی سے باتیں کرنے لگے۔ مجھ سے بھی میرے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے بتایا کہ میں سینٹ لوسیا میں رہتا ہوں۔

وہ لوگ مجھ سے سینٹ لوسیا کے بارے میں سوالات کرنے لگے اور مجھے جتنا بریف کیا گیا تھا، اس کے مطابق میں محتاط انداز میں ان کا جواب دیتا رہا۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ میری نگاہیں کتنی ہی بار قرب و جوار میں روپالیہ کو تلاش کر چکی تھیں۔ روپالیہ کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ انگریز ماں کی بیٹی ہے جبکہ باپ ہندوستانی ہے۔ اچانک ہی سریتا دیوی نے کہا۔

"روپالیہ۔"

سامنے کے حصے سے ایک خوبصورت لڑکی چند اور ماڈرن لڑکیوں کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ لیکن روپالیہ کو دیکھ کر میرے دل کو شدید دھکا لگا تھا...... اور میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ حیرت ناک...... پراسرار...... یہ پراسرار قوتیں میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مرتے دم تک میرا پیچھا کرتی رہیں گی۔ روپالیہ، روپالیہ نہیں بلکہ کلاڈیا تھی۔ کرنل صغیر کی بیٹی جو خود بھی ایک انگریز ماں کی بیٹی تھی۔ میرے خدا...... آخر یہ کیا اسرار ہے؟ چند مخصوص کردار کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ زندگی میں ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیا؟

روپالیہ قریب آتی چلی گئی۔ کلاڈیا کو میں نے کئی بار دیکھا تھا لیکن جتنی تفصیل سے آج دیکھ رہا تھا اس سے پہلے اتنی تفصیل سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نقش میں ایک ایسی معصومیت تھی اور چہرے کی جلد میں ایسی ملاحت تھی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔ اتنے

شفاف چہرے کم ہی نظر آتے ہیں۔ بے شکن جیسے سنگ مرمر سے تراش دیئے گئے ہوں اور سنگ تراش نے ان چہروں پر اپنی بہترین مہارت کا مظاہرہ کیا ہو۔ انتہائی متناسب قد و قامت، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس سے پہلے میں نے جب بھی کلاڈیا کو دیکھا ایسے لباس میں دیکھا کہ میں اس کے چہرے اور جسمانی نقوش کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا۔ لیکن آج جو وہ لباس پہنے ہوئے تھی وہ اس کی جسمانی موزونیت کا بھی اظہار کرتا تھا۔ اور ایک دم سے میرے ذہن میں وہی سناٹے در آئے جو شاید میری فطرت کا ہی ایک حصہ تھے۔ میں ان سناٹوں کو کسی پراسرار کیفیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دلکش سڈول جسم کا تصور اور اس کو پا لینے کی خواہش میرے دل میں پھر سے مچلنے لگی تھی اور میں اس کے بارے میں مکمل طور پر غور کرنے لگا تھا۔

اسی وقت رانا جسپال اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے لے کر ہمارے پاس آیا۔

''رانی سریتا دیوی، پرنس ہردیپ سنگھ۔'' اس نے ہمارا تعارف کرایا تو روپالیہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا لئے۔ سریتا دیوی نے میری طرف دیکھا تو میں نے بھی جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ ظاہر ہے مجھے پرنس ہردیپ کا کردار ادا کرنا تھا۔ رانا نے روپالیہ سے کہا۔

''یہ ہمارے آج کے خاص مہمان ہیں۔ تم انہیں کمپنی دو گی۔''

''جی پتا جی۔'' روپالیہ نے مترنم آواز میں کہا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ آواز بھی کلاڈیا ہی کی تھی۔ میری گہری نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں اور میں اپنی آنکھوں کی معنی خیزیت سے اسے یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ بہرحال میں اس کا قدیم شناسا ہوں۔ لیکن روپالیہ کے معصوم چہرے پر کوئی نقش نمودار نہ ہوا۔ وہ دلآویز انداز میں بولی۔

''آئیے پرنس! آئیے پلیز۔''

''جی۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''ہماری اس وقت کی ملاقات تو بہت سرسری رہے گی۔ کیونکہ یہ جو میری دوست آئی ہوئی ہیں، انہیں خود سے دور کرنا بڑا مشکل ہوگا اگر میں چاہوں بھی تو۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں آپ کو اپنی کوٹھی دکھانے کے لئے لے چلوں گی۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آئیے۔'' اس کے بعد اس نے مجھے کئی لڑکیوں سے ملوایا لیکن اس کے انداز میں

کوئی ہلکا پن نہیں تھا۔ اس نے یہی کہا۔

''انڈین پرنس ہردیپ سنگھ۔ سینٹ لوسیا میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پتا جی کے بہت گہرے دوست کی اولاد ہیں۔'' چونکہ اس تعارف میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکیوں نے بھی مجھے پُرخلوص انداز میں ویلکم کہا تھا۔ رانا جسپال اور سریتا دیوی ہم دونوں کی طرف سے بالکل بے خبر ہو گئے تھے اور دوسرے مہمانوں میں گم تھے۔ آخر کار موقع ملا تو میں روپالیہ کے ساتھ کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑا۔ وہ سادگی سے مجھے بتانے لگی کہ رانا جسپال ہندوستان سے بہت محبت کرتے ہیں اور انہوں نے یہ کوٹھی قدیم ہندوستانی عمارتوں کے انداز میں بنوائی ہے۔ میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک بار میں نے ایک فانوس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مس کلاڈیا! یہ فانوس.....''

''یہ پیرا گوئے سے میرے پتا جی خود لائے تھے۔''

''بہت خوبصورت فانوس ہے مس کلاڈیا۔''

''ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔''

میں نے دو بار اسے کلاڈیا کہہ کر مخاطب کیا تھا لیکن نجانے کیوں اس نے میرے الفاظ کی تردید نہیں کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ شاید مجھ سے اس بارے میں سوال کرے۔ اپنے خوبصورت بیڈ روم میں لے جا کر اس نے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور بولی۔

''آپ پہلی بار میرے مہمان بنے ہیں۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

''پہلی بار؟'' میں نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

''تو اور کیا؟''

''میں پہلی بار تو آپ کا مہمان نہیں بنا۔''

''کیا مطلب؟''

''ہماری ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے۔''

''سپنوں میں؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں، ایک بار کلکتہ میں..... ایک بار اسکندریہ میں۔''

''جی.....؟'' وہ حیرت سے بولی اور میں ایک دم ہنس پڑا۔ اس وقت ماحول کو خراب کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ کی پیدائش کہاں کی ہے روپالیہ جی؟"

"یہیں لندن میں پیدا ہوئی ہوں۔"

"انڈیا آتی جاتی رہتی ہیں؟"

"ہاں، بہت سی بار۔ کپورتھلہ ہماری اصل رہائش گاہ ہے، میرا مطلب ہے پتہ جی کے سارے عزیز کپورتھلہ میں ہی رہتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، ہاں۔ اچھا ٹھیک۔" میں نے خوامخواہ گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ روپالیہ مجھ سے سینٹ لوسیا کی باتیں کرنے لگی۔ میں خاصا الجھ گیا تھا۔ وہ اپنے انداز سے کہیں ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی کہ وہ کلاڈیا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے دوسری ملاقات بھی کروں گا۔ پھر ہم مہمانوں کے درمیان واپس آ گئے۔ رانا جسپال نے میری کلائی پکڑی اور مجھے دوستوں کے درمیان لے گیا۔ یہاں اس نے کھل کر لوگوں سے بات کی۔

"بھئی آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ بیٹی اگر راجہ کی بھی ہو تو پرائی ہوتی ہے۔ اس کو اپنا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ماتا پتا کی سب سے بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی کسی اچھی جگہ جائے۔ پرنس ہردیپ ایک ہندوستانی ریاست قولی کے راجکمار ہیں۔ قولی بہت بڑی ریاست ہے اور چندی گڑھ کے اطراف میں ہے۔ پرنس ہردیپ کے پتا میرے بہترین دوست تھے۔ وہ اب اس سنسار میں نہیں ہیں۔ ان کی چچی، رانی سریتا دیوی نے فیصلہ کیا ہے کہ روپالیہ کو اپنی بہو بنائیں گی۔ یعنی میری بیٹی کو۔ آپ لوگ پرنس ہردیپ کو اسی نگاہ سے دیکھیں۔"

رانا جسپال سنگھ بلاشبہ ایک بڑا آدمی تھا۔ ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ لیکن بہرحال یہ تو ایک کھیل تھا جو رانی سریتا کھیل رہی تھی اور جہاں تک میرا تعلق تھا میں یہ بات جانتا تھا کہ اس کھیل کے پراسرار تار میری زندگی سے بندھے ہوئے ہیں اور بھوج پتر پر ابھر آنے والا چہرہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ رانی سریتا دیوی کا تعلق ان سارے معاملات سے بہت گہرا ہے۔ بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، میں اپنے طور پر غیر مطمئن نہیں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود کو تقدیر کے دھارے پر تو چھوڑ ہی دیا ہے، تقدیر کے ہر فیصلے کو خوش دلی کے ساتھ قبول کروں گا۔ یہی میرے لئے سب سے بہتر عمل ہو گا۔ غرض یہ کہ یہ ساری باتیں سوچ کر میں مطمئن تھا۔ رات کے کھانے کے بعد رانا جسپال نے ہمیں رخصت کیا۔ روپالیہ بھی ساتھ تھی۔ رانا جسپال نے کہا۔

"پرنس! میری طرف سے تمہیں اجازت ہے، جب دل چاہے یہاں آ سکتے ہو، روپالیہ سے مل سکتے ہو۔ سریتا دیوی! پرنس ہردیپ بہت اچھا لڑکا ہے، مجھے بے حد پسند آیا۔"

سریتا نے مسکرا کر گردن ہلا دی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ واپسی پر اس نے کہا۔ "اور کبھی کبھی انسانوں کو کچھ ایسی شخصیتیں مل جاتی ہیں جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ آگے ہوتی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگا ہے خاقان جمشیدی! کہ تم خاقان جمشیدی ہو ہی نہیں بلکہ پرنس ہردیپ ہو۔"

"آنٹی! میں تو اس وقت سے خوفزدہ ہوں جب پرنس ہردیپ میری جگہ آ کر لے لے گا۔"

"دیکھو...... میں تمہیں بتاؤں، زندگی جو ہے نا یہ ایک خطرناک کھیل ہے۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ لاکھوں افراد لاکھوں بار ایسی لاکھوں مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس یہی زندگی کا اختتام ہے اور وہ ان مشکلوں سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن وقت کوئی نہ کوئی حل نکال لیتا ہے عام لوگ جو کچی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی سطح بہت ہلکی ہوتی ہے، اپنی مرضی کے خلاف پیش آنے والے واقعات سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ لیجئے زندگی گئی۔ بھئی زندگی جانی تو ہے، آج نہیں، کل نہ سہی پرسوں، کسی نہ کسی شکل میں جانی ہے۔ بس یہی سب سے بڑا خطرہ ہوتا ہے زندگی کو۔ اس کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے، بتاؤ؟ یہ تو معمولی سی بات ہے۔ اگر یہ سوچ لیا جائے کہ ہمیں ہر مشکل سے گزرنا ہو گا اور اس یقین کے ساتھ کہ آخر کار یہ مشکل خود بخود ختم بھی ہو جائے گی، سب کافی ہے۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ تم بالکل فکر مت کرو، اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دو۔ مزے لو زندگی کے۔ سب کچھ تمہارے چرنوں میں ہے۔"

ہم لوگ فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ سریتا نے کہا۔ "اب تم اندر جاؤ، میں یہیں سے واپس چلی جاؤں گی۔ نہ، نہ...... میرے بارے میں یہ مت پوچھو کہ میں کہاں جاؤں گی اور کیوں جاؤں گی۔ بات یہ ہے کہ اب تک بے شمار چیزیں تمہارے علم میں نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں مجھے وہ کرنے دو جو میں کرنا چاہتی ہوں۔ بس سمجھ لو کہ تمہارے اطراف مضبوط کرنا چاہتی ہوں اور تمہارے خلاف کوئی بات کبھی نہیں جائے گی۔ اوکے؟"

"اوکے۔" میں نے گردن ہلا کر کہا اور رانی سریتا دیوی اسی وقت کار میں واپس چلی گئی۔

میں اندر پہنچ گیا تھا۔ جب میں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا تو راج شری میرے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں چونک پڑا تھا۔ ''ارے راج شری! تم؟''

''ہاں...... ظاہر ہے میں آپ کی داسی ہوں مہاراج! ہماری ڈیوٹی لگی ہے۔ میری بہن جے شری کسی کام سے گئی ہوئی ہے۔ آپ کی خاطر مدارات کی ذمہ داری تو مجھے ہی پوری کرنا ہوگی۔''

''جے شری کہیں گئی ہوئی ہے؟''

''ہاں۔''

''یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ بخار آ گیا تھا نا تمہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔ ٹھیک تو ہونا تھا نا مجھے۔ ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کے کپڑے رات کے پہننے والے رکھ دیئے ہیں۔ یہ بات مجھے معلوم ہے کہ آپ کھانا کھا کر آئے ہیں۔ دعوت پر گئے تھے۔''

''کہاں ہیں میرے کپڑے؟''

''واش روم میں۔''

''اچھا۔''

''کچھ پیئیں گے، کافی وغیرہ؟''

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے، کافی پلا دو۔ باقی ملازم کہاں ہیں؟''

''سب اپنی اپنی آرام گاہوں میں جا چکے ہیں۔ صرف چوکیدار اپنی ڈیوٹی پر مستعد ہے۔''

''او کے، کافی لے آؤ۔'' میں نے واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، پھر لباس وغیرہ تبدیل کر کے میں نے ٹوتھ برش وغیرہ کیا۔ دروازے سے باہر نکلا تو کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں چکرا رہی تھی اور جے شری برتنوں کے پاس موجود تھی۔

''واہ...... تمہارے پاس جادو کا چراغ ہے۔''

''میرے پاس اپنے جیون کا چراغ بھی نہیں ہے، جادو کا چراغ تو بہت بڑی بات ہے کمار۔'' راج شری نے اداس لہجے میں کہا اور میں نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے ایسی باتیں پسند نہیں ہیں راج شری! تم اگر جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔'' نجانے کیوں میرے لہجے میں خشکی پیدا ہو گئی۔ اس نے سہم کر مجھے دیکھا، پھر دونوں ہاتھ جوڑ

رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''نہیں مہاراج! معاف کر دیجئے کمار جی! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ کو ناراض کروں۔ آگے ایسی بات نہیں کہوں گی۔''

''کافی بناؤ۔'' میں نے بھاری لہجے میں کہا اور وہ جلدی سے برتنوں پر جھک گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو دیکھے تھے اور ایک لمحے کے لئے وہ مجھے قابل رحم لگی تھی۔ ظاہر ہے گھر کی ملازمہ تھی، اسے بہت زیادہ منہ لگانے کا نتیجہ میرے حق میں کیا نکل سکتا ہے یہ مجھے معلوم تھا۔ اس نے کافی بنا کر میرے سامنے رکھی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے کافی کی پیالی اپنے سامنے سرکاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے راج شری! دل چاہے تو آرام کر سکتی ہو۔ میں تم سے ایک سوال کروں؟''

''جی کمار جی؟'' وہ بھرائے ہوئے انداز میں بولی۔

''دیکھو راج شری، جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں تمہیں بھی علم ہے کہ میں قصور وار نہیں ہوں۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ تم خود میرے پاس آئی تھیں۔ دیکھو برا مت ماننا، یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کسی ذہنی ہیجان یا حقیقی عمل کے ذریعے یہاں تک پہنچی تھیں اور تم یقین کرو میں بھی اسی عمل کا شکار ہو گیا تھا۔ بہرحال ہمارے درمیان جو یہ تعلق قائم ہوا ایک طرح سے بے معنی ہے۔ تم سمجھدار لڑکی ہو، اور بات کو اچھی طرح سوچ سکتی ہو۔ میں اگر تم سے صرف اپنی ہوس پوری کرتا رہوں تو بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو کھو دو گی۔ دیکھو راج شری! ایسی انوکھی کہانیاں کبھی کبھی ہی جنم لیتی ہیں کہ کسی راج کمار نے اپنی کسی داسی کی محبت میں گرفتار ہو کر راج پاٹ ٹھکرا دیا۔ اب ایک ایسی بات کہوں جو تمہارے سامنے نہیں کہنی چاہئے۔ تم جانتی ہو کہ میں پرنس ہردیپ نہیں ہوں۔ معلوم ہے نا تمہیں؟''

''ج...... جی...... جی کمار صاحب۔''

''اچھا بیٹھو...... بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا اور وہ زمین پر بیٹھ گئی۔

''جو کچھ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کا جواب دو گی؟''

''جی۔''

''اس وقت بھی تم یہاں موجود تھیں جب اصل پرنس ہردیپ یہاں آیا تھا۔ رانی سریتا

دیوی مجھے بتا چکی ہیں کہ تم تمام لوگ جو یہاں موجود ہو ان کے ایسے وفاداروں میں سے ہو جو جان دے کر بھی ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولیں گے۔ میں نے ایک لفظ خاص طور سے کہا ہے۔ تم اس پر غور کرو۔"

"کون سا لفظ؟" اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھ سے سوال کیا۔

"میں نے کہا تھا کہ رانی کے خلاف زبان نہیں کھولو گے۔ بے شک میں تم سے رانی کے خلاف ایک لفظ بتانے کے لئے ہی کہوں۔ لیکن میرے اور تمہارے درمیان ایک نامعلوم رشتہ قائم ہو چکا ہے، اس کے تحت تو میں تم سے کچھ سوال کر سکتا ہوں؟"

"آپ پوچھئے مہاراج! کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں ہم سے؟" راج شری بولی۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"تو پوچھئے۔ ہم جو کچھ بتا سکتے ہیں ضرور بتائیں گے۔"

"کیا پرنس ہردیپ سینٹ لوسیا سے یہاں آیا تھا؟"

"آئے تھے مہاراج۔"

"کون تھا اس کے ساتھ؟"

"ان کا دوست۔"

"جس رات یہاں ان کا قتل ہوا، تم لوگ کہاں تھے؟"

"ہم یہیں ہوتے ہیں، یہاں سے کہیں نہیں جاتے۔ ویسے اگر گھومنے پھرنے کا ارادہ ہو تو رانی صاحبہ ہمیں پوری پوری اجازت دیتی ہیں اور ہم سیر و تفریح کر آتے ہیں۔ رانی صاحبہ دل کھول کر ہمیں پیسے دیتی ہیں اور ہم اپنی ہر خواہش پوری کر لیتے ہیں۔ بے شک ہم یہاں داسیاں اور داس ہیں پر ہمیں ساری سہولتیں حاصل ہیں۔ رانی جی بہت اچھی ہیں، ہمیں یہاں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔"

"جب رانی یہاں نہیں ہوتی تو صرف تم ہی یہاں ہوتے ہو، میرا مطلب ہے اگر تمہیں کوئی پریشانی ہو تو تم کیا کرتی ہو؟"

"ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔ پرلوک ناتھ جی خود ہی ہمارا خیال رکھتے ہیں۔"

"پرلوک ناتھ؟"

"ہاں۔"

"یہ کون ہیں؟"

"آپ نہیں ملے ان سے؟"

"نہیں۔"

"ہائے رام۔ رانی سریتا دیوی نے بھی آپ کو ان کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"نہیں۔"

"ارے اب کیا ہو گا۔ ہمارے منہ سے تو یہ نام اس لئے نکل گیا تھا کہ آپ ان کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔"

"راج شری! تم مجھے موقع دے رہی ہو کہ تمہارے سلسلے میں، میں اپنے آپ کو بے گناہ سمجھوں۔ تم میری اس قدر قربت حاصل کرنے کے باوجود مجھے کوئی اہمیت نہیں دے رہیں۔ یعنی اگر کوئی چیز میرے کام آ سکتی ہے تو مجھے اس بارے میں نہیں بتا رہیں۔"

راج شری نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ "اور کتنا صاف صاف کہو گے کہ تم ہمیں جوتے کی نوک پر مارتے ہو۔ تم نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ کسی راج کمار نے اپنی کسی داسی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ہو۔ خیر یہ بات تو ہم خواب میں بھی نہیں سوچتے کہ کبھی کسی لمحے ہم تمہارے جیون ساتھی بن سکیں گے۔ پر اتنا ادھیکار تو ہمیں دو کہ ہم اپنے مالک کی وفاداری ہی نبھا سکیں۔ کیا ملے گا ہمیں سب کچھ تمہیں بتا کر۔ داسی ہیں، داسی رہیں گے۔ پھر کیوں بتائیں ہم تمہیں ایسی باتیں جن کی طرف سے ہماری رانی جی کی ممانعت ہو۔" اس کے لہجے میں کسی قدر تلخی آ گئی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے، مت بتاؤ۔ اور کوئی سوال کروں یا خاموش ہو جاؤں؟"

"پرلوک ناتھ جی رانی صاحبہ کے منیجر ہیں۔ بس اسی سمے یہاں آتے ہیں جب رانی جی انہیں بلاتی ہیں۔ کون ہیں، کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، مستقل قیام لندن میں ہے یا لندن سے باہر؟ اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ جوان آدمی ہیں، مطلب یہ کہ چالیس سال کے ہوں گے۔ لمبے تڑنگے ہیں، نرم بولتے ہیں۔ مگر چہرے سے بہت خطرناک لگتے ہیں۔ اور کچھ......؟" وہ بدستور تلخی سے بولی۔

"ہردیپ سنگھ کے ساتھ جو آدمی یہاں آیا تھا، کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ وہی یہاں قتل ہوا؟"

"ہاں...... بعد میں جب رانی صاحبہ نے اس کا اصل چہرہ دیکھا تو یہی پتہ چلا کہ وہ

ہردیپ سنگھ نہیں ہے۔"

"اس کے چہرے پر ہردیپ سنگھ کا میک اپ کس نے کیا تھا؟"

"میں نے نہیں کیا۔" راج شری نے کہا اور ہذیانی انداز میں ہنس پڑی۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ کس نے کیا؟ اب یہ بتا دو، جس رات ہردیپ سنگھ کا دوست یہاں قتل ہوا اور ہردیپ سنگھ غائب ہو گیا، پرلوک ناتھ جی یہاں آئے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" راج شری خشک لہجے میں بولی۔

"اوہو...... تم نے اپنا انداز بدل لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اب تم سے کوئی سوال کرنا بیکار ہے۔ اوکے، سوری راج شری! تمہیں اتنی تکلیف دے کر مجھے افسوس ہوا ہے۔ اور ایک بات میں تمہیں بتاؤں، پرلوک ناتھ جی کے بارے میں، میں زبان نہیں کھولوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

اس نے ایک تند نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے بعد بولی۔ "ہمارے لئے اب کیا حکم ہے؟"

"جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں اسے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اپنے اندر پیدا ہو جانے والی غصے کی اس لہر کو ختم کر دیا جو اس کے اس طرح چلے جانے سے پیدا ہو گئی تھی۔ ٹھیک تھی، اپنی جگہ غلط نہیں تھی وہ۔ بہرحال عورت تھی اور فاحشہ نہیں تھی۔ کبھی کبھی انسان کچھ مانگے بغیر کسی کا مقروض ہو جاتا ہے۔ قرض دینے والا تو یہی سوچے گا کہ اس کے سامنے اس کا مقروض بیٹھا ہوا ہے یا اگر یہ بات میں غلط سوچ رہا ہوں یا غلط الفاظ دے رہا ہوں تو یوں کہنا چاہئے کہ کچھ ایسے عمل ہوا کرتے ہیں جو خواہ مخواہ کچھ رابطے پیدا کر دیتے ہیں اور ان رابطوں کی ادائیگی بھی کرنا ہوتی ہے۔ میں نے اس کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں اس کی جانب دونوں ہاتھ پھیلا دیتا تو وہ کسی درخت سے ٹوٹے ہوئے پکے پھل کی مانند میرے بازوؤں میں آ گرتی۔ بہرحال کچھ بھی تھا، بیچاری عورت تھی۔ البتہ اب ایک نیا نام اس کے ذریعے میرے سامنے آ گیا تھا اور یہ تھا پرلوک ناتھ۔

رانی کے لئے اصل میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا میں، جو اسے ناگوار گزر جائے۔ فی الحال تو وہ میرے لئے تحفظ کا ایک بہترین ذریعہ بن گئی تھی۔ کیونکہ اب باقی لوگ تاریکی میں جا سوئے تھے یعنی وہ جو میرے ہمراہ یہاں تک آئے تھے۔ میرا ان سے

ہر طرح کا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ گیرون، مارک وغیرہ سے کوئی رابطہ دوبارہ قائم کرنے کی کوشش حماقت کے سوا کچھ نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ مفرور تھے اور پتہ نہیں ان کا کیا بیک گراؤنڈ ہو۔ رانی کو اپنی مٹھی میں رکھنا ضروری تھا اور اس کے ساتھ یہاں لندن سے بھی نکل جانا ضروری تھا کیونکہ کبھی کسی بھی لمحے کوئی مصیبت آ سکتی تھی۔ رانی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان جا کر وہ میری بھرپور حفاظت کرے گی اور مجھے کسی مشکل میں نہ پڑنے دے گی۔ ورنہ اب میں یوں بھی کر سکتا تھا کہ اب رانی کے بارے میں ہلٹن سے معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ راتوں کو وہ ہلٹن میں اپنے کمرے میں ہی ہوتی ہے یا کہیں اور؟ اور یہ شخص پرلوک ناتھ، ساری باتیں پراسرار تھیں۔

رانی سے دوسرے دن ہی ملاقات ہوئی۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھ کر بے تکلفی سے بولی۔

"سنا ہے خاقان! رانا تو تم پر لٹو ہو گیا ہے۔ وہ اتنا خوش ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ کہہ رہا تھا کہ شان و شوکت اس کی کمزوری ہے اور وہ خوبصورت اور شاندار لوگوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پرنس ہردیپ کو اس نے بہت چھوٹی عمر میں دیکھا تھا، کہنے لگا کہ پرنس اتنا شاندار نکلے گا یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی بتایا اس نے کہ روپالیہ بھی بہت خوش ہے اور اس نے فوراً اپنے دل کی بات کہہ دی ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے تمہاری منگنی اس سے کر دی جائے۔ میرا خیال ہے میں یہ کام کر دینا چاہئے۔"

"آپ اسے مناسب سمجھتی ہیں؟"

"مائی سن! میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تو یہی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اور میں آپ کے مقصد میں اپنے بھرپور تعاون کا وعدہ کر چکا ہوں اور آپ کا ردعمل بھی ٹھیک ہی ہے آنٹی۔ آپ نے میری بھرپور مدد کی ہے، میرے سارے مسائل بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے اس وقت آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ایسے عالم میں تو آپ جو چاہیں میں وہی کروں گا۔"

رانی چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "ارے ارے...... تمہارے یہ الفاظ تو کچھ اور کہہ رہے ہیں، مقصد نہیں سمجھ پائی میں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی یا تمہاری اس سوچ میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی اصل میں انسان جب کسی کو اپنا حتمی محور پاتا ہے تو اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اسے ایک قریبی مقام دیا جائے، ہر بات سے اسے آگاہ رکھا جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں اس سے محروم ہوں۔ مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ روپالیہ سے منگنی آپ کے کس کام آ سکتی ہے۔ آپ یقین کریں اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو مجھے اپنا یہ فرض سرانجام دے کر بڑی خوشی ہوتی۔"

میں نے رانی کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے چہرے کے عضلات کچھ سرد ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "اور میں تم سے اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کر چکی ہوں۔ سوری جان! ابھی میں تمہیں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔ بولو، میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟"

"ارے ارے...... آپ نے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ آپ کے لہجے سے ناراضگی ٹپک رہی ہے۔ یہ بہتر نہیں ہے میرے لئے بھی اور آپ کے لئے بھی۔"

میں نے اپنے ان جملوں میں رانی کی خشک مزاجی کا جواب دے دیا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر ٹھنڈی سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"تم سے دوبارہ بات کروں گی۔ پتہ نہیں کیوں ہماری ملاقات کے یہ لمحات کچھ خشک سے ہو گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔

※☆※

پھر مجھے روپالیہ کا فون موصول ہوا۔ رانی نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اس کا رویہ میرے ساتھ پہلے جیسا ہی ہو گیا تھا۔ روپالیہ کی آواز فون پر سنائی دی۔

"پرنس ہردیپ سنگھ؟"

"بول رہا ہوں۔ آپ؟"

"میں روپالیہ ہوں۔"

"ہیلو روپالیہ! کیسی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔ ملیں گے نہیں آپ مجھ سے؟"

"کیوں نہیں۔ بتائیے کب فرصت ہے آپ کو؟"

"ہر وقت فرصت ہے آپ سے ملاقات کے لئے۔ پتا جی بھی کہہ رہے تھے کہ کیا بات ہے ہردیپ سنگھ دوبارہ نہیں آئے۔"

"روپالیہ جی! میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو فون کروں گا اس کے بعد پروگرام طے کر لیں گے۔"

"جی نہیں، فون نہیں کریں گے آپ بلکہ آ جائیں گے۔"

"آپ کو اطلاع دے کر ہی آؤں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔" روپالیہ نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں خود بھی یہ سوال تھا کہ روپالیہ سے تنہائی میں ملاقات کروں اور جائزہ لینے کی کوشش کروں کہ وہ روپالیہ ہے یا کلاڈیا؟ بڑی عجیب مماثلت تھی۔ کلاڈیا بھی ایک انگریز ماں کی بیٹی تھی اور ایک مسلمان باپ کی جبکہ روپالیہ بھی انگریز ماں کی بیٹی ہے اور ایک ہندو باپ کی بیٹی بقول سب کے۔ لیکن نجانے کیوں میرا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہ روپالیہ ہے۔ کلکتے میں کرنل صغیر سے ہمارے جس قدر بھی تعلقات رہے تھے ان سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ کلاڈیا ایک پراسرار کردار ہے۔ کتنی ہی بار وہ مجھے مختلف انداز میں

ملی۔ مگر اس کا یہ نیا روپ میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔ بہر حال فون بند کرنے کے بعد میں نے راج شری کو بلا کر رانی سریتا کے بارے میں پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہیں وہ۔'' راج شری نے جواب دیا اور میں کمرے میں پہنچ گیا۔

''آؤ...... مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم مجھ سے ناراض ہو۔ حالانکہ میرا خیال ہے کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی ہمارے درمیان۔''

''آپ اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ آپ کیوں سوچ رہی ہیں کہ میں آپ سے ناراض ہوں؟''

''پلیز ہونا بھی نہیں۔''

''وہ روپالیہ کا فون آیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔''

''اچھا، خیریت؟''

''مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''تو ملو۔ بلکہ تمہیں جانا چاہئے تھا۔ میں نے تو تم سے کہہ دیا ہے کہ اب ہمیں اسی روشنی میں عمل کرنا ہے۔ تم مل لو روپالیہ سے۔''

''اس وقت میں اسی لئے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔''

''نہیں، نہیں۔ جاؤ پلیز۔ اور سنو ذرا ہوشیار رہ کر۔ حالانکہ وہ بڑی سادہ سی لڑکی ہے، مجھے اس کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ لیکن پھر بھی احتیاط ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔''

''آپ اطمینان رکھئے۔''

''مجھے اطمینان ہے۔ اب ایسی بات بھی نہیں کہ مجھے تم پر اطمینان نہ ہو۔'' رانی سریتا نے کہا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور تھوڑی تیاریاں کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔

باہر آیا تو کار تیار تھی۔ رانی نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی تھی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ابھی خود بہت زیادہ ذہانت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی نہ کسی کا ساتھ ضروری تھا۔ رانی نے ڈرائیور کو شاید یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا باہر کے مناظر دیکھتا رہا۔ آخر کار گاڑی روپالیہ کے خوبصورت مکان کے سامنے رک گئی۔ میں ڈرائیور سے مزید کچھ کہے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ ظاہر ہے اسے تمام تر ہدایات رانی سریتا نے ہی دے دی تھیں۔ روپالیہ میرا انتظار کر رہی

تھی۔ ایک خوبصورت لباس میں وہ بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ لیکن ایک بار پھر اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت جو لباس وہ پہنے ہوئے تھی، میں نے اسے بالکل اسی لباس میں اسکندریہ میں دیکھا تھا۔ اس وقت جب وہ مجھے انتہائی مشکل حالات میں ملی تھی۔ بالکل یہی لباس اس کے بدن پر تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں سارے شبہات تازہ ہو گئے کہ وہ روپالیہ نہیں کلاڈیا ہے۔ سو فیصدی...... سو فیصدی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ چکر میری زندگی کا وہی پراسرار چکر ہے جس نے مجھے مستقل طور پر چکر میں ڈال رکھا ہے۔ دیکھیں یہ چکر کب تک چلتا رہتا ہے۔

روپالیہ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا تھا۔

''آپ...... لباس کے معاملے میں بہت ہی خوش ذوق ہیں پرنس! میری تمام دوست لڑکیاں آپ کے لباس کی بھی تعریف کر رہی تھیں۔''

''شکریہ کلاڈیا۔'' میں نے کہا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔

''کیا نام لیا آپ نے میرا؟''

''روپالیہ۔''

''روپالیہ تو نہیں کہا تھا آپ نے مجھے بلکہ شاید پہلے بھی آپ نے یہی نام لیا تھا۔ وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''وجہ پوچھیں گی یا......؟'' میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''یا......؟''

''یا مجھے داد دیں گی؟''

''اپنے آپ کو کلاڈیا کہنے پر؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''چلئے اسی بات پر سہی۔''

''کیا آپ کو یہ نام بہت زیادہ پسند ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں۔''

''مگر میرا نام تو روپالیہ ہے۔''

''ہاں ہاں، میں کب منع کر رہا ہوں اس بات سے۔''

''آیئے نا، اندر آئیں۔ پتا جی بھی کہہ رہے تھے کہ کیا بات ہے، شاید پرنس تم سے متاثر نہیں ہوئے۔ ورنہ ملنے ضرور آتے۔''

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کہاں ہیں انکل جسپال؟“

”اس وقت تو نہیں ہیں، کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آئیے۔“ وہ مجھے لئے ہوئے ایک خوبصورت گوشے میں پہنچ گئی۔

”کہئے...... کیسے بلایا آپ نے مجھے؟“

”ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ آئے نہیں تھے، میں نے سوچا کہ آپ کو یاد دلا دوں کہ ہماری ملاقات ہوئی ہے اور لندن میں آپ ہمارے مہمان ہیں۔“

”شکریہ اس یاددہانی کا۔“

”پتا جی نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر چاہیں تو میں آپ کو لندن گھماؤں۔ ویسے سینٹ لوسیا کیسی جگہ ہے، مجھے تو اس کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ہیں۔“

”بہت عمدہ جگہ ہے۔ ایک سادہ سی زندگی ہے وہاں۔“

”آپ کو سادہ زندگی پسند ہے؟“

”اور آپ کو؟“

”مجھے بھی پسند ہے۔“

”آپ یہ بتائیے آپ نے کون کون سے ممالک دیکھے ہیں؟“

”بہت کم۔ یوں سمجھ لیجئے نہ دیکھنے کے برابر دیکھے ہیں۔ اصل میں آپ کو ہمارے بارے میں بہت زیادہ نہیں معلوم۔ اس بات کا تو آپ کو پتہ ہے کہ میری ماتا جی انگریز تھیں۔“

”ہاں بالکل، مجھے معلوم ہے۔“

”پتا جی کے خاندان والوں کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے ایک انگریز عورت سے شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ خاندان کی مان مریادائیں ختم کر دی ہیں انہوں نے۔ حالانکہ پتا جی نے انہیں سمجھایا کہ ان کی دھرم پتنی مختلف مزاج کی ہیں، مگر کسی نے مان کر نہ دیا۔ پتا جی نے ماتا جی کو یہ بات بتائی تو ماتا جی نے کہا کہ وہ چنتا نہ کریں، ایک دن رانا جسپال کے پریوار کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ برائی کسی انسان کی نسل میں نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذات میں ہوتی ہے۔ ماتا جی نے اس کے بعد سارے طور طریقے وہی اپنائے جو پتا جی کے پریوار کے تھے۔ آپ دیکھ لیجئے میں ایک انگریز عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود آج بھی اپنے باپ کو پتا جی کہتی ہوں اور مجھے ہندی بھی بہت اچھی آتی ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ میں نے پُراعتراف لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اسے دیکھ کر کسی قدر

چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اسکندریہ دیکھا ہے آپ نے؟“

”نہیں۔ میں مصر کبھی نہیں گئی۔“

”سوچ لیجئے۔“ میں نے دوبارہ کہا اور اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے اس کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی ہو، ایک چور کی سی کیفیت۔ لیکن ایک لمحے کے اندر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولی۔

”نہیں، اسکندریہ کبھی نہیں گئی میں۔ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ یہ سوال؟“

”نہیں بس ایسے ہی۔ ویسے میرا خیال ہے اسکندریہ کے نام سے آپ کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا ہے۔“

”پتہ نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے۔“

”چھوڑیئے ان باتوں کو اور سنائیے، مجھے بلانے کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”نہیں بس آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ معاف کیجئے میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔“

”ضرور پوچھئے۔“

”آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے بڑے ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ وہ ہمیں زندگی بھر کے لئے یکجا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“

”آپ خوش ہیں اس بات سے؟“

”اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“

”پہلے سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔ خیر اگر آپ مجھ سے ہی یہ سوال کرنا چاہتے ہیں تو میں کہتی ہوں ہاں، میں خوش ہوں۔“

”ہندوستان دیکھا ہے تم نے؟“

”کئی بار۔ ہمارا پورا پریوار چندی گڑھ میں ہے۔“

”ایک بات بتائیں گی آپ؟“

”ہاں پوچھئے۔“

”یہ پرلوک ناتھ جی آپ کے کیا لگتے ہیں؟“

”پرلوک ناتھ؟“

''ہاں، ایسے ہی پوچھ لیا تھا میں نے۔''

''نہیں، میرا خیال ہے میں تو کسی پرلوک ناتھ کو نہیں جانتی۔ مگر آپ کو یہ نام کس نے بتایا اور کون ہے یہ؟''

''بس ایسے ہی ایک ٹیلی فون آیا تھا جس میں کسی پرلوک ناتھ نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ روپالیہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔''

''پھر کچھ بتایا انہوں نے میرے بارے میں؟''

''نہیں، پھر فوراً ہی ٹیلی فون بند کر دیا۔ میرا خیال ہے کسی نے مذاق کیا ہوگا۔''

''پتہ نہیں۔ میں نہیں جانتی۔'' روپالیہ نے جواب دیا۔ پھر اس نے میری کافی خاطر مدارت کی میں اب بھی اس کی طرف سے مشکوک تھا۔ بظاہر وہ بڑی معصوم اور سادہ سی لڑکی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے کبھی کبھی اس کے چہرے پر ایک معنی خیز کیفیت نظر آتی تھی اور اس کیفیت نے مجھے پاگل بنا رکھا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا فیصلہ کروں۔ اس کے بیڈ روم میں ایک بہت ہی خوبصورت تصویر ایک حسین فریم میں لگی ہوئی تھی۔ خاصی بڑی تصویر تھی۔ میں اس پر غور کرنے لگا اور میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوبصورت تصویر لگی ہے یہ روپالیہ جی۔''

''ہاں، مجھے بھی اتنی ہی پسند ہے۔''

''نجانے کیوں میرا یہ دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ سے یہ مانگ لوں۔''

وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ ''تو کیا ہو گیا۔ مانگ لیجئے نا۔''

''دیں گی آپ یہ مجھے؟''

''شرمندہ کر رہے ہیں......'' وہ جیسے کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

بہت دیر تک ہم دونوں ساتھ رہے۔ پھر میں نے کہا۔ ''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''ہمارے ساتھ باہر چلئے نا۔''

''ٹھیک ہے، چلئے جہاں آپ کا دل چاہے۔''

روپالیہ خوش ہو گئی۔ میری کار باہر موجود تھی۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ ہی چلے۔ اور پھر ہم دونوں لندن کی سیر کو چل دیئے۔

میں نے بہت سی بار روپالیہ پر توجہ دی اور خود ہی اس شرمندگی کا شکار ہو گیا کہ بلاوجہ بے چاری پر شک کر رہا ہوں۔ وہ ایک سادہ سی، معصوم سی لڑکی ہے۔ اس کی باتوں میں سو فیصدی

بچپن تھا اور لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کلاڈیا ہے۔ لیکن چہرے کے ان نقوش کو کیا کرتا جو بار بار مجھے شبے کا شکار کر دیتے تھے۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ بلاوجہ اپنا دماغ کھپا رہا ہوں۔ اگر وہ کلاڈیا ہے بھی تو پتہ چل جائے گا کہ خود کو روپالیہ کیوں بنایا ہوا ہے اس نے اور خود اس نے بنایا ہے یا پھر کوئی اور ہی ہے جس نے اس کی شخصیت کو مشکوک کر دیا ہے۔

بہر حال کچھ نہ کچھ تو تھا۔ یہ بات کسی نہ کسی شکل میں آنے والے وقت میں پتہ چل ہی جائے گی۔ روپالیہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ پھر کافی وقت ہو گیا اور میں نے اس سے کہا۔

''کیا کہتی ہیں اب آپ؟''

''جانا تو ہے۔ اور ویسے بھی ہمارے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ ہم لوگ کہاں ہیں۔ پتا جی کہیں میرے لئے پریشان نہ ہو جائیں۔''

''کیا آپ نے اندر موجود لوگوں کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ آپ میرے ساتھ جا رہی ہیں؟''

''نہیں نہیں، سب کو پتہ ہے۔ دیکھا تھا انہوں نے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''ٹھیک ہے، پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''کیا آپ میرے ساتھ کچھ اور وقت گزارنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں یہ بالکل نہیں چاہوں گا کہ رانا صاحب ہمارے کسی عمل سے پریشان ہوں۔''

''بس ذرا پتا جی کچھ محتاط قسم کے آدمی ہیں۔ ورنہ اور تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔''

میں نے اسے اس کی کوٹھی پر چھوڑا تو وہ بولی۔ ''آیئے۔ ہو سکتا ہے پتا جی آ گئے ہوں۔''

ایک لمحے کے لئے سوچ کر میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ لیکن اندر پہنچ کر پتہ چلا کہ رانا صاحب بدستور غائب ہیں اور اس وقت بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ بولی۔

''چلئے یہ اچھا ہوا پتا جی موجود نہیں ہیں۔''

میں چلنے لگا تو وہ بولی۔ ''اور وہ تصویر جو آپ نے مانگی تھی؟''

''میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اسے نہ دینا چاہتی ہوں۔''

''اب ایسی باتیں نہ کریں آپ۔ بھلا میری مجال ہے کہ آپ کو کسی چیز کے لئے منع کر دوں؟ اور پھر میری تصویر ہے، اچھا ہے نا آپ کے من میں رہے گی۔''

''صرف تصویر؟'' میں نے وہ جملہ پورا کر دیا جو وہ سننا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر

باقاعدہ شرم کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر اس نے کہا۔

’’میں تصویر لا کر دیتی ہوں۔‘‘

تصویر اس نے میرے حوالے کر دی اور میں اسے لے کر چل پڑا۔ اصل میں اس تصویر کے نقوش پر بھی غور کرنا چاہتا تھا۔ دیکھوں تو سہی کہ اس چہرے پر کیا تاثرات ہیں۔ روپالیہ اپنے آپ کو کتنا چھپانا جانتی ہے؟ اور پھر اس نے خود کو چھپایا ہے بھی یا پھر یہ میری غلط فہمی ہے۔

بہر حال کچھ دیر کے بعد میں واپس آ گیا تو تصویر میں نے اپنے بیڈروم کے کارنس پر سجا دی تھی اور لباس وغیرہ تبدیل کرنے بیٹھ گیا تھا۔ معمول کے مطابق رانی سریتا اس وقت بھی موجود نہیں تھی۔

ذہن میں مختلف گتھیاں اُلجھتی رہتی تھیں۔ اب یہ نیا نام پرلوک ناتھ میرے علم میں آیا تھا۔ پتہ نہیں یہ پرلوک ناتھ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ رانی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رانی نے ابھی تک اس نام سے گریز کیوں کیا ہے؟ مجھے اس کے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟ روپالیہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ میری نگاہیں روپالیہ کی تصویر پر پڑیں۔ بڑی جاندار تصویر تھی۔ اس میں اس کے چہرے کا ہر نقش نمایاں تھا لیکن ایک ایک نقش چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ روپالیہ ہی کلاڈیا ہے۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کلاڈیا نے یہ روپ کیوں اختیار کیا ہے؟ کرنل صغیر کی بیٹی اور یہاں ہندو لڑکی جو رانا جسپال سنگھ کی بیٹی تھی، ان کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ دنیا میں یکساں چہرے والے بے شمار لوگ ہوا کرتے ہیں لیکن اتنی یکسانیت کہ انسان یقین کی منزل سے نکل جائے پتہ نہیں اتنی یکسانیت ہوتی ہے یا پھر یہ سب بے وقوف بنانے والی باتیں ہیں۔

بہت دیر تک یہ خیالات ذہن کو الجھاتے رہے اور آخر کار میں نے انہیں دماغ سے جھٹک دیا۔ خواہ مخواہ خود پر دیوانگی سوار کرنے والی بات تھی جو ہونی نہیں چاہئے تھی۔

تمام معمولات سے فراغت حاصل کر کے آرام کرنے لیٹ گیا۔ دلی آرزو تھی کہ گہری نیند آ جائے۔ لیکن نجانے کتنی دیر گزری تھی پلکوں کی اس غنودگی کو کہ دروازہ کھلا اور اس کے بعد راج شری اندر داخل ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات تھے جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ لیکن اس کے چلنے کا انداز بالکل ٹھیک تھا۔ میں تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ میرے قریب آ گئی اور میرے پیروں کے نزدیک بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ہاتھ آگے بڑھائے اور میرا ایک پاؤں اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ پھر اس کا چہرہ آہستہ آہستہ جھکا اور اس نے میرے پاؤں کا انگوٹھا چوم لیا۔ کیف و سرور کی ایک عجیب سی لہر میرے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے اپنے آپ میں سمو لوں۔ ذہن بری طرح اس کی اس حرکت سے متاثر ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیف و سرور کا ایک انوکھا احساس دل کو مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا کہ اچانک ہی میری نگاہ کلاڈیا کی اس تصویر پر پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے نقوش بدل گئے ہوں۔

کلاڈیا کی آنکھوں کی پتلیاں گردش کر رہی تھیں...... اور ان آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں پورے دعوے اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلاڈیا کی یہ تصویر اس وقت متحرک تھی اور اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ سنبھل گیا۔

کلاڈیا کی تصویر کا یہ انداز مجھے بڑا عجیب لگا تھا۔ میں نے راج شری پر سے نگاہیں ہٹا لیں اور کلاڈیا کی تصویر کی آنکھوں کے سحر نے جیسے مجھے خود میں پیوست کر لیا۔ تبھی ایک نامانوس آواز میرے کانوں میں ابھری۔

’’یہی تو سب کچھ ہے۔ یہیں تو غلطیاں کر رہے ہو۔ منزل تک پہنچتے ہو اور اس کے بعد ایک جھٹکے سے دور جا پڑتے ہو۔ ابھی تک نہیں سوچا تم نے اس بارے میں۔ بار بار تمہیں منع کیا گیا کہ خود کو اشبھ بھاوناؤں میں نہ ڈالو۔ لیکن لگتا ہے یہ اشبھ بھاونائیں تمہارے خون کا ورثہ ہیں۔ یہیں سے تو تمہیں بچنا ہے۔ اگر یہ خون کا ورثہ بھی ہیں تو تمہیں اس جال سے نکلنا ہے۔ اس جال میں پھنسے رہو گے تو جیون بھر اپنی منزل نہیں پاؤ گے۔‘‘

آوازیں بدل رہی تھیں۔ کبھی یہ آواز ایک دم سے تبدیل ہو کر وردان سادھانی کی آواز بن جاتی تھی، کبھی ایک اجنبی نسوانی آواز جو ناقابل فہم تھی جو واقعی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں ششدر رہ گیا تھا۔ اب یہ آواز میرے ذہن پر حاوی ہو گئی تھی جو مجھے راج شری کی قربت سے روکنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ راج شری کو اپنے آپ سے دور کر دیا اور اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا۔ راج شری چونک پڑی تھی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ’’راج شری......‘‘

اور وہ چونک کر اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگی جیسے نیند سے جاگ گئی ہو۔

''کیوں آئی ہو یہاں؟'' میں نے کہا اور وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے منہ سے ایک سسکی جیسی آواز نکلی۔ اس نے میرے کمرے کو دیکھا اور بولی۔

''ہائے رام...... یہ میں...... یہ میں یہاں کیسے آ گئی؟''

''راج شری! میں اب بھی یہ نہیں کہوں گا کہ تم جان بوجھ کر ناٹک کر رہی ہو۔ لیکن میری جگہ کوئی بھی ہوگا، سوچے گا یہی جو میں سوچوں گا۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی اپنے آپ کو سنبھالو اور ایسے راستے پر چلنے سے گریز کرو جو بعد میں تمہیں بیمار ڈال دے۔ تم ایک بار پھر یہاں آئی ہو۔ اور دیکھو، میں انسان ہوں، لمحوں میں بھٹک جانے والا انسان۔ میں اپنے آپ کو کسی بھی شکل میں ایک ایسا انسان نہیں کہہ سکتا جو پوتر ہو، جو بہت زیادہ پاک بنتا ہو۔ جاؤ، اپنے کمرے میں واپس جاؤ ورنہ کل پھر بخار میں مبتلا ہو جاؤ گی۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم میری منزل نہیں ہو اور نہ میں کوئی ایسی مثال قائم کرنا چاہتا ہوں اور نہ کر سکتا ہوں جس میں کسی کو اپنے قریب لے آیا جائے۔''

راج شری کے چہرے پر ایک عجیب سی بے بسی پھیل گئی۔ پھر وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل گئی۔ میں نے ایک ڈری ڈری نگاہ روپالیہ کی تصویر پر ڈالی۔ تصویر مجھے مسکراتی نظر آئی تھی۔

حقیقتاً یہ تصویر اس انداز میں مسکراتی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شگفتگی بے شک تھی لیکن اب جو کچھ مجھے نظر آ رہا تھا وہ پہلے سے بہت مختلف تھا۔ میں نے ایک عجیب د غریب انداز میں ہوش سنبھالا تھا، میرے ماضی کی کہانی بہت ہی حیران کن تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر کبھی اپنے ماضی پر بھی نگاہ ڈال لی جاتی تو ایک پراسرار قصہ تیار ہو جاتا تھا۔ میری پیدائش ہی پراسرار حالات میں ہوئی تھی۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ والد صاحب ذرا مختلف انداز کے آدمی تھے۔ ہمدان جمشیدی کی زندگی سیر و شکار میں گزری اور جب انہیں بیوی ملی تو انہوں نے اسے اپنا شکاری ساتھی بنا لیا۔ چونکہ خاص قسم کے زمیندار تھے جن کا مزاج ذرا الگ اور مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی ایک مرکز پر قناعت نہیں کی بلکہ مرکز نگاہ بدلتے رہے۔ لیکن میری والدہ کا جو مقام تھا وہ الگ ہی رہا اور شاید انہیں کبھی والد صاحب سے یہ شکایت نہیں ہوئی کہ وہ ان کی عدم توجہی کا شکار رہی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی شکار کے دوران میں اس دنیا میں نمودار ہوا۔ لیکن یہ کوئی ایسی پراسرار بات نہیں تھی۔

پھر والد صاحب نے مجھے اپنی لائن پر لگا لیا۔ ان کے سیر و شکار کی زندگی میں بھی کوئی ایسی انوکھی واردات نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے پراسرار قوتیں میرا پیچھا کریں۔ بس آغاز وہیں سے ہوا تھا جب میں بالکل ہی اتفاقیہ طور پر شو جی کے مندر میں پہنچا تھا اور دھرم شوالہ میں دیو استھان میں بدھا کے مجسمے کی گود میں جا بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں وقت کی کون سی دھار وہیں سے بگڑ گئی تھی اور حالات نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ جن میں وردان سادھانی، سیوک سندھورتی، ماشرہ اور نجانے کیسے کیسے انوکھے نام شامل ہو گئے تھے۔

دنیا میں بہت کم لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا ہوگا۔ بس پھر اس کے بعد پراسرار طاقتیں میرے اردگرد پھیل گئیں۔ کلکتے میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ حالانکہ والد صاحب کو ان تمام باتوں سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ مجھے صرف ایک شکاری بنانا چاہتے تھے۔ دولت، جائیداد، زمینیں اتنی تھیں کہ اب بھی اگر میں ہندوستان پہنچ جاتا تو ظاہر ہے میری ہر چیز مجھے واپس مل جاتی، میں ایک عالیشان حکمران کی حیثیت سے وقت گزار سکتا تھا۔ لیکن کیا، کیا جاتا ان پراسرار قوتوں کا، وہ لوگ مجھے مہتر بدھ بنانا چاہتے تھے۔ پتہ نہیں یہ کمبخت کیا بلا تھی، میں تو سمجھ ہی نہیں سکا۔ جو جو تجربات مجھ پر بیت چکے تھے اور جس جس طرح مجھے بدھ پگوڈوں میں جانا پڑا تھا، گاشر برم کی پہاڑیوں میں عجیب و غریب خانقاہوں میں جو پراسرار لمحات مجھ پر بیتے تھے اور پھر وہ بھوج پتر جو مستقبل کا حال مجھے بتاتا تھا۔ وہ لوگ تو مجھے ایک دیوتا، ایک اوتار کا مقام دینا چاہتے تھے لیکن میں اپنی فطرت کو کیا کرتا۔

جس ماحول میں جنم لیا تھا اس ماحول کو تو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ بنانے والے جو کچھ بنانا چاہتے تھے وہ میں نہیں بن سکا اور اب تک بھٹک رہا تھا۔ اور پھر اتنے سارے دوسرے کردار جیسے کلاڈیا یا پھر جس طرح میں اسکندریہ سے مصیبتوں میں گرفتار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا اس کے بعد رانی سریتا کا مل جانا اور اس کی ایک الگ کہانی اور پھر جگہ جگہ کلاڈیا۔

مجھے یہ احساس ہوا کہ جس طرح وردان سادھانی میرا پیچھا کرتا رہا ہے اسی طرح کلاڈیا بھی مجھ سے دور نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس دوران بے شمار کردار آئے۔ آغاز ایلس فیوری سے ہوا تھا مگر نجام ابھی نہیں ہوا تھا۔ اینہ اور اس کے بعد راج شری۔ میرے دل سے قریب جو کردار تھے ان میں اینہ سر فہرست تھی اور صحیح معنوں میں اس کے لئے میرے دل میں تڑپ تھی۔ لیکن اب اس کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ یہ تمام چیزیں اور یہ تمام کردار میری ذات پر

مسلط تھے۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ کلاڈیا ضرورت سے زیادہ ہی میرے پاس ہے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ سارے کے سارے مجھے عورت کے قرب سے روکنا چاہتے تھے اور میرے دل و دماغ کی صفائی کے خواہشمند تھے۔

کبھی کبھی تو ان تمام سوچوں پر ہنسی آتی تھی۔ ارے بابا میں جس باپ کی اولاد ہوں وہ اسی طرح کا انسان تھا۔ کہاں کہاں تم لوگ میری دیکھ بھال کرو گے؟ کہاں کہاں تم لوگ مجھے بچاتے اور سنبھالتے رہو گے؟ میں تو لمحوں لمحوں میں بگڑنے والا ہوں۔ سنا مس کلاڈیا آپ نے۔ روپالیہ بن کر آئیں یا آسمانی مخلوق، میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں ہے۔ نتیجے کا انتظار میرے باپ نے بھی نہیں کیا تھا اور میرے لئے بھی یہ مشکل ہے۔ راج شری بے چاری تو ویسے ہی قابل ہمدردی ہے، اسے تباہ و برباد کرنا بے شک ایک غلط عمل ہو گا۔ لیکن اس کے علاوہ محترمہ کلاڈیا! بچ کر رہئے، کہیں روپالیہ کی حیثیت سے آپ دھوکا نہ کھا جائیں۔ اور اب تو آپ سے میری منگنی بھی ہونی والی ہے۔ بہتر ہے کہ خود اپنے آپ کو سنبھالیں۔ کہیں میں آپ کی طرف ہی راغب نہ ہو جاؤں۔ اور میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔

میں نے یہ بات دل میں سوچی تھی اور صرف ازراہِ تمسخر کلاڈیا کی تصویر کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اب کلاڈیا کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک ناخوشگوار سا انداز تھا۔ حیرانی کے باوجود میرے حلق سے ایک قہقہہ نکل گیا۔

"میں نے تو آپ کو اپنی فطرت بتائی ہے میڈم! ناراض ہوں یا کچھ بھی کریں، بات میں نے بالکل سچ کہی ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ سے بچ کر رہیں۔ میرے وجود میں ایک اور بھی ہے جس نے آج تک میرے اقدامات کے سلسلے میں فیصلے کئے ہیں اور ہو سکتا ہے کسی وقت اس کا فیصلہ آپ کے بارے میں بھی ہو جائے۔ خیر، یہ تو ایک الگ بات ہے۔ لیکن اب یہ فیصلہ کیا ہے میں نے کہ یہ کھیل کچھ بھی ہو میں اس میں بھرپور حصہ لوں گا اور سریتا دیوی کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوں گا بے خوفی سے۔ آج تک جن جن چیزوں کے بارے میں خوف کرتا رہا ہوں، وہ بے مقصد ہیں۔ جناب وردان سادھانی، سیوک سندھورتی، میڈم کلاڈیا اور جو کوئی بھی میرا ہمدرد ہے، آپ لوگ یہ غور کر لیجئے کہ جانا ہے مجھے ہندوستان۔ اور نہ صرف ہندوستان جاؤں گا بلکہ سیتا گڑھی بھی جاؤں گا اپنی جنم بھومی۔ اور اس کے بعد...... اس کے بعد......"

میری آنکھیں خوابوں میں ڈوب گئیں۔ بچپن کے وہ سہانے مناظر، ہمدان جمشیدی صاحب کے ساتھ سیر و سیاحت، شکار کی وہ تمام باتیں مجھے یاد آنے لگیں اور میں خوابوں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

رانی سریتا دیوی جو کھیل بھی کھیل رہی تھی، مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ حالانکہ اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہیں، بے مقصد نہیں ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی خاص بات ہے۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی تھی۔ میں اس خاص بات سے بھی متاثر نہیں تھا۔ بلاوجہ اپنے اوپر ایک خوف مسلط کر لیتا کبھی کسی کا، کبھی کسی کا۔ دشمنوں میں میرا بدترین دشمن ہیگ تھا جو بہرحال میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ انسان کو ان تمام چیزوں کی گنجائش تو رکھنا ہی ہوتی ہے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ حالات آپ ہی کی مرضی کے تابع ہوں۔ دوسرے بھی تو بہرطور تقدیر بھی رکھتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات بدترین سے بدترین ہوئے ہیں لیکن ہیگ میرے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ اور اس کی تقدیر نے اسے ہمیشہ میرے چنگل سے بچا لیا تھا۔ جبکہ میں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت اسی کے لئے صرف کر دیا تھا اور نجانے کیسے کیسے کرداروں نے اس کی مدد کی تھی۔

سریتا دیوی نے بڑی خوشی کے عالم میں مجھے بتایا۔

"رانا جسپال نے منگنی کی تاریخ طے کر دی ہے۔ میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان گفتگو ہوئی اور انہوں نے منگنی طے کر دی۔"

"یہ سب آپ ہی کا کام ہے سریتا دیوی!"

"اچھا ایک بات بتاؤ، برا تو نہیں مانو گے میری بات کا؟"

"بھلا آپ کی بات کا میں برا مان سکتا ہوں؟"

"میں تم سے یہ بات کہہ چکی ہوں کہ تم میرے دل کی گہرائیوں میں اترتے جا رہے ہو اور اس کی بنیادی وجہ تمہارا پیارا کردار ہے۔"

"شکریہ رانی جی! آپ خود بھی تو اتنی ہی اچھی ہیں۔ جتنے پیار اور مہربانی سے آپ مجھ سے پیش آتی ہیں، نجانے میرے دل میں کیسے کیسے جذبے جاگ اٹھتے ہیں آپ کے لئے۔"

میں نے مکاری کا مظاہرہ کیا اور یہ کہنے میں بالکل عار نہیں محسوس کرتا کہ یہ سو فیصدی مکاری ہی تھی۔ ورنہ سریتا دیوی کے لئے میرے دل میں ایسی کوئی جذباتی کیفیت نہیں تھی۔

"آج سے پانچویں دن ہمیں منگنی میں شرکت کرنا ہوگی۔ ہم چند افراد جائیں گے اور منگنی ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد بہت خوبصورت وقت گزرے گا۔ ہم ہندوستان واپس جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔"

"تم دیکھنا تو سہی کہ چندی گڑھ پہنچنے کے بعد ہوتا کیا ہے۔ میں تمہیں ایک شاندار روپ دوں گی۔ ناز کرو گے تم اپنے آپ پر۔"

میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ میں نے سوچا کہ سریتا جی! وقت نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے ورنہ میں آپ کو بتاتا کہ میں کیا ہوں۔

بہرحال ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ راج شری اس دن سے میرے سامنے نہیں آئی۔ جے شری البتہ میری خدمت پر مامور رہی اور جے شری نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس سے مجھے کوئی دقت ہوتی۔ کلاڈیا کی تصویر میری خوابگاہ میں موجود تھی اور میں یہ بات کہنے میں عار نہیں محسوس کرتا کہ جب بھی میری کوئی اُلجھن ہوتی میں اس تصویر سے مدد حاصل کر لیتا۔ بہرحال مجھے اس سے بڑا فائدہ ہو رہا تھا۔

وہ دن آ گیا جب منگنی ہونی تھی۔ سریتا دیوی نے لندن کے ایک بہت بڑے جیولر سے انتہائی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی خریدی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہیروں کے پانچ سیٹ خریدے گئے تھے۔ دولت کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔

پھر ایک نیا کردار میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ رانی سریتا دیوی نے اس سے میرا تعارف پرلوک ناتھ کہہ کر کرایا تھا۔ دُبلے پتلے بدن کا مالک انتہائی شاطر چہرے والا آدمی تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں دو دنیائیں بسی ہوئی تھیں۔ ذرا بھی غور کر لیا جاتا ان آنکھوں پر تو لگتا تھا جیسے کسی شیطان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

"ہیلو پرنس!" اس نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔"

"میرا نام پرلوک ناتھ ہے۔"

"پرلوک؟"

"ہاں۔"

"میرے خیال میں پرلوک تو عدم آباد کو کہتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

"عدم اور وجود یہی دو کہانیاں انسان کی زندگی پر مسلط ہیں۔ یا تو وہ عالم وجود میں ہوتا ہے یا عدم آباد پہنچ جاتا ہے۔"

"مگر پرلوک ناتھ جی، آپ کا نام عدم آباد کیوں ہے؟"

"یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔" پرلوک ناتھ نے ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اچھا......؟"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"اصل نام تو میں نے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ یہ میری صفت ہے۔"

"پرلوک؟"

"ہاں۔ وجود سے عدم تک پہنچانا میرے لئے آسان ترین کام ہے۔"

"رانی جی سے آپ کا کیا واسطہ ہے؟"

"مینیجر ہوں ان کا۔" اس نے کہا اور ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں بہت سے طنز پوشیدہ تھے۔

"گویا آپ ان کے راستے صاف کرتے ہیں؟"

"نہیں بھائی! بھنگی نہیں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ہر مشکل کا حل میرے پاس ہے۔ ان کی زندگی کی کتاب مینیج کرتا ہوں، یہ سمجھ لو۔"

"ہوں ہوں......ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن پرلوک ناتھ جی! کبھی پہاڑ دیکھا ہے؟"

"اونٹ بھی دیکھا ہے۔" پرلوک ناتھ نے میری بات کا برا مانے بغیر اصل بات سمجھ کر کہا۔

"کیا خیال ہے ان دونوں چیزوں کے بارے میں؟"

"فرسودہ کہانیاں ہیں بیوقوفوں کی بنائی ہوئی۔ پہاڑ ایک بے جان چیز ہے جبکہ اونٹ رک ہوتا ہے۔ اپنی بلندیوں کے بارے میں وہ بے شک سوچتا ہے اور اپنے آپ کو بلند و ا سمجھتا ہے لیکن کسی پہاڑ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا ہے کیونکہ وہ اس پہاڑ کی بلندیاں طے کر سکتا ہے جبکہ پہاڑ اس کی بلندیوں کو نہیں چھو تا۔"

"عجیب منطق ہے۔"

"ہر منطق عجیب ہی ہوتی ہے۔"

’’آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ویسے ایک بات بتائیے؟‘‘

’’جی جی پرنس!‘‘

’’ہمارے لئے بھی کچھ کریں گے؟‘‘

’’آپ ہی کے لئے تو سب کچھ کر رہا ہوں۔‘‘

’’ایسے نہیں۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’تمام معاملات سے ہٹ کر۔‘‘

’’دیکھئے اس سنسار میں ہر شخص سب سے پہلے اپنا مفاد دیکھتا ہے اس کے بعد کچھ اور۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’شعر ہے ایک کہ

اپنی ذات سے عشق ہے سچا
باقی سب افسانے ہیں

تو بات یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص ایک کسوٹی اپنے سامنے رکھتا ہے، اپنے مفادات کی کسوٹی۔‘‘

’’اگر آپ کی کسی فرمائش میں، آپ کے کسی عمل میں میرا مفاد پوشیدہ ہوا تو میں آپ کے کام ضرور آؤں گا۔‘‘

’’یہی تو میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔‘‘ میں نے کہا تو وہ ایک دم چونک گیا، پھر سنبھل کر بولا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا مشترکہ مفاد سامنے آیا جس میں میرا اور آپ کا دونوں کا فائدہ ہو تو کیا آپ میرا ساتھ دینا پسند کریں گے؟‘‘

اب وہ محتاط نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ’’خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جینا بھی جانتے ہو اور سودے کرنا بھی۔ ہاں، خیال رکھنا اس چیز کا، اگر کہیں ہمارا مشترکہ مفاد ہوا اور کسی کو کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا تو میں تم سے سودا کر سکتا ہوں۔ باقی ساری باتوں کو بھول جاؤ۔‘‘

’’تو پھر ہاتھ تو ملاتے جائیے۔‘‘

’’دیکھو دوست! اگر تم ہاتھ ملانے کو کوئی جذباتی معاہدہ سمجھتے ہو تو سب سے بڑی حماقت یہی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی وہ شعر کہا گیا ہے کہ

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا‘‘

’’شاعری سے بہت دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔‘‘

’’خود بھی ایک شاعر ہوں۔‘‘

’’پرلوک کی کہانیاں سناتے ہو گے۔‘‘

’’تخلص بھی پرلوک ہی کرتا ہوں۔‘‘

’’واہ، بہرحال اچھے آدمی ہو۔ مزہ آیا تم سے مل کر۔‘‘

’’اور تم بھی اتنے ہلکے نہیں ہو جتنا لوگوں نے تمہیں سمجھا ہے۔ میں نے اچانک ہی تمہارے وزن کو محسوس کیا ہے۔‘‘ پرلوک ناتھ نے کہا اور مسکراتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ میں دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

رانی سریتا دیوی ان تمام معاملات میں بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اس طرح بھاگ بھاگ کر وہ سارے انتظامات کر رہی تھی جس طرح کوئی اپنا کر سکتا ہے۔

آخر کار وقت مقررہ پر ہم رانا جسپال کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ لندن جیسے قیمتی شہر میں ایسی عالیشان رہائش گاہ کا تصور عام لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ رانا جسپال بھی عام آدمی نہیں تھا، لندن کے بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ وہاں مدعو کئے گئے تھے اور خوبصورت عمارت کو دلہن بنا دیا گیا تھا۔ جتنا انداز تھا میرا اتنے ہی شاندار بلکہ اس سے کہیں زیادہ شاندار انتظامات کئے گئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے دل پر ایک عجیب سا بوجھ سوار ہوا۔

یہ منگنی جس حیثیت کی حامل بھی ہے لیکن بہرحال مجھے کسی لڑکی کی انگلی میں انگوٹھی پہنانی ہے۔ ایسے تصورات سے نجانے کتنے لوگوں کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے۔ مگر میرا تو ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو میرے لئے جذباتی ہوتا۔ میری زندگی عجیب ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سانسوں پر کسی نے قبضہ کر لیا ہو اور میں ایک عمر قیدی ہوں جو صرف اپنی قید کے دن کاٹ رہا ہوتا ہے۔

ان جذباتی احساسات کو میں نے فوراً ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ رانا جسپال اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا پُرجوش خیر مقدم کیا اور بڑے احترام کے ساتھ خاص طور سے بنائی ہوئی جگہ پر جا کر بٹھایا۔ ہم لوگ بیٹھ گئے۔ رانی سریتا دیوی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ کچھ لمحے وہ

میرے پاس رکیں اور اس کے بعد مہمانوں سے ملنے جلنے لگیں۔ کوئی آدھے گھنٹے تک اسی طرح وقت گزرا اور اس کے بعد روپالیہ آ گئی۔

بہت سی لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ آ رہی تھی۔ ان میں انگریز لڑکیاں بھی تھیں، ہندو بھی تھیں۔ راناجپال نے غالباً ہندوستان سے بھی اپنے مہمان بلائے تھے کیونکہ کچھ نئے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ آخرکار روپالیہ کو میرے پاس لایا گیا۔ وہ انتہائی حسین لباس میں ملبوس تھی اور کسی قدر شرمائی شرمائی سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور دوسرے لمحے مجھے چکر آ گیا...... جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا وہ بہت غیر یقینی تھا۔ میں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ انہیں بھینچ لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ دوسرے لوگ میری اس کیفیت کو دیکھیں گے تو نجانے کیا سوچیں گے۔ لیکن میری یہ کیفیت بالکل فطری تھی کیونکہ اس وقت کی روپالیہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ یہ وہ چہرہ ہی نہیں تھا جو میں دیکھتا چلا آیا تھا۔

ایک انتہائی دلکش لڑکی سبک سبک، حسین حسین نقش و نگار والی۔ لیکن یہ کلاڈیا کا چہرہ نہیں تھا۔ اپنے نقش و نگار، اپنی سبک روی لئے ہوئے یہ چہرہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم تھی۔ باقی تمام لوگ بالکل مطمئن نظر آ رہے تھے۔ رانی سریتا دیوی بھی بالکل ہی مطمئن تھی۔ لیکن...... لیکن سب کیا ہے؟ اچانک ہی سریتا نے میرے شانوں پر دباؤ ڈال کر کہا۔

''ہردیپ، اٹھو۔ روپالیہ کا سواگت کرو۔'' مجھے ایک دم جیسے ہوش آ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ روپالیہ میرے برابر صوفے پر بیٹھ گئی لیکن میرے ہوش و حواس اب بھی غائب تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ لاکھوں سوالات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ اب انسان تو تھا، اپنے آپ کو کیسے سنبھال سکتا؟ پرلوک ناتھ ہی میرے قریب آیا اور اس نے انگوٹھی کا بکس میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''پرنس ہردیپ سنگھ! لیجئے یہ انگوٹھی اپنی منگیتر کی انگلی میں ڈال دیجئے۔''

انگوٹھی پہنانے کی رسم پوری ہوئی۔ میں نے روپالیہ کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی تھی لیکن اس دوران بھی میری نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرتی رہی تھیں۔ نہیں تھی، بالکل نہیں تھی۔ اس میں تو کلاڈیا کی کہیں سے ایک جھلک نہیں تھی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ باقی تمام لوگ مطمئن ہیں۔ کیا صرف میری ہی آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے؟ دفعتہً ہی میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ اگر کوئی پراسرار عمل ہے تو مجھے کسی قسم کے ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا

چاہئے۔

روپالیہ میری منزل تو نہیں تھی۔ یہ تو ایک واقعہ تھا جو بس ہو رہا تھا۔ ہاں بس ذرا سا تبدیل شدہ چہرہ میرے لئے الجھن کا باعث تھا۔ یہ کیسے ہو رہا ہے؟ اور یہ تمام لوگ کیسے مطمئن نظر آ رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے اپنے اعصاب قابو میں کئے، خود کو سنبھالا۔ ہر طرف ہنسی خوشی کی برسات ہو رہی تھی۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی دلچسپ لمحات گزر رہے تھے۔ روپالیہ بڑی مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھی اور میں بار بار اس کا چہرہ دیکھنے لگتا تھا۔

یہ بدلی ہوئی شکل والی لڑکی بھی بہت دلکش تھی بلکہ کسی بھی طرح کلاڈیا سے کم نہیں تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی دلکش تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ کلاڈیا میری منزل تھی اور نہ یہ۔ یہ تو صرف رانی سریتا دیوی کا شوق تھا جو وہ نجانے کس مقصد کے تحت یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ بہرحال اب میں نے اپنے آپ کو اعصابی طور پر سنبھال لیا تھا۔ اس بات کی تحقیق بھی ہو جائے گی۔

تقریب کے ہنگامے جاری رہے۔ آرکسٹرا مدھم دھنیں بکھیر رہا تھا۔ مہمان خوش نظر آ رہے تھے۔ راناجپال بہت زیادہ خوش تھے۔ مجھے سینکڑوں تحائف پیش کئے گئے اور خود رانی کی طرف سے بھی بے شمار لوگوں نے روپالیہ کے لئے تحائف پیش کئے تھے۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہو گیا۔ مہمان رخصت ہونے لگے تھے۔ روپالیہ میرے ساتھ ہی تھی اور بڑی مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھی۔ پھر ہمیں کچھ لمحوں کی تنہائی ملی تو روپالیہ نے کہا۔

''ایک بات کہوں پرنس؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، آواز تک اجنبی تھی۔ بڑی دلکش اور کھنکتی ہوئی آواز۔

''ہاں کہئے؟''

''کچھ عجیب سا لگ رہا ہے مجھے۔''

''کیسا؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہیں۔''

''وضاحت کرو گی؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، مجھے یوں لگ رہا ہے آپ اتنے خوش نہیں ہیں جتنی...... جتنی......''

''جی...... جتنی؟''

''جتنی میں ہوں۔''

''آپ خوش ہیں؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''چلئے..... آپ تو خوش ہیں۔''

''مطلب یہ کہ آپ خوش نہیں ہیں۔''

''کیوں نہیں روپالیہ جی۔ ظاہر ہے ہم دونوں کی مرضی سے یہ منگنی ہوئی ہے۔''

''پھر آپ عجیب عجیب سے کیوں ہو رہے ہیں؟''

''اچھا ایک بات بتائیے۔''

''ہاں پوچھئے؟''

''کیا اس سے پہلے میں آپ کو کچھ مختلف محسوس ہوا تھا؟''

''زیادہ تو نہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ میری سوچ ہو۔ اصل میں انسان بہت سے معاملات میں بڑے مختلف احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی بہت ہی انوکھی بات ہوئی ہے اور ہر شخص کو اس انوکھے پن کا اظہار کرنا چاہئے۔ اب جیسے میں تو آپ کے ساتھ بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں بلکہ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم جیون کے سو سال گزار چکے ہوں اور ان سو سالوں کی رفاقت ہماری رہبر ہو۔ ہم اسی انداز میں سوچ رہے ہوں۔'' میں ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنسنے لگی اور بولی۔

''کیا سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے آپ کو بوڑھا کر دیا۔''

''نہیں..... میں ایسے نہیں سوچ رہا۔ آپ کی باتیں بہت خوبصورت ہیں۔ اچھا ایک بات بتائیے روپالیہ جی!''

''ہاں پوچھئے؟''

''پہلے ملاقاتیں کتنی ہو چکی ہیں ہماری؟''

''غالباً چار یا پانچ۔''

''آپ نے اس وقت میں اور ان پہلی ملاقاتوں میں میرے اندر کوئی تبدیلی پائی؟''

''نہیں۔ اسے تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ بس میں نے کہا نا وہی بات ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ بہت ہی انوکھی بات ہے اور یہ انوکھی بات ہم دونوں کے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ غالباً مجھے وہ چیز آپ کے چہرے پر نظر نہیں آ رہی۔ اب ضروری تو نہیں ہے کہ ہر شخص کا سوچنے کا انداز وہی ہے۔ میں مختلف انداز میں سوچ رہی ہوں۔ آپ مرد ہیں، مختلف انداز

میں سوچ رہے ہیں۔''

''بہر حال چھوڑیئے ان باتوں کو۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ اوہو، دیکھئے کون آ رہا ہے۔''

رانا جسپال اور سریتا دیوی اس طرف آ رہے تھے۔

''چلئے پرنس ہردیپ سنگھ! اپنے سسر جی سے اجازت لیجئے۔ اب چلیں۔ دیکھئے ایک بجنے والا ہے۔ ان لوگوں کو بھی آرام کرنا ہوگا۔''

''ہماری چنتا نہ کریں۔ آپ اگر جانا چاہتی ہیں تو بے شک جائیے۔''

''اور ہردیپ؟''

''نہیں میرا مطلب ہے.....'' رانا جسپال نے کہا اور سریتا کا قہقہہ بلند ہو گیا۔

''گھبرا گئے رانا صاحب؟''

''نہیں نہیں، گھبرانے کی کیا بات ہے؟ اب تو یہ گھر بھی ہردیپ کا ہے۔ جب دل چاہے آ کر رہیں۔''

''چلو ہردیپ، چلو۔ کہیں تم بھی پھسل ہی مت جانا۔'' سریتا دیوی نے مذاق کرتے ہوئے کہا اور اس کے بعد ہم نے واپسی کی اجازت طلب کر لی۔ میں بڑی زبردست سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس بات کی وضاحت تو مجھے کرنا ہی تھی اور اس کے لئے سریتا کے علاوہ اور کوئی میرے ذہن میں نہیں تھا۔

کار میں، میں اور سریتا دیوی ساتھ ساتھ تھے۔ ڈرائیور، ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پرلوک ناتھ نے وہیں سے رخصت حاصل کر لی تھی۔ دوسرے مہمان بھی وہیں سے چلے گئے تھے۔ میں نے سریتا دیوی سے کہا۔ ''ایک بات نہیں بتائیں گی مجھے آنٹی؟''

سریتا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کیا؟''

''آپ کے خیال میں کچھ نہیں ہوا؟''

''مطلب کیا ہے تمہارا، منگنی ہوئی اور کیا ہوا؟''

''میں سنجیدہ ہوں واقعی۔''

''منگنی کے سلسلے میں؟''

''نہیں، تعجب کی بات ہے سریتا دیوی، تعجب کی بات ہے۔ آپ کو میرے دماغ میں کوئی خرابی نظر آ رہی ہے۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو ہردیپ! بعض اوقات ضرورت سے زیادہ خوشی انسان کو عجیب و غریب باتیں کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''کیوں؟''

''آپ اتنی شانِ بے نیازی سے کام لے رہی ہیں کہ میری عقل میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔''

''اب تم میری عقل خبط کرنے کے چکر میں ہو۔ واقعی کوئی سنجیدہ بات ہے یا تم مذاق کر رہے ہو؟''

''نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا۔''

''کیا ہوا...... کیا بات ہے؟''

''آپ کو روپالیہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی؟''

''بہت سندر لگ رہی تھی۔ وہ ہے بھی پیاری۔ کسی اور تبدیلی کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ روپالیہ ہی تھی؟'' میں نے کہا اور سریتا دیوی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

''کوئی مذاق کر رہے ہو؟ بڑے سنجیدہ سنجیدہ سے لگ رہے ہو۔ اتنی سنجیدگی سے تم مذاق کرتے نہیں ہو۔ کیا بات ہے؟''

''آنٹی، وہ روپالیہ ہی تھی؟''

''کون؟''

''وہی جسے میں نے انگوٹھی پہنائی تھی۔''

''ہاں۔ تو پھر؟''

''آنٹی! وہ روپالیہ نہیں تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ وہ روپالیہ نہیں تھی۔'' میں نے کہا اور سریتا دیوی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا۔ تم نے تو مجھے ایک عجیب سی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مطلب کیا ہے تمہارا اس بات کا؟''

''آہ...... تب شاید میں ہی پاگل ہوں گیا ہوں آنٹی۔ وہ روپالیہ نہیں تھی۔''

''پھر کون تھا؟''

''میں نہیں جانتا وہ چہرہ میرا اجنبی تھا۔ میں حیرت سے پاگل ہو گیا تھا جب میں نے اس کی شکل دیکھی تھی آنٹی۔ یہ وہ روپالیہ نہیں تھی۔''

سریتا دیوی پھٹی پھٹی نگاہوں سے میرا جائزہ لینے لگی پھر بولی ''تمہیں کیا ہوا ہے...... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''آپ یقین کر لیں، جس روپالیہ سے میں تین چار پانچ بار مل چکا ہوں یہ وہ روپالیہ نہیں تھی۔''

سریتا دیوی عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ اگر تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو تو میں تم سے درخواست ہی کر سکتی ہوں کہ پلیز اس طرح کا مذاق نہ کرو۔ میں برداشت نہیں کر پا رہی۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا آنٹی۔ جس روپالیہ سے میں پہلے دن ملا تھا اور...... اور......'' میں نے اپنی زبان کو احتیاط کے ساتھ سنبھال لیا۔ ظاہر ہے کلاڈیا کے بارے میں، میں تفصیل نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آنٹی! وہ روپالیہ بالکل مختلف تھی۔ ایک الگ چہرہ تھا بالکل۔''

''کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ پہلے دن جب روپالیہ سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی تو میں تم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور پھر رانا جسپال کی بیٹی کو میں آج سے نہیں کافی عرصہ پہلے سے جانتی ہوں۔''

''آپ کے خیال میں آنٹی! اس میں کوئی تبدیلی نہیں تھی؟''

''بس آج وہ مختلف ڈریس میں تھی۔ انڈین ڈریس میں۔ اس سے پہلے بھی وہ تمہیں ہندوستانی لباس میں ملی تھی۔ لیکن آج اس نے جو میک اپ کیا ہوا تھا وہ مختلف تھا۔ لیکن بہرحال تھی وہ روپالیہ ہی۔ مجھے بڑی حیرت ہے۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ اس دوران تم اس کے ساتھ رہے، تمہیں وہ مسلسل اجنبی محسوس ہوتی رہی؟''

''ہاں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

دفعتہً میں اچھل پڑا اور میں نے کہا۔ ''آنٹی، ایک بات۔ میں اپنی بات کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔''

''ہاں بتاؤ، کیسا ثبوت؟''

"آنٹی! میں روپالیہ سے ایک تصویر مانگ کر لایا تھا۔"

"ہاں میں نے تمہارے کمرے میں دیکھی ہے۔"

"اس تصویر میں روپالیہ کا اصل چہرہ ہے اور...... اور......"

ہاں اور کیا؟"

"نہیں، میرا مطلب ہے اگر وہ تصویر الگ ہوئی تو آپ یہ بات مان لیں گی؟"

"ماننے کی تو خیر بات ہی نہیں۔ چونکہ میں روپالیہ کو جانتی ہوں۔ وہ تم سے پہلے بھی ملی تھی اور یہ وہی روپالیہ تھی۔ دوسری کوئی ہو ہی نہیں سکتی رانا صاحب اس طرح کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر ہم سب کی نگاہیں تو تھیں نا۔ ہم پاگل تو نہیں ہیں۔"

"آنٹی! وہ روپالیہ نہیں تھی۔ آپ تصویر میں دیکھ لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ کر لیجئے۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو چلتے ہیں۔ ہو جائے گا یہ فیصلہ بھی۔"

آخر کار ہم واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ میں مضطربانہ انداز میں سریتا دیوی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا اور اس کے بعد میں نے کہا۔

"دیکھئے...... اب دیکھئے ذرا یہ تصویر۔" یہ کہہ کر میں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا اور خود بھی اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے بعد آنکھیں بند کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اپنے دماغ کا علاج ہی کرانا ضروری تھا۔ کیونکہ اس وقت جو تصویر دیوار پر نظر آ رہی تھی وہ کلاڈیا کی تصویر نہیں تھی بلکہ اسی لڑکی کی تصویر تھی جس کے ہاتھ میں، میں نے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ یہ کلاڈیا بالکل نہیں تھی۔ وہ کلاڈیا جو مجھے ہر بات پر سرزنش کرتی تھی، مجھے گھورتی تھی، میرے لئے ہنستی تھی مسکراتی تھی، آہ...... یہ کیا قصہ ہے؟

سریتا دیوی غور سے میری صورت دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "شاید تم کچھ تھک گئے ہو۔ پلیز...... تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ اب جاؤ، لباس تبدیل کرو۔ میں تمہیں دلیہ بھیجتی ہوں، وہ لے لو، پُرسکون ہو جاؤ گے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی اور اس کے بعد میں غصیلی نگاہوں سے کلاڈیا کی تصویر کو دیکھنے لگا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

"کلاڈیا! کلکتہ میں تم سے میری ملاقات ذرا مختلف انداز میں ہوئی تھی۔ تم کرنل صغیر کی بیٹی تھیں اور اس وقت میرے اور تمہارے درمیان ایسے روابط نہیں رہے تھے جن کی بنا پر میں تم سے بہت زیادہ متاثر ہوتا۔ لیکن پھر تم نے جس طرح میرا پیچھا کیا، وہ میرے لئے

ناقابل فہم رہا۔ میں نہیں جانتا کلاڈیا کہ تمہارا کردار کیا ہے، کیا چاہتی ہو تم؟ دیکھو کلاڈیا، مجھے اس طرح تنگ مت کرو۔ میں بہت تھکا ہوا انسان ہوں۔ اتنے عجیب و غریب اور پریشان کن حالات سے گزر چکا ہوں کہ اب میرے دماغ میں مزید ایسے دھماکے سہنے کی صلاحت نہیں رہی ہے۔ پلیز......"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ جے شری دودھ کا گلاس اور ویلیم کی گولیاں لئے ہوئے اندر آئی تھی۔

"میڈم نے بھیجی ہیں۔"

"لاؤ......" میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس اور گولیاں لے لیں اور پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے اسے روکا۔ "جے شری، بات سنو۔"

وہ چونک کر رک گئی۔

"جے شری! میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"جی پوچھئے؟"

"یہ تصویر دیکھو۔" میں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا اور اب جو میں نے اس تصویر کو دیکھا تو وہ کلاڈیا ہی کی تصویر تھی۔ جے شری سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کلاڈیا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

"جی آگے کہئے راجکمار؟"

"نہیں جے شری، شکریہ۔ جاؤ۔" میں نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"پتہ نہیں کیا ہے سب کچھ۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ کلاڈیا! باز آ جاؤ۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو چکا ہے کہ تم پراسرار قوتوں کی مالک ہو۔ لیکن میرا مشن بہت مختلف ہے۔ اب مجھے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرنے دو۔ میں اس سارے طلسم سے نکل جانا چاہتا ہوں جس نے میری زندگی کے راستے بدل دیئے ہیں۔ کلاڈیا پلیز...... پلیز......" میں نے مسہری پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

※☆※

اس کے بعد تقریباً ایک ہفتہ لندن ہی میں گزر گیا۔ اس دوران روپالیہ روزانہ ہی میرے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ ہم دونوں سیر و سیاحت کو نکل جاتے تھے۔ روپالیہ نے کئی بار مجھ سے کہا

تھا کہ وہ نجانے کیوں میرے اندر کچھ تبدیلی سی محسوس کر رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے میں اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے مسکرا کر بات ٹال دی تھی۔ اب اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

بہرحال اسی طرح سے یہ ہفتہ گزر گیا۔ روپالیہ اب باقاعدہ مجھ سے اقرارِ محبت کرنے لگی تھی اور اس بات پر بہت زیادہ متردّد تھی کہ ہندوستان جا رہا ہوں۔ وہ اس بات کی خواہشمند تھی کہ اسے جلد از جلد میری قربت حاصل ہو جائے۔ آخر کار تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ رانا جسپال بہت افسردہ تھا اور اس نے چلتے ہوئے سریتا دیوی سے کہا تھا۔

”سریتا جی! ان بچوں کو اب ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں رکھ سکتے۔ آپ بھی جلد ہی پروگرام بنائیں۔ ویسے آپ نے یہ ایک اچھا فیصلہ کیا ہے کہ اب ہردیپ کو سینٹ لوسیا نہیں بھیج رہیں۔ اب انہیں ہندوستان ہی میں اپنے ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع دیجئے۔“

”آپ چنتا ہی نہ کریں رانا جی۔ بہت جلد ہم کوئی مناسب فیصلہ کر لیں گے۔“ رانی سریتا دیوی نے کہا۔ پرلوک ناتھ بھی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ ایئرپورٹ پر موجود تھا نجانے کیوں یہ شخص مجھے کوئی غیر انسانی مخلوق لگتا تھا۔

بہرحال ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔ ایک بار میں سمندری راستے سے سفر کرتا ہوا اسکندریہ اور پھر وہاں سے نجانے کہاں کہاں پہنچا تھا اور اب پھر ہندوستان واپس جا رہا تھا۔ اُس وقت جو حالات تھے وہ بہت مختلف تھے۔ لیکن اس وقت صورتحال خاصی پُراعتماد تھی۔ حالانکہ رانی سریتا کیا، جن پراسرار حالات میں، میں گھرا ہوا تھا ان میں کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن بات وہی آ جاتی ہے کہ جب تک انسان خود اپنی مدد کرنے کا فیصلہ نہ کرے کوئی دوسرا اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ رانی سریتا کا جو بھی کھیل تھا، میں جانتا تھا کہ وہ خاصا پُراسرار ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا کوئی گہرا پس منظر ہے۔ لیکن بہرحال جب میں واپس ہندوستان جا رہا تھا تو میرے اندر ایک دوسرا ہی انسان جنم لے چکا تھا اور میں دوسروں سے زیادہ اس پر بھروسہ کر کے ہندوستان واپس جا رہا تھا۔

آخر کار ہم ہندوستان پہنچ گئے۔ رانی سریتا دیوی کی حیثیت کے بارے میں تو کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا اور میری بھی کافی پذیرائی کی گئی تھی۔ ایک بات میرے لئے ذرا قابلِ غور تھی، وہ یہ کہ کیا مقامی لوگوں میں سے کوئی مجھے نہیں جانتا تھا

میرا مطلب ہے ہردیپ سنگھ کو۔ ظاہر ہے اس طرح تو یہ رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں رانی جی نے کیا چکر چلایا تھا۔ کسی نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور ہم لوگ چندی گڑھ پہنچ گئے۔

ریاست چندی گڑھ میں رانی کا محل بے حد شاندار تھا۔ قدیم طرز کی یہ حسین عمارت قابلِ دید تھی۔ میرے لئے بہترین انتظامات کئے گئے تھے۔ غلام گردشیں اور غلام، بہت ساری باندیاں، یہ سمجھ لیا جائے کہ درحقیقت ایک عالی شان محل میں ایک شہزادے کی پذیرائی ہو رہی تھی۔

بہرحال دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ مجھے محل کی سیر بھی کرائی گئی۔ میں نے خود بھی محل کا جائزہ لیا۔ میری آنکھیں وہ متجسس چہرے تلاش کر رہی تھیں جو مجھے دیکھ کر حیران ہوں۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ابھی تک کسی حیرانی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔

ویسے زیادہ لوگوں سے میری واقفیت بھی نہیں کرائی گئی تھی۔ رانی نے مجھے مخصوص رکھا تھا۔ اور یوں نواحات کی سیر کرائی گئی اور میں اس علاقے کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ماضی کی یادیں ہر وقت گردش کرتی رہتی تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ رانی کے اشاروں پر چلنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اپنے طور پر بھی کچھ سوچنا تھا۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے رانی کی اصلیت کا پتہ چل جائے کہ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اس کی کیا مجال تھی کہ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف یہاں روک سکتی۔ لیکن جس کھیل کا آغاز لندن سے ہوا تھا میں اس کی مزید تفصیل جاننا چاہتا تھا اور یہی چیز مجھے یہاں روکے ہوئے تھی۔

جہاں تک روپالیہ کا تعلق تھا تو اس کے سلسلے میں ویسے ہی ایک انوکھا کھیل ہو چکا تھا۔ روپالیہ کا ٹیلی فون روزانہ آتا تھا اور ایک بیوقوف لڑکی جس قسم کی باتیں کر سکتی تھی، وہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ میں اسے بیوقوف اس لئے کہتا تھا کہ لندن جیسی جگہ پرورش پانے کے باوجود وہ لڑکی خالص ہندوستانی تھی۔ جبکہ اس قدر جذباتیت انسان کو کچھ نہیں دیتی۔ زندگی تو کھیل ہی کھیل ہے۔ بس کون کس کے بارے میں سوچے اور ان سوچوں سے کیا نتیجہ نکلے اس کے لئے کیا کہا جا سکتا ہے۔

آخر کار حالات نے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کی اور کھیل تھوڑا سا بدلا۔ اس دوران میں محل کا اچھی طرح سے جائزہ لے چکا تھا۔ اس کے بہت سے گوشے میری نگاہوں کے

سامنے تھے۔ وہاں کے حالات کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ میرے اوپر کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے مجھے اس محل یا حویلی میں پوری پوری آزادی دے دی گئی تھی۔

چنانچہ اس رات بھی میں اپنی خوابگاہ میں بہت دیر تک اس کھڑکی کے پاس کھڑا رہا تھا جو حویلی کے عقبی حصے میں کھلتی تھی۔ اس طرف ایک وسیع و عریض باغ تھا جس میں پھولوں کے اونچے اونچے کنج لگے ہوئے تھے۔ پھولوں کی مہک پوری حویلی میں چکراتی پھرتی تھی۔ خاص طور سے رات کے وقت رات کی رانی تو قیامت ڈھا دیتی تھی۔ چند لمحوں کے لئے کھڑکی کھول دی جاتی تو ہوا کے جھونکے پورے کمرے کو خوشبو میں بسا دیتے۔ مجھے یہ خوشبو بے حد پسند تھی۔ چنانچہ اکثر میں رات کو کھڑکی کھول دیا کرتا تاکہ ہلکی ہلکی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی رہے۔ باہر کا دروازہ اندر سے بند کرلیا کرتا تھا۔

اس رات بھی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں پوری طرح سویا نہیں تھا بس نیم غنودہ کیفیت تھی۔ خیالات کے سلسلے کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں اور یہ خیالات میری زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ بس بہت کچھ سوچتا تھا اپنے بارے میں ان دنوں۔ سیتا گڑھی بہت یاد آتی تھی۔ میں ان تمام کرداروں کو یاد کر رہا تھا جو میرے قریبی عزیز تھے۔ یہ بھی یاد کر رہا تھا کہ کون مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ خیر اصل چیز تو والدین ہوتے ہیں جو نہ رہے تھے۔ لیکن اب بھی میرے ایسے بہت سے عزیز و اقارب وہاں موجود تھے جو مجھے چاہتے تھے۔ ان کی یاد دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور میں ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے نیند آنکھوں میں آ گھسی تھی۔

پھر نجانے کتنی دیر گزری تھی کہ دفعتہً ہی مجھے کچھ ایسی آہٹوں کا احساس ہوا جو اجنبی تھیں اس احساس کے ساتھ ہی میں نے اپنے چہرے پر ایک گرم بھاپ محسوس کی۔ کسی کے سانس کی بھاپ تھی۔ یہ نہ وہم تھا نہ خواب۔ کیونکہ خواب دیکھنے والی نیند ابھی تک طاری نہیں ہوئی تھی اور وہم یوں نہیں ہوسکتا تھا کہ ہوش و حواس جاگ رہے تھے اور پورے ہوش و حواس عالم میں، میں نے اس بھاپ کو محسوس کیا تھا۔

میری آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ کوئی چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ بالوں کی کچھ لٹیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی لڑکی ہے۔ جیسے ہی میری آنکھیں کھلیں چہرہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے نقوش میری آنکھوں میں واضح نہیں ہوسکے تھے۔ لیکن ہیولا مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اس سے مکمل طور پر یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ کوئی نوجوان لڑکی

ہے۔ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔

"ک ک..... کون ہے؟"

لیکن میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ تیزی سے واپس پلٹی اور اس کھڑکی کی جانب دوڑی۔ میں پھرتی سے اٹھ گیا تھا۔

"رکو..... رک جاؤ..... بات سنو۔ کون ہو تم..... رکو تو سہی۔ رکو..... رک جاؤ" میرے منہ سے نکلا۔ لیکن اب وہ دوڑنے لگی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر وہ کھڑکی پر پہنچی اور پھر غڑاپ سے کھڑکی میں داخل ہو کر دوسری طرف کود گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا تھا۔ کھڑکی سے باہر کوئی پندرہ گز کے فاصلے پر وہ ایک سمت دوڑ رہی تھی۔ بے اختیاری میں، میں نے بھی کھڑکی کی دوسری طرف چھلانگ لگائی اور بری طرح زمین پر گر پڑا۔ لیکن پھر اٹھا اور دوبارہ اٹھ کر دوڑنے لگا۔ باہر تاروں کی مدھم چھاؤں میں لڑکی کے دوڑتے ہوئے ہیولے کو میں بخوبی دیکھ رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تیز نہیں تھی لیکن اس وقت میں نے اس پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ایک سمت مڑ گئی۔ میں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔

حویلی کا یہ حصہ آگے جا کر پرانی حویلی سے جا ملا تھا۔ لڑکی اسی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اسے آواز نہیں دی تھی کیونکہ حویلی میں رات کو چوکیدار گشت کیا کرتے تھے۔ لڑکی حویلی کے بوسیدہ حصے کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایسی جگہ رکی جہاں اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ وہ احتیاط سے اس ڈھیر پر چڑھنے لگی۔ یہ حویلی سے باہر نکلنے کا راستہ تھا اور میں نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ لڑکی کو میں ٹوٹی حویلی کے دوسری طرف اب بیرونی حصے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بدستور بھاگی جا رہی تھی۔ لیکن نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ سکتی ہے لیکن دوڑ نہیں رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنے پیچھے لگائے رکھنا چاہتی ہو۔

ایک لمحے کے لئے میں محتاط ہو گیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ہوسکتا ہے وہ جان بوجھ کر مجھے اپنے پیچھے لگا کر کہیں لے جانا چاہتی ہو۔ لیکن یہ احتیاط بے معنی تھی۔ میں تو مشکل حالات میں گھرا ہی ہوا تھا۔ اگر کوئی مجھے قتل بھی کرنا چاہتا ہے تو کم از کم یہ تو پتہ چلنا چاہئے کہ وہ کون ہے۔ ڈر کر رک جانا تو ایک بے معنی سی بات ہوگی۔ ذہن میں خلش ہی رہے گی کہ وہ کون تھا۔

چنانچہ میں دوڑتا رہا اور اس تک پہنچنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

میں نے خاص طور سے محسوس کی تھی کہ لڑکی کی رفتار ویسے تو اچھی خاصی تیز تھی لیکن جب میں کوشش کر کے اس کے قریب پہنچنا چاہتا تھا تو اچانک ہی وہ اپنی رفتار تیز کر دیتی۔ بلکہ یوں لگتا جیسے وہ ایک دم فارورڈ ہو گئی ہو۔ میں کافی دور نکل آیا تھا اور پھر کافی فاصلے پر کولی کے کھنڈرات نظر آنے لگے۔ رانی سریتا دیوی نے مجھے چندی گڑھ کے نواحات کی سیر بھی کرائی تھی۔ ویسے بھی چندی گڑھ بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ ان کھنڈرات کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بڑے تاریخی کھنڈرات ہیں اور چندی گڑھ کی تاریخ میں کولی کا ذکر بڑے پراسرار الفاظ میں آتا ہے۔ اس وقت وہی کھنڈرات میری نگاہوں کے سامنے آ گئے تھے اور لڑکی انہی کھنڈرات میں داخل ہو رہی تھی۔

میں محتاط انداز میں ان کھنڈرات تک پہنچ گیا اور اس کے بعد اندر داخل ہو گیا۔ درحقیقت اندر کا منظر بے حد بھیانک تھا۔ بات وہی ہو جاتی ہے، انسان خطرناک سے خطرناک ماحول سے گزرتے وقت گزر جاتا ہے تو بہت کچھ ذہن سے نکل جاتا ہے۔ ہشمان ذکری کی وہ رہائش گاہ جہاں اس نے چیتے پالے ہوئے تھے میرے لئے بڑی دہشت ناک تھی۔ لیکن اب اس وقت یہ کھنڈرات بے حد خوفناک لگ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی میں اس سے خوفناک جگہ پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ میرے قدم رک گئے اور میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑنے لگا۔

دفعتہً ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کھنک دار سکوں کو اچھالا ہو۔ ایک چھناکے کی آواز تھی۔ میں چونک پڑا اور نفسیاتی طور پر میرے قدم اسی آواز کی جانب اٹھ گئے۔ دو ہی باتیں ہوتی ہیں، اگر انسان بزدل ہوتا ہے تو شروع ہی سے محتاط رہتا ہے اور ایسے عمل سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے لئے کسی بھی شکل میں نقصان دہ ثابت ہو۔ اور اگر اس کے اندر تھوڑی بہت ہمت ہوتی ہے تو پھر بات کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ میں بھی اگر خوف محسوس کرتا تو اصولی طور پر مجھے لڑکی کے پیچھے آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اور جب میں یہاں تک آ گیا تھا تو پھر مجھے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں اس آواز کی جانب بڑھ گیا۔

چار پانچ سیڑھیاں تھیں اور اس کے بعد ایک وسیع و عریض چبوترہ۔ آگے دو در بنے ہوئے تھے۔ چمکدار سکوں کی چھنکار انہی دروں کی طرف سے آئی تھی۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھ کر ان دروں میں سے ایک در کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک دالان جیسی جگہ تھی اور تاریکی کے باوجود مدھم مدھم نظر آ رہی تھی۔ عین سامنے ایک روشن دروازہ کھلا ہوا تھا۔

دروازے کے دوسری جانب مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ حیرت ناک بات تھی۔ حالانکہ اندر سے دل بار بار کہہ رہا تھا کہ خاقان جمشیدی، کسی جال میں پھنسنے جا رہے ہو۔ تمہارے لئے ایک باقاعدہ جال بچھایا گیا ہے۔ لیکن وحشت کہہ رہی تھی کہ بے خطر آتش نمرود میں کود جایا جائے۔

چنانچہ میں آگے بڑھ کر اس در میں داخل ہو گیا۔ اب آواز دینے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو، رک جاؤ۔ اگر تم مجھے یہاں تک لانا چاہتی تھیں تو دیکھو میں بے خوف و خطر یہاں آ گیا ہوں۔ ڈرتا نہیں ہوں میں کسی بھی چیز سے۔ تم میرے سامنے آؤ۔ مجھے بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟ اگر مجھے کوئی جسمانی نقصان پہنچانا چاہتی ہو تو بھی میں حاضر ہوں، وجہ ضرور پوچھوں گا تم سے۔ اور اگر...... سنو سنو...... میری بات سنو...... میری بات تو سن لو۔ تمہیں مجھ سے مایوسی نہیں ہو گی۔ تم جو کچھ بھی چاہتی ہو میں اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

لیکن اب ہر آواز مفقود ہو گئی تھی۔ میں روشن در سے آگے بڑھا ہی تھا کہ لڑکھڑا گیا۔ وہ سیڑھیاں تھیں جو نیچے چلی گئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اندر مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ یہ روشنی کیسی ہے کیونکہ ان کھنڈرات میں، میں نے الیکٹرک لائن نہیں دیکھی تھی۔ میں سیڑھیاں اترتا چلا گیا اور پھر ایک وسیع و عریض تہہ خانے میں پہنچ گیا جہاں دیواروں پر مشعلیں روشن تھیں۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ تب میں نے وہاں ایک مسہری نما جگہ دیکھی۔ اس مسہری پر کوئی کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ خیر دل میں خوف و دہشت تو نہیں پیدا ہوا تھا لیکن ان پراسرار حالات نے تھوڑا سا الجھا ضرور دیا تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا اس جگہ کو دیکھتا رہا اور پھر میرے قدم آہستہ آہستہ اس جانب اٹھ گئے۔ لڑکی کا اب یہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ میرے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ ممکن ہے اب وہ لڑکی یہاں آ کر بستر پر لیٹ گئی ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھی بہرطور میرے ذہن میں اس کے لئے تجسس تھا اور میں اس کی اصلیت جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

"دیکھو...... تم جو کوئی بھی ہو میں ایک بار پھر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی بجائے مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہ بھی بتاؤ کہ مجھے یہاں تک

لانے سے تمہاری کیا غرض ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے تعاون کروں گا۔ بالکل بے فکر رہو، میں تم سے مکمل تعاون کروں گا۔"

اچانک ہی کمبل اوڑھنے والے وجود نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک نوجوان کا چہرہ ہے۔ اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا لیکن عجیب و غریب کیفیت کا شکار۔ اس کی حیران نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ غالباً میری آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ میں نے ایک بھرپور نگاہ سے اسے دیکھا اور اس کے بعد اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ مجھے تو اس لڑکی کی تلاش تھی۔

نوجوان کچھ دیر تک حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کیا بات ہے، اس وقت کیوں آئے ہو؟ کوئی نیا کھیل؟"

میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "اٹھ کر بیٹھنا پسند کرو گے دوست؟"

"دوست؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کیوں...... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"مذاق اڑا رہے ہو نا؟"

"مذاق؟"

"تو اور کیا۔ یہاں کوئی ایسا ہے جو مجھے دوست کہہ سکے۔"

"اوہو...... اس کا مطلب ہے کہ یہاں تمہارے بہت سے دشمن ہیں۔"

"تم ان سے اجنبیت کا اظہار کیسے کر رہے ہو؟"

"اس لئے کہ میں انہیں نہیں جانتا۔"

"کوئی نیا مذاق۔ چلو ٹھیک ہے، کیا حرج ہے۔ ہم تو ہیں ہی پچنگ بیگ۔ جس کا دل چاہے ہم پر مشق کر سکتا ہے۔"

"اٹھ کر بیٹھو۔" میں نے کہا اور اس نے کمبل اپنے بدن پر سے ہٹا دیا۔ پھر اس مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ قمیض پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اچھے تن و توش کا مالک تھا۔ اس نے اپنے پیروں کو دیکھا اور پھر میری طرف۔ اس کے بعد بولا۔

"جی فرمائیے؟ ویسے یہ بتانا پسند کریں گے آپ کہ وقت کیا ہوا ہے؟"

"صحیح وقت نہیں معلوم دوست۔ لیکن ایک ڈیڑھ کے قریب ہے۔"

"اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اس سے پہلے آپ لوگوں میں سے کوئی اس وقت نہیں آیا۔ کیا میرا آخری وقت آ پہنچا ہے؟"

"غلط فہمیوں کا شکار ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا اور نہ ہی میں جان بوجھ کر یہاں آیا ہوں بلکہ...... بلکہ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟ تابعدار ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"بتایا نہیں گیا؟"

"دیکھو مجھ سے تعاون کرو۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ بظاہر تو یوں لگ رہا ہے جیسے تم یہاں قیدی ہو۔"

"آپ اس پراسرار تہہ خانے میں کیسے تشریف لائے جس کے بارے میں کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح یہ کھلتا ہے کس طرح بند ہوتا ہے؟"

"کیا......؟"

میں اچھل پڑا۔ ایک دہشت کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہاں اس قید خانے میں مجھے قید کرنے کے لئے لایا گیا ہو۔ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اگر وہ سچ ہے تو اب تک تہہ خانے کا دروازہ بند ہو جانا چاہئے تھا۔ میں آندھی طوفان کی طرح واپس پلٹا اور اس کے بعد تہہ خانے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے یہ جائزہ لیا کہ دروازہ کیسے کھلتا ہے اور کیسے بند ہوتا ہے۔ کئی منٹ تک غور کرنے کے بعد مجھے ایک ایسی کیل نظر آئی جو دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی کیل ہو سکتی تھی۔ باہر ہی پتھر کے ایک حصے میں یہ کیل بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا تو دروازہ ایک سل کے ذریعے بند ہو گیا۔ کیل کو دبایا، دروازہ کھل گیا۔ اندر سے نہ یہ کھل سکتا تھا نہ بند ہو سکتا تھا۔ یہ تھی اس کی تکنیک۔ لیکن وہ لڑکی غائب تھی ابھی تک۔ نجانے کیوں اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ اگر مجھے بھی یہاں قید کیا جانا تھا تو اصولی طور پر یہ دروازہ باہر سے بند کر دینا چاہئے تھا۔ کوئی اور ہی چکر ہے۔ میں واپس پلٹا تو اس نوجوان کو میں نے اپنے بالکل پیچھے سیڑھی پر کھڑے ہوئے پایا۔ اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"میں زخمی ہوں۔ تم سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہت دن سے کھلا آسمان دیکھنے کی آرزو

ہے۔ مجھے بتاؤ کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے؟ ورنہ پھر سیدھی سیدھی بات کرو کہ تمہیں رانی سریتا نے یہاں بھیجا ہے۔“

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا۔ تہہ خانے سے باہر نکل جانا ہر حالت میں فائدہ مند ہے۔ صورتحال کچھ بھی ہو اس چوہے دان میں آ کر صورتحال خراب ہو سکتی ہے۔ وہ شخص بھی باہر آنے کا خواہش مند تھا۔ لحہ بھر سوچتے رہنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”آؤ.....“

اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہلکی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ سیڑھیاں طے کرنے لگا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ سوچ کر میں نے وہ کیل دبائی اور دروازہ بند ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔

”یہ دروازہ باہر ہی سے کھلتا ہے اور باہر ہی سے بند ہوتا ہے۔ ایک آدمی کبھی تہہ خانے میں نہیں آتا، دو ہوتے ہیں۔ ایک باہر کھڑا رہتا ہے دوسرا اندر آتا ہے۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرے ساتھ لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اب انہی کھنڈرات میں مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں رُک کر میں اس سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں۔ لڑکی کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں اس کی جسامت اور حلیے پر غور کرنے لگا۔ لیکن اب اتنا ماہر بھی نہیں تھا کہ سب کچھ معلوم کر لیتا۔

بہر حال کھنڈر کے ایک حصے میں پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”جانے کو تو ہم راتوں رات یہاں سے کافی دور نکل سکتے ہیں۔ کیا تم پیدل چلنے کی پوزیشن میں ہو؟“

”دیکھو، میں جانتا ہوں یہاں اس قید خانے میں مجھے صرف اسی لئے زندہ رکھا گیا ہے کہ وہ مجھ سے مختلف معاملات میں معلومات حاصل کرتی رہتی ہے ورنہ کبھی کا ختم کر دیا جاتا۔ میری عمر دیکھو...... میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میرے دونوں پیر زخمی کر دیئے گئے ہیں اور ان پر اکثر ضربیں لگائی جاتی رہتی ہیں تاکہ میں بھاگ نہ سکوں۔ لیکن میں چل سکتا ہوں۔ زندگی بچانے کے لئے میں چل سکتا ہوں۔“

نجانے کیوں اس شخص کی آواز میں مجھے ایک دردانگیز کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ صورتحال میں ایک دم تبدیلی رونما ہوئی تھی اور مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھوں جو ہردیپ سنگھ کی حیثیت تھی یا پھر موجودہ صورتحال کو بدل دوں؟ اب جو کچھ بھی ہو گا وہ دیکھا

جائے گا۔ میں کچھ نہ کچھ تو کرتا ہوں۔ اس نوجوان کے بارے میں، میں یہی کہہ سکتا تھا کہ اس تک میری رہنمائی کی گئی ہے۔ رہنمائی کرنے والا کوئی بھی ہو مجھے اس کی رہنمائی کو قبول کر لینا چاہئے۔ دل اندر سے یہی کہہ رہا تھا اور آج تک دل ہی کی تو بات مان کر ذلیل و خوار ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ ایک لحہ سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

”آؤ...... یہاں سے چلتے ہیں۔ یہ جگہ خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا میرے دوست!“ اس نے کہا اور میں اسے سہارا دے کر کھنڈرات سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑا۔

دو تین بار میں نے اس نوجوان کی شخصیت پر غور کیا۔ قید میں ہونے کی وجہ سے اس کا حلیہ بری طرح بگڑا ہوا تھا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب نوجوان ہے۔ شکل وصورت کا بھی بہت اچھا ہے، جسامت بھی بری نہیں ہے۔ پتہ نہیں کن حالات کا شکار ہوا اور رانی سریتا نے اس کے ساتھ یہ برا سلوک کیوں کیا تھا؟ رانی سریتا ویسے تو ایک پراسرار شخصیت تھی لیکن ایسی کسی بات کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ بہر حال ان کھنڈرات سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں اسے سہارا دیئے ہوئے آگے لے جاتا رہا۔ راستے میں، میں نے اس سے سوال کیا۔

”تمہارے دونوں ٹخنے زخمی ہیں؟“

”ہاں...... ایک مخصوص طریقے سے میرے ٹخنوں کی ہڈیاں اتار دی گئی ہیں۔ ان پر سوجن ہے۔ وہ ایک انتہائی کمینہ صفت بوڑھا ہے جو غالباً ہڈیوں کے جوڑوں کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ کمبخت پیروں کو پکڑ کر بار بار جھٹکے دیتا ہے اور تم یہ سمجھ لو کہ میں تکلیف کی وجہ سے موت کی آرزو کرنے لگتا ہوں۔“

میں نے اس کے پیروں پر سے کپڑا ہٹا کر اس کے ٹخنوں کو دیکھا، واقعی کافی سوجے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے لئے چلنا بہت مشکل کام ہے لیکن پھر بھی اس کو یہاں سے اتنی دور لے جانا چاہتا تھا کہ اگر وقت پڑنے پر ہماری تلاش بھی ہو تو رانی ہمیں تلاش نہ کر سکے۔ اب یہاں تک عمل کر تو ڈالا تھا چنانچہ اس عمل کو آگے بڑھانا ضروری تھا۔ نتیجہ اچھا نکلے یا برا۔ میں ہندوستان پہنچ گیا تھا اور رانی کے حوالے سے پہنچا تھا۔ رانی کے ذریعے مجھے بھرپور تحفظ حاصل ہو سکتا تھا لیکن نجانے رانی کا کھیل کیا تھا۔

بہر حال یہ بات طے تھی کہ مجھے کسی نے حویلی سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کیونکہ صدر

دروازے سے آیا ہی نہیں تھا۔ اگر صورتحال میری مرضی کے مطابق نہ ہوئی اور مجھے رانی ہی کا سہارا لینا پڑا تو پھر رانی سے کوئی بہانہ کر دوں گا۔ کوئی بھی کہانی سنائی جا سکتی ہے اسے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں کس طرح اس کے خلاف عمل کر رہا ہوں۔ ابھی تک میں نے ایسا کوئی تاثر اسے دیا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا مکمل احترام کرتا رہا تھا اور اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ میں مکمل طور پر اس کے حق میں ہوں اور کسی بھی طرح اس سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ پھر اچانک ہی آگے بڑھا اور میں نے اس شخص کے ہاتھ کو اپنی گردن میں ڈالا اور جھک کر اسے کندھے پر اٹھا لیا۔

''ارے ارے بھائی...... ارے یہ کیا کر رہے ہو، گر جاؤں گا۔''

''نہیں گرو گے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اپنے آپ کو آزمانا بھی ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے زندگی میں کبھی شدید جسمانی مشقت کی ضرورت بھی پیش آ جائے۔ کم از کم اپنے آپ کو آزمانا تو چاہئے۔ میں اسے لئے چلتا رہا۔ وہ میرا ممنون احسان ہو گیا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر اس نے عاجزی سے کہا۔

''بھائی مجھے اتار دو۔ اچھا خاصا وزنی آدمی ہوں، کہاں تک لے کر جاؤ گے؟''

''تھوڑا فاصلہ اور طے کر لیتے ہیں، پھر دیکھیں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ لیکن ایک بات اور ہے، انسان کی اگر نیت ٹھیک ہوتی ہے تو قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔ میں اسے لئے ہوئے مزید کچھ دور چلا تھا کہ مجھے ایک کچی چوڑی پگڈنڈی نظر آئی۔ پگڈنڈی تو خیر کوئی ایسی اہم چیز نہیں تھی لیکن عقب سے گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایک روشنی متحرک تھی۔ میں رک گیا۔

ماحول سے واقفیت بھی ضروری تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک چھکڑا گاڑی ہے جس میں دو بیل جتے ہوئے ہیں۔ سامنے کے حصے میں لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ بیلوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک انسان کا ہیولہ بھی نظر آ رہا تھا۔ میں اسے کندھے پر لئے ہوئے رُک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو قدرتی مدد تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو یا ڈھائی بجے ہوں گے۔ پتہ نہیں بیل گاڑی میں کون تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور تھوڑی دیر کے بعد بیل گاڑی ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ بیل گاڑی کے سامنے والے حصے پر بیٹھے ہوئے شخص نے بیلوں کے جوئے میں لٹکی ہوئی لالٹین اٹھائی اور اسے اونچی کر کے مجھے دیکھنے لگا۔

''ارے کا کرت ہو سسروا! مار ڈالن کا بیچارے کو؟'' کسی دیہاتی کی آواز ابھری۔

''نہیں بابا جی! میرا بھائی ہے۔ بے چارے کے ٹخنے اتر گئے ہیں، چل نہیں سکتا اس لئے کندھے پر لادے ہوئے ہیں۔''

''ارے بھیا تو بٹھاؤ نا۔ سسروا بیل گاڑی ما لے آؤ...... لے آؤ...... ارے بہت بڑھیا کیا، سیارام پہلوان کے سامنے ای کا لا کر۔ ٹھہرا چرا گاڑی روکت رہن۔ دیکھیں تو کیسے ٹخنوا اتر گئی رے۔''

وہ کوئی ہمدرد آدمی تھا۔ بیل گاڑی میں گھاس لدی ہوئی تھی اس لئے وہ اور زیادہ آرام دہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی مدد سے اس نوجوان کو گھاس پر لٹا دیا اور سیارام پہلوان گاڑی کے پچھلے حصے میں آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''لو لالٹین پکڑ لو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ لالٹین کی روشنی میں نوجوان کے پیر ٹٹولنے لگا نوجوان کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔

''ابھی ٹھیک کر دیت ہیں۔ ابھی جرا ہمت سے کام لو۔''

''مگر سیارام جی!'' میں نے کہا تو وہ حیرت سے بولا۔

''ارے تم ہم کا کیسے جانت رہو بھیا؟''

''بس سیارام جی! آپ نے ابھی کہا تھا نا سیارام پہلوان۔''

''ارے ہاں، ہم ہی سسروا پاگل ہیں۔ پر یہ ٹخنے تو بہت پہلے کے اترے ہوئے ہیں۔ سوجن یہی بتاتی ہے۔ پر تم چنتا مت کرو ابھی راستے ما ہی ٹھیک ہو جائی ہے۔ اے کون سی بڑی بات ہے، ہم تو ٹوٹی ہوئی ٹانگیں چپکا دیتے ہیں۔ دیکھو بھیا! یہ جو گھاس ہے نا اگر ہم تمہارے منہ میں بھر دیں تو کیسا رہے گا؟'' سیارام نے کہا۔ ایک ہلکی سی آواز آئی اور نوجوان کے حلق سے ایک دھاڑ نکل گئی۔

''ارے کاہے سور مچات ہو۔ بیل بیچارے ڈر جاویں گے۔'' سیارام نے کہا اور دوسری چٹاک کی آواز ابھری اور نوجوان پھر چیخا۔

''لو کھیل ختم ہوئی گیا۔ ایک منٹ۔'' سیارام نے کہا اور پھر جیب سے کوئی چھوٹی سی شیشی نکالی۔ ''اس میں سرسوں کا تیل ہے۔ ہلکے سے اس کی ٹانگوں پر مالش کر دو اور ذرا کپڑے سے ڈھک دو پھر دیکھو تماشہ۔ پر جا کہاں رہے ہو بھیا؟''

''برابر کے گاؤں۔''

''کویا؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''لو، تو ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔ یہ گھاس صبح کو پہنچانی ہے۔ ویسے اس کے بعد دن میں آرام کریں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیارام بیل گاڑی ہانکنے لگا تھا۔ میں اس شخص کے پیروں پر مالش کرنے لگا۔ وہ میرا بہت ممنون تھا۔ خاموشی سے اپنے پیروں کی مالش کراتا رہا اور اس کے بعد بولا۔

''تم جو کوئی بھی ہو دوست! ایک بات میں جانتا ہوں، ساری زندگی تمہارے اس احسان کا صلہ نہیں دے سکتا۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے میرے لئے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ تمہیں تعجب ہوگا کہ میں اپنے پیروں میں توانائی محسوس کر رہا ہوں۔ حالانکہ کافی دن سے اس قدر کرب اور اذیت کا شکار تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔''

''بس قدرت ہی رہنمائی کرتی ہے۔ تمہارا نام نہیں معلوم ہو سکا مجھے؟''

''ستنام سنگھ ہے میرا نام۔ بس یوں سمجھ لو کہ زندگی کے ایک بہت بڑے جال میں گرفتار ہو گیا۔ کیا بتاؤں تمہیں۔ ایک اچھے گھرانے کا فرد ہوں۔ دہلی میں میرا پورا خاندان موجود ہے اور میں اپنے سارے خاندان کا چہیتا ہوں۔ اس سے پہلے سینٹ لوسیا میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خیال تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس جاؤں گا۔ لیکن بس ایک چکر میں پڑ گیا۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ سینٹ لوسیا اور رانی سریتا دیوی، باتیں ایک دوسرے سے منتی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی دھن میں پھر بول پڑا۔ ''سینٹ لوسیا میں میرا ایک جگری دوست ہردیپ سنگھ میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس کا تعلق یہاں چندی گڑھ سے تھا۔ اچانک ہی اسے اس کی چچی کا پیغام ملا۔ یہ چندی گڑھ ہی میں رانی سریتا دیوی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی شخصیتوں میں سے ہے۔ وہ اپنی ماسی کے پیغام پر لندن جانے کو تیار ہوا اور اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں اس کے ساتھ چلوں تو اسے بڑی تقویت ہو جائے گی۔ اتنا ہی گہرا دوست تھا وہ میرا۔ میں اس کی اس فرمائش کو رد نہیں کر سکا اور پرنس ہردیپ کے ساتھ لندن روانہ ہو گیا۔ لندن میں رانی سریتا

دیوی کی ذاتی رہائش گاہ ایک فارم ہاؤس کی شکل میں موجود تھی۔ ہم دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے اور ہمارے پہنچنے کے تین دن کے بعد ہی سریتا دیوی بھی آ گئی۔ ہردیپ سنگھ نے مجھے زیادہ تفصیل نہیں بتائی لیکن مجھے پتہ چلا کہ سریتا دیوی اور ہردیپ سنگھ کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو گیا ہے۔ اور پھر، ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... سریتا نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ ہلاک کر دیا اس نے اسے۔ میری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ اس کا دست راست پرلوک ناتھ نامی ایک شیطان صفت آدمی ہے جس نے ہردیپ سنگھ کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ بس اس کے بعد بہت سے لوگوں نے مل کر مجھے قابو میں کر لیا اور نجانے کتنے دن بے ہوش رہا میں۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں چندی گڑھ میں تھا، یہاں اس جگہ جہاں سے تم نے مجھے آزاد کرایا۔ سریتا دیوی نے مجھے بتایا کہ چونکہ میں اس کے جرم کا عینی گواہ ہوں اس لئے وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ میں نے لاکھ اس سے کہا کہ میں کبھی کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کروں گا، مجھے سینٹ لوسیا بھجوا دے یا پھر دہلی پہنچا دے۔ لیکن ظاہر ہے اس نے ایسا نہیں کیا اور میں اس کے قبضے میں رہا۔ وہ مجھے آہستہ آہستہ ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ شاید میرے لئے بھی اس کے دل میں کوئی منصوبہ تھا۔ جانتے ہو وہ عورت کیا چیز ہے؟''

میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ سریتا دیوی اس قدر خطرناک عورت ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

''ہاں، آگے بولو ستنام سنگھ! آگے بولو۔''

''شیطان کا روپ ہے وہ دوسرا۔ ایک شیطانی عمل کر رہی ہے وہ اور اس نے ایک بڑا لمبا چکر چلا رکھا ہے۔ لندن میں رانا جسپال سنگھ نامی ایک شخص ہے، بڑا دولت مند آدمی ہے وہ۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ ہردیپ سنگھ کو اس کی بیٹی سے شادی کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہردیپ سنگھ، رانا جسپال کی بیٹی سے سگائی کرے اور اس کے بعد وہ ہردیپ سنگھ کو ہندوستان لے آئے۔ پھر یہاں رانا جسپال کی بیٹی کو بلائے۔ وہ اپنے شیطانی عمل کی تکمیل کے لئے ان دونوں کی قربانی دینا چاہتی تھی۔ کوئی ایسا ہی مسئلہ تھا جس میں اسے رانا جسپال کی بیٹی اور ہردیپ سنگھ کے خون کی بھینٹ دینا ضروری تھا۔

چنانچہ وہ اس منصوبے پر کام کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کسی طرح ہردیپ سنگھ کو اس بات کا علم ہو گیا اور ہردیپ سنگھ نے ضرور کوئی ایسی بات کی جس سے رانی کو خطرہ ہو گیا کہ ہردیپ سنگھ

اس کا سارا کھیل بگاڑ دے گا۔ چنانچہ اس نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ یہ ساری باتیں اس نے مجھے یہاں بتائیں۔ وہ اسی طرح کی عورت ہے۔ حالانکہ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مجھے تو اپنی ہی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے ایک آدمی مل گیا ہے جو ہردیپ سنگھ کی جگہ اس کا کردار ادا کرے گا۔ اور پھر وہ اپنے کام کی تکمیل کرے گی۔ میرے دوست! سنا ہے کہ وہ اس آدمی کو لے کر یہاں تک آ گئی ہے اور اب اس کے نام پر رانا جسپال کی بیٹی کو بلایا جائے گا اور وہ ان دونوں کی بلی دے دے گی۔ بعد میں وہ رانا جسپال سے بھی نمٹ لے گی ایسی ہی شاطر عورت ہے وہ۔ کیا سمجھے؟ وہ پراسرار عمل کر رہی ہے۔ یقین کرو وہ شیطان کا دوسرا روپ ہے۔ ایک جوڑے کی قربانی دے کر وہ مکمل شیطان بن جائے گی اور اپنا عمل کرے گی۔ وہ یہی کہتی ہے۔ اب یہ تو بھگوان ہی جانتا ہے کہ اصلیت کیا ہے اور کہاں تک اسے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن بھگوان بچائے اس سے۔ اگر تم مجھے وہاں سے نکال نہ لاتے دوست تو وہ مجھے وہیں اسی جگہ مار دیتی۔ بس ایک ذرا سی بات میرے کام آ گئی۔" وہ رُکا تو میں نے چونک کر پوچھا۔

"کون سی بات کام آ گئی؟"

"جب وہ مجھے اپنے اس کارنامے کے بارے میں بتا رہی تھی تو میں نے اس کا مذاق اڑا دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اس کا یہ شیطانی منصوبہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اس بات پر وہ بگڑ گئی اور کہنے لگی کہ وہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گی جب تک کہ اپنی آنکھوں سے اس کی طاقت کا کرشمہ نہ دیکھ لوں۔ اس طرح سے مجھے تھوڑی سی زندگی مل گئی تھی ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ مجھے زندہ رکھتی۔"

میں انتہائی خوف و دہشت کا سفر کر رہا تھا۔ یہ رانی سریتا جو شکل و صورت سے اتنی اچھی اور سلیقے کی نظر آتی ہے اندر سے اس قدر گھناؤنی اور خوفناک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے ذہن میں بے چاری روپالیہ کی تصویر بھی گھوم گئی۔ رانا جسپال ایک شریف آدمی تھا۔ اس نے بڑے پُرمحبت انداز میں اپنی بیٹی کو اس کا سسرال دے دیا تھا لیکن اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو جہاں بھیجنا چاہتا ہے وہ اس کا سسرال نہیں بلکہ ایک جہنم ہے۔ ایک ہولناک جہنم۔ میں نے ایک بار پھر ستنام سنگھ سے سوال کیا۔

"اور اس کا دست راست پرلوک ناتھ ہے؟"

"ہاں، وہ اس کا دست راست ہی ہے۔ بس کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔"

"ستنام سنگھ! تم یقین کرو میرے دوست، میں نے یہ سوچا تھا کہ تمہارے ساتھ یہاں سے کہیں دور نکل جاؤں گا۔ رانی پر لعنت بھیج دوں گا۔ لیکن تم نے جو کہانی مجھے سنائی ہے اس کے بعد تو مجھ پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں۔"

میرے ان الفاظ پر وہ مجھے چونک کر دیکھنے لگا پھر بولا۔ "بھائی، میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"میرا نام خاقان جمشیدی ہے۔ میں مسلمان ہوں اور وہ آدمی ہوں جسے سریتا دیوی نے ہردیپ سنگھ بنا دیا ہے۔ مجھے وہ لندن سے اپنے ساتھ لائی ہے اور میرے ہی ساتھ اس نے رانا جسپال کی بیٹی کی سگائی کی ہے۔"

میں نے دیکھا کہ ستنام سنگھ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ہے۔ وہ سکتے کے سے عالم میں میری صورت دیکھتا رہا اور پھر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"نہیں نہیں نہیں، تم تو میرے محسن ہو۔ تم تو بہت اچھے انسان ہو۔ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں، یہ سب کچھ تمہارے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو غلط ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں دونوں ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پھر وہ ہیجانی سی کیفیت میں بولا۔ "وہ شیطانی علوم سیکھ رہی ہے اور اس کے لئے نجانے کیا کیا کرتی رہی ہے۔ اسے ایک جوڑے کی قربانی دینی ہے جس کا اس نے کالے علم کے دیوی دیوتاؤں سے وعدہ کر رکھا ہے اور اس کے لئے اس نے پوری منصوبہ بندی کی ہے۔ رانا جسپال کی بیٹی اور ہردیپ سنگھ جسے اس نے اپنی بات نہ ماننے پر ہلاک کر دیا، اس کا شکار تھے۔ لیکن اب اس نے تمہیں اپنا نشانہ بنایا ہے۔ بچ جاؤ میرے بھائی۔ اگر ہو سکے تو بچا لو اپنے آپ کو۔ ورنہ وہ شیطان زادی تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ پورا منصوبہ ہے اس کے پاس۔ وہ تم دونوں کی قربانی دے گی۔ ابھی کچھ دن کے بعد وہ رانا جسپال کی بیٹی کو تمہارے ذریعے یہاں بلائے گی اور اس کے بعد وہ اپنا یہ کام مکمل کر لے گی۔"

"ہاں، جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے وہ واقعی بہت خطرناک ہے اور اب مجھے یقین بھی ہو رہا ہے کہ وہ ایسا کرے گی۔ اور میرے دوست، ان تمام باتوں کو جاننے کے بعد میری واپسی ضروری ہے۔ مجھے واپس رانی کے محل میں پہنچنا چاہئے۔ راتوں رات، ابھی اور اسی وقت۔ حالانکہ ہم اچھا خاصا فاصلہ طے کر چکے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں تیز رفتاری سے واپسی کا سفر طے کروں تو صبح کی روشنی ہونے سے پہلے واپس چلا جاؤں گا۔"

"اور میں؟"

"دیکھو، تم بابا سیا رام کے ساتھ کویا پہنچ جاؤ اور وہاں ایک لمحہ رکے بغیر کسی اور ذریعے سے آگے بڑھ جاؤ۔ تمہیں دہلی پہنچ جانا چاہئے۔ بولو، تم یہ کر سکو گے؟"

"اب کر سکتا ہوں۔ پہلے تو میرے اندر بالکل ہی ہمت نہیں تھی۔ لیکن......"

"بہر حال اپنی زندگی بچانے کی ذمہ داری اب تمہاری ہے۔ اگر زندہ رہا تو دہلی میں تم سے ملاقات کروں گا۔"

"میرا پتہ ذہن میں محفوظ کر لو، مجھے ضرور ملنا۔" ستنام سنگھ نے کہا۔

"ضرور ملوں گا تمہیں۔ سمجھے؟" میں نے کہا اور پھر بابا سیا رام سے کہا۔ "بابا جی! کاش آپ کو اس محبت اور تعاون کا صلہ دے سکتا۔ میں دعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتا۔ ذرا گاڑی روک دیں، مجھے واپس جانا ہے۔"

سیا رام بیچارے نے گاڑی روک دی۔ ستنام سنگھ کا پتہ نوٹ کر کے میں نیچے اتر گیا تھا اور اس کے بعد میں نے برق رفتاری سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ بیل گاڑی میں لگی ہوئی لالٹین کی روشنی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور میں برق رفتاری سے راستے طے کرتا ہوا ان حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کہانی بے شک نئی تھی لیکن میں یہ جانتا تھا کہ مجھے اس داستان سے گزرنا تھا۔ داستان میری زندگی کا ایک حصہ تھی۔ جب انسان کی زندگی میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن تقدیر سے تو اب منہ موڑا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جگہ جگہ میری تقدیر نے مجھے راستوں کا تعین کر کے دیا تھا اور میری کوئی تدبیر میرے کام نہیں آئی تھی۔ میں تقدیر ہی کے ساتھ ساتھ سفر کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ جہاں تک روپالیہ کا معاملہ تھا تو بیچاری کی زندگی بچانا میرا فرض تھا۔ رانی تو واقعی شیطان ہے۔ شیطان کیسے کیسے چہروں میں نمودار ہوتا ہے یہ بڑا تعجب خیز انکشاف تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سوچوں نے میرے راستے مختصر کر دیئے ہوں۔ صبح کی مدھم مدھم روشنی فضاؤں میں اترنے لگی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو چندی گڑھ میں رانی کی حویلی کے قریب پایا۔

پھر اس کے بعد میں نے وہی راستہ اختیار کیا جہاں سے نکل کر باہر گیا تھا۔ اور جب میں اپنی خوابگاہ میں پہنچا تو میرا بدن تھکن سے چور تھا۔ لیکن سوچوں کے دائرے پھیل رہے تھے، سکڑ رہے تھے۔ وہ پراسرار وجود کس کا تھا جس نے مجھے ستنام سنگھ کے راستے پر لگایا تھا؟

☆

دوسرے دن بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ رانی سریتا دیوی خود ہی میرے پاس آئی اور اس نے مجھے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جگایا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ رانی کا چہرہ دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔

"ارے ارے آپ...... آپ......"

"نہ...... نہ، گھبرا کیوں رہے ہو، کیا بات ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ خیریت، آپ میرے لئے پریشان کیوں ہو گئیں؟"

"اتنی دیر سوتے جو نہیں ہو۔" رانی نے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میری نگاہیں گھڑی کی جانب اٹھ گئیں۔

"ارے باپ رے، یہ کیا ہوا؟"

"کیوں، مجھے بتاؤ؟"

"نہیں، واقعی میں اتنی دیر کب سوتا ہوں؟"

"اسی لئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ جب ناشتے پر نہیں پہنچے تو میں نے باندیوں سے پوچھا کہ کہاں ہیں ہمارے ہردیپ کمار جی۔ انہوں نے بتایا کہ سو رہے ہیں۔"

"ہاں، رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور جب نیند آئی تو سپنوں نے گھیر لیا۔"

"ہاں، یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ واقعی یہ عمر سپنے دیکھنے کی ہی ہوتی ہے۔ اور پھر سپنوں میں اگر کسی حسین ساتھی کا تصور ہو تو پھر تو یہ سپنے امر ہو جاتے ہیں۔"

میں مدھم سا مسکرا دیا۔ رانی میری صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "بلا لوں روپالیہ کو؟" اس کے انداز میں کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بات کتنی اہم ہے۔

"نہیں آنٹی! اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"ہے نا، میں جانتی ہوں۔ مجھ سے چھپا رہے ہو؟"

"لیجئے، آپ سے بھلا کوئی بات چھپا سکتا ہوں؟"

''بتاؤ، اپنی آنٹی سے جو مانگو گے مل جائے گا۔ کیا سمجھے؟''

''وہ تو میں جانتا ہوں۔''

''اگر جانتے ہو تو پھر گریز کیوں کر رہے ہو؟ بلاتی ہوں تمہاری روپالیہ کو کچھ دن کے لئے۔ ابھی تو شادی میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ اگر تم اسی طرح سپنوں میں کھوئے رہے تو کام کے آدمی نہیں رہو گے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور رانی کو دیکھنے لگا۔

''چلو منہ ہاتھ دھولو، ناشتے کے کمرے میں آجاؤ۔ باقی باتیں وہیں کریں گے۔'' رانی کا موڈ بہت اچھا نظر آ رہا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ابھی اسے ستنام سنگھ کے فرار کی خبر نہیں ملی ہے۔ ظاہری بات ہے یہ خبر اس کے لئے بڑی خطرناک ہوگی اور پھر اس کا موڈ اچھا نہیں رہے گا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو میں اٹھ کر غسل خانے کی جانب چل پڑا۔

ستنام سنگھ ذہن میں آ رہا تھا۔ روپالیہ سے تو سچی بات ہے اب بھی مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اچھی شخصیت کی مالک تھی۔ چاہا جا سکتا تھا اسے اور کچھ نہیں تو کم از کم ماضی کی روشنی میں۔ جس طرح ایلس فیوری، اینہ اور دوسری خواتین میری زندگی میں شامل ہوگئی تھیں۔ روپالیہ تو ان میں ایک الگ اور نمایاں مقام رکھتی تھی۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں اب ان برائیوں سے بچنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور بات یہی ذہن میں تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے اپنا کوئی مناسب مقام تلاش کروں۔ ان ساری باتوں میں کچھ بھی نہیں رکھا۔

نجانے کتنی دیر تک یہ تمام باتیں سوچتا رہا۔ پھر ایک دم سے خیال آیا کہ رانی انتظار کر رہی ہوگی۔ چنانچہ میں پھرتی سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ناشتے کے کمرے میں رانی کے سامنے موجود تھا۔ رانی نے میرا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''اچھا اب یہ تو طے ہے کہ تم میرے دوست بھی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ روپالیہ کس حد تک یاد آ رہی ہے؟''

''اگر میں آپ سے ایک سوال کروں آنٹی! تو کیا آپ مجھے جواب دیں گی اس کا؟''

''کیوں نہیں دوں گی بھئی۔''

''آپ نے لندن میں مجھ سے ایک بات کہی تھی۔''

''بہت سی باتیں کہی تھیں میں نے لندن میں تم سے۔ کس بات کا تذکرہ کر رہے ہو؟''

''آپ نے کہا تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ یعنی مجھے ہردیپ سنگھ کا کردار عارضی طور پر ادا کرنا پڑے گا۔''

رانی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک اس کی آنکھیں خاموشی سے میرا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ اب اس کے چہرے کی وہ مسکراہٹ ختم ہوگئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اب میں بھی تم سے ایک سوال کروں؟''

''ضرور کیجئے۔''

''تم خود کیا چاہتے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں؟''

''میرا مطلب ہے تم خود کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے کہا نا بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا تم ہردیپ سنگھ بنے رہنا چاہتے ہو؟''

''میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو کچھ میں نہیں ہوں وہ تو ایک سچائی ہے۔''

''ہاں، بعض اوقات سچائی، سچائی نہیں رہتی۔ بلکہ جھوٹ کی طاقت زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے۔ ویسے تمہارا جھوٹ کی طاقت کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کبھی تجزیہ نہیں کیا میں نے۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔ میں جانتا تھا بلکہ ستنام سنگھ مجھے بتا چکا تھا کہ رانی گناہوں کی پجاری ہے اور جو گناہوں کے پجاری ہوتے ہیں ان کی نگاہوں میں سچ بنیاد نہیں ہوتا بلکہ ان کی بنیاد جھوٹ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر رانی سے میں اپنی سچائیوں کا اظہار کر دوں تو بات بگڑ سکتی تھی۔ وہ کچھ لمحے میری صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''دیکھو ہردیپ سنگھ! خاقان جمشیدی تو میں اب تمہیں کہہ ہی نہیں سکتی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ دنیا بہت مختصر سی جگہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہر انسان مر جاتا ہے، ہر انسان جتنی بھی زندگی وہ اس سنسار میں گزارتا ہے بس نجانے کیسے کیسے خیالات میں گزار لیتا ہے اور آخر کار اسے احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے ساتھ اس نے وہ انصاف نہیں کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ اس نے زندگی کے وہ مزے نہیں لوٹے جو اسے لوٹنے چاہئے تھے۔ تم ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو، نجانے کیسے کیسے افکار و خیالات تمہارے

دل میں ہوں گے۔ نجانے کس کس طرح تمہارے دین دھرم میں تمہیں سکھایا پڑھایا گیا ہو گا۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ آخر کار تم مر جاؤ گے خاقان جمشیدی! زندگی کی ان مختصر سی سانسوں سے کیوں نہ پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔ طاقتور بنو، طاقت حاصل کرو اور اس کے بعد جیسے بھی چاہو زندگی گزارو۔"

"ایک بات کہوں آپ سے آنٹی؟"

"ہاں کہو، آج دل کھول کر ساری باتیں کرو۔"

"آنٹی، آپ نے کبھی مجھ سے میرے بارے میں تفصیل نہیں پوچھی؟"

رانی سریتا دیوی کے چہرے سے یوں لگا جیسے واقعی اسے اس بات پر حیرت ہوئی ہو۔ وہ عجیب سے انداز میں میرا چہرہ دیکھتی رہی پھر بے اختیار مسکرا دی۔

"ہاں واقعی، پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا۔ اصل میں، میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ کچھ لوگ اپنی تفسیر آپ ہوتے ہیں، کھلی کتاب کی مانند، اپنے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیتے، بس آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتے ہیں۔ تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔ معمولی بات نہیں ہے کہ میں نے اپنے مقصد کے لئے تمہارا انتخاب کیا۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ تم خود اپنی سفارش بن گئے تھے۔ اور پھر ایک عارضی کام کی تکمیل میں نے اس طرح کی کہ تمہارے کردار کو مستقل کر دیا۔ اب اگر کبھی تقدیر کا مارا ہردیپ آ بھی جائے تو میں اسے ہردیپ تسلیم نہیں کروں گی۔ اور یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جان چکے ہو کہ اگر میں اسے ہردیپ تسلیم نہ کروں تو پھر دنیا کا کوئی شخص بھی اسے ہردیپ ثابت نہیں کر سکتا۔ کم از کم اتنی قوت رکھتی ہوں میں اپنے اندر۔"

میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ میں نے سوچا کہ آنٹی! ہردیپ اب واپس کہاں سے آئے گا؟ وہ کہنے لگی۔

"پھر بھی خاقان! تم اگر چاہو تو مجھے اپنے بارے میں بتا دو۔"

"کوئی خاص تفصیل نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہندوستان میرے لئے ایک قید خانہ ہے اور اگر مجھے میری اصل شخصیت سے جان لیا جائے تو برٹش حکومت مجھے چھوڑے گی نہیں۔"

"اور میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

"ہاں، آپ نے یہ کہا تھا۔"

"تم ملک سے باہر کس طرح نکلے تھے؟"

"بس یوں سمجھئے پولیس میرے پیچھے تھی۔ اصل میں میرا ایک بدترین دشمن ہے جس نے مجھے ان راستوں کا راہی بنا دیا ہے۔ میں اس کے پیچھے باہر نکل گیا تھا اور نجانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہوا لندن تک پہنچا تھا۔"

"تب تو مجھے تمہارے اس دشمن کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے تمہیں مجھ تک پہنچایا۔" رانی نے اس طرح بات ٹال دی جیسے اسے میری شخصیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہو۔ وہ میرے ماضی کے بارے میں بہت زیادہ جاننا بھی نہ چاہتی ہو۔ شاید اس کی وجہ پہلے میری سمجھ میں نہ آتی لیکن اب سب کچھ سمجھ گیا تھا میں۔ اس نوجوان نے مجھے ساری تفصیل بتا دی تھی اور مجھے پتہ چل گیا تھا کہ رانی کیا چیز ہے۔

بہرحال انتہائی خطرناک عورت تھی یہ۔ ستنام سنگھ کے بارے میں ابھی اسے پتہ نہیں چلا تھا ورنہ یقیناً اس کے اندر پریشانی کی جھلکیاں ہوتیں۔ بہت دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی، کوئی اہم اور خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس نے مسکراتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا۔ "میں تمہارے خوابوں کو اس طرح تشنہ نہیں چھوڑوں گی۔ آؤ، رانا جسپال سے بات کرتے ہیں۔"

"رانی صاحبہ، آپ......"

"کیا رانی رانی لگا رکھی ہے۔ ایک دم پٹری سے اتر جاتے ہو۔"

"معافی چاہتا ہوں۔"

"آؤ......" اور اس کے بعد وہ ٹیلی فون تک پہنچ گئی۔ میرے سامنے اس نے ٹیلی فون کے نمبر ملائے اور بولی۔

"رانا جسپال سے بات کراؤ، ہندوستان سے سریتا دیوی بول رہی ہوں۔"

کچھ لمحوں کے بعد رانا جسپال لائن پر پہنچ گیا۔ سریتا نے کہا۔ "رانا صاحب، سریتا۔ جی جی...... ہاں جی، بالکل ٹھیک ہوں۔ ہردیپ بھی ٹھیک ہے...... لیکن بس...... نام کے ٹھیک ...... ارے نہیں نہیں گھبرانے کی بات نہیں ہے...... اصل میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خاص طور سے جب ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں تو بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہردیپ سنگھ جی ہیں، راتوں کو کم سونے لگے ہیں۔ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں روپالیہ کو۔" رانی نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔

''ہاں وہ بھی تو انسان ہے۔ وہ بھی یاد کرتی ہے؟...... اچھا اچھا...... سونا بیٹھنا چھوڑ دیا ہے؟ بھئی کمال ہے...... ہاں ہاں...... نہیں، حل تو ہر چیز کا ہوتا ہے رانا صاحب! آپ ایک کام کریں، روپالیہ کو تھوڑے دنوں کے لئے یہاں ہندوستان بھیج دیں چندی گڑھ میرے پاس...... آنٹی ہوں اس کی۔ اور پھر آنا تو اسے یہیں ہے نا...... آپ تو بڑے دل کے مالک ہیں۔ اوہو، اچھا آ جائیے، آ جائیے آپ بھی۔ ذرا تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی...... ہاں ہاں...... میں نے اسی لئے فون کیا تھا آپ کو...... اچھا ٹھیک...... کب پہنچ رہے ہیں؟ ہاں بھئی، آپ کے لئے کیا مشکل ہے...... ظاہر سی بات ہے لندن سے ہندوستان کا فاصلہ ہی کتنا ہے...... بڑی خوشی کی خبر سنائی ہے آپ نے رانا صاحب۔ آ جائیے، آ جائیے۔ یہ چھوٹی سی جھونپڑی آپ کے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔'' رانی پھر ہنسی اور بولی۔

''تو پھر میں انتظار کروں گی آپ کا...... جی سر جی! ہم آپ کو لینے دہلی پہنچیں گے...... ایسی کیا بات ہے...... جی بالکل، بالکل...... اوکے۔'' رانی نے فون بند کر دیا پھر مسکرا کر مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

''ایک ہفتے کے اندر اندر رانا صاحب آ رہے ہیں۔''

میں ایک سنسنی سی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ رانی کہنے لگی۔

''میں نے تو کہا تھا کہ وہ صرف روپالیہ کو بھیج دیں۔ لیکن وہ خود بھی آ رہے ہیں۔ آنے دو، کیا فرق پڑتا ہے۔ اوکے۔''

اسی وقت ایک ملازم اندر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ''پیتم سنگھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں مہارانی جی!''

''کہاں ہے پیتم؟''

''باہر موجود ہیں۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' رانی نے کہا اور اس کے بعد بولی۔ ''آرام کرو پرنس! اور خوش ہو جاؤ کہ تمہاری پریمیکا آ رہی ہے۔ خوب سیر و سیاحت کرنا چندی گڑھ کی۔ اب تو تم نے چندی گڑھ دیکھ لیا ہے۔''

''جی۔'' میں نے کہا اور رانی باہر نکل گئی۔

میں دیر تک وہیں بیٹھا سوچوں میں ڈوبا رہا تھا۔ تو رانا جسپال اور روپالیہ آ رہے ہیں۔

گویا رانی کی دوسری کوشش کارگر ہو رہی ہے۔

بہرحال مجھے اپنا کردار بھی دیکھنا تھا ان تمام معاملات میں۔ میں نجانے کب تک سوچوں میں ڈوبا رہا تھا اور میری عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ رانی گئی تو گھنٹوں واپس نہ آئی۔ البتہ شام ڈھلے وہ پہنچی تھی۔ میں نے ایک نگاہ میں محسوس کر لیا کہ اس کے چہرے پر پریشانی ہے۔ میں اس کی تاک میں لگ گیا۔ ایک ایسی جگہ دیکھ لی تھی میں نے جہاں سے میں رانی کی اس خواب گاہ میں جھانک بھی سکتا تھا اور وہاں کی باتیں بھی سن سکتا تھا۔ خوابگاہ کے دوسرے سرے پر ایک پتلی گلی تھی، اس پتلی گلی کو بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن یہاں ایک کھڑکی تھی جہاں سے رانی کی خوابگاہ میں جھانکا جا سکتا تھا اور وہاں کی باتیں بھی سنی جا سکتی تھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں شدید تجسس پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو اس کھڑکی تک لے جانے سے نہ روک سکا اور میں نے کھڑکی سے کان لگا دیئے۔ رانی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''کتے کے بچے! اگر وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو میں تم سب کو زندہ جلا دوں گی۔ بات وہی ہوتی ہے، اگر سختی نہ کی جائے تو کوئی کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں کہاں مر گئے تھے تم لوگ؟ کون تھا جس نے باہر سے دروازہ کھولا تھا؟ تم سو گئے ہو گے گہری نیند۔ کوئی آیا اور دروازہ کھول کر اسے لے گیا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں تم ہی میں سے کسی نے اس سے ساز باز کی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، مجھے پتہ نہیں چلے گا؟ فنا کر دوں گی میں تمہیں۔ تلاش کرو کتو، اُس کو تلاش کرو۔ اسے زندہ نہیں بچنا چاہئے ورنہ وہ ہمارے لئے موت کا پھندہ بن جائے گا۔ سمجھے؟ بس میں اب تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتی ہوں کہ تم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ نہیں...... زندہ...... زندہ بالکل۔ تمہاری کسی بات پر میں بھروسہ نہیں کروں گی۔ اب سمجھ گئے؟'' رانی نے ٹیلی فون دھاڑ سے کریڈل پر مار دیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گویا رانی کو اب پتہ چلا ہے کہ ستنام اس کے قبضے سے نکل گیا ہے۔

بہرحال وہ بیچارہ مجھے جو کچھ بتا کر چلا گیا تھا اس سے استفادہ کرنا تھا، باقی اور کوئی بات نہیں تھی۔ غرض یہ کہ میں وہاں سے چلا آیا۔ لیکن رانی کی مصروفیات کے بارے میں میرے اندر ایک تجسس پیدا ہو گیا تھا اور یہ جگہ بڑی اچھی دستیاب ہوئی تھی مجھے۔ میں اب رانا جسپال کی آمد کا انتظار کر رہا تھا اور میرے ذہن میں منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔ رانا

جسپال کو ساری حقیقتیں بتانا ضروری تھا اور اس بیچارے کو اس مصیبت سے نکالنا بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔

بہرحال کوئی تیسرے دن کی بات ہے، رانی کو شاید ابھی تک کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں ملی تھی۔ ظاہر ہے ستنام سنگھ ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد اس کے قبضے میں نہیں آ سکتا تھا۔ رانی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

اور پھر ایک اور خوفناک واقعہ ہوگیا۔ رانی اپنی گاڑی میں کہیں گئی تھی۔ ایک گاڑی میں وہ تھی اور دو اس کے ساتھ تھیں۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا، پھر آتے ہوئے بھی دیکھا۔ تین گھنٹے کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ کچھ مہمان آئے تھے اس کے ساتھ۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے بہت دور سے دیکھا، وہ گاڑی سے اترے تھے۔ دو چہرے تو اجنبی تھے لیکن باقی دو چہرے دیکھ کر میرے سارے وجود پر لرزشیں طاری ہوگئی تھیں۔ یہ خوف کی لرزشیں نہیں تھیں بلکہ میرے اندر شدید جوش بھر گیا تھا۔ ان میں سے ایک ہیگ تھا، دوسرا ہشمان ذکری...... باقی بھی دو مصری نسل کے لگتے تھے۔ ہوسکتا ہے ان کے باڈی گارڈ ہوں یا ہوسکتا ہے ساتھی ہی ہوں۔

ہیگ اور یہاں؟...... اور ہشمان ذکری بھی یہاں موجود ہے...... کیا قصہ ہے یہ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کو دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی تھی میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ان لوگوں کو معزز مہمانوں کی طرح حویلی میں لایا گیا تھا اور رانی سریتا دیوی ان کی بڑی خاطر مدارات کر رہی تھی۔ لیکن میرے اندر اب پارہ بھر گیا تھا۔ ہیگ میری زندگی کا سب سے خوفناک دشمن جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا تھا، جس کی وجہ سے ایسے نقصانات اٹھانا پڑے تھے جن کا ازالہ اس زندگی میں تو ممکن نہیں تھا، وہ ہیگ ایک بار پھر میری رینج میں آ گیا تھا لیکن اب اسے میرے ہاتھ سے بچنا نہیں چاہئے۔ اب بھی اگر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر زندگی بھر میں اس کا پتہ نہیں پا سکوں گا۔ تقدیر مجھے بار بار موقع دے رہی تھی۔ آہ...... تقدیر مجھے بار بار موقع دے رہی تھی مجھے کچھ کر لینا چاہئے۔ کچھ کر لینا چاہئے مجھے۔ ہیگ کے رانی سریتا سے کیا تعلقات تھے؟ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

اور اس کے بعد میں اپنی رہائش گاہ پر آ گیا۔ بدن اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے ملیریا ہو جاتا ہے۔ پورے وجود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ہیگ کچھ فاصلے پر موجود ہے اور یہ

بات طے ہے کہ رانی سریتا نے مجھے جو روپ دے رکھا ہے اس میں وہ میری ملاقات ہیگ سے ضرور کرائے گی اور ہیگ مجھے پہچان جائے گا۔ کیا کرنا چاہئے مجھے؟ کیا کرنا چاہئے؟

بہت دیر تک میں سوچتا رہا لیکن کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ سکی تھی۔ ایک بار پھر باہر نکل گیا اور یہ جائزہ لینے لگا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ میں بہت سی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہیگ اور ہشمان ذکری کی ہر طرح سے خاطر مدارت کی جا رہی تھی لیکن ابھی تک رانی نے مجھے طلب نہیں کیا تھا۔ مگر میں منتظر تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں واپس اپنی رہائش گاہ میں پہنچا اور پھر کافی عرصے کے بعد، بہت عرصے کے بعد میرے دماغ میں ایک خوشبو چکرائی...... چمپا کے پھولوں کی خوشبو......!

وہ پراسرار خوشبو جو بھوج پتر سے آتی تھی۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ یہ کچھ پراسرار قوتیں میرے وجود سے چمٹی ہوئی ہیں۔ مجھے بدنصیبی سے ان سے منسلک ہونا پڑا ہے۔ میری نگاہیں بھٹکتی رہیں اور پھر میں بھوج پتر کو تلاش کرتا ہوا ایک الماری تک پہنچا لیکن بھوج پتر کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ البتہ الماری میں ایک ریوالور رکھا ہوا تھا۔ میں پورے دعوے سے کہتا ہوں کہ اس سے پہلے میں نے یہ ریوالور نہیں دیکھا تھا۔ ریوالور لوڈ تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور دفعتہً ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال سرایت کر گیا...... یہ ریوالور میرے ہی لئے ہے اور اس وقت واقعی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ایک سیدھا سادھا سا کام کیا جائے اور وہ کام یہ ہے کہ ہیگ کو دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ بس اب کوئی رسک لینا مناسب نہیں ہے۔ میں یہی کروں گا۔ مجھے یہی کرنا چاہئے۔ اور میں نے ریوالور اٹھا کر اپنے لباس میں پوشیدہ کرلیا۔

ایک عجیب سا سکون ملا تھا مجھے۔ ایک گہرا سکون دل و دماغ پر طاری ہو گیا تھا۔ آہ...... واقعی زندگی کی سب سے خوشگوار گھڑی آ رہی ہے یعنی ہیگ کی موت! اور وہ بھی میرے ہاتھوں۔ رانی اگر اس کے بعد میرے خلاف کوئی عمل کرتی ہے تو بھی دیکھا جائے گا۔ حالانکہ اصولی طور پر اس وقت اسے میری ضرورت تھی۔ کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک کہ وہ ستنام سنگھ کے بیان کے مطابق قربانی کی رسم پوری نہیں کر لیتی۔ اگر میں نے ہیگ کو ہلاک کر بھی دیا تو وہ میرا بچاؤ کرے گی۔ کیونکہ اسے میری ضرورت ہے، وہ قربانی کی رسم پوری کئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ یہ بھی فیصلہ کیا میں نے کہ خالی ہیگ ہی سے کام نہیں چلے گا، ہشمان ذکری اور اگر وہ دونوں افراد ہوئے تو انہیں بھی ہلاک کر دیا

جائے۔ یہ بہت ضروری تھا۔

پھر وہ وقت آ گیا جب مجھے اپنا کام سرانجام دینا تھا۔ رانی نے مجھے ڈنر کے لئے طلب کیا تھا اور میں اس کے لئے تیار ہو کر چل پڑا۔ ریوالور میرے لباس میں پوشیدہ تھا۔ جب میں ڈنر روم میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہاں رانی سریتا دیوی کے علاوہ صرف ہشمان ذکری اور ہیگ موجود تھے۔ ملازم کھانا سرو کر چکے تھے، غالباً میرا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ لباس وغیرہ تبدیل کرنے میں مجھے دیر ہو گئی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو ہیگ اور ہشمان ذکری نے مجھے مسکرا کر دیکھا لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان کے چہرے آگ کی طرح سرخ ہو گئے۔ دونوں ہی مضطربانہ انداز میں کرسیاں کھسکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ رانی ان سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ ان دونوں کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' ہیگ نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ جانتے ہیں انہیں؟ یہ پرنس ہردیپ سنگھ ہیں۔'' رانی نے متجسس نگاہوں سے ہیگ اور ہشمان ذکری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ بدبخت آپ تک پہنچ گیا؟ یہ پرنس نہیں ہے، اس کا نام خاقان جمشیدی ہے۔ بہت بڑا شاطر، بہت ہی خطرناک آدمی۔ آپ اسے ہردیپ سنگھ کہہ رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے کوئی لمبا چکر چلا کر آپ تک رسائی حاصل کر لی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں مسٹر ہیگ! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''اوہ...... اس سے بچنے کی کوشش کیجئے۔ اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔ یہ ہمارا شکار ہے۔ آپ نہیں جانتیں رانی صاحبہ! اس کی ذات سے ایک بہت بڑی کہانی وابستہ ہے۔ میں آپ کو مختصر الفاظ میں بتاتا ہوں۔ ایک ایسے عظیم الشان خزانے کا راز جانتا ہے یہ جو اگر اس دنیا میں کسی کو حاصل ہو جائے تو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ دنیا کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ اتنی دولت حاصل کر سکتا ہے وہ کہ انسانی تصور میں بھی نہ آئے۔''

سریتا دیوی نے میرا چہرہ دیکھا، میں مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آنٹی! وہ کہانی پوچھئے اس بدمعاش سے۔ میں نے آپ کو اپنے ایک دشمن کے بارے میں بتایا تھا جس کے پیچھے لگ کر میں پہلے اسکندریہ پھر نجانے کہاں کہاں اور آخر میں لندن پہنچا تھا۔ آنٹی!

یہی وہ دشمن ہے میرا جس کی موت میری زندگی کا سب سے پہلا مقصد ہے۔ آنٹی! ذرا پوچھئے تو سہی اس سے وہ کہانی اور اس خزانے کے بارے میں جس کا یہ تذکرہ کرتا ہے۔ یہ جاہل آدمی، یہ پاگل دیوانہ اسی غلط فہمی کا شکار ہے کہ میں ایسے کسی خزانے کے بارے میں جانتا ہوں۔''

''غلط فہمی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی لوح کی کہانی ہے جو......''

''ہیگ! میں معذرت چاہتا ہوں۔ تیرے اور میرے درمیان بہت سے قصے آئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ میں تجھے اس دنیا سے روانہ کر دوں۔ کیا آپ یہ جانتی ہیں آنٹی! کہ یہ حرام زادہ ہپناٹزم کا ماہر ہے۔ یہ لوگوں کو اپنے ٹرانس میں لے لیتا ہے اور اس نے مجھے بھی اپنے ٹرانس میں لے کر میری زندگی کو میرے لئے ایک زخم بنا دیا تھا۔ میں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا آنٹی! کہ اس نے ایک انگریز افسر کو میرے ہاتھوں سے ختم کرا دیا اور اس کے بعد مجھے ہندوستان چھوڑنا پڑا، اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ یہ ساری باتیں میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ جس خزانے کا یہ تذکرہ کرتا ہے وہ اس کی جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر مجھے ایسے کسی خزانے کا راز پتہ ہوتا تو آپ کا کیا خیال ہے میں یوں وقت ضائع کرتا پھرتا؟ آنٹی! یہ آپ کے مہمان ہیں، لیکن یوں سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کا اولین مقصد ان کی موت ہے۔ معافی چاہتا ہوں آنٹی! اگر اس سے آپ کا کوئی پروگرام متاثر ہوتا ہے یا آپ کو اس کی وجہ سے کوئی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے تو میں زندگی بھر اس پر افسردہ اور شرمندہ رہوں گا۔ لیکن ان کی موت......''

''بکواس مت کر کتے! تیرے اندر یہ سکت، یہ ہمت نہیں ہے۔''

لیکن میرے لئے اب اس کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا کہ اپنا کام جتنی جلدی نمٹا لوں وہی میرے لئے بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ریوالور نکالا اور اس کے بعد میں نے پورا ریوالور ان دونوں پر خالی کر دیا...... ہیگ اور ہشمان ذکری کے بھیجے کے چیتھڑے اڑ گئے تھے اور ان کے سینوں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ سریتا دیوی وحشت زدہ انداز میں ایک طرف ہٹ کر دیوار سے جا لگی تھی۔ میں نے اپنی وحشت اور دیوانگی کو اس وقت نہیں روکا تھا۔ ہر نتیجے سے بے نیاز ہو کر میں نے یہ کارروائی کی تھی۔ ان کے جسم صرف چند لمحوں کے لئے تڑپے اور اس کے بعد وہ کھانے کی میز پر ہی اوندھے ہو گئے۔ ہر طرف خون ہی خون بکھر گیا تھا۔ لیکن جب میں نے سریتا دیوی کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے وہ چہرہ

نہ تو اس قدر خوفزدہ نظر آیا نہ مضطرب۔ وہ خاموش نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''ہو گیا کام تمہارا، چلو آؤ...... میرے ساتھ آ جاؤ۔ یار، جو کچھ کرنا تھا کھانے کے بعد کر لیتے۔ اب یہ منظر دیکھنے کے بعد تو بھوک بھی نہیں لگے گی۔''

میں نے حیرانی سے سریتا دیوی کو دیکھا تو سریتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات بتاؤں تمہیں...... بڑی مزے کی بات ہے۔''

مجھے سریتا کی اس کیفیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ''میں خود بھی ان دونوں کی موت چاہتی تھی۔ بہت عرصے سے یہ دونوں میری ہٹ لسٹ پر تھے۔ ان کا خاتمہ میرے ایک بہت بڑے مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ان کی موت ہی انہیں یہاں لائی تھی۔ تم نے ذرا انداز بدل دیا۔ چلو اچھا ہوا تمہارے دل کو بھی تسکین ہو گئی کہ تم نے اپنے دشمن کو ختم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ان کی موت لکھی ہوئی تھی۔ مگر کیا ہی عجیب بات ہے جو کھانا ان کی پلیٹوں میں ہے نا، یہ زہریلا ہے۔ ان پلیٹوں میں زہر کا پینٹ کر دیا گیا تھا اور اس میں جو کھانا پڑا ہوا ہے وہ اس قدر زہریلا ہے کہ ایک گھوڑا بھی باآسانی مر سکتا ہے اگر اس میں سے چند لقمے لے لے۔ سمجھ رہے ہو؟ میں بھی وہی کام کرنا چاہتی تھی جو تم نے کیا ہے۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ کھانا بھی گندا ہو گیا اور قالین بھی۔ چلو خیر کوئی بات نہیں۔ میرے ملازم باہر تیار کھڑے ہوئے ہیں کہ ان کی لاشیں ٹھکانے لگا دیں۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ ان دونوں کا مہمان خانے میں خاتمہ کر دیا گیا ہے اور ان چاروں کی لاشوں کو دفن کرنے کے لئے حویلی کے ایک گوشے میں ہی بندوبست بھی کر لیا گیا ہے۔ تم ایسا کرو اپنی آرام گاہ میں جاؤ اور میری واپسی کا انتظار کرو۔ میں یہ تمام کام اپنی نگرانی میں کرا کے آتی ہوں۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہیگ اور ہشمان ذکری کو قتل کر کے جو ایک دلی سکون اور خوشی حاصل ہوئی تھی، رانی سریتا دیوی کے اس تعاون سے دوبالا ہو گئی تھی۔ میں نے عجیب سی نگاہوں سے دونوں کی لاشیں دیکھیں اور اس کے بعد رانی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

سریتا دیوی کا یہ انداز میرے لئے انتہائی حیران کن تھا۔ لیکن وہ واقعی ایک خطرناک عورت تھی۔ انتہائی خوفناک عورت۔ جس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اندر سے کیا ہے۔ بہرحال میں باہر نکل آیا اور سریتا باہر کھڑے ہوئے ان چار افراد کی طرف

بڑھ گئی جو یقیناً وہی ملازم تھے جنہیں یہ لاشیں ٹھکانے لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ میرا وہاں رُکنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن جن احساسات کے ساتھ میں اپنے کمرے میں آیا وہ بڑے عجیب اور سنسنی خیز تھے۔

سریتا کے بارے میں تو یہ پتہ چل چکا تھا کہ وہ انتہائی بھیانک عورت ہے۔ ستنام نے مجھے اس کے بارے میں پوری حقیقت بتا دی تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہیگ اور ہشمان ذکری کو کیوں قتل کرنا چاہتی تھی؟ کس حیثیت سے وہ یہاں آئے تھے؟ ان کی قومیت کیا لکھی گئی تھی؟ ظاہر ہے اس طرح کے لوگ اس قدر بے حیثیت نہیں ہوتے کہ ان کے سفارت خانوں کو ان کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوں۔ کیا وہ چھپ چھپا کر یہاں آئے تھے؟

جہاں تک ہیگ کا تعلق اس لوح سے تھا تو یقینی طور پر اس عورت کو اس لوح کے بارے میں نہیں معلوم تھا کیونکہ جس انداز میں ہیگ نے اس سے خزانے کا تذکرہ کیا تھا اس میں لوح کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ بہرحال ہیگ مارا گیا۔ وہ شخص جس کے لئے میں نے ایک خوفناک سمندری سفر کیا تھا اور اس کے بعد انتہائی وحشت ناک مشکلات میں گھر گیا تھا۔ وہ اس وقت تو میرے ہاتھوں نہیں مارا گیا تھا لیکن آج میری وہ خواہش بھی پوری ہو گئی تھی۔

دفعتہً ہی مجھے ایک اور خیال آیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ سریتا نے میری وحشت روا کرنے کے لئے اس طرح کے برتاؤ کا مظاہرہ کیا ہو اور اب وہ میرے لئے کوئی چوہے دان تیار کر رہی ہو۔ یہ خیال کرتے ہی میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر برق رفتاری سے باہر نکل آیا۔ میں نے چھپ چھپا کر سریتا دیوی کو تلاش کر ہی لیا۔ اس کے چاروں ساتھی ان لاشوں کو لے کر حویلی کے ایک ویران گوشے کی جانب جا رہے تھے۔ اور پھر میں نے ان کا تعاقب کر کے وہ جگہ بھی دیکھ لی جہاں واقعی ایک بڑا سا گڑھا تیار کیا گیا تھا۔ ان لاشوں کو ان گڑھوں میں ڈال دیا گیا۔ دو لاشیں اور بھی تھیں۔ سریتا دیوی نے اپنی اس آرام گاہ میں بڑے بھیانک انتظامات کر رکھے تھے۔ لیکن یہ عورت کیا ہے اور اس کے پُراسرار علوم کی کہانی کیا ہے؟ یہ بہت سی باتیں میرے دل و دماغ میں ہلچل مچا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس عورت سے صحیح طور پر مقابلہ نہ کر سکوں اور اسی کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار جاؤں۔ پھر ایک اندازِ مستانہ سے میں نے سوچا کہ

زندگی تو ہوتی ہی ہارنے کے لئے ہے۔ کہیں اور کسی کے ہاتھوں مارا جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک اتنی بڑی خواہش پوری ہو گئی تھی جو اب خواب ہی بن کر رہ گئی تھی۔ بات وہی وقت کی ہوتی ہے۔ ایک عرصہ ہو گیا، ایک دنیا گزار لی اور ہیگ ہمیشہ بچتا رہا۔ لیکن تقدیر نے یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ ہشمان ذکری گیہوں کے ساتھ گھن کی حیثیت سے پس گیا تھا لیکن وہ بھی کم خطرناک آدمی نہیں تھا۔ مجھے اس کی وہ پراسرار حویلی یاد تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ ایمنہ اسی کی وجہ سے زندگی ہاری تھی۔

☆

رانی سریتا دیوی دوسرے دن مجھے بالکل دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ تین چار دن بعد میرے ذہن میں ستنام سنگھ کا خیال آیا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ رانی ستنام سنگھ ہی کے لئے پریشان ہو گی۔ ویسے واقعی خطرناک عورت تھی۔ ہیگ اور ہشمان ذکری کے علاوہ اس کے دو ساتھی یعنی چار افراد کی لاشوں کو اس طرح غائب کر دیا گیا تھا کہ ان کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ اس صورتحال کو بھی رانی سنبھال رہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ہیگ کسی ملک کے سفارت خانے کے تحت یہاں آیا ہو۔ لیکن بہرحال رانی کے وسائل خاصے زیادہ اور بہترین معلوم ہوتے تھے۔ پتہ نہیں وہ خود ہیگ کو کیوں قتل کرنا چاہتی تھی۔ ویسے میں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ بھی بڑا سنسنی خیز اور انتہائی جذباتی نوعیت کا حامل تھا۔ لیکن حیران کن بات وہ ریوالور تھا مجھے مل گیا تھا۔ خود رانی نے بھی مجھ سے اس ریوالور کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ اس کی ذہنی پریشانی تھی ورنہ وہ مجھ سے اس بارے میں ضرور پوچھتی۔

بہرحال یہ دوسرا دن پورا گزر گیا اور رانی مجھے ایک بار بھی نظر نہ آئی۔ البتہ اس حویلی یا پھر دوسرے الفاظ میں محل کے معاملات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہاں مجھے بہت سے خطرناک چہرے نظر آتے تھے۔ میں تو یہاں رکنے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن رکنے سے فائدہ ہی ہوا تھا۔ اب میرے لئے نکل جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ میں باہر جانے کے راستے جانتا تھا۔ لیکن رانا جسپال کا انتظار ضروری تھا جس کے بارے میں مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ بس آنے ہی والا ہے۔ یوں تھوڑا سا وقت اور گزرا۔ دوسرے دن صبح ناشتے پر اطلاع ملی کہ رانی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں تیار ہو کر ناشتے پر پہنچ گیا۔ رانی نے گردن خم کر کے میرا استقبال کیا اور بولی۔

''آؤ بیٹھو خاقان جمشیدی! تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے کہ تمہیں یہاں لا کر میں نجانے کیسے کیسے کاموں میں مصروف ہو گئی۔''

''نہیں آنٹی! بلکہ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟''

''اصل میں ایسا مہمان بننا چاہتا ہوں جس کے ساتھ مہمانی کا تصور نہ ہو بلکہ وہ بذاتِ خود میزبان ہو۔ آپ کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں ضرورت سے آگے نہ بڑھ جاؤں اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ میں اپنی حدوں کو عبور کر رہا ہوں۔''

رانی کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولی۔ ''میں نے تو تمہاری حدیں توڑ دی ہیں۔ تم خود اپنے لئے حدیں کیوں مقرر کر رہے ہو؟ یہ کام مجھے کرنے دو۔''

''آپ نے بے شک مجھ پر جو احسانات کئے ہیں میں انہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔''

''ارے...... میں تو تم پر احسانات کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی میں نے کوئی احسان کہاں کیا ہے تم پر۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خود تم نے میرے لئے اپنے آپ کو جس طرح وقف کر دیا ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔''

''تب پھر ہم دونوں بہت اچھے لوگ ہیں۔ آپ بھی اور میں بھی۔'' میں نے ہنس کر کہا اور رانی بھی ہنسنے لگی پھر بولی۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ ہم میں سے کسی نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے احسان مند ہیں۔''

''تھوڑا سا وقت ہے؟ ذرا سی پریشان ہوں میں۔''

''خیریت، کیا ہیگ اور ہشمان ذکری کا قتل؟''

''نہیں، وہ کھیل تو ختم ہوا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ ہیگ جو ہے نا یا تھا یہ اس قدر کمینہ صفت آدمی تھا کہ اس نے مجھے بدترین نقصان پہنچائے ہیں۔ تم یقین کرو کتے کی موت مر جاتا یہ۔ لیکن جو کام کرنا چاہتی تھی میں وہ تم نے کر ڈالا۔''

''اور اسے کر کے میں بے پناہ خوش ہوں۔''

''تمہارا مسئلہ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔''

''اس نے میری پوری زندگی تباہ کر ڈالی۔ مجھے قاتل بنا دیا اس نے۔ اور پھر ایک
کوئی تعلق نہیں تھا۔''
بڑے انگریز افسر کا قتل جبکہ میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''
''ہاں بتایا تھا تم نے۔ چلو چھوڑو...... میرا ایک شکار نکل بھاگا ہے۔ مجھے اس کی تلاش
ہے۔ وہ مجھے مل جائے۔ بلکہ اس کا ملنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے مجھے کچھ
الجھنیں بھی پیش آ سکتی ہیں۔''
''مجھے بتایئے، اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا ہوں میں؟''
''نہیں نہیں، میں خود ہی دیکھ رہی ہوں اسے۔ پتہ نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔
خیر جائے گا کہاں بچ کر۔ اچھا اب سنو، ہمیں اپنے معاملات کو بالکل بھلا کر رانا جسپال
سنگھ کا سواگت کرنا ہے۔ وہ سیدھے یہیں آئیں گے۔ میرا مطلب ہے ہمیں انہیں لینے
کے لئے ایئر پورٹ جانا ہوگا اور پھر وہاں سے انہیں گاڑیوں میں چندی گڑھ لانا ہوگا۔''
''ارے آپ چاہیں تو یہ کام میرے سپرد کر سکتی ہیں۔''
''نہیں، تم تو ساتھ ہو گے ہی۔ روپالیہ کی پیاسی آنکھیں تمہیں تلاش کر رہی ہوں گی۔
اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمہاری جگہ صرف میں اسے نظر آؤں۔''
''آپ رانا جسپال سنگھ سے بہت متاثر ہیں۔''
''بہت اچھا آدمی ہے۔ اور پھر سچ بتاؤں تمہیں میرے لئے بڑا کارآمد آدمی ہے۔''
''جی...... میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کے لئے وہ کیوں کارآمد ہے۔''
''تم بھروسہ کر لو، تمہیں یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے
مطلب کی بات ہے ہی نہیں۔''
''جی۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
ہم لوگ ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ ناشتے سے فراغت حاصل کر کے رانی نے ک
''دیکھو...... تمہیں یہاں ہر طرح کی آزادی ہے۔ پورے چندی گڑھ میں جہاں دل چا
گھومو پھرو۔ جیپ بھی مل سکتی ہے تمہیں۔ سیر و سیاحت کرو۔ رانا جسپال کی آمد کا ا
کرنا ہوگا۔ اس کے بعد تمہیں روپالیہ کو نواحات کی سیر کرانی ہوگی''
''بہت بہتر۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ آپ کی
الجھن میں شریک ہو سکتا۔''
''تم میری الجھن میں برابر کے شریک ہو۔ یہ مت سوچو کہ میں تمہیں نظر انداز کر

ہوں۔ جہاں تمہاری ضرورت پیش آئے گی میں تمہیں تکلیف دینے سے گریز نہیں کروں
گی۔''
''مجھے خوشی ہو گی۔''
''میں جانتی ہوں تم کس طرح کے انسان ہو۔ اچھی طرح اندازہ ہے مجھے اور تم پر ناز
کرتی ہوں میں کہ میرے اتنے اچھے اچھے دوست ہیں۔''
میں نے نیاز مندی کا مظاہرہ کیا۔ بہرحال رانی کو اپنے جال میں جکڑے رہنا انتہائی
ضروری تھا۔ لفظوں کا خرچ بڑے بڑے کام بنا دیتا ہے اور رانی پر بھی الفاظ خرچ کئے بغیر
قابو پائے رکھنا ضروری تھا۔ حالانکہ جو معلومات مجھے حاصل ہو چکی تھیں ان کے تحت میں
خود رانی کا شکار تھا۔ لیکن بہرحال ہم دونوں ایک دوسرے سے چوہے بلی کا کھیل کھیل
رہے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وقت کسے چوہا بنا دے اور کسے بلی۔ لیکن رانی کی
دی ہوئی مراعات سے میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور اس کے بعد جب رانی اپنے
کاموں میں مصروف ہو گئی تو میں نے جیپ طلب کر لی۔ مجھے چندی گڑھ کے بارے میں
کافی تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ بہت اعلیٰ درجے کی ایک جیپ فیول ٹینک بھروا کر
میرے سپرد کر دی گئی۔ ڈرائیور نے اپنی خدمات پیش کیں اور بولا۔
''سر جی! میں آپ کی ہر خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ حکم دیجئے، میں
آپ کے ساتھ چلوں یا آپ خود جیپ لے جائیں گے؟''
''نہیں، میں چندی گڑھ اور اس کے نواحات کی آوارہ گردی کروں گا۔ اور صحیح معنوں
میں آوارہ گردی کا لطف تبھی آتا ہے جب انسان اجنبی راستوں پر سفر کرے۔ تم آرام کرو،
میں جیپ لئے جا رہا ہوں۔ اور بالکل بے فکر رہو، میں آرام سے اسے ڈرائیو کروں گا۔''
''جی صاحب جی۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔
میں جیپ لے کر چل پڑا۔ تھوڑی دیر تک تو یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کوئی
میرا پیچھا وغیرہ تو نہیں کر رہا ہے۔ رانی جیسی چالاک عورت سے ہر بات کی توقع کی جا
سکتی تھی۔ لیکن کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آئی۔ جب مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ کوئی میرا
تعاقب نہیں کر رہا تو میں نے اپنے حساب کے مطابق جیپ اس بستی کی طرف دوڑا دی
جہاں ستنام سنگھ گیا تھا۔ میرے ذہن میں ستنام سنگھ کے لئے بہت سے خیالات تھے اور
میں ان راستوں پر سفر کر رہا تھا۔ میں اگر چاہتا تو ان کھنڈرات میں جا کر اس جگہ کا جائزہ

بھی لے سکتا تھا لیکن وہ کھنڈرات اب میرے لئے موت کا گھر تھے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ رانی انہی کھنڈرات میں تحقیقات کر رہی ہو گی کہ وہ کون تھا جس نے باہر سے دروازہ کھول کر ستنام سنگھ کو آزاد کر دیا۔ ممکن ہے اس وقت بھی انہی کھنڈرات میں موجود ہو۔

آخر کار یہ لمبا سفر طے کر کے میں کویا پہنچ گیا۔ چھوٹی سی خوبصورت آبادی تھی جس کے اطراف میں سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ پیلی پیلی سرسوں سبز ڈنڈیوں پر اس قدر حسین لگتی تھی کہ گویا آنکھوں کے راستے دل میں اتر رہی ہو۔ ان میں جگہ جگہ حسین پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ حسین پھول وہ نوجوان عورتیں تھیں جو سرسوں کے کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ یہ محنت کش لڑکیاں اور عورتیں اس قدر دلکش لگ رہی تھیں ان ہری ہری ڈنڈیوں کے درمیان لال پیلے کپڑوں میں ملبوس کہ دل چاہتا تھا کہ انہیں بس دیکھتے رہا جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ برا بھی نکل سکتا تھا۔ میں نے کویا بستی کے مختلف گوشوں میں جا کر ساری صورتحال کا اندازہ کیا۔ کویا کے مشرقی گوشے میں لاری اڈا تھا جہاں سے پرانے طرز کی لاریاں مقامی دیہاتیوں کو لے کر مختلف شہروں میں جاتی تھیں۔ میں نے معلوم کیا کہ یہاں سے کون سی لاری دہلی جاتی ہے تو پتہ چلا کہ تین لاریاں بدل کر یہاں سے دہلی جایا جا سکتا ہے۔ لازمی بات تھی کہ ستنام سنگھ اتنا بیوقوف نہیں ہو گا کہ کویا ہی میں وقت گزارتا رہتا۔ وہ دہلی نکل گیا ہو گا، لازمی بات ہے۔

بہر حال اس کے بارے میں یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب وہ رانی کے ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ دیکھ کر کہ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو رانی کا آدمی ہو میں نے واپسی کا سفر طے کیا اور اس کے بعد بہت دیر تک چندی گڑھ کے نواحی علاقوں میں چکراتا رہا، پھر واپس آ گیا۔

رانی اس وقت بھی مجھے نہیں ملی تھی اور دوسرے دن بھی پورا دن وہ غائب رہی تھی۔ لیکن تیسرے دن رات کو اس وقت جب میں کھانا وغیرہ کھا کر فراغت حاصل کر چکا تھا وہ میری خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی کوئی لکیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے پاس آ کر اس نے کہا۔ ”کہو بھتیجے، کیسے ہو؟“

”ٹھیک ہوں آنٹی۔“

”مجھے رپورٹ مل گئی ہے کہ تم نے اس دوران اپنے آپ کو بور نہیں ہونے دیا۔“

”نہیں، بالکل بور نہیں ہوا ہوں میں۔ بس صرف اس احساس کا شکار ہوا ہوں کہ آپ

اکیلی نجانے کس اُلجھن میں گرفتار ہیں۔ کاش میں اس اُلجھن میں آپ کی مدد کر سکتا۔“

”تم پوری پوری مدد کر رہے ہو میری۔ رانا جسپال کل صبح ساڑھے آٹھ بجے آ رہے ہیں۔ ہمیں ساڑھے پانچ بجے یہاں سے چل پڑنا ہو گا تاکہ ہم ان کو ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہہ سکیں۔“

”میں تیار ملوں گا آپ کو۔“

”بس یہی کہنے آئی تھی۔“

”آپ کا وہ شکار آپ کو ملا یا نہیں؟ یہ بتایئے۔“ میں نے سوال کیا تو رانی کے چہرے پر نفرت کے نقوش پھیل گئے۔ اس نے کہا۔

”سنو...... تمہاری دعا سے میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں ہندوستان میں بڑے سے بڑے مسئلے سے نمٹ سکتی ہوں۔ جیسے میں نے تمہارے بارے میں کہا اور تم بلاوجہ اس تشویش کا شکار تھے کہ ہندوستان میں تم انگریز حکومت کو درکار ہو۔ میرے ساتھ تم دہلی چلو۔ میں تمہیں ہر جگہ لے جا سکتی ہوں جہاں تمہارے سلسلے میں تمام تر ریکارڈ موجود ہو۔ لیکن جب میں ان سے کہہ دوں گی کہ یہ پرنس ہردیپ ہے تو پھر کسی کی مجال نہیں ہے جو یہ کہے کہ یہ پرنس ہردیپ نہیں ہے۔ اسی طرح میں اپنے شکار کی بات کرتی ہوں۔ وہ میرے لئے بڑی ضروری چیز تھا۔ لیکن اب جب وہ مجھے نہیں ملا تو میں نے اس پر تھوک دیا۔ وہ آسمان پر بھی جا بیٹھے تو میرے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بس، بات ختم ہو گئی۔ میں نے اس کی تلاش چھوڑ دی ہے۔“

”ہاں۔ آپ کی پوزیشن کا تو میں بھرپور اندازہ لگا چکا ہوں آنٹی۔“

”اب تم آرام کرو۔ صبح کو خود جاگ جاؤ گے یا......“

”نہیں نہیں، میں خود جاگ جاؤں گا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ صبح جب وہ تیار ہو کر میرے کمرے کی طرف چلی تو میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں مکمل لباس میں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

”اتنے ذمے دار لوگ مجھے بے حد پسند ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بڑی گڈ بک میں ہو اور لمحہ لمحہ تم میرے دل میں اپنی جگہ کشادہ کرتے جا رہے ہو۔“

”اتنی خوبصورت باتوں کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور رانی لا پڑی۔ ہم دونوں باہر جا کر ایک بڑی جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے ایک اور کار

چل پڑی تھی۔ یہ انتہائی قیمتی کار تھی اور غالباً فورڈ کمپنی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ کار رانا جسپال کے لئے تھی۔ رانی نے ایئرپورٹ تک کے سفر کے لئے جیپ کا انتخاب کیا تھا۔ صبح کی سہانی فضا میں ایک لمبا سفر انتہائی خوشگوار کیفیت کا حامل تھا۔ رانی غالباً کسی گہری سوچ میں تھی چنانچہ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ رانا جسپال کو صورتحال سے آگاہ کر کے میں یہاں سے نکل جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ سیتا گڑھی جاؤں۔ وہاں میرے اہل خاندان بھی تھے۔ زندگی میں تو کبھی میں نے ان سے واسطہ نہیں رکھا تھا لیکن اب دل چاہتا تھا کہ ان سب سے ملا جائے۔

انسانی فطرت میں اپنوں کا ایک مقام ہمیشہ ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور ان سے دور ہٹ جاتے ہیں وہ عارضی طور پر تو اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کرتے ہیں لیکن آنے والے وقت میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے بہتر نہیں کیا۔ انہیں بہرحال اپنوں کی ضرورت تھی۔ یہ اپنے ہی تو زندگی کے ہر لمحے کے سفر کے ساتھی ہوتے ہیں۔ باقی تو سب راستے کے نشانات ہوتے ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔

بہرحال ہمارا یہ سفر ختم ہو گیا اور میں رانی کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ فلائٹ صحیح وقت پر آ گئی تھی۔ مسافر باہر آنے لگے۔ میں نے رانا جسپال اور روپالیہ کو دیکھا، پیچھے رانا کے دو ساتھی تھے جو باڈی گارڈ بھی تھے اور سیکرٹری بھی۔ ایک وقار، ایک شان تھی رانا کی۔ شاندار سوٹ میں ملبوس روپالیہ تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت ہی حسین لباس پہنا ہوا تھا اس نے۔ بڑی پُروقار شخصیت تھی اس کی لیکن اسے دیکھ کر میرے دل میں پھر بھنور پڑنے لگے۔ میں نے اسے ہمیشہ کلاڈیا کی شکل میں دیکھا تھا، اس نے جو تصویر مجھے دی تھی وہ بھی کلاڈیا کی تصویر تھی۔ لیکن منگنی والے دن اچانک اس کی شکل بدل گئی تھی اور یہ بات میرا دل کسی طور ہضم نہیں کر پاتا تھا۔

لیکن بہرحال سامنے کی سچائیوں کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ آہ، نجانے وہ کیا قصہ تھا؟ ویسے قصہ تو مسلسل کچھ نہ کچھ تھا ہی کیونکہ کلاڈیا بدستور میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اب تو مجھے یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ وہ عورت جس نے ستنام سنگھ کے لئے میری رہنمائی کی تھی اور ایک ہیولے کی شکل میں وہ مجھے کھنڈرات تک لے گئی تھی، کلاڈیا ہی تھی۔ خداوند عالم! یہ کلاڈیا آخر ہے کیا چیز؟ بے اختیار دل میں یہ خیال بھی گزرا کہ ذرا اس صورتحال سے

نجات مل جائے اور کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے تو کلکتے کا ایک چکر ضرور لگاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا کہاں ہے۔ وہ پراسرار وجود جو جگہ جگہ میرا تعاقب کرتا رہا ہے، اسی کلاڈیا کا ہے یا پھر یہ انوکھا کردار کہیں اور سے عالم وجود میں آیا ہے؟

رانا جسپال سنگھ نے ہم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے روپالیہ کے چہرے پر بھی خوشی کے تاثرات دیکھے اور سوچنے لگا کہ جب اس لڑکی کو حقیقت حال کا علم ہو گا تو اس کی کیا کیفیت ہو گی۔ نیز یہ کہ رانا جسپال اس کا اور اپنا تحفظ بھی کر سکے گا یا نہیں؟ ستنام سنگھ نے جو انکشافات کئے تھے کیا وہ سچائی پر مبنی تھے یا پھر وہاں بھی کوئی جھوٹ چھپا ہوا ہے؟ لیکن ایک بات فیصلہ کن تھی کہ یہ انکشافات وقت ہی کرے گا۔ وقت سے پہلے کچھ معلوم ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ کم از کم یہ میرا ذاتی تجربہ تھا۔

بہرحال اس طرح وہ دونوں ضروریات سے فراغت حاصل کر کے باہر نکل آئے۔

رانی سریتا دیوی نے بڑا والہانہ استقبال کیا تھا۔ روپالیہ کی مسکراتی نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کیسی ہو روپالیہ!"

"کیسی نظر آ رہی ہوں آپ کو؟"

"پہلے سے زیادہ خوبصورت۔"

"شکریہ۔ بس ویسی ہی ہوں جیسی آپ کو نظر آ رہی ہوں۔"

رانی نے عقل سے کام لیا اور بولی۔ "تم لوگ اس کار میں سفر کرو گے۔ میں رانا جسپال اور باقی افراد کے ساتھ جیپ میں ہوں۔ یہ چابی پکڑو۔ اور ڈرائیونگ بھی تمہیں ہی کرنی ہے۔ مگر ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔"

رانی نے اپنی دانست میں بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ روپالیہ اس کارنامے سے بہت خوش نظر آئی تھی۔ بہرحال ہم ایئرپورٹ سے چل پڑے تو روپالیہ نے کہا۔

"کتنا یاد کیا تھا مجھے؟"

"کافی۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک بات کہوں؟"

"ہاں۔"

"تم مجھے اتنے زیادہ پُرجوش نظر نہیں آتے جتنی زیادہ میں ہوں۔"

"اچھا......؟"

"غلط کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں۔"

"مگر میں غلط نہیں کہہ رہی۔"

"چھوڑو ان باتوں کو روپالیہ! تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"نہیں، مجھے وجہ بتاؤ۔ بات ٹالو نہیں۔"

"کوئی ایسی بات نہیں ہے روپالیہ! تمہیں احساس ہوا ہوگا میں ذرا معتدل قسم کا آدمی ہوں اور زندگی کی حقیقتوں کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ ظاہر ہے ابھی ہمارے درمیان تھوڑے سے فاصلے ہیں۔ یہ فاصلے طے ہو جائیں تو پھر ہم کھل کر اپنی محبتوں کا اظہار کریں۔" میں گول مول انداز میں اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے اور اس کے راستے الگ ہیں لیکن ابھی اس کا اظہار کر کے بھی کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ بڑے محتاط انداز میں بول رہا تھا۔ لیکن روپالیہ شاید میرے اس سرد رویے سے ناخوش تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔

"میں یہ پوچھ کر رہوں گی کہ تم مجھے پسند کرتے ہو یا نہیں؟ ویسے سچ بتاؤں، لندن میں رہ کر بھی میں نے یہی سب کچھ محسوس کیا تھا۔"

"ارے نہیں روپالیہ! بھلا یہ احساس تمہیں کیسے ہوا؟"

"اس لئے کہ فون پر بھی تمہارے لہجے میں وہ جوش اور وہ اپنائیت نہیں ہوا کرتی تھی جو میرے لہجے میں ہوتی تھی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس کمی کو اب پورا کر لیں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور آخر کار ہم چندی گڑھ میں رانی کی حویلی میں پہنچ گئے۔

حویلی میں رانا جسپال کے استقبال کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ ابتدائی رسمیں پوری کی گئیں۔ رانا صاحب اور روپالیہ کو الگ الگ کمرے دیئے گئے تھے لیکن دونوں برابر برابر تھے۔ میری خاص طور سے ڈیوٹی تھی کہ میں روپالیہ کو خوش رکھوں۔ بہرحال میرے سپرد یہ ذمہ داری میری مرضی کے خلاف تھی لیکن میں رُکا ہی اس لئے تھا کہ رانا کو کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہونے دوں حالانکہ اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں تھا۔ ستنام سنگھ کے ساتھ

کہیں بھی نکل سکتا تھا۔ خطرہ تو بہرحال ہر جگہ ہی تھا اور اس خطرے سے خود ہی مقابلہ کرنا تھا جس کے لئے میرے اندر اب کوئی بے چارگی نہیں رہی تھی۔ اصل میں میرا حوصلہ بیگ اور ہشمان ذکری کو ختم کرنے کے بعد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور انسان جب یہ سوچ لے کہ اس کی زندگی کا مقصد تو پورا ہو چکا ہے، اب تو صرف جینے کے لئے جینا ہے اور زندگی جب تک ساتھ دے منافع والی بات ہے تو پھر بہت سے خوف خود بخود کم ہو جاتے ہیں۔

میں اس وقت اسی پوزیشن میں آ گیا تھا اس لئے ذرہ برابر خوفزدہ نہیں تھا۔ رانا جسپال کی خاطر مدارات کے سلسلے میں مجھے بھی پیش پیش رہنا پڑتا تھا۔ روپالیہ سے میں نے عشق و محبت کی داستانیں تو نہیں دوہرائیں لیکن عارضی طور پر اسے سنبھالے رکھنے کے لئے خاصی یگانگت اور محبت کا ثبوت دیتا رہا جس سے وہ کافی حد تک مطمئن نظر آئی تھی۔ اور پھر میں اس کے ساتھ سیر و سیاحت کے لئے نکل پڑا۔

رانی کی طرف سے ہمیں اجازت تھی، وہ قیمتی کار ہمیں دے دی گئی تھی۔ چندی گڑھ چھوٹی سی جگہ تھی۔ اس کے نواحات بھی بے حد خوبصورت تھے۔ میں خود ڈرائیونگ کرتا تھا اور روپالیہ بہت زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ لیکن میں زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ پتہ نہیں رانی سریتا کے ذہن میں اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے کون سا وقت تھا۔ میں یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن میں اپنا فرض ضرور پورا کر دینا چاہتا تھا۔ فوری طور پر رانا جسپال کو اس صورتحال سے آگاہ کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ رانا جسپال محتاط ہو جائے اور احتیاط شروع کر دے۔ رانی جس قدر چالاک عورت تھی اس سے لازمی امر تھا کہ رانا جیسے ہی احتیاط شروع کرے گا وہ سمجھ جائے گی کہ رانا کو کسی بات کا شبہ ہو گیا ہے۔

بہرحال رانا کو یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ روپالیہ خوب نکھر گئی تھی۔ اسے میری محبت کا یقین ہو گیا تھا اور وہ غلط فہمی جو اس کے دل میں تھی وہ نکل چکی تھی۔ اس رات ڈنر کے دوران رانا جسپال نے کہا۔

"اور اب آپ مجھے اجازت دیں گی رانی جی! دو چار دن کے لئے اُودے پور جانا چاہتا ہوں۔ اُودے پور میں میرے کچھ رشتے دار بھی ہیں اور وہاں میری کافی جائیداد بھی پڑی ہوئی ہے۔ پچھلے بہت دنوں سے وکیل سے بات چیت چل رہی ہے۔ میں اصل میں اب اس جائیداد کو بیچ دینا چاہتا ہوں۔ یا پھر اگر آپ کو وہ زمینیں وغیرہ پسند آئیں تو آپ انہیں رکھ لیجئے گا۔"

''ہمیں زمینوں کا کیا کرنا ہے رانا صاحب! آپ ہو آیئے۔ لیکن ابھی دو چار دن نہ جاتے تو کیا حرج تھا۔''

''اُودے پور کا کام نمٹا آؤں اس کے بعد آپ کی خدمت میں کچھ وقت گزاروں گا۔''

''ہاں ضرور۔ کب جانا چاہتے ہیں آپ؟''

''کل صبح۔''

''ریل سے جانا ہوگا؟''

''ہاں ریل ہی کا سفر ہے۔''

''میں معلومات کرائے لیتی ہوں۔''

''نہیں، مجھے معلوم ہے۔ یہاں چندی گڑھ سے ٹرین صبح ساڑھے آٹھ بجے ملتی ہے۔ میں سات بجے نکل جاؤں گا۔''

''سات بجے کیوں؟''

''ہمیشہ کی عادت ہے، وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہوں۔ آپ ڈرائیور سے کہہ دیجئے مجھے چھوڑ دے۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ڈرائیور نہیں انکل، میں آپ کو لے کر چلوں گا۔'' میں نے فوراً ہی اپنی خدمات پیش کر دیں اور رانی ہنسنے لگی، پھر بولی۔

''داماد جی بڑے مستعد ہیں آپ کے۔''

''کیوں نہیں بھئی، داماد کیا اب تو یہ میرا بیٹا ہے۔'' رانا جسپال نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''میں بھی جاؤں گی ڈیڈی۔'' روپالیہ نے کہا۔

''ارے تم...... تم صبح اٹھ سکو گی روپالیہ؟ زندگی میں تو تمہارا ریکارڈ ہے۔''

روپالیہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''میں اپنا ریکارڈ خود توڑ دوں گی۔''

''ہمیں کیا اعتراض ہے بھئی۔ دیکھ لینا۔''

مجھے یہ موقع سب سے بہتر نظر آیا۔ لیکن روپالیہ کا ساتھ ہونا مناسب نہیں تھا۔ میں نے دوسرے دن صبح چھ بجے ہی تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ میری دلی آرزو تھی کہ روپالیہ سوتی ہی رہے تاکہ مجھے رانا جسپال سے گفتگو کرنے کا مناسب موقع مل جائے۔ رانی نے بھی غالباً اسی لئے مجھے آزادی دے دی تھی کہ اس کے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی

تشویش نہیں تھی۔

بہر حال روپالیہ معمول کے مطابق سوتی رہی۔ رانا نے اس کے کمرے میں جھانک کر کہا۔ ''اگر اسے وقت سے پہلے جگا بھی دیا جائے تو سارا دن اس کا موڈ خراب رہتا ہے۔ ہم لوگ چلتے ہیں، اسے رہنے دو۔''

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا اور سوچا تھا کہ تقدیر یہاں میرا ساتھ دے رہی ہے۔ روپالیہ کی موجودگی میں یہ سب کچھ نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ اسٹیشن تک ڈرائیونگ بھی مجھے ہی کرنی تھی۔ رانی بھی آرام کرنے کی عادی تھی۔ چنانچہ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد میں رانا جسپال کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ حویلی سے باہر نکلنے کے بعد رانا جسپال نے کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو ہردیپ سنگھ! تم یقین کرو مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ ویسے میرا دعویٰ ہے کہ اگر تم ہندوستان ہی میں رہتے تو اس قدر کام کے آدمی نہیں بن سکتے تھے۔ سینٹ لوسیا میں تمہاری زندگی......''

''رانا صاحب! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور رانا چونک پڑا۔

''خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے۔''

''ارے ارے، کیا بات ہے بھئی؟''

''رانا صاحب! ایک بہت بڑا کھیل ہو رہا ہے۔ میں اس کھیل کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔''

''کھیل؟''

''ہاں۔ آگے ایک باغ آتا ہے، وہاں میں گاڑی روک دوں گا۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''اسٹیشن نہیں چلو گے؟''

''آپ پوری تفصیل سن لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ ویسے یقینی طور پر اُودے پور میں، میرا مطلب ہے اُودے پور جانے کے لئے ساڑھے آٹھ بجے کے بعد بھی کوئی ٹرین ملتی ہوگی۔''

’’ہاں، اس کے بعد پونے دس بجے ٹرین ملتی ہے۔‘‘

’’آپ اس سے چلے جائیے۔‘‘

’’جس قدر تم سنجیدہ ہو، وہ مجھے لرزائے دے رہا ہے۔ ویسے چلتے رہو۔ رُک کر بات کرنے کی کوئی خاص ضرورت ہے؟‘‘

’’نہیں، آپ کی مرضی ہے۔ چل رہے ہیں؟‘‘

’’مگر مسئلہ کیا ہے بیٹے۔ کیا کہنا چاہتے ہو آخر تم ایسی بات۔‘‘

’’رانا صاحب! سب سے پہلی بات تو یہ بتا دوں آپ کو جو کچھ میں آپ سے کہوں گا اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں ہوگا۔ چونکہ یہ میرے نہیں آپ کے مفاد کی بات ہے۔ میں صرف ایک اچھے انسان کی حیثیت سے آپ کو ان حقیقتوں سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ہاں بولو۔ بتاؤ، جلدی بتاؤ۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن اس وقت تمہارے لہجے کی اس سنجیدگی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔‘‘

’’سب سے پہلی بات یہ آپ سے عرض کروں رانا صاحب! کہ میں پرنس ہردیپ سنگھ نہیں ہوں۔‘‘

رانا پر یہ انکشاف ایک دھماکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ’’تو پھر؟‘‘

’’میرا نام خاقان جمشیدی ہے۔ میں ایک مسلمان باپ کا بیٹا ہوں۔ تعلق سیتا گڑھی سے ہے۔ سینٹ لوسیا میں کبھی نہیں گیا بلکہ مختلف جگہوں پر گھومتا ہوا لندن پہنچا تھا۔ وہاں رانی سریتا دیوی مجھے ملیں۔ کچھ اس انداز سے میرے ساتھ پیش آئیں کہ میرے اور ان کے درمیان ہلکے پھلکے تعلقات قائم ہو گئے۔ تب انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں کچھ عرصے کے لئے ان کے بھتیجے کی حیثیت اختیار کر لوں، وہ مجھے ہردیپ سنگھ کے نام سے کسی کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہیں۔ اور آخر کار انہوں نے مجھے ہردیپ سنگھ کی حیثیت سے آپ سے ملایا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ایک مجبوری کے تحت وہ ہردیپ سنگھ کی منگنی رانا جسپال کی بیٹی سے کرنا چاہتی ہے اور یہ ضروری ہے۔ ہردیپ سنگھ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ رانی صاحبہ کے فارم ہاؤس پر قتل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ یہ ہردیپ سنگھ نہیں تھا بلکہ اس کا دوست تھا۔ ایک عجیب کہانی رانی نے مجھے سنائی تھی جو غلط تھی۔ رانا صاحب! اب آپ پوری بات ہی سن لیجئے۔ وہاں ہردیپ سنگھ کی

حیثیت سے مجھے روپالیہ جی سے ملوایا گیا اور آپ لوگوں نے آخر کار ہماری منگنی کر دی۔ ہم یہاں واپس آ گئے۔ میرے ذہن میں شدید تجسس تھا کہ آخر رانی صاحبہ کے اس کھیل کی نوعیت کیا ہے۔ بہرحال پھر میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ یہ ستنام سنگھ تھا۔ سینٹ لوسیا میں ہردیپ سنگھ کا ساتھی۔ دونوں ساتھی لندن پہنچے تھے۔ رانی نے ہردیپ سنگھ سے غالباً کوئی بات کی تھی اور اختلاف ہو جانے کی وجہ سے اس نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا تھا اور ستنام سنگھ کو چونکہ یہ تمام تفصیلات معلوم تھیں اس لئے اس نے اسے یہاں لا کر یہاں سے تھوڑے فاصلے پر کولی کے کھنڈرات میں ایک تہہ خانے میں قید کر دیا۔ یہ بالکل اتفاق کی بات ہے کہ میں ٹہلتا ہوا ان کھنڈرات کی جانب جا نکلا اور بالکل غیر متوقع طور پر اس تہہ خانے تک پہنچ گیا جہاں مجھے ستنام سنگھ ملا۔ وہاں پہنچ کر مجھے باقی تمام حقیقتیں معلوم ہوئیں۔ رانی سریتا دیوی کالے علوم سیکھ رہی ہے اور اس کے لئے اسے مختلف کالے کرتوت کرنا پڑتے ہیں۔ ایک بہت ہی اہم سلسلے میں اسے ایک نوخیز جوڑے کی بلی دینے کی ضرورت پیش آ گئی تھی اور اس کے لئے اس نے ہردیپ سنگھ اور آپ کی بٹی روپالیہ کا انتخاب کیا تھا۔ اب انتخاب میں کیا راز پوشیدہ ہے یہ بات میرے علم میں نہیں آ سکی۔ منصوبے کے مطابق اس نے وہاں مجھے ہردیپ سنگھ بنا کر میری منگنی آپ کی بٹی سے کی اور مجھے یہاں لے آئی۔ منصوبے ہی کے مطابق روپالیہ کو یہاں بلایا جانا تھا اور اس کے بعد خاموشی سے وہ ہم دونوں کو اپنے کالے مقصد کے لئے قربان کر دیتی۔ ستنام سنگھ کو یہ تمام تفصیلات خود اسی نے بتائی تھیں۔ ستنام سنگھ نے ساری تفصیلات مجھے بتا دیں۔ میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا اور آپ کو ہوشیار کر دینا چاہتا تھا۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ میں ایک مسلمان آدمی ہوں اور یہیں سے ساری باتیں غلط ہو جاتی ہیں۔ آپ مجھے بتایئے رانا صاحب! اب آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ آپ یقین کیجئے، یہ تمام تفصیلات معلوم ہونے کے بعد میں نے ستنام سنگھ کو آزاد کر دیا۔ وہ یہاں سے دہلی چلا گیا کیونکہ وہیں کا باشندہ ہے وہ۔ میں اگر چاہتا تو خود بھی ہندوستان کی وسعتوں میں گم ہو سکتا تھا۔ رانی اتنی آسانی سے مجھے تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو بھی تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ خدانخواستہ روپالیہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔

اوہ مائی گاڈ...... مائی گاڈ‘‘ رانا جسپال انتہائی غمزدہ لہجے میں بولا۔ پھر اسی

طرح کہنے لگا۔ ''روپالیہ پر تو غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ نیم دیوانی ہو جائے گی۔''

''اسے آپ سنبھال لیجئے رانا صاحب! لیکن اس طرح ایک شیطانی عمل کا شکار ہو جانا جس قدر خطرناک ہے، اس کا آپ کو علم ہے۔ روپالیہ جی کے دُکھ کو آپ سمیٹ لیں گے لیکن ان کی زندگی تو بچ جائے گی۔''

''نوجوان! ویسے تو تم ہمیشہ سے مجھے ایک صاحب کردار شخص نظر آئے اور میں نے یقین کرو دل ہی دل میں تمہیں پسند کیا۔ ظاہر ہے اگر تم چاہتے تو بہت فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کر ڈالا ہے۔''

''آپ ان باتوں کو چھوڑیئے، اب آپ یہ بتایئے کہ آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''اس کتیا کی بچی کو تو میں وہ سبق سکھاؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ میں بے شک ایک طویل عرصے سے ہندوستان سے باہر ہوں لیکن ہندوستان میرا اپنا گھر ہے۔ تم ذرا رفتار تیز کرو، میں اسی ٹرین سے اُودے پور جاؤں گا۔ تمہارے سپرد میں یہ ذمے داری کئے جا رہا ہوں کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، تم روپالیہ کو رانی کے جال سے بچانا اور خود بھی اپنی زندگی محفوظ رکھنا۔ میری واپسی میں بہت زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں تمہیں ایک ٹیلی فون نمبر دیتا ہوں۔ اس نمبر پر رِنگ کرنا، میں تمہیں بتا دوں گا کہ میں کب واپس یہاں چندی گڑھ پہنچ رہا ہوں۔ بالکل بے فکر رہنا، میں سارے کام کر لوں گا۔ اُودے پور میں ڈی آئی جی پولیس میرا بہت گہرا دوست ہے۔ بس یوں سمجھ لو اس وقت اُودے پور میں اپنی زمینوں کے کام سے نہیں جا رہا بلکہ اس بھیانک منصوبے کے خاتمے کے لئے جا رہا ہوں۔'' رانا جسپال سنگھ مجھے مختلف ہدایات کرتا رہا اور میں نے انہیں ذہن نشین کر لیا۔

اور پھر آخر کار ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔

※☆※

رانا جسپال کو اسٹیشن چھوڑ کر میں واپس حویلی پہنچ گیا کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ روپالیہ ناشتے پر آئی۔ روٹھی روٹھی سی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

''آپ نے مجھے جگا کیوں نہ لیا؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''رانا صاحب نے منع کر دیا تھا۔ کہنے لگے اگر آپ کی نیند پوری ہونے سے پہلے آپ کو جگا دیا گیا تو پورا دن آپ کا موڈ خراب رہے گا۔''

رانی سریتا دیوی کی موجودگی میں روپالیہ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی لیکن بعد

میں وہ کہنے لگی۔ ''آئندہ خیال رکھئے گا آپ۔ اگر مجھے آدھی رات کو بھی جگا لیں گے تو میرا موڈ خراب نہیں ہوگا۔''

میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''ابھی تو مجھے آپ کی عادتوں کا کوئی پتہ نہیں ہے۔''

''واقف ہوتے جایئے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ناز برداری کرنا تو ہوگی۔''

''ہاں۔''

''پتا جی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر میں چاہوں تو ان کے ساتھ اُودے پور چلوں۔ آپ کو بھی ساتھ لے لوں۔ میں نے منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ نہیں، ابھی نہیں۔ میں یہیں چندی گڑھ میں آپ کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔

''آج کا کیا ارادہ ہے؟''

''جیسا آپ کہیں۔''

''وہ جو ایک ہردیوی کا مندر آپ نے مجھے دور سے دکھایا تھا مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ مجھے وہاں لے کر چلیں۔ اصل میں لندن میں اس طرح کے پرانے مندر نظر نہیں آتے۔ جبکہ مجھے ایسی پرانی عمارتوں سے بہت دلچسپی ہے۔''

یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی کہ سریتا دیوی ہماری باتیں سن رہی ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور مسکرا کر بولی۔

''سوری بچو! یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری باتوں پر کان لگائے ہوئے تھی۔ تمہارے پاس آ رہی تھی، تم نے اصل میں تھوڑا سا کھلا ہوا دروازہ نہیں دیکھا۔ ایک دوسرے میں اس طرح گم تھے کہ میری دستک بھی نہیں سن سکے۔ لیکن میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ خوش ذوق لوگ اپنے ماضی کی کہانیاں بڑی دلچسپی سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور یہ بھی روپالیہ نے بالکل ٹھیک کہا کہ لندن میں زمانہ قدیم کی کچھ عمارتیں انگریزی ماحول سے متعلق ہوں تو ہوں لیکن کم از کم پرانے مندر کہیں بھی نظر نہیں آ سکتے۔ یا ہمارے طرزِ معاشرت کی عمارتی تصویریں وہاں کے ماحول میں نہیں ملتیں۔ ہندوستان میں ایسی تاریخی عمارتیں اتنی بکھری ہوئی ہیں کہ انسان کی زندگی انہیں دیکھتے دیکھتے پوری ہو جائے۔ چندی گڑھ کے نواحات میں بھی کچھ ایسی ہی عمارتیں ہیں۔ یہاں ایک پورا معاشرتی نظام کولی کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کی لوک کہانیاں بھی بڑی دلچسپی سے سنی جاتی ہیں۔ میں

تمہیں کولی کے کھنڈرات کے بارے میں ایک تفصیلی کہانی سناؤں گی۔ یہ کہانی سنانے کے بعد تمہیں وہاں کی سیر بھی کراؤں گی۔ چلو گے میرے ساتھ؟''

''کیوں نہیں آنٹی۔ آپ کے ساتھ جانے میں تو بہت لطف آئے گا۔''

''تو پہلے میں تمہیں وہ کہانی سناؤں گی۔ کیا سمجھے؟ بڑا تاریخی شہر ہے کولی۔ ہے کیا، بلکہ تھا ماضی قدیم میں۔ یہ شہر کچھ آفات کا شکار ہوا اور پھر اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ ایک دو کھنڈر وہاں نظر آتے ہیں اور بس۔ شہر کولی ایک باقاعدہ ریاست تھی اور جو کھنڈرات اب کولی کے کھنڈرات کہلاتے ہیں یہ اصل میں ریاست کول کا وسیع وعریض قلعہ تھا اور اس قلعے کی گہرائیوں میں......'' اتنا کہہ کر سریتا دیوی خاموش ہوگئی۔ روپالیہ اور میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ روپالیہ تو خیر معصوم سی لڑکی تھی، صورتحال کو کیا ہی سمجھتی۔ لیکن میرے ذہن نے بہت سے جھٹکے کھائے تھے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سریتا نے اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے اور وہ ہم دونوں کو کولی کے کھنڈرات کی جانب متوجہ کر رہی ہے تاکہ اپنے کام کا آغاز کر سکے۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی تھی، پھر اس نے کہا۔

''چھوڑو بچو، میں بھی کیا پرانی داستانیں لے کر بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے تمہیں ان داستانوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ بس روپالیہ نے پرانے مندر کا ذکر کیا تو مجھے کولی کی وہ داستان یاد آگئی جس میں راج کماری دیول دیوی اور خضر خان کی آوازیں مدفون ہیں۔''

''دیول دیوی اور خضر خان؟'' روپالیہ نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں روپالیہ! محبت تو ایک عجیب وغریب چیز ہے۔ انسان اس کے ہاتھوں اس طرح مارا جاتا ہے کہ بس سوچو تو دل دُکھے۔''

''ایسا کرتے ہیں ہردیپ! کہ آج آنٹی سے کولی کی داستان سنتے ہیں، کل گھومنے چلیں گے۔'' روپالیہ نے داستان میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہیں یہ کہانی پسند آئے تو کل میرے ساتھ کولی کے وہ کھنڈرات دیکھنے چلو۔ جو کچھ میں تمہیں وہاں دکھا سکتی ہوں کوئی اور نہیں دکھا سکتا۔''

''آنٹی، ہم ضرور چلیں گے۔ آج ہی کیوں نہ چلیں وہاں۔''

''آج نہیں، کل۔ کل اماوس ہے۔'' رانی سریتا نے کہا اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ میں خود چونک پڑا تھا۔ اماوس، ہندو لوک داستانوں میں ڈوبتے چاند

کی رات بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ تاریکیوں میں نجانے کیسے کیسے خونی کھیل جنم لیتے ہیں۔ گویا رانی نے اس خونی کھیل کا آغاز کر دیا تھا جس کی اطلاع ستنام سنگھ نے مجھے دی تھی۔

بہرحال رانی کی کہانی سن لی جائے۔ کم از کم اس بات کا تعین ہوگیا تھا کہ رانی نے اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ کل کے دن جب چاند ڈوب جائے گا، اپنے شیطانی عمل کا آغاز کرے گی۔ یہ اطلاع لازمی طور پر رانا جسپال سنگھ کو بھی دینی تھی۔

رانی جیسے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی تھی، پھر اس کی آواز ابھری۔

''ساون عروج پر تھا۔ کئی دن سے رِم جھم مینہ برس رہا تھا۔ آسمان پر حد نظر تک اُودے اُودے بادل چھائے ہوئے تھے۔ گھر گھر سے میگھ ملہار کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں جھولے جھول رہی تھیں۔ پتنگوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ آم اور پکوان بہار پر تھے اور جمنا چڑھاؤ پر۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ کچے مکان ڈھے چکے تھے، پکے ڈول رہے تھے۔ مال مویشی اور ساز وسامان سب بہہ گیا۔ لوگ چھتوں اور پیڑوں پر چڑھ گئے۔ کئی ایک بہاؤ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہر طرف دُھوم تھی، شور تھا، ساون آیا رے۔

کولی کے راجہ رائے کرن کی بیٹی قلعے کے برج پر کھڑی موسم کے حسین رنگ دیکھ رہی تھی۔ برابر ملکہ جہاں کھڑی تھی۔ پیچھے خواصیں اور خادمائیں تھیں۔ منظر انتہائی نظر فریب اور دلکش تھا۔ جھکی ہوئی گھٹا، گاتی پھوار، نکھرا ہوا سبزہ، اُجلی دُھلی عمارتیں، سانولا سلونا سماں اور اس میں کوکتی کوئلیں، چہکتے پرندے۔ راج کماری اور ملکہ جہاں مبہوت کھڑی تھیں۔ اچانک بجلی زور سے کڑکی۔ ساتھ ہی جھاڑیوں میں سمٹے ہوئے مور چنگھاڑے۔ راج کماری سہم کر پلٹی۔ ملکہ جہاں کے دوسری طرف ایک وجیہہ اور شکیل نوجوان کھڑا تھا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں۔ اتنی دیر میں کام دیوتا اپنا کام کر چکا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ بالکل ہی انجان۔ لیکن پہلی ہی نظر نے انہیں ایک مضبوط رشتے میں باندھ دیا۔ محبت کے اٹوٹ بندھن میں جکڑ دیا۔ پلک جھپکتے ہی عشق کی ساری منزلیں طے ہوگئیں۔ نوجوان راجپوت، دوشیزہ کے مدھ بھرے کنول ایسے نینوں میں کھو گیا اور راج کماری نوجوان کی وجاہت پر لٹ گئی۔ نوجوان ملکہ جہاں سے بات کر کے فوراً ہی لوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بارش تیز ہوگئی۔ راج کماری اور ملکہ

جہاں بھی برج سے اتر کر اپنے محلوں کو چلی گئیں۔

رات کو جب اسے کسی پہلو قرار نہ آیا اور حسن مجسم کے تصور نے آنکھ نہ لگنے دی تو اس نے اس خواجہ سرا کو بلا بھیجا جو سہ پہر کو برج میں موجود تھا جبکہ راج کماری سیر کر رہی تھی۔ خواجہ سرا آیا تو اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"وہ...... وہ لڑکی کون تھی جو امی حضور کے پاس کھڑی تھی؟" فرطِ جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"وہ صاحب عالم......" خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "وہ جس کے بال گھور رات جیسے کالے اور سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے تھے اور جس نے نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی؟"

"ہاں ہاں، وہی نیلی ساڑھی والی...... جلدی بتاؤ...... وہ کون تھی؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"شہزادہ عالم! وہ راج کماری دیول دیوی تھیں۔ کولی کے راجہ رائے کرن کی بیٹی۔" خواجہ سرا نے جواب دیا۔

"دیول دیوی؟" اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"جی ہاں سرکار۔" خواجہ سرا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم سمجھ گئے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

خواجہ سرا فرشی سلام کر کے رخصت ہو گیا اور وہ پھر حسین تصورات میں کھو گیا۔

ادھر راج کماری دیول دیوی بے کل تھی۔ کسی طور چین نہ آتا تھا۔ دل اڑان، نگاہیں پریشان تھیں۔ رات کروٹیں بدلتے تمام ہو گئی۔ دن کسی کو ڈھونڈتے گزر گیا۔ عشق کے مریضوں پر رات بھاری ہوتی ہے۔ بارہ بجے کی توپ داغ چکی تھی مگر وہ جاگ رہی تھی۔ صبح کو جب بستر سے اٹھی تو جوڑ جوڑ اور انگ انگ دکھ رہا تھا۔ دیر تک جاگنے سے آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر ایک ہم راز خواص نے جرأت کی اور راج کماری سے پریشانی اور وارفتگی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں نیلما!" راج کماری نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے کہا۔ "دل میں آگ سی دہک رہی ہے۔"

"اجازت ہو تو ماتا جی سے کہوں؟ شاہی وید بلوا دیں گی۔" نیلما نے تشویش کا اظہار

کیا۔

"میں بیمار تو نہیں۔" دیول دیوی خواص کی سادگی پر مسکرائی۔

"بیمار نہیں تو پھر کیا ہے؟" نیلما نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں نیلما۔ تو، تو یونہی گھبرا گئی۔" راج کماری نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ بتا وہ کون تھا جو پرسوں ملکہ جہاں سے باتیں کر رہا تھا؟"

"وہ خلجی راج تارا خضر خاں تھا راج کماری!" خواص نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"خضر خان، ملکہ جہاں کا بیٹا۔" راج کماری دیول دیوی نے زیر لب کہا اور پھر اٹھ کر باہر باغ میں چلی گئی۔ راج کماری دیول دیوی جو کبھی کولی کی رانی تھی اب سلطان علاؤ الدین خلجی کے محل میں تھی اور خوش و خرم تھی۔

اسمتھ کے بیان کے مطابق سلطان علاؤ الدین خلجی نے ہندوستان کے راجاؤں کو مطیع بنانے کے لئے 1294ء میں دکن پر حملہ کیا۔ دیوگری یا دیوگڑھ کے راجہ رام چندر دیو نے مقاومت کی مگر سلطان کی افواج کا مقابلہ نہ کر سکا اور شکست کھا کر سلطان کا فرمانبردار بن گیا۔ سلطان نے خراج کا وعدہ لے کر اس کا ملک اسے ہی بخش دیا۔ 1297ء میں سلطان نے کولی کا رُخ کیا۔ راجہ رائے کرن نے شکست کھائی اور بھاگ کر دیوگری کے بادشاہ راجہ چندر دیو کے ہاں پناہ لی۔ مالِ غنیمت میں زر و جواہر کے علاوہ انتظام ایک معتمد سردار کے سپرد کر کے علاؤ الدین فوج لے کر آگے بڑھ گیا۔ کئی برس بعد رائے کرن نے رام چندر دیو کی مدد سے گجرات میں پھر اپنا راج پاٹ جما لیا۔

کنول دیوی پہلے تو ایک قیدی رانی کی حیثیت سے سلطان کے لال محل میں رہی لیکن ...ہی اس کی موہنی صورت اور ستھری سیرت، معاملہ فہمی و نکتہ سنجی نے افغان شہنشاہ کو موہ ... آخر وہ شاہی حرم میں داخل کر لی گئی۔ کنول دیوی کی بیٹی راج کماری دیول دیوی کولی کے دارالحکومت نہروالا ہی میں رہ گئی تھی۔ رانی کو اپنے جگر گوشے سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس کے غم میں اُداس رہتی۔ اکثر رویا کرتی۔ سلطان اگر کبھی اُداسی کا سبب پوچھتا بھی تو خوبصورتی سے ٹال جاتی اور اپنا غم ظاہر نہ کرتی۔ دیول دیوی کی جدائی بہر کیف کنول کے لئے روز بروز جاں گسل بنتی جاتی تھی۔

ایک دن سلطان علاؤ الدین اپنی ہندو ملکہ کنول دیوی کے ساتھ جمنا کی سیر کر رہا تھا۔ ...ک ملکہ کچھ یاد کر کے رونے لگی۔ پھر غم نے وہ شدت اختیار کی کہ ہاتھ سے صبر کا

دامن چھوٹ گیا۔ سلطان نے دلاسہ دیا۔ ہمدردی اور محبت کا سہارا پا کر جذبات آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلے۔ بادشاہ دُکھ کی دھار کا مقابلہ نہ کر سکا اور انتہائی پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"کنول دیوی! ہم سے دل کا دکھ نہ چھپاؤ۔ بے کھٹکے بیان کرو۔ ہم تمہارا غم دور کرنے کی کوشش کریں گے چاہے ہمیں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔"

"مہاراج!" کنول دیوی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "مجھے دیولا چاہئے عالی جاہ! اپنی بیٹی...... دیول دیوی۔"

اس کی آواز غم کی گہرائیوں میں ڈوب گئی اور آنکھوں سے دُکھ کی دھار تیز ہو گئی۔

سلطان نے ملکہ کی دل جوئی کی۔ اسی وقت اپنے برادر نسبتی الغ خان کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ دیول دیوی کو حاضر کیا جائے۔ الغ خان نے شاہی حکم کی تعمیل میں اپنا سر جھکا دیا اور اگلے دن ایک لشکر جرار لے کر کولی کی طرف باگیں موڑ دیں۔

راجہ رائے کرن نے پھر شکست کھائی۔ جب میدان میں مقابلے کی ہمت نہ رہی تو ناہروالا میں قلعہ بند ہو گیا۔ سلطانی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے گزر گئے۔ آخر غذا کے ذخائر ختم ہونے لگے۔ راجہ کو عافیت صلح میں نظر آئی۔ اس نے الغ خان کو صلح کا پیغام بھیجا۔ الغ خان نے دیول دیوی حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے پہلے تو تامل کیا مگر پھر مرتا کیا نہ کرتا، اپنی بیٹی فاتحین کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن رات کو اچانک سنگل دیو (دیوگری کے راجہ) کا چھوٹا بھائی آ پہنچا اور صورتحال پھر بدل گئی راجہ رائے کرن اپنے وعدے سے پھر گیا۔

سنگل دیو، دیوگری کا راجہ تھا۔ وہ رام چندر دیو کی وفات کے بعد گدی پر بیٹھا تھا۔ وہ دیول دیوی کو اپنی رانی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو شادی کا پیغام دے کر بھیجا تھا اور دیول دیوی کے عوض رائے کرن کو امداد اور پناہ دینے کی پیشکش کی تھی راجپوت راجہ ایک مرہٹے کو اپنی بیٹی دینے پر شاید کبھی تیار نہ ہوتا اگر حالات و مصائب کے ہاتھوں عاجز و ناچار نہ ہو گیا ہوتا۔ مسلمان اس کی نظر میں ملیچھ تھے اور مرہٹے ہندو ہونے کی بناء پر مسلمانوں سے بہتر۔ اس نے ملیچھوں پر مرہٹے کو ترجیح دی اور رات کی تاریکی میں ایک مضبوط فوجی دستے کی نگرانی میں دیول دیوی کو دیوگری روانہ کر دیا۔

صبح کو جاسوسوں نے راج کماری کے چلے جانے کی اطلاع الغ خان کو دی۔ علاؤ

الدین کے غضب سے خوف کھا کر الغ خان نے فوراً راجکماری کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ اس نے اسی دم شہر سے محاصرہ ہٹا لیا اور افتاں و خیزاں دیول دیوی کو لے جانے والے دستے کے تعاقب میں چل کھڑا ہوا لیکن دستہ بہت دور نکل چکا تھا۔

کچھ دن اور کچھ راتیں بیت گئیں۔ آخر دیوگری ایک دن کی مسافت کے فاصلے پر رہ گیا۔ بظاہر دیول دیوی کے ہاتھ آنے کی کوئی امید نہ رہی۔ تاہم الغ خان اپنی سعی سے دست بردار نہ ہوا اور تعاقب جاری رکھا۔

مسلسل سفر سے سلطانی فوج تھک کر چور ہو گئی تھی۔ دوپہر کو جب آفتاب کی تمازت بڑھی تو ذرا دم لینے کے لئے ایک ندی کے کنارے سپاہیوں نے اپنی کمریں کھول دیں۔ شاہی فوج کا ایک محافظ دستہ گھومتا پھرتا ایلورا کے غاروں کی طرف جا نکلا۔ لوٹتے ہوئے راہ میں کچھ سپاہی سوار دکھائی دیئے جو بڑی تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ شاہی گشتی دستے نے ان پر دیوگری کی فوج سمجھ کر حملہ کر دیا۔ مختصر سی جھڑپ ہوئی۔ آخر سواروں نے شکست کھائی اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ ایک بڑی تعداد ہلاک ہو گئی، باقی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مالِ غنیمت سمیٹتے ہوئے شاہی دستے کے چند سپاہی ایک زخمی گھوڑے کے پاس پہنچے۔ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑے کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔ سپاہیوں نے جونہی نوجوان پر ہاتھ ڈالا برابر سے ایک زخمی عورت چلائی۔

"خبردار...... یہ دیول دیوی ہے۔ کولی کے راجہ کی سپتری۔ دیکھو راج کمار کی لاج کا دھیان رہے۔"

سپاہیوں نے فوراً ہاتھ روک لیا اور انہیں اپنی اس غیر متوقع یافت پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ راج کماری کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ لے کر الغ خان کے حضور حاضر ہوئے۔ وہ اسے لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔

کنول دیوی اپنی بیٹی کو پا کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے جب اسے چھوڑا تھا تو بچی تھی، اب جوان ہو چکی تھی۔ خوبصورت تھی۔ کنول دیوی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ دونوں فرطِ مسرت سے خوب روئیں اور دہلی کے قلعے میں خوش و خرم رہنے لگیں۔

دن گزرتے گئے۔ آخر ساون کا وہ دن بھی آ گیا جب دیول دیوی ملکہ جہاں کے شاہ برج میں کھڑی ساون کی لہر دیکھ رہی تھی۔ خضر خان اپنی ماں سے کچھ پوچھنے ادھر آیا۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ اپنے بس میں ہی نہ رہے۔

کنول دیوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ راجکماری اور ولی عہد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور پائیں باغ میں چھپ چھپ کر ملتے ہیں تو بہت بگڑی۔ اس نے دیول دیوی کو برا بھلا کہا اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دیں۔ علاوہ ازیں چند رازدار خواتین اس پر متعین کر دیں جو ہر وقت اس کی نگرانی کیا کرتیں۔ مگر محبت کی اپنی راہیں اور اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ کچھ دن تو مجبوری رہی۔ لیکن پھر وہی نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چوری چھپے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ جب ملتے تو ایک دوسرے کو اپنی محبت کا زیادہ سے زیادہ یقین دلاتے۔ غرض یہ کہ محبت عشق و جنون کی حدیں چھونے لگی۔

کنول دیوی کو جوان اُمنگوں کا جلد ہی احساس ہو گیا۔ وہ جان گئی کہ محبت کی راہ پر بڑھے ہوئے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ اس نے دیول دیوی پر لگائی ہوئی تمام بندشیں ایک ایک کر کے ختم کر دیں۔ اب دونوں آزادانہ کنول دیوی کے محل میں ملا کرتے۔ پہروں باتیں کرتے۔ گھنٹوں ساتھ رہتے۔ ساتھ کھاتے، ساتھ سیر کرتے۔ ان کی اس یکجائی و یگانگت کو دیکھ کر کنول دیوی کو یقین ہو گیا کہ اب یہ دونوں کسی طور الگ نہیں رہ سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ دونوں کو محبت کے دائمی بندھن، رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔ موقع پا کر اس نے علاؤ الدین کے سامنے دونوں کی محبت کا تذکرہ کیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ ولی عہد خضر خان کی شادی راج کماری دیول دیوی سے کر دی جائے۔

خضر خان کی ماں ملکہ دیوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے کی شادی کنول دیوی کی لڑکی سے ہو رہی ہے تو وہ بڑی چراغ پا ہوئی۔ اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ وہ اپنی بھتیجی اور الغ خان کی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد محلاتی سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس کے پہلے ہی ریلے میں کنول دیوی کی ساری اُمیدیں بہہ گئیں اور وہ بت بنی سب کچھ دیکھتی رہی۔

مشک کی طرح عشق بھی نہیں چھپا رہتا۔ خضر خان اور دیول دیوی کی محبت کے چرچے بڑھتے بڑھتے ملکہ جہاں کے کانوں تک بھی جا پہنچے۔ ملکہ عالیہ کے حکم سے دیول دیوی ''لال محل'' سے دور بھیج دی گئی۔ مگر بے سود۔ خضر خان پھر اس سے ملتا رہا۔ ملکہ کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کرنے کا اعلان کر دیا اور شہنشاہ کو مجبور کیا کہ فوراً تقریب سعید کے انعقاد کا اہتمام کرے۔ خضر خان ماں کی بالادستی کے آگے بے بس ہو گیا اور بادل نخواستہ اس کے فرمان کے سامنے اپنا سر

ھکا دیا۔

1313ء کے شروع میں خضر خان کی شادی ماموں زاد بہن سے ہو گئی۔ ملکہ جہاں بھتیجی لو اپنی بہو بنا کر بہت خوش تھی لیکن دیول دیوی اور کنول دیوی پر قیامت گزر گئی۔ صبر و شکر ے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ دونوں نے بظاہر بہت خوش دلی سے تقریب میں بھی شرکت کی۔

شادی کے بعد بھی خضر خان دیول دیوی کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ وہ اب بھی اس ے اعصاب پر بدستور چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دن تو صبر یا جبر کئے رہا، پھر اس نے لال ل کے داروغہ سے سازباز کی، اسے انعام و اکرام کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا ہ وہ دیول دیوی کو بے روک ٹوک محل میں آنے دے تاکہ پائیں باغ کے کنجوں میں قات ہو سکے۔ دونوں کی ملاقاتیں پھر شروع ہو گئیں۔ کبھی دن کو اور کبھی رات کو۔

وہ چاند کی غالباً چودھویں رات تھی۔ پائیں باغ میں چھاجوں نور برس رہا تھا۔ خضر ن اور دیول دیوی نہر کے کنارے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فضا ے اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ملکہ جہاں باغ کی سیر کرتی وہاں پہنچ ا۔ اس نے دور ہی سے دونوں کو پہچان لیا اور راستہ کاٹ کر واپس محل میں آ گئی۔

ڑی دیر بعد اس نے خضر خان کو بلا بھیجا۔ خضر خان کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ملکہ ل اسے باتیں کرتا دیکھ گئی ہے۔ اس نے ماں کے استفسار پر فوراً ہی اقرار کر لیا کہ وہ ل دیوی سے باتیں کر رہا تھا۔

''آئندہ میں تمہیں اس چھوکری کے ساتھ نہ دیکھوں۔'' ملکہ جہاں گرجی۔

''امی جان!'' شہزادے نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ......''

''مگر کیا......؟'' وہ شاہانہ تمکنت سے بولی۔

''مگر یہ کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' خضر خان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ئے تھے۔

''خضر! تم اس سے اتنی محبت کرتے ہو؟'' ملکہ جہاں اپنے بیٹے کی حالت پر پسیج چکی ا۔ خضر خان نے اقرار میں سر جھکا دیا۔ ملکہ جہاں نے محبت میں تڑپتے دل کی دھڑکن ۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ خضر خان کو دیول دیوی سے بے پناہ محبت ہے۔ پھر عورت حیثیت سے اس نے دیول دیوی کے جذبات کا اندازہ کیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس

ہو گیا۔ وہ مان گئی کہ خضر خان کو اس کی بھتیجی سے شادی کر کے کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ اس کے پیارے بیٹے کی زندگی تلخ اور ویران ہو گئی ہے۔ ایک طویل جذباتی کشمکش کے بعد اس نے بھی محبت کی بے پناہ قوت کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ دیول دیوی کو بہو بنانے پر راضی ہو گئی۔

اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کے چند ماہ بعد خضر خان نے ملکہ جہاں اور علاؤ الدین کی موجودگی میں دیول دیوی سے شادی کر لی۔ کھوئی ہوئی مسرتیں لوٹ آئیں۔ ملکہ جہاں مسرور تھی مگر الغ خان اور اس کے کنبے پر قیامت گزر گئی۔ کنول دیوی پھولے نہ سماتی تھی۔

عرصے کے بعد سلطان بیمار ہوا۔ دربار میں تخت نشینی کے سلسلے میں سازشیں شروع ہو گئیں۔ ملک کافور حبشی اپنی عسکری اور انتظامی قابلیتوں کی وجہ سے سلطان کا معتمد خاص تھا۔ اس کا دربار میں بھی بڑا اثر و رسوخ تھا۔ سلطان پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے 1309ء میں دکن پر حملہ کیا اور الفنسٹن اور اسمتھ کے بیان کے مطابق 1312ء تک ورنگل، دیوگری اور بیلال یا ہوسلا کی حکومتیں زیر کر کے انہیں سلطان کا دائمی باج گزار بنا دیا تھا۔ اس لئے سارا دربار اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سلطان کی صحت کمزور ہوئی تو سیاسی امور پر بھی اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ درباری سازشوں نے ملک کافور کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس نے بھی ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس نے خضر خان اور الغ خان کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے بتایا کہ خضر خان اپنے خسر الغ خان کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور الغ خان شہزادے کی کم عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر خود دِلّی کے تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ بیماری نے سلطان کو شکی اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ شامت اعمال انہی دنوں ملکہ جہاں نے یہ تجویز پیش کر دی کہ شادی خان کا نکاح الغ خان کی دوسری لڑکی سے کر دیا جائے۔ اس سے سلطان کا شبہ یقین میں بدل گیا۔

علاؤ الدین خلجی بڑا سخت گیر حکمران تھا۔ اس نے تمام مشتبہ افراد فوراً گرفتار کرا لئے۔ ملکہ جہاں لال محل کی ایک سہ دری میں نظر بند کر دی گئی۔ الغ خان کا سر قلم ہوا۔ شہزادہ شادی خان اور ولی عہد خضر خان پابجولاں گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیئے گئے۔ دیول دیوی نے اس پُر آشوب وقت میں خضر خان کی رفاقت کو نہ چھوڑا۔ اگرچہ اس کی ماں کنول دیوی اور دوسرے بہی خواہوں نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہ مانی اور ایک وفا پرست بیوی کی طرح

خاوند کے ساتھ گوالیار چلی گئی۔ اس نے رضا کارانہ طور پر قید و بند کی مصیبتوں کا دروازہ اپنے اوپر کھول لیا۔ بے شک اسے خضر خان سے لازوال محبت تھی۔

فرشتہ کے بیان کے مطابق ملک کافور نے علاؤ الدین کی وفات کے دوسرے دن شہزادہ شادی خان کو گوالیار کے قلعہ میں اندھا کرا دیا۔ اس نے حکم تو دونوں شہزادوں کو اندھا کرنے کا دیا تھا لیکن دیول دیوی کی گریہ و زاری اور کنول دیوی کی طرف سے انعام و اکرام کے لالچ نے جلاد کو ملک کافور کے حکم کی تعمیل سے باز رکھا اور اس نے بکرے کی آنکھیں لے جا کر مدار المہام (ملک کافور) کو پیش کر دیں۔

ملک کافور نے دربار میں سلطان کا ایک جعلی وصیت نامہ پیش کر کے نابالغ شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا اور اس طرح سے خود امورِ سلطنت انجام دینے لگا۔ لیکن جلد ہی اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ خضر خان کے چھوٹے بھائی مبارک شاہ نے اس کے خلاف بغاوت کی اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ملک کافور اور شادی خان کو فی الفور قتل کرا دیا اور ان سرداروں کو قید کر لیا جن سے ذرا بھی بغاوت کا اندیشہ تھا۔

دیول دیوی ایک عصمت مآب و وفا شعار بیوی کی طرح مصائب و آلام میں اپنے شوہر کی رفیق و دم ساز تھی۔ وہ اس کی خدمت میں راحت محسوس کرتی۔ خضر خان اس کی رفاقت و محبت میں تمام مصائب و آلام کو بھولا ہوا تھا کہ ایک دن اسے مبارک شاہ کا حکم ملا کہ دیول دیوی بلا تاخیر اس کے حوالے کر دی جائے ورنہ اس کا وہی انجام ہو گا جو ملک کافور اور شادی خان کا ہوا تھا۔ جب دیول دیوی کو سلطان دہلی کے حکم کی اطلاع ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنے شوہر کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس نے شدتِ غم سے کانپتی تھرتھراتی آواز میں کہا۔

"مجھے اپنے ہاتھوں مار دیجئے سرتاج! لیکن مبارک شاہ کے حوالے نہ کیجئے۔"

خضر خان کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے دیول دیوی کو دلاسا دیا، پیار کیا، اپنے دامن سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ جب تک خضر خان زندہ ہے، دیول دیوی کو کوئی نہیں لے جا سکتا۔

شوہر کے اس عزم بالجزم پر مظلوم عورت خوش ہو گئی۔ خضر خان کے جواب پر مبارک شاہ نے برافروختہ ہو کر اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ یہ 1312ء کا واقعہ ہے۔ پھر وہ تین برس تک سلطنت کے استحکام اور دوسرے سیاسی امور میں مصروف رہا اور دیول دیوی اسے یاد

نہ آئی۔

1319ء میں مبارک شاہ نے پھر پیغام بھیجا کہ دیول دیوی کو فوراً طلاق دے کر دہلی بھیج دیا جائے۔ خضر خان نے اسے صاف کہلا بھیجا کہ دیول دیوی اسے کبھی نہیں مل سکتی۔ مبارک شاہ نے جھلا کر حکم دیا کہ خضر خان کو قتل کر دیا جائے اور اس کی بیوی ہمارے حضور حاضر کی جائے۔

صبح کا وقت تھا۔ نماز و دُعا کے بعد دیول دیوی بیٹھی اپنے محتاج شوہر کے پیر داب رہی تھی۔ چند آدمی ننگی تلواریں لئے سہ دری میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ نابینا خضر خان نے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت طلب کی لیکن جلاد نہ مانا اور تلوار کے ایک ہی وار میں اس کی گردن اُڑا دی۔ دیول دیوی لاش کے قدموں سے لپٹ کر بے ہوش ہوگئی جلاد اور اس کے ساتھی باہر چلے گئے۔

دوپہر کو جب وہ دیول دیوی کو دہلی لے جانے کے لئے پھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ خضر خان کے پہلو میں ایک اور لاش پڑی ہے۔ ایک حسین و جمیل عورت کی لاش۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور سر خضر خان کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ یہ دیول دیوی تھی...... کولی کے راجہ رائے کرن کی بیٹی...... ہاں! کولی کے راجہ...... رائے کرن کی بیٹی!''

سریتا دیوی کی آواز سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ اتنا گہرا سرخ ہو رہا تھا جیسے سارے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ میں اور روپالیہ چونک پڑے تھے......!

☆

کھنڈرات سحر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم اسی پراسرار تہہ خانے میں کھڑے ہوئے تھے جہاں میری ملاقات ستنام سے ہوئی تھی۔ رانی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں اس تہہ خانے میں بہت کچھ کر چکا ہوں۔

''دیول دیوی......'' رانی کی آواز ابھری۔ پھر وہ خاموش ہوگئی۔ ''اس کا محبوب خضر خان اسی کھنڈر میں جو اس وقت کھنڈر نہیں تھا...... ٹھہرو میں تمہیں دکھاتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ......'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی تو روپالیہ نے سرگوشی کی۔

''ہردیپ!''

''ہوں؟''

''میرا دل گھبرا رہا ہے۔ چلو یہاں سے پلیز۔ یہ بڑی عجیب جگہ ہے۔''

''آؤ......'' رانی کی آواز ابھری۔

''ہردیپ، پلیز......'' روپالیہ نے کہا۔

''آؤ روپالیہ...... آؤ......'' میں نے کہا۔

''مگر ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''تاریخ کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے لئے۔'' میری بجائے سریتا دیوی نے کہا۔ میں نے اس کی آواز میں ایک کرختگی محسوس کی تھی۔

''ہردیپ، مجھے یہاں سے لے چلو۔'' روپالیہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ رانی اس دوران ایک پراسرار دروازہ کھول چکی تھی۔ اس نے رُک کر ہمیں گھورا، پھر بولی۔

''آؤ......''

ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پراسرار قوت ہمیں آگے دھکیل رہی ہو۔ ہم اس دروازے کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ یہاں نیم تاریک ماحول تھا لیکن رانی سریتا دیوی ہمارے پیچھے اندر آئی اور پھر اس نے نجانے کیا، کیا کہ کمرے میں ایک عجیب و

غریب روشنی پھیل گئی۔ اسے کمرہ نہیں بلکہ ایک ہال کہا جا سکتا تھا۔ اب اس روشنی میں یہ وسیع وعریض ہال مکمل طور سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میری اور روپالیہ کی نگاہیں ہال میں بھٹکنے لگیں۔ ہال میں دو تابوت رکھے ہوئے تھے۔ سفید رنگ کے تابوت۔ اور ان دونوں تابوتوں کے درمیان ایک عجیب وغریب مجسمہ ایستادہ تھا۔ وہ مجسمہ بھی غالباً سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا، سفید براق۔ لیکن یہ بے نقش تھا۔ اس کا چہرہ نقوش سے عاری تھا۔ ہمارے قدم جس طرح آگے بڑھے تھے وہ بالکل کسی سحر کی داستان معلوم ہوتی تھی۔ میں بھی ایک لمحے کے لئے عجیب وغریب کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ تب رانی نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور انہیں سر سے اونچا اٹھا کر زور سے نیچے کی طرف جھٹکا۔ روشنی کا ایک جھما کا ہوا اور سنگ مرمر کا سفید مجسمہ اچانک ہی رنگ بدلنے لگا۔ اب وہ مختلف رنگوں میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

سریتا ہماری جانب مڑی۔ اس کا چہرہ اب بہت خوفناک ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے پورے چہرے سے خون ٹپک پڑے گا۔ اس کی آواز بھی تبدیل ہو گئی۔ آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمکنے لگیں۔ پھر اس کے منہ سے ایک سحر زدہ آواز نکلی۔

''میں دیول دیوی ہوں...... رائے کرن کی بیٹی دیول دیوی۔ میرے ساتھ تاریخ نے ظلم کیا ہے۔ لیکن میں نے اس ظلم کو قبول نہیں کیا۔ خضر خان مر گیا لیکن میں اپنے دل کی دنیا ویران نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سچی پریمی تھی میں۔ سنسار نے میرے ساتھ انیائے کیا تھا۔ میں نے سنسار کے ساتھ انیائے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی آتما کو بھسم ہونے سے روک دیا۔ میں نے اپنے شریر کو بھی بھسم نہ ہونے دیا اور آتما کا سہارا لے کر وہاں سے چل پڑی۔ اور اس کے بعد میں نے سنسرانی سے مدد مانگی۔ سنسرانی مہاراج سنسار کے بہت بڑے رشی تھے۔ پہلے تو میری بات نہ مانی انہوں نے لیکن پھر انہوں نے کہا کہ دیوی! بڑا انتظار کرنا پڑے گا تجھے۔ یگ بیتانے پڑیں گے۔ میں نے کہا مہاراج، شما کر دیں مجھ پر۔ تب انہوں نے مجھے ایک سمے دے دیا۔ لیکن ایک شرط رکھی میرے سامنے اور وہ شرط میں اب پوری کرنے جا رہی ہوں۔ تم دونوں کو ہمارا پریم سپھل کرنے کے لئے اپنی بلی دینی پڑے گی، سمجھے۔ بلی دو گے تم سنسرانی مہاراج کے چرنوں میں۔ تب سنسرانی مہاراج خضر خان کو وہ جیون دے دیں گے جو اس سے چھین لیا گیا تھا، سو سال کا جیون اور مجھے بھی۔ ہم سو سال جئیں گے۔ ہمیں معاف کرنا، تمہارا کام یہی تھا۔ تم یہاں

تک آ گئے، بس اب یہی سب کچھ ہو گا۔ ہمیں شما کر دینا...... شما کر دینا ہمیں۔'' یہ کہہ کر رانی نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے اور اس کے ہاتھ میں دو کٹاریں آ گئیں، چمچماتی ہوئی۔ یہ کٹاریں ہاتھ میں پکڑ کر وہ سنسرانی کے سامنے رقص کرنے لگی۔ دیواروں سے ایک مدھم موسیقی اُبھر رہی تھی اور میں سحر زدہ کھڑا ہوا تھا۔ روپالیہ پر تو غشی طاری ہو رہی تھی۔ رانی کا رقص انتہائی خوفناک ہوتا چلا گیا۔

پھر طوفانی انداز میں رقص کرتی ہوئی وہ روپالیہ کی طرف دوڑی اور اس نے دونوں کٹاریں اس طرح پکڑ لیں کہ بس ایک لمحہ جا رہا تھا کہ روپالیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ لیکن اسی وقت دھائیں، دھائیں، کی آوازیں اُبھریں اور رانی کے بدن میں چار پانچ سوراخ ہو گئے...... وہ گولیاں اسی غار میں کسی پوشیدہ جگہ سے چلائی گئی تھیں!

تبھی رانا جسپال ایک بڑی سی چٹانی مورتی کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے اور چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ رانی کے ہاتھ سے کٹاریں گر گئی تھیں اور وہ حیرت سے اپنے بدن کے زخموں سے اُبلتے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے حیرت سے رانا جسپال کو دیکھا اور اس کے بعد چت زمین پر گر پڑی۔ اس کے منہ سے پہلے سرخ اور اس کے بعد کالا خون بہنے لگا اور اس کے حلق سے خوفناک غرغراہٹیں اُبھرنے لگیں۔

سنگ مرمر کا مجسمہ جسے وہ سنسرانی کا مجسمہ کہہ رہی تھی، اچانک ہی موم کی طرح پگھلنے لگا اور اس پگھلے ہوئے موم نے رانی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ لوگ حیرت سے اس تعجب خیز منظر کو دیکھ رہے تھے اور میں خود بھی ششدر تھا۔ میرے سامنے یہ ساری سنگین داستان بکھری پڑی تھی۔ یہاں تک کہ رانی کا جسم موم کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے بعد یہ موم زمین پر پانی کی طرح بہہ گیا۔ اب نہ وہاں مجسمے کا وجود تھا، نہ رانی کا۔

دفعتہً ہی روپالیہ کی ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ رانا جسپال اگر روپالیہ کو اپنے بازوؤں میں نہ جکڑ لیتا تو وہ زمین پر گر جاتی اور اسے چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔ رانا جسپال گہری گہری سانسیں لے کر روپالیہ کو سنبھالنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''بیٹے! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟ میں بھول گیا۔''

''خاقان جمشیدی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا روپالیہ کو اس تہہ خانے سے نکالنے میں تم میری کچھ مدد کرو گے؟'' وہ بولا۔

"ہاں آیئے۔" میں نے کہا اور اس کے بعد اس کھنڈر کے خوفناک تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ لیکن بے ہوش روپالیہ کو آسانی سے لے جانے کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ باہر آنے کے بعد میں نے رانا جسپال سے کہا۔

"کیا آپ کے پاس کوئی انتظام ہے؟ میرا مطلب ہے انہیں لے جانے کا؟"

"میرے پاس ایک بہت بڑی جیپ ہے مگر وہ ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی ہے۔" رانا جسپال نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں ہے، میں انہیں اٹھا کر وہاں تک لئے چلتا ہوں۔"

رانا جسپال نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے علاوہ چارہ کار بھی کچھ نہیں تھا۔ ویسے بھی میں اس وقت کوئی تکلف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ روپالیہ سے میرا کوئی ذہنی رشتہ تھا ہی نہیں۔ یہ تو بس ایک کھیل تھا جو رانی کھیل رہی تھی اور کھیل ختم ہو گیا تھا۔ میں نے روپالیہ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور اس کے بعد فاصلہ طے کر کے جیپ تک پہنچ گیا۔ رانا جسپال ایک عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔ روپالیہ کو جیپ میں لٹا دیا گیا۔ رانا جسپال اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"اب کیا کریں...... یہ بتاؤ۔"

"کیا آپ حویلی جانا پسند کریں گے؟"

"کیا اس کے بعد حویلی جانے کی گنجائش ہے؟" رانا جسپال نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"اس طرف تو رُخ کر کے تھوکنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے خاقان جمشیدی! تم ایک آئیڈیل نوجوان ہو۔ وقت اور تقدیر نے ہمیں جن راستوں پر لا ڈالا ہے وہ راستے بہت عجیب ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کاش! تم ایک ہندو نوجوان ہوتے...... کاش......" رانا جسپال کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تو میں تم سے ہاتھ جوڑ کر بنتی کرتا کہ میری بیٹی کو سویکار کر لو۔ اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیتا۔ سب کچھ دے دیتا تمہیں۔ میرے پاس روپالیہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ روپالیہ ہوش میں آنے کے بعد اور حقیقت معلوم ہونے کے بعد کیا کرے گی، کیا سوچے گی۔ کیسے اپنے آپ کو سنبھالے گی۔" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میرا چہرہ دیکھا۔ غالباً یہ

اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ان الفاظ نے مجھے کتنا متاثر کیا ہے۔ متاثر تو میں ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایک باپ کی پریشانیاں ایک حقیقی شکل رکھتی تھیں۔

روپالیہ میرے بارے میں ضرور سوچے گی۔ ویسے بھی مجھے اس کی فطرت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ایک سنجیدہ سی جذباتی لڑکی تھی اور اندازہ یہی ہوتا تھا کہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ جب اسے حقیقت کا علم ہو گا تو ہو سکتا ہے وہ لڑکی ہی کے انداز میں سوچے۔ لیکن یہ رانا صاحب جو کہانی مجھے سنا رہے تھے اس کی گہرائی کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ رانا صاحب ان تمام باتوں کو اور لینے دینے کے تذکرے کو غالباً مجھے رجھانے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا۔ نوجوان بھٹک جاتے ہیں۔ اتنی دولت کے ساتھ لندن کی رہائش کو کون ناپسند کرتا؟ دین دھرم الگ چیز ہے، کبھی کبھی سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہی سوچ ہو گی ان کی۔ لیکن وہ بیچارے کیا جانتے تھے کہ خاقان جمشیدی کا ماضی کیا ہے۔ اتنی بڑی دولت کم از کم خاقان جمشیدی کے سامنے بے حقیقت ہے۔ بہرحال یہ ان کی اپنی سوچ تھی۔ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے رانا جسپال سے پوچھا۔

"تو پھر آپ کا کیا ارادہ ہے رانا صاحب؟"

"بس میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم جہاں چاہو اتر سکتے ہو۔ حویلی جانا چاہو تو میں تمہیں حویلی چھوڑ دوں گا اور ایک پیشکش میں ضرور کر رہا ہوں تمہیں۔ اگر میرے ساتھ انگلینڈ چلنا چاہو تو میں مکمل ذمے داری لیتا ہوں تمہیں وہاں تک لے جانے کی اور ہر طرح کی آسائش اور سہولت بہم پہنچانے کی۔ باقی تم جیسا پسند کرو۔"

"نہیں رانا صاحب! مجھے یہیں رہنا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کیجئے، آپ جہاں جانا چاہیں جائیں۔ بس مجھے آبادی کے پاس اتار دیجئے گا۔"

رانا نے افسردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولے۔ "لندن آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔"

"جی۔ یہ وعدہ کرتا ہوں آپ سے۔"

رانا صاحب نے پھر مجھے آبادی کے پاس اتار دیا۔ میں ان سے رخصت ہو کر چل پڑا۔ روپالیہ بدستور بے ہوش تھی۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ روپالیہ سے مجھے اتنا زیادہ ذہنی لگاؤ ہوا بھی نہیں تھا اور پھر اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا۔ یہ جملے کہتے ہوئے میں فخر سے گردن نہیں اٹھا

رہا۔ انسان کسی بھی دین کو اپنائے، اسے دین دار ہونا چاہئے۔ یہی اس کے ٹھوس وجود کا
ثبوت ہوتا ہے۔ لیکن میرا تو حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا تھا۔ نام تھا خاقان جمشیدی۔ کچھ پراسرار
قوتیں مجھے مہتر بدھ، بدھی نمو، نموستی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ رانا
صاحب مجھے ہندو دھرم کی پیشکش کر رہے تھے۔ بس چوں چوں کا مرتبہ شاید اسی کو کہتے
ہیں جو میں بنایا جا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے کوئی بنا نہیں سکا تھا۔ غرض یہ کہ رانا
صاحب سے الگ ہونے کے بعد میں نے بہت سی باتیں سوچیں۔ پیدل چل پڑا۔ چلتا
رہا اور طویل فاصلہ طے کر کے چندی گڑھ کے ایک نواحی علاقے میں پہنچ گیا۔

کولی کے کھنڈرات اب پیچھے رہ گئے تھے۔ نواحی علاقہ کسی قدر دیہاتی ماحول پر مشتمل
تھا۔ تھوڑے سے پہاڑی راستے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک چھپر ہوٹل کے اندر جا بیٹھا۔
یہاں سے اس پہاڑی درّے کا نظارہ ہوتا تھا جو کہیں دور جا نکلتا تھا۔ اس جھونپڑا ہوٹل
میں بیٹھ کر میں نے چائے وغیرہ پی اور یہ سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ذہن
میں یہ خیال بھی تھا کہ بہرحال ایک انگریز افسر کا قاتل ہوں اور انگریزوں کا مطلوب۔
اگر اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہوں تو صورتحال خراب بھی ہو سکتی ہے۔

بہرحال یہ شاطر قوم اپنے دشمن کو بھولتی نہیں ہے۔ مجھے بھی بھلایا نہیں جا سکا ہوگا
کیونکہ میرے ہاتھوں انہیں بدترین زک پہنچی ہے۔ سیتا گڑھی کا رُخ کروں تو عین ممکن
ہے کہ پولیس وہاں مجھے تلاش کرے۔ پھر کیا کرنا چاہئے؟ خیر اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا
ہوتا کہ انگلینڈ واپس چلا جاؤں ورنہ رانا جسپال کی پیشکش سب سے بہتر تھی۔

نجانے کب تک اسی طرح بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت سوار
ہوئی۔ ہوٹل سے اٹھ آیا اور اس درّے میں چلنے لگا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہاں پگڈنڈی
نما راستہ بڑا خوبصورت تھا۔ دیکھوں کہاں پہنچتا ہوں۔ چنانچہ چلتا رہا اور کافی دور نکل آیا۔
پھر ایک چھوٹی سی آبادی نظر آئی۔ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ غالباً کوئی گاؤں تھا۔
میں وہاں پہنچ گیا۔ گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر وہی درّہ نما راستہ آگے کو جاتا تھا۔ یہاں
میں نے ایک پڑاؤ دیکھا۔

سفید اور گیروے لباس میں ملبوس گھٹے ہوئے سر والے کوئی سو ڈیڑھ سو افراد وہاں
موجود تھے۔ میرے قدم ان کی جانب اٹھ گئے اور پھر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بدھ مت کے
پیروکار ہیں اور ہندوستان میں کسی بدھ زیارت گاہ کی سیر کو آئے ہیں اور یہ بدھ زیارت

گاہ یہیں چندی گڑھ کے نواح میں تھی۔ میں نے آبادی کی جانب دیکھا، بہت سے خوانچہ
بردار یہاں خرید و فروخت کر رہے تھے۔ بدھ زیارت گاہ داہنی سمت ایک ڈھلان میں
اترنے کے بعد تھی۔ کافی بڑی اور پرانی عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ غیر
متوقع طور پر یہ بدھ گروہ نظر آیا تھا اور مجھے وردان سادھانی، سیوک سندھورتی، ماشرہ اور
نجانے کون کون یاد آنے لگا تھا۔ وہ بھوج پتر تو اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے گدھے کے
سر سے سینگ۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھ سے مایوس ہو کر میری طرف سے بددل ہو
گئے ہوں۔ اب تو طویل عرصے سے کسی نے میری جانب رخ نہیں کیا تھا۔ غرض یہ کہ
میرے قدم خود بخود ان کی جانب اٹھ گئے۔ ویسے بھی بستی کے ہندو اور ممکن ہے مسلمان
نوجوان یہاں موجود ہوں۔ کیونکہ مقامی لوگوں کو بھی میں ان کے درمیان گھومتے پھرتے
دیکھ رہا تھا۔

پھر میرے دل میں خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی بدھ عبادت گاہ میں کیا ہو رہا ہے۔
میں اس جانب چل پڑا۔ بدھ خانقاہ بہت قدیم بنی ہوئی تھی اور وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا
کہ یہ ترنت مادھو کی خانقاہ ہے۔ اب ترنت مادھو کا جغرافیہ کیا تھا اس بارے میں تو خیر
مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں اس خانقاہ میں داخل ہو گیا اور وہاں بدھ مت کے
پیروکاروں کی کارروائیاں دیکھتا رہا۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ بدھ بھکشو اپنے
اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

خانقاہ خاصی وسیع و عریض تھی۔ مختلف علاقوں کا جائزہ لیتا ہوا میں اس بڑے ہال میں
پہنچ گیا جہاں بہت سے بھکشو سجدہ ریز تھے۔ سامنے ہی مہاتما بدھ کا عظیم الشان مجسمہ نظر آ
رہا تھا۔ وہ سب وہاں عبادت کر رہے تھے۔ میں ان کے طریقۂ عبادت کو دیکھتا رہا اور
مجھے یوں لگا جیسے وہاں دُھند سی پھیلتی جا رہی ہو۔ اس دُھند میں گھٹن بالکل نہیں تھی۔ بس
دُھند تھی۔ خالی دُھند۔ میں نے وہاں سے نکل آنا چاہا لیکن دُھند نے اس طرح تسلط قائم
کیا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اچانک ہی یہ دُھند میرے دماغ میں داخل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سر
چکرا رہا ہو۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔
یہ کیا قصہ ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا لیکن بس یہ میرا اپنے ذہن سے آخری سوال
تھا۔ اس کے بعد میرے حواس اس طرح گم ہوئے کہ مجھے دنیا کی کچھ خبر نہ رہی۔ بے

خبری کا یہ عالم نجانے کتنا طویل تھا۔ اور جب حواس جاگے تو بہت سے احساسات نے گھیر لیا۔ میری نگاہوں نے ماحول سے روشناس ہونے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے چھت نظر آئی اور میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ چھت پر انتہائی خوبصورت نقوش کندہ تھے اور ان کی تراش اس قدر حسین تھی کہ آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔ چھت پر کندہ نقوش میں ہیرے جڑے ہوئے تھے جن کی مدھم مدھم روشنیاں چاروں طرف رنگین شعاعوں کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ قوس وقزح کا یہ حسین امتزاج پہلے ہی مرحلے میں دل و دماغ کو عجیب سی فرحت بخشتا تھا۔ وہاں سے نگاہ ہٹی تو دیواریں نظر آئیں۔ حریری پردے پڑے ہوئے تھے اور ان پردوں پر تراشے ہوئے ہیروں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ کسی خواب کا سا منظر معلوم ہوتا تھا۔ ہشمان ذکری کا محل، دولت اور امارت بہترین مثال تھا لیکن اُس پورے محل کی قیمت صرف چھت میں جڑے ہوئے ہیروں سے ادا کی جا سکتی تھی۔ اس کمرے کا ماحول تو نجانے کیا تھا۔ ہیروں کے طاؤس، خوبصورت مجسمے جو دمک رہے تھے اور ایک نگاہ دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سونے کے بنے ہوئے ہیں۔ پھر ان مجسموں کے گلوں میں پڑی ہوئی مالائیں اور ان کے سارے وجود میں جڑے ہوئے ہیرے، حسین برتن، یہ سونے اور ہیروں کا ایک ایسا امتزاج تھا کہ انسانی دماغ کام کرنا چھوڑ دے۔ میں نے اپنے جسم کو محسوس کیا تو ایک دم مجھے اندازہ ہوا کہ میں بالکل صحیح سالم حالت میں ہوں۔ جس مسہری پر میں لیٹا ہوا تھا وہ بھی سونے کی بنی ہوئی تھی اور اس میں ہیروں کے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ بہت ہی موٹا رُوئی کا گدا تھا جو میرے بدن کے نیچے تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس پورے کمرے کے ماحول کو وحشت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور دبیز قالین پر کھڑا ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا۔ تبھی چمپا کی وہ مانوس خوشبو میری ناک سے ٹکرائی اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں چندی گڑھ کی ایک نواحی بستی میں ایک بدھ خانقاہ میں گیا تھا جہاں یہ صورتحال پیش آئی۔ چمپا کی خوشبو نے میرے حواس قائم کر دیئے تھے اور میں سب کچھ سمجھتا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک بار پھر میں اسی طلسم ہوشربا میں داخل ہو گیا ہوں۔ سونے کی ایک منقش تپائی پر بھوج پتر رکھا ہوا تھا۔ یہ بہت عرصے کے بعد

میرے سامنے آیا تھا۔ میں دور کھڑا اسے گھورتا رہا، پھر آہستہ آہستہ میرے قدم بھوج پتر کی جانب اٹھ گئے۔ میں نے اسے اٹھایا اور دیکھنے لگا۔ اس پر ایک تصویر ابھری ہوئی تھی۔ یہ میرا ہی چہرہ تھا لیکن اس میں ایک حسین وجمیل لباس میں ملبوس سر پر تاج پہنے کھڑا تھا۔ اپنی یہ ہیئت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

”واہ، اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے کسی ملک کی سلطنت ملنے والی ہے۔ مگر راجاؤں، بادشاہوں کا دور تو انگریزوں نے ختم کر دیا۔ اب تو وہ بڑی بری حالت میں اور بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر یہ کون سے ملک کی مملکت ہے جو مجھے ملنے والی ہے؟ لیکن ایک بات کا یقین تھا کہ بھوج پتر پر جو کچھ نمودار ہوتا ہے اب تک تو سچ ہی ہوتا رہا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اس بھوج پتر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور اسے واپس اس کی جگہ رکھ دیا۔

بہرحال مملکت تو مل گئی تھی۔ یہ جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے تھا اسے دیکھ کر بھی عقل چکرا جاتی تھی۔ اس طلسم گاہ میں نجانے اور کیا کیا کچھ ہے۔ دفعتہً ہی مجھے خیال آیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ ایک عجیب وغریب سناٹا ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تبھی میرے منہ سے آواز نکلی۔

”کوئی ہے...... کوئی ہے تو میرے پاس آؤ۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے کئی بار یہ آواز لگائی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے بعد میں نے دروازے پر نگاہ ڈالی۔ زر و جواہر کے اس انبار کے درمیان نجانے کیوں دم کچھ گھٹنے سا لگا تھا۔ دروازے کو چھو کر دیکھا تو وہ بھی سونے ہی سے بنا ہوا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ لکڑی پر سونے کا پتر چڑھایا گیا ہو، خالص سونا ہی معلوم ہوتا تھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک چوڑی راہداری تھی جس کی دیواروں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہی رنگین روشنیاں جو ہیروں سے منتشر ہوتی تھیں۔ یہ طلسم گاہ واقعی کسی بھی انسان سے اس کے ہوش وحواس چھین لینے کے لئے کافی تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ لیتا تو اپنا ذہنی توازن کھو سکتا تھا۔ بھلا انسانی نگاہوں نے اتنا سب کچھ کہاں دیکھا ہوگا؟ اتنے زر و جواہر تو کسی ملک کے پاس بھی ہونا مشکل تھے۔

بہرحال میں اس راہداری کو طے کرتا ہوا اس کے دوسرے دروازے تک پہنچا۔ یہ دروازہ بہت ہی بڑے ہال میں کھلتا تھا۔ لیکن خدا کی پناہ یہاں بھی جو کچھ تھا، ناقابل

یقین تھا۔ سونے کے مجسمے ہر طرف ایستادہ تھے اور ان کے بدن پر ہیرے جواہرات اور سچے موتیوں کے لاتعداد زیورات ہر طرف خوبصورت برتنوں میں یہ زر و جواہر سجائے گئے تھے۔ چھت پر سونے کے فانوس اور جھاڑ لٹک رہے تھے۔ اربوں بلکہ کھربوں روپے کی مالیت کا یہ عظیم الشان خزانہ تصور سے بھی باہر تھا۔ دفعتہً ہی مجھے ایک بار پھر خیال آیا کہ کہیں میں کوئی احمقانہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کوئی ایسا خواب جو ذہنی اختراع ہو اور مجھے پاگل کئے ہوئے ہو۔ میں نے اپنے آپ کو نوچ کر، کاٹ کر دیکھا مگر ہوش میں تھا۔

یہاں کھڑے ہو کر میں نے پھر آوازیں لگائیں۔

"کوئی ہے...... کم بختو! اگر کوئی ہے تو میرے سامنے تو آؤ۔"

لیکن کوئی کمبخت نہیں آیا۔ تب میں وہاں سے بھی آگے بڑھا۔ اب ان روشنیوں کو دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس دروازے سے دوسری طرف پہنچا تو کچھ سکون ہوا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ اس کے بیچ و بیچ ایک حوض بنا ہوا تھا، کنارے پر کرسیاں تھیں۔ زمین پر چند لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں رنگین لباسوں میں ملبوس، خاص قسم کے نقش و نگار کی مالک۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک صف بنائی، پھر رکوع کی شکل میں جھک گئیں۔ ان کے منہ سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے ان آوازوں پر توجہ دی تو کچھ اس طرح کے الفاظ تھے۔

"مہتر بدھ...... تیری آمد پر ہم شکر ادا کرتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر ہماری آنکھیں روشن ہوئیں۔ مہتر بدھ، ہم تیرے عقیدت مند ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بعد کہا۔ "میں اتنی دیر سے تم لوگوں کو آوازیں دے رہا ہوں۔ میری آمد پر تم شکر گزار تو ہو لیکن میری آواز نہیں سن رہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔"

ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ سیدھی ہوئیں اور میرے گرد آ کر پھیل گئیں۔ میں ان کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ دو لڑکیاں فوراً ہی ایک چاندی، سونے سے بنی ہوئی ایک چوکی لے کر آئیں اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ چوکی انہوں نے اس حوض کے کنارے رکھی تھی اور جب میں کچھ نہ بولا تو ان میں سے کچھ لڑکیاں آگے بڑھیں، انہوں نے میرے بازو پکڑے اور مجھے چوکی کی جانب لے چلیں۔

"واہ...... اب تم وہ طلسماتی ڈرامے کرو گی جو انگریزی فلموں میں ہوا کرتے ہیں۔

بیوقوف لڑکیو! مجھے نہانا نہیں ہے۔" لیکن انہوں نے میری بات نہ سمجھی اور بازو پکڑ کر مجھے چوکی پر بٹھا دیا۔ پھر ان کے ہاتھ میرے لباس کی طرف بڑھے تو میں بوکھلا کر بولا۔

"ارے ارے، بیوقوف کی بچیو! یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

ایک بڑی انوکھی بات میں نے یہ محسوس کی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی تھیں، میری زبان تو اس کی مدافعت کر رہی تھی لیکن میرے ہاتھ انہیں نہیں روک رہے تھے۔ میں سخت اچنبھے میں تھا۔ انہوں نے میرا لباس میرے جسم سے جدا کر دیا اور میں بڑی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ مجھے واقعی یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں اتنی ساری لڑکیوں کے سامنے بے حجاب ہوں۔ لیکن انہوں نے مختلف طریقوں سے پانی نکال نکال کر میرے بدن کو دھونا شروع کر دیا۔

ان کی عقیدت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے پورے بدن کو مل مل کر صاف کیا، پھر ایک لڑکی سفید سلک کے لبادے کا ایک خوان ہاتھوں میں اٹھائے قریب پہنچ گئی اور اس کے بعد مجھے باقاعدہ یہ لباس پہنایا گیا۔ یہ لبادہ بھی بے مثال تھا لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ میں سلک کے اس سفید لبادے کو بھوج پتر میں دیکھ چکا تھا۔ وہی ہونا ہے جس کا نقش بھوج پتر پر ابھر آیا تھا۔ میری ہر طرح کی مدافعت بے جا ہے اور اس سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میرے دل نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔

بہر حال یہ لباس پہنانے کے بعد دو اور لڑکیاں آئیں اور انہوں نے ایک خوبصورت سنہری تاج میرے سر پر رکھ دیا۔ گویا اب میں تیار ہو گیا تھا۔ پھر وہ کشاں کشاں وہاں سے باہر لائیں اور ایک بار پھر ایک زرنگار کمرے میں پہنچ گیا۔

یہ کمرہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ بڑی خوبصورت میز لگی ہوئی تھی اور اس میز کے پیچھے صرف ایک کرسی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں ہے بلکہ میں اس طلسم گاہ میں ایک معمول کی حیثیت سے ہوں تو ذرا دیکھوں تو سہی آگے کیا ہوتا ہے۔ میرے سامنے پھلوں، خشک میووں اور حلووں کے انبار لگا دیئے گئے۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"بی بی! چائے، توس اور مکھن وغیرہ نہیں مل سکتا؟ تم جس شخص کو یہ سب کچھ کھلانا چاہتی ہو وہ بدنصیب پتہ نہیں کہاں ہو گا۔ ہم فقیروں کو تو بس چائے اور توس وغیرہ ہی درکار ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کو ہٹا لو۔ میں معدہ نہیں خراب کرنا چاہتا۔ میری مطلوبہ چیز مل سکے تو لے آؤ۔"

لیکن لمحوں کی دیر تھی، ایک لڑکی ٹرے لئے ہوئے سامنے آئی۔ گرم گرم چائے دانی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ ایسی لذیذ خوشبو کہ بس دل چاہے ٹوٹ پڑو۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں اور ان کے نقرئی قہقہے اب مجھے حیران نہیں کر رہے تھے بلکہ میں ان تمام چیزوں سے لطف لینے لگا تھا۔ اصل میں، میں نے سوچا تھا کہ اپنا دماغ خراب کرنا بیکار سی بات ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جو کچھ گزر رہی ہے، اسے گزاروں۔ کوئی ایسا مشکل مرحلہ نہیں ہے میرے ساتھ۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ دیکھتا ہوں صورتحال ہے کیا۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ میں ایک بار پھر اسی طلسمی چکر میں آ پھنسا ہوں جو میری تقدیر کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اب اس سے فرار کسی طور ممکن نہیں۔

بہرحال میں ناشتہ کرتا رہا۔ پھر ناشتے سے فراغت حاصل ہو گئی اور لڑکیوں نے میرے سامنے سے وہ تمام چیزیں ہٹا لیں اور ایک بار پھر میری صفائی ستھرائی کی جانے لگی۔ بھوج پتر پر نظر آنے والی تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن تجسس ابھی تک برقرار تھا۔ دفعتہً ہی باہر کسی پیتل کا بہت بڑا گاندھ بجنے کی آواز سنائی دی۔ گاندھ کی یہ آواز بھی زمانہ قدیم کے شاہی درباروں جیسی تھی۔ جیسے ہی گاندھ بجا، لڑکیاں الرٹ ہو گئیں۔ پھر سامنے والا بہت بڑا دروازہ کھلا اور چند افراد اندر داخل ہو گئے۔ لیکن ان میں سے دو کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ ایک سیوک سندھورتی تھا اور دوسرا وردان سادھانی۔ دونوں بڑے قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ پہلے میں نے ان دونوں کو جس شکل میں دیکھا تھا وہ سادھو سنتوں جیسی شکلیں تھیں لیکن اس وقت وہ زرنگار لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے کچھ اور لوگ چل رہے تھے۔ بالکل فلموں جیسا منظر تھا جیسے کسی شاہی دربار کا پیش کیا جاتا ہے۔

سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی میرے اِردگرد کھڑے ہو گئے۔ باقی جو لوگ پیچھے آئے تھے ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے گردن جھکا کر مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے کہا۔

''آیئے مہاراج! دربار آپ کا منتظر ہے۔''

میں نے تمسخرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی کو اور اس کے بعد سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اچھا ڈرامہ ہے۔ پسند آ رہا ہے مجھے۔ جاری رکھو۔''

میں نے ان دونوں کے چہروں پر بوکھلاہٹیں دیکھی تھیں لیکن کسی نے زبان سے کچھ

نہیں کہا اور میں ان کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا صدر دروازے سے باہر پہنچ گیا۔ باہر کا منظر اندر کے منظر سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ کیا زبردست ہال تھا۔ اس میں صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی خوشبودار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سارے کے سارے بدھ مت کے پیروکار معلوم ہوتے تھے۔ ان کے لباسوں سے یہی پتہ چلتا تھا۔

بہرحال مجھے لانے والے ایک طرف لے چلے اور یہاں نیل سنگھاسن بچھا ہوا تھا۔ ناقابل یقین سی چیز تھی وہ۔ نیلے رنگ کے کسی پتھر سے تراشا گیا تھا اور یہ پتھر ہیروں کی طرح چمکدار تھا۔ ایک ہی پتھر سے تراشا گیا نیل سنگھاسن ہیروں کی طرح ہی جگمگا رہا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھ گیا۔ وہ صرف میرے بیٹھنے کے لئے تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے مضحکہ خیز خیالات آ رہے تھے۔ ہندوستان ہی کی تاریخ میں سقہ کی کہانی تھی۔ ایک سقے کو ایک دن کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور اس نے چمڑے کے سکے چلوا دیئے تھے۔ یا پھر الف لیلہ کا ابوالحسن جسے ہارون رشید کی بیوی اٹھا کر لے گئی تھی اور اس نے اسے ایک دن کے لئے بادشاہ بنا دیا تھا اور بھائی ابوالحسن سالہا سال ایک بادشاہ بنے رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاہی دربار سے نکالنے کے بعد انہیں سڑکوں پر بچے پتھر مارتے تھے۔

ایسا ہی کوئی مضحکہ خیز چکر میرے ساتھ چلایا جا رہا تھا اور شاید یہ چکر چلانے والوں کا خیال ہو گا کہ وہ میری کھوپڑی بھی آؤٹ کر دیں گے۔ لیکن یہاں انہیں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں بہت مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہوں۔ میں اس جال میں گرفتار نہیں ہوں گا۔

بہرحال مجھے نیل سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا۔ ایک بار پھر گاندھ پر چوٹ پڑی اور وسیع و عریض ہال کے آخری سرے پر بنے ہوئے ایک دروازے سے کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔ چار افراد چوڑے کھانڈے لئے ہوئے جن کی دھار چمک رہی تھی اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے کچھ افراد جن میں چند کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے ہیگ، ہشمان ذکری کو تو فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ باقی کچھ اور لوگ بھی تھے جن میں دو افراد اپنی بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی کے ساتھ صاف پرتگالی نظر آتے تھے۔ لمبے چوڑے جسموں کے مالک۔ لباس سے لگتا تھا جیسے کسی قدیم جہاز کے

کپتان ہوں۔ کچھ اور افراد۔ ان سب کی تعداد ملا کر کوئی بارہ تیرہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے۔

تب میں نے لوہے کی کھڑکھڑاہٹ سنی۔ یہ ان کے پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کی آوازیں تھیں۔ گویا وہ قیدی تھے۔ میری نگاہوں کو دھوکا نہیں لگ رہا تھا۔ ہیگ اور ہشمان ذکری کو میں نے صاف پہچان لیا تھا۔ یہ تو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ یہ زندہ کہاں سے نظر آرہے ہیں۔ قیدیوں کو آگے لا کر مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے کھانڈا بردار ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی گویا میرے مشیر تھے۔ تب وردان سادھانی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

''مہا وشا...... ادرم مہا کیشو۔ وہ مجرم آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ مہا کیشو کے اس عظیم وردان کو چرانا چاہتے تھے جو مہا کیشو کی نسلوں سے چلا آرہا ہے اور جس کی سرکھشا کرنے کے لئے صدیوں سے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مہا کیشو کے پرکھوں کا یہ وردان مہا کیشو ہی کی ملکیت ہے۔ لیکن ان پاپیوں نے، ان مورکھوں نے اس پر ہمیشہ بری نگاہ ڈالی، اس کے لئے قتل و غارت گری اور خون کئے۔ زمانہ قدیم میں ایک مورکھ اس جگہ تک پہنچ گیا تھا جہاں مہا کیشو کے وردان کا نقشہ لوحِ مقدس کی شکل میں تھا۔ وہ پہاڑوں کی گہرائیوں سے اس لوح کو چرا کر لے گیا۔ تیس آدمی تھے اس کے ساتھ۔ اس نے ان میں سے سولہ کو قتل کر دیا باقی وہاں سے چلے گئے اور پھر کسی اور نے اس لوح کو دو ٹکڑے کر دیا۔ ایک ٹکڑا کہیں سے کہیں چلا گیا اور دوسرا ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔ یہ اس طرح سے طرح طرح کے اندازے لگاتے رہے۔ کبھی انہوں نے مہا کیشو کے وردان کو مصر کے اہراموں میں تلاش کیا اور انہیں مصر کے فرعونوں کی ملکیت سمجھا، کبھی انہوں نے اسے زمانہ قدیم کے کسی اور شہنشاہ کے نام سے منسوب کر دیا اور کبھی روم کی سلطنت میں۔ لیکن مہا کیشو، یہ دو منش جواب اس سنسار میں نہیں ہیں، پر ان کی آتماؤں کو آپ کے سامنے مجرم کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ دونوں اصلیت پانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ نمی ستو...... مہا بدھی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ مہا کیشو! اب یہ دونوں مجرم آپ کے سامنے موجود ہیں، ان کی تقدیر کا فیصلہ آپ کیجئے۔ جو سنسار میں نہیں ہیں ان کے لئے نرکھ کا وردان دیجئے اور جو سنسار

باسی ہیں ان کے لئے سزا تجویز کیجئے۔ آپ بہت عرصے کے بعد نیل سنگھاسن تک پہنچے ہیں۔ سارے مقدمے آہستہ آہستہ آپ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے۔''

میں نے مسکراتی نگاہوں سے ہیگ اور ہشمان ذکری کو دیکھا۔ پھر میں ہیگ سے مخاطب ہوا۔ ''ذلیل انسان! کلکتہ میں تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا کیا تیرے ذہن میں موجود ہے؟ ہپناٹزم کا ماہر ہے تو اب ایسا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے اور مجھے ہپناٹائز کر دے۔ تو، تو بہت بڑا ہپناٹسٹ ہے۔ درجنوں نام ہیں تیرے۔ تو اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہے۔ سمندری جہاز کے سفر کے دوران تو نے جس طرح مجھ پر زندگی عذاب کر دی تھی، یاد ہے تجھے؟''

ہیگ نے حقارت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''اور تو نے اس کا بدلہ لے تو لیا۔ اب کیا کرے گا میرا؟ یہ بتا۔''

''وردان سادھانی! بقول تمہارے یہ دونوں روحیں ہیں؟''

''مہا کیشو! ان میں اور بھی کچھ آتمائیں ہیں، جیسے وہ دونوں پرتگالی باشندے یا ان کے پیچھے کھڑے ہوئے وہ تین باشندے، وہ سب جیتے نہیں ہیں اور ان کے لئے کالا نرکھ تیار ہے۔ کالے نرکھ میں انہیں صدیوں جلنا ہوگا۔''

''جو مر چکے ہیں، انہیں یہاں سے نکال دو اور جو زندہ ہیں، ان کے دماغوں سے ہمارے اس خزانے کا خیال اس طرح صاف کر دو کہ مرتے وقت تک وہ کبھی اس کے بارے میں نہ سوچیں۔ اور پھر ان کو ان علاقوں سے نکال دو۔'' میں نے کہا اور ایک لمحے کے لئے سارے ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا اور پھر بھنبھناہٹوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

لوگ شاید میرے اس فیصلے پر تبصرے کر رہے تھے۔ لیکن میرے اپنے خیال میں یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ ہیگ اور ہشمان ذکری سے میرا جھگڑا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہشمان ذکری تو بس ہیگ کا دوست ہونے کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ لیکن باقی لوگوں سے میرا کوئی چکر نہیں چلا تھا۔ ہیگ وغیرہ سے بھی میں نے اپنا انتقام تو لے لیا تھا اب ان روحوں کو کالے ساگر میں ڈلوانے سے مجھے کیا حاصل ہوتا۔ دشمنی زندوں سے کی جاتی ہے، مُردوں سے نہیں۔

بہرحال اس کے بعد وردان سادھانی نے کہا۔

''مہا کیشو نے ان لوگوں کے بارے میں جو فیصلہ دیا ہے وہ حرفِ اول اور حرفِ آخر

ہے۔ اس پر کسی کو تبصرہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہر زبان خاموشی اختیار کرے۔ بات ختم ہو گئی ہے۔ مہا کیشو! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ قیدیوں کو لے جاؤ اور آزاد کر دو۔ ان کی قید ختم ہو چکی ہے۔''

تمام قیدیوں کو واپس لے جایا گیا۔ میں اب بھی اپنے آپ کو ایک دن کے سلطان کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور خود اپنے آپ پر ہنس بھی رہا تھا۔ اگر زندگی نے واقعی کبھی ہوش وحواس قائم کرنے اور کسی پُرسکون دنیا میں رہنے کا موقع دیا تو ان گزرے ہوئے واقعات کو یاد کر کے شاید سب سے زیادہ ہنسی مجھے ہی آئے، دوسروں کو تو بعد میں ہی ہنسنے کا موقع ملے گا۔ کیا عجیب وغریب کیفیت ہے میری اس وقت۔ سقہ، ایک دن کا سلطان اور نجانے کیا کیا خیالات خود میرے اپنے ذہن میں تخلیق پا رہے تھے۔ غرض یہ کہ اس کے بعد اور بہت سے مقدمات سامنے لائے گئے جو بڑے دلچسپ اور عجیب وغریب تھے۔

وقت اس طرح سے گزرتا رہا اور اس کے بعد مہا کیشو یعنی میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن اندر کا جو زرنگار ماحول تھا وہ مجھے دیوانہ کئے دے رہا تھا۔ جتنے لوگ اس خزانے کی تلاش میں تھے اور اس کے لئے خونریزی کرتے پھر رہے تھے پتہ نہیں ان میں سے کسی نے اس خزانے کو دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو دو ہی باتیں ہوتیں۔ یا تو وہ کسی ملک کو یہاں چڑھا لاتا یا پھر خودکشی ہی کر لیتا، کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتا وہ۔

بہرحال یہ ساری باتیں صرف سوچنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کرنا کیا تھا یہ تو آنے والے وقت ہی سے پتہ چل سکتا تھا۔ غرض یہ کہ اس طرح میں نے یہ دربار آرائی کی اور اس کے بعد جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو انہی لوگوں کا ایک گروہ مجھے لے کر وہاں سے چل پڑا اور میں واپس اسی آرام گاہ میں آ گیا جہاں سے نکل کر باہر گیا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ میں نجانے کب تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ دو حسین لڑکیاں میری خدمت پر معمور تھیں۔ ہال میں ان کا پورا جمگھٹا لگا ہوا تھا جن کی پُرہوس اور لالچی نگاہیں میرا طواف کرتی رہی تھیں۔

کھانے وغیرہ سے فراغت ہوئی اور پھر میں اسی بستر پر آرام کرنے لیٹ گیا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بستر پر لیٹ کر میں سوچوں کے دائروں میں گھر گیا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ یہ مہا کیشو کیا چیز ہے؟ نیا نام سنا تھا میں

نے اور وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی پہلے تو بدھ بھکشوؤں کے لباس میں میرے سامنے آتے رہے تھے لیکن اس وقت یہ بھی شہنشاہ کے مصاحب بنے ہوئے تھے۔ اگر یہ کوئی ڈرامہ ہے تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ اتنے عرصے تک کوئی ڈرامہ کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر یہ کوئی مذہبی چکر ہے تو پھر میں کیوں اس عذاب میں گرفتار ہوا ہوں؟ یہ بڑا عجیب وغریب معاملہ تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس بھوج پتر کو اس کی جگہ دیکھا اور وہ مجھے اپنی جگہ رکھا ہوا ملا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی کہ قصہ کیا ہے۔ آنے والا وقت اب کون سی نئی تصویر پیش کرتا ہے۔ میں نے وہ بھوج پتر اٹھا کر دیکھا اور ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ اب اس پر موجود تصویر بدل چکی تھی۔ میرے بدن پر گیروا لباس تھا اور میں ایک سادھو کی حیثیت سے ہاتھ میں کمنڈل لئے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاس ہی ایک لکڑی رکھی ہوئی تھی جس کا اوپری حصہ سانپ کے پھن جیسا تھا۔ سو فیصدی یہ میری ہی شکل تھی۔ باپ رے باپ...... کیا اب مجھے اس شکل میں بھی آنا پڑے گا؟ ٹھیک ہے بھائی، ٹھیک ہے۔ اب جو بھی تماشہ ہو رہا ہے اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ اب دیکھو میری یہ شکل کب ظاہر ہوتی ہے۔ مگر دیر کی کیا گنجائش تھی۔ رات کو نجانے کن کن سوچوں میں ڈوبا ہوا گہری نیند سو گیا اور صبح کو جب آنکھ کھلی تو سارا منظر بدلا ہوا تھا......!

میں نے اپنے آپ کو ایک پہاڑی سلسلے میں پایا اور ذرا سی کوششوں سے میں نے اس جگہ کو پہچان لیا۔ یہ گاشر برم کا پہاڑی سلسلہ تھا جہاں مجھے پہلے بھی لایا گیا تھا اور سامنے ہی وہ عبادت گاہ نظر آ رہی تھی جو دھرم شوالہ کے نام سے مشہور تھی۔ میرے چاروں طرف ویران پہاڑیاں بکھری ہوئی تھیں لیکن کافی فاصلے پر دھرم شوالہ میں چہل پہل نظر آ رہی تھی اور بدھ بھکشو اپنے مخصوص لباسوں میں اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ لیکن میرا ان سے اتنا فاصلہ تھا کہ مجھے ان کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ جس جگہ میں پڑا ہوا تھا وہ پتھر کی تراشی ہوئی ایک چٹان تھی۔ اور مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر ناقابل یقین گہرائیاں تھیں۔ ایسی کہ دیکھ کر دل دہشت سے بند ہو جائے۔

گاشر برم کی ان خوفناک پہاڑیوں میں کب اور کیسے پہنچا اس کا جواب تو نہ پہلے میرے پاس تھا اور نہ ہی اب میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ بہرحال پہاڑیوں کی ان گہرائیوں کی تہہ میں دھوئیں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا اور میں ششدر تھا۔ دور

خانقاہ کی کارروائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے دو افراد اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ اسی خانقاہ کی طرف سے آ رہے تھے۔ اور جیسے ہی وہ کچھ اور آگے بڑھے میں نے بدھ بھکشوؤں کے لباس میں ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک سیوک سندھورتی اور دوسرا وردان سادھانی تھا۔ دونوں مناسب رفتار سے چلتے ہوئے آخر کار میرے قریب پہنچ گئے۔ میرے چہرے پر مذاق اڑانے والی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں مجھے نوٹنکی کے دو کردار معلوم ہوتے ہو۔ حقیقتاً اس طرح روپ بدل لیتے ہو کہ انسان سوچتا ہی رہ جائے۔ اب کیا نئی کہانی لے کر آئے ہو۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہاری جادوگری بھی بے مثال ہے اور تمہارا روپ بدلنا بھی کمال کی بات ہے۔“ وہ دونوں خاموشی اور عقیدت سے گردن جھکائے میری باتیں سنتے رہے، پھر وردان سادھانی نے کہا۔

”بدھی نمو! آپ ہم پر کسی طرح کا شک نہ کریں۔ سنسار کے دو ہی تو روپ ہوتے ہیں۔ کالا، سفید۔ روشنی، اندھیرا۔ غم، خوشی۔ یہی سنسار کا روپ ہے اور اسی روپ سے سنسار چلتا ہے۔ آپ نے ہزاروں سال پہلے جنم لیا تھا ایک بادشاہ کے گھر۔ اس سے آپ کو گیان ملا تھا نہ وردان۔ یہ سورج آپ کا سیوک اور چاند آپ کا دوست تھا مہاراج۔ آپ وہ بے شک نہیں تھے لیکن اس کا سدور تھے اور یہ سدور سدھارت کے نام سے سنسار کا وردان تھا۔ وہ بھی بادشاہ تھا۔ اور جب اس نے گیان کے راستے اپنائے تو بادشاہت چھوڑ دی۔ مہاراج! یہ کہانی تو سنسار کی کہانی ہے اور اسی کہانی میں سنسار کی پرہڑتا چھپی ہوئی ہے۔ آپ سنسار میں گرشارک ہوئے۔ اور سب نے دیکھا آپ کو۔ پر مہاراج! سمے سمے کی بات ہے۔ آپ کو سنسار کی دشائیں بھٹکاتی رہیں۔ کبھی ابلیس فیوری کے روپ میں، کبھی کسی اور روپ میں اور کبھی کسی اور روپ میں۔ واسناؤں نے آپ کو گھیرا اور آپ ایک منش ہی کے انداز میں واسناؤں میں گھر گئے۔ پر نمی ستی کارم سدھارتی ہمیں آپ کا ہر روپ پسند تھا۔ ہم آپ سے یہی بنتی کرتے رہے کہ مہاراج! اپنا مقام پہچانیئے اور یہی تو ہونا ہی تھا۔ پھر نمن تندورتا نے آپ پر اپنا سایہ کیا اور آپ برائیوں کو ٹھکرانے لگے۔ سو ہم نے آپ سے دور رہ کر یہاں آپ کے لئے تیاریاں شروع کر دیں کہ سنسار میں مہتر بدھ کی آمد بدھ دھرم کے لئے شبھ تھی۔ اشبھ بھاوناؤں نے آخر کار آپ

کا پیچھا چھوڑا اور ہماری بنتی سن لی گئی۔ آپ گیان کے راستے پر چل پڑے۔ اور نمی ستو، آپ درحقیقت بہت بڑا سچ ہیں۔ آپ سچ کا دوسرا روپ ہیں۔ آپ کے پاس سنسار کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ آپ بہت سی بستیاں آباد کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو وہی روپ اپنا سکتے ہیں اور آپ کو سنسار کی ساری دشائیں مل جائیں گی۔ مگر نمی ستو! جسے بدھ کا وردان ملنے والا ہے وہ بھلا سنسار کی ان دشاؤں کا کیا کرے گا۔ آپ تو سنسار سیوک ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آپ مہتر بدھ کی یہ رسم آگے بڑھائیں گے۔

مہا ستو! اگر آپ کے من میں کچھ اُلجھن ہے تو ہم آپ کی یہ اُلجھن دور کر دیں گے۔ دھرم شوالہ درحقیقت ایک میزان ہے، ایک ترازو ہے اور وہیں سے مہتر بدھ کا وردان ہوتا ہے۔ مہتر بدھ وہیں نظر آتے ہیں اور پھر ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ان کا پالن کریں اور جب وہ بڑے وردان میں آ جائیں تو پھر ان کی سیوا کریں اور انہیں آخر کار اس گیان دھنک پر لے آئیں جہاں سے وہ بدھ مت کے پیروکاروں کے لئے روشنی کی مشعل جلا دیں۔ اور وہ سمے آ گیا ہے۔ آپ کھوٹے سے کھرے بن گئے ہیں اور ہم آپ کو اسی لئے یہاں تک لائے ہیں۔ وہ دیکھئے، سامنے دھرم شوالہ موجود ہے نمی ستو! وہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ شو جی کا مندر اور دیو استھان اشو جی، وہ آپ کے منتظر ہیں۔ آپ کو پہلے یہاں پہلا وردان دیا جائے گا، پھر آپ کو دیو استھان لے جایا جائے گا۔ نیل سنگھاسن آپ کے چرنوں سے چھو کر ایک بار پھر امر ہو گیا ہے۔“

”بک چکے...... یا ابھی اور بک بک کرنی ہے؟“ میں نے ان کی ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔ وردان سادھانی نے سیوک سندھورتی کی طرف دیکھا اور سیوک سندھورتی محبت سے مسکرا دیا۔

”آپ اگر کچھ کہنا چاہیں تو کہیں نمی ستو۔“

”بیوقوفو، میں صرف تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں سنسار کا بہت بڑا جھوٹ ہوں۔ سمجھے...... بہت بڑا جھوٹ۔“

”جھوٹ؟“ وہ دونوں بیک وقت بولے۔

”ہاں، بہت بڑا جھوٹ۔ پہلی بات تو یہ کہ میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور ظاہر ہے میرا اپنا ایک دھرم ہے۔ میرا اپنا ایک نام ہے۔ خاقان جمشیدی ہے میرا نام اور میرے باپ کا نام ہمدان جمشیدی تھا۔ تم لوگوں نے پتہ نہیں کیوں مجھے اتنا بڑا درجہ دے

دیا ہے۔"

"مگر مہاراج......"

"بتا دیا ہے میں نے تمہیں، بہت بڑا جھوٹ ہوں میں سنسار کا۔"

"یہ تو آپ ہمیشہ ہی کہتے آئے ہیں مہاراج۔"

"اس وقت بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرا مستقبل کیا ہے۔ ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر کبھی تم پر حقیقتوں کا انکشاف ہو اور تم یہ جان لو کہ میرے لئے تم صرف غلط فہمی کا شکار رہے ہو اور اس غلط فہمی میں تم نے نجانے کیا کیا کچھ کر ڈالا ہے۔ جہاں تک اس لوح کا تعلق ہے جس کے لئے ہنگامہ آرائی ہوئی تو تم لوگ یہ بھی جانتے ہو کہ نہ وہ میری منزل تھی نہ میں نے اسے اپنی منزل بنایا۔ جبکہ میرے سامنے بہت سی بار یہ بات کہی گئی کہ وہ لوح ایک بہت بڑے خزانے کا نقشہ ہے۔ میرے دوستو! خزانے تو میرے قدموں تلے بکھرے پڑے ہیں۔ میں نے خود ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا ہے جہاں اتنی دولت پائی جاتی تھی کہ میری کئی نسلیں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر شہنشاہوں کی سی زندگی گزار سکتی تھیں۔ پھر اس کے بعد نجانے کیا کیا چکر چلے اور میں دربدر ہو گیا۔ لیکن دولت نے ہمیشہ میرا تعاقب کیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے پھرتی رہی اور میں اسے ٹھوکریں میں مارتا رہا۔ ابھی چند روز پہلے ایک بار پھر مجھے دولت کے ڈھیر نجانے کیسے کیسے لالچ کے ساتھ دکھائے گئے پر میں نے انہیں بھی ٹھوکر مار دی اور یہ جو تم مجھے دکھا چکے ہو، تم یقین کرو میرے لئے بالکل بے مقصد ہے اور میں دوبارہ کبھی اسے دیکھنے یا اس کے حصول کی خواہش کا کوئی اظہار نہیں کروں گا تم سے۔ اب اس کے بعد تمہیں جو بولنا ہے تم بولو۔"

"نمی وردھنا...... ماتھن گھوچنا، کبھی کبھی منش اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ اس بڑے نے بھی اپنے آپ کو نہیں پہچانا تھا۔ وہ کرنت کردھا تھا شہزادہ سدھارت، جس کے سینے میں چراغ جلتے تھے۔ لیکن جب گیان وردان ہوا اسے تو اس نے سنسار چھوڑ دیا۔ مہا گنی! تم تو شروع ہی سے سنسار کو تیاگے ہوئے ہو۔ تم اسنے بڑے نہ ہو گے تو کیا کوئی اور ہو گا؟"

"پاگل ہو تم سالو! پاگل ہو۔ چلو میرا کیا جاتا ہے۔ آج تک میں تمہارے شوق پورے کرتا رہا ہوں، اب بھی اگر تم اپنا شوق پورا کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ اب بولو مجھے کیا کرنا ہے؟"

"آیئے مہاراج! ہمیں اس بات کا یقین ہے، سمے کا ایک لمحہ ایسا آئے گا جب اچانک ہی ہوا کا ایک جھونکا چلے گا اور آپ کے ذہن سے ساری گرد اُڑ جائے گی پھر آپ کا ہاتھ اٹھے گا اور آپ ہمیں وجے کا وردان دیں گے۔ آپ ہمیں وجے کی بھینٹ دیں گے۔ ہم اس سمے کو اپنے آپ سے زیادہ دور نہیں سمجھتے نمی ستو۔"

"میں نے کہا نا تمہاری بکواس ہوتی بڑی مزے کی ہے۔ بیوقوفو! اب یہ بتاؤ میں کیا کروں؟ تم لوگ ایک لمحے میں سین بدل دیتے ہو۔ دوسرا سین کیا ہے؟"

"آپ آیئے مہاراج! دھرم شوالہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

اور یہ دھرم شوالہ وہی سامنے والی عمارت تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ جس جگہ میں موجود ہوں وہاں خود کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے بہرطور انہی کے رحم و کرم پر رہنا ہے۔ چنانچہ ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ قدم آگے بڑھ گیا اور فاصلے کم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ میں نے اس دھرم شوالہ میں قدم رکھ دیا۔

بہت بڑا ہال نما دروازہ تھا جس سے وہ لوگ مجھے اندر لے گئے۔ اندر آنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ شو مندر کو میں نے پہلے جس ماحول میں دیکھا تھا یہ وہ ماحول نہیں تھا اور اس کے علاوہ اب میرے ذہن کے پردوں پر وہ پرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں میں والد صاحب کے ساتھ آیا تھا اور بعد میں مجھے پتہ لگا تھا کہ یہ شو مندر ہے۔ یہ دوسری جگہ تھی۔ اندر ٹڈی دل بھرا ہوا تھا۔ سفید کپڑوں میں گھٹے ہوئے سر والے بھکشو، جگہ جگہ مہاتما بدھ کے تانبے، کانسی اور سونے کے مجسمے، مجسموں کا شہر آباد تھا۔ بہت بڑی جگہ تھی۔ اتنی صاف شفاف اور اس قدر پُرسکون کہ بس لگتا تھا زندگی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

وہ لوگ مجھے ایک ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے اور بدھ بھکشو مدھم مدھم آوازوں میں کچھ گا رہے تھے۔ ان کی آوازوں کی ایک ہی لے تھی۔ وہ لوگ مجھے آگے لیتے چلے گئے۔ سامنے ہی ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک خوبصورت قالین اور پھر یہاں ایک بڑے سے برتن میں کوئی عجیب سی خوشبو سلگ رہی تھی۔ لیکن یہ بالکل ناخوشگوار نہیں تھی بلکہ انتہائی خوشگوار سی تھی۔ میں اس سارے ماحول کو دیکھ کر کچھ سحر زدہ سا ہوا جا رہا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان لوگوں نے مجھے اس قالین پر بٹھایا اور اس کے بعد ایک عجیب و غریب رسم ادا کی جانے

لگی۔ مجھے پالتی مار کر یوگا کے آسن میں بٹھا دیا گیا تھا۔ میری دونوں بغلوں کے نیچے دو لکڑیاں لگائی گئی تھیں جو غالباً اخروٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح میرے دونوں بازو اٹھ گئے تھے۔ پھر سب سے پہلے وردان سادھانی نے میرے دونوں پیروں کے انگوٹھے چھوئے اور انہیں ماتھے سے لگا کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ سیوک سندھورتی اور اس کے بعد وہاں موجود تمام بھکشو یہی عمل دوہرانے لگے۔ سفید لباس میں ملبوس بھکشو پجارنیں بھی آئیں۔ انہوں نے بھی یہی عمل کیا اور اس عمل میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ میرا بدن دُکھ گیا تھا۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد کچھ لوگ عقب سے آئے اور انہوں نے میرے کندھوں، گردن اور چہرے پر کوئی چیز لگائی۔ غالباً کوئی سیال تھا جس کے میرے بدن کو چھوتے ہی آپ لوگ یقین کریں میری ساری تھکن اس طرح دور ہو گئی جیسے تھکن کو نچوڑ لیا گیا ہو۔ پھر یہ سلسلہ دوبارہ جاری ہو گیا اور اس وقت جب سورج ڈوب گیا اور پورے ہال میں شمعیں روشن کر دی گئیں تب کہیں جا کر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن ان کا جشن بدستور جاری تھا۔ جو بھکشو میرے پیروں کے انگوٹھے چھو کر باہر نکل جاتے وہ دوبارہ واپس نہیں آتے۔ یہاں تک کہ آخری آدمی باہر نکل گیا۔ اب صرف وہی دونوں یہاں موجود تھے یعنی وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی۔ وہ خاموشی سے دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

''ہو گیا تمہارا تماشہ یا ابھی کچھ اور ہونا ہے؟''

میری اس بات کا ان لوگوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا۔

''میں تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اُٹھ کر بھاگ جاؤں گا یہاں سے۔''

سیوک سندھورتی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''کچھ لمحے اور بدھی نمو! کچھ لمحے اور۔'' اور پھر ان دونوں نے میری بغلوں کے نیچے سے لکڑیاں نکال لیں۔ بازو اکڑ کر رہ گئے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں تو بس یہیں لمبا ہوئے جا رہا ہوں۔''

''نہیں بدھی ستو، ابھی تو رات کی مشقت باقی ہے۔''

''اے، اے...... اے بھائی، بات سنو...... بات سنو یارو! دیکھو، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں وہی کر رہا ہوں جو تم کہہ رہے ہو۔ لیکن اب جب میرے اندر ہمت ہی نہ رہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''آپ کے اندر ہمت پیدا ہو جائے گی۔ یہ لیجئے...... یہ پی لیجئے۔'' وردان سادھانی

نے آگے بڑھ کر ایک پیالہ مجھے پیش کیا۔ گڑ کے پانی جیسی کوئی چیز تھی۔

''کیا ہے یہ؟''

''جو کچھ بھی ہے آپ کے شایانِ شان ہے۔''

میں نے اس شایانِ شان چیز کو چکھا، مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ پہلے ہی گھونٹ نے بڑی فرحت بخشی اور میں نے پیالہ خالی کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ وردان سادھانی مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''جی مہاستو...... اب بتائیے؟''

''ٹھیک ہے بابا، ٹھیک ہے۔''

اور واقعی ٹھیک ہی ہو گیا تھا۔ یہ چیز جو کچھ بھی تھی کم از کم اس نے مجھے اس طرح تروتازہ کر دیا تھا کہ اب نہ بدن میں تھکن تھی اور نہ نیند آ رہی تھی۔ بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ طبیعت میں فرحت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''یارو! تم لوگوں نے ایسی ایسی ایجادات کر لی ہیں کہ واقعی اگر یہ ایجادات دوسروں کو حاصل ہو جائیں تو بہت سوں کی زندگی سنبھل جائے۔ چلو اب بولو۔''

اسی وقت باہر سے چار آدمی اندر آ گئے اور ان دونوں کے کہنے پر میں کھڑا ہو گیا پھر ایک ایک قدم چلتا ہوا اس عمارت سے باہر نکلا تو باہر میں نے بدھوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ چار چار کی قطار میں بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ دروازے کے باہر ایک بہت ہی خوبصورت رتھ نما چیز رکھی ہوئی تھی جس میں ڈوری جیسے چار ڈنڈے لگے تھے۔ مجھے اس رتھ میں بٹھایا گیا تو میں نے پھر کہا۔

''کر لو، کر لو۔ جو دل چاہتا ہے کر لو۔ خود پچھتاؤ گے کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔''

عقیدت مندوں نے وہ رتھ نما چیز کاندھوں پر اٹھا لی۔ بڑا آرام دہ بنایا گیا تھا اسے۔ اب نجانے یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ بیٹا! جو دل چاہے کرتے رہو۔ خود بھگتو گے۔

ویران پہاڑی راستوں پر سفر کا آغاز ہو گیا۔ چیونٹیوں کی طرح یہ لوگ میرے آس پاس چل رہے تھے اور اس طرح کاندھے بدل رہے تھے جیسے مجھے کاندھوں پر اٹھانا ان کے لئے عقیدت کا بہت بڑا عمل ہو۔ میں نے بہت دیر تک آنکھیں کھلی رکھیں۔ آسمان پر

چاند نکل آیا تھا اور تا حد نظر پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ جفاکش لوگ پیدل سفر کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے اس رتھ میں ہچکولے لیتے ہوئے نیند آ گئی اور میں صحیح معنوں میں بے خبر سو گیا۔ بدن کو لگنے والے ہچکولے گویا ماں کی آغوش بنے ہوئے تھے۔ اور یہ سفر جاری تھا۔

نجانے کتنی دیر کے بعد آنکھ کھلی تو میں نے آسمان کے چاند کو سفر کرتے دیکھا۔ بھکشوؤں کا ٹڈی دل اب بھی سفر کر رہا تھا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور تیسری بار جب میری آنکھ کھلی تو صبح کا ستارہ ڈگمگا رہا تھا اور بھکشوؤں کا ٹڈی دل ایک پہاڑی پر چل رہا تھا۔ میں نے اس پہاڑی کو فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ پھولا کھانچن کا علاقہ تھا۔ یہ جگہ کئی بار میرے قدموں تلے آ چکی تھی اور یہاں میرے ساتھ اس سلسلے میں بڑے عجیب و غریب لمحات گزرے تھے۔

بہر حال وہ لوگ بلندیاں طے کرتے رہے اور کچھ نہیں۔ لیکن میں ان کی جفاکشی کا قائل ہو گیا تھا۔ ساری رات سفر کیا تھا انہوں نے اور اب صبح کا ستارہ ڈوب رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بلندی کی انتہا تک پہنچ گئے اور یہاں میں نے ایک بار پھر دھرم شوالہ دیکھا۔ یہ دھرم شوالہ تھا یا شِو کا مندر، یہ بات میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہی خیال دل میں تھا۔ جگہ میری جانی پہچانی تھی۔ میں اس سارے منظر کو دیکھتا ہوا ان لوگوں کے کندھوں پر آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں مجھے اتار دیا گیا اور میں نیچے اتر گیا تھا۔

وہ لوگ میرے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور پھر مجھے ایک بڑے سے اونچے چبوترے پر چڑھایا گیا جہاں قالین بچھا ہوا تھا۔ چاروں طرف خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں اور بہت سے پجاری یہاں پہلے سے میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کے گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ نمی بدھو...... نموستو...... ست گاترے...... ست گاترم...... نمی ستو...... نمی بدھو۔'' ایک بار پھر مجھے قالین پر اسی طرح آسن مار کر بٹھا دیا گیا۔

''اب کیا تماشہ ہو رہا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''مہاترم...... مہاوردانی...... دلائی لامہ آنے والے ہیں اور بس وہ تمہارے سر پر مہتر بدھ کا تاج رکھ دیں گے اور آج صبح جب سورج نکلے گا تو ہمارے دھرم میں ایک نئے بدھ کا اضافہ ہو جائے گا جو ہمیں گیان دے گا۔ مہا گیانی نمو بدھو...... نموستو۔'' میں ایک

ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا۔

''بھائیو! جو دل چاہے کر لو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ اب دیکھوں گا کہ تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ تمہارا سلوک پسند نہ آیا تو راہِ فرار اختیار کر لوں گا اور کیا کر سکتا ہوں۔''

انتظار جاری رہا۔ پھر کافی وقت گزرا اور ایک بار پھر باہر سے شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ یہ شور شرابا دلائی لامہ کے آنے کا تھا۔ جو شخص اندر لایا گیا وہ ایک چوکی پر بیٹھا ہوا تھا اور چار آدمی یہ چوکی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ انتہائی بوڑھا اور لاغر آدمی تھا۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ بھی بالکل سوکھا ہوا تھا اور سر گھٹا ہوا تھا۔ لیکن اس کے سارے وجود میں اُس کی آنکھیں بڑی جاندار تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ایک انتہائی تندرست اور توانا آدمی نگاہوں کے سامنے ہے۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سا جلال تھا۔

وہ اندر آ گیا۔ چوکی کو ایک جگہ رکھ دیا گیا۔ یہ جگہ اس جگہ کے بالکل سامنے تھی جہاں مجھے بٹھایا گیا تھا۔ دلائی لامہ مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے کچھ چنگاریاں نکل رہی ہوں اور میرے دماغ میں پیوست ہو رہی ہوں۔ میں نے بھی اس پر سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ کچھ لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے، پھر دلائی لامہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر کھنچ گئی اور اس کی آواز ابھری۔

''ہاں! تو کہتا ہے کہ تیرا وجود اس کائنات کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ تو بہت بڑا سچ ہے اور سچائی انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ جو انسان ہوتے ہیں وہ سچے ہوتے ہیں اور جو ہوس کے ہاتھوں حیوان بن جاتے ہیں ان کا سارا جیون جھوٹ بن کر رہ جاتا ہے۔ سیوک سندھورتی، وردان سادھانی، تم لوگوں سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ بہت بڑی غلطی۔ یہ تم سے کیا کہتا رہا ہے مجھے بتاؤ؟''

''مقدس رہنما! اس نے کبھی اپنے آپ کو مہتر بدھ تسلیم نہیں کیا۔ اس کے ذہن میں وہ وسعتیں نہیں آئیں جو اسے دھرم کی طرف راغب کرتیں۔''

''بیوقوفو! سارے دھرم سچے ہوتے ہیں۔ اس دھرم کا نام بتا دو مجھے جو تمہیں برائیوں کی طرف لے جاتا ہو، جو تم سے کہتا ہو کہ انسان سے انسان کا جیون چھیننا ثواب ہے۔ جو تم سے کہتا ہو کہ کسی مظلوم کی آہوں پر کان بند کر لینا اچھی بات ہے۔ جو تم سے کہتا ہو

کہ غریبوں سے ان کا حق چھین لینا اچھی بات ہے۔ نہیں...... ہر دھرم نیکیوں کے راستے دکھاتا ہے چاہے بدھ مت ہو چاہے اسلام۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ لوگ خود دین دھرم کے اصولوں کو پیچھے چھوڑ کر صرف اپنی واسناؤں کو اپنا دھرم بنا لیتے ہیں۔ پاپیو! اس نے اس لئے اپنے آپ کو مہتر نہیں تسلیم کیا کہ یہ مہتر نہیں ہے۔"

دلائی لامہ کی آواز رُکی تو چاروں طرف ایک غلغلہ سا مچ گیا۔ لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ اتنا شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔ کچھ لمحے اسی طرح گزر گئے۔ پھر دلائی لامہ کی آواز ابھری۔

"خاموش ہو جاؤ۔ میری پوری بات سن لو۔ ہاں...... یہ مہتر نہیں ہے اور یہ برا انسان بھی نہیں ہے۔ ورنہ جس طرح دین دھرم کے باسیوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ مہتر بدھ ہے اور وہ اسے وہ تمام قوتیں دینے پر راضی ہو گئے جنہیں اگر یہ مکمل طور پر حاصل کر لیتا تو بہت بڑی طاقت بن سکتا تھا اور اس کے بعد تم لوگ تو دھوکے ہی میں رہتے۔ یہ تم پر راج کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک سچے دین کا پیروکار ہے۔ مذہب اسلام نیکیوں اور سچائیوں کے تمام اصولوں سے سجا ہوا ہے اور اگر کوئی ان اصولوں کو مان لے تو وہ بھٹک نہیں سکتا۔ یہ ایک مسلمان کا بیٹا ہے۔ برائیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن دین دھرم ان برائیوں کو چھپا لیتے ہیں۔ اس نے تمہاری بات تسلیم نہیں کی اور انسانوں کی طرح ہی زندگی گزاری۔ پھر بڑی بات یہ کہ یہ لالچی نہیں تھا کہ خزانوں کے پھیر میں آ کر دھوکے کی زندگی اپنا لیتا، یہ ایک اچھا انسان ہے اور اچھے انسانوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہی چاہئے۔ یہ دوسرے اچھے انسان کا اصول ہوتا ہے اور میں تمہیں وردان سادھائی! اور تمہیں خاقان جمشیدی! حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ قصور نہ وردان سادھائی کا ہے نہ تمہارا۔

تم اس دن اپنے باپ کے ساتھ شکار کھیلتے ہوئے دھرم شوالہ پہنچے جہاں مہاتما بدھ کا مجسمہ ایستادہ ہے اور پھر تمہیں نیند آئی تو تم مہانی بدھوتی کے چرنوں میں سو گئے۔ ان کی آغوش میں لیٹ گئے۔ یہ ہمارا دھرم سرندھ ہے کہ مہتر بدھ جو ہر صدی میں دھرم استھان کرتا ہے، شِو مہاراج کے چرنوں ہی میں نمودار ہوتا ہے اور دھرم سیوک اس کی آمد کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب وہ مہاتما بدھ کے چرنوں میں نمودار ہوتا ہے تو اسے لے آیا جاتا ہے، اس کی پرورش کی جاتی ہے، اسے سنسار کی نیکیوں سے روشناس کرایا جاتا

ہے، اسے پوتر اور پاک رکھا جاتا ہے تاکہ وہ عقل پانے کے بعد دھرم کا پالن ہار بن جائے۔ جب تم شکار کھیلتے کھیلتے وہاں جا کر مہاتما بدھ کے چرنوں میں سو گئے تو وردان سادھائی اور سیوک سندھورتی نے تمہیں دیکھا اور یہی سمجھے کہ مہتر بدھ کا سکنڈ ہو گیا ہے اور پھر انہوں نے تمہیں مستقبل کا مہتر بدھ سمجھنا شروع کر دیا اور تمہارے لئے تمام راستے سجائے جانے لگے۔ لیکن تم ظاہر ہے مہتر بدھ نہیں تھے۔ تم نے وہی سب کچھ کیا جو سنسار میں رہنے والے کرتے ہیں، کہیں اچھا کہیں برا۔ تم سنسار کی تمام مشکلوں میں گھرے۔ یہ لوگ تمہاری سہائتا بھی کرتے رہے۔ پرنتو تم تو سنسار باسی تھے، جو تمہارے من میں آیا وہی کرتے رہے۔ اور آخر کار یہ باولے تمہیں یہاں تک لے آئے اور تم سے یہ سب کچھ چاہنے لگے۔ وردان سادھائی! مہتر بدھ ابھی تک نہیں پہنچا ہے لیکن وہ شِو مہاراج کے چرنوں میں آ چکا ہے۔ دیکھو...... میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر دلائی لامہ نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور سامنے کے حصے میں ایک تصویر سی ابھرنے لگی۔ میں نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا کہ پھولا کھانچن کا دھرم شوالہ نگاہوں کے سامنے واضح ہونے لگا۔ وہ تمام راستے نظر آنے لگے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ وہ جگہ نظر آنے لگی جب میں سیتا گڑھی سے کچھ فاصلے پر والد صاحب کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا اور پھر راستہ بھٹک کر وہاں تک پہنچا تھا جہاں وہ عظیم الشان مجسمہ تھا۔ اس مجسمے کی آغوش میں مجھے نیند آ گئی تھی۔

یہ مجسمہ نہ صرف میری بلکہ تمام لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھا اور دس گیارہ سال کا ایک خوبصورت سا بچہ اس مجسمے کی آغوش میں سو رہا تھا۔ اتنا حسین اور پُر وقار بچہ تھا یہ کہ دیکھ کر دل اس کی جانب کھنچتا تھا۔ دلائی لامہ کی آواز ابھری۔

"اوم نموستی...... اوم نموستی...... اوم دھم نموستی۔"

وہاں جتنے افراد تھے ان کے سر جھک گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور ہر طرف سے اوم نموستی کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ تب دلائی لامہ نے کہا۔

"اور وردان سادھائی، سیوک سندھورتی! جاؤ اور جنم لینے والے مہتر بدھ کو اپنی تحویل میں لے لو۔ تمہارا کام وہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اصل مہتر بدھ تمہیں جس کی پرورش کرنی پڑے گی۔ اور اس کے بعد تمہیں اسے اپنا سندھان بنانا ہو گا۔"

چاروں طرف ایک شور مچ گیا تھا۔ اوم نموستی، اوم نموستی کی آوازیں ہر طرف سے اُبھر

رہی تھیں۔ بدھ راہبوں نے مندر سے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہاں صرف دس پندرہ راہب رہ گئے۔ یہ بھکشو دلائی لامہ کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔

تب دلائی لامہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑے اور اچھے انسان! تم نے ہمارے دھرم کو خراب کرنے کی بجائے اس کی سیوا کی ہے۔ تم نے وہ کیا ہے جو کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے اس عظیم الشان خزانے کو بھی اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ تم اندر سے اس خزانے سے کہیں زیادہ بڑے ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ اب ہم تمہاری کیا سیوا کریں؟ تم جب تک چاہو ہمارے مہمان رہ سکتے ہو، جب چاہو یہاں سے جا سکتے ہو۔ ہم تمہیں ہر طرح کی مدد دیں گے۔''

''خیر، مجھے کسی کی مدد درکار نہیں ہے۔ اگر میری زندگی کے کچھ حالات آپ کو معلوم ہیں بزرگ راہب! تو ان میں سے کچھ باتیں اہم ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستانی پولیس، انگریز حکومت مجھے ایک مجرم سمجھتی ہے اور ایک بڑے افسر کے قتل کے الزام میں میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں یہاں آ گیا ہوں لیکن میرے ذہن میں یہ خیال ہے کہ اب اگر میں اپنی دنیا میں واپس جاتا ہوں تو مجھے اس مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''دھرم سدھو...... سہاگ منی! ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو سنسار کے کمزور ترین لوگ ہیں۔ لیکن جو کچھ ہمیں دیا گیا ہے اس کا سہارا لے کر میں پہلی بات تم سے یہ کہتا ہوں خاقان جمشیدی! کہ ان تمام متعلقہ محکموں، اداروں، انسانوں کے ذہن سے یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دی گئی ہے کہ تم نے ہندوستان میں کوئی جرم کیا ہے اور تم پولیس کو درکار ہو۔ اگر کوئی تمہاری نشاندہی بھی کرے گا تو کبھی کوئی تسلیم نہیں کرے گا کہ ایسا کوئی جرم تم سے سرزد ہوا ہے۔ سمجھ لو تمام متعلقہ لوگوں کے ذہن سے یہ بات مٹا دی گئی ہے اور یہ بالکل جھوٹ یا دھوکا نہیں ہے۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سچ ہے۔ اور جب تم نے ہم سے جھوٹ نہیں بولا تو ہم بھی تم سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اب تم انگریز حکومت کے مجرم نہیں رہے اور ہندوستان بھر میں آزاد ہو۔ اس کے علاوہ ہم چار محافظ تمہارے اردگرد اکٹھا کرتے ہیں۔ تمہارے دشمنوں کو یا انہیں جو تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں گے یہ چاروں سنبھال لیں گے اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے چاہے دن ہو یا رات۔ اس کے علاوہ تمہیں اس خزانے میں سے جو کچھ چاہئے ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ لے لو۔ یہ تو ہماری طرف سے پیشکش ہے۔ اس کے بعد تم بتاؤ تمہیں کیا چاہئے؟''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''انسانی خواہشات اتنی ہی ہوتی ہیں کہ زندگی سکون اور آرام سے گزر جائے اور اس کے لئے میرے پاس معقول بندوبست ہے۔ خوف صرف یہی ہے کہ ہندوستان واپس جانے کے بعد انگریز حکومت مجھے پریشان نہ کرے۔''

''اس بارے میں تمہیں ہم پر بھروسہ کرنا ہوگا اور بہت مختصر وقت تمہیں یہ بتا دے گا کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے غلط نہیں کہا ہے۔''

''نہیں، مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ لوگ غلط نہیں کہیں گے۔''

بہرحال یہ سارے معاملات چلتے رہے اور اس کے بعد ایک دن مجھے یہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ دلائی لامہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا۔ جو منظر اس نے یہاں دھرم شوالہ میں دکھایا تھا وہ شو مندر میں حقیقی شکل میں موجود تھا یعنی ایک ایسا بچہ جو مستقبل کا مہتر بدھ تھا۔

میں وہاں سے چل پڑا۔ میرا سفر بے مقصد ہی تھا۔ اپنے ساتھ میں نے بہت بڑی رقم نہیں لی تھی بس ضروریات کی کچھ چیزیں۔ رخ سیتا گڑھی کی طرف ہی تھا۔ اعتماد بے شک تھا لیکن پھر بھی محتاط رہنا چاہتا تھا۔ جن چار محافظوں کو میرے ساتھ بھیجا گیا تھا وہ البتہ میرے لئے بہت ہی پراسرار شخصیتوں کے مالک تھے۔ میں نے ان چاروں کو دیکھا تھا جو اپنے چہرے کے نقوش سے پتھر کے لوگ معلوم ہوتے تھے اور اس طرح میری ہر بات پر سر جھکاتے تھے جیسے انسان نہ ہوں مشین ہوں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں تک کہ سفر کے دوران میں نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ وہ کسی دوسرے کی نگاہوں میں نہیں آتے۔ اور میں نے یہ سوال ان سے کر ہی ڈالا۔

''سنو...... کیا دوسرے لوگ تمہیں نہیں دیکھ سکتے؟''

''نمی ستو...... ہم آپ کے خادم ہیں، صرف آپ کے۔ اور ہمیں صرف آپ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ہمیں چھو سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ ہم اپنی ضروریات بھی خود ہی پوری کر لیتے ہیں۔ آپ کی طرف سے ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں نمی ستو...... جس چیز کی آپ کو طلب ہو بس ایک بار اس کا نام لے دیں، وہ آپ کو حاضر کر دی جائے گی۔''

یہ واقعی ایک بہت بڑی تقویت تھی اور مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہوتا جا رہا تھا۔ سیتا گڑھی تک کے سفر کے دوران میں اپنے ان تمام رشتوں کو یاد کرنے لگا جن سے پہلے بھی

مجھے کوئی رغبت نہیں رہی تھی۔ میں نے تو زندگی میں صرف دو ہی کردار دیکھے تھے، ماں اور باپ۔ حالانکہ والد محترم نے بڑے جھنڈے گاڑے تھے اور وہ جھنڈے آج بھی سیتا گڑھی کے مختلف حصوں میں لہرا رہے تھے۔ انہیں میرے ہی خاندان سے منسوب کیا جاتا تھا اور ان میں وہ نرس صاحبہ بھی تھیں جنہوں نے میری پیدائش کرائی تھی اور جنہیں والد صاحب نے بعد میں نئی بیگم کا اعزاز دے دیا تھا بلکہ شاید یہی ان کی آخری بیگم تھیں۔ بھلا ہمدان جمشیدی جیسے شخص کے لئے اتنی ساری بیویاں پال لینا کون سا اہم مسئلہ تھا۔ وہ سبھی کی پرورش کر سکتے تھے اور سبھی کا انتظام موجود تھا۔ یہ تمام تفصیلات تو مجھے سیتا گڑھی پہنچنے کے بعد معلوم ہوئیں۔

بہرحال ایک دلچسپ عمل تھا۔ انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں اور ان مختلف ادوار میں اس کے مختلف شوق۔ مثلاً بچپن میں والد نے سیر و شکار کی عادت ڈال دی تھی اور لگتا تھا کہ زندگی اسی میں گزر جائے گی۔ لیکن بعد میں حالات تبدیل ہو گئے۔ سیر و شکار کی منزل سے نکلا تو تعلیم کی دنیا میں بھیج دیا گیا۔ تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد عملی زندگی میں لایا گیا۔ بے شک وہاں سے حالات بگڑ گئے۔ لیکن پھر جو فیصلے کئے وہ اپنی مرضی سے کئے اور اپنی مرضی کے ان فیصلوں میں ایلس فیوری، عالیہ، امینہ اور دوسرے کردار شامل تھے۔ یہاں تک کہ ہشمان ذکری، ہیگ اور نجانے کون کون۔ پھر گاشر برم اور اس کے بعد کے سارے چکر۔ لیکن اب سیتا گڑھی آنے کے بعد جب میں نے سیتا گڑھی کی فضاؤں میں قدم رکھا تو نجانے کیوں دل میں بہت سے جذبے ابھر آئے۔ کچھ رشتے، کچھ ناطے، کچھ اپنے، کچھ بیگانے۔ سیتا گڑھی میں تو خیر دوست وغیرہ نہیں تھے البتہ کلکتے میں بہت سی شناسائیاں ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ خوف دل سے نہیں نکال سکا تھا کہ کلکتہ میرے لئے خطرناک ہو سکتا ہے اور کلکتہ جانے کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔

آخر کار سیتا گڑھی کی حویلی پر پہنچ گیا۔ حویلی کی شکل دیکھ کر دل میں بہت سے خیالات جاگ اٹھے تھے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے بچپن کو کبھی نہیں بھولتا اور بچپن بھی اسے کبھی نہیں بھولتا۔ حویلی کا عظیم الشان پھاٹک جو انتہائی موٹی اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا، آج بھی پورے وقار کے ساتھ گردن اٹھائے ہوئے تھا۔ ذیلی کھڑکی کی دوسری طرف بابا نظام ہوا کرتے تھے، مضبوط اور طاقتور جسامت کے مالک جنہوں نے پوری زندگی حویلی کے اس داخلی دروازے کی حفاظت کی تھی۔ میں نے ذیلی کھڑکی کو تھوڑا سا

دھکیلا تو وہ کھل گئی۔ لیکن بابا نظام دوسری طرف موجود نہیں تھے۔ ڈیوڑھی میں چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر بستر اور تکیہ بھی تھا۔ لیکن یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بابا نظام اب یہاں ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ اسی وقت ایک جوان آدمی بھاگا ہوا آیا اور مجھے گھورتا ہوا بولا۔

"بغیر اجازت اندر کیسے گھس آئے بھائی، کسی سے پوچھا گچھا؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ نیا دربان معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔ "کوئی تھا ہی نہیں دروازے پر۔ کس سے پوچھتا؟"

"اب بحث بھی کرو گے۔ بتاؤ کس سے ملنا ہے؟"

"سب سے ملنا ہے۔ کون کون ہے یہاں؟ کون مل سکتا ہے؟"

"تمہیں کس سے ملنا ہے، یہ بتاؤ؟"

"ہاں مجھے کس سے ملنا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ طارق صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"وہ سامنے کھڑے ہیں۔" اس شخص نے اشارہ کیا اور میں آگے بڑھا تو اس نے جلدی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی...... ارے کون ہو؟ کیا ہو؟ اپنی شناخت تو کراؤ۔"

"رہنے دو یار۔ میں مل لوں گا ان سے جا کر۔ میری شناخت خود بخود ہو جائے گی۔ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تم میری شناخت نہ حاصل کرو۔"

"باہر نکلو...... چلو باہر جا کر کھڑے ہو۔ نام پتہ بتاؤ...... گھر ہے یہ، بڑے آدمیوں کا گھر ہے۔ طریقہ سلیقہ سیکھو۔ شناخت کرائے بغیر تم اندر نہیں جا سکتے۔"

"شناخت چاہتے ہو میری؟" میں نے کہا۔

"بالکل...... بالکل چاہتے ہیں۔ تم باہر نہیں نکلو گے؟"

دوسرے لمحے میرا مضبوط تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ پٹاخے کی آواز ہوئی اور وہ ٹیڑھے منہ کے ساتھ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن پھر یوں لگا کسی نے اس کے لات ماری ہو۔ اس نے قلابازی کھائی اور نیچے جا گرا۔ تبھی کسی نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ دوسری قلابازی، تیسری اور پھر چوتھی اور اس کے بعد وہ لمبا پڑ گیا۔ طارق جمشیدی نے دور سے یہ اچھل کود دیکھ لی تھی۔ چنانچہ وہ حیرت سے اس طرف مڑے۔ یہ طارق جمشیدی صاحب مائہ قدیم کے آدمی تھے یعنی اس وقت کے جب میرے والد زندہ تھے اور میرے والد

کے چچا زاد بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ چچا کا تو خیر عالم جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن طارق جمشیدی صاحب اپنی پوری فیملی کے ساتھ یہیں ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کی صحت قابل رشک تھی۔ دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتے تھے اور بذاتِ خود بڑے تیز طرار تھے۔ یہ ہنگامہ آرائی دیکھ کر اس طرف لپکے اور تیزی سے قریب آ گئے۔ انہوں نے دربان کو بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

''یہ...... یہ کیا ہوا؟''

''پتہ نہیں۔ بیچارے کو کوئی مرض معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تو مجھ سے کہنے لگا کہ میں اپنی شناخت کراؤں۔ میں نے صرف ایک تھپڑ مارا تھا، بعد میں اس نے کئی قلابازیاں کھائیں اور بے ہوش ہو گیا۔

''تم نے اسے تھپڑ مارا تھا؟'' طارق جمشیدی نے کہا۔

''جی چچا جان! اب بھلا اپنی شناخت کس طرح کراتا اسے؟''

''چچا جان......؟'' طارق جمشیدی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے بعد مجھے گھورنے لگے۔ پھر ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش ابھرے اور اس کے بعد ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔

''تت...... تم...... تم خاقان......''

''خدا کا شکر ہے۔ آپ کے دربان نے تو مجھے نہیں پہچانا، آپ ہی نے پہچان لیا۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ ویسے یہاں بابا نظام ہوا کرتے تھے، وہ کہاں گئے؟''

''ارے، ارے تم آؤ...... آؤ...... ارے تم...... ارے تم زندہ سلامت ہو۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''پتہ نہیں میرے زندہ سلامت ہونے سے آپ کو خوشی ہوئی ہے یا دکھ۔''

''تم واپس آ گئے خاقان، تم واپس آ گئے؟'' چچا جان کے انداز میں اب بھی وہی حیرت اور وحشت تھی پھر مجھ سے کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر دوڑ گئے۔ میں ان کی اس بوکھلاہٹ پر مسکرا رہا تھا۔ دنیا داری سے بہت زیادہ واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اب عمر کی اس منزل میں تھا کہ بے عقلی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اتنی عقل رکھتا تھا کہ یہ جان سکوں کہ میری آمد سے کسے کسے کیا نقصان اور کیا دکھ ہو سکتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد حویلی کے سارے کردار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ رشتے کی

ایک پھوپھی جان تھیں جنہیں والد صاحب بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ بے اولاد تھیں اس لئے ان کے زیادہ مسائل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے چچا، تایا زاد بہن بھائی، کچھ بزرگ، یہ سارے کے سارے یہاں موجود تھے اور مجھ سے اپنی محبتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ البتہ چند ہی لمحوں میں ایک بات میں نے بخوبی محسوس کر لی تھی کہ یہاں اقتدار طارق جمشیدی کے پاس ہی ہے۔ طارق جمشیدی کے علاوہ دو اور چچا حضرات بھی تھے جو اپنے خاندانوں کے ساتھ یہیں رہا کرتے تھے۔ یہ طارق جمشیدی کے سگے بھائی نہیں تھے بلکہ والد صاحب کے اور دوسرے رشتے داروں میں سے تھے۔

چنانچہ سب کی محبتوں کے ڈونگرے برسنے لگے۔ میں ان سب سے بہت محبت سے پیش آ رہا تھا۔ پھوپھی رقیہ بیگم نے بہت دیر تک مجھے سینے سے لگائے رکھا تھا اور روتی رہی تھیں۔ طارق جمشیدی صاحب بھی بڑی محبت کا اظہار کر رہے تھے اور اب ساری حیرانی دور ہو گئی تھی۔ طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔

''کہاں رہے بیٹے؟ تم تو اس طرح گم ہو گئے جیسے آسمانوں میں کھو گئے ہو۔ نجانے کہاں کہاں تلاش کیا ہم نے تمہیں۔ ہمدان بھائی مرحوم اور بھابی صاحبہ رو رو کر اندھے ہو گئے تھے تمہارے لئے۔ پتہ نہیں کیا کیا الزامات عائد کئے گئے تم پر۔ یہ انگریز حکومت بھلا کسی کی دوست ہو سکتی ہے۔ بہت سے لوگ آتے جاتے رہے تمہاری تلاش میں۔''

''جی چچا جان! ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ انگریز حکومت کے لئے اس لئے قابل توجہ تھا کہ وہ مجھے افسر اعلیٰ بنانا چاہتی تھی اور میں نے انگریز کی نوکری کرنا قبول نہیں کیا۔''

بہرحال یہ ساری باتیں ہوتی رہیں اور میں ان سب کی سنتا رہا۔ طارق جمشیدی نے بظاہر تو بڑی محبت کا ثبوت دیا تھا لیکن مجھے اس کی آنکھوں کی مکاری بہت عجیب لگ رہی تھی۔ یوں اس حویلی میں میری آمد بظاہر تو بڑی خوشگوار محسوس کی گئی تھی۔ بہت سے رشتے ناطے دار تھے، لڑکیاں بالیاں بھی تھیں، سارے کے سارے تھے۔ لیکن مجھے اپنے ماں باپ کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

پھر مجھے آرام کے لئے میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بڑا شاندار کمرہ تھا۔ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ۔ طارق چچا نے کہا۔

''بس یوں سمجھ لو خاقان! دن رات تمہارے بارے میں بات چیت ہوا کرتی تھی۔ کسی نہ کسی موقع سے تمہارا ذکر نکل ہی آیا کرتا تھا۔ بھلا تم کوئی بھلائے جانے کے قابل

تھے؟ یہ کمرہ تمہارے لئے ہی تیار رکھا گیا تھا۔ اور کیسی کیسی دعائیں نہیں مانگتے تھے ہم کہ معبودِ الٰہی! اس کمرے کے مکین کو ضرور بھیجنا۔ ہماری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترستی ہیں۔ اللہ نے ہماری دعا پوری کر دی بیٹا! بہت خوش ہیں تمہاری آمد سے ہم۔"

"کیوں نہیں چچا جان۔"

"بیٹا! ایک بات بتاؤ، کہیں ملک سے باہر رہتے ہو؟"

"رہتا تھا چچا جان! اب سب کچھ ترک کر کے گھر واپس آ گیا ہوں۔ ظاہر ہے یہ گڑھی بھی میری رہائش گاہ ہے۔ کہیں نہ کہیں تو وقت گزارنا ہی ہو گا۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ کہیں نہ کہیں کیوں، تمہارا گھر ہے۔ بس اب یہیں رہو، عیش کرو۔ زندگی آرام سے گزارو۔"

"جی چچا جان۔"

محبتوں کے یہ ڈونگرے برستے رہے۔ رات کو آرام کرنے کے لئے لیٹا تھا اور نجانے کس کس کے بارے میں کیا کیا سوچتا رہا تھا۔

دوسرے دن پھر وہی ہنگامے تھے۔ سارے کے سارے مجھے گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے میرے بارے میں پوچھا جا رہا تھا اور بڑی ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے بھی ان لوگوں میں خاصا دل بہلایا۔ شام کو کوئی سات بجے کا وقت تھا، پھوپھی رقیہ خانم کمرے میں آ گئیں۔ ایک بار پھر انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور پھر بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! ہمارا خون ہو۔ اور پھر وہ جو کہتے ہیں کہ ماں جائے ایک ذات پھوپھی بھتیجا ایک ذات۔ بیٹا، پھوپھی ہوں میں تمہاری۔ یہ سچ ہے کہ سگی پھوپھی نہیں ہوں لیکن سگا سوتیلا کیا ہوتا ہے، اللہ ہی بہتر جانے۔ جان جاتی ہے تم پر۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ بیٹھ گئے تمہیں یاد کر کر کے۔ ہمدان بھیا گئے تو سمجھ لو کہ دنیا ہی ختم ہو گئی۔ ارے دشمنوں نے کیا کیا عیش کئے ہیں۔ دیکھو بیٹا! برا مت ماننا اور یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی کی غیبت کر رہی ہوں۔ طارق جمشیدی سب سے زیادہ چالاک نکلے۔ ایک ایک کو شکست دے دی انہوں نے اور ہر چیز کے مالک بن بیٹھے۔ کہیں سے ایک جعلی وصیت نامہ بھی تیار کرا لیا جس میں یہی کہا گیا تھا کہ اگر میرا بیٹا نالائق نکلے اور زمین اور جائیدادوں کا کاروبار نہ سنبھال سکے تو پھر طارق جمشیدی ہر چیز کے نگراں ہوں گے اور انہی کی مرضی سے حویلی اور زمینوں کے معاملات چلیں گے۔ دور دور کی ساری زمینیں بیچ دیں۔ پیسہ بینکوں میں ڈلوا

دیا۔ خود ان کا منافع کھاتے ہیں اور نیک نام بھی بنے ہوئے ہیں۔ بات یہ کہی کہ اب اتنی دور کی زمینوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ باقیوں پر تو انہیں کسی طرح اعتماد نہیں ہے۔ دونوں بیٹے ہیں کہ نکمے پن کی اعلیٰ مثال، چھٹے ہوئے غنڈے بدمعاش ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ طارق جمشیدی نے احمد اور شاہنواز کو غنڈہ بنایا ہے تاکہ زمینوں پر قبضہ قائم رکھیں۔ بیٹی ہے کہ آفت کی پرکالہ۔ طارق جمشیدی نے ہر ایک شخص کو اپنے پیروں میں جھکا رکھا ہے۔ اب اسی کی بنتی ہے جو طارق جمشیدی کے جوتے چاٹے۔ باقی تمہارے دونوں چچا صرف طارق جمشیدی کے باج گزار ہیں۔ وہ بیچارہ حافظ تو حویلی سے ہی نکال دیا گیا۔ چھوٹی سی جھونپڑی لے کر بیٹھ گیا ہے بیوی بچوں کے ساتھ۔"

"ارے ہاں، ہمارے ماموں حافظ بھی تو تھے۔ کیا کہا آپ نے ان کے بارے میں پھوپھی جان! کہاں چلے گئے وہ؟"

"بیٹا، جاتے کہاں۔ ذرا خوددار تھے۔ نکال دیئے گئے حویلی سے۔ طارق جمشیدی کی ہر الٹی سیدھی ماننے پر، ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہ ہوئے تو راندۂ درگاہ ہو گئے اور بھگا دیئے گئے حویلی سے۔ عزت لے کر نکل گئے حویلی سے۔ اب چھوٹا موٹا کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ لیکن اچھا ہے بیٹا، خودداری اور عزت بھی کوئی چیز ہے۔"

"مگر چچا جان کو یہ حق کس نے دیا؟ ماموں حافظ تو واقعی بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے تو یاد ہی نہیں آئے۔ میرے والد اور والدہ انہیں بہت زیادہ عزت اور حیثیت دیتے تھے۔"

"یہی بات تو دشمنوں کے کلیجوں میں چبھتی تھی، سانپ بن کر لوٹتی تھی۔ وہ کھری کہتے تھے۔"

"کہاں ہیں وہ پھوپھی؟"

"بیٹا! الیاس کو معلوم ہے۔ الیاس تمہیں بتا دے گا۔"

"الیاس کون ہے؟"

"نوکر ہے گھر کا۔ اسے حافظ کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔"

"میں ضرور جاؤں گا ان کے پاس۔"

"بیٹا! ایک بات کہوں تم سے؟"

"جی پھوپھی جان، ضرور کہئے۔"

"دیکھو، میری تو کوئی اولاد ہے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور کپڑے کے علاوہ میری

زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جب تک بھی زندگی ہے جی لوں گی۔ اور جب زندگی ختم ہوگی تو اس بات کا تو اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ قبر اور کفن مل ہی جائے گا۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتائے دیتی ہوں، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری آمد سے ان لوگوں کو خوشی ہوئی ہے تو بیٹا! یہ خیال دل سے نکال دینا۔ اب تو ہزاروں وسوسوں نے جنم لیا ہوگا۔ جس جائیداد اور دولت پر ناگ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں یہ لوگ اب اس کا حساب کتاب دینا پڑے گا۔ ذرا ہوشیار رہنا، کہیں دشمن تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔''

''آپ فکر نہ کریں پھوپھی جان! میں ہوشیار رہوں گا۔''

اپنی آرام گاہ میں آ کر میں نے پھوپھی جان کی باتوں پر غور کیا، خوب مزہ آیا۔ گھروں میں یہ حالات ہوا ہی کرتے ہیں اور جہاں تک چچا طارق کا معاملہ تھا تو ان کے چہرے کی مکاری ہی یہ بتاتی تھی کہ بڑے زمانہ ساز آدمی ہیں اور یقینی طور پر خاصے گڑبڑ ہیں۔ ان کی طرف سے ہوشیار رہنا بڑا ضروری ہے۔ دفعتہً ہی میرے چاروں محافظوں میں سے کسی ایک نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ہم آپ کے اردگرد ہیں جناب! لیکن اگر آپ کہیں کسی جگہ سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔''

میں چونک پڑا۔ میں نے کہا۔ ''کیسے؟''

''یہ دیکھئے...... یہ وہ کمرہ ہے جہاں آپ کے چچا طارق جمشیدی رہتے ہیں۔ اس کے اندر کے ماحول کو دیکھ لیجئے۔ ہم ہر اس جگہ کو آپ کے سامنے نمایاں کر دیں گے جس کی فرمائش آپ ہم سے کریں گے۔''

اب میں واقعی دلائی لامہ کے دیئے ہوئے اس انعام کا دل سے قائل ہوا۔ یہ تو بڑے کمال کی بات تھی کہ میں اس طرح اپنے دشمنوں سے یا پھر اپنے خلاف کچھ کرنے والوں سے باخبر رہوں۔ میں نے کہا۔

''سنو...... کیا یہ کام تم ہمیشہ کر سکتے ہو؟''

''آپ کے حکم کے مطابق نمی ستو...... آپ ہمارے محسن ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم آپ کی ہر خواہش اور ضرورت پوری کر سکیں جو ہمارے بس میں ہو۔''

''ذرا ان آوازوں کو میرے لئے نمایاں کرو۔'' میں نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سامنے وہ فلم چل رہی ہو یا وہ جیتے جاگتے کردار میرے پاس پہنچ گئے ہوں۔

چچا طارق جمشیدی مسہری پر بیٹھے ہوئے پائپ پی رہے تھے۔ چچی صاحبہ متفکر ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور غالباً کسی کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ پھر وہ دونوں نوجوان آ گئے جن کے چہروں پر میں نے کینہ توزی کی جھلک دیکھی تھی۔ تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ احمد اور شاہنواز ہیں، طارق جمشیدی کے دونوں بیٹے۔ اور ان کے بارے میں پھوپھی جان نے بتایا تھا کہ انہیں باقاعدہ غنڈہ بنایا گیا ہے۔ میں حیرت اور دلچسپی سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔

یہ مناظر جس طرح میری نگاہوں کے سامنے نمایاں ہوئے تھے وہ ایک انتہائی دلچسپ عمل تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ چلو ٹھیک ہے۔ وہ سارے ہنگامے تو پس پشت رہ گئے۔ اب نہ لوح کا کوئی چکر ہے اور نہ مہتر بدھ بننے کے لئے کوئی مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دوران مجھے جیسی مراعات سے نوازا گیا تھا، کوئی اور ہوتا تو ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔ میں نے تو ان چیزوں کو بہت ہی سرسری انداز میں لیا تھا ورنہ بھوج پتر جیسی چیز جو آنے والے لمحات کا پتہ دیتی تھی اور یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے سخت دہشت اور سنسنی پھیل جاتی تھی۔ بات اگر اتفاقیہ طور پر کچھ ہو جائے تو الگ حیثیت رکھتی ہے اور اگر اس کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوں تو پھر وہ مزید خوفناک ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اسے باقاعدہ استعمال ہی نہیں کیا اور اس سے نفرت ہی کرتا رہا۔ کتنی ہی بار میں نے بھوج پتر اٹھا کر پھینکا تھا لیکن بہرحال وہ صورتحال بھی الگ ہی تھی۔ مجھے حقیقت معلوم ہی نہیں تھی۔ اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو بلاشبہ میں نے بھی ان لوگوں کو قابل معافی سمجھ لیا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا صرف غلط فہمی کی بنیاد پر کیا تھا۔ حقیقت تو بہرحال ایک دن عیاں ہونی ہی تھی۔ دلائی لامہ ایک صاحب علم انسان تھا۔ بہرحال بدھ مت کے پیروکاروں کی تعداد شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے لیکن بڑا منظم اور پراسرار مذہب ہے یہ۔

میں اپنی سوچوں کے دائرے سے نکل آیا۔ کیونکہ مجھے دوسری طرف کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ طارق جمشیدی کہہ رہا تھا۔ ''میں نے انتظار کیا تم لوگوں کا کہ تم خود آ کر اس بارے میں مجھ سے بات کرو۔ کیا تمہیں اس برے وقت کا کوئی احساس نہیں ہے جو اچانک ہی ہم پر نازل ہو گیا ہے؟''

''برا وقت؟''

"ہاں، بہت برا وقت۔ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ہم نے کہ خاقان جمشیدی اس طرح واپس آ جائے گا۔ یہ کس قدر خوفناک بات ہے کہ وہ واپس آ گیا ہے اور تم لوگ یہ بات جانتے ہو کہ یہ دولت، یہ جائیداد نہ تو ہماری موروثی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے وہم کی پیداوار کہ ہم یہ ثابت کر سکیں کہ اس میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔ نہیں میرے بچو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں سے ایک پیسہ بھی ہمارا اپنا نہیں ہے۔ یہ سب ہمدان جمشیدی کا چھوڑا ہوا ترکہ ہے اور وہ تنہا اس کے مالک تھے۔ ہم تو بس ایک طرح سے طفیلی ہیں، انہوں نے صرف رشتوں کی بنیاد پر اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ خاقان جمشیدی کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جائیداد میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے، یہ بات تو ثابت ہے۔ ہندوستان بھر کی عدالتیں اس بات کو ظاہر کر سکتی ہے۔"

"تو پھر؟"

"اُلو کے پٹھو...... پھر، پھر کی رٹ لگا رہے ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بلکہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کی جوابدہی کرنا مشکل ہو جائے گی۔"

"مگر بابا میاں! جوابدہی ہمیں کسے کرنا پڑے گی۔ خاقان جمشیدی کو؟"

"اب بھی تم یہ سوال کر رہے ہو؟"

"سوال نہیں کر رہے آپ سے، پوچھ رہے ہیں کیا آپ اسے اس قابل سمجھتے ہیں؟"

"اچھا...... کوئی کسی چیز کا مالک ہو تو آپ یہ سوال کریں گے کہ وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ ہم اسے جواب دیں؟"

"اسے مالک تسلیم کون کرتا ہے؟"

"برطانوی حکومت کا قانون۔"

"ہوں...... اور آپ کے خیال میں حکومت برطانیہ اپنے ایک اعلیٰ افسر کے قاتل کو اس طرح آزاد چھوڑ دے گی۔"

"گڈ...... گویا یہ پوائنٹ تمہارے ذہن میں ہے۔"

"مگر ہم اس پوائنٹ سے کام نہیں لیں گے۔" احمد نے کہا۔

"تو پھر؟"

"بابا میاں! نجانے آپ کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ کو اپنے بیٹوں پر بھروسہ نہیں ہے؟ دو منٹ میں چٹنی بنا کر پھینک دیں گے اس کی۔ وہ ہے کیا بلا۔ آپ بس

حکم دے دیجئے، جب بھی آپ کہیں گے وہ آپ کو یہاں نظر نہیں آئے گا۔ ہم آپ کو بس یہی اطمینان دلا سکتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میری بات سنو، ہر مسئلے کو اس طرح اتنی آسانی سے نہیں لیا جانا چاہئے۔ آج کا کام کل پر چھوڑنا بالکل مناسب نہیں ہوتا۔"

"کوئی پرواہ کی بات نہیں ہے۔ اتنے دن کے بعد وہ آیا ہے، اسے سیر کرانے لے جاتے ہیں۔ خاص طور سے ہمارا پالن باغ جو ہندوستان بھر میں سب سے اچھے آموں کے لئے مشہور ہے اور فصل بھی پک رہی ہے، ہمارے خاقان بھیا پالن باغ تو دیکھنا پسند کریں گے نا۔ اور پھر پالن باغ میں وہ کالا کنواں کس کام آئے گا۔ کتنی محنت سے بنایا ہے ہم نے اسے ہمارے اور بھی کچھ دوست اس کالے کنوئیں میں رہتے ہیں۔ خاقان بھیا کی ان سے ملاقات کرا دیں گے، بات ختم ہو جاتی ہے۔"

"اور دوسرے لوگوں سے کیا کہو گے؟" طارق جمشیدی نے سوال کیا۔

"اول تو دوسرے لوگ ہیں ہی کون۔ ہم بھلا کسی کو کیوں جواب دیں گے۔ اور فرض کیجئے خاندان میں اگر کسی نے پوچھ بھی لیا خاقان جمشیدی بھیا کے لئے تو بتا دیں گے کہ لاپرواہ آدمی ہیں، نکل گئے ہوں گے کہیں گھومنے پھرنے۔ آ جائیں گے کبھی ٹہلتے ہوئے۔ اچھی پرواہ کی آپ نے۔" احمد نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ طارق جمشیدی کے چہرے پر بدستور تشویش کے آثار تھے۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا، پھر اس نے کہا۔

"دیکھو، میں پھر وہی بات کہوں گا۔ پوری عمر کا تجربہ ہے میرا۔ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔ بہت سے مرحلے آ سکتے ہیں اس میں اور تمہیں ہر ایک کا نعم البدل سوچنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔ اور بھی بہت سے معاملے ہو سکتے ہیں۔"

"بات اصل میں یہ ہے کہ ہم آپ سے صرف ایک بات کہیں اور اس کے لئے ہم پر اعتماد کریں۔ آپ ہم سے یہ کہیں کہ میرے بچو، اس نازک صورتحال میں تم اپنی ذہانت اور فراست سے کام لو اور اس مسئلے کو نمٹا لو۔ بس اس کے بعد آپ بے فکر ہو جائیں۔"

"وہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن بس ایسے ہی ڈر لگتا ہے۔ کسی بھی معاملے کو اتنے معمولی انداز میں لینا خطرناک بات ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال اگر تمہیں اپنے اس خیال پر اعتماد ہے تو دیکھ لو، جیسے مناسب سمجھو۔" طارق جمشیدی نے کہا۔

"آپ مطمئن ہو جائیے، تین دن کا وقت دے دیجئے ہمیں۔ تیسرے دن آپ کو خوشخبری سنا دیں گے۔ کالا کنواں آباد ہو جائے گا۔ پالن باغ ایک بہترین جگہ ثابت ہو گی۔" شاہنواز نے کہا اور طارق جمشیدی تعریفی انداز میں ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے تھوڑی دیر تک ان کے مزید بولنے کا انتظار کیا۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اٹھ کر باہر نکل گئے تو میں نے گردن اٹھائی اور اپنے نادیدہ محافظوں سے کہا۔

"ٹھیک ہے بس۔"

اور اچانک ہی وہ منظر غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے سپاٹ دیوار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ زندگی کے کتنے سارے روپ ہوتے ہیں، کسی کو کوئی اندازہ نہیں ہے۔ یہ لوگ میرے لئے اتنے پریشان تھے اور میرے خلاف اس طرح کی سازشیں کر رہے تھے۔ مقصد صرف ان کا اتنا سا تھا کہ یہ دولت جس پر ان کا بے جا تصرف تھا اور جسے وہ صحیح معنوں میں باپ کا مال سمجھ کر استعمال کر رہے تھے ان کے قبضے میں رہے۔ نجانے کیوں بہت ساری باتیں اپنی جگہ، حرص و ہوس کی بہت سی منزلیں طے کی تھیں میں نے لیکن دولت کے کھیل سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اگر متاثر ہوتا تو عظیم الشان خزانہ جس کا اگر چھوٹا سا حصہ بھی مجھے حاصل ہو جاتا تو نجانے میں کس قدر دولت مند آدمی ہوتا۔ میں اس کے حصول کے لئے کوشش ضرور کرتا۔ مگر یہ چیز تو فطرت کا حصہ ہی نہیں تھی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بچپن سے دولت کا کھیل دیکھتا رہا تھا۔ کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اس کے بارے میں۔

بہرحال اب معاملہ ان لوگوں کا تھا اور بڑے دلچسپ اور سنگین حالات سامنے آ گئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ چلو ٹھیک ہے، کم از کم کوئی مشغلہ تو شامل حال رہے گا۔ اور کچھ نہیں تو ان لوگوں سے ہنگامہ آرائی ہی کچھ وقت گزروا دے گی۔ چنانچہ اب میں انتظار کرنے لگا کہ میرے پیارے پیارے چچا کے پیارے پیارے بیٹے مجھے سیر و سیاحت کی پیشکش کریں اور میں ان سے دو دو ہاتھ کروں۔ منصوبہ بندوں نے زیاہ وقت صرف نہیں کیا۔ فوراً ہی شاہنواز نے مجھ سے ملاقات کی اور بڑے پیار بھرے انداز میں بولا۔

"مجھے یوں لگتا ہے بھائی جیسے آپ ہم سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔"

"کھنچے کھنچے کیوں بھائی، ایسا کیوں لگتا ہے آپ کو؟" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ ہمارے آپ کے درمیان ملاقاتیں ہی نہیں ہوتیں۔"

"تو یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں میرا مطلب۔"

"سمجھا دو۔ اصل میں ایک خرابی ہے میرے اندر۔ بات سمجھ میں آ تو جاتی ہے مگر ذرا دیر سے آتی ہے۔"

شاہنواز کے چہرے پر کسی قدر بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ غالباً وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں میں اس کا مذاق تو نہیں اڑا رہا۔ میرے اندر خود بخود ایک تمسخرانہ سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کا مجھے خود بھی احساس تھا۔ حالانکہ میں اس کیفیت سے بچنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کو ایک سبق دینا ضروری تھا۔ بیوقوف! اگر خود مجھ سے اس موضوع پر بات کر لیتے تو میں انہیں اطمینان دلا دیتا کہ بیٹا کھاؤ پیو، عیش کرو۔ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ دولت میرے لئے ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ حالانکہ یہ الفاظ بڑے عجیب اور میرے خیال میں غیر مناسب ہیں۔ کیونکہ جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا، ان سے ذرا پوچھیں کہ سارے مذاق اپنی جگہ، کم از کم دولت کبھی مذاق نہیں ہوتی۔

لیکن بہرحال اتنی دیر میں احمد بھی آ گیا۔

"میں شاہنواز سے پوری طرح متفق ہوں خاقان بھائی! ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہم سے کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔"

"اگر میں واقعی کچھ زیادہ کھنچا ہوا ہوتا تو لمبا ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں ہم لوگوں نے کیسی کیسی محنت کی ہے؟"

"اوہو، خیریت...... کیا حالات کچھ خراب ہو گئے تھے؟ میرا مطلب ہے مالی حالات کچھ گڑبڑ ہو گئے تھے؟"

"نہیں تو۔" احمد حیرت سے منہ پھاڑ کر بولا۔

"تو پھر محنت مزدوری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"مزدوری وزدوری نہیں، میں خالی محنت کی بات کر رہا ہوں۔ بھئی دیکھئے نا، اپنی چیز پر اگر توجہ نہ دی جائے تو باہر کے لوگ تو کبھی غور نہیں کریں گے کہ آپ کا کیا نفع ہو رہا ہے کیا نقصان۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ایسی ہی بات ہے۔"

"ہم نے اپنی زمینوں پر خود محنت کی ہے۔"

"ہل چلایا ہے؟" میں نے فوراً ہی سوال کیا۔

"ہل تو نہیں چلایا بے شک۔ آپ نے پالن باغ دیکھا ہے؟"

"پالن باغ...... یہ کیا بلا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"پھلوں کا باغ ہے ہمارا۔ اور ہم اس پر ناز کرتے ہیں۔"

"کرنا چاہئے۔ جو چیز سب سے بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے اس پر تو ناز کرنا ہی چاہئے۔"

میرے ان الفاظ پر وہ دونوں بری طرح چونک پڑے۔ شاہنواز نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مطلب...... مم...... مطلب......"

"بھئی محنت کر کے تم نے یقینی طور پر بڑے خوبصورت پھل اُگائے ہوں گے۔ مقصد ہوا نا آخر۔"

"ہاں ہاں...... کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ لیکن ایسے نہیں۔ آپ چلیں ہمارے ساتھ۔ ذرا دیکھیں ہم نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

"کارنامہ سرانجام دے بھی دیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

"یار! وقت سے پہلے فیصلے نہیں کر لینے چاہئیں۔ وقت کا انتظار کیا کرو۔ یہ دیکھا کرو کہ جو کچھ تم نے سوچا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ پہلے سے ہی طے کر لیا کہ کارنامہ سرانجام دے ڈالا۔"

میرے ان الفاظ پر وہ دہشت زدہ ہو گئے تھے۔

"آپ کی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"اصل میں خاقان بھائی باہر کے ملکوں میں رہے ہیں نا، اس لئے اس معیار کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم ٹھہرے سیدھے سادھے سیتا گڑھی کے لوگ۔ اتنی گہرائیاں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

میں ہنس کر خاموش ہو گیا تھا۔ پھر احمد نے کہا۔ "تو پھر کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ تو تم لوگ کر چکے ہو۔" میں نے پھر نشتر چلایا۔

"میرا مطلب ہے چلیں گے آپ ہمارے ساتھ؟"

"نہیں چلیں گے تو بزدل کہلائیں گے نا۔" میں نے کہا۔ درحقیقت میں نے اپنی باتوں سے انہیں زچ کر دیا تھا اور وہ اس شک و شبہے کا شکار ہو گئے تھے کہ کہیں میں ان کا مطلب سمجھ تو نہیں گیا ہوں۔ لیکن بہرحال کر بھی کیا سکتے تھے۔ میں ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہا۔

پھر انہوں نے وقت وغیرہ کا تعین کر لیا اور میں نے اس پر آمادگی کا اظہار بھی کر دیا۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا اور اس کے بعد دلائی لامہ کی اس مہربانی پر جو اس نے کی تھی۔ ویسے بھی نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے، حالات جس رخ پر لے جا رہے ہیں لے جاتے رہیں۔ نتیجہ جو کچھ بھی نکلتا ہے نکلتا رہے۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں نے بھی تیاریاں مکمل کر لیں اور پھر وقت مقررہ پر ان کے ساتھ چل پڑا۔

ایک بڑی سی پرانی طرز کی جیپ جو عام طور سے میں نے یہاں ان لوگوں کے استعمال میں دیکھی تھی ہم لوگوں کو لے کر چل پڑی۔ احمد ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے سیتا گڑھی کے اطراف دیکھ لئے تھے اور ویسے بھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا ان لوگوں کے فرشتوں نے ہی دیکھا ہو گا۔ والد صاحب کے ساتھ نجانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا تھا۔ تھوڑی بہت تبدیلیاں بے شک ہو گئی تھیں اس دوران لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ وقت بھی بھول جاتا۔

پالن باغ، آبادی سے کافی فاصلے پر نکل کر تھا۔ چوڑی پگڈنڈی پر سفر کرتے ہوئے ہم پالن باغ میں داخل ہو گئے۔ اس دوران میں نے یہ جائزہ لیا تھا کہ ہو سکتا ہے ان دونوں کے آدمی ساتھ ساتھ ہی ہوں۔ لیکن بعض ایسی جگہیں آئیں جہاں سے دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا اور وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ جہاں تک میرے نادیدہ محافظوں کا معاملہ تھا تو وہ تو کسی کو نظر ہی نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات مجھے بھی نہیں۔ البتہ وہ میری جانب سے غافل نہیں ہوں گے۔

بہرحال پالن باغ کا سفر طے ہوتا رہا۔ ان لوگوں نے یقینی طور پر اپنے آدمیوں کو وہاں پہنچا دیا ہو گا۔ ہم پالن باغ کے دروازے پر پہنچے تو میں نے ایک لمبے چوڑے آدمی کو دیکھا جو مالیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھا لیکن چہرے ہی سے خطرناک نظر آتا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ یہ اصل مالی نہیں ہو سکتا بلکہ انہی غنڈوں میں سے

ایک ہو سکتا ہے جو یہاں میرا حساب کتاب کرنے کے لئے پہلے سے پہنچا دیئے گئے ہیں۔ کم از کم یہ شخص شکل سے مالی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اصل مالی کو ان لوگوں نے اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔

غرض یہ کہ پالن باغ میں پہنچنے کے بعد جیپ رک گئی۔ باغ واقعی بڑا سرسبز و شاداب تھا۔ پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہر طرف جھول رہے تھے اور ان پھلوں کی خوشبوئیں فضا میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ شاہنواز نے تعریفی انداز میں باغ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دور دور تک کے علاقے میں کوئی ایسا باغ نکال کر دکھا دے۔''

''باغ نکالے نہیں جاتے، لگائے جاتے ہیں۔'' میں نے تصحیح کی۔

''وہی میرا مطلب ہے۔ آپ کو کیسا لگا یہ باغ؟''

''بہت خوبصورت۔''

''بس یہ سمجھ لیجئے یہی ہماری محنت ہے۔ آیئے۔''

وہ لوگ مجھے آہستہ آہستہ اپنی دانست میں مقتل گاہ کی طرف لے جا رہے تھے مگر میں اسے ان کا مقتل سمجھ رہا تھا۔ مختلف راستوں کو عبور کرتے ہوئے آخر کار وہ اس کالے کنوئیں کے پاس پہنچ گئے جو زمانہ قدیم میں بھی کالا کنواں تھا۔ اتنا پرانا کہ شاید ہمارے دادا پردادا کے دور کا ہوگا۔ خاصا چوڑا تھا لیکن اس میں کوئی ٹیوب ویل وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ احمد نے کہا۔

''آپ کو اس کالے کنوئیں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں؟''

''اندر جاؤں گا تو پتہ چلے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اندر؟''

''میرا مطلب ہے آگے جا کر اس میں جھانکوں گا تو پتہ چلے گا۔''

''تو جھانکئے۔'' شاہ نواز کا لہجہ بدل گیا۔ اب اس کی آواز میں غنڈہ پن نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''پہلے تم جھانکو۔''

جواب میں شاہنواز نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ہم بیوقوف نظر آتے ہیں آپ کو؟''

''لگتا تو ہے۔''

''بھول جایئے خاقان جمشیدی! بس یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی سے اگر کچھ مانگنا ہے تو

اور مانگ لیجئے۔ آپ کی آخری آرام گاہ یہی کنواں ہے۔''

''اچھا...... تمہیں کیسے معلوم؟'' میں نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

''بس بہت سی باتیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔''

''خود بخود کبھی کچھ نہیں معلوم ہوتا مائی ڈیئر! کچھ معلوم کرنے کے لئے تو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے اور تم محنت کے عادی نہیں ہو۔ بولو، کی ہے کبھی زندگی میں محنت میرے پیارے بھائی! کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے بھی تھوڑا سا ہوم ورک کرنا پڑتا ہے۔''

''وہ ہم نے کرلیا ہے۔ دیکھنا چاہتے ہیں آپ؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ اپنے بھائیوں کی محنت کو نہیں دیکھوں گا تو اور کیا کروں گا۔''

''آ جاؤ ہوم ورک۔'' احمد نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور درختوں کے اوپر سے لوگ نیچے کودنے لگے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ ایک وہی مالی تھا جو نجانے کب آ کر درخت پر چڑھ گیا تھا۔ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ہے ہمارا ہوم ورک۔''

''اوہو...... یہاں اس طرح کا ہوم ورک ہوتا ہے؟ بڑے ناکارہ لوگ ہو تم تو۔ اسے ہوم ورک کہتے ہیں؟''

''ہاں، مگر آپ نے ہمیں ناکارہ کیوں کہا خاقان جمشیدی صاحب؟''

''اس لئے کہ ان بیوقوف لوگوں کو تم نے جو ذمہ داری سونپی ہے وہ یہ پوری نہیں کر سکتے۔''

''ابھی دیکھو کس طرح سے کرتے ہیں۔'' شاہنواز نے کہا اور چاروں غنڈے دانت نکالے ہوئے میری جانب بڑھنے لگے۔

''ارے واہ...... یہ تو باقاعدہ فلموں کا سا منظر ہے۔ لیکن تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟''

''صفائی۔'' احمد نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''بھنگی لگے ہوئے ہو؟''

''یہی سمجھ لو۔ اس وقت بھنگی بن کر تمہاری صفائی کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئی ہمارا راستہ روکنے آ گئے تھے۔''

''تمہارا راستہ؟ اُلّو کے پٹھے! میرے باپ نے تمہارے باپ کو زندگی بھر کھلایا، ہر طرح کی ضرورتیں پوری کیں اس کی، تم حرام کی کمائی کھا کر یہاں پلے بڑھے اور اس

کے بعد میری ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتے ہو؟''

میرے ان الفاظ پر وہ بری طرح بپھر گئے اور انہوں نے اپنے غنڈوں سے کہا۔

''مارو اسے۔''

وہ سارے کے سارے میری جانب لپکے۔ لیکن پھر اس دلچسپ منظر کا آغاز ہو گیا جو میرے لئے بھی دلچسپ ہی تھا۔ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے انہیں کمر سے پکڑ لیا ہو۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے اور ہاتھ اس طرح فضا میں چل رہے تھے جیسے وہ اپنے آپ کو کسی نادیدہ وجود سے چھڑانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ پلٹ پلٹ کر دیکھ بھی رہے تھے۔ لیکن انہیں کمر سے پکڑنے والے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ چاروں کے چہرے پر دہشت کے آثار اُبھر آئے۔

''کک...... کون ہے...... کون ہے...... کک...... کون ہے؟'' ان کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں اور احمد اور شاہنواز حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا تماشہ کر رہے ہو حرامیو! مارو اسے، ٹکڑے کر دو اس کے۔''

مگر حرامی جو تماشہ کر رہے تھے، وہی تماشہ کرتے رہے۔ وہ ایک انچ آگے نہیں بڑھ پائے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔

''یہ لوگ کیا خلا میں تیر رہے ہیں؟''

اسی وقت ان دونوں کو غصہ آ گیا اور دونوں گردنیں جھکا کر میری جانب لپکے۔ لیکن یہ بھی ان کی بیوقوفی تھی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچے میں بیٹھ گیا اور وہ بری طرح آپس میں ٹکرائے۔ ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے اور بالکل ایسی ہی آواز آئی تھی جیسے دو خول آپس میں ٹکرائے ہوں۔ انہیں چکر آ گیا تھا۔ ادھر نادیدہ محافظوں نے ان چاروں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخنا شروع کر دیا۔ ان کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں اور بعض کے جسم اور چہروں سے خون بھی بہنے لگا۔ وہ دہشت بھرے انداز میں چیخ رہے تھے کیونکہ انہیں نقصان پہنچانے والے انہیں نظر ہی نہیں آ رہے تھے اور یہ بات ظاہر ہے ان کے لئے حیرانی کا باعث ہی نہیں بلکہ خوف کا باعث بھی تھی۔

میں پُر اطمینان انداز میں ایک طرف کھڑا ان کی کاوشیں دیکھ رہا تھا۔ احمد اور شاہنواز اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھ پر حملہ کیا لیکن میرے محافظوں میں سے شاید کچھ محافظ فارغ ہو گئے تھے۔ کیونکہ احمد اور شاہنواز قلابازیاں کھا کھا کر نیچے

گرنے لگے اور ان کے حلق سے بھی چیخیں نکلنے لگیں۔ دو تین پٹخنیاں انہوں نے کھائیں تو میں نے کہا۔

''نہیں...... یہ مجھے اندھا کنواں دکھا رہے تھے۔ میرا خیال ہے اب ہم انہیں اندھا کنواں دکھاتے ہیں۔''

اب تو ان دونوں کی حالت بری ہو گئی تھی۔ میں نے انہیں بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا لیکن بھلا وہ کہاں بھاگ سکتے تھے۔ انہیں پکڑ لیا گیا تھا۔ تب وہ رونے اور گڑگڑانے لگے۔

''معاف کر دو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہمیں معاف کر دو۔''

''ارے ارے...... یہ بڑی خرابی ہے۔ انسان اپنی کوششوں میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑتا، برائیاں اس طرح کرتا ہے جیسے وہ اس کا قومی فرض ہو۔ اور جب پھنس جاتا ہے تو پھر خدا کے واسطے دینے لگتا ہے۔''

''ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، ہمیں نہ مارو۔''

''کون مار رہا ہے بھائی۔ تم میرے چچا زاد بھائی ہو۔ میرے پیارے چچا جان کو کتنا دکھ ہو گا اگر تم اس دنیا سے چلے گئے۔ اس کے بعد کون رہ جاتا ہے ان کے پاس۔ ظاہر سی بات ہے وہ تمہارے بغیر جی بھی نہیں سکیں گے۔ جبکہ میں چاہتا ہوں وہ جئیں...... ایسا کرو میرے دوستو! ان کی ٹانگیں باندھو اور انہیں اس اندھے کنوئیں میں الٹا لٹکا دو۔''

''نہیں نہیں، مر جائیں گے ہم...... مر جائیں گے۔''

''اگر موت ہی تمہارا مقدر ہے اور اتنی سی بات پر تم مر جاؤ گے تو مر جاؤ بھائی! کون کسے بچا سکتا ہے۔'' میں نے تفریحی انداز میں کہا۔

بہر حال اب اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتا تھا انہیں۔ چنانچہ میرے محافظوں نے ان کی ٹانگیں باندھیں اور اس کے بعد ان کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کالے کنوئیں میں انہیں رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔ ان کی دہاڑیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن ان سے فراغت حاصل کر کے میرے محافظوں نے ان چاروں کو بھی رسیوں سے باندھ دیا جو پٹ پٹ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ دیکھنے کے قابل منظر تھا۔ چھ افراد عذاب میں گرفتار تھے اور واقعی یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ اس وقت مجھے بڑی سرخروئی بخشی گئی تھی۔

پھر میں اپنے اس پائن باغ کی سیر کے لئے نکل گیا اور مجھے وہ مالی نظر آ گیا جو کافی ضعیف تھا۔ مالی کا بیٹا بھی اس کے ساتھ یہیں جھونپڑی میں رہتا تھا۔ مالی کو ایک پرانے درخت کے پاس باندھ کر ڈال دیا گیا تھا جو بالکل دور دراز اور آخری علاقے میں تھا اور یہی سلوک اس کے بیٹے کے ساتھ کیا گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ان دونوں کو کھولا تو مالی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور اس کے رونے کی آوازیں فضا میں منتشر ہونے لگیں۔

''نہیں مالی بابا! رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کس نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر کار ہر برائی کی کوئی نہ کوئی انتہا ہو جاتی ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے، وہ آپ کو باندھنے کے بعد مجھے قتل کرنے کے لئے یہاں لائے تھے۔ لیکن آیئے، میں آپ کو ان کا حشر دکھاؤں۔''

مالی بابا اور اس کے بیٹے کو لے کر میں کالے کنوئیں کے پاس پہنچا۔ یہیں پر وہ چاروں غنڈے بھی بندھے پڑے تھے اور یہیں وہ دونوں بھی کالے کنوئیں میں الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ ہوش میں تھے، ان کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں چیخ چیخ کر۔ ان کے حواس خراب ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر شدید وحشت تھی۔ مالی انہیں دیکھنے لگا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ہمیں یہاں سے لے چلو بیٹے! ہمیں یہاں سے لے چلو۔ تم پہچان گئے نا اپنے مالی بابا کو؟''

''بالکل پہچان گیا مالی بابا! آپ تو میرے لئے میرے سب سے بڑے اور اہم بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

مالی بابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ ہمدان جمشیدی کو یاد کر رہا تھا۔ اس دور کو یاد کر رہا تھا۔ رو رو کر فریاد کر رہا تھا۔

''عزت دیتے تھے ہمیں مالک۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نوکر کو عزت دیتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ہمیں کبھی بھی انہوں نے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ عزت اور محبت، بس یہی ہمارا سرمایہ تھا۔ ہماری کبھی کسی ضرورت کو رد نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب...... اب تو پیسے بھی بھیک کی طرح مانگنے پڑتے ہیں۔ ہماری تنخواہ تک وقت پر نہیں ادا کی جاتی۔ بیٹے کو بڑی مشکل سے ہماری جگہ دی گئی ہے۔ ہمیں ایک پیسہ بھی نہیں دیا جاتا۔ تمہارے ماموں حافظ کو بھی حویلی سے نکال دیا گیا ہے۔ شروع میں انہوں

نے ان کے رویے کی مخالفت کی تھی، بس حویلی سے ہی نکال دیا گیا۔''

''ماموں حافظ......؟'' میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ مجھے ماموں حافظ یاد آ گئے۔ میری والدہ کے بھائی تھے۔ گو رشتے کے بھائی تھے لیکن پھر بھی ہم لوگ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کے کچھ بچے بھی تھے۔ ارے باپ رے...... ماموں حافظ تو میرے ذہن سے بالکل ہی نکل گئے۔ میں نے مالی بابا سے ماموں حافظ کے بارے میں مزید تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ ماموں حافظ حویلی سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہتے ہیں۔ ان کے بیٹے محنت مزدوری کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

''حویلی سے انہیں کچھ نہیں ملتا؟''

''ایک پائی نہیں۔ پچھلے دنوں بہت بیمار ہو گئے تھے۔ علاج کرانے تک کے لئے پیسے نہیں تھے۔ نجانے کیسے کیسے گزارا کر کے بیچاروں نے علاج کرایا۔ وہ جو کہتے ہیں نا بیٹا کہ دنیا انسان کے ساتھ کچھ بھی کر لے، اللہ سب کا محافظ ہوتا ہے۔ اللہ نے انہیں صحت دے دی۔ اب سب بالکل ٹھیک ہے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ مالی بابا، آپ نے مجھے ماموں حافظ کے بارے میں بتایا۔ بہرحال آپ لوگ اطمینان رکھئے، اب میں آ گیا ہوں۔ اب آپ کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں ہو گی۔ میں کچھ کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔

مالی بابا بدستور رو رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''آپ ایسا کرو مجھے باندھ کر وہیں ڈال دو جیسے ان لوگوں نے باندھ دیا تھا مجھے۔ ہوش میں آئیں گے تو مجھے مار ڈالیں گے یہ۔''

''نہیں ماریں گے مالی بابا۔ آپ آرام سے جس طرح اپنا وقت گزارتے رہے ہو اسی طرح اپنا وقت گزارو۔ میں دیکھوں گا۔'' اور پھر میں نے خاموشی سے اپنے محافظوں سے کہا۔ ''مالی بابا اور اس کے بیٹے کا خیال رکھا جائے۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔'' مجھے جواب ملا۔ اور جب یہ جواب مجھے مل گیا تو پھر اطمینان کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں تھا۔

پورے چار گھنٹے تک میں نے احمد اور شاہنواز کو اس اندھیرے کنوئیں میں لٹکائے رکھا۔ چاروں آدمی بندھے پڑے تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے محافظوں سے کہا۔

''ٹھیک ہے، نکال لو انہیں۔ میں ان کی موت نہیں چاہتا۔''

محافظوں نے میری ہدایت پر ان کے پیروں سے رسیاں نکال دیں اور انہیں زمین پر ڈال دیا۔ وہ اپنے بدن کی توانائی کھو چکے تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکے تھے۔ بس زمین پر پڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔

"پتہ چلا تھا مجھے کہ تم دونوں غنڈے ہو، غنڈہ گردی کرتے ہو۔ بہت اندھیر مچا رکھا ہے تم نے۔ سنو...... جو کچھ تم نے دیکھ لیا ہے اگر تمہارے لئے کافی ہے تو تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔ کسی بوڑھے آدمی کو میں بیٹے کا داغ نہیں دینا چاہتا ورنہ تم دونوں کو اسی کالے کنوئیں میں موت کی نیند سلا دیتا۔ معاف کر دیا ہے میں نے تمہیں اس وقت۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا، جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ مذاق نہیں ہے۔ میں تمہیں آسانی سے زندہ درگور کر سکتا ہوں۔ دو تین چیزیں بتا رہا ہوں، اس کے بعد میرے خلاف کوئی سازش کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ میں تو شاید تمہیں چھوڑ بھی دوں لیکن وہ جو مجھ سے محبت کرتے ہیں وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ پڑے رہو۔ بلکہ نہیں، پڑے نہیں رہو۔ ہم لوگ ساتھ ہی واپس چلیں گے۔ تم اپنے باپ کو یہ خوشخبری سناؤ گے کہ تم چار گھنٹے کنوئیں میں اُلٹے لٹکے رہے۔ یقیناً تمہارا باپ تمہاری اس کارکردگی سے بہت خوش ہو گا۔ چلو، کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔"

وہ لوگ اپنے آپ کو سنبھالنے لگے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے وہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ احمد نے جیپ سنبھالی۔ چاروں ساتھیوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "مالی بابا کو اگر ذرہ برابر نقصان پہنچایا گیا تو سمجھ لینا کہ میں تم لوگوں کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ پہلے سے تمہیں سمجھائے دے رہا ہوں۔ جن لوگوں نے تمہیں باندھ کر کنوئیں میں لٹکایا ہے میں نے انہیں ہدایت کر دی ہے کہ مالی بابا کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ آگے تمہاری مرضی ہے جس طرح چاہو وقت گزارو۔ اور کیا کہتے ہو اس بارے میں؟"

"نہیں...... بالکل نہیں۔ ہم اب کسی کو نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"چلو......" میں نے کہا اور جیپ حویلی کی جانب چل پڑی۔

***

حالانکہ مجھے تجسس تھا اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سورما واپس آنے کے بعد چچا صاحب کو کیا بتاتے ہیں لیکن دونوں سورما اپنے کمروں میں بند ہو گئے تھے اور رات تک ان سے طارق چچا کی کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ طارق چچا شام کو چار بجے کسی کام سے چلے گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔

بہرحال میں نے بھی سکون سے وقت گزارا۔ ردِعمل دیکھنا تھا کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر رات گزر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طارق جمشیدی نے اس بارے میں کسی تجسس کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ یا پھر وہ کون سی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہرحال اب ساری باتوں کا پتہ اپنے محافظوں سے نہیں چل سکتا تھا چنانچہ میں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ البتہ دوسرے دن میرے ذہن میں ماموں حافظ ابھر آئے۔

مالی بابا سے میں ان کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ سیتا گڑھی کے ایک دور دراز علاقے میں حافظ علی صاحب کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ مجھے فوراً ہی ایک جھونپڑی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ماموں حافظ جھونپڑی میں موجود تھے۔ ان کے بھی دو بیٹے تھے، دُبلے پتلے قد و قامت کے مالک۔ ماموں حافظ نے مجھے دیکھا اور دفعتہً ہی ان کے جذبات اُبل پڑے۔ میرا بچہ کہہ کر دونوں ہاتھ پھیلائے اور مجھ سے لپٹ کر بلکنے لگے۔ زار و قطار رو رہے تھے۔ میں خود بھی متاثر ہو گیا۔ نجانے کیوں مجھے یہ لگا جیسے یہ لمس میرے لئے بالکل سچا ہے۔

بہرحال بہت دیر تک میں انہیں سینے سے لپٹائے رہا، اس کے بعد ان کے دونوں بیٹے بھی آ گئے تھے۔ شکل ہی سے سلیقے کے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ لیکن چہروں پر افسردگی اور غربت منجمد تھی۔ ایاز اور محمود ان کے نام تھے۔ میں اندر جھونپڑی میں چلا گیا۔ ممانی صاحبہ بھی بہت محبت سے پیش آئیں۔ مجھے یہاں بڑی اُنسیت کا احساس ہوا تھا۔ ماں کے خون سے تعلق تھا ان کا۔ باپ کا خاندان تو خیر حالات کی بنا پر کافی سرکش ہو گیا تھا لیکن ماموں

حافظ کو ایک طرح سے بالکل ہی چھانٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ ایک جھلنگا چارپائی پر فوراً ہی چادر بچھائی گئی۔ ماموں حافظ سامنے بیٹھ گئے اور بولے۔

"بیٹے! آج ہی تمہارے آنے کی خبر ملی تھی ہمیں۔ یہ ایاز کسی کام سے کھیت کی طرف سے گزرا تھا، ایک ہاری نے بتایا کہ چھوٹے مالک گھر آ گئے ہیں۔ بڑا دل تڑپ رہا تھا تمہارے لئے۔ میں نے محمود سے کہا تھا کہ بیٹا، تاک میں رہو۔ اگر کبھی خاقان تنہا نظر آ جائیں تو انہیں بتا دینا کہ ماموں حافظ کہاں رہتے ہیں۔ اگر ملنا چاہیں گے تو آ جائیں گے۔"

"میں آ گیا ماموں جان! مجھے بھی آپ کا پتہ ذرا دیر سے ہی معلوم ہوا۔ لیکن دیکھ لیجئے، میں نے پتہ لگا ہی لیا۔"

"اللہ تمہیں بڑائی دے بیٹا! خوش رہو۔ بیٹا، برا نہیں ماننا ذرا تھوڑی سی تنگی ہے۔ چائے پیو گے۔ اور کچھ نہیں دے سکیں گے ہم تمہیں۔"

"لیجئے، اگر تنگی ہے تو آپ چائے کہاں سے پلائیں گے مجھے؟"

"نہیں، چائے کا سامان تو ہے۔ مگر وہ برتن وغیرہ......"

"ممانی جان! چائے لے آیئے، زیادہ بہانہ بازی نہ کریں آپ۔ چلیں چائے پلائیں۔" میں نے اپنائیت سے کہا اور ممانی جان خوشی خوشی جھونپڑی کے ایک حصے میں چلی گئیں۔

"جی ماموں جان! اب آپ مجھے حالات سنایئے۔"

"بیٹا، پہلے تم سناؤ۔ یہ بتاؤ کیفیت کیا ہے تمہاری؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، تندرست و توانا ہوں۔"

"کہاں تھے؟"

"ملک سے باہر۔ بس جن حالات میں گھرا ہوا تھا ان کا آپ کو بھی علم ہوگا۔"

"اب صورتحال کیا ہے؟"

"سب ٹھیک ہو چکا ہے ماموں جان! کوئی پریشانی، کوئی الجھن نہیں ہے مجھے۔"

"اللہ کا شکر ہے بیٹے! ہمدان بھائی اور میری بہن کا تو انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد لوگوں کی بن آئی۔ مجھے معاف کرنا، غیبت کرنا بری بات ہے۔ لیکن کچھ حقیقتیں بھی ہوتی ہیں جن کا تذکرہ تو کیا ہی جاتا ہے۔ سب سے طاقتور طارق جمشیدی نکلے۔ کوششیں تو بہت سوں نے کیں کہ تمہارے باپ کی لاوارث جائیداد کو لوٹ لیا جائے کیونکہ تم بھی موجود نہیں تھے۔ لیکن طارق جمشیدی سب پر بازی لے گئے۔ بیٹوں کی مدد سے انہوں نے سب کے حوصلے

پست کر دیئے اور پھر ہر چیز پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔ میں نے تھوڑا سا اعتراض کیا بعض معاملات میں۔ میں نے کہا ساری باتیں اپنی جگہ، خاقان زندہ ہے۔ جو کچھ کیا جائے، اسی کے نام پر کیا جائے۔ زمینیں نہ بیچی جائیں، اس کا حق انہیں نہیں پہنچتا۔ لیکن نتیجے میں مجھے مار پیٹ کر نکال دیا گیا۔ بڑی زیادتی کی گئی میرے ساتھ بیٹا! دیکھو...... میرے بدن پر اب بھی زخموں کے نشانات موجود ہیں۔ ایاز اور محمود کو مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی۔ میں نے سوچا کہ بھیا بچوں کی زندگی سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ انہیں کیوں مصیبت میں ڈالوں۔ بس انہیں لے کر نکل کھڑا ہوا اور یہ جھونپڑی بنا لی۔ اصل میں سیتا گڑھی چھوٹی سی جگہ ہے۔ بچوں کو کوئی کام دھندہ بھی نہیں ملا۔ پڑھایا لکھایا بھی ہے میں نے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے پڑھنے لکھنے کے بعد آدمی اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی بیچارے جو کچھ بھی بن پڑتا ہے کر لیتے ہیں۔ میں خود بھی کام دھندوں کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ ایک دو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ سیتا گڑھی میں اس کی گنجائش ہی کیا ہے۔ یوں گزارا ہو رہا ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان حرام خوروں میں شامل نہیں ہوئے جو ہمدان جمشیدی کی کھال نوچ رہے ہیں۔"

"ماموں صاحب! میں ذرا ان لوگوں کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

اسی وقت ممانی صاحبہ چائے لے آئیں۔ معمولی سے برتنوں میں چائے تھی۔ دونوں بھائی محمود اور ایاز بھی ہمارے ساتھ چائے میں شامل ہو گئے۔ بڑے صاف ستھرے اور سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان تھے۔ میں نے کہا۔

"جی......"

"دیکھو میاں، غیبت بہت بری چیز ہوتی ہے۔ لیکن تم واپس آ گئے ہو تو تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کرنا بھی میں اپنے فرائض میں سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمدان جمشیدی کی بے پناہ دولت تھی۔ اور تو کوئی اس قدر شاطرانہ چالیں نہیں چل سکا لیکن صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی طارق نے سب سے پہلے تو اپنے نام کے ساتھ جمشیدی منسلک کیا اس کے بعد انہوں نے کچھ سرکاری افسروں سے سازباز کی، انہیں پیسہ کھلایا اور بس کام بن گیا۔ ظاہر یہی کیا کہ ہمدان جمشیدی کی جائیداد کے متولی ہیں اور ہمیشہ سے اس کی دیکھ بھال پر مامور رہے ہیں۔ بس اس کے بعد جو بھی ان کے آڑے آیا، بیٹوں کے ذریعے اس کی آواز اور زبان بند کر دی۔ اس کام میں احمد اور شاہنواز بڑے ماہر ہیں۔ غنڈے پال رکھے ہیں انہوں نے۔ جس کی چاہتے ہیں عزت اتروا دیتے ہیں۔ سب اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔

میں نے دو چار بار کچھ چیزوں پر تنقید کی تو مجھے دھمکی دی گئی کہ کیوں میں اپنے بیٹوں کی زندگی کا گاہک بنا ہوا ہوں۔ میں نے لعنت بھیجی اور حویلی سے کنارہ کشی کر لی۔ سامان بھی پھنکوا دیا انہوں نے میرا اور حکم دیا تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر حویلی سے نکل جائیں۔ بس اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا، یہاں کچھ شناسائیاں تھیں، یہ جھونپڑی کا ٹھکانہ مل گیا۔ کچھ لوگوں نے مدد کی اور بس اب یہاں زندگی گزر رہی ہے۔"

میں چائے پیتے ہوئے بہت دیر تک ماموں حافظ سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ پھر میں نے محمود اور ایاز سے کہا کہ وہ مجھے کچھ وقت دیں۔ ماموں حافظ سے رخصت لے کر میں محمود اور ایاز کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"ہاں بھائیو! میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کے ذہنوں میں بہت سی باتیں ہوں گی۔ ماموں زاد بھائی ہیں آپ میرے، بڑی عزت اور بڑی محبت کرتا ہوں آپ سے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"ہم سمجھے نہیں خاقان بھائی؟"

"ظاہر ہے چچا جان کو میں من مانی تو نہیں کرنے دوں گا جبکہ وہ بھرپور کوششوں میں مصروف ہیں۔ میں نے ماموں جان کو صورتحال بتائی نہیں ہے، ان دونوں غنڈوں کو تو میں نے ٹھیک کر دیا ہے جو بقول ماموں حافظ کے لوگوں کی عزت اتروانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ تو اب شاید غنڈہ گردی سے کان پکڑ لیں۔ مجھے پالن باغ لے گئے تھے ایک منصوبے کے تحت اور منصوبہ یہ تھا کہ وہاں کالا کنواں نامی ایک جگہ ہے، مجھے اس کی سیر کرا دیں۔ چار گھنٹے تک میں نے انہیں کالے کنوئیں میں الٹا لٹکائے رکھا ہے۔ شیخی نہیں مار رہا ہوں، جا کر پوچھو گے تو خود بھی کان پکڑ کر بتائیں گے کہ کیا بیتی ہے ان پر اور ان کے چاروں غنڈوں پر۔"

محمود اور ایاز کے چہرے چمکنے لگے تھے۔ "کیا آپ نے واقعی ان کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟"

"ہاں...... میں جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، یہ بتائیے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی بے عزتی کی تھی انہوں نے ہماری۔ لیکن بہر حال ہم شرافت سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔"

"بے فکر رہو، شرافت سے ہی زندگی گزارو گے۔ اور ایک بات اور کہوں، ماموں حافظ تو

پرانے دور کی اقدار کے انسان ہیں، کسی بھی طرح کوئی ایسی بات قبول نہیں کریں گے جو ان کے ظرف کو متاثر کرے۔ لیکن بھائی، میرے ماموں ہیں۔ میری والدہ کے بھائی۔ مجھے اپنی ماں کو جوابدہی کرنی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ماموں حافظ کو میں اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ تم لوگ اپنے آپ کو تیار کر لو، میں ہر طرح سے اس ساری جائیداد اور دولت کا متولی تمہیں بنانا چاہتا ہوں۔ ذہنی طور پر تیار رہو۔"

"توبہ، توبہ، توبہ۔ خاقان بھائی! ہمیں دولت سے زیادہ عزت اور زندگی عزیز ہے۔"

"دیکھو، بہت بڑا بھروسہ کر رہا ہوں میں تم لوگوں پر۔ ایسی بات کر کے میرے اعتماد کو زخمی نہ کرو۔"

"ویسے تو آپ جو حکم دیں گے ہم وہ کریں گے۔ لیکن آپ یقین کریں یہ لوگ......"

"ایسا کرو، ان سے ملاقات کر لو۔ ان سے خود جا کر کہو کہ میں نے یہ کہا ہے۔ اگر کان پکڑ کر تمہارے سامنے سیدھے نہ ہو جائیں تو میری بات مت ماننا۔"

بہت دیر تک میں ان دونوں کو بریف کرتا رہا اور اس کے بعد حویلی چل پڑا۔

حویلی کے معمولات میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ تبدیلی تیسرے دن نمایاں ہوئی جب اچانک ہی پولیس کی دو گاڑیاں کچھ اعلیٰ افسران کے ساتھ اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے ایک طرح سے حویلی کی ناکہ بندی کر لی۔ اس وقت طارق جمشیدی اور ان کے دونوں بیٹے پائیں باغ میں تھے۔ دو انگریز افسران سے معلومات حاصل کرنے لگے۔ اور پھر ایک ملازم میرے پاس آ گیا اور اس نے کہا۔

"انگریز افسر کچھ تحقیقات کرنے آئے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے دل میں ہلکی سی پریشانی کا احساس ہوا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ لو، گڑبڑ ہو گئی۔ لیکن بہر حال یہ مرحلہ بھی حل کرنا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لان پر پہنچ گیا جہاں جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ طارق جمشیدی نے مجھے دیکھا اور دانت نکال کر بولے۔

"یہ ہیں خاقان۔ خاقان! یہ ہیں رابرٹ صاحب۔ کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔"

انگریز افسر نے مجھے دیکھا اور بولا۔ "مسٹر خاقان جمشیدی؟"

"جی میں ہی ہوں۔"

"مسٹر خاقان! آپ نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی تھی؟"

"جی۔"

"ہمیں یہاں سے اطلاع دی گئی ہے کہ دورانِ تعلیم آپ نے کسی انگریز افسر کو قتل کر دیا تھا اور اس کے بعد ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے۔"

میں نے پُروقار انداز میں افسر کو دیکھا اور اس کے بعد کہا۔ "آپ کو صرف اطلاع ہے یا آپ کے پاس اس کا حوالہ موجود ہے؟"

"نہیں، اس اطلاع کے ملنے کے بعد مکمل طور پر سارا ریکارڈ چیک کیا گیا ہے، کہیں بھی ریکارڈ میں کسی ایسے قتل کے بارے میں تفصیل نہیں ہے۔ پوری چھان بین کے بعد ہم یہاں آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے جس نے آپ کے خلاف یہ رپورٹ درج کرائی ہے اور حکومت کو بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔"

"جب آپ کے ریکارڈ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے رابرٹ صاحب! تو پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ کیا میں آپ کی خواہش پر آپ کے سامنے یہ اقرار کروں کہ میں نے ایسا کوئی کام کیا ہے؟"

"نہیں پلیز...... آپ لوگ تو بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ہمیں سیتا گڑھی کے ہمدان جمشیدی کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم ہیں۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے اور ان کی جائیداد بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ انگریز حکومت کے پاس ان کے خلاف کوئی ایسا ریکارڈ نہیں ہے جس سے انہیں کسی بھی طرح کا مجرم قرار دیا جائے۔ ہم معافی چاہتے ہیں، لیکن یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ کون ہے جس نے یہ غلط رپورٹ ہمیں دی ہے۔"

میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے غور سے طارق جمشیدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا کہتے ہیں چچا جان، اس سلسلے میں کس نے میرے خلاف یہ رپورٹ حکومت کو دی ہے؟"

"مم...... میں...... مجھے...... مجھے نہیں معلوم۔"

"رابرٹ صاحب! اعلیٰ افسران کو غلط رپورٹ دینا اور انہیں راستے سے بھٹکانا بھی ایک بہت بڑا جرم ہے۔ آپ براہِ کرم باقاعدہ تحقیقات کیجئے کہ کس نے یہ مذاق حکومت کے ساتھ کیا ہے اور جب یہ پتہ چل جائے کہ یہ اطلاع دینے والا کون ہے تو آپ اسے گرفتار کیجئے اور اس پر مقدمہ چلائیے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں مسٹر خاقان جمشیدی!" رابرٹ صاحب نے کہا اور اس کے بعد معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔

چچا طارق کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ایک لفظ بھی نہ بول سکے وہ۔ دونوں

بیٹوں کا بھی یہی حال تھا۔ بہرحال اس محاذ پر بھی انہیں شکست ہوئی تھی۔ اب رابرٹ صاحب نے اس سلسلے میں کیا تحقیقات کیں، مجھے اس بارے میں علم نہیں تھا لیکن چچا صاحب نے اپنے آخری کھیل کا آغاز کر دیا تھا۔ ادھر میں نے ماموں حافظ سے مل کر ان کے بیٹے ایاز کو ایک ذمے داری سونپی اور ایاز کو خاصی رقم بھی دی اور اسے کہا کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کام سرانجام دے۔

چنانچہ ایاز دہلی چلا گیا۔ پھر اس نے دہلی سے ایک بہت بڑے بیرسٹر صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ ساری تفصیلات میں نے ایاز کو بتا دی تھیں۔ ماموں حافظ کو میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

ادھر طارق جمشیدی صاحب نے نئے کھیل کا آغاز کر دیا۔ نغمانہ ان کی صاحبزادی تھیں۔ طارق جمشیدی صاحب کی صاحبزادی ہونے کی تمام صفات سے آراستہ۔ یقینی طور پر میری تاک میں لگی ہوئی تھیں اور اس دن جب میں بادلوں کی چھاؤں میں حویلی کے پائیں باغ میں خوبصورت پھولوں کا جائزہ لے رہا تھا، مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو نغمانہ صاحبہ دھانی سوٹ میں ملبوس مجسم قیامت بنی ہوئی میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"ہیلو...... آپ پلیز آ جائیے، میں چل رہا ہوں۔"

"ارے، ارے، ارے...... آپ کو دیکھ کر تو میں یہاں آئی ہوں اور آپ مجھے دیکھ کر جا رہے ہیں؟" نغمانہ نے نغمہ باری کی۔

"اوہو، کوئی کام ہے مجھ سے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ بہت ضروری کام۔"

"فرمائیے؟" میں نے کہا اور نغمانہ صاحبہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے ایک بہت خوبصورت پھول توڑا اور اسے میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"آپ کو یہ پھول پیش کرنا چاہتی تھی۔"

"شکریہ۔" میں نے پھول لیتے ہوئے کہا۔

"اور اب اس کے بعد کچھ سوالات میرے ذہن میں ہیں جو آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھئے۔"

"کوئی غلطی ہوئی ہے ہم سے؟"

"جی......"

"میں نے پوچھا کہ کوئی غلطی ہوئی ہے ہم سے؟"

"پتہ نہیں۔"

"مطلب یہ کہ آپ ناراض ہیں۔"

"کس سے؟"

"مجھ سے۔"

"بالکل نہیں۔"

"رشتہ ہے ہمارا آپس میں۔"

"جی ہاں۔"

"کیا رشتہ ہے؟"

"آپ میری کزن ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے آپ نے یہ الفاظ اُردو میں نہیں کہے۔"

"کیا مطلب؟"

"انگریزی کی کزن میں بڑی گنجائش ہے جبکہ اُردو میں اگر کوئی کسی کو بہن کہہ دے تو طبیعت پر خود بخود ایک بوجھ آ پڑتا ہے۔"

"بڑی اچھی توجیہہ تلاش کی ہے آپ نے۔"

"ہے تو سہی نا۔"

"آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔"

"اچھا مذاق ختم کیجئے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ مجھ سے منحرف ہونے کی وجہ کیا ہے؟"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ سے منحرف ہوں؟"

"آپ کے رویے نے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ میرے رویے میں ایسی کوئی بات تھی۔"

"ایک بار بھی آپ نے مجھے مخاطب نہیں کیا۔"

"ضرورت نہیں پیش آئی۔ چلئے اب کئے لیتا ہوں۔"

"ہاں یہ ہوئی نا بات۔ تو جناب! ہم آپ کے کزن ہیں اور اب آپ سے یہ فرمائش کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا سے ہٹ کر آپ ہماری طرف توجہ دیں۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے کہا۔ "ذرا توجہ کی قسم بھی بتا دیجئے۔ ویسے تو آپ کے ساتھ ڈنر ٹیبل پر خاص طور سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی آپ چچا جان کے ساتھ نظر آتی ہیں تو آپ سے سلام دعا بھی ہو جاتی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے۔" نغمانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو پھر میری ذمہ داریاں آپ مجھے بتا دیجئے؟"

"آپ کی ذمہ داریاں؟"

"جی۔"

"ٹھیک ہے، صبح کو آپ ہوا خوری کے لئے اٹھتے ہیں؟"

"پابندی کے ساتھ نہیں۔ کبھی دل چاہتا ہے تو اٹھ جاتا ہوں۔"

"کل سے آپ کو پابندی کرنا ہوگی۔"

"وہ کیسے؟"

"صبح ساڑھے چھ بجے آپ جاگ کر یہاں پائیں باغ میں آ جائیں گے۔ میں بھی چند منٹ کے بعد پہنچ جاؤں گی۔ ہم دونوں ایک گھنٹے تک ہوا خوری کریں گے۔ کل سے اس سلسلے کا آغاز ہوگا۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"جی۔"

بس نغمانہ صاحبہ پورے دن بجلیاں گراتی رہیں۔ ابتدا میں تو کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن جب رات کو ڈنر کے بعد انہوں نے بڑے پُراعتماد انداز میں کہا۔

"آپ نے ہمارا بیڈروم دیکھا ہے؟"

میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، سب نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

"آیئے میں آپ کو دکھاؤں۔ میں نے بڑے نادر سکے جمع کئے ہیں۔ سکے جمع کرنے کا شوق ہے۔ آیئے نا۔"

میں بوکھلائے ہوئے سے انداز میں نغمانہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا اور جب میں آگے بڑھ رہا تھا تو میں نے پلٹ کر طارق جمشیدی صاحب کی صورت دیکھی۔ طارق جمشیدی اپنی بیگم کو مسکرا کر کچھ اشارہ کر رہے تھے اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ چچا جان اب اپنا آخری کارتوس استعمال کر رہے تھے۔ پہلے انہوں نے بیٹوں کے ذریعے مجھے راستے سے ہٹانا چاہا لیکن الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے انگریز سرکار کو اطلاع دی

کہ ایک انگریز افسر کا قاتل یہاں موجود ہے۔ اطلاع ظاہر ہے گمنام حیثیت سے دی ہوگی ورنہ اب تک تھانے پہنچ چکے ہوتے۔ ذلائی لامہ کی نوازش نے انگریز محکمہ پولیس کے ریکارڈ سے اعلیٰ آفیسر کے قتل کا ریکارڈ غائب کرا دیا تھا اور مجھے ان لوگوں کے ذہن سے محو کر دیا تھا چنانچہ یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ اور اب آخری حربے کے طور پر وہ نغمانہ کو سامنے لائے تھے۔ اس بیوقوف لڑکی کے ذریعے وہ مجھے پھانسنا چاہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے میں کھایا کھیلا آدمی تھا، یہ بیوقوف لڑکی بھلا مجھے کیا احمق بنا سکتی تھی۔ اس جیسی درجنوں کو میں خود بیوقوف بنا کر پھینک دیتا۔ بہرحال یہ ان کا آخری کھیل تھا اس کے بعد وہ کیا کریں گے۔

ادھر ایاز کو میں نے جس کام سے بھیجا تھا وہ اس نے مکمل کر دیا اور بیرسٹر صادق ہادی خود میری فرمائش پر آ گئے۔ البتہ جب انہیں ایک جھونپڑی میں مجھ سے ملاقات کرنا پڑی تو وہ بہت حیران ہوئے۔

''یہ سب کچھ مذاق تو نہیں ہے؟ یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں مسٹر ایاز! آپ نے تو خاقان جمشیدی کا ذکر کیا تھا اور جمشیدی خاندان معمولی حیثیت کا مالک نہیں ہے، پوری سیتا گڑھی ہی اس کی ہے۔''

''میں خاقان جمشیدی ہوں بیرسٹر صاحب! اور آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں جھونپڑیوں کا ایک پورا شہر آباد ہے، بے شمار انسان ان جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ان کی زندگی، اس کی بود و باش صرف ایک مذاق ہے؟ کیا آپ تقدیر کو مذاق کہنا پسند کریں گے؟ کیا آپ اللہ کے عمل کو ایک مذاق سے تشبیہ دینا چاہتے ہیں بیرسٹر صاحب؟''

بیرسٹر صادق ہادی ایک دم سنبھل گئے اور انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انتہائی معذرت خواہ ہوں میں خاقان جمشیدی صاحب! سخت سرمندہ ہوں اپنے الفاظ پر۔ میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ اصل میں دیکھئے بات صرف اتنی سی ہے کہ انسان کسی بھی شخصیت کے بارے میں ایک ذہن رکھتا ہے، ایک سوچ رکھتا ہے۔ خاقان جمشیدی جیسا کہ میں نے عرض کیا بہت بڑا نام ہے، ہم اسے کسی شاندار حویلی میں تصور کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی ایسی جھونپڑی میں نظر آئے تو حیرت کی بات ہے۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو میں مذاق بالکل نہیں کہہ رہا۔ آپ میری بات کا یقین کر لیجئے گا۔''

''نہیں صادق ہادی صاحب! میں کوئی طنز نہیں کر رہا آپ پر۔ بس یوں ہی برسبیل تذکرہ

یہ بات نکل آئی تھی۔ خیر میں آپ کو تھوڑی سی تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ والد صاحب کی موت کے بعد مجھے ملک سے باہر جانا پڑا اور ایک طویل عرصہ میں نے یہاں کے معاملات سے لاتعلق رہ کر گزارا۔ پھر جب میں یہاں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ شاید یہ سوچ کر میری تمام جائیداد اور دولت پر قابض ہوگئے کہ میرے والدین تو مر ہی چکے ہیں، میں بھی لاپتہ ہوں چنانچہ یہ سب کچھ ان کا ہے۔ بڑی من مانیاں کرتے رہے وہ۔ رشتے کے چچا ہیں میرے، اپنی پسند اور ناپسند کا بھی اظہار کر دیا انہوں نے۔ بہرحال اب میں واپس آ گیا ہوں۔ قانونی رو سے یہ تمام جائیداد میری ہے۔ اور ویسے بھی میرے والد نے زمینوں اور جائیداد کا بہت بڑا حصہ بچپن ہی سے میرے نام منتقل کر دیا تھا۔ یہ صرف اولاد پیدا ہونے کے شوق کے نتیجے میں کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ تمام کاغذات کہاں محفوظ ہیں اور ویسے بھی میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں چنانچہ یہ ساری ملکیت میری ہے۔ میرے چچا صاحب اس دولت و جائیداد کے خود ساختہ متولی بن گئے ہیں اور اپنے دونوں بیٹوں کی مدد سے من مانی کر رہے ہیں۔ اب میں قانونی طور پر جائیداد کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں اور اپنا ایک متولی مقرر کرنا چاہتا ہوں جو اس سارے نظام کو سنبھالے۔''

''جی... بآسانی ہو سکتا ہے خاقان جمشیدی صاحب! آپ وہ کاغذات مجھے مہیا کر دیں۔''

''آپ سے ملاقات ہوگئی، بڑا اچھا ہوا۔ میرا خیال ہے میں ایاز ہی کو اس سلسلے میں استعمال کروں گا۔ کیونکہ میں خود یہاں مصروف ہوں۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا آپ پسند کریں۔ ویسے آپ کو دہلی آنا پڑے گا۔ بس ایک بار عدالت عالیہ میں جا کر آپ مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرا دیں، باقی سب بالکل ٹھیک ہے۔''

''میں حاضر ہوں جاؤں گا جب بھی آپ حکم دیں گے۔ بیرسٹر صاحب! معافی چاہتا ہوں یہ ایک حقیر سی رقم آپ کی فیس کے طور پر۔''

میں نے ایک خاصی بھاری رقم بیرسٹر صادق ہادی کو دی اور انہوں نے شکریہ کے ساتھ وہ رقم قبول کر لی۔ بس پھر تو ان کا رویہ ہی بدل گیا۔ کچھ کاغذات انہوں نے فوری طور پر تیار کئے جو ان کی اپنی ہی اتھارٹی کے طور پر تھے اور میں نے انہیں اپنا قانونی مشیر مقرر کر دیا تھا۔ یہ کارروائی ہوئی اور صادق ہادی نے واپسی کی اجازت طلب کر لی۔ ایاز انہیں چھوڑنے چلا گیا تھا۔ ماموں حافظ نے کہا۔

''مجھے یقین کرو اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ طارق جمشیدی کا دورِ اقتدار ختم ہو گیا اور اس کے راستے تنگ ہو گئے، مجھے بس اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنا منصب سنبھال لیا۔ اب جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ ایک الگ بات ہے۔''

''جی...... میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن آپ بے فکر رہئے۔ بات وہی آ جاتی ہے ماموں صاحب! والد صاحب یعنی ہمدان جمشیدی تو انتہائی فراخ دل انسان تھے، اپنے خاندان کو ہر طرح کی سہولتیں باہم پہنچانا ان کی دلی خواہش ہوتی تھی، ہر ایک کو بلا کر انہوں نے اپنے پاس حویلی میں رکھا اور حویلی بھر دی تھی۔ میں بھی ان کے ان اقدامات سے منحرف نہیں ہوں۔ مگر یہ کیا کہ طارق جمشیدی صاحب نے لوگوں کے بارے میں فیصلے کرنا بھی شروع کر دیئے کہ کس کو کیا مقام دینا ہے، کس کے لئے کیا کرنا ہے۔ ویسے ماموں صاحب! آپ کو ایک دلچسپ اطلاع دوں، دینا تو نہیں چاہتا تھا لیکن آپ کو خوشی ہو گی، اس کا مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔ طارق جمشیدی صاحب نے بہت سی چالیں چلی ہیں اور اپنی ہر چال میں ناکام رہے ہیں۔''

''کیا مطلب... کیسی چالیں؟'' ماموں حافظ نے پوچھا اور میں انہیں شروع سے ساری تفصیل بتانے لگا۔ احمد اور شاہنواز کی کالے کنوئیں پر ہنگامہ آرائی، اس کے بعد دوسری کوششیں یعنی انگریز سرکار کو میرے بارے میں تفصیل بتانا اور پولیس کو بلا لینا۔ یہاں بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ اور تیسری کوشش نعمانہ کی تھی۔ میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔

''نعمانہ لڑکی ہے اور بہرحال طارق جمشیدی صاحب سے میرا ایک چھوٹا سا رشتہ بھی ہے۔ لیکن طارق جمشیدی صاحب نے جس حوالے سے اس کا آغاز کیا ہے وہ ظاہر ہے بڑا شرمناک ہے۔ ان کا مفہوم کچھ اور ہی ہے۔''

ماموں حافظ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''خداوند عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے نام کے ساتھ کوئی ایسی چیز وابستہ نہیں تھی۔ خاص طور سے یہ کہ میری کوئی بیٹی ہی نہیں ہے۔ حالانکہ بیٹیاں اللہ کی نعمت ہوتی ہیں اور میں نے ہمیشہ بیٹیوں کی خواہش کی ہے۔ لیکن بہرحال اللہ کا حکم نہیں تھا۔ اور اس کا حکم تو بہرحال ہر حالت میں قبول ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا! یہ تو بڑی شرمناک حرکت ہے۔''

میں ہنسنے لگا تھا۔

☆☆☆

نعمانہ بیچاری کوئی تربیت یافتہ لڑکی تو تھی نہیں۔ اب ان بیوقوفوں کو کیا معلوم کہ میں نے زندگی میں بڑے الٹ پھیر دیکھے تھے۔ ایسے ایسے کردار میری زندگی میں آئے تھے جو عورت کے نام سے بہت آگے نکل چکے تھے اور جن کا زندگی میں ایک تجربہ تھا۔ عالیہ آدم زمان اور اس کے بعد اینہ وغیرہ یہ سب بہت آگے کی چیزیں تھیں۔ اور میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اچھا خاصا کھایا کھلایا انسان تھا، پھر بیچاری یہ معصوم سی گھریلو لڑکی مجھے کیا بیوقوف بناتی۔ حالانکہ حیران کن بات یہ تھی کہ کم از کم ایسے معاملات میں یہ لڑکیاں خود بخود ٹرینڈ ہو جاتی ہیں۔ نعمانہ اپنی بھرپور قوتوں کے ساتھ مجھ پر حملہ آور تھی۔ موقع ملتے ہی میرے پاس آ گئی۔

''کہاں گئے تھے؟''

''ارے یہ آپ کا اندازِ تخاطب کیسا ہے نعمانہ؟''

''اتنی گاڑھی اُردو کیوں بول رہے ہیں؟''

''کیوں؟''

''آپ کا اندازِ تخاطب۔ کیا میں آپ کہلانے کے قابل ہوں؟''

''کیوں بھئی کیوں، یہ تو احترام کا لفظ ہے۔''

''احترام؟'' اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''بابا، کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں ہنس کر بولا۔

''عزت، احترام یہ تمام رشتے تکلف کے ہوتے ہیں اور جناب خاقان صاحب! میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھ سے تکلف برتیں۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میری چاہت آپ کے لئے قابلِ قبول ہے یا نہیں۔''

میں ششدر رہ گیا تھا۔ کیا ذو معنی لفظ تھا۔ میں خاموش ہو گیا تو وہ بولی۔ ''دیکھئے...... کسی بھی بات کا جواب دیا جاتا ہے۔''

''ہاں، دیا تو جاتا ہے۔ کیا آپ نے کوئی سوال کیا مجھ سے؟''

''جی، اگر آپ سمجھیں تو۔''

''میری چاہت آپ کے لئے قابلِ قبول ہے یا نہیں؟'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''اصل میں یہ اُردو زبان جو ہے نا، بڑی مشکل زبان ہے۔ آپ کون سی چاہت کی بات کر رہی ہیں؟'' میں نے کہا اور وہ شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

"میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے بے تکلفی سے پیش آیا کریں۔"

"اس چاہت کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟" میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ حرفوں سے کھیل رہے ہیں۔"

"چلئے معذرت چاہتا ہوں۔"

"چاہتا ہوں؟"

"جی، جی۔"

"اب دیکھئے نا یہاں بھی چاہت کا لفظ استعمال ہو گیا۔ کتنے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔"

"بھئی آپ کی طرح میں لفظوں کا کھلاڑی نہیں ہوں۔ ویسے بھی زیادہ تر ملک سے باہر رہا ہوں۔"

"جناب، کلکتے میں بڑی تعلیم حاصل کی ہے آپ نے۔"

"ہاں کی تو ہے۔"

"اچھا ایک بات بتائیے، کلکتے میں جب آپ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو کتنی عمر تھی آپ کی؟"

"مردوں سے ان کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"جی نہیں، یہ بات خواتین کے لئے کہی جاتی ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، کیا خواتین اپنی عمر ٹھیک نہیں بتاتیں؟"

"ارے ہم کیا باتیں کر رہے ہیں، کہیں کسی ایک جگہ ٹکتے ہی نہیں ہیں۔ میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ آپ کہاں گئے تھے اور بات ایک دوسرے کے کاندھے پر سوار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن کیا آپ اب دوبارہ اس سوال پر واپس آئیں گی؟"

"کون سے سوال پر۔"

"یہی کہ میں آپ کو بتاؤں کہ میں کہاں گیا تھا۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ میں زیادتی کر رہی ہوں۔ آپ نے تو یہ تک نہیں بتایا ابھی مجھے کہ مجھے آپ سے یہ سوال کرنے کا حق ہے یا نہیں۔"

"بھئی آپ میری کزن ہیں۔"

"چھوڑیئے، ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ کزن تو آپ کے یہاں اور بھی بہت سے ہیں۔"

"پھر آپ کیا چاہتی ہیں نغمانہ صاحبہ؟"

"چاہت، چاہت، چاہت۔ دیکھا آپ نے، یہ تو بڑا خطرناک لفظ ہے بھئی۔" نغمانہ نے کہا اور ہنس پڑی، پھر بولی۔ "آیئے باہر چلیں۔ یہاں گھٹن ہو رہی ہے۔ ویسے آپ کا فرض ہے کہ آپ ہمیں اپنی زمینیں دکھانے لے جائیں، تھوڑی سی سیر و سیاحت کرائیں۔ پتہ نہیں آپ کس طرح کے کزن ہیں، گھاس ہی نہیں ڈالتے۔"

"آپ کی خدمت میں گھاس کے گٹھر کے گٹھر۔ لیکن جہاں تک زمینیں دکھانے کا تعلق ہے تو آپ کے دونوں برادران مجھے زمینیں دکھانے لے گئے تھے۔ کیا آپ کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ کیا مطلب؟" نغمانہ نے کہا اور میں اس کے چہرے پر جھوٹ اور سچ تلاش کرنے لگا۔ اندازہ یہ ہوا کہ وہ سچ ہی بول رہی ہے۔ ظاہر ہے چچا جان اب اسے ایسے معاملات میں تو شریک نہیں کر سکتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ اسے میری جانب پھینکنے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے یونہی ایک سوال کر ڈالا اس سے۔

"نغمانہ، ایک بات بتایئے آپ؟"

"جی فرمایئے؟"

"یہ اچانک ہی آپ میری طرف راغب کیوں ہو گئیں؟ مجھے تو یہاں آئے ہوئے خاصے دن گزر گئے۔ آپ نے تو مجھ سے کبھی کسی خاص رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔"

"سچ بتاؤں آپ کو؟"

"میرا خیال ہے جھوٹ بولنے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔"

"آپ مجھے پہلی نگاہ میں اچھے لگے تھے لیکن بس ہمارا تعلق مشرق سے ہے۔ ماں باپ، بھائی یہ سب ہمارے لئے قابل احترام ہوتے ہیں اور ہم ان کی مرضی کے تابع۔ آپ مجھے اچھے لگے تھے لیکن میں نے اس بات کو اپنے دماغ میں ہی رکھا۔ پھر ایک دن امی نے مجھ

سے آپ کے بارے میں سوال کیا۔

''سوال کیا؟''

''ہاں۔''

''کیا؟''

نغمانہ کے چہرے پر پھر شرم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ دیر تک خاموش رہی۔ جب میں نے دوبارہ اس سے کہا تو وہ بولی۔

''انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ خاقان تمہیں کیسے لگتے ہیں۔'' وہ شرمائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اچھا، پھر؟''

''ظاہر ہے میں کوئی جواب تو نہیں دے سکتی تھی انہیں۔''

''کیوں...... اچھے یا برے لگنے سے کوئی برائی تو نہیں پیدا ہو جاتی۔''

''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اب میں ان سے کیا کہتی؟''

''کیا کہا آپ نے، مجھے یہ بتائیے۔''

''بس میں خاموش ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ نغمانہ، تمہارے ابو خاقان کو تمہاری زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ خاقان سے مراسم بڑھاؤ۔ اگر تم اس کے ساتھ نظر آؤ گی تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ نہ مجھے، نہ تمہارے ابو کو اور نہ تمہارے بھائیوں کو۔ اپنا ایک معیار قائم رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خاقان سے گہری دوستی پیدا کر لو تاکہ مستقبل میں تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے میں کوئی اُلجھن پیش نہ آئے۔''

میرا دل چاہا کہ ایک زور کا قہقہہ لگاؤں۔ لیکن نغمانہ ان برے لوگوں میں اتنی بری نہیں تھی، جس سادگی سے اس نے یہ سب کچھ بتایا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد وہ خاصی دیر تک شرمائی شرمائی رہی تھی۔

بہر حال اگر وہ چچا طارق کی سازش نہ ہوتی تب بھی بے چاری مجھے اس حیثیت سے قبول تو نہیں تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ ملازموں کی آمد نے یہ سلسلہ ختم کیا اور نغمانہ چلی گئی کیونکہ اسے طارق جمشیدی نے بلایا تھا۔ میں گہری سانس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

بہر حال میرے ذہن پر کوئی بوجھ، کوئی بار نہیں تھا۔ طارق جمشیدی صاحب غلط آدمی تھے اور اب اپنی غلط کاریوں کی سزا بھگتنے جا رہے تھے۔ میں نے جو فیصلے کئے تھے وہ کافی سخت تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کاغذات کی تلاش شروع کر دی۔

بہت ہی پرانی بات تھی، ایک دفعہ میں ہمدان جمشیدی صاحب کے ساتھ شکار پر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا اور ہمدان جمشیدی صاحب تھوڑے سے کاغذات میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ کاغذات دولت اور جائیداد سے متعلق ہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی مجھے بتایا کہ خاقان! ان کاغذات کی جگہ ذہن نشین کر لو۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ میں نے تمہاری والدہ تک کو اس بارے میں نہیں بتایا۔ بات اصل میں یہ ہے بیٹا! کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے روگ پال رکھے ہیں۔ اب تم سے کیا چھپانا، میری بہت سی بیگمات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کبھی کوئی ایسا وقت آئے جب جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں کچھ پریشانیاں ہوں۔ اس لئے میں یہ کاغذات تیار کر کے وہاں رکھ رہا ہوں۔ آؤ میں تمہیں وہ جگہ دکھا دوں۔ اس کے بارے میں خبردار کسی کو معلوم نہ ہونے دینا۔

اس وقت تو بس یہ مجھے ایک کھیل لگا تھا۔ لیکن آج وہ کھیل میرے لئے کس قدر کارآمد تھا، میں ہی جانتا تھا۔

حویلی کے ایک دور دراز کمرے میں ایک الماری دیوار میں نصب تھی۔ اس میں طرح طرح کے فائل اور کاغذات دیوار میں چنے ہوئے تھے۔ لیکن اس الماری کو ایک خاص کیل کے ذریعے گھمایا جا سکتا تھا اور اس کے پیچھے ایک دوسری الماری نمودار ہو جاتی تھی جس میں یہ کاغذات تھے۔ میں نے سامنے والی الماری میں پرانے کاغذوں کے ڈھیر دیکھے لیکن ایک لمحے کے اندر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان فائلوں اور کاغذات کو ہزاروں مرتبہ دیکھا گیا ہے۔ البتہ جب میں نے وہ کیل گھمائی تو الماری بے آواز گھوم گئی اور اس کے پیچھے مجھے ان کاغذات کا پیکٹ نظر آ گیا جو میرے لئے بڑی حیثیت کے حامل تھے، جن کی رو سے میں اپنے والد کی تمام جائیداد کا تنہا اور بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ ہمدان جمشیدی صاحب نے بہر حال مجھ سے ساری زندگی محبت کی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے دوستوں کی حیثیت دی تھی اور دوست ہی کی حیثیت سے وہ مجھے شکار پر لے جاتے تھے۔ آج ان کی دوستی پھر میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ زندگی میں پہلی بار میری آنکھوں سے آنسوؤں کے کچھ قطرے بہہ گئے۔

بہر حال یہ ایسے کردار ہوتے ہیں جن سے زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور جن پر زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ اپنا فرض پورا کر کے دنیا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن دنیا میں جو کچھ اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جاتے ہیں وہ نا قابل فراموش ہوتا ہے۔ ہمدان جمشیدی صاحب کی ایک ایک بات مجھے یاد آتی رہی اور میں ان کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر ان کا پیکٹ بند کر کے وہاں سے چل پڑا۔ اصل کام تو پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا آغاز کر دینا ضروری تھا۔ اور میں ان لوگوں میں سے بالکل نہیں تھا جو آج کا کام کل پر چھوڑ کر مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک بار پھر قرب و جوار پر نگاہ رکھتے ہوئے ماموں حافظ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ اس بات کا پورا پورا خیال رکھتا تھا کہ ذرا طارق جمشیدی صاحب کی کارروائیوں پر نگاہ رکھی جائے۔ جو بڑا کام وہ کر رہے تھے اس کے لئے انہیں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا سی چوک انہیں بہت بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے یہ دولت اور جائیداد کھو دینا ان کے لئے زندگی کا سب سے بڑا نقصان کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے بعد ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر جو عمل انہوں نے کیا تھا وہ ایسا تھا کہ حویلی کا ایک بھی شخص ان سے ذرہ برابر ہمدردی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمدردی کے قابل تھے ہی نہیں۔

بہر حال وہ اپنا کام کر رہے تھے اور میں اپنا۔ ایاز کو میں نے ایک اور اچھی خاصی رقم دی اور کہا۔

”تم صادق ہادی صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کاغذات بڑی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں ضائع نہیں ہونا چاہئے۔“

”آپ بالکل فکر نہ کریں خاقان بھائی!“ ایاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مسکراہٹ میں اس کا عزم چھپا ہوا تھا کہ وہ زندگی کی قیمت پر بھی ان کاغذات کی حفاظت کرے گا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسا میں نے محسوس کیا۔ ایاز کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا اور ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہونے جا رہی تھی۔

ایاز دہلی چلا گیا۔ اسی رات کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے میں اپنی آرام گاہ میں آرام کر رہا تھا کہ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ ذرا اپنے چاروں موکلوں کی مدد سے دیکھوں تو سہی کہ چچا جان کی اب کیا کیفیت ہے۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور درحقیقت

ایک بار پھر میں دلائی لامہ کی اس مہربانی کا شکر گزار ہو گیا جو اس نے اپنے جادو منتر سے مجھ پر کی تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ میں اپنے دشمنوں کے نزدیک اس طرح پہنچ جاتا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان سانسوں کا فرق بھی نہ رہے۔ پتہ نہیں کیوں چھٹی حس نے یہ کہا تھا کہ اس وقت مجلس مشاورت ہو رہی ہو گی اور ممکن ہے موضوع میں ہی ہوں۔ کیا عمدہ خیال تھا۔ میرے سامنے جو منظر آیا وہ یہی تھا کہ طارق جمشیدی صاحب کے دونوں سپوت گردن خم کئے بیٹھے ہوئے تھے، بیگم صاحبہ کچھ فاصلے پر نٹنگ کر رہی تھیں اور طارق جمشیدی صاحب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔

”بات یہ ہے بیٹا، جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو دوسروں ہی کے سہارے تلاش کرنے لگتا ہے۔ لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب اس کے سہارے بالکل ہی بودے اور کمزور نکلیں۔“

”اور بزرگوں کا یہ سب سے بڑا شوق ہوتا ہے ابا جان! کہ وہ جوان اولاد کو گالیاں بکتے رہیں۔ ارے بابا! آپ نے دنیا دیکھی ہے، دنیا کو آپ ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے، ہم کیا کریں؟ ہمیں گالیاں تو آپ اس وقت دیں جب آپ کچھ کہیں اور ہم اس سے انکار کریں۔“

”یہی تو افسوس کی بات ہے۔ تم یہ بتاؤ اس وقت میری مدد کون کرتا تھا جب تم کتے کے پلوں کی طرح ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے تھے۔ میں ہی تھا نا جس نے اپنی عقل، اپنی دانش سے تمہیں ایک مضبوط اور طاقتور جوان بنایا۔ اب وقت ہے کہ میرے مسائل میں تم اپنے دماغ سے سوچو۔ ابے تم لوگوں کے پاس دماغ ہے یا نہیں؟ اس کا مجھے جواب دے دو۔“

”اس بات کا تو ہم جواب دے دیں گے۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ٹانگ کا کیا کریں جو ہماری ہر سوچ میں آ کر اڑ جاتی ہے۔“

”ٹانگ؟“ طارق چچا حیرت سے بولے۔

”جی ہاں، ٹانگ۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”دیکھ رہی ہو تم......؟“ طارق چچا بیگم سے بولے۔

”جو بات ہے، صاف کہو۔“ چچی جان نے بیٹوں سے کہا۔

''ہم کچھ کرتے ہیں تو والد صاحب کی ٹانگ بیچ میں آجاتی ہے۔'' شاہنواز نے کہا۔

''بیٹے...... میرے لختِ جگر! میرے نورِ نظر، کیا کرتے ہو تم...... اسے قتل کرنے چھ افراد جاتے ہو۔ چار کا وہ مار مار کر حلیہ خراب کر دیتا ہے اور تم پورے چار گھنٹے کالے کنوئیں میں الٹے لٹک کر اس سے معافیاں مانگتے گھر آجاتے ہو۔''

''آپ کے پاس طنز کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟'' احمد نے جل کر کہا۔

''جھوٹ بول رہا ہوں میں...... بتاؤ؟''

''آپ کو حقیقت بتائی جا چکی ہے۔''

''حقیقت؟''

''جی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ تنہا نہیں تھا۔''

''کون تھا اس کے ساتھ؟''

''کچھ پراسرار قوتیں۔''

''جو نظر نہیں آتی تھیں؟''

''جی۔''

''بیٹے، ہم بھی بچپن میں ایسے ہی بے تکے جھوٹ بولتے تھے۔ لیکن وہ بچپن کی بات تھی۔ جوان ہو کر ہم نے ایسا جھوٹ کبھی نہیں بولا۔''

''ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔'' دونوں بیٹے چیخ کر بولے۔

''چیخو مت...... میں تم سے زیادہ چیخ سکتا ہوں۔''

''پھر ہم ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''سب کچھ بھاڑ میں جائے۔'' شاہنواز نے کہا۔

''چلا جائے گا نورِ نظر...... چلا جائے گا۔ اطمینان رکھو۔ مگر یہ جانتے ہو کہ سب کچھ بھاڑ میں جانے کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟''

''ہمیں کیا معلوم۔''

''مجھے معلوم ہے، بتاؤں؟'' طارق چچا بولے۔

''وہ بھی بتا دیجئے۔''

''چولہے میں۔'' طارق چچا بولے۔

''تو آخر ہم کیا کریں؟ آپ نے تو ہماری زندگی برباد کر دی ہے۔'' شاہنواز غصے سے بولا۔

''بالکل ٹھیک کہتے ہو تم...... بالکل ٹھیک کہتے ہو الو کے پٹھو۔ دو کوڑی کے نہیں ہو تم۔ بالکل ناکارہ...... حرام خور، مردود۔''

''بس ایک آسانی حاصل ہے آپ کو ابا جان! وہ یہ کہ آپ ہمارے باپ ہیں۔ ورنہ ہم آپ کو بتاتے کہ ہم کتنی کوڑیوں کے ہیں۔''

''مجھے بتاتے...... ایں...... مجھے بتاتے؟'' طارق چچا کسی ہتھیار کی تلاش میں پھدکنے لگے اور چچی جان بیٹوں کو دروازے کی طرف دھکیلنے لگیں۔

ہنس ہنس کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ دونوں صاحبزادے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ کمرے کی فضا خاصی مکدر ہو گئی تھی۔ بیگم طارق جمشیدی یعنی چچی صاحبہ منہ پھاڑے بیٹھی تھیں۔ نغمانہ پریشان تھی۔ پھر اسی نے یہ خاموشی توڑی۔

''یعنی اب یہ ہو گا گھر میں؟''

''اس سے بھی برا...... دیکھو تو سہی۔'' طارق صاحب نے ہتھیلی پر گھونسہ مار کر کہا۔

''آپ ہی خود کو سنبھالیں۔ جوان بچوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے۔'' چچی جان نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ایک بات کہوں تم سے۔'' چچا طارق بولے۔

''جی......''

''انہیں بدمعاش میں نے بنایا ہے۔''

''تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔'' چچی جان بولیں۔

''اور میں ہی انہیں ٹھیک بھی کر سکتا ہوں۔''

''ضرور کریں۔''

''سال سال بھر کی سزا کرا دوں گا۔ جیل میں چکی پیسیں گے تو اوقات میں آجائیں گے۔ جب چاہوں یہ کام کر سکتا ہوں۔''

''یہ کوئی حل ہے؟'' چچی جان بولیں۔

"یہی حل ہے ان کمین کے بچوں کا۔" طارق صاحب نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمین کے بچے تو پہلے ہی باہر نکل گئے تھے، والد صاحب بھی باہر نکل گئے۔ اب رہ گئی تھیں نغمانہ بیگم اور محترمہ چچی جان۔ اب میں نے یہ سوچا کہ ذرا ان کی بھی سنوں۔ نغمانہ بیگم سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک چچی جان نے چونک کر کہا۔

"نغمانہ! تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟"

"امی، میں کیا کہوں گی۔ آپ لوگوں نے مجھے جس راستے پر لگایا ہے، میں کام کر رہی ہوں آپ کی ہدایت کے مطابق۔ حالانکہ آپ کو پتہ ہے میں کس طرح کی لڑکی ہوں۔ میں نے کبھی......"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن بعض اوقات مصلحت کے لئے سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اب تم دیکھو نا، ہم کیسی مشکل میں آ پھنسے ہیں۔ اگر خاقان جمشیدی اپنا سب کچھ واپس لینے پر اتر آئے تو اسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔ کون سنبھالے گا اسے؟"

"میں جانتی ہوں۔"

"اب تو تم پر ہی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔"

"جب آپ مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں تو پھر مکمل بھروسہ کیوں نہیں کر لیتے؟ یہ پریشانیاں کس لئے؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم......"

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے وہ میں آپ کو کر کے دکھا دوں گی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو تو آپ نے ناکارہ بنا دیا ہے۔ لیکن میں خدا کے فضل سے ناکارہ نہیں ہوں۔"

"جی خوش کر دیا تو نے بیٹی!" چچی جان نے اپنی ہونہار بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ میرے نادیدہ محافظ میری نگاہوں کے سامنے سے ختم کر دیں۔ اور ایسا ہو گیا۔ وہ میرے ہر اشارے کو سمجھنے لگے تھے۔

بہر حال یہ ایک دلچسپ مرحلہ تھا جو اب میری زندگی سے گزر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہاں بھی اچھی خاصی دلچسپ صورتحال ہے۔ ماموں حافظ کے گھر بڑا سکون ملتا تھا۔ زندگی کہاں کہاں، کس کس عالم میں ہوتی ہے۔ جھونپڑیوں کا یہ شہر اپنے مسائل الگ رکھتا تھا اور ماموں حافظ ان لوگوں سے زیادہ مطمئن نظر آتے تھے۔ رُوکھی سوکھی میں زندگی گزر رہی

تھی۔ میں بھی اسی میں شامل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ صادق ہادی نے اپنے سارے کام مکمل کر لئے اور اس کے بعد خود مجھ سے ملنے آ گئے۔ بہت بڑے بیرسٹر تھے اور سنا یہ گیا تھا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ایسی جھونپڑیوں میں قدم رکھنا ان کے لئے بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ لیکن عزت اور بے عزتی کا تعین بھی دولت کے معیار پر کیا جاتا ہے۔ اب اس جھونپڑی سے انہیں بڑی رغبت تھی کیونکہ یہاں سے انہیں بہترین معاوضہ مل رہا تھا۔ تمام کاغذات انہوں نے تیار کرا لئے تھے اور پھر جب انہوں نے پوچھا کہ اب اس جائیداد کے متولی کے خانے میں کس کا نام لکھا جائے تو میں نے بڑے اطمینان سے ماموں حافظ کا نام لے دیا اور ماموں حافظ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"یہ...... یہ...... یہ بیٹا...... یہ بیٹا......"

"ماموں جان! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں تو آوارہ مزاج آدمی ہوں۔ آج یہاں کل وہاں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے میرے مشاغل کیا ہیں۔ میں آپ جیسی ذمہ دار شخصیت کو یہ تمام ذمہ داریاں سونپنا چاہتا ہوں اور بلاتکلف اس سلسلے میں بھی کچھ معاملات طے کر دینا چاہتا ہوں۔ مثلاً میں نے زمینوں کے بہت سارے کاغذات، جائیداد وغیرہ کی تفصیلات دیکھی ہیں۔ ان تمام چیزوں میں سے بیس فیصد میں محمود اور ایاز کے نام کرتا ہوں۔ اس آمدنی کا بیس فیصد ان کی ملکیت ہوگا، پندرہ فیصد آپ کے متولی ہونے کا معاوضہ۔ آپ ان تمام چیزوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ پانچ فیصد اس اسٹاف کے لئے جو آپ کے ساتھ آپ کے معاونوں کے طور پر کام کرے گا۔ یہ ہوئے چالیس فیصد۔ دس فیصد خاندان کے ان افراد کے لئے جو حویلی میں ہمارے ساتھ رہتے ہیں، ان کی فلاح و بہبود، ان کے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال۔ باقی پچاس فیصد آپ میرے اکاؤنٹ میں رہنے دیجئے۔ صادق ہادی صاحب! آپ نے میری بتائی ہوئی تفصیلات نوٹ کر لی ہیں؟"

"بالکل...... بالکل جناب۔ نوٹ کر لی ہیں۔"

محمود اور ایاز کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ جو بیس فیصد آمدنی میں نے ان کے حوالے کی تھی، اتنی تھی کہ وہ رئیسوں کی طرح زندگی گزار سکتے تھے۔ معمولی زمینیں اور جائیدادیں نہیں تھیں۔ صادق ہادی صاحب نے کہا۔

"ایک بات اور فرمائیے جناب! طارق جمشیدی صاحب نے جو اُلٹ پلٹ کی ہے، اس

کے بارے میں کیا کرنا ہے؟"

"صرف انہیں دھمکیاں دینا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی میرے چچا ہی ہیں اور جو کچھ کر چکے ہیں اس کے نتیجے میں اگر میں چاہوں تو انہیں بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن میں انہیں حویلی میں نہیں رہنے دینا چاہتا۔ مشرقی سیتا گڑھی میں ہمارا ابھی ایک مکان ہے اور جس میں ہماری ایک والدہ صاحبہ رہتی تھیں۔ یعنی ہمارے والد صاحب کی پتہ نہیں کون سے نمبر کی بیگم، اب جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ گھر اگر طارق جمشیدی صاحب چاہیں تو انہیں دیا جا سکتا ہے۔ ہاں ایک شق خاص طور سے قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ اگر طارق جمشیدی صاحب اور ان کے دونوں بیٹوں نے خاندان کے کسی بھی فرد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو پھر انہیں باقی عمر جیل میں ہی گزارنی پڑے گی۔"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔" صادق ہادی نے کہا۔ میں نے اس سلسلے میں یہ تمام فیصلے کر لئے۔ صادق ہادی نے اس کو نوٹ کر لیا، پھر انہوں نے کہا۔

"اب آپ یہ فرمایئے کہ دہلی کب آ سکتے ہیں؟ میں ان تمام کاغذات کو تین دن کے اندر تیار کر لوں گا۔ آپ براہِ کرم دہلی کا ایک چکر لگا کر عدالت میں اپنا بیان دے دیجئے گا، سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"تو آج سے پانچویں دن میں دہلی آ جاتا ہوں۔"

"ہاں، ایسا ہی کیجئے گا۔"

میں نے صادق ہادی صاحب سے وعدہ کر لیا۔ جب صاحب ہادی چلے گئے تو ماموں جان اور ممانی جان نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"اب بتایئے کیا ہوا؟ اب یہ رونا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"بیٹا، یہ تم نے ہمیں کس بات کا صلہ دیا ہے، یہ بتا دو۔"

"آپ کو اپنا ماموں ہونے کا۔"

"نہیں، یہ بہت زیادہ ہے۔"

"ماموں جان! آپ میری والدہ کے عزیز ہیں اور یقیناً والدہ کو بھی عزیز ہوں گے۔ میں نے یہ سب کچھ ان کی روح کی خوشی کے لئے کیا ہے۔ دیکھئے نا ویسے بھی مجھے کیا کرنا ہے۔ اب یہ دونوں حضرات میرے بھائی ہیں۔ کتنی بے کسی اور کسمپرسی کی زندگی گزاری ہے انہوں

نے۔ پڑھے لکھے ہیں۔ انہیں ان کا شایانِ شان مقام مل جائے گا تو آپ کے خیال میں ایک بھائی کو اس کی خوشی نہیں ہو گی؟"

"خدا تمہیں صدیوں تک آباد رکھے۔ اور کیا کہہ سکتے ہیں ہم نادار لوگ۔"

"بابا! اب بھی آپ نادار ہیں؟ صادق ہادی صاحب سے ذرا ملاقات کر کے دیکھئے، رویہ ہی بدل گیا ہو گا ان کا۔ کیونکہ سب سے پہلے انہیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی شخصیت کتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

میں ان لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔ بڑے خوش تھے سارے کے سارے۔ بہرحال یہ خوشیاں ان کا حق تھیں۔ طارق جمشیدی صاحب نے اگر یہ ساری کارروائیاں نہ کی ہوتیں تو یقینی طور پر میں انہیں بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ لیکن مجھے مروانے کی کوششیں کر چکے تھے۔ اب اتنا تو فرشتہ صفت میں بھی نہیں تھا کہ اس کے باوجود ان کے ساتھ ایثار کرتا۔ یہ سب کچھ تو غلط ہو جاتا نا۔

بہرحال اس طرح میں نے یہ کارروائی کر دی۔ ادھر محمود اور ایاز بڑی رازداری کے ساتھ کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ نغمانہ صاحبہ بیچاری اپنے طور پر میری خاطر مدارات میں لگی رہتی تھیں۔

پانچویں دن میں نے دہلی جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے اجازت لینا تو ضروری نہیں تھی۔ میں خاموشی سے چل پڑا۔ محمود میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں آخر کار دہلی پہنچ گئے۔ دہلی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہم نے قیام کیا۔ حالانکہ صادق ہادی صاحب نے مجھے پیشکش کی تھی کہ میں ان کی کوٹھی پر رہ سکتا ہوں لیکن میں نے ہوٹل زیادہ بہتر سمجھا تھا۔ چنانچہ میں ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دوسرے دن صادق ہادی صاحب نے مجھے عدالت میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے میں نے تمام بیانات دیئے اور کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ گواہی کے لئے صادق ہادی صاحب نے کچھ افراد کو منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ ساری کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور تمام کاغذات صادق ہادی کی ہی تحویل میں دے دیئے گئے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں محمود کے ساتھ دہلی کی سیر کو نکلا اور اس وقت میرے ذہن میں کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ بس دہلی جو انگریزوں کی تحویل میں تھا اور مغل اسے کبھی کا کھو چکے تھے، میری نگاہوں کے سامنے تھا اور میرے ذہن پر نجانے کیسے کیسے تصورات قائم تھے۔ وردان سادھانی، سیوک

سندھورتی، گاشر برم، شومندر، وہ پراسرار حالات جو ماضی میں مجھے پیش آ چکے تھے سب کے سب میرے سامنے تھے۔

شاہی قلعے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ ایک گاڑی کے بریک میرے بالکل قریب آ کر لگے اور میں چونک پڑا...... گاڑی میں سے کسی نے میری طرف چھلانگ لگائی اور میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ لیکن چھلانگ لگانے والے نے کسی برے ارادے سے میری جانب چھلانگ نہیں لگائی تھی بلکہ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ نجانے کیا کیا اول فول بکتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اسے دیکھا اور ایک لمحے کے اندر پہچان گیا۔ یہ ستنام سنگھ تھا اور اس کے منہ سے نجانے کیا کیا باتیں نکل رہی تھیں۔

''بھبھ...... بھیا جی...... تت...... تم...... بھیا جی تم...... تم...... ارے تم یہاں...... ارے کہاں بھیا جی...... جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ سچ ہے کیا؟''

میں نے ستنام سنگھ کو گلے لگا لیا تھا۔

''ارے ستنام سنگھ تم...... معاف کرنا یار، بس تمہارے پاس آنا تھا مجھے۔ لیکن ذرا اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔''

''بھیا جی...... بھیا جی...... کیا کہوں تم سے، بس یہ بتا دو کہ اس سسری کا کیا حال ہے۔ آؤ نا گھر چلو بھیا جی۔ ارے تم یہاں آؤ گے میں نے تو خوابوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ بھیا جی گھر چلو۔ میرے گھر سے زیادہ اچھی جگہ دہلی میں تمہارے لئے کیا ہو سکتی ہے۔ یہ بتاؤ دہلی میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

''ہوٹل میں ستنام سنگھ۔''

''میں نے تو تمہیں اپنا پتہ بتایا تھا بھیا جی۔''

''یہاں میں ضروری کام سے آیا تھا اور اسی کی تکمیل میں مصروف تھا۔''

''تمہارا گھر ہے بھیا جی۔ یہاں ہوٹل میں کیوں ٹھہرے؟''

''میں نے کہا نا ایسا ضروری کام تھا کہ ہوٹل میں ٹھہرنا ضروری تھا۔ یہ میرے کزن محمود ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر۔ یہ بھیا جی جو ہیں نا خاقان جمشیدی، بس ان کے بارے میں کچھ پوچھو مت مجھ سے۔ میرے سب کچھ ہیں یہ۔ جان بچائی ہے انہوں نے میری۔ بھیا جی، مجھے معاف کرنا۔ ارے آؤ نا، تھوڑی دیر کے لئے تو گھر چلو۔''

''ستنام! اس وقت مجھے گھر نہ لے جاؤ۔ ایک وعدہ کرتا ہوں تم سے آؤں گا ضرور۔''

''کب بھیا جی؟''

''بہت جلد...... بہت ہی جلد۔''

''بھیا جی، مجھے یہ تو بتا دو اس کا کیا ہوا؟''

''مر گئی سسری۔ ختم ہو گئی۔ رانا جسپال ہی نے اسے زندگی سے محروم کر دیا۔ تمہاری اطلاع کے مطابق وہ وہی کام کرنا چاہتی تھی جو تم نے کہا تھا۔ لیکن بس یہ سمجھ لو کہ خاتمہ ہو گیا اس کا۔''

''شکر ہے بھگوان کا۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا بھیا۔ بڑی خطرناک عورت تھی۔ تو پھر بھیا جی کب آؤ گے؟''

''میں نے کہا نا ستنام......''

''میرے گھر کا پتہ ایک بار پھر لکھ لو۔''

''ہاں ایک بار پھر اپنے گھر کا پتہ مجھے دے دو۔''

پتہ وغیرہ لکھا گیا۔ ستنام کی محبت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بیچارہ بہت زیادہ چاہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تو مجھے فائنل ٹچ دینے تھے۔ آخر کار ستنام رخصت ہوا۔ محمود نے کہا۔

''بڑا اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں، تو اب ایسا کرتے ہیں کہ واپس چلتے ہیں۔ ہوٹل جا کر بل وغیرہ چکا دو اور اس کے فوراً بعد ہم لوگ سیتا گڑھی کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام کام کر لئے جائیں، اس کے بعد ذرا سکون حاصل ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن بڑا ڈرامہ ہو گا۔ طارق جمشیدی صاحب تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے۔''

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

بہر حال پھر میں محمود کے ساتھ واپس آ گیا۔ سارے کے سارے بڑے بے چین تھے میرے لئے۔ پہلے تو میں ماموں حافظ کے پاس گیا اور انہیں ساری صورتحال بتائی۔ میں نے کہا کہ وہ لوگ اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئیں گے جب تک میں سارے کام مکمل نہیں کر لوں گا۔ صادق ہادی نے مزید کچھ پروگرام ترتیب دیئے تھے اور انہی پروگراموں کے

تحت باقی سارے کام بھی ہونے تھے۔ حویلی واپس پہنچا تو طارق جمشیدی صاحب فوراً ہی مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے تم بھئی۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ یعنی وہ جو کہتے ہیں کہ ہم نے تو کنوئیں میں بانس ڈلوا دیئے تھے تمہاری تلاش میں بیٹا! بغیر کہے ہوئے ہی چلے گئے۔ تمہیں پتہ ہے ہم کتنے پریشان تھے تمہارے لئے۔"

"پھر میں کسی کنوئیں میں دستیاب نہیں ہوا۔ کالا کنواں بالکل بیکار جگہ ہے۔ میرا خیال ہے اسے بند کرا دیتے ہیں۔ کوئی چیز کسی کام ہی نہ آئے تو اس کے ہونے سے کیا فائدہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گئے کہاں تھے، یہ بتاؤ۔"

"کچھ کام تھے چچا صاحب! آپ سے اس سلسلے میں باتیں بھی کرنی تھیں۔"

"کیا کام تھے...... مجھ سے کہے ہوتے۔"

"اصل میں آپ اس قدر بزرگ ہو چکے ہیں کہ اب آپ سے کچھ کام کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ تو ہم بچوں کا کام ہے کہ ہم آپ کے کام کریں۔"

"بس بیٹا! بعض لوگوں کی تقدیر میں ذمہ داریاں لکھی جاتی ہیں اور وہ ذمہ داریاں پوری کرتے کرتے ہی مر جاتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ آج شام کو تمام افراد کو جمع کر لیجئے، سب ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

"بدتمیز ہیں سارے کے سارے۔ یہ نہیں جانتے کہ حویلیوں میں رہنے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ کہاں چکروں میں پڑو گے۔"

"چچا صاحب! میں نے آپ سے جو کہا ہے وہ آپ نے سنا۔ تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کر لیجئے، کھانا سب ساتھ کھائیں گے۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا اور طارق جمشیدی میری صورت دیکھتے رہ گئے۔ انہوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن شام کو بڑے ہال میں زمینی دسترخوان بچھا دیئے گئے تھے اور حویلی کے سارے افراد جو ایک طرح سے یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ چچا صاحب کی رعایا بن چکے تھے، وہاں پہنچ گئے۔ سارے کے سارے اچھے لوگ تھے، بس حالات کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے طور پر گزارہ کر لیا کرتے تھے اور حویلی سے انہیں بہت کم ملتا تھا۔ لیکن بس گزارے والی بات تھی۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں نے کہا۔

"مجھے معاف کیجئے گا، ہو سکتا ہے آپ لوگوں نے کبھی اس دوران یہ سوچا ہو کہ میں نے آپ پر کوئی توجہ نہیں دی اور بس چند ہی لوگوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہوں۔ حالانکہ میرا آپ سب سے برابر کا رشتہ ہے۔ لیکن اس کے لئے میں آپ سے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں کچھ مصروف تھا۔ طویل عرصے کے بعد وطن واپس آیا۔ کچھ ایسے کام کرنے تھے جو اب میرے لئے ضروری ہو گئے تھے۔ میں نے والد صاحب کے ساتھ سیر و شکار میں زندگی گزاری۔ اس کے بعد جو حالات ہوئے وہ آپ سب کے علم میں ہیں۔ ملک سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو میری نگاہوں نے یہاں کا جائزہ لیا۔ بہت سے تجربے کئے میں نے۔ طارق جمشیدی صاحب جو میرے چچا ہیں انہوں نے حویلی کا نظام سنبھال رکھا تھا اور زمینیں اور جائیدادیں انہوں نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں حالانکہ انہیں اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ زمینوں کی خرید و فروخت کرتے یا ان میں ردوبدل کرتے۔ لیکن انہوں نے چالاکی سے کچھ حکام کو اپنے قبضے میں لے کر یہ عمل بھی کر ڈالا اور لاکھوں روپے خورد برد کئے۔ سارے حسابات میرے علم میں ہیں اور اس خورد برد کے نتیجے میں چچا طارق جمشیدی صاحب اور ان کے دونوں بیٹے کم از کم دس سال کی سزا بھگتنے کے لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن طارق صاحب نے اپنے نام کے ساتھ جمشیدی کا نام بھی لگایا ہوا ہے اور اس نام کے حوالے سے میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ یہ جیل کی چکی پیسیں۔ چنانچہ میں انہیں معاف کرتا ہوں۔ ہاں، آج سے آپ تمام لوگوں کے سامنے میں انہیں ان کے خود ساختہ اختیارات سے بے دخل کرتا ہوں۔ تمام لوگ حویلی میں اسی طرح رہیں گے جس طرح رہتے چلے آئے ہیں لیکن طارق جمشیدی صاحب کو اپنی بیگم اور تینوں بچوں کے ساتھ اب سے چند گھنٹے کے اندر اندر اس حویلی سے نکلنا ہو گا۔ اس سلسلے میں، میں نے حکومت سے اختیارات لے لئے ہیں۔ ایس پی حامد علی شاہ صاحب باہر آ چکے ہیں، میں انہیں طلب کرتا ہوں۔ آگے کی ہدایات وہ دیں گے۔"

طارق جمشیدی صاحب، ان کے دونوں صاحبزادے، نغمانہ اور چچی جان پتھرا کر رہ گئے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد طارق جمشیدی نے اپنے آپ کو سنبھالا اور غرائی آواز میں بولے۔

"کس حرام زادے کی مجال ہے کہ مجھے ان تمام اختیارات سے بے دخل کر سکے۔ کل کا لونڈا میرے مقابلے پر آیا ہے۔ ابے تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ میں نے کچی گولیاں کھیلی ہیں کیا؟"

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔ ''آیئے ایس پی صاحب۔ اندر آ جایئے۔'' صادق ہادی صاحب نے ہی یہ انتظام بھی کیا تھا۔ ایس پی حامد علی شاہ وردی میں ملبوس اندر آ گئے۔

''آپ نے سنا ایس پی صاحب؟''

''ہاں سن لیا ہے۔ اچھی طرح سن لیا ہے۔''

''آپ لوگوں کو کچھ اور بتانا بھی ضروری ہے۔ طارق جمشیدی صاحب نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ مجھے قتل کر دیں اور یہ دونوں گدھے مجھے لے کر پالن باغ پہنچ گئے جہاں کالا کنواں نامی ایک جگہ ہے۔ انہوں نے مجھے کالے کنوئیں میں ڈال کر ختم کرنا چاہا لیکن پورے چار گھنٹے میں نے انہیں اس کالے کنوئیں میں الٹا لٹکائے رکھا اور دوبارہ بھی ایسا ہی کر سکتا ہوں، یہ بات یہ لوگ جانتے ہیں۔ بہر حال چھوڑیئے۔ اس کے بعد طارق جمشیدی صاحب نے اور بھی بہت سی کارروائیاں کیں جن کا ابھی تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایس صاحب! آپ ان کی دھمکی کو سن چکے ہیں۔ آپ کو تمام تفصیلات کا علم ہے۔ کم از کم تین مہینے تک انہیں لاک اپ میں رکھئے تا کہ ان کے ہوش و حواس ٹھکانے آ جائیں۔ اس کے بعد میں آپ سے رابطہ کر کے ان کے بارے میں بات کروں گا۔''

ایس پی صاحب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور طارق جمشیدی صاحب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ان کے دونوں بیٹوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ چچی جان چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ نغمانہ ایک دیوار سے لگی پتھرائی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ سارا کھیل ہی غلط ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ حویلی والوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ طارق جمشیدی صاحب اگر دھمکیوں بھری بات نہ کرتے تو شاید میں ان کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ لیکن بہر حال پولیس انہیں لے کر چلی گئی۔ حویلی کے تمام مکینوں پر سکوت طاری تھا۔ تب میں نے آگے بات کی۔

''طارق جمشیدی صاحب سے آپ لوگوں کو نجات مل چکی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ انہوں نے کس کس طرح آپ لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ آپ سب بالکل بے فکری سے یہاں رہیں، میں وہی کچھ کروں گا جو میرے والد کی زندگی میں ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ حویلی میری نہیں، آپ سب کی ہے۔ یہ طارق جمشیدی صاحب کی بھی ہوتی اگر وہ اس طرح اس پر غاصبانہ قبضہ نہ جما لیتے۔ ایک چھوٹی سی اطلاع آپ کو اور دینی ہے، حویلی کے متولی، جائیداد اور زمین کے مکمل طور پر نگران اب ماموں حافظ ہوں گے۔ آپ سب کو

ان سے تعاون کرنا ہوگا۔ یہ ساری کارروائیاں میں کر چکا ہوں۔''

حویلی کے مکینوں نے ماموں حافظ کے اس منصب پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ سب ماموں حافظ سے خوش ہیں اور ان کے اس منصب پر کسی کو ذرہ برابر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

چچی جان اور نغمانہ ابھی حویلی میں ہی تھیں۔ نغمانہ نے جب دوبارہ مجھ سے ملاقات کی تو میں نے اسے بہت محبت سے خوش آمدید کہا اور پیچھے سے چچی جان بھی آ گئیں۔ انہوں نے دوڑ کر میرے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ وہ کہنے لگیں۔

''نہیں بیٹا! یہ مت کرو۔ ہمارے ساتھ ایسا مت کرو۔''

''آپ اٹھئے چچی جان! جس طرح اس حویلی کے تمام افراد میرے لئے قابل احترام ہیں، آپ بھی ان سے کم نہیں ہیں۔ لیکن آپ خود دیکھ لیجئے، جو باتیں ہیں وہ آپ کے علم میں بھی ہیں اور میں جانتا ہوں چچی جان کہ آپ بھی اس کی شریک ہیں۔''

''ہاں بیٹا، ہم شریک تھے۔ ظاہر ہے انسان جب برائی پر آمادہ ہوتا ہے یا پھر اگر تم تسلیم کرو تو یہ سمجھ لو کہ ہم تو تھے ہی ان کے رحم و کرم پر۔ جو وہ چاہتے تھے وہی ہمیں بھی کرنا ہوتا تھا۔''

''بالکل ٹھیک چچی جان! آپ سے ایک عرض اور کروں، نغمانہ جس انداز میں میری جانب بڑھی، میں نے اس انداز کی کبھی پذیرائی نہیں کی۔ وہ میرے لئے ایک بہن کی مانند ہی ہے اور میں نے اسے بہن ہی سمجھا ہے۔ بہر حال ہو سکتا ہے چچا طارق کو ہوش آ جائے۔ یہ تو میں نے ان کے لئے عارضی بندوبست کیا ہے۔ میں ان کا خیال رکھوں گا۔ بلکہ آپ چاہیں تو میں آپ کو بھی بھیج سکتا ہوں ان کے پاس۔ آپ اندازہ لگا لیجئے، حویلی میں، میں آپ لوگوں کو نہیں رکھوں گا۔ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ کیونکہ حویلی والے آپ کو اپنے درمیان پسند نہیں کرتے۔ ہاں آپ کی رہائش گاہ اور آپ کے اخراجات کا انتظام میں کر دوں گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھئے اس کے بعد اگر کوئی سازش کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ دوبارہ کسی قسم کی رعایت مجھ سے نہیں لیں گی۔''

''نہیں لوں گی بیٹا، نہیں لوں گی۔'' چچی جان نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر چچا صاحب کو پولیس کی تحویل سے نکال کر شالی سیتا گڑھی والے گھر میں پہنچا دیا جائے گا۔ آپ لوگوں کے لئے میں بندوبست کئے دیتا

ہوں۔"

چچی جان نے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے تقریباً تمام ہی معاملات درست ہو گئے تھے۔ کافی دن تک میں یہاں کے انتظامی امور سنبھالتا رہا اور ماموں حافظ اور محمود اور ایاز کو سمجھاتا رہا۔ اس دوران طارق چچا کو پولیس کے چنگل سے رہائی دلا دی تھی۔ وہ خاصے سدھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ادھر شاہنواز اور احمد جو صحیح معنوں میں بدمعاش نہیں تھے بلکہ طارق چچا نے زبردستی انہیں بدمعاش بنا دیا تھا تاکہ حویلی والوں پر رعب قائم کریں، وہ بھی اوقات میں آ گئے تھے۔ چھتیس بار آ آ کر مجھ سے معافی مانگی تھی۔ اور بہرحال دشمنی تو میری کسی سے بھی نہیں تھی۔ یہی تو میرا اپنا خاندان تھا۔

پھر دل چاہا کہ ستنام سنگھ سے ملاقات کروں اور دل کی یہ چاہت بے مقصد نہیں تھی۔

میں ستنام کے گھر پہنچ گیا۔ خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا ستنام۔ اس کے پتا جی گرنام سنگھ اس سے بھی زیادہ خوش اخلاق تھے۔ حالانکہ ہندو گھرانہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ میں مسلمان ہوں لیکن گھر کا ایک ایک فرد مجھ سے اس طرح گھل مل گیا جیسے میں ان کا بہت ہی قریبی رشتے دار ہوں۔ ستنام کی دونوں بہنیں کشوری اور پشپا ہنستی مسکراتی میرے پاس آ گئی تھیں اور مجھ سے ایک لمحے کے اندر بے تکلف ہو گئی تھیں۔ رات کو کھانے پر بھی بہت اچھا بندوبست کیا گیا تھا۔ ستنام سنگھ نے میرے لئے باقاعدہ تیتر پکوائے تھے۔ باقی لوگ گوشت نہیں کھاتے تھے لیکن ایک ہی میز پر سارا بندوبست کیا گیا تھا۔ پھر اسی میز پر ایک اور شخصیت داخل ہوئی جسے دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا...... مجھ پر صحیح معنوں میں ایسا شدید حملہ ہوا تھا کہ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ یہ کلاڈیا تھی۔ ایک خوبصورت سوٹ میں ملبوس مدھم مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر آئی تھی۔ گرنام سنگھ جی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ رخسار ہے میری تیسری بیٹی۔ مسلمان لڑکی ہے۔ آؤ بیٹا، بیٹھ جاؤ۔"

کلاڈیا کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس کا یہ نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے میری یہ کیفیت محسوس کی تھی یا نہیں۔ لیکن کیا کھانا کھایا، کیا کچھ کہا، بس لمحے گزرے تھے۔ کھانے کے بعد کلاڈیا، کشوری اور پشپا کے ساتھ واپس چلی گئی۔ ستنام سنگھ مجھ سے باتیں کرتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جو میرے لئے تیار کرایا گیا تھا۔

"اب پندرہ دن سے پہلے دِلّی سے نہیں جانے دوں گا۔ پوری دِلّی کی سیر کرانی ہے تمہیں۔ ایک بات بتاؤں یار، بے تکلفی کی معافی چاہتا ہوں، کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے تمہاری۔ الجھے الجھے سے گھبرائے گھبرائے سے۔"

"ہاں ستنام، میں اُلجھ گیا ہوں۔ گھبرا گیا ہوں۔ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ لیکن دوسرا لمحہ میرے لئے مزید حیرت کا باعث تھا۔ دروازہ بند نہیں تھا، ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی، اس کے بعد دروازہ کھلا اور کلاڈیا مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ہاں ستنام بھیا! ان پر جو کیفیت طاری ہوئی ہے وہ غلط نہیں ہے۔ ہم اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ میں ایک صاف ستھری طبیعت کی مالک لڑکی ہوں۔ جو صورتحال ہے، میں بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے پتا جی کو بھی یہاں آنے کے لئے کہا ہے اور ماتا جی کو بھی۔ پشپا اور کشوری بھی آ رہی ہیں۔ سب کے سامنے میں صورتحال بتاؤں گی کیونکہ یہ انتہائی اہم مسئلہ ہے۔"

میں ایک بار پھر سکتے میں رہ گیا تھا۔ میری نگاہیں کلاڈیا پر جمی ہوئی تھیں۔ آج پہلی بار وہ مجھے اس قدر حسین نظر آئی تھی کہ صحیح معنوں میں میری پلکیں ہی جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کے کہنے کے مطابق سب آ گئے تو کلاڈیا نے کہا۔

"پتا جی! اب آپ ہی میرے پتا جی اور ماتا جی ہی میری ماتا جی ہیں۔ میں آپ کو ایک اہم صورتحال بتانا چاہتی ہوں، خاصی پرانی بات ہے جب خاقان جمشیدی صاحب کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنے آئے۔ یہ بات تو آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد کرنل صغیر احمد نے ایک انگریز عورت سے شادی کی تھی جو میری ماں تھی، انہوں نے قبول اسلام نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی نہیں کیا تھا کیونکہ میری ماں کی شرط تھی کہ میرے والد اور والدہ اپنے اپنے مذہبوں پر رہیں گے۔ پھر ہمارا واسطہ ایک بزرگ سے پڑا جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہمیں ملے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا اور انہوں نے ہی میرا مذہب تبدیل کر دیا اور مجھے مسلمان کر لیا۔ اس کے بعد وہ مجھے پراسرار علوم سکھانے لگے۔ انہوں نے مجھے ایسے وظائف بتائے جن کی مدد سے میں اپنے بے شمار مقاصد حاصل کر سکتی تھی۔ اس دوران معافی چاہتی ہوں، خاقان جمشیدی میرے سامنے آئے۔ میں ایک نوعمر اور کچے ذہن کی مالک لڑکی تھی۔ یہ میرے دل و دماغ میں اتر گئے۔ میں ان سے محبت کرنے لگی۔ میرے تمام علوم ان کے لئے وقف ہو گئے اور اس کے بعد میں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ ان پر صرف کرتی چلی گئی۔ یہ جہاں بھی مشکل میں پڑے، جس حد تک مجھ سے ممکن ہو سکا، میں نے ان کی مدد کی اور اس

کے لئے مجھے اپنے علوم کا سہارا لے کر نجانے کہاں کہاں جانا پڑا۔ خاقان جمشیدی صاحب! اس کے بعد میں واپس آ گئی۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گرنام سنگھ جی میرے والد کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔ پشپا اور کشوری میرے ساتھ پڑھتی رہی تھیں۔ والد کے انتقال کے بعد میرا سرپرست اور کوئی نہ رہا تو گرنام سنگھ جی مجھے اپنے ساتھ لے آئے اور اب میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔ یہ ہے ساری صورتحال۔ آپ لوگوں کو بلاوجہ کسی حیرت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی، سو میں نے یہ داستان آپ کے سامنے سنا دی۔ خاقان جمشیدی صاحب! معافی چاہتی ہوں، آپ کو بہت بار میری وجہ سے اُلجھنوں میں پھنسنا پڑا ہو گا۔"

یہ کہہ کر کلاڈیا اٹھی اور باہر نکل گئی۔ سب کے سب سکتے کی سی کیفیت کا شکار تھے۔ ستنام سنگھ نے مجھے دیکھا، مسکرایا اور پھر ہنس پڑا۔ کشوری اور پشپا بھی خوب دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"ارے تم لوگ ہنس کیوں رہے ہو بھئی؟"

"ایک منٹ...... ایک منٹ بیٹا! ایک موقع آ گیا ہے۔ بہت بار میں نے سوچا کہ تم نے میرے بیٹے ستنام سنگھ کی زندگی بچائی ہے، میں تمہیں اس کا کیا صلہ دے سکوں گا۔ لیکن بھگوان نے میرے لئے یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ بیٹا، اب کہیں نہیں جا سکتے۔ جو اتنے عرصے سے تم سے محبت کر رہی ہے، تم اس کا حق بنتے ہو۔ بیٹا! ایک بات بتاؤ، بتاؤ گے اپنے زبردستی کے چاچا کو؟"

"نہیں چاچا جی! آپ میرے زبردستی کے چاچا کہاں ہیں، آپ تو میرے سچ مچ کے چاچا ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر میری ایک بات مان لو۔ وہ اپنے منہ سے کہہ چکی ہے کہ کب سے اس نے تمہیں اپنے جیون میں شامل کر لیا ہے۔ تم اسے اپنے جیون میں شامل کر لو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے گرنام سنگھ جی کو دیکھا اور کہا۔

"جو آپ کا حکم چاچا جی۔"

(ختم شد)